روزمرہ زندگی کے مسائل سے مُتعلق فتاویٰ

احکام و مسائل

کتاب و سُنت کی روشنی میں

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا ابو الحسن مُبشر احمد ربانی حفظہ اللہ تعالیٰ

نظرثانی

فضیلۃ الشیخ حافظ عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روزمرہ زندگی کے مسائل سے متعلق فتاویٰ

احکام و مسائل

کتاب و سنت کی روشنی میں

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا ابوالحسن مبشر احمد ربانی

نظر ثانی

فضیلۃ الشیخ حافظ عبدالسلام بن محمد

Dar ul Andlus

دار الاندلس اسلام کی نشرو اشاعت کا عالمی مرکز

4-لیک روڈ چوبرجی لاہور 042-7230549

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب

احکام و مسائل

کتاب و سنت کی روشنی میں

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا ابو الحسن مبشر احمد ربانی

نظر ثانی

فضیلۃ الشیخ حافظ عبد السلام بن محمد

جمع و ترتیب

حافظ عمران ایوب || **ابو عمر اشتیاق احمد**

ناشر .... دار الاندلس

Dar ul Andlus

ملنے کا پتہ

دار الاندلس
اسلام کی نشر و اشاعت کا عالمی مرکز
4- لیک روڈ، چوبرجی لاہور
Ph: 7230549 Fax: 7242639 www.dar-ul-andlus.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احکام ومسائل

WWW. KITABOSUNNAT. COM

عقائد کا بیان

کیا انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے؟ 13
ایک من گھڑت روایت کی تحقیق 16
اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرنے کے متعلق حدیث کی توثیق .. 17
عبدالنبی اور عبدالرسول نام رکھنا 19
کیا اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے؟ 22
غیراللہ کی قسم کھانا 22
غیراللہ سے مدد مانگنا 23
میرے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہیں 25
زمانے کو برا کہنا 26
ایک ضمیر میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو جمع کرنا 27
مسئلہ تقدیر 29
اللہ تعالیٰ کی مشیت رسول اللہ ﷺ کی مشیت سے مقدم ہے 31
قبروں پر جانور ذبح کرنا 35
قبروں پر اعمال پیش ہونا 35
مسلمانوں کی میلوں ٹھیلوں میں شرکت 36
کلمہ طیبہ 36
استطاعت سے بڑھ کر نذر پوری کرنا 37
رسول اللہ ﷺ کا سایہ 38
خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت 40
نبی ﷺ کا نام سن کر انگوٹھے چومنا 42
جمعرات کو مردوں کی روحوں کا گھر آنا 45
قبر میں میت کو نبی ﷺ کی صورت کا دکھایا جانا 45
درود کی آواز 47
لفظ وہابی سے نفرت کیوں؟ 49
نبی اکرم ﷺ کا بڑے بھائی جتنا ادب 49
قرآن سے عید میلاد النبی ﷺ کا جواز 49
شبینہ کی شرعی حیثیت 52
نبی ﷺ پر اعمال کا پیش کیا جانا 55
روایت "لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ" 59
"نُورٌ مِنْ نُورِ اللّٰهِ" والی ایک روایت کی تحقیق 60
نوری ستارے والی روایت کی تحقیق 61
نبی کریم ﷺ کا مسلک 62
نعت رسول مقبول ﷺ کی شرعی حیثیت 63
سید کسے کہتے ہیں؟ 64
ماہ صفر منحوس ہے؟ 65
ترانے کے لیے قیام 66
''یا محمد'' کا نعرہ 68
نبی ﷺ کی مخالفت پر سزا 69
نجد کا صحیح مفہوم 69
کیا نبی ﷺ نے بدر کے کافر مقتولوں کا ٹھکانا پہلے بتلا دیا تھا؟ 75
تحریف شدہ آسمانی کتابوں سے انکار 77
ماہ رجب کے کونڈوں کی شرعی حیثیت 77

تعویذ کے متعلق شرعی موقف 77
اللہ تعالٰی یا رسول اللہ ﷺ کے لیے لفظ ''عشق'' کا استعمال 78
دم کر کے پانی پر پھونک مارنا........................ 80
عاملوں سے علاج کروانا اور انھیں ہاتھ دکھانا 80
کرامت اور صاحب کرامت 81
کیا ابراہیم علیہ السلام شیعہ تھے؟ 82
کیا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلا فصل اور مشکل کشا ہیں؟ 83
شیعہ اثنا عشریہ اور قرآن 85
ماہ محرم کی بدعات اور ناجائز امور 95
جادو اور جنات نکالنے کی شرعی حیثیت 99
جنات میں شادی بیاہ اور توالد و تناسل 103
جنات سے بچاؤ کے لیے بچوں کے پاس چھری یا لوہے کی
چیز رکھنا.. 104
شرعی احکامات میں ترمیم کی ضرورت سمجھنے والے کا حکم 104
شرک ناقابل معافی جرم.................................. 105
سچی توبہ کی حیثیت...................................... 106

وضو کا بیان

وضو میں پاؤں کا دھونا................................ 108
وضو کی دعا کے متعلق حدیث کی وضاحت 108
دوران وضو دعائیں پڑھنا 109
وضو کے بعد شرم گاہ کی طرف چھینٹے مارنا 109
کیا خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ 110
شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکانے سے وضو ٹوٹنا.............. 113
نیل پالش کے ساتھ وضو.................................. 114
اگر دوران نماز وضو ٹوٹ جائے 115
غسل جمعہ کے بعد وضو.................................. 116
بغیر وضو تلاوت قرآن مجید کا حکم 116

غسل اور جنابت کا بیان

صرف پانی سے طہارت 118
ننگے ہو کر غسل کرنے کا حکم 118
عورت کا غسل جنابت میں بالوں کو تر کرنا 119
غسل خانے میں گفتگو کرنا 122
حالت مباشرت میں پہنے گئے کپڑوں کا حکم 122

حیض و نفاس کا بیان

حائضہ عورت کا مسجد میں جانا.............................. 123
حیض و نفاس کی حالت میں عبادات کا حکم.................. 123
حائضہ عورت کا قرآن کو ہاتھ لگانا.......................... 126
حائضہ عورت کا قرآن پاک کی تلاوت کرنا.................. 128
دوران حج و عمرہ حائضہ کا حکم................................ 129

طہارت کے متفرق مسائل

سلسل البول کا حکم 131
اہل کتاب اور دیگر کفار کے برتنوں اور ذبیحے کا حکم 131

نماز کے احکام

اذان کا بیان.. 133
اذان فجر میں '' اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ '' کہنا.......... 133
اذان میں '' اَشْهَدُ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيٌّ وَ لِيُّ
اللّٰهِ '' کا اضافہ 135
ترجیع والی اذان ثابت ہے؟ 139

نماز کے لیے اذان دینا 140
اذان سے پہلے صلوٰۃ کا حکم 141
بدعتیوں کی اذان کا جواب 141
اقامت کون کہے؟ 142
اقامت کے جواب میں "أَقَامَهَا اللّٰهُ وَ أَدَامَهَا" کہنا . 142
نومولود کے کان میں اذان اور اقامت کہنا 143
اکیلا آدمی نماز کے لیے اپنی اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے؟ 145

اوقات نماز کا بیان

اوقات نماز اور ان کے معلوم کرنے کا طریقہ 146

مساجد کا بیان

کیا مسجد کو گرایا جا سکتا ہے؟ 151
مزین مساجد اور منقش جائے نماز پر نماز کا حکم 153
جنبی کا مسجد میں داخل ہونا 155
چھوٹے بچوں کا مسجد میں آنا 156
مسجد میں گردنیں پھلانگ کر آگے آنا 157
ممنوعہ اوقات میں تحیۃ المسجد پڑھنا 157
مساجد میں عورتوں کے اجتماعات کا کیا حکم ہے؟ 161
مسجد میں اعلانات 162
مسجد میں سترے کی ضرورت 163

طریقۂ نماز کا بیان

نماز کے لیے زبان سے نیت کرنا 168
نماز میں پاؤں سے پاؤں ملانا 169
نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟ 170
سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ 171
مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کی قراءت 171
نماز ظہر میں کبھی کبھار جہراً کوئی آیت پڑھنا 172
سورۂ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ 173
دوران قراءت ہر آیت پر وقف 173
قصداً ترک کی ہوئی نمازوں کی قضا 174
قراءت میں سورتوں کی ترتیب 175
نماز میں قرآن سے دیکھ کر قراءت کرنا 188
نماز میں آیات کا جواب دینا 180
اونچی آواز سے آمین کہنے کا حکم 181
فرائض کی آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کوئی
سورت پڑھنا 181
کیا رفع الیدین کا حکم منسوخ ہو چکا 182
سجدہ کرتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھیں یا گھٹنے؟ 185
دوران سجدہ پاؤں کی کیفیت 186
دوران سجدہ دعا مانگنا 187
سجدہ سہو کا حکم 189
اگر نمازی بھول کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے .. 190
تشہد میں انگشت شہادت کو حرکت دینا 191
تشہد میں شہادت کی انگلی کا قبلہ رخ ہونا 193
پہلے تشہد میں درود پڑھنا 193
آخری تشہد میں دعا 195
مرد اور عورت کی نماز میں فرق 195
فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کی حیثیت 200
کیا رفع الیدین بتوں کی وجہ سے کیا جاتا تھا؟ 203

امامت کا بیان

صفوں کی درستی 204

صف میں اکیلے کھڑے ہونا 207
امامت کا مستحق کون ہے؟ 208
ننگے سر جماعت کرانے کا حکم 209
داڑھی کٹوانے والے کو مستقل امام بنانا 209
کیا غیر ذمہ دار شخص امامت کے لائق ہے؟ 210
امام کی اقتدا کا صحیح طریقہ 211
امام سے پہل کرنا 213
ایک مسجد میں دو جماعتیں 214
میاں بیوی کا باجماعت نماز ادا کرنا 220
مرد کی عورتوں کے لیے امامت 220
عورت کا جماعت کروانا 221
مسافر کی مقیم کے پیچھے نماز 222
مسافر کی مقیم کے لیے امامت 224
مشرک امام کے پیچھے نماز 226
منفرد کے ساتھ نماز میں شریک ہونا 228
نماز میں مقتدی کا امام کو لقمہ دینا 229
دورانِ قنوت مقتدی کیا کہے؟ 230
مقتدی بھی "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ" کہیں 230
امام اور مقتدی کی تکبیر اور سمع اللہ لمن حمدہ میں فرق کیوں؟ ... 231

نفل نماز کا بیان

نوافل بیٹھ کر پڑھنے چاہییں یا کھڑے ہو کر؟ 236
فرض نماز کی جگہ سنتوں کی ادائیگی 236
اقامت کے بعد سنتیں پڑھنے کا حکم 237
فجر کی سنتوں کی قضا کا طریقہ 239
فجر کی سنتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا 241
ظہر سے پہلے چار کی بجائے دو سنتیں پڑھنا 242
خطبہ جمعہ کا اہتمام 243
علاقائی زبانوں میں خطبہ جمعہ 244
نماز جمعہ کی کل رکعتیں 245
نماز جمعہ کا صحیح وقت 245
جمعہ کے روز سورۃ الکہف پڑھنے کی فضیلت 246
جمعہ کے روز عید آنے پر جمعہ کی رخصت 247
منبر کی تیسری سیڑھی پر خطبہ دینا 247
خطبہ جمعہ کے دوران سنتوں کا حکم 248
جمعہ کے بعد سنتیں دو ہیں یا چار؟ 249
خطبہ جمعہ اور نماز جمعہ کے لیے الگ الگ امام 250
خطبہ چھوٹا اور نماز لمبی والی حدیث کا مفہوم 250
تین رکعات وتر تقسیم کر کے پڑھنا 251
وتروں میں قنوت سے پہلے تکبیر 253
وتر کی آخری رکعت 254
وتروں کے بعد نماز 255
نماز عشاء کے بعد وتروں کی تعداد 258
قنوتِ وتر رکوع سے پہلے ہے یا بعد میں؟ 258
قنوت نازلہ کا حکم 259
قنوت نازلہ میں ہاتھ اٹھانا درست ہے 262
نماز تہجد میں سورۂ اخلاص کی مخصوص تعداد میں قراءت 263
نماز عید کے لیے عورتوں کا عیدگاہ جانا 263
نماز عید کہاں ادا کی جائے؟ 264
عید کے دن روزہ رکھنا 265
ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں بال اور ناخن نہ اتروانا 265
نماز اشراق کا بیان 266
نماز استخارہ کا طریقہ 268
رکعاتِ نماز تراویح کی تعداد 268

تراویح کے امام کے علاوہ دوسرے امام کا وتر پڑھانا 270
صدقہ فطر ادا کرنے کا صحیح وقت 270

نماز کے متفرق مسائل کا بیان

نماز میں قضائے حاجت کا مسئلہ 272
جوتے پہن کر نماز پڑھنا 272
نماز میں آستینیں چڑھانا 273
مباشرت کے دوران پہنے گئے کپڑوں میں نماز کا حکم 273
مرد کی ننگے سر نماز 274
قبروں والی مسجدوں میں نماز 275
گھر میں فرض نماز ادا کرنا 279
دوران نماز جیب میں روپے رکھنا 280
ڈرائیور حضرات کی نماز 282
دوران نماز خیالات و وساوس اور ان کا علاج 282
نماز میں مصروف افراد کو سلام کرنا 284
نماز میں بالوں اور کپڑوں کو سنوارنا 284
نماز میں خشوع وخضوع کا طریقہ 285
نماز میں اعوذ باللہ پڑھنا 287
ایک رات میں قرآن ختم کرنا؟ 287
نماز میں ایک آیت سے کم تلاوت کرنا 289
اگر جمعہ فوت ہو جائے؟ 290
قضا نمازوں کی ادائیگی کا طریقہ 291
نماز کے متعلق شک 292
بارش کی وجہ سے نمازیں جمع کرنا 293
عصر کے بعد نفل پڑھنا 294
سجدۂ تلاوت کا حکم 297
رسول اللہ ﷺ کا نماز میں عمامہ باندھنا 298
عورتوں کا نماز میں پاؤں ڈھانپنا 298

زکوٰۃ کے مسائل

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی سزا کیا ہے؟ 300
سونے چاندی کے نصاب پر زکوٰۃ 301
رجب میں زکوٰۃ دینا اور روزے رکھنا 301
زیورات پر زکوٰۃ 302
مصارف زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟ 303
مجاہدین کو زکوٰۃ دینا 304
صدقہ فطر کا حکم 305
مسجد کے قاری کو صدقہ فطر دیا جا سکتا ہے؟ 306
مقروض آدمی کا عشر دینا 306
زمین ٹھیکا پر دینا اور ٹھیکا والی زمین کے عشر کا حکم 307
آل رسول ﷺ کو زکوٰۃ دینا 308
کن فقراء کو زکوٰۃ دینی چاہیے 308

روزے کے احکام

چاند دیکھ کر روزہ رکھنا 315
رمضان کے چاند کے لیے ایک فرد کی گواہی 316
سحری کھانا لازمی ہے؟ 317
سحری کے لیے بہترین چیز 318
تاخیر سے سحری کھانا 318
اذانِ سحری کی شرعی حیثیت 318
اذان کے دوران کھانا پینا 320
سحری کھانے کا آخری وقت 321
روزے کے لیے نیت کرنا 322
روزے کے لیے زبان سے نیت کی حیثیت 322

روزے کا اجر ضائع کردینے والے اعمال 324
روزہ توڑ دینے کا کفارہ 325
روزہ افطار کرنے کا وقت 325
کس چیز سے روزہ افطار کرنا چاہیے؟ 327
روزہ افطار کرنے کی دعا 328
فرضی روزوں کی قضا اور نفلی روزے 328
روزہ میں بھول کر کھانا پینا 328
تارک نماز کے روزے کا حکم 329
روزے کی حالت میں قے آنا 329
جھوٹ بولنے والے کا روزہ 330
ہوائی سفر کرنے والے کا وقت افطار 330
آکسیجن اور روزہ 332
مریض کا روزہ 332
بحری، بری اور فضائی سفر میں روزہ کی رخصت 333
حیض ونفاس والی عورتوں کے لیے روزوں کی قضا 334
دوران روزہ ٹوتھ پیسٹ کا استعمال 334

اعتکاف کے مسائل

اعتکاف کی شرعی حیثیت 336
اعتکاف کے لیے نیت 338
جائے اعتکاف میں کس وقت داخل ہونا چاہیے 338
دوران اعتکاف ممنوع افعال 339
خواتین کا اعتکاف 340
دورانِ اعتکاف چند جائز کام 341
لیلۃ القدر کی تلاش 340
لیلۃ القدر کی علامات 341

حج کے احکام

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والے کا حکم 342
حج کتنی مرتبہ فرض ہے؟ 342
حج کی کون سی قسم افضل ہے 343
دوران طواف جوتا ساتھ اٹھانا 344
کیا ہر طواف میں اضطباع ضروری ہے؟ 344
مقام ملتزم پر دعا کرنا 345
رمل کس طواف میں ضروری ہے؟ 345
حج یا عمرے سے واپسی پر دعوت کرنا 346

حج سے متعلق چند متفرق مسائل

دوران حج حیض ونفاس والی عورت کیا کرے؟ 347
ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنے کا حکم 347
میت کی طرف سے حج کرنا 348
حج بدل کا حکم 348
رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت 348
آب زمزم کے فوائد 349
حج کے موقع پر کی قربانی 351

جنازے کے احکام

میت کو غسل دینے کا طریقہ 352
میت کو غسل دینے والے پر غسل 353
میاں بیوی کا ایک دوسرے کو غسل دینا 354

کفن دینے کا بیان

کفن کا کپڑا 357

عورت کا کفن 358
کفن پر کلمہ یا قرآنی آیات لکھنا 359
نماز جنازہ کا بیان 361
نماز جنازہ کے لیے طاق صفیں بنانا 361
نماز جنازہ میں رفع الیدین 361
نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنے کا حکم .. 363
نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا 365
سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت ملانا 368
نماز جنازہ میں قراءت 369
نماز جنازہ میں میت پر نام لے دعا مانگنا 370
نماز جنازہ میں دعائیں 370
نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا 373
نماز جنازہ کے فوراً بعد دعا 374
مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا 375
نماز جنازہ میں خواتین کی شرکت 377
مردہ بچے کی نماز جنازہ 377
خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ کا حکم 379
شہید کی نماز جنازہ کا حکم 380
غائبانہ نماز جنازہ 384
میت کی بار بار نماز جنازہ پڑھنا 385
نماز جنازہ میں قہقہہ ناقص وضو نہیں؟ 387
غروب کے وقت نماز جنازہ ادا کرنا 388
تدفین کا بیان 391
میت کو قبر میں اتارنا 391
میت کو قبر میں اتارنے والا کیا کہے؟ 392
تدفین کے بعد میت کو کلمہ پڑھنے کی تلقین کرنا 392
قبروں کے مسائل کا بیان 396
قبر پر قرآن پڑھنا 396
میت کے لیے دعا کا حکم 396
میت کے سرہانے سورۂ بقرہ پڑھنا 397
قبر سے سورۃ الملک پڑھنے کی آواز آنا 400
پکی قبریں بنانا 400
قبروں پر مسجدیں بنانا 401
قبر کی اونچائی 401
عورتوں کا قبرستان جانا 401
جنازہ کے متفرق مسائل کا بیان 403
میت کو دیکھ کر کھڑے ہونا 403
سوگ کا مسنون طریقہ 404
جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے باآواز بلند ذکر کرنا 407
میت کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرنا 407
اجنبی عورت کے جنازے کو کندھا دینا 408
تین دن کے بعد تعزیت کا حکم 410
جمعہ کے روز فوت ہونا 410
قریب المرگ شخص کو کلمہ توحید کی تلقین کرنا 411
تجارت کے احکام 412
سودی مال کا کیا کیا جائے؟ 412
بینک میں رقم رکھنا 413
بینک میں ملازمت کرنا 414
انعامی بانڈز کی شرعی حیثیت 414
قسطوں پر اشیاء خریدنے کا حکم 415
بیمہ کی شرعی حیثیت 416
حرام کھانے کا انجام 417
اشیاء کی قیمتیں مقرر کرنا 418
گروی رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا 420

ناجائز کاروبار کے لیے دکان کرائے پر دینا 421
شیو کی کمائی 423
فوٹوگرافی کا پیشہ 424
ذخیرہ اندوزی 426
بیع سلم کا حکم 427
زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والے کی سزا 427
خوردونوش کی اشیاء ادھار لینا 430
قرآن کی تعلیم پر معاوضہ لینا 430
جی پی فنڈ کی شرعی حیثیت 431
نکاح کے احکام 433
نکاح کے لیے ذات برادری ایک ہونا 433
اسلام میں جہیز کی حیثیت 434
اگر شادی کے لیے خرچہ محدود ہو تو؟ 436
بے نماز شخص کو لڑکی کا رشتہ دینا 437
ولی کی اجازت کے بغیر نکاح 438
کورٹ میرج کی شرعی حیثیت 442
والد کی موجودگی میں چچا کی ولایت 443
بیوی کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح 443
نکاح سے پہلے مباشرت 444
بالغ اولاد کا نکاح 446
بالغ لڑکی کا نکاح 447
کم سن بچی کا نکاح 448
شہید کی اہلیہ سے نکاح 448
اولاد کی تمنا میں شادی کرنا 449
عورت کسی کا نکاح کرواسکتی ہے 450
دلہن کے لیے بیوٹی بکس کا استعمال 452
شادی کی تقریب میں بینڈ باجے 453
ناجائز امور پر مشتمل شادی میں شرکت 454
مکلاوہ کی رسم بد 456
بارات کی شرعی حیثیت اور مسنون شادی کے لوازمات 458
شادی کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلانا 459
دعوت ولیمہ پر سلامی 459
نکاح کے بعد چھوہارے تقسیم کرنا 460
لونڈیوں سے مباشرت 462
حاملہ عورت سے صحبت کرنا 463
ولادت سے کتنی مدت بعد مرد عورت کے پاس جائے 464
عورت کے حقوق 464
خاندانی منصوبہ بندی 465
شادی کے دو ماہ بعد بچے کی پیدائش 466
طویل عرصہ بیرون ملک رہنے والے کے نکاح کا حکم 470
ایک سے زیادہ بیویوں کے مابین عدل کا حکم 471
بیوی یا شوہر کا راز افشا کرنے کا شرعی حکم 471
حرمت رضاعت 472
رضاعت کا مسئلہ 474
ایک دفعہ دودھ پینے سے رضاعت 475
بڑی عمر میں رضاعت ثابت نہیں ہوتی 476
بہن کا دودھ پینے والے کی اولاد 476
وٹہ سٹہ کا نکاح 477
شادی سے پہلے کوئی شرط عائد کرنا 481
زبردستی کا نکاح درست نہیں 481
حلالہ کی شرعی حیثیت 482
متعہ کا شرعی حکم 483
طلاق کے احکام 487
طلاق کا مسنون طریقہ 487

طلاق رجعی کے بعد 488
ایک مجلس کی تین طلاقوں کا شرعی حکم 489
حالت حیض میں دی گئی طلاق 491
دوران حمل دی گئی طلاق 493
زبردستی دلوائی جانے والی طلاق 494
بیوی سے ہم بستر ہوئے بغیر طلاق دینا 496
غصہ میں طلاق 497
غیر مدخولہ کی عدت 498
بیوہ کی عدت اور احکام 498
کیا عورت کی طرف سے بھی ظہار ہوتا ہے؟ 500
خلع طلاق یا فسخ نکاح 502
طلاق اور خلع میں فرق 503
شوہر کی خبر نہ ملنے پر عورت کے لیے حکم 504
قربانی کے احکام 507
گیارھویں کی نیت سنت یا بدعت؟ 507
جن جانوروں کی قربانی جائز نہیں 507
حاملہ جانور کی قربانی 508
رسول اللہ ﷺ کیسا جانور قربان کرتے تھے؟ 508
بھینس کی قربانی 509
دو دانتے سے کمتر کی قربانی 511
قربانی کا جانور کیسا ہو؟ 513
اونٹ کی قربانی میں کتنے آدمی شریک ہوں؟ 514
قربانی کا وقت 515
قربانی کے گوشت اور کھالوں کا مصرف 515
عورت کا قربانی کا جانور ذبح کرنا 517
جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ لٹانا 517
قربانی کا جانور خود ذبح کرنا 518
سب اہل خانہ کی طرف سے ایک قربانی 518
میت کی طرف سے قربانی کرنا 518
نحر کرنے کا طریقہ 519
کیا پاکستانی قوم کو قربانی معاف ہے؟ 520
عقیقہ کے مسائل 524
عقیقہ کی شرعی حیثیت 524
عقیقہ کے لیے اونٹ اور گائے ذبح کرنا 527
عقیقہ کے موقع پر رسم مہندی 529
کھانے پینے کے احکام 530
مسلمان کا اہل کتاب کے ساتھ کھانا 530
لہسن کھایا جاسکتا ہے 530
برائلر مرغی کا گوشت حلال ہے یا حرام 532
کیا گھوڑا اور جنگلی گدھا حلال ہے؟ 536
کھانے میں مکھی کا گرنا 539
جہاد کے احکام 540
جہاد کے لیے والدین کی اجازت 540
قرآن وحدیث میں فی سبیل اللہ سے مراد 541
جہاد کشمیر کی شرعی حیثیت 542
ہندوستان کے خلاف جہاد کی فضیلت 545
کیا طالبان کسی غیر مسلم ملک سے مدد لیتے ہیں؟ 546
کافروں کی گردنیں کاٹنا 550
مسلمانوں سے لڑائی نہ کرنے والے کافروں سے سلوک ... 551
کیا ''فی سبیل اللہ'' سے مراد جہاد ہے؟ 552
کفار دوست مسلمان حکمرانوں کے خلاف جہاد 553

اسلامی آداب واحکام

''السلام علیکم'' کی بجائے دیگر فقرے 558

ہاتھ کے اشارے سے سلام 559
جھک کر یا کھڑے ہو کر سلام کرنا 561
تعظیماً کھڑے ہونا 561
دونوں ہاتھوں سے سلام کرنا 562
یہود و نصاریٰ سے سلام 566
روزِ قیامت انسان کو کس نام سے پکارا جائے گا؟ 570
والدین کی طرف دیکھنے کے متعلق حدیث کی وضاحت 571
غسل خانے میں گفتگو 571
برہنہ حالت میں کسی کو دیکھنا 572
روزانہ کنگھی کرنا 572
پینٹ شرٹ پہننا 573
کس رنگ کی پگڑی پہننا مسنون ہے؟ 574
ٹوپی پر پگڑی باندھنا 575
لوہے کی انگوٹھی پہننا 576
کافر کا دیا ہوا تحفہ قبول کرنا 578
وِگ یعنی مصنوعی بال لگانا 580
بہن بھائیوں کا ایک بستر میں سونا 584

وراثت کے احکام

جائداد کی تقسیم کا شرعی طریقہ 587
زندگی میں وراثت کی تقسیم 589
وراثت میں انصاف کا مسئلہ 589
چچا کی موجودگی میں پوتا وارث 592
وارث کے لیے وصیت کرنا 593
اولاد کو عاق کرنا 594

حدود کے احکام

زنا کی حد 596
عمل قوم لوط کی سزا 598
غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت نشینی 599
مرتد کسے کہتے ہیں؟ 603
مرتد کی دنیوی سزا 605
کافر کے بدلے مسلمان کا قتل 606
بیٹے کے قصاص میں باپ کا قتل 607

دعاؤں اور اذکار کے احکام

تسبیح گننے کا صحیح اور ثابت طریقہ 610
کیا تسبیح کا استعمال جائز ہے؟ 610

وظائف کی تعداد کا مسئلہ

مجلس برخاست کرنے سے قبل سو مرتبہ استغفار کرنا 614
چلتے پھرتے اللہ کا ذکر کرنا 615
کلمہ شہادت کا وظیفہ 615
''لا الہ الا اللہ'' کی فضیلت 616

حرام اور مباح امور کا بیان

محرم کے بغیر عورت کا سفر 618
عورت کے لیے محرم کے بغیر حج وعمرہ کا حکم 623
ہاتھ اور پاؤں کی تصویر اتروانا 625
گھر میں تصویر لٹکانے کا حکم 626
جاندار کی تصویر والے لباس 627
قوالی کی شرعی حیثیت اور عرسوں کے کھانے 627
دل بہلانے کے لیے بانسری بجانا 631
قبروں پر عرس اور میلے کا حکم 631
گانا اور میوزک سننا 634

محفلوں میں تالی بجانا 634
موسیقی، اسلام کی نظر میں 635
خودکشی 641
عزت بچانے کی خاطر خودکشی کرنا 642
رسومات میں شرکت کرنا 643
ہوٹلوں میں منعقد تقریبات میں شرکت 644
ویڈیو اور موسیقی والی شادیوں میں شرکت 644
داماد سے پردہ 645
خاوند کی وفات کے بعد ملازمت کرنا 646
کسی کی وفات پر خاموشی اختیار کرنا 647
کتا کہلوانا 647
چوسر کھیلنا کیسا ہے؟ 652
عورت کے لیے چہرے کے بال اکھیڑنا 652
بیوی کے ساتھ جھوٹ بولنا 653
قرآن اور دوسری الہامی کتابوں کو زمین پر رکھنا 654
سکول میں گھنٹی بجانا 655
تقریبات میں طبلے بجانا اور ترانے پڑھنا 658
اپریل فول 658
ماتم کا شرعی حکم 662
غمی کے موقع پر گریبان پھاڑنا یا سینہ پیٹنا 664
ہدیہ وتحفہ واپس لینے کا حکم 665
بسم اللہ یا قرآنی آیات کو اعداد کی صورت لکھنا 666
داڑھی اور مونچھوں کے متعلق شرعی احکامات 668
داڑھی رکھنا فرض ہے 670
داڑھی کے متعلق عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث 671
خضاب لگانا 672
چاندی کی انگوٹھی پہننا 678
گھڑی باندھنا 679
عورت کا خوشبو لگا کر باہر نکلنا 679
فیشن کے لیے ناخن بڑھانا 680
راہ چلتے اگر کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو کیا کرنا چاہیے؟ ... 680
شادی شدہ عورت کے لیے باپ کی اطاعت 681
خوش طبعی 682

چند اہم مسائل کا بیان

شادی کرنے میں بھی والدین کی اطاعت 684
ولدیت تبدیل کرانے کا حکم 684
اولاد کے نان ونفقہ کی ذمہ داری 688
میاں بیوی میں علیحدگی کی صورت میں نابالغہ بچی کے
خرچہ کا حکم 689
اگر میاں بیوی میں جدائی ہو جائے تو اولاد کس کے پاس رہے گی 691
روایت فضیلتِ سورۃ واقعہ کی تحقیق 695
توبہ کے بعد مسروقہ مال نامعلوم مالکوں تک پہنچانا 698
علم حاصل کرنے کے متعلق چین جانے والی حدیث 699
وفات کے بعد میت کی طرف سے سود کے مال سے صدقہ کرنا 699
ناراضی کے دوران شوہر فوت ہو جائے تو؟ 700
مسلمان مریض کو خون کا عطیہ 702
کالے بکرے کا صدقہ 702
مذہبی جلسوں میں نعرہ بازی 704
کوے کا شرعی حکم 704
قل اور ساتے کی جگہ کوئی دینی پروگرام کروانا 706
احناف کے ہاں فاتحہ پیشاب سے لکھنا 708
قرآن خوانی کرانا 710
جھوٹی قسم کا کفارہ 711

قسم کا کفارہ اور مسکین کے کھانے کی مقدار 712
دو یا تین نابالغ بچوں کی وفات پر جہنم سے آزادی........ 712
چچازاد یا خالہ زاد بھائی سے پردہ 713
آیت کریمہ پڑھنے کی فضیلت 714
تاج کمپنی کی کتاب اعمال قرآنی.............................. 716
ایک نماز کے بدلے انچاس کروڑ نمازوں کا ثواب 716
ترجمہ پڑھنے کا ثواب 717
سیاہ لباس پہننا 718
مرد وخواتین کا اختلاط 719
گھروں میں پردہ.. 719
نماز کی تارک بیوی کا حکم 720
عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ نہ ہونے کی دلیل پکڑنے والوں کا ردّ ... 721
ہومیوپیتھی ادویات استعمال.................................... 722
لقطہ کا حکم 722
اجتہاد کے متعلق معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تحقیق 727
بینک کی چوکیداری کی نوکری 728
سودی کاروبار کرنے والے کے گھر سے کھانا 728
لفظ ''نصب'' کا معنی 729
علماء کی سیکیورٹی 729
غیر محرم مردوں سے عورتوں کا مصافحہ کرنا 731
آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے لینز لگانا 731
سالگرہ منانا.. 732
صاع، مد، رطل اور وسق کا صحیح وزن............................ 732
بغیر اجازت کسی کی چیز استعمال کرنا............................ 734
شوہر سے پوچھے بغیر عورت کا صدقہ کرنا 735
افتتاح کے لیے فیتا کاٹنا.. 736
حرام جانور کے اعضاء کا حکم....................................... 737
کبوتر بازی اور مرغ لڑانا 738
زیادہ نمازیں پڑھنے والا شہید سے پہلے جنت میں 740
پھولوں کا تحفہ پیش کرنا 741
بال زائل کرنے کا حکم 742
دین کے لیے وقف کی گئی اولاد سے کام لینا 742
رسول اللہ ﷺ کا ختنہ.. 743
خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی ایک بیٹی فاطمہ تھی یا چار؟ 744
کالے کپڑے پہننے کا حکم 747
ضعیف روایات کا حکم 748
گھر سے نکلنے کی دعا کی وضاحت.................................. 749
آل محمد ﷺ سے مراد 749
خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں 751
قرآن پاک کے شہید اوراق کو محفوظ کرنا.................... 752
ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر فقیہ 752
صحیح بخاری کو نا قابل صحت سمجھنے والوں کا حکم 755
کیا امام بخاری اور دیگر محدثین بھی مقلد تھے؟.......... 757
کیا اختلاف امت رحمت؟ 759
ہر امت کے لیے فتنہ والی حدیث کی تحقیق.................. 760
ام کلثوم بنت علی (رضی اللہ عنہما) کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے 762
عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے صحیح بخاری کی ایک روایت پر نظر. 731
عورت کی آواز سننا.. 769
خضر علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں؟.. 770
یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا حدیث رکھنے کے متعلق حدیث.... 771
خواتین کے لیے بھی سونے کا زیور ممنوع ہے................ 771
نفاق سے براءت 775
شعبان کی پندرھویں رات کی فضیلت 776
شعبان کی نصف رات کے اعمال کی حیثیت 777
پندرہ شعبان کا قیام اور روزہ 778

WWW. KITABOSUNNAT. COM

عرض ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى أَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ أَمَّا بَعْدُ !

شریعت کے احکام پر عمل کرنا اور نواہی سے بچنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اگر شرعی احکام میں کہیں اختلاف واقع ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے، نیز یہ ادب بھی سکھایا گیا ہے کہ بے فائدہ سوال پوچھنے سے اجتناب کیا جائے، پہلی قوموں کی ہلاکت کا ایک بڑا سبب اسی کو گردانا گیا ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''مسلمانوں میں سب بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جو حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کرنے کی وجہ سے اسے حرام قرار دے دیا گیا۔'' [مسند احمد (۱/ ۱۷۹)]

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ روز مرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے بھی نظر چرائی جائے اور جاہلانہ زندگی پر قناعت کر لی جائے۔ آج ہمارے معاشرے میں بے شمار مسلمان ایسے ہیں کہ جن کو طہارت و پاکیزگی کے اسلامی مسائل کا بھی پتا نہیں اور پوری زندگی یونہی گزر جاتی ہے، مردوں کی نسبت یہ کیفیت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو پاکیزہ زندگی گزارنے کے متعلق بھرپور راہنمائی کی ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے علم و فضل سے بہرہ ور علماء و محدثین کی جماعت پیدا کی، جنھوں نے ہر دور میں پیش آمدہ مسائل کا حل کتاب و سنت سے پیش کیا ہے۔

''احکام و مسائل کتاب و سنت کی روشنی میں'' روز مرّہ کے مسائل سے متعلق فتاویٰ کا شاندار مجموعہ ہے جو محقق عالم، فضیلۃ الشیخ ابوالحسن مبشر احمد ربانی ﷾ کی طرف سے مجلۃ الدعوۃ اور ہفت روزہ غزوہ میں سالہا سال سے شائع ہوتے رہے، جماعۃ الدعوۃ کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق دی کہ دعوت و جہاد کے عظیم منہج کے ساتھ ساتھ روز مرّہ فقہی مسائل میں بھی کتاب و سنت کی بھرپور رہنمائی احباب کے لیے پیش کی۔ مجلۃ الدعوۃ اور غزوہ میں احکام و مسائل کے کالم اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں، جنھیں پڑھ کے ہزاروں لوگوں کے عقیدہ و عمل میں تبدیلی واقع ہو چکی ہے اور بے شمار لوگ ان سے اب بھی دینی رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ وللہ الحمد!

دارالاندلس کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد میری خواہش تھی کہ مجلۃ الدعوۃ اور غزوہ میں بکھرے ہوئے ان انمول موتیوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ تو اس خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے حافظ عمران ایوب اور ابو عمر اشتیاق بھائی کی ذمہ داری لگائی جنھوں نے کئی ماہ کی محنت کے نتیجہ میں ایک جامع مجموعہ ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ مولانا مبشر احمد ربانی ﷾ کے ہزارہا فتاویٰ جات سے

انتخاب ہے، تکرار سے بچنے کے لیے کئی ایک سوالات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ روز مرہ زندگی سے متعلق زیادہ سے زیادہ مسائل کا احاطہ بھی ہو اور کتاب زیادہ ضخیم بھی نہ ہو۔ مجلۃ الدعوۃ کے سوالوں کی تخریج تو پہلے سے موجود تھی لیکن غزوہ میں اختصار کے پیش نظر ایسا نہیں، اس لیے غزوہ کے سوالات کی تخریج کا کام بھی رفقائے ادارہ نے سرانجام دیا۔ نظر ثانی کے لیے اس کتاب کو محترم حافظ عبدالسلام بن محمد ﷾ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انھوں نے اول تا آخر اس کا مطالعہ کیا اور اسے بہتر سے بہترین بنانے کے لیے مختلف مفید تجاویز دیں، جن کی روشنی میں اس پر مزید کام کیا گیا۔

روزمرہ زندگی کے مسائل سے متعلق یہ فتاویٰ ہر فرد اور ہر گھر کی ضرورت ہے، سینکڑوں پیش آنے والے مسائل کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں دیا گیا ہے اسے خود بھی پڑھیے اور احباب کو تحفہ بھی دیجیے۔

اللہ تعالیٰ اسے مؤلف محترم اور رفقائے دارالاندلس کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور اہل اسلام کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین!)

محمد سیف اللہ خالد

مدیر دارالاندلس

١٣ صفر المظفر ١٤٢٦ھ

WWW. KITABOSUNNAT.COM

مقدمہ

نَحْمَدُهُ وَ نُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ أَمَّا بَعْدُ !

اسلامی احکامات میں افہام و تفہیم اور سوجھ بوجھ پیدا کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ جس شخص کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ خیر و بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے اپنے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

« سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ »

[صحیح بخاری، کتاب العلم: باب من یرد اللہ بہ خیرًا یفقهه فی الدین (٧١)]

''میں نے نبی مکرم ﷺ سے سنا ہے آپ فرمار ہے تھے: ''جس آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر و بھلائی کا ارادہ فرمالیتا ہے اسے دین کا فہم عطا کرتا ہے۔''

دین اسلام میں تمام اعتقادات و معاملات داخل ہیں، جس شخص کو عقائد اسلامیہ اور معاملات دینیہ کی تفہیم حاصل ہوجائے تو اسے خیر و برکت کی بلندیاں مل گئیں۔

اہل حدیث خوش نصیب افراد ہیں جن کے تمام مسائل کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر ہے۔ ان کے اصول و فروع اور قواعد و ضوابط کی اساس و بنیاد محض قرآن و حدیث پر استوار ہے۔

قرآن و حدیث اہل حدیث کے ضمیر کی آواز، دل کی دھڑکن اور روح کی غذا ہے۔ ہر صبح شام اور لیل و نہار نے بے شمار انقلابات اور تبدیلیوں کو اپنے دامن میں سمیٹا لیکن کتاب و سنت کی ضیاؤں اور تابانیوں میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ اس کے دلائل و براہین آج بھی اسی طرح چمک دمک رہے ہیں جیسا کہ چودہ سو سال پہلے تھے۔ لیکن بعض افراد ایسے بھی اس کرۂ ارض پر موجود ہیں جنھوں نے کتاب و سنت کے آفتاب و ماہتاب کے مقابل اقوال الرجال کو پسند کیا اور امام الانبیاء، امام اعظم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی حدیث و سنت پر اپنے امام کے قول کو مقدم کیا اور اسلام کی حقیقی تصویر کو نمایاں کرنے کی بجائے مسخ کیا اور رسول مکرم ﷺ کی واضح تعلیمات کو تاویلات فاسدہ اور اقاویل کاسدہ کے ذریعے رد کیا۔ انہی مقلدین پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف حنفی عالم اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

''اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہوتے ہیں کہ اگر قول مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کان میں پڑتی ہے تو ان کے قلب میں انشراح و انبساط نہیں رہتا بلکہ اول قلب میں استنکار پیدا ہوتا ہے پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے، خواہ کتنی ہی بعید ہو اور خواہ دوسری قوی دلیل اس کے معارض ہو بلکہ مجتہد کی دلیل اس مسئلہ میں بجز قیاس کے کچھ بھی

نہ ہو بلکہ خود اپنے دل میں اس تاویل کی وقعت نہ ہو مگر نصرت مذہب کے لیے تاویل ضروری سمجھتے ہیں۔ دل یہ نہیں مانتا کہ قول مجتہد کو چھوڑ کر صحیح وصریح حدیث پر عمل کرلیں۔'' [تذکرة الرشيد (١٣١/١)]

تھانوی صاحب کے اس قول کی صداقت پر کئی ایک دلائل موجود ہیں کہ مقلدین اپنے امام کے قول کے خلاف صحیح حدیث پا کر خوش نہیں ہوتے بلکہ اس صحیح حدیث کا یا تو انکار کر دیتے ہیں یا پھر اس کی بعید از عقل تاویلیں کرتے ہیں۔ بعض تاویلات اس قدر فاسدہ ہوتی ہیں کہ عامۃ الناس بھی اسے سن کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلَ لَهُ» [سنن ابن ماجه، كتاب النكاح: باب المحلل والمحلل له (١٩٣٤)، جامع ترمذى كتاب النكاح: باب ماجاء في المحلل والمحلل له (١١١٩)، ابوداؤد، كتاب النكاح: باب في التحليل (٢٠٧٦)، سنن النسائي (٣٤٤٥) مسنداحمد (٣٢٣/٢)، بيهقى (٢٠٨/٨) مستدرك حاكم (١٩٨/٢)]

''اللہ کے رسول ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے اس پر لعنت کی ہے۔''

یہ حدیث کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

اس صحیح اور صریح حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ حلالہ کرنے والے پر بھی اللہ کی پھٹکار اور جس بے غیرت کے لیے حلالہ کیا جاتا ہے اس پر بھی اللہ کی پھٹکار پڑتی ہے۔ حلالہ کسے کہتے ہیں، لغات حدیث کی معروف و مشہور کتاب ''النہایۃ'' میں مرقوم ہے:

" هُوَ اَنْ يُّطَلِّقَ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا فَيَتَزَوَّجهَا رَجُلٌ آخَرُ عَلٰى شَرِيْطَةٍ اِنْ يُّطَلِّقَهَا بَعْدَ وَطْئِهَا لِتَحِلَّ لِزَوْجِهَا الْاَوَّلِ " [النهاية في غريب الحديث والأثر (٤١٤/١)]

''حلالہ یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دے پھر دوسرا آدمی اس عورت کے ساتھ اس شرط پر شادی کرلے کہ وہ اسے صحبت کے بعد طلاق دے گا تاکہ یہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے۔''

حلالہ کی یہی تعریف احناف کی فقہی اصطلاحات پر مشتمل کتاب القاموس الفقہی (ص:١٠٠)، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، القاموس المحیط (٣٧١/٣) المعجم الوسیط (ص:١٩٤) کتاب الآثار مترجم (ص٣٧٩)، مطبوعہ ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی کراچی، شرح السنۃ للبغوی (١٠١/٩)، التلخیص الحبیر (١٧١/٣)، تحفۃ الاحوذی (١٨٥/٢) وغیرھا کتب لغات اور شروحات حدیث میں موجود ہے۔ لیکن مقلدین نے اس حلالہ جیسے مکروہ فعل کو جائز و روا رکھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی اس مبارک حدیث کی یوں تاویل فاسد کی:

" وَاِنْ كَانَ بِشَرْطِ التَّحْلِيْلِ فَيُحْمَلُ اَنَّهُ اَرَادَ بِاللَّعْنِ الرَّحْمَةَ " [كنزالدقائق كى شرح مستخلص الحقائق (ص ١٢٦)]

''اگر یہ حدیث نکاح بشرط تحلیل کے متعلق ہے تو اس میں اس معنی کا احتمال ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے لعنت سے مراد رحمت لی ہے۔''

مقلدین نے رسول اللہ ﷺ کی واضح حدیث کو اپنی مرضی ومنشا کے خلاف پا کر لعنت کو رحمت سے بدل دیا، یعنی حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ حلالہ کرنے والا اور کروانے والا لعنت کے بجائے رحمت کے مستحق ہیں، اور اس رحمت کے حصول کی خاطر آج مفتیان شرع متین نے اپنے اپنے دارالافتاء میں جہاں حلالہ کے جواز کا فتویٰ دینا شروع کیا ہوا ہے وہاں ساتھ ہی حلالہ کا بندوبست بھی کر رکھا ہے۔ اللہ شاہد ہے ہمارے پاس ان علمائے سو کے ستائے ہوئے کئی ایسے افراد آئے جنھیں باقاعدہ حلالہ کا مشورہ دیا گیا اور کہا گیا کہ تم اپنی بیوی کو لے آؤ ہمارے مدرسہ میں حلالہ کے لیے قاری صاحب موجود ہیں۔ بہر کیف مقلدین نے کتاب وسنت کی نصوص کو بالائے طاق رکھ کر اپنی آراء واہواء کی پوجا کی اور رسول مکرم ﷺ کے واضح فرامین کو تاویلات رکیکہ اور آرائے فاسدہ کے ذریعے پس پشت ڈال دیا اور دشمنان اسلام کو اہل اسلام کی تضحیک وتمسخر کا موقع فراہم کیا

روؤں دل کو کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

بہر کیف ہم نے اپنے فتاویٰ میں خالص کتاب وسنت کی تعلیمات کو فروغ دیا اور لوگوں کے ارسال کردہ سوالات کو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ وحسنہ کی روشنی میں حل کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جماعۃ الدعوۃ سے منسلک وغیر منسلک افراد نے ملک کے طول وعرض سے بے شمار خطوط اپنے مسائل کے حل کے لیے ارسال کیے اور ان خطوط کی اتنی کثرت ہے کہ راقم ان سب کا جواب دینا تو درکنار ان کا مطالعہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس وقت ہمارے دارالافتاء میں دو بوریوں کے لگ بھگ خطوط موجود ہیں۔ جہاں یہ خطوط جماعۃ الدعوۃ کی ملک میں مقبولیت پر دلالت کرتے ہیں وہاں اس حقیقت کی نقاب کشائی بھی کرتے ہیں کہ عوام میں صحیح اور خالص دین کے حصول کی تڑپ موجود ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بے دلائل فتاویٰ سے اکتا چکے ہیں اور اپنے مسائل کے حل کے لیے قرآن حکیم اور صحیح احادیث کے طالب ہیں۔

ہم اللہ کے فضل وکرم سے مسائل لکھتے ہوئے پوری احتیاط سے کام لیتے ہیں اور روایات کی اچھے طریقے سے جانچ پڑتال کر کے پھر انھیں اپنے فتاویٰ میں جگہ دیتے ہیں اور جن روایات کا ضعف معلوم ہو جائے انھیں معرض استدلال میں پیش نہیں کرتے کیونکہ ہمارے نزدیک ضعیف روایات احکامات شرعیہ میں حجت اور دلیل نہیں بن سکتیں۔

بعض حضرات فتویٰ دیتے وقت دقیق عبارات اور مفتیانہ زبان استعمال کرتے ہیں جو اکثر قارئین کی سمجھ سے بالا ہوتی ہے۔ حالانکہ مقصود تو عوام الناس کو دین سمجھانا ہے۔ اس لیے جتنی سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی جائے گی عوام الناس کو اتنا ہی زیادہ فائدہ ہوگا۔ بہر کیف یہ کتاب ''احکام ومسائل'' کے عنوان سے آپ کے ہاتھوں میں ہے، اگر اس میں کوئی حسن اور خوبی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور انعام ہے اور اگر اس میں کوئی لغزش اور خطا ہے تو وہ راقم کا قصور فہم ہے، جس پر متنبہ کرنے والے اہل علم کا مشکور ہوں گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو مؤلف، رفقائے دارالاندلس اور عوام الناس کے لیے نجات کا ذریعہ بنائے۔ خصوصاً راقم کے دادا جان اور والد محترم رحمہ اللہ کے لیے اخروی کامیابی کا زینہ بنائے کیونکہ میرے ان بزرگوں نے مجھے دینی تعلیم کے

حصول کے لیے مواقع فراہم کیے، گھر میں بھی دینی ماحول دیا اور والد محترم رحمہ اللہ کی تو بہت زیادہ خواہش تھی کہ میں دین کا علم سیکھ کر اس کی اشاعت کا کام کروں اور اسی غرض سے انھوں نے مجھے محترم المقام امیر جماعۃ الدعوۃ حافظ محمد سعید اور محترم پروفیسر ظفر اقبال حفظہ اللہ کے حوالے کیا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جماعۃ الدعوۃ کے قائدین میں اخلاص واستقامت عطا کیے رکھے اور ہمیں دن رات دین حنیف کے لیے مخلص ہو کر کام کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

ابوالحسن مبشر احمد ربانی عفا اللہ عنہ

عقائد کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

کیا انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے؟

سوال کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے؟

جواب خلیفہ عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ "فعیلة" کے وزن پر ہے، جب ایک کے بعد دوسرا اس کے قائم قام ہو تو عرب کہتے ہیں "خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا" فلاں شخص فلاں کا خلیفہ و نائب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَ إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً ﴾ (البقرة: ٣٠)

''اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: ''میں بلاشبہ زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

اس سے مراد پوری ذریت آدم ہے یعنی ایسی قوم پیدا کرنے والا ہوں جو ایک دوسرے کے جانشین ہوں گے نہ کہ اللہ کے جانشین ہوں گے (معاذ اللہ) امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" أَيْ قَوْمًا يَخْلُفُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا قَرْنًا بَعْدَ قَرْنٍ وَ جِيْلًا بَعْدَ جِيْلٍ "

''خلیفہ سے مراد یہ ہے کہ ان کے یکے بعد دیگرے بعض کے بعض جانشین ہوں گے اور ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں یونہی صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔''

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَ إِنَّهُ لَغَفُوْرٌ رَحِيْمٌ ﴾ [الانعام: ١٦٥]

''اللہ کی ہستی تو وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنایا اور بعض کے بعض پر درجات بلند کیے تا کہ جو کچھ اس نے تمھیں دے رکھا ہے اس میں تمھیں آزمائش کرے۔ یقیناً آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ءَ إِلٰهٌ مَعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [النمل: ٦٢]

''کون ہے وہ جو بے قرار شخص کی دعا کو قبول کرے جب وہ بے قرار اس سے فریاد کرے اور اس کی مصیبت کو ٹال

دے اور کون ہے جو زمین میں تمھیں خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ تم لوگ غور وفکر بہت کم کرتے ہو۔''

ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ﴾ [زخرف : ٦٠]

''قریب ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کرے اور تمھیں زمین میں جانشین بنادے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔''

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَ إِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ » [صحيح مسلم، كتاب الرقاق: باب اكثر أهل الجنة الفقراء (٢٧٤٢)، مسنداحمد(٢٢/٣)]

''بے شک دنیا میٹھا سبزہ ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں اس دنیا میں خلیفہ بنانے والا ہے تاکہ وہ دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔''

اس حدیث کی شرح میں شیخ مسلم بن محمود السلفی فرماتے ہیں:

" اَیْ جَاعِلُكُمْ خُلَفَاءَ مِنَ الْقُرُوْنِ الَّذِيْنَ قَبْلَكُمْ فَيَنْظُرَ هَلْ تَعْلَمُوْنَ بِطَاعَةِ اَمْ بِمَعْصِيَةِ وَشَهَوَاتِكُمْ " [تعليق على صحيح مسلم (٥٠١/٤)]

''یعنی وہ تمھیں پہلے لوگوں کے خلیفے بنانے والا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ تم اس کی اطاعت کرتے ہو یا اس کی نافرمانی اور اپنی خواہشات پر عمل کرتے ہو۔''

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ﴿ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾ میں خاص آدم علیہ السلام مراد نہیں ہیں بلکہ ان کی تمام اولاد مراد ہے، جنھیں اللہ تعالیٰ یکے بعد دیگرے اس زمین پر حکومت و خلافت عطا کرتا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَالظَّاهِرُ لَمْ يُرِدْ آدَمَ عَيْنًا اِذْ لَوْ كَذٰلِكَ لِمَا حَسُنَ قَوْلُ الْمَلَائِكَةِ ﴿ اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ﴾ فَاِنَّهُمْ اَرَادُوْا اَنَّ مِنْ هٰذَا الْجِنْسِ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ " (المصباح المنير فی تهذيب تفسير ابن كثير (ص/٤٩)

''ظاہر بات ہے کہ صرف آدم علیہ السلام کی ذات یہاں مراد نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو فرشتوں کا یہ قول بہتر نہیں تھا۔ ''تو زمین میں ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد اور خون ریزی کرے گا۔'' فرشتوں نے اس بات کا ارادہ کیا تھا کہ جنس آدم میں سے ایسے لوگ ہیں جو فساد اور خونریزی کریں گے۔''

علامہ ابوحفص عمر بن علی المعروف ابن عادل الدمشقی فرماتے ہیں:

''مفسرین نے اس بات میں دو وجہوں پر اختلاف کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو خلیفہ کیوں کہا گیا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی گئی ہے کہ جب اللہ نے زمین سے جنوں کو نکالا اور آدم علیہ السلام کو آباد کیا تو آدم علیہ السلام ان جنوں کے خلیفہ ہو گئے جو پہلے ہو گزرے، اس لیے کہ آدم علیہ السلام ان کے بعد میں آئے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خلیفہ اس لیے قرار دیا:

" لِاَنَّهُ يُخلِفُ اللّٰهَ فِي الْحُكْمِ بَيْنَ خَلْقِهِ وَيُرْوَى عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَابْنِ عَبَّاسٍ وَالسُّدِّي وَهٰذَا الرَّأْيُ مُتَاكِّدٌ بِقَوْلِهِ تَعَالٰى : ﴿ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾(ص/٢٦)

''وہ اللہ کی مخلوق کے درمیان اللہ کا حکم نافذ کرے گا اور یہ بات عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور مفسر سدی سے روایت کی گئی ہے اور یہ رائے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مؤکد ہوتی ہے:

''بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے آپ لوگوں کے درمیان حق سے فیصلہ کریں گے۔'' [اللباب في علوم الكتاب ١/٥٠١، ٥٠٠]

مفسرین کی ان توجیہات سے معلوم ہوا کہ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب نہیں ہے۔ اسے خلیفہ یا تو اس لیے کہا گیا کہ یکے بعد دیگرے بعض افراد بعض کے جانشین ہیں اور ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں یہ سلسلہ جاری و ساری ہے یا پھر اس لیے کہ انسان اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون لوگوں کے درمیان نافذ کرتا ہے اور اسے عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ ﴿اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''خلیفہ سے مراد ایسی قوم ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی اور یہ کہنا کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور نائب ہے، غلط ہے۔'' [تفسير احسن الكلام (ص/١٧)]

بعض علماء نے جو انسان کو اللہ کا نائب و خلیفہ قرار دیا ہے تو اس سے مراد اللہ کے احکامات کا نفاذ کرنے والا ہے۔

مولانا عبدالرحمان کیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یہاں علی الاطلاق خلیفہ (نائب، قائم مقام) کا لفظ استعمال ہوا ہے، صراحتاً یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ آدم اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے یا کسی دوسری مخلوق کا۔ بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ خلیفہ چونکہ وہ شخص ہوتا ہے جو کسی کے مرنے یا عدم موجودگی کی صورت میں اس کے اختیارات سنبھالتا ہے اور اللہ تو "حی لایموت" اور ہمہ وقت حاضر ہے، لہٰذا آدم اللہ کے خلیفہ نہیں تھے بلکہ جنوں کے خلیفہ تھے۔ پھر ایک ایسی روایت بھی ملتی ہے کہ انسان کی پیدائش سے پیشتر اس زمین پر جن آباد تھے جو فتنہ و فساد اور قتل و غارت کرتے رہتے تھے تو اللہ نے فرشتوں کا لشکر بھیج کر ان جنوں کو سمندروں کی طرف دھکیل دیا اور آدم علیہ السلام ان کے خلیفہ ہوئے اور بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ خلافت یا نیابت کے لیے موت یا عدم موجودگی ضروری نہیں، بلکہ کوئی با اختیار ہستی اپنی موجودگی میں بھی کسی کو کچھ اختیارات تفویض کر کے اسے

اپنا خلیفہ یا نائب بنا سکتی ہے کہ وہ اس کی منشا کے مطابق ان اختیارات کو استعمال کرے۔ ہمارے خیال میں دوسری رائے راجح ہے کیونکہ اس کی تائید ایک آیت سے بھی ہو جاتی ہے اور دنیا میں موجود سفارتی نظام سے بھی محولہ آیت کا ترجمہ یوں ہے: ''ہم نے امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی اور انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس بار عظیم کے اٹھانے سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا کیونکہ انسان تو انہی جیسا ظالم اور نادان واقع ہوا ہے۔'' (الاحزاب: ۷۲) اور تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں امانت سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے فرائض واحکام کی تعمیل اور ان کے نفاذ کا بار ہے اور اس کا دوسرا نظام نظام خلافت ہے۔'' [تیسیر القرآن (۳۸۹/۱)]

مفسرین کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ انسان کے خلیفہ ہونے کا یا تو یہ مفہوم ہے کہ یہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل، اطاعت وفرماں برداری اور شرعی قواعد وضوابط کا نفاذ کرتا ہے یا پھر یہ ایک دوسرے کے بعد اس زمین پر وارد ہوتے ہیں اور صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے اور تاقیام قیامت جاری رہے گا۔ جیسا کہ امام ابن کثیر کے حوالے سے اور کئی ایک آیات قرآنیہ کے حوالے سے اوپر گزر چکا ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص انسان کو اللہ کا نائب یا خلیفہ اس معنوں میں لے کہ اللہ تعالیٰ کے کام انسان کرتا ہے اور اس کے افعال میں نائب ہے تو یہ معنی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ صحیح فہم نصیب فرمائے اور سلف صالحین کے منہج پر قائم ودائم رکھے۔ (آمین!)

ایک من گھڑت روایت کی تحقیق

(سوال) بعض صوفیا یہ حدیث ذکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا '' كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا لَا أُعْرَفُ فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ خَلْقًا فَعَرَّفْتُهُمْ بِيْ فَعَرَفُوْنِيْ '' ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، پہچانا نہیں جاتا تھا۔ میں نے پسند کیا کہ پہچانا جاؤں، سو میں نے مخلوق پیدا کی، میں نے انھیں اپنا تعارف کروایا تو انھوں نے مجھے پہچان لیا۔'' کیا یہ روایت صحیح ہے؟

(جواب) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ يَّقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ » [بخاری، کتاب العلم : باب إثم من كذب على النبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (۱۰۷)]

''جس نے مجھ پر ایسی بات کہی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنالے۔''

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بعض لوگوں نے روایتیں گھڑ کر جرم عظیم کا ارتکاب کیا اور روایات وضع کرنے والے مختلف اقسام اور مختلف اغراض پر مبنی لوگ ہیں ان میں سے بعض نام نہاد صوفی منش لوگ بھی ہیں اور یہ روایت بھی انھیں متصوفین کا شاخسانہ ہے۔ اس کے بارے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

'' لَيْسَ مِنْ كَلَامِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا يُعْرَفُ لَهٗ سَنَدٌ صَحِيْحٌ وَلَا ضَعِيْفٌ ''
[مجموع الفتاوی (۱۲۲/۱۸، ۳۷۶)]

''یہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں سے نہیں ہے اور اس کی صحیح یا ضعیف کوئی سند معروف نہیں۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اس قول کی متابعت امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بدر الدین الزرکشی نے ''التذکرۃ فی الاحادیث المشتہرۃ(۱۳۶) الباب الثالث فی الزھد ' الحدیث العشرون میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ نے کی ہے

دیکھیں! المقاصد الحسنۃ للسخاوی (۸۳۸) (۳۲۷)، کشف الخفاء ومزیل الالباس از اسماعیل العجلونی (۲۰۱۶) (۱۳۲/۲)، الاسرار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ از ملاعلی قاری (۳۵۳)، احادیث القصاص (۳)، اسنیٰ المطالب (۱۱۱۰)، تمییز الطیب من الخبیث (۱۰۴۵)، الدرر المنتثرۃ (۳۳۰)، تذکرۃ الموضوعات]

معلوم ہوا کہ یہ روایت من گھڑت ہے اور متصوفین کی وضع کردہ معلوم ہوتی ہے۔ ملاعلی قاری نے اس کے مفہوم کو صحیح قرار دینے کی کوشش کی ہے اور سورۂ ذاریات کی آیت (۵۶) ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ﴾ میں لِیَعْبُدُوْنَ کا معنی لِیَعْرِفُوْنَ کیا ہے کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ مجھے پہچان لیں اور اس تفسیر کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے (الاسرار المرفوعۃ (۲۶۹) تحت رقم (۳۵۳)

ملاعلی قاری کا قول درست نہیں ہے۔ اس قول کی نسبت جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف کی گئی ہے اس کی پختہ سند کی حاجت ہے۔ پھر قرآن وسنت میں جو صفات باری تعالیٰ ہم پڑھتے ہیں یہ روایت اس کے معارض ہے، اللہ عزوجل مجہول خزانہ کیسے ہو سکتے ہیں: وہ عزت وجلال والا کیسے نہ پہچانا جائے۔

ایسی روایات وضع کر کے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے اجزائے خاملہ اور اقوال سخیفہ سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرنے کے متعلق حدیث کی توثیق

سوال اللہ ہی سے مانگنے کے متعلق حدیث کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس کی استنادی حیثیت معتبر نہیں۔ مہربانی فرما کر درست موقف کی رہنمائی فرمادیں۔

جواب سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« یَسْئَلُ اَحَدُکُمْ رَبَّہٗ حَاجَتَہٗ کُلَّھَا حَتّٰی یَسْأَلُہٗ شِسْعَ نَعْلِہٖ اِذَا انْقَطَعَ »[شعب الإیمان للبیھقی (۴۱/۲) (۱۱۱۶) مجمع الزوائد (۲۲۸/۱۰)، صحیح ابن حبان (۲۴۰۲)، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی(۳۵۴)، الکامل لابن عدی(۲۰۷/۶)، مسند بزار (۳۱۳۵) ، مسند ابی یعلی(۱۳۰/۶)]

''تم میں سے ہر کوئی اپنی حاجات اپنے رب سے مانگے حتیٰ کہ جب جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اس سے مانگے۔''

اس حدیث کے موصول ومرسل ہونے میں اختلاف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا یہ حدیث غریب ہے، اس کو جعفر بن سلیمان از ثابت البنانی از نبی ﷺ بہت سے راویوں نے روایت کیا ہے، انھوں نے ثابت البنانی اور نبی ﷺ کے درمیان

انس رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں کیا۔ یعنی امام ترمذی رحمہ اللہ نے ایک تو جعفر بن سلیمان کے تفرد کی وجہ سے اسے غریب کہا ہے اور دوسرے جعفر بن سلیمان کے اکثر شاگردوں نے اسے مرسل بیان کیا ہے، موصول بیان نہیں کیا۔ اس کے جوابات درج ذیل ہیں:

① جعفر بن سلیمان کا تفرد مضر نہیں اس لیے کہ یہ مسلم کے راویوں سے ہے۔ اسے امام احمد، امام یحییٰ بن معین، امام علی بن المدینی، امام ابن حبان، امام ابو احمد اور ابن سعد وغیرہم نے ثقہ قرار دیا ہے۔[تهذيب التهذيب (٣٨٠/١)، تقريب التهذيب (ص/٥٦)، الكاشف(٢٩٤/١)، تهذيب سير أعلام النبلاء (٤٨٥/١)، الجرح والتعديل (٤٨١/٢)]

② جعفر بن سلیمان سے قطن بن نسیر ہی نے اسے موصول بیان نہیں کیا بلکہ مسند بزار میں سیار بن حاتم نے اسے موصول بیان کرنے میں قطن کی متابعت کی ہے۔ سیار بن حاتم کو علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں ثقہ قرار دیا ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ صالح ہے اور صالح الحدیث ہے، اس میں کچھ کمی ہے۔ کسی نے اسے ضعیف قرار نہیں دیا۔'' لیکن ازدی نے کہا: ''اس کے پاس منکر روایات ہیں۔'' [المغنى فى الضعفاء(٤٥٩/١)]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: ''یہ صدوق ہے۔'' [الكاشف(٤٧٥/١)]

امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اسے اپنی کتاب ''الثقات'' میں ذکر کیا ہے۔[كتاب الثقات(٢٩٨/٨)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صدوق ہے اور خطا کر جاتا ہے۔''[تقريب التهذيب(ص/٢٨٢)]

لہٰذا قطن بن نسیر حسن الحدیث ہے اور سیار بن حاتم ثقہ راوی نے اسے موصول بیان کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ حدیث صحیح ہے۔ محدثین کا قاعدہ ہے کہ جب موصول و مرسل میں جھگڑا ہو جائے تو حکم موصول ہی کا ہوتا ہے خواہ موصول بیان کرنے والے تعداد میں تھوڑے ہی ہوں۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یقیناً صحیح بلکہ درست بات وہی ہے کہ جس پر فقہائے اصولین اور محققین محدثین ہیں کہ جب ایک حدیث مرفوع اور موقوف یا موصول اور مرسل روایت کی گئی ہو تو حکم مرفوع اور موصول کا لگایا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ ثقہ راوی کی زیادتی ہے۔'' [شرح مسلم للنووی(٢٥٦/١)]

امام نووی رحمہ اللہ کے اس اصولی قاعدے سے معلوم ہوا کہ جعفر بن سلیمان کے تلامذہ میں سے قطن بن نسیر اور سیار بن حاتم نے اس حدیث کو موصول بیان کیا ہے۔ باقی تلامذہ اسے مرسل بیان کرتے ہیں تو اس حدیث پر مرسل کا نہیں بلکہ موصول کا حکم لگے گا۔ لہٰذا یہ حدیث صحیح ہے، اس پر کوئی غبار نہیں جب کہ اس کی تائید میں ایک اثر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے:

«عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَتْ سَلُوا اللّٰهَ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى الشِّسْعَ فَإِنَّ اللّٰهَ إِنْ لَمْ يُيَسِّرْهُ لَمْ يَتَيَسَّرْ»[مسند ابى يعلى(٤٥٦٠)، المطالب العالية(٢٣٢/٣)، عمل اليوم والليلة لابن السنى(ص/١٢٨)، شعب الإيمان للبيهقى(٤٢/٢)، (١١١٩)، مجمع الزوائد(٢٢٩/١٠)]

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگو حتیٰ کہ جوتی کا تسمہ بھی، بیشک اللہ تعالیٰ اگر اس کو آسان نہ کرے تو وہ آسان نہیں ہوتا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی تمام تر ضروریات میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے دست بدعا ہو اور صرف اسی سے سوال کرے۔

عبدالنبی اور عبدالرسول نام رکھنا

(سوال) سورۂ نور (۳۲) میں ہے: ﴿ وَاَنْكِحُوا الْأَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ ﴾ اور سورۂ زمر (۵۳) میں ہے: ﴿ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾ ان دونوں آیات میں عباد کا لفظ غلام اور خادم کے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ عبادت گزار کے معنوں میں، لہٰذا ان آیات کی روشنی میں عبدالمصطفیٰ، عبدالرسول یا عبدالنبی وغیرہ نام رکھنے میں کیا مضائقہ ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

(جواب) لفظ عبد ایک مشترک لفظ ہے جس کے معنی عابد یعنی عبادت گزار کے بھی آتے ہیں اور خادم و غلام کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ جب عبد کی اضافت و نسبت غیر اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس کا مطلب خادم اور غلام ہی ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ نور میں عباد کی نسبت ''کم'' ضمیر کی طرف ہے۔ لیکن نام اور تسمیہ کے محل پر عموماً یہ لفظ عبادت کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اس لیے ایسے مواقع پر اس کا استعمال درست نہیں کیونکہ اس میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ کئی ایک ایسی احادیث صحیحہ ہیں جن میں اسماء کے تعین کے وقت عبد کی اضافت اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَحَبُّ الْاَسْمَاءِ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ عَبْدُ اللّٰهِ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ » [ابن ماجه ، كتاب الادب ، باب ما يستحب من الاسماء (٣٧٢٨) ، مسلم (٢١٣٢)]

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔''

ان دونوں ناموں میں لفظ عبد کی اضافت بالترتیب لفظ اللہ اور الرحمٰن کی طرف ہے اور یہ دونوں باری تعالیٰ کے نام ہیں۔ وہ اسماء جن میں عبد کی اضافت غیر اللہ کی جانب تھی، رسول اللہ ﷺ نے ان کو بدل ڈالا تھا جیسا کہ امام ابن عبد البر الاستیعاب میں لکھتے ہیں:

'' عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اَبِيْ قُحَافَةَ اَبُوْ بَكْرِ نِ الصِّدِّيْقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ كَانَ اسْمُهٗ فِي الْجَاهِلِيَّةِ عَبْدَ الْكَعْبَةِ فَسَمَّاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَبْدَ اللّٰهِ '' [الاستيعاب برهامش الاصابة (٢٣٤/٢)]

''سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام دور جاہلیت میں عبد الکعبہ تھا پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔''

اسی طرح سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف کا نام زمانہ جاہلیت میں عبد عمرو تھا۔ بعض نے کہا عبد الکعبہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام عبدالرحمٰن رکھ دیا۔ [الاستيعاب (٣٨٧/٢)]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کا نام دور جاہلیت میں عبد شمس تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے بدل کر عبد الرحمٰن رکھ دیا۔ [الاصابه (٤/ ٢٠٠)، الاستيعاب (٤/ ٢٠٠-٢٠٧)]

ابن ابی شیبہ میں حدیث ہے شریح بن ہانی بیان کرتے ہیں:

« وَفَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِي قَوْمِهِ فَسَمِعَهُمْ يُسَمُّوْنَ رَجُلاً عَبْدَ الْحَجَرِ فَقَالَ لَهُ مَا اسْمُكَ فَقَالَ عَبْدُ الْحَجَرِ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا أَنْتَ عَبْدُ اللّٰهِ » [ابن ابى شيبة ، كتاب الادب ، بابتفسيرالاسماء (٢٥٨٩٢)]

''ایک وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ نے سنا کہ یہ لوگ ایک شخص کو عبدالحجر کے نام سے پکار رہے تھے تو آپ ﷺ نے اس شخص سے پوچھا: ''تیرا کیا نام ہے؟'' اس نے کہا: ''عبد الحجر۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''(آج سے) تیرا نام عبداللہ ہے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ وَ عَبْدُ الْقَطِيْفَةِ » [ابن ماجه، كتاب الزهد ، باب فى المكثرين (٤١٣٥) ، بخارى، كتاب الجهاد والسير ، باب الحراسة فى الغزو فى سبيل الله (٢٨٨٦)]

''درہم و دینار اور چادر کا بندہ تباہ ہو گیا۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عبد کی اضافت اسماء میں جب غیر اللہ کی طرف ہوتی ہے تو یہ لفظ عبادت کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایسے ناموں کو بدل دیا تھا کیونکہ یہ شرکیہ نام ہیں۔ اگر انھیں شرکیہ نہ سمجھا جائے تو پھر ان میں شرک کی بو ضرور موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَ مِنْهَا أَنَّهُمْ كَانُوْا يُسَمُّوْنَ أَبْنَاءَ هُمْ عَبْدَ الْعُزّٰى وَ عَبْدَ شَمْسٍ وَ نَحْوَ ذٰلِكَ...... وَ قَدْ ثَبَتَ فِيْ أَحَادِيْثَ لَا تُحْصٰى أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ غَيَّرَ أَسْمَاءَ الصَّحَابَةِ عَبْدَ الْعُزّٰى وَ عَبْدَ شَمْسٍ وَ نَحْوِهِمَا إِلٰى عَبْدِ اللّٰهِ وَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ وَ مَا أَشْبَهَهُمَا فَهٰذِهِ أَتْبَاحُ وَ قَوَالِبُ لِلشِّرْكِ نَهَى الشَّارِعُ عَنْهَا لِكَوْنِهَا قَوَالِبَ لَهُ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ " [حجة الله البالغة، باب اقسام شرك (١/ ٦٣)]

''مشرک کی شرک کی اقسام میں سے ایک یہ تھی کہ لوگ اپنی اولاد کے نام عبد العزیٰ اور عبد شمس وغیرہ رکھتے تھے اور بے شمار احادیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کے ناموں کو عبد العزیٰ اور عبد شمس سے بدل کر عبداللہ اور عبد الرحمٰن وغیرہ رکھا۔ یہ شرک کے دروازے اور سانچے ہیں۔ شرع میں ان ناموں سے اسی لیے منع کیا گیا ہے کہ یہ شرک کے سانچے ہیں۔ واللہ اعلم۔''

اسی طرح حنفی علمائے کرام میں سے ملا علی قاری مشکوٰۃ کی شرح مرقاۃ میں رقمطراز ہیں:

" وَ لَا يَجُوْزُ عَبْدُ الْحَارِثِ وَ لَا عَبْدُ النَّبِيِّ وَ لَا عِبْرَةَ بِمَا شَاعَ فِيْمَا بَيْنَ النَّاسِ " [مرقاة شرح

مشکوٰۃ (۵۱۳/۸)، تحت جدید رقم(۴۷۵۲)]

''عبدالحارث اور عبدالنبی وغیرہ نام رکھنا جائز نہیں اور لوگوں میں جو یہ نام رائج ہیں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔''

ملا علی قاری کی اس تصریح میں یہ بات عیاں ہوگئی کہ عبدالحارث اور عبدالنبی وغیرہ نام رکھنے جائز نہیں۔ بعض حضرات کا اس آیت ﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ اسْرَفُوا عَلَى اَنْفُسِهِمْ﴾ سے یہ استدلال کرنا کہ نبی ﷺ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کہیں کہ ''اے میرے بندو!'' یہ استدلال سراسر باطل ہے اور قرآن حکیم کے خلاف ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴾

[آل عمران:۷۹]

''کسی انسان کے یہ لائق نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔''

اس آیت کریمہ میں صاف فرمایا ہے کہ نبی ﷺ کے لائق نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے عبد بن جاؤ۔ اس بات کی مزید تائید رسول اللہ ﷺ کی اس بات سے ہوتی ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَقُوْلَنَّ أَحَدُكُمْ عَبْدِيْ وَ اَمَتِيْ كُلُّكُمْ عَبِيْدُ اللّٰهِ وَ كُلُّ نِسَائِكُمْ إِمَاءُ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ لِيَقُلْ غُلَامِيْ وَ جَارِيَتِيْ وَ فَتَايَ وَ فَتَاتِيْ وَ لَا يَقُلِ الْعَبْدُ رَبِّيْ وَ لٰكِنْ لِيَقُلْ سَيِّدِيْ » [مسلم، كتاب الالفاظ من الادب وغيرها، باب حكم اطلاق لفظة العبد والامة والمولىٰ والسيد (۲۲۴۹)]

''ہرگز تم میں کوئی شخص نہ کہے میرا بندہ اور میری لونڈی۔ سب مرد تمھارے اللہ کے بندے اور تمھاری سب عورتیں اللہ کی لونڈیاں ہیں بلکہ یوں کہے کہ میرا غلام اور میری لڑکی، میرا خادم اور میری خادمہ اور غلام مالک کو ''ربی'' (میرا رب) نہ کہے بلکہ مالک کو ''سیدی'' کہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی فرد کو اس بات کی اجازت نہیں کہ کسی دوسرے شخص کو ''عبدی'' (میرا بندہ) کہے اور جس کام سے خود رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہو، کیا اس کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ عبد کا لفظ غلام و خادم کے معنوں میں مستعمل ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے: « لَايَقُلِ الْعَبْدُ رَبِّيْ » لیکن پھر بھی کسی کو اجازت نہیں دی کہ وہ عبدی کہے کہ کسی فرد کی نسبت عبودیت میں اپنی طرف کرے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت درست ہے۔ غیر اللہ کی طرف اس کی اضافت کر کے اسماء رکھنا جائز نہیں، یہ کم از کم شرک کی بو سے خالی نہیں۔

﴿ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ ﴾ میں لفظ ﴿ قُلْ ﴾ یعنی ''آپ ﷺ کہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ آگے جو ﴿ يَا عِبَادِيْ ﴾ ہے اس کی نسبت فرمان خداوندی کی طرف ہے نہ کہ یہ مطلب کہ آپ ﷺ بندوں کی اضافت اپنی طرف کر رہے ہیں۔ اس کی ممانعت سورۂ آل عمران کی آیت (۷۹) جو اوپر مذکور ہوئی ہے اس میں بھی ہے اور آپ ﷺ کی مذکورہ حدیث میں بھی اور

مزاج قرآن کے بھی خلاف ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ جو ساری زندگی غیر اللہ کی عبودیت سے منع کرتے رہے اور عبد العزیٰ و عبد الشمس جیسے اسماء کو بدلتے رہے تو کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ عباد کی اضافت اپنی طرف کر کے عبد النبی یا عبد المصطفیٰ کہتے۔

اور سورۂ نور کی آیت (۳۲) میں عِبَادِکُمْ سے مراد خادم ہی ہے جیسا کہ لفظ ''اماء'' کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور اس کی توضیح مذکورہ حدیث ہی میں ہو جاتی ہے جس میں خادم کو عبد کہا گیا ہے لیکن اس کی اضافت اپنی طرف کر کے بلانے کی کسی کو اجازت نہیں دی گئی بلکہ « لَا يَقُولَنَّ اَحَدُكُمْ عَبْدِيْ » کہہ کر ممانعت کر دی ہے۔ لہٰذا عبد المصطفیٰ، عبد النبی، عبد الرسول وغیرہ نام رکھنا ناروا اور ناجائز ہیں، کسی طرح بھی درست نہیں۔

کیا اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے؟

سوال ہم نے سن رکھا تھا کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے مگر پھر کسی نے بتایا کہ یہ عقیدہ ٹھیک نہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں صحیح عقیدہ بتا دیں کہ اللہ کہاں ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کے متعلق محدثین و سلف صالحین کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ [طٰہٰ:٥]

''رحمٰن عرش پر مستوی ہوا۔''

مستوی ہونے کا مفہوم بلند ہونا اور مرتفع ہونا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ كِتَابًا...... فَهُوَ مَكْتُوْبٌ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ »[بخاری ، كتاب التوحيد : باب قول الله تعالىٰ : ﴿ بل هو قرآن مجيد ﴾ (٧٥٥٤)]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب لکھی ہے...... جو اس کے پاس عرش کے اوپر ہے۔''

لیکن اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے اسی طرح وہ عرش پر مستوی ہے، ہماری عقلیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے کیونکہ وہ مکان سے پاک اور مبرا ہے البتہ اس کا علم اور اس کی قدرت ہر چیز کو محیط ہے، اس کی معیت ہر کسی کو حاصل ہے جیسا کہ یہ بات عقائد کی کتب میں واضح طور پر موجود ہے۔

غیر اللہ کی قسم کھانا

سوال بعض لوگ اپنی گفتگو میں اولاد، اولیاء اور نیک بندوں کی قسم کھاتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب اسلامی تعلیمات میں غیر اللہ کی قسم کھانے سے روکا گیا ہے، نبی کریم ﷺ نے غیر اللہ کی قسم کو کفر و شرک قرار دیا ہے۔ سعد بن عبداللہ فرماتے ہیں: ''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی کو قسم کھاتے ہوئے سنا، اس نے کہا: ''کعبہ کی قسم! تو اسے ابن

عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا ہے:

« مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ أَشْرَكَ »[ابوداؤد، کتاب الایمان والنذور: باب کراهية الحلف بالآباء (٣٢٥١)، ترمذی (١٥٣٥)]

''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔''

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک قافلے میں باپ کی قسم کھاتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« اِنَّ اللّٰهَ يَنْهَاكُمْ اَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ فَمَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ أَوْ يَسْكُتْ »[ابوداؤد، کتاب الأیمان و النذور: باب كراهية الحلف بالآباء (٣٢٤٩)،بخاری (٦٦٤٨)، مسلم (١٦٤٦)]

''بیشک اللہ تمھیں تمھارے باپوں کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، جو شخص قسم کھانا چاہے اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔''

مذکورہ بالا احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی قسم کھانا حرام و شرک ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے، جو لوگ اپنی گفتگو میں دودھ پتر کی قسم، پیر کی قسم، مرشد کی قسم، سید کی قسم، ماں باپ کی قسم، محبت کی قسم وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں انھیں اپنے محبوب رسول ﷺ کی مذکورہ بالا احادیث پر سنجیدگی و متانت سے غور و خوض کرنا چاہیے اور نا جائز و حرام قسموں سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔

غیر اللہ سے مدد مانگنا

(سوال) غیر اللہ سے مدد مانگنا کیسا ہے؟ شریعت کی نظر میں اس کی قباحت کی صراحت فرما دیں۔

(جواب) اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ ایسی اشیاء کے حصول کیلئے جو مخلوق کے اختیار میں نہیں ہیں، مخلوق میں سے کسی فرد کو پکارنا شرک ہے اور پھر مردہ کو جو نہ سن سکتا ہے اور نہ جواب دے سکتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَ لَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾

[یونس:١٠٦]

''اور اللہ کے سوا کسی کو مت پکارو جو نہ تجھے نفع دے سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر تو نے یہ کام کیا تو ظالموں میں شمار ہوگا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا ہے کہ کوئی غیر اللہ کو اپنی حاجت روائی یا مشکل کشائی کے لیے پکارے اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اللہ کے سوا نہ کوئی کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ﴾ [یونس:١٠٧]

''اگر اللہ تعالیٰ تجھ کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دے تو اس مصیبت کو دور کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔''

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

« وَ اعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ »

[ترمذی، کتاب صفة القيامة : باب منه (٢٥١٦)]

''جان لو! اگر ساری امت تجھے نفع پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو نفع نہیں پہنچا سکتی مگر وہ جو اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے۔''

قرآن کریم میں ایک مقام پر ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَ اعْبُدُوْهُ ﴾

[العنكبوت :١٧]

''بے شک جن لوگوں کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، وہ تمھارے لیے رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ پس تم اللہ تعالیٰ کے ہاں سے رزق مانگو اور اس کی عبادت کرو۔''

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾

[الأحقاف: ٥،٦]

''اور ایسے لوگوں سے زیادہ کون گمراہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا ایسے لوگوں کو پکارتے ہیں جو قیامت تک ان کی دعا قبول نہ کر سکیں بلکہ ان کی آواز سے بھی بے خبر ہوں اور جب سب لوگ جمع کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادات سے انکار کر دیں گے۔''

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ غیر اللہ کو حاجت روائی کے لیے پکارنا ان کی عبادت ہے حالانکہ انسان صرف اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ ﴾ [النمل:٦٢]

''مجبور و بے بس شخص کی دعا کو قبول کرنے والا اور مشکل کو حل کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے؟''

یہ چند دلائل ہیں ورنہ اس کے بیان کے لیے قرآن و سنت میں کئی ایک نصوص موجود ہیں جن کو پڑھ کر کوئی بھی ذی شعور اور صاحب عقل اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا نہیں سمجھ سکتا۔ یہ تو ایسی کھلی حقیقت ہے کہ مشرکین مکہ بھی اس کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراف کا ذکر کیا ہے۔ اگر کسی بزرگ کی قبر پر جا کر حاجت روائی کے لیے پکارنا درست ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ سے بڑا بزرگ دنیا میں کون ہو سکتا ہے؟ لیکن حالت یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی امام الانبیاء ﷺ کی قبر پر جا کر انھیں کسی حاجت کے لیے کبھی نہیں پکارا۔ اگر یہ کام جائز ہوتا تو صحابہ خصوصاً خلفائے راشدین کو اپنے دور میں بڑی بڑی ضرورتوں اور مصائب کا سامنا تھا، وہ ضرور اللہ کے

رسول ﷺ کی قبر پر آتے۔ بالکل اسی طرح دعا کا مسئلہ ہے۔ ان جلیل القدر صحابہ میں سے کسی نے بھی اللہ کے رسول ﷺ کی قبر پر آکر یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے لیے دعا کر دیں۔ ہاں! زندگی میں جو واقعتاً بزرگ ہو اس سے دعا کروانا درست ہے اور اس میں بھی بزرگ سے نہیں مانگا جاتا بلکہ اس سے عرض کی جاتی ہے کہ وہ اللہ سے ہماری بہتری کے لیے دعا کرے۔

میرے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہیں، روایت کی وضاحت

سوال آج کل مختلف مقامات پر سٹیکرز لگے نظر آرہے ہیں جن پر لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میرے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہیں۔'' وضاحت کریں کہ یہ کون سی روایت ہے اور اگر ہے تو کس موقع پر کہا گیا؟

جواب قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات کئی جگہ سمجھائی کہ ہمیں اللہ ہی کافی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴾

[توبة: ١٢٩]

''اگر یہ سب لوگ منہ موڑ جائیں تو آپ کہہ دیں کہ مجھے اللہ کافی ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں نے اس پر توکل کیا اور وہ عرش عظیم کا رب ہے۔''

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾ [الطلاق:٣]

''جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اسے کافی ہو جاتا ہے۔''

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ﴾ [الزمر: ٣٦]

''کیا اللہ اپنے بندوں کو کافی نہیں۔''

الغرض اللہ تعالیٰ پر ایمان، توکل، اسے اپنے تمام امور میں کافی سمجھنا اسلامی عقیدہ ہے، بعض لوگ اس سے منحرف ہو جاتے ہیں اور قرآن وحدیث کے دلائل میں تحریف کا ارتکاب کرتے ہیں، جس کی ایک مثال یہ ہے جس کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے۔ اصل روایت یہ ہے:

''عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا، اس دوران میرے پاس کچھ مال آگیا، میں نے سوچا کہ آج کے دن میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اگر سبقت لے لی تو سبقت لے سکتا ہوں۔ کہتے ہیں میں اپنا آدھا مال لے کر آگیا تو رسول اللہ ﷺ نے کہا ''تو نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا باقی رکھا؟'' میں نے کہا اسی کی مثل اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جو کچھ تھا وہ لے آئے۔ آپ ﷺ نے کہا: ''اے ابوبکر! تم نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا باقی

رکھا؟'' تو انھوں نے کہا:

«أَبْقَيْتُ لَهُمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ»

''میں نے ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول (کی رضامندی) کو باقی رکھا۔''

میں نے سوچا میں کسی چیز میں بھی ان سے آگے کبھی نہیں نکل سکتا۔'' (ترمذی، کتاب المناقب: باب رجاء ہ ﷺ ان یکون ابو بکر ممن یدعی من جمیع ابواب الجنة: (٣٦٧٥)، حاکم (٤١٤/١)]

شارحین حدیث نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس جملے "أَبْقَيْتُ لَهُمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ" کی شرح "رَضَا هُمَا" سے کی ہے یعنی ''اللہ اور اس کے رسول کی رضا مندی۔'' جیسا کہ ملا علی قاری حنفی نے مشکوٰۃ کی شرح مرقاۃ (۳۷۹/۱۰) اور علامہ عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری نے تحفۃ الاحوذی (۱۵۴/۱۰) میں ذکر کیا ہے۔ لہٰذا اسے غلط رنگ دے کر بیان کرنا درست نہیں ہے۔ ہر مسلمان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور وہی کام کرنا پسند کرتا ہے جسے اللہ نے پسند کیا یا اس کے رسول ﷺ نے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ جو مقام صدیقیت پر فائز تھے، انھوں نے بھی صدقہ کرتے وقت جو سب کچھ دے دیا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ہی میں دیا۔ اسی طرح کہا کہ گھر میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا ہی چھوڑی ہے۔ واللہ اعلم!

زمانے کو برا کہنا

سوال ہم عام طور پر زمانے کو برا کہتے ہیں کہ زمانہ ہی ایسا برا آ گیا ہے، کیا یہ کہنا درست ہے کہ زمانہ بہت برا آ گیا ہے؟

جواب زمانۂ جاہلیت میں جب مشرکین عرب کو کوئی دکھ، غم، شدت و بلا پہنچتی تو وہ کہتے: ''يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ!'' یعنی ہائے زمانے کی بربادی! وہ ان افعال کو زمانے کی طرف منسوب کرتے اور زمانے کو برا بھلا کہتے اور گالیاں دیتے حالانکہ ان افعال کا خالق اللہ جل جلالہ ہے تو گویا انھوں نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی۔ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے سورۂ جاثیہ کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« كَانَ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُهْلِكُنَا اللَّيْلُ وَ النَّهَارُ وَ هُوَ الَّذِيْ يُهْلِكُنَا يُمِيْتُنَا وَ يُحْيِيْنَا فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِهِ :﴿ وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ ﴾» [تفسیر ابن کثیر(١٥٩/٤)]

''اہل جاہلیت کہتے تھے کہ ہمیں رات اور دن ہلاک کرتا ہے، وہی ہمیں مارتا اور زندہ کرتا ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: ''انھوں نے کہا ہماری زندگی صرف اور صرف دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں صرف زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے، دراصل انھیں اس کی خبر نہیں یہ تو صرف اٹکل پچو سے کام لیتے ہیں۔''

اس آیت کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ زمانے کو برا بھلا کہنا اور اپنی مشکلات اور دکھوں کو زمانے کی طرف منسوب کر کے اسے برا بھلا کہنا مشرکین عرب اور دھریہ کا کام ہے۔ دراصل زمانے کو برا بھلا کہنا اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ يُؤْذِيْنِيْ ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَ اَنَا الدَّهْرُ بِيَدِيْ الْاَمْرُ اُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَ النَّهَارَ »
[بخاری، کتاب التفسیر: باب تفسیر سورة جاثیة(٤٨٢٦)،مسلم(٢٢٤٦)، حمیدی(٤٦٨/٢)، مسند احمد (٢٣٨/٢)، ابو داؤد(٥٢٧٤)]

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ابن آدم مجھے اذیت دیتا ہے، وہ زمانے کو گالیاں دیتا ہے اور میں (صاحب) زمانہ ہوں۔ میرے ہاتھ میں معاملات ہیں، میں رات اور دن کو بدلتا ہوں۔''

اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تَسُبُّوْا الدَّهْرَ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ »[مسند ابی یعلی (٤٥٢/١٠)]

''زمانے کو برا نہ کہو یقیناً اللہ ہی زمانہ ہے (یعنی زمانے والا ہے)۔''

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« لَا يَقُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ ! فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ »[حلیة الأولیاء(٢٥٨/٨)]

''ہرگز کوئی یہ نہ کہے: ''ہائے زمانے کی بربادی!'' بے شک اللہ ہی زمانے والا ہے۔''

امام خطابی رحمہ اللہ ''أنا الدهر'' کا معنی بیان کرتے ہیں:

'' اَنَا صَاحِبُ الدَّهْرِ وَ مُدَبِّرُ الْاُمُوْرِ الَّتِيْ يَنْسِبُوْنَهَا اِلَى الدَّهْرِ فَمَنْ سَبَّ الدَّهْرَ عَنْ اَجْلِ اَنَّهٗ فَاعِلُ هٰذِهِ الْاُمُوْرِ عَادَ سَبُّهٗ اِلٰى رَبِّهِ الَّذِيْ هُوَ فَاعِلُهَا '' [فتح الباری (٥٧٥/١٦)]

''میں زمانے والا اور کاموں کی تدبیر کرنے والا ہوں، جن کاموں کو یہ زمانے کی طرف منسوب کرتے ہیں (یعنی دن رات کا نظام وغیرہ ابدی ہے خود بخود چل رہا ہے۔ یہ زمانہ ہی مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے) جس نے زمانے کو اس بنا پر برا بھلا کہا کہ وہ ان امور کا بنانے والا ہے تو اس کی گالی اس رب کی طرف لوٹنے والی ہے جو ان امور کا بنانے والا ہے۔''

لہٰذا زمانے کو برا بھلا کہنا جیسا کہ عوام الناس میں رائج ہے کہ زمانہ برا آ گیا ہے، گیا گزرا زمانہ ہے، وقت کا ستیاناس وغیرہ، دراصل اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنا ہے، کیونکہ سارا نظام عالم اللہ وحدہ لا شریک لہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہی پیدا کرنے والا اور وہی مارنے والا ہے۔ وہی مدبر الامور ہے، منتظم اور سب کی بگڑی بنانے والا گنج بخش، غوث اعظم، داتا، فیض بخش اور دست گیر ہے۔ اس لیے ان امور اور زمانے کو برا کہنا اللہ تعالیٰ کو برا کہنا ہے جو ان کا خالق ہے۔ لہٰذا ایسے کلمات سے اجتناب کرنا چاہیے۔

ایک ضمیر میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کرنا

سوال کیا ترمذی میں ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خطبہ دیا اور کہا:

« مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَقَدْ غَوىٰ »

''جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ ہدایت پا گیا اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہو گیا۔''

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« بِئْسَ الْخَطِيْبُ اَنْتَ قُلْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ »

''تو برا خطیب ہے تو کہہ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔''

نیز اس ممانعت کی وجہ کیا ہے؟

(جواب) یہ حدیث کئی ایک کتب احادیث [صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلاة والخطبة: ۸۷۰۔ نسائی، کتاب النکاح، باب ما یکره من الخطبة: ۳۲۸۱۔ ابوداؤد، کتاب الصلاة، باب الرجل یخطب علی قوس: ۱۰۹۹۔ کتاب الأدب: ۴۹۸۱۔ مسند احمد: ۲۵۶/۴)۔ بیهقی: ۲۱۶/۳،۸۶/۱۔ مستدرك حاکم: ۲۸۹/۱] میں مطول ومختصر مروی ہے۔ ترمذی شریف میں مجھے یہ روایت نہیں ملی۔ اس روایت میں جو "مَنْ يَّعْصِهِمَا فَقَدْ غَوىٰ" (جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہوا) کے الفاظ پر آپ ﷺ نے کہنے والے کو جو کہا کہ ''تو برا خطیب ہے اس کی شارحین حدیث کئی وجوہات بیان کرتے ہیں بعض نے کہا کہ اس لیے آپ نے اس پر ناراضی کا اظہار کیا کہ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو ایک ضمیر میں جمع کر دیا۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں خطبہ سکھایا، اس میں مذکور ہے:

« مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ فَقَدْ رَشَدَ وَ مَنْ يَّعْصِهِمَا فَاِنَّهُ لَا يَضُرُّ اِلَّا نَفْسَهُ »[ابوداؤد، کتاب النکاح: باب فی خطبة النکاح، (۲۱۱۹)]

اسی طرح قرآن کریم میں بھی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَآئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﴾ [الأحزاب : ۵۶]

اس آیت میں " يُصَلُّوْنَ " کی ضمیر میں اللہ اور ملائکہ کو جمع کیا گیا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''درست بات یہی ہے کہ منع اس لیے کیا گیا ہے کہ خطبوں کی شان یہ ہے کہ ان میں تفصیل اور وضاحت ہو اور اشارات و رموز سے اجتناب ہو، اسی لیے صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ بات کرتے تو اسے تین بار دہراتے تاکہ اسے سمجھا جا سکے۔'' (شرح النووی (۱۳۹/۶)، طبع بیروت)

مزید تفصیل کے لیے حاشیہ سیوطی علی النسائی وغیرہ ملاحظہ کریں۔

خطیب کو چاہیے کہ وہ اشارات و رموز سے کام نہ لے تاکہ سامعین کو کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ ایک ضمیر میں اللہ اور اس کے رسول بھی شریک ہیں۔ اس لیے بات کھول کر تفصیل سے عوام الناس کے سامنے بیان کر دینی چاہیے۔

مسئلہ تقدیر

سوال ہمارے کچھ دوستوں کا کہنا ہے کہ اگر کسی کی تقدیر ہی میں برائی لکھی ہے تو پھر اس برائی کے کرنے پر عذاب اور گناہ کیوں ملے گا؟ حالانکہ وہ تو مجبور تھا۔ اس مسئلہ کی وضاحت سے ہماری تشفی فرما دیں۔

جواب تقدیر کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن کے متعلق بحث و تمحیص شرعاً منع ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق بحث و تکرار سے اجر کی محرومی، بدعملی اور ضلالت کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ایک حدیث میں ہے:

« خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَلٰى اَصْحَابِهِ وَ هُمْ يَخْتَصِمُوْنَ فِي الْقَدَرِ فَكَاَنَّمَا يُفْقَأُ فِيْ وَجْهِهِ حَبُّ الرُّمَّانِ مِنَ الْغَضَبِ فَقَالَ بِهٰذَا اُمِرْتُمْ اَوْ لِهٰذَا خُلِقْتُمْ ؟ تَضْرِبُوْنَ الْقُرْآنَ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ بِهٰذَا هَلَكَتِ الْاُمَمُ قَبْلَكُمْ » [ابن ماجه، باب في القدر(٨٥)،مصنف عبدالرزاق (٢١٦/١١) ،(٢٠٣٦٧)، مسند احمد (١٧٨/٢)]

”آپ ﷺ اپنے اصحاب کے پاس آئے اور دیکھا کہ وہ مسئلہ تقدیر پر بحث کر رہے ہیں تو آپ ﷺ یہ دیکھ کر اس قدر غصے میں آگئے کہ معلوم ہوتا تھا گویا آپ کے چہرے پر انار کے دانے نچوڑ دیے گئے ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:
”کیا تم اس کا حکم دیے گئے ہو یا تم اس کام کے لیے پیدا کیے گئے ہو؟ اللہ کے قرآن کی بعض آیات کو بعض کے ساتھ ٹکراتے ہو؟ (یاد رکھو!) اسی وجہ سے تم سے پہلی امتیں ہلاک ہو گئیں۔“

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے اندر کئی مقامات پر بیان کیا ہے کہ ہم نے خیر و شر دونوں کا راستہ دکھا دیا ہے اور انسان کو اختیار دیا ہے کہ جس راستے کو چاہے اختیار کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ﴾ [الدهر:٣]

”ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ہے خواہ وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ هَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ [البلد:١٠]

”ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیے۔“

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر کے دونوں راستے دکھا دیے ہیں اور اسے عقل و شعور عطا کر دیا ہے کہ اپنے لیے دونوں راستوں میں سے جو صحیح ہے اسے اختیار کر لے۔ اگر انسان سیدھے یعنی خیر و برکت والے راستے کو اختیار کرے گا تو جنت میں داخل ہو جائے گا اور جہنم کے دردناک عذاب سے اپنے آپ کو بچا لے گا اور اگر راہِ راست کو ترک کر کے ضلالت و گمراہی اور شیطانی راہ پر گامزن ہوگا تو جہنم کی آگ میں داخل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے جو تقدیر لکھی ہے اس نے اپنے علم کی بنیاد پر لکھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ ہر شخص کے متعلق تمام معلومات رکھتا

ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ انسان دنیا میں کیسے رہے گا؟ یا کیا کرے گا؟ اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس لیے اس نے اپنے علم کے ذریعے سب کچھ پہلے ہی لکھ دیا ہے، کیونکہ اس کا علم کبھی غلط نہیں ہوسکتا اور تقدیر میں لکھی ہوئی اس کی تمام باتیں ویسے ہی وقوع پذیر ہوں گی جس طرح اس نے قلمبند کی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ کے کمال علم و احاطہ کلی کا ذکر ہے۔ اس میں یہ بات نہیں کہ انسان کو اس نے ان لکھی ہوئی باتوں پر مجبور کیا ہے۔

اس لیے یہ بات کہنا درست نہیں کہ زانی وشرابی، چور وڈاکو وغیرہ جہنم میں کیوں جائیں گے؟ کیونکہ ان کے مقدر ہی میں زنا کرنا، شراب پینا، چوری کرنا اور ڈاکے وغیرہ ڈالنا لکھا ہوا تھا۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ ایک استاد جو اپنے شاگردوں کی ذہنی وعلمی صلاحیتوں اور ان کے لکھنے پڑھنے سے دلچسپی وعدم دلچسپی سے اچھی طرح واقف ہے، وہ اپنے علم کی بنا پر کسی ذہین و محنتی طالب علم کے بارے میں ڈائری میں لکھ دے کہ یہ طالب علم اپنی کلاس میں اول پوزیشن حاصل کرے گا اور کسی شریر اور کند ذہن طالب علم کے بارے میں لکھ دے کہ وہ امتحان میں ناکام ہوگا اور پھر لائق اور کند ذہن کو کلاس میں برابر محنت کروائے اور انھیں اکٹھا سمجھائے لیکن جب امتحان ہو اور ذہین طالب علم اچھے نمبر حاصل کر کے اول پوزیشن حاصل کرے اور کند ذہن طالب علم ناکام ہو جائے تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ لائق طالب علم اس لیے کامیاب ہوا کہ استاد نے پہلے ہی اپنی ڈائری میں اس کے متعلق لکھ دیا تھا کہ وہ اول پوزیشن حاصل کرے گا اور کند ذہن اس لیے فیل ہوا کہ اس کے متعلق استاد نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ وہ فیل و ناکام ہوگا۔ لہٰذا اس بے چارے کا کیا قصور اور گناہ ہے؟ یقیناً سمجھدار انسان یہ نہیں کہے گا کہ اس میں استاد کا قصور ہے۔ اس لیے کہ اس میں استاد کی غلطی نہیں کیونکہ وہ دونوں کو برابر سمجھاتا رہا کہ امتحان قریب ہے، محنت کرو وگرنہ فیل ہوجاؤ گے۔ استاد کی ہدایت کے مطابق لائق طالب علم نے محنت کی اور نالائق طالب علم اپنی بری عادات میں مشغول رہا، یوں اس نے اپنا وقت کھیل کود اور شرارتوں میں صرف کر دیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ جس کا علم بلاشبہ پوری کائنات سے زیادہ اکمل واتم ہے، اس سے کوئی چیز مخفی و پوشیدہ نہیں، اس نے اپنے کامل علم کی بنا پر ہر انسان کے دنیا میں آنے سے قبل ہی لکھ دیا تھا کہ یہ بد بخت ہوگا یا نیک بخت؟ جنتی ہوگا یا جہنمی؟ مگر ان سے اختیارات اور عقل وشعور سلب نہیں کرتا بلکہ ان کی رہنمائی کرتے ہوئے اچھے اور برے راستوں میں فرق اپنے انبیاء و رسل بھیج کر کرتا رہا ہے اور سلسلہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد انبیاء کے ورثاء صالح علماء کے ذریعے کائنات میں انھیں ایمان و اعتقاد اور اعمال صالحہ کی دعوت دیتا ہے، کفر وشرک، معصیت اور گناہ سے منع کرتا ہے، جہنم کے عذاب اور حساب کتاب اور قیامت کی ہولناکیوں سے ڈراتا ہے۔ ان تمام احکامات کے باوجود جب کافر اپنے کفر اور طغیان پر اڑا رہتا ہے، فاسق اپنے فسق و فجور سے توبہ نہیں کرتا تو اس کے ان برے اعمال پر اگر اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ یہ تو عین عدل و انصاف ہے اور اس کے برعکس نیک و بد اور کافر و مومن سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا عین ظلم و ناانصافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت رسول اللہ ﷺ کی مشیت سے مقدم ہے

(سوال) میں نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اللہ کے پکڑے کو حضرت محمد ﷺ چھڑا لیں گے جبکہ حضرت محمد ﷺ کے پکڑے کوئی چھڑا نہیں سکتا۔ تو پوچھنا میں یہ چاہتا ہوں کہ کیا حضرت محمد ﷺ کی مرضی اللہ کی مرضی پر حاوی ہے؟

(جواب) یہ عقیدہ درست نہیں ہے، حدیث میں آتا ہے:

« عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شِئْتَ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَجَعَلْتَنِيْ لِلّٰهِ عَدْلًا ؟ بَلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ »

[مسند احمد (۲۱٤/۱)، بیهقی(۲۱۷/۳)، فتح الباری(٥٤٠/١١)، عمل الیوم واللیلة للنسائی (۹۸۸)، الأدب المفرد (۸۰٤)، ابن السنی (٦٦۷)، تاریخ بغداد(۱۰٥/۸)]

'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے کہا: جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔'' تو اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: '' اللہ کی قسم! کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے؟ بلکہ جو اللہ اکیلا چاہے۔''

یہ روایت اجلح عبداللہ کی وجہ سے حسن ہے۔ یہ حدیث اس طرح بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا حَلَفَ اَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شِئْتَ وَ لٰكِنْ لِيَقُلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شِئْتَ »

[سلسلة الأحادیث الصحیحة (۱۳۹،۱۳٦) ، صحیح ابن ماجه، کتاب الکفارات: باب النهی ان یقال ماشاء الله و شئت (۲۰۰/۲)،(۲۱۱۷)]

'' جب تم میں سے کوئی حلف اٹھائے تو یہ نہ کہے جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں لیکن یوں کہے جو اللہ چاہے پھر آپ چاہیں۔''

حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے خواب دیکھا کہ وہ اہل کتاب کے ایک آدمی سے ملا ہے اس نے کہا: '' تم اچھی قوم ہو اگر تم شرک نہ کرو، تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور محمد (ﷺ) چاہیں۔'' اس نے نبی کریم ﷺ سے یہ بات ذکر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« اَمَا وَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُ لَاَعْرِفُهَا لَكُمْ قُوْلُوْا مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شَآءَ مُحَمَّدٌ »[سلسلة الأحادیث الصحیحة (۱۳۷)، مسند احمد (۳۹۳/٥)، عمل الیوم واللیلة للنسائی (۹۸٥)]

'' اللہ کی قسم! میں اس بات کو جانتا ہوں۔ یوں کہا کرو جو اللہ چاہے پھر محمد (ﷺ) چاہیں۔''

یعنی اللہ کے ساتھ محمد (ﷺ) کو شریک نہ بناؤ بلکہ اللہ کے بعد محمد (ﷺ) کا ذکر کرو، اس لیے کہ اللہ کا کوئی ہمسر نہیں، سب اس کے بندے ہیں۔

اسی مفہوم کی حدیث سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔[مسند احمد(۷۲/٥)، دارمی(۲۷۰۲)]

قبیلہ جہینہ کی ایک عورت قتیلہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اس نے کہا: '' تم شرک کرتے ہو

اور حصہ دار بناتے ہو، تم کہتے ہو کہ جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں اور تم کہتے ہو کہ کعبہ کی قسم۔'' تو نبی کریم ﷺ نے انھیں حکم دیا: ''جب حلف کا ارادہ کریں تو کہیں:

« وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ وَ يَقُوْلُ اَحَدُهُمْ مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شِئْتَ » [نسائی، كتاب الأيمان : باب الحلف بالكعبة (٣٨٠٤)، مسند احمد (٣٧١/٦)، مستدرك حاكم (٢٩٧/٤)، اس حديث كو امام حاكم اور امام ذهبی رحمہ اللہ نے صحيح قرار ديا هے۔]

''رب کعبہ کی قسم اور ان میں سے ہر کوئی کہے جو اللہ چاہے اور پھر آپ چاہیں۔''

قبروں پر جانور ذبح کرنا

سوال کیا قبروں پر جانور ذبح کرنا یا نذر و نیاز چڑھانا جائز ہے؟

جواب نذر و نیاز اور تقرب کی غرض سے جانور ذبح کرنا عبادت ہے اور اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ [الأنعام:١٦٢، ١٦٣]

''کہہ دیجیے! بلاشبہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے بات ماننے ہوں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴾ [الکوثر:٢]

''اپنے رب کی خاطر نماز پڑھ اور قربانی کر۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ [الحج:٣٧]

''اللہ تعالیٰ کو ان جانوروں کا گوشت اور خون ہرگز نہیں پہنچتا لیکن اسے تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔''

ان واضح آیات سے پتا چلا کہ ہر قسم کی عبادت، قربانی، جانوروں کے ذبیحے اور تقویٰ اللہ کے لیے ہونا چاہیے، اس میں کسی کو شریک اور حصہ دار نہیں بنانا چاہیے۔ جو شخص کسی اور ہستی کے لیے جانور ذبح کرتا ہے اس پر نبی آخر الزمان صادق و مصدوق محمد ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے صحیفے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے:

« لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ سَرَقَ مَنَارَ الْاَرْضِ وَ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَيْهِ وَ

لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ اٰوٰى مُحْدِثًا ﴾[مسند احمد(٩٥٤) ، نسائی ، کتاب الضحایا: باب من ذبح لغیر اللّٰه عزوجل (٤٤٢٧)]

'' اللہ کی لعنت ہو اس آدمی پر جس نے غیر اللہ کے لیے ذبح کیا اور اس پر بھی لعنت ہو جس نے زمین کی حدود و علامات کو چرایا اور اس پر بھی اللہ کی لعنت ہو جس نے اپنے والدین پر لعنت کی اور اس پر بھی اللہ کی لعنت ہو جس نے کسی بدعتی کو جگہ دی۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کی حدیث مروی ہے۔ [مسند احمد(٢٩١٣)]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ لَا عَقْرَ فِي الْإِسْلَامِ ﴾[مسند احمد (١٩٧/٣)، بیھقی (٥٧/٣)، عبد الرزاق(٢٦٩)، شرح السنۃ(٤٦١/٥)، جمع الجوامع (٢٧٢/٨)]

'' اسلام میں قبروں کے نزدیک ذبیحہ نہیں ہے۔''

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے 'عقر' کی تشریح میں فرمایا ہے:

" كَانُوا يَعْقِرُوْنَ عِنْدَ الْقَبْرِ بَقَرَةً اَوْ شَاةً "

'' مشرکین قبروں کے پاس گائے یا بکری ذبح کیا کرتے تھے۔''

امام خطابی رحمہ اللہ نے ابوداؤد کی شرح میں فرمایا ہے:

'' اہل جاہلیت سخی آدمی کی قبر پر اونٹ ذبح کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اس کی سخاوت کا بدلا دے رہے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنی زندگی میں اونٹ ذبح کر کے مہمانوں کو کھلاتا تھا، ہم اس کی قبر کے پاس ذبح کر رہے ہیں تاکہ درندے اور پرندے کھائیں اور جس طرح اس کی زندگی میں لنگر جاری رہتا تھا مرنے کے بعد بھی جاری ہے۔''
[معالم السنن (٧٣٤/١)]

مذکورہ بالا حدیث اور اس کی شرح سے معلوم ہوا کہ قبروں کے پاس جانور ذبح کرنا زمانہ جاہلیت میں مشرکوں کا کام تھا جو قبروں پر لنگر جاری رکھتے تھے۔ اسلام نے آ کر اس کو ختم کیا ہے اور یہ درس دیا ہے کہ قبروں کے پاس جانور ذبح کرنا اسلام میں جائز نہیں۔ جو لوگ قبروں پر جا کر نذر و نیاز چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے ہیں وہ اہل قبور کو مشکل کشا اور حاجت روا جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر یہاں نذرانہ دیا گیا تو ہماری حاجات پوری ہوں گی اور صاحب قبر راضی ہوگا۔ حالانکہ اصحاب القبور نہ ہماری پکار سنتے ہیں اور نہ مشکلات حل کرنے پر قادر ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴾
[الفاطر:١٣، ١٤]

'' اور وہ ہستیاں جنھیں تم اس کے علاوہ پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں، اگر تم انھیں پکارو تو وہ

تمھاری پکار کو نہیں سنتے اور اگر سن بھی لیں تو تمھیں جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے اور خبر دینے والے کی طرح تمھیں نہیں خبر دیں گے۔‘‘

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ جن ہستیوں کو اللہ کے سوا پکارا جاتا ہے وہ کسی بھی چیز کی مالک نہیں۔ مالک و مختار تو صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے اسے ہی پکارنا چاہیے اور نذریں اور نیازیں جو اکثر عوام قبروں اور آستانوں پر مانتے ہیں، حرام قرار دی گئی ہیں۔ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’اکثر لوگ جو نذر مانتے ہیں اور مشاہدے میں ہے کہ وہ کسی غائب انسان کے لیے ہوتی ہے یا مریض کے لیے یا کسی دوسری ضروری حاجت کے لیے۔ بعض لوگ نیک لوگوں کی قبروں پر آ کر اس کا غلاف سر پر رکھ کر کہتے ہیں اے میرے فلاں آقا! اگر میرا غائب ہونے والا ساتھی واپس کر دیا گیا یا میرا مریض شفایاب ہو گیا یا میری حاجت پوری کر دی گئی تو تیرے لیے اتنا سونا یا اتنی چاندی یا اتنا غلہ یا اس طرح کی پانی کی سبیل یا شمع جلاؤں گا یا اتنا تیل ڈالوں گا۔ یہ نذر بالاجماع باطل و حرام ہے، اس کی کئی ایک وجوہات ہیں:

① یہ نذر مخلوق کی ہے اور مخلوق کے لیے نذر ماننا جائز نہیں۔ اس لیے کہ یہ عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لیے نہیں ہوتی۔

② جس کے لیے نذر مانی جا رہی ہے وہ مردہ ہے اور مردہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔

③ اگر نذر ماننے والے نے یہ یقین کیا کہ میت اللہ کے سوا متصرف الامور ہے تو اس کا یہ عقیدہ رکھنا کفر ہے۔‘‘

[البحر الرائق (۲۹۸/۲)]

یہی بات فتاویٰ شامی (۱۲۸/۲) اور فتاویٰ عالمگیری (۲۱۶/۱) میں بھی موجود ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ لَوْ اَنَّ مُسلِمًا ذَبَحَ ذَبِيْحَةً وَ قَصَدَ بِذِبْحِهَا التَّقَرُّبَ اِلٰى غَيْرِ اللّٰهِ صَارَ مُرْتَدًّا وَ ذَبِيْحَتُهٗ ذَبِيْحَةُ مُرْتَدٍّ " [فتاویٰ عزیزی اردو (ص/۵۳۷)]

’’علمائے کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی ذبیحہ غیر اللہ کے تقرب کے لیے کیا تو وہ مرتد ہو جائے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیح ہوگا۔‘‘

فقہ حنفی کے حوالہ جات سے بھی معلوم ہوا کہ اہل قبور کے لیے نذر و نیاز ماننا بالاجماع حرام و باطل ہے اور ان کے متعلق تصرف کا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ کئی لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو بزرگوں کے نام کی نذر دیتے ہیں۔ ان کے مزارات اور آستانوں پر حاضر ہو کر اللہ کے نام کا جانور ذبح کرتے ہیں تو یاد رہے کہ ایسے مقامات جہاں غیر اللہ کی عبادت ہوتی ہے جیسے قبروں پر سجدے کرنا، اہل قبور کو مشکلات میں ندا دینا اور پکارنا وغیرہ، وہاں اللہ کے نام کا ذبیحہ اور نذر و نیاز ماننا بھی جائز نہیں۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جسے ثابت بن الضحاک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے:

« نَذَرَ رَجُلٌ اَنْ يَّنْحَرَ اِبِلاً بِبُوَانَةَ فَسَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ هَلْ كَانَ فِيْهَا وَثَنٌ

مِنْ اَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ ؟ قَالُوْا لَا ، قَالَ فَهَلْ كَانَ فِيْهَا عِيْدٌ مِنْ اَعْيَادِهِمْ ؟ قَالُوْا لَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَوْفِ بِنَذْرِكَ فَاِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَ لَا فِيْمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ ﴾[ابو داؤد، كتاب الأيمان والنذور: باب ما يؤمر به من وفاء النذر(٣٣١٣)، بيهقي (١٠/٨٢)]

''ایک آدمی نے نذر مانی کہ وہ بوانہ مقام پر اونٹ نحر کرے گا تو اس نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: '' وہاں جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت تو نہیں جس کی عبادت کی جاتی ہو؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس جگہ ان کے میلوں میں سے کوئی میلا تو نہیں لگتا؟'' صحابہ کرام نے عرض کیا: ''نہیں۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی نذر پوری کر لے اور یاد رکھو اللہ کی نافرمانی میں نذر کو پورا نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کو پورا کیا جائے گا جس کا ابن آدم مالک نہیں۔''

اس حدیث کی شرح میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جس مقام پر مشرکین کا میلا لگتا ہو یا اس مقام پر ان کا کوئی بت وغیرہ نصب ہو اگرچہ اس مقام پر اب نہ میلے کا اہتمام ہوتا ہو اور نہ بت نصب ہو، ہمیں اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے لیے کسی جانور کو ذبح کرنا ممنوع ہے۔ کیونکہ مشرکین کا کسی جگہ میلا لگانا یا کسی مقام پر ان کا غیر اللہ کی عبادت کرنا خالص اللہ کے لیے ذبح کرنا اور نذر پوری کرنے کے لیے مانع اور رکاوٹ ہے۔''[هداية المستفيد(١/٤٥٥)]

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایسے مقامات جہاں اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت ہوتی ہو، عرس میلے لگتے ہوں، وہاں اللہ کے نام کی نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھانا اور بکرے چھترے ذبح کرنا حرام ہیں، اس سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔

قبروں پر اعمال پیش ہونا

سوال مسند ابی داؤد طیالسی میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارے اعمال تمھارے رشتہ داروں اور قرابت داروں پر ان کی قبروں میں پیش کیے جاتے ہیں، پس اگر نیکیاں ہوں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر کچھ غیر صالح اعمال ہوں تو وہ کہتے ہیں: ''اے اللہ! تو انھیں توفیق دے کہ وہ تیری اطاعت والے کام کریں۔''[مسند ابی داؤد الطیالسی (١٩٠٣)، مسنداحمد (٣/١٦٥)]

کیا یہ روایت صحیح ہے اور ہمارے اعمال واقعتاً ہمارے رشتہ داروں پر ان کی قبروں میں پیش کیے جاتے ہیں؟

جواب مذکورہ بالا روایت صحیح نہیں ہے، انتہائی کمزور ہے، اس کی سند میں صلت بن دینار راوی کو امام احمد، امام یحییٰ بن معین، امام عبدالرحمن بن مہدی، امام بخاری، امام جوزجانی، امام دارقطنی اور امام نسائی وغیرہم نے ضعیف و متروک قرار دیا ہے، کسی بھی محدث نے اس کی توثیق نہیں کی۔ (میزان الاعتدال: ۱/ ۳۱۸) اسی طرح اس کی سند میں حسن راوی کی تدلیس بھی ہے لہٰذا یہ

روایت کسی طرح بھی درست نہیں کہ ہمارے تمام اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی میلوں ٹھیلوں میں شرکت

سوال میلوں ٹھیلوں کی زینت بننا اسلام میں کیسا ہے؟ اور کیا ایسے مقامات پر تقسیم ہونے والی اشیاء کھانا جائز ہے؟

جواب اسلام میں میلوں ٹھیلوں کا کوئی تصور نہیں ہے کہ موجودہ دور میں جو عرس اور میلے قائم کیے جاتے ہیں ان کی قباحتیں کسی بھی ذی شعور پر مخفی نہیں، ڈھول باجے، سرنگیاں، بھنگڑے، جوئے، شراب اور افیون وغیرہ جیسی حرام چیزوں کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، ایسی محفلوں میں شرکت کرنا گناہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ میلوں کا بندوبست کیا کرتے تھے، جسے آج کے مسلمان کہلوانے والے افراد نے کثرت سے اپنا لیا ہے اور میلوں میں اللہ کے علاوہ صاحب قبر کو سجدہ کرنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صریح شرک ہے۔ سجدہ صرف اللہ کی ذات کے لیے ہے۔ ایسے مقامات پر اللہ کے نام پر بھی کوئی چیز نہیں دینی چاہیے۔ ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''ایک آدمی نے بوانہ جگہ اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی تو اس نے نبی ﷺ سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ''کیا وہاں ان کے میلوں میں سے کوئی میلا تو نہیں؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''نہیں۔'' پھر رسول ﷺ نے فرمایا: ''اپنی نذر پوری کرلے، اس لیے کہ اللہ کی نافرمانی میں نذر نہیں ہے اور نہ ہی اس چیز میں نذر ہے جس کا ابن آدم مالک نہیں۔''

[سنن ابی داؤد، کتاب الایمان والنذور: باب ما یؤ مربه من وفاء النذر (۳۳۱۳)، بیهقی: (۸۳/۱۰)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ میلوں کا اسلام میں کوئی تصور نہیں، جہاں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت ہو وہاں اللہ کے نام پر نذر چڑھانا بھی جائز نہیں۔ جب نذر چڑھانا جائز نہیں تو اس کا کھانا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اللہ سے دعا کی:

''اے اللہ! میری قبر کو وثن (بت) نہ بنانا، اللہ کی لعنت ہو ایسی اقوام پر جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

[مسند حمیدی: (۱۰۲۵)، مسند احمد (۲۴۶/۲)]

اسی طرح آپ نے فرمایا:

''میری قبر کو عید میلا گاہ نہ بننے دینا۔'' [ابو داؤد، کتاب المناسك: باب زیارة القبور: (۲۰۴۲)]

لہٰذا ایسے میلوں میں شرکت نہ کریں اور نہ ہی وہاں سے کوئی نذر و نیاز لے کر کھائیں۔

کلمہ طیبہ

سوال کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کسی ایک حدیث سے ثابت ہے یا نہیں اور اگر نہیں تو پھر ہم تک یہ کیسے پہنچا؟ نیز کسی غیر مسلم آدمی کو مسلمان ہونے کے لیے انہی الفاظ میں توحید و رسالت کا اقرار کرنا ہو گا یا اس کے لیے کوئی اور الفاظ بھی

قرآن وحدیث میں موجود ہیں؟

جواب اسلام میں داخل ہونے کے لیے جو کلمات پڑھائے جاتے ہیں وہ دو شہادتوں کا اقرار یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی توحید اور محمد ﷺ کی رسالت کی گواہی ہے اور یہ بات کتب احادیث سے ثابت ہے۔ صحیح بخاری میں ابو ذر الغفاری رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ مفصل مذکور ہے۔ انھوں نے بیت اللہ میں جا کر بلند آواز سے کہا:

« اَشْهَدُ اَنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ »

''میں تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت وگواہی دیتا ہوں۔''

[صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار: باب سلام ابی ذرالغفاری رضی الله عنه (٣٨٦١)]

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ حدیث کتب احادیث میں موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ » [بخاری، کتاب الایمان: باب "فان تابوا و اقاموا الصلوٰة...... الخ (٢٥)، مسلم ، کتاب الایمان: باب الأمربقتال الناس...... الخ (٢٠)]

''مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں۔''

اسی طرح ملاحظہ ہو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے وفد عبدالقیس والی حدیث جس میں آپ ﷺ نے ایمان باللہ وحدہ کے بارے میں فرمایا:

« شَهَادَةُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ » [بخاری، کتاب الایمان: باب إدا الخمس من الایمان : (٥٣)، مسلم، کتاب الایمان: باب الامر بالایمان باللّٰه تعالٰی...... الخ (١٧)]

کتب احادیث کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے سب سے پہلے دو باتوں کی گواہی دینا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور عرف عام میں اسے کلمہ طیبہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' میں دونوں چیزیں موجود ہیں، اسلام قبول کرتے وقت لوگ انہی دو باتوں کی گواہی دیتے تھے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اور قرآن حکیم میں بھی اپنے اپنے مقام پر''لا الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا ذکر موجود ہے اور اس بات پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے۔

استطاعت سے بڑھ کر نذر پوری کرنا

سوال کیا استطاعت سے باہر نذر کو پورا کرنا ضروری ہے؟

جواب اگر کوئی آدمی ایسی نذر مان بیٹھے جس کی اسے استطاعت نہ ہو اور وہ اسے پورا نہ کر سکتا ہو تو اس کے لیے ایسی نذر پوری کرنا جائز نہیں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ رَأَى شَيْخًا يُهَادَىٰ بَيْنَ ابْنَيْهِ فَقَالَ مَا بَالُ هٰذَا ؟ قَالُوْا نَذَرَ اَنْ يَّمْشِيَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ عَنْ تَعْذِيْبِ هٰذَا نَفْسَهُ لَغَنِيٌّ وَ اَمَرَهُ اَنْ يَّرْكَبَ »[بخاری، کتاب جزاء الصید: باب من نذر المشی إلی الکعبة (١٨٦٥)، (٦٧٠١)، مسلم (١٦٤٢)، مسند احمد (١١٤/٣)، ابوداؤد (٣٣٠١)، ترمذی(١٥٣٧)، نسائی(٣٨٨٣)، ابن الجارود (٩٣٩)، بیهقی(٧٨/١٠)]

''بلاشبہ نبی کریم ﷺ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو اپنے دو بیٹوں کا سہارا لے کر چل رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:'' یہ کیا ہے؟'' انھوں نے عرض کیا:'' اس نے نذر مانی ہے کہ وہ پیدل چل کر جائے گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس کے اپنے نفس کو عذاب دینے سے بے پروا ہے۔'' تو آپ نے اسے سوار ہونے کا حکم دیا۔''

سنن نسائی میں ہے:

« نَذَرَ اَنْ يَّمْشِيَ اِلَى بَيْتِ اللّٰهِ »[نسائی ، کتاب الایمان والنذور: باب ما الواجب علی من أوجب علی نفسه نذراً فعجز عنه؟ (٣٨٨٣)]

''اس آدمی نے بیت اللہ کی طرف پیدل چل کر جانے کی نذر مانی تھی۔''

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَمْ يُسَمِّهِ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ ...... وَ مَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَمْ يُطِقْهُ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ »[ابو داؤد، کتاب الایمان والنذور: باب من نذر نذراً لا یطیقه (٣٣٢٢)]

''جس نے ایسی نذر مانی جس کا نام نہ لیا اس کا کفارہ قسم کا کفار ہے اور جس نے ایسی نذر مانی جس کو پورا کرنے کی اسے طاقت نہ ہو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے۔''

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ایسی عورت کو کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا جس نے پیدل چلنے کی نذر مانی اور وہ اس کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ [ابو داؤد، کتاب الأیمان والنذور: باب من رأی علیه کفارة إذا کان فی معصیة (٣٢٩٦) ،الفتح الربانی(١٨٨/١٤)]

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ جو مرد یا عورت ایسی نذر مان لے جس کو پورا کرنے کی اس میں ہمت نہ ہو تو وہ قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ ایسی نذر اس کے لیے پوری کرنا جائز نہیں اور قسم کا کفارہ یہ ہے کہ آدمی اپنے گھر والوں کو جو درمیانے درجہ کا کھانا کھلاتا ہے اس طرح کا کھانا دس مساکین کو کھلا دے یا ان کو کپڑا دے یا ایک غلام آزاد کر دے اور جس کو اس کی طاقت نہ ہو وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔ [المائدۃ:٨٩]

رسول اللہ ﷺ کا سایہ

سوال ہمارے ہاں یہ مسئلہ پیدا ہوگیا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ مبارک تھا اور کچھ اس کے برعکس بات کرتے ہیں۔ براہِ مہربانی صحیح بات کی طرف رہنمائی فرما دیں۔

(جواب) رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی اور انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلسلہ انسانیت ہی سے پیدا کیا تھا اور انسان ہونے کے اعتبار سے یہ بات عیاں ہے کہ انسان کا سایہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ﴾ [الرعد:١٥]

''اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی اور ناخوشی سے اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ کرتی ہیں اور ان کے سائے بھی صبح و شام سجدہ کرتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهُ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ ﴾ [النحل:٤٨]

''کیا انھوں نے اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ اس کے سائے دائیں اور بائیں سے لوٹتے ہیں۔ یعنی اللہ کے آگے عاجز ہو کر سربسجود ہوتے ہیں۔''

ان ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان میں اللہ نے جتنی مخلوق پیدا کی ہے ان کا سایہ بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی تو اللہ کی مخلوق ہیں لہٰذا آپ ﷺ کا بھی سایہ تھا۔ آپ ﷺ کے سائے کے متعلق کئی احادیث موجود ہیں:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک رات نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور نماز کی حالت میں اپنا ہاتھ اچانک آگے بڑھایا مگر پھر جلد ہی پیچھے ہٹا لیا۔ ہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آج آپ (ﷺ) نے خلاف معمول نماز میں ایک نیا عمل کیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ میرے سامنے ابھی ابھی جنت پیش کی گئی، میں نے اس میں بہترین پھل دیکھے تو جی میں آیا کہ اس میں سے کچھ اچک لوں مگر فوراً حکم ملا کہ پیچھے ہٹ جاؤ، میں پیچھے ہٹ گیا پھر مجھ پر جہنم پیش کی گئی « حَتّٰى رَاَيْتُ ظِلِّيْ وَ ظِلَّكُمْ » ''اس کی روشنی میں میں نے اپنا اور تمھارا سایہ دیکھا'' دیکھتے ہی میں نے تمھاری طرف اشارہ کیا کہ پیچھے ہٹ جاؤ۔'' [مستدرك حاكم(٤٥٦/٤)]

ایک حدیث میں ہے:

''سیدہ زینب اور سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہما ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھیں، صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک اونٹ تھا اور وہ بیمار ہو گیا جب کہ زینب رضی اللہ عنہا کے پاس دو اونٹ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم ایک زائد اونٹ صفیہ رضی اللہ عنہا کو دے دو۔'' تو انھوں نے کہا: ''میں اس یہودیہ کو کیوں دوں؟'' اس پر رسول اللہ ﷺ ناراض ہو گئے۔ تقریباً تین ماہ تک زینب کے پاس نہ گئے حتیٰ کہ زینب نے مایوس ہو کر اپنا سامان باندھ لیا۔

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« فَبَيْنَمَا اَنَا يَوْمًا بِنِصْفِ النَّهَارِ اِذَا اَنَا بِظِلِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مُقْبِلٌ» [مسند احمد (١٣٢/٦)، طبقات الكبرى(١٢٧/٨)، مجمع الزوائد(٣٢٣/٤)]

''اچانک دیکھتی ہوں کہ دوپہر کے وقت نبی کریم ﷺ کا سایہ آ رہا ہے۔''

عقلی طور پر بھی معلوم ہوتا ہے کہ سایہ مرئیہ فقط اس جسم کا ہوتا ہے جو ٹھوس ہو اور سورج کی شعاعوں کو آگے گزرنے نہ دے۔ لیکن اگر وہ جسم اتنا صاف اور شفاف ہو کہ وہ سورج کی شعاعوں کو روک ہی نہیں سکتا تو اس کا سایہ بلاشبہ نظر نہیں آتا۔ مثلاً صاف اور شفاف شیشہ اگر دھوپ میں لایا جائے تو اس کا سایہ دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اس میں شعاعوں کو روکنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی، بخلاف اس کے نبی کریم ﷺ کا جسد اطہر نہایت ٹھوس تھا، اس کی ساخت شیشے کی طرح نہیں تھی کہ جس سے سب کچھ گزر جائے۔

لامحالہ آپ ﷺ کا سایہ تھا۔ اگر جسم اطہر کا سایۂ مبارک نہ تھا تو کیا جب آپ ﷺ لباس پہنتے تو آپ کے ملبوسات کا بھی سایہ نہ تھا۔ اگر وہ کپڑے اتنے لطیف تھے کہ ان کا سایہ نہ تھا تو پھر ان کے پہننے سے ستر وغیرہ کی حفاظت کیسے ممکن ہو گی؟

منکرین سایہ یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نور تھے اور نور کا سایہ نہیں ہوتا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا سایہ اس لیے نہیں تھا کہ اگر کسی کا آپ ﷺ کے سایہ پر قدم آ جاتا تو آپ ﷺ کی توہین ہو جاتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کا سایہ پیدا ہی نہیں کیا۔ جہاں تک پہلی بات ہے کہ آپ ﷺ نور تھے اور نور کا سایہ نہیں، سراسر غلط ہے۔ نوریوں کا سایہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ جب سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے والد عبداللہ رضی اللہ عنہ غزوہ احد میں شہید ہو گئے تو ان کے اہل وعیال ان کے گرد جمع ہو گئے اور رونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا زَالَتِ الْمَلَائِكَةُ تُظِلُّهُ بِأَجْنِحَتِهَا حَتّٰى رَفَعْتُمُوْهُ» [بخاری، كتاب الجنائز : باب الدخول على الميت بعد الموت(١٢٤٤)]

''جب تک تم انھیں یہاں سے اٹھا نہیں لیتے اس وقت تک فرشتے اس پر اپنے پروں کا سایہ کیے رکھیں گے۔''

اور دوسری بات بھی خلاف واقعہ ہے کیونکہ سایہ پاؤں کے نیچے آ ہی نہیں سکتا، جب کبھی کوئی شخص سائے پر پاؤں رکھے گا تو سایہ اس کے پاؤں کے اوپر ہو جائے گا نہ کہ نیچے۔ لہٰذا ان عقلی اور نقلی دلائل کے خلاف یہ بے عقلی کی اور بے سند باتیں فی الحقیقت کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔

خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت

سوال کیا خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ممکن ہے؟

جواب خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ممکن ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے مجھے نیند میں دیکھا، اس نے یقیناً مجھے دیکھا کیونکہ شیطان میری شکل نہیں بنا سکتا۔'' [بخاری، كتاب الجنائز: باب الدخول على الميت بعد الموت: (١٢٤٤)]

اور صحیح بخاری ہی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جس نے مجھے خواب میں دیکھا، وہ مجھے بیداری میں دیکھے گا اور شیطان میری صورت نہیں بن سکتا۔“[بخاری، كتاب التعبير: باب من رئى النبي في المنام: (٢٩٩٣)]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ساتھ تعبیر کے مشہور تابعی امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی وضاحت نقل فرمائی ہے کہ یہ اس وقت ہے جب وہ آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی صورت میں دیکھے۔ فتح الباری میں ہے کہ جب کوئی شخص محمد بن سیرین سے بیان کرتا ہے کہ اس نے نبی ﷺ کو دیکھا ہے تو وہ فرماتے: ”تم نے جسے دیکھا ہے، اس کی شکل بیان کرو۔“ اگر وہ ایسی صورت بیان کرتا جسے وہ نہ پہچانتے تو فرماتے: ”تم نے نبی کریم ﷺ کو نہیں دیکھا۔“

اس لیے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو ہو تو اس نے یقیناً رسول اللہ ﷺ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان آپ ﷺ کی صورت اختیار نہیں کرسکتا اور چونکہ صحابی آپ ﷺ کو پہچانتا بھی ہے، وہ یقین سے کہہ سکتا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے۔ لیکن جس شخص نے آپ کو دیکھا ہی نہیں، وہ یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے؟ خود آپ ﷺ کی زندگی میں اجنبی لوگوں کو آپ ﷺ کی پہچان کے لیے بعض اوقات پوچھنا پڑتا تھا کہ آپ ہی رسول اللہ ﷺ ہیں؟

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”ایک دفعہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی اونٹ پر آیا، اسے مسجد میں بٹھایا، اس کا گھٹنا باندھا اور پھر کہنے لگا: ”تم میں محمد (ﷺ) کون ہیں؟“ نبی کریم ﷺ صحابہ کے درمیان ٹیک لگا کر بیٹھے تھے، ہم نے کہا: ”یہ سفید تکیہ لگانے والے محمد ﷺ ہیں۔“ پھر اس نے آپ ﷺ سے مخاطب ہو کر کئی سوالات کیے۔“[بخاري، كتاب العلم: باب القراءة والعرض على المحدث (٦٣)]

سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ذر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت ہے، فرماتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے درمیان بیٹھتے، کوئی اجنبی آتا تو پوچھنے کے بغیر معلوم نہ کرسکتا کہ آپ ﷺ ان میں سے کون ہیں؟ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ہم آپ ﷺ کے لیے بیٹھنے کی جگہ بنا دیتے ہیں تاکہ کوئی اجنبی آئے تو آپ کو پہچان لے۔ تو ہم نے آپ کے لیے مٹی کا ایک چبوترہ سا بنا دیا تو آپ اس پر بیٹھتے اور ہم آپ ﷺ کے ارد گرد بیٹھتے تھے۔“[ابو داؤد، كتاب السنة: باب في القدر(٤٦٩٨)]

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ کیلئے ہجرت کرکے قبا پہنچے تو بنو عمرو بن عوف کے ہاں ٹھہرے۔ اس موقع پر انصار کے جن لوگوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو نہیں دیکھا تھا، وہ ان کو رسول اللہ ﷺ سمجھ کر سلام کرتے تھے۔ جب سایہ ہٹ گیا اور رسول اللہ ﷺ پر دھوپ پڑنے لگی تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر کا آپ ﷺ پر سایہ کیا۔ اس وقت لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی زندگی میں جب آپ ﷺ کو نہ پہچاننے والے کسی دوسرے کے متعلق خیال کر سکتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہیں تو خواب میں بھی اس کا امکان ہے۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ کوئی شخص اگر آپ ﷺ کو

اس حلیہ میں دیکھے جو صحیح احادیث میں آیا ہے تو اس نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے۔

لیکن اگر وہ کوئی اور صورت دیکھے یا کوئی ایسا شخص دیکھے جو اسے خلاف شریعت کسی کام کا حکم دے رہا ہو یا ایسا کام کر رہا ہو جو نبی کریم ﷺ کے شایان شان نہیں تو اسے رسول اللہ ﷺ کی زیارت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شیطان آپ ﷺ کی شکل نہیں بن سکتا مگر یہ بات نہیں کی کہ وہ کسی اور شکل میں آ کر جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔ اس دور کے شیطان مرزا دجال نے دعویٰ کیا تھا:

منم مسیح و محمد که مجتبی باشد

میں مسیح ہوں اور محمد مجتبیٰ ہوں

خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت حاصل کرنے کے لیے لوگوں نے بہت سے وظائف اور طریقے گھڑے ہیں جن کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ خلوص دل سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے۔ اگر قبولیت کے خاص اوقات میں دعا کی جائے تو امید اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے انبیاء کی زیارت بھی اللہ تعالیٰ جسے کرانا چاہے کرا سکتا ہے۔

نبی ﷺ کا نام سن کر انگوٹھے چومنا

سوال کیا نبی ﷺ کا نام سن کر انگوٹھے چومنا جائز ہے؟

جواب جب اذان ہو رہی ہو تو مؤذن کے کلمات کا جواب دینا چاہیے اور مؤذن کے کلمات "اَشْهَدُ أَنَّ......" کے بعد مندرجہ ذیل کلمات پڑھنے چاہییے:

« وَ اَنَا اَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا » [مسلم، كتاب الصلاة، باب إستحباب القول مثل قول المؤذن ...... الخ (٣٨٦)، ابن خزيمة(١/٢٢٠)]

اس کے علاوہ اذان ہوتے وقت کوئی اور عمل قرآن و حدیث، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے ثابت نہیں۔ اذان نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بھی ہوتی تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنتے تھے، انھیں جو تعلیم دی گئی تھی وہ احادیث میں مذکور ہے، عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ ، ثُمَّ صَلُّوْا عَلَيَّ » [مسلم، كتاب الصلاة ، باب استحباب القول مثل قول المؤذن...... الخ(٣٨٤)، بخاري ، كتاب الاذان (٦١١)]

"جب تم اذان سنو تو جو کلمات مؤذن کہتا ہے وہی تم بھی کہا کرو اور پھر مجھ پر درود پڑھو۔"

صحیح مسلم کی دوسری روایت میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ فَقَالَ اَحَدُكُمُ اللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، ثُمَّ قَالَ اَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ اَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ قَالَ اَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَشْهَدُ أَنَّ

مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ثُمَّ قَالَ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ قَالَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ قَالَ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ قَالَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ قَالَ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، ثُمَّ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِنْ قَلْبِهٖ دَخَلَ الْجَنَّةَ » [مسلم، کتاب الصلوٰۃ : باب استحباب القول مثل قول الموذن ...... الخ (٣٨٥)]

''جب مؤذن اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہے تو تم اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہو، پھر جب وہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے تو تم بھی اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو، پھر جب وہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہے تو تم بھی اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہو، پھر جب وہ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ کہے تو تم لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہو، پھر جب وہ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کہے تو تم لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہو، پھر جب وہ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہے تو تم بھی اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہو اور جب وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے تو تم بھی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو، جس نے جواب خلوص دل سے دیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

اس کے علاوہ کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے انھیں انگوٹھے چومنے اور آنکھیں ملنے کا حکم دیا ہو اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک صحابی سے صحیح سند سے ثابت ہے حتیٰ کہ ائمہ اربعہ سے کوئی اس کی سند پیش نہیں کر سکتا۔

اس صریح اور واضح حدیث کے ہوتے ہوئے (جس میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے جواب میں صرف وہی کلمہ دہرانے کی تعلیم ہے اور اس سارے جواب پر جنت کی ضمانت ہے کہیں بھی انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر ملنے کا ذکر نہیں ہے) افسوس صد افسوس کہ لوگوں نے کہیں انگوٹھے چومنے، کہیں " قرة عينى " والے الفاظ کہنے شروع کر دیے ہیں۔ یہ خود ساختہ حرکتیں اور خود ساختہ الفاظ ایسے ہیں جن کا دین اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ اس بارے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اور دوسری جتنی روایات ہیں وہ سب کی سب موضوع یعنی بناوٹی اور خود ساختہ ہیں۔

چنانچہ فقہ حنفی کی معتبر کتاب "رد المحتار (١/٢٩٣)" میں ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"لَمْ يَصِحَّ فِي الْمَرْفُوْعِ مِنْ كُلِّ هٰذَا شَيْءٌ"

''اس بارے میں جتنی بھی مرفوع روایات ہیں ایک بھی صحیح سند سے ثابت نہیں۔''

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے ابن طاہر حنفی کی کتاب ''التذکرة'' کے حوالہ سے لکھا ہے:

جس روایت میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے انگوٹھا چوما، وہ روایت صحیح نہیں ہے۔'' [الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعة:(٩)]

حسن بن علی ہندی تعلیقات مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں:

" كُلُّ مَا رُوِيَ فِيْ وَضْعِ الْإِبْهَامَيْنِ عَلَى الْعَيْنَيْنِ عِنْدَ سَمَاعِ الشَّهَادَةِ الْمُؤَذِّنِ لَمْ يَصِحَّ "

'' مؤذن سے شہادتین کے کلمے سنتے وقت آنکھوں پر انگوٹھے رکھنے کے بارے میں جو کچھ روایت کیا گیا ہے اس میں سے کچھ بھی صحیح نہیں۔''

علامہ عینی حنفی نے اس سے منع فرمایا ہے، کہتے ہیں:

" يَجِبُ عَلَى السَّامِعِيْنَ تَرْكُ عَمَلٍ غَيْرِ الْإِجَابَةِ "

'' اذان سننے والے کو اذان کا جواب دینے کے علاوہ اور ہر عمل کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔''

حتیٰ کہ اہل علم نے تو ان روایات کو من گھڑت اور خود ساختہ قرار دیا ہے۔ امام ابونعیم الاصبہانی نے کہا:

" مَا رُوِيَ فِيْ ذٰلِكَ كُلُّهٗ مَوْضُوْعٌ "

'' اس بارے میں جو بھی روایت کی گیا ہے وہ سب کا سب موضوع و من گھڑت ہے۔''

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے:

" كُلُّهَا مَوْضُوْعَاتٌ " [تيسير المقال]

'' یہ سب کا سب موضوع و من گھڑت ہے۔''

اور جس حدیث میں '' قرۃ عینی'' والی عبارت ہے، اس کے متعلق امام شیبانی "تمییز الطیب من الخبیث " میں فرماتے ہیں:

" قَالَ شَيْخُنَا وَ لَا يَصِحُّ، فِيْ سَنَدِهٖ مَجَاهِيْلُ مَعَ انْقِطَاعِهٖ عَنِ الْخِضْرِ وَ كُلُّ مَا رُوِيَ مِنْ هٰذَا فَلَا يَصِحُّ رَفْعُهٗ الْبَتَّةَ " [تمييز الطيب من الخبيث(١٨٩)]

'' شیخ سخاوی فرماتے ہیں کہ یہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ والی حدیث صحیح نہیں کیونکہ یہ منقطع بھی ہے اور اس کی سند میں راوی بھی مجہول ہیں۔''

امام الانبیاء کا نام سن کر انگوٹھے چوم کر آنکھوں کو لگانا یہ محبت نہیں ہے بلکہ محبت اس چیز کا نام ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے کے لیے کائنات کی ہر چیز کو قربان کر دیا جائے۔ دیکھیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے پانی کو اپنے جسموں پر ملنا شروع کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَا يَحْمِلُكُمْ عَلٰى هٰذَا !؟ قَالُوْا حُبُّ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ أَنْ يُّحِبَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اَوْ يُحِبَّهُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ فَلْيَصْدُقْ حَدِيْثَهٗ إِذَا حَدَّثَ وَلْيُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ إِذَا اؤْتُمِنَ وَ لْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهٗ » [شعب الايمان للبيهقي (١٥٣٣)، هداية الرواة(٤٩٢٠)، الصحيحة (٢٩٩٨)

""تمھیں کسی چیز نے ایسا کرنے پر ابھارا ہے؟" کہنے لگے: "اللہ اور اس کے رسول کی محبت نے۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "جسے یہ بات پسند ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کریں، تو وہ بات کرتے وقت سچ بولا کرے، امانت میں خیانت نہ کرے اور پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرے۔"
یعنی قول وفعل میں رسول اللہ ﷺ کا سچا تابع بن جائے۔

جمعرات کو مردوں کی روحوں کا گھر آنا

سوال کیا جمعرات کو مردوں کی روحیں گھروں میں آتی ہیں؟
جواب جمعرات کو فوت شدہ لوگوں کی روحیں اپنے ورثا کے گھروں میں واپس آنے کی کوئی بھی روایت ثابت نہیں ۔ نہ روحیں شب براءت ہی کو واپس آتی ہیں۔ مردے قیامت کے دن ہی قبروں سے نکلیں گے۔

قبر میں میت کو نبی ﷺ کی صورت کا دکھایا جانا

سوال حدیث میں آتا ہے کہ میت سے رسول مکرم کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو کیا رسول اللہ ﷺ خود بنفسِ نفیس قبر میں تشریف لاتے ہیں؟
جواب جب انسان اس دار فانی سے اپنا وقت مقررہ ختم کرکے قبر کی آغوش میں پہنچتا ہے تو اس سے منکر نکیر جو سوالات کرتے ہیں ان میں سے ایک سوال نبی کریم ﷺ کے متعلق بھی ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: «مَا كُنتَ تَقُوْلَ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ» "تو اس مرد کے متعلق کیا کہتا ہے؟" اگر آدمی ایماندار ہو تو اس کا صحیح جواب دیتا ہے اور اگر کافر ہو تو کہتا ہے: «لَا أَدْرِيْ» "میں نہیں جانتا۔" لیکن کسی صحیح حدیث میں یہ مذکور نہیں کہ آپ ﷺ خود تشریف لاتے ہیں یا آپ ﷺ کی صورت وہاں پیش کی جاتی ہے جسے دیکھ کر اور اشارہ کرکے فرشتے کہتے ہوں: «مَا كُنتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ»
ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مشکاۃ کی شرح مرقاۃ میں لکھا ہے:

" قِيْلَ يُكْشَفُ لِلْمَيِّتِ حَتّٰى يَرَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ هِيَ بُشْرٰى عَظِيْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِ إِنْ صَحَّ ذٰلِكَ وَ لَا نَعْلَمُ حَدِيْثًا صَحِيْحًا مَرْوِيًّا فِيْ ذٰلِكَ " [مرقاة شرح مشكاة(١/٢٤١)]

"کہا گیا ہے کہ میت کے لیے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ نبی کریم ﷺ کو دیکھتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو مومن کے لیے بڑی عظیم خوشخبری ہے (کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کر لیتا ہے) لیکن ہم نہیں جانتے کہ کوئی صحیح حدیث اس بارے میں مروی ہے۔"
امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

” وَ سُئِلَ (الْحَافِظُ بْنُ حَجَرٍ) هَلْ يُكْشَفُ لَهُ (اَىْ لِلْمَيِّتِ) حَتّٰى يَرَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَاَجَابَ اَنَّهُ لَمْ يَرِدْ هٰذَا فِيْ حَدِيْثٍ وَ اِنَّمَا ادَّعَاهُ بَعْضُ مَنْ لَا يُحْتَجُّ بِهِ بِغَيْرِ مُسْتَنَدٍ سِوَى قَوْلِهِ هٰذَا الرَّجُلِ وَ لَا حُجَّةَ فِيْهِ لِاَنَّ الْاِشَارَةَ اِلَى الْحَاضِرِ فِي الذِّهْنِ“

[شرح صدور (٦٠)، مرقاة(١/٣٤٠)]

” حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا: ”کیا میت کے لیے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ نبی کریم ﷺ کو دیکھتا ہے؟“ تو انھوں نے جواب دیا: ”یہ بات کہ میت کے لیے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا ہے، کسی حدیث میں مروی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے غیر مستند باتوں سے استدلال کیا ہے جو قابل حجت نہیں سوائے اس قول ” هذا الرجل“ کے اور اس میں اس کے متعلق کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے کہ ھٰذا اسم اشارہ یہاں ذہن کے لیے ہے۔“

ھٰذا اسم اشارہ سے استدلال درست نہیں کیونکہ حضور دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک حضور ذہنی (تصوراتی) اور دوسرا حضور شخصی، یہاں حضور ذہنی مراد ہے شخصی نہیں۔ [مرقاة المفاتيح (١/٣٤٠)]

اس کے علاوہ قرآن مجید اور کتب احادیث میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ ھٰذا اسم اشارہ کو بعید کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جس کی طرف ھٰذا کا اشارہ ہو وہ پاس ہی موجود ہو۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ فرشتے جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کرنے کے لیے تشریف لائے تو پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے۔ انھوں نے آمد کا سبب دریافت کیا تو وہاں فرشتوں نے جواب دیا:

﴿ اِنَّا مُهْلِكُوْا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴾ [العنكبوت:٣١]

” ہم اس بستی کے باشندوں کو ہلاک کرنے والے ہیں کیونکہ یہ ظالم ہیں۔“

لوط علیہ السلام سدوم اور ابراہیم فلسطین میں تھے۔ بستی سدوم پاس موجود نہیں تھی لیکن فرشتے ” ھٰذہٖ“ کا اشارہ کر کے کہتے ہیں کیونکہ سدوم ابراہیم علیہ السلام اور فرشتوں کے ذہن میں تھا۔ اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ ہرقل نے بیت المقدس میں جب سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق پوچھا تو کہا:

« اَيُّكُمْ اَقْرَبُ نَسَبًا بِهٰذَا الرَّجُلِ »[بخاری، كتاب بدء الوحی : باب بدء الوحی(٧)]

” تم میں سے اس آدمی کے نسبی لحاظ سے کون زیادہ قریب ہے۔“

اسی طرح اس روایت میں یہ بھی موجود ہے: « اِنِّيْ سَائِلٌ عَنْ هٰذَا الرَّجُلِ » مراد یہ ہے کہ جب بیت المقدس میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق گفتگو ہوئی تو آپ ﷺ کے لیے ” ھٰذا“ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اور بیت المقدس مدینہ سے تقریباً (٨١٠) میل کے سفر پر ہے تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں ” ھٰذا“ اسم اشارہ حضور شخصی کے لیے نہیں بلکہ حضور ذہنی کے لیے بولا گیا ہے کیونکہ آپ ﷺ گفتگو کے وقت وہاں موجود نہ تھے۔ اسی طرح صلح حدیبیہ میں بدیل بن ورقاء مشرکین مکہ

کی طرف سے شرائط صلح نامہ طے کرنے کے لیے سفیر بن کر آیا اور گفتگو کر کے واپس مکہ پہنچا تو اس نے کہا:

« اِنَّا قَدۡ جِئۡنَاكَ مِنۡ عِنۡدِ هٰذَا الرَّجُلِ »[مسند احمد (١٨١٦٦)]

''ہم تمھارے پاس اس آدمی سے ہوکر آئے ہیں۔''

سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا سنا تو تحقیق حال کے لیے اپنے بھائی کو بھیجا اور کہا:

« اِرۡكَبۡ اِلٰى هٰذَا الۡوَادِىۡ فَاعۡلَمۡ لِىۡ عِلۡمَ هٰذَا الرَّجُلِ »[بخاری، كتاب المناقب: باب إسلام ابی ذرالغفاری(٣٨٦١)]

''تو اس کی طرف سوار ہو اور مجھے اس آدمی کے بارے میں معلومات فراہم کر۔''

اس قسم کی کئی مثالیں کتب احادیث میں موجود ہیں کہ ھٰذا اسم اشارہ کو بعید اور حضور ذہنی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طرح جو قبر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کیا جاتا ہے اور اس میں لفظ ھٰذا مستعمل ہے وہ بھی حضور ذہنی کے لیے ہے جیسا کہ اوپر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے حوالے سے گزر چکا ہے۔

درود کی آواز

(سوال) دنیا میں جہاں کہیں بھی درود پڑھا جاتا ہے کیا اس کی آواز خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سنتے ہیں جیسا کہ ایک روایت سے بھی ایسا ثابت ہوتا ہے؟

(جواب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَيۡهِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا ﴾ [الاحزاب:٥٦]

''بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلاۃ بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی اس نبی پر صلاۃ و سلام بھیجتے رہو۔''

معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر صلاۃ و سلام پڑھنا چاہیے لیکن یہ بات کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ دنیا میں جہاں بھی درود پڑھا جاتا ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی آواز پہنچ جاتی ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سنتے ہیں۔امام ابن قیم رحمہ اللہ نے صلاۃ و سلام کے متعلق جو کتاب بنام ''جلاء الأفهام'' لکھی ہے اس میں ایک روایت حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے اس سند کے ساتھ درج کی ہے:

« قَالَ الطَّبۡرَانِىُّ حَدَّثَنَا يَحۡيَى بۡنُ اَيُّوۡبَ الۡعَلَّافِ حَدَّثَنَا سَعِيۡدُ بۡنُ اَبِىۡ مَرۡيَمَ عَنۡ خَالِدِ بۡنِ يَزِيۡدَ عَنۡ سَعِيۡدِ بۡنِ اَبِىۡ هَلَالٍ عَنۡ اَبِى الدَّرۡدَاءِ رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ سَلَّمَ : اَكۡثِرُوا الصَّلَاةَ عَلَىَّ يَوۡمَ الۡجُمُعَةِ فَاِنَّهٗ يَوۡمٌ مَشۡهُوۡدٌ تَشۡهَدُهُ الۡمَلَائِكَةُ لَيۡسَ مِنۡ عَبۡدٍ

يُصَلِّيْ عَلَيَّ اِلَّا بَلَغَنِيْ صَوْتُهُ حَيْثُ كَانَ قُلْنَا وَ بَعْدَ وَفَاتِكَ قَالَ وَ بَعْدَ وَفَاتِيْ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْاَرْضِ اَجْسَادَ الْاَنْبِيَاءِ »

''حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جمعہ والے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو۔ یہ ایسا دن ہے کہ جس میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ کوئی آدمی مجھ پر درود نہیں پڑھتا مگر مجھ تک اس کی آواز پہنچ جاتی ہے وہ جہاں کہیں بھی ہو۔'' ہم نے کہا: ''آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری وفات کے بعد بھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے۔''

یہ روایت درست نہیں۔ امام عراقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' اِنَّ اِسْنَادَهُ لَا يَصِحُّ '' [القول البديع فی الصلاة علی الحبيب الشفيع(ص/١٥٩)]

''اس کی سند صحیح نہیں۔''

اس کی سند کے صحیح نہ ہونے کی دو وجوہات ہیں:

① سعید بن ابی مریم اور خالد بن یزید کے درمیان انقطاع ہے۔ یعنی سعید بن ابی مریم نے یہ حدیث خالد سے نہیں سنی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خالد بن یزید ۱۳۹ھ میں فوت ہوئے۔ [تهذيب التهذيب(١٧٨/٢)] جب کہ سعید بن ابی مریم کی ولادت ۱۴۴ھ میں ہوئی۔ [تهذيب التهذيب(٢٩٦/٢)] گویا کہ سعید خالد کی وفات کے پانچ سال بعد پیدا ہوئے تو پھر یہ روایت صحیح کیسے ہو سکتی ہے؟

② دوسری علت یہ ہے کہ سعید بن ابی ہلال اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے درمیان بھی انقطاع ہے۔ سعید بن ابی ہلال مصر میں ۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ [تهذيب التهذيب(٣٤٢/٢)] جب کہ ابو درداء رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخر میں فوت ہو چکے تھے۔ [تقريب التهذيب (ص/٥٢)] لہٰذا ۷۰ھ میں پیدا ہونے والے آدمی کی ابودرداء رضی اللہ عنہ سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی اس دنیائے فانی سے جا چکے تھے۔

امام صلاح الدین العلائی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سعید بن ابی ہلال کی روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرسل ہے۔ [جامع التحصيل :(٢٢٢٤)] اور جابر رضی اللہ عنہ مدینہ میں ۷۰ھ کے بعد فوت ہوئے۔ [تقريب التهذيب(ص/٥٢)] تو جب سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ان کی روایت مرسل ہے تو جابر رضی اللہ عنہ سے پہلے فوت ہو جانے والے صحابی ابو درداء رضی اللہ عنہ سے ان کی روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

علاوہ ازیں علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے القول البدیع میں طبرانی کبیر کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

« اَخْرَجَهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْكَبِيْرِ بِلَفْظِ اَكْثِرُوْا الصَّلَاةَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَاِنَّهُ يَوْمٌ مَشْهُوْدٌ تَشْهَدُهُ الْمَلَائِكَةُ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يُصَلِّيْ عَلَيَّ اِلَّا بَلَغَتْنِيْ صَلَاتُهُ حَيْثُ كَانَ »

یعنی جلاء الافہام میں اس روایت کے اندر ''بَلَغَتْنِيْ صَوْتُهُ'' اور القول البدیع میں '' بَلَغَتْنِيْ صَلَاتُهُ '' کے الفاظ

ہیں۔ پہلی حدیث کا مطلب ہے مجھے اس کی آواز پہنچتی ہے اور دوسری کا مطلب ہے مجھے اس کا درود پہنچتا ہے۔ دوسری صورت میں مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ کو درود پہنچا دیا جاتا ہے۔ بہرکیف جلاء الافہام والی روایت کہ جس میں نبی ﷺ کو درود کی آواز پہنچانے کا ذکر ہے اسنادی لحاظ سے قابل احتجاج نہیں۔

لفظ وہابی سے نفرت کیوں؟

سوال وہابی کے لفظ سے لوگوں کو متنفر کیوں کیا جاتا ہے حالانکہ وہاب خود اللہ تعالیٰ کا نام ہے؟

جواب سرزمین نجد و حجاز میں امام محمد بن عبدالوہاب ؒ نے جب توحید خالص اور اتباع سنت کی دعوت دی اور اس کے لیے عملی جہاد کیا تو اس کی تکلیف سب سے زیادہ شرک و بدعت میں گرفتار لوگوں کو ہوئی۔ ہندوستان میں جب شاہ اسماعیل شہید ؒ اور ان کے ساتھیوں نے دعوت و جہاد کا علم بلند کیا اور سکھوں اور انگریزوں کے خلاف لڑائی شروع کی تو انگریز نے انھیں وہابی کے نام سے بدنام کیا تاکہ لوگ جہاد میں ان کا ساتھ نہ دیں، ورنہ فی الحقیقت وہابی نہ کوئی مذہب ہے اور نہ فرقہ۔ دراصل جہاد کو بدنام کرنے کے لیے غیر مسلموں نے ہر دور میں کوئی نہ کوئی ہتھکنڈا استعمال کیا۔ پہلے وہابی کہہ کر جہاد کو بدنام کیا جاتا تھا تو آج انہی مجاہدین کو بنیاد پرست اور دہشت گرد کہہ کر لوگوں کو جہاد سے متنفر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا بڑے بھائی جتنا ادب

سوال میں نے سنا ہے اہل حدیث نبی اکرم ﷺ کو بڑے بھائی جتنا احترام دیتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

جواب یہ بات کہ وہابی لوگ حضور ﷺ کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی بڑے بھائی کی، سراسر غلط ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں اور آپ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کو فرض سمجھتے ہیں۔ بھلا کوئی اپنے بڑے بھائی کو بھی اللہ کا رسول مانتا ہے۔ (سبحانك هذا بهتان عظيم)

قرآن سے عید میلاد النبی ﷺ کا جواز

سوال کچھ لوگ قرآن مجید کی بعض آیات سے عید میلاد کا جواز ثابت کرتے ہیں ان کی محنت کہاں تک درست ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں۔

جواب نبی کریم ﷺ کی بعثت، ہجرت، تبلیغ، جہاد، امت پر شفقت اور آپ ﷺ کی زندگی کے دوسرے احوال پر مسلمان سے خوشی مطلوب ہے۔ یہ خوشی سال کے ۳۶۰ دنوں میں سے صرف ایک دن یا رات تک محدود نہیں بلکہ ہر زمانے میں ہر وقت اور ہر حالت میں ہونی چاہیے۔ یہ کس قدر زیادتی ہے کہ ہم مسلمان ہو کر سال میں صرف ایک دن تو خوشی اور جشن منائیں باقی

سارا سال نہ ہمیں آپ ﷺ کا قول وفعل یاد رہے، نہ زندگی میں آپ ﷺ کا اسوہ نظر آئے بلکہ ہماری زندگی کا ہر پہلو یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کی رسم و رواج کا مظہر ہو اور سال میں صرف ایک دن رسول اللہ ﷺ کے نام پر وہ بھی ان غیر مسلم قوموں کی مشابہت میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کے خلاف گزرے۔ قرآن مجید کی آیت:

﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ﴾ [یونس:۵۸]

''کہہ دیجیے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر خوش ہو جاؤ۔''

اس میں ''فَلْيَفْرَحُوْا'' سے نبی کریم ﷺ کی ولادت پر خوشی اور جشن منانے کا استدلال حقیقت میں تحریف قرآن ہے۔ کیونکہ ''فَلْيَفْرَحُوْا'' کا معنی خوشی مناؤ کون سی لغت میں ہے؟ بتاؤ کس مفسر یا مترجم نے لکھا ہے کہ اس کا معنی جلوس نکالو، بھنگڑے ڈالو، موسیقی بجاؤ، بیل چھکڑے، بسیں، ٹرک، ٹرالیاں سجا کر میدان میں آؤ، گنبد خضراء کا ماحول بناؤ اور اونٹوں پر بیٹھ کر گلی گلی گھومو اور شرکیہ نعتیں پڑھو۔

حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، ہلال بن سیاف، قتادہ، زید بن اسلم اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم نے اس فضل اور رحمت کی تفسیر اسلام اور قرآن مجید کے ساتھ کی ہے جس کی تائید اس سے پہلی آیت بھی کرتی ہے۔ امام ابن جریر، امام ابن کثیر، امام بغوی، امام قرطبی، ابن عربی اور دوسرے بہت سے مفسرین نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ ائمہ کی تفاسیر میں سے کسی بھی تفسیر میں نہیں ہے کہ اس رحمت سے مراد نبی کریم ﷺ کی ولادت ہے۔ یہ واضح ہو کہ لوگوں کیلئے اصل رحمت نبی کریم ﷺ کی بعثت اور رسالت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الانبیاء:۱۰۷]

اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔''

یہ آیت نص ہے کہ نبی کریم ﷺ کی رسالت جہانوں کے لیے رحمت ہے۔ اور صحیح مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو کہا گیا کہ آپ مشرکین کے لیے بددعا کریں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« اِنِّيْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا وَ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً »[مسلم، کتاب البر والصلة: باب النهی عن لعن الدواب وغيرها (۲۵۹۹)]

''میں لوگوں پر لعنت کرنے کے لیے نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

یہ آیت اور حدیث دونوں اس بات کو واضح کر رہی ہیں کہ جہانوں کے لیے رحمت نبی کریم ﷺ کی بعثت ہے۔ دوسرا جو صحیح بخاری کی روایت سے استدلال ہے وہ بھی باطل ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ دین اسلام وحی کے علاوہ کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا اور یہ بخاری کی حدیث میں جس بات کا تذکرہ ہے وہ خواب ہے اور خواب بھی نبی کریم ﷺ کا نہیں جو وحی ہوتا ہے بلکہ عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا خواب ہے اور ان کے مسلمان ہونے سے پہلے کا ہے۔ ایک کافر آدمی کے خواب سے دین کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ جسے بیان بھی اس نے حالت کفر ہی میں کیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے

کہ کافر کو مرنے کے بعد اس کے اچھے اعمال کی جزا نہیں ملتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [الفرقان:٢٣]

''اور ہم ان کے عملوں کی طرف پہنچے جو انھوں نے کیے تھے تو ہم نے اسے اڑتی ہوئی خاک بنا دیا۔''

دوسری آیت میں ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴾ [الكهف:١٠٥]

''یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اپنے رب کی آیتوں اور اس کی ملاقات کا، برباد ہو گئے ان کے اعمال۔ قیامت کے دن ہم ان کے لیے ترازو قائم نہیں کریں گے۔''

اگر ابولہب نبی کریم ﷺ کی ولادت کا سن کر خوش بھی ہوا تھا تو وہ ایک طبعی خوشی تھی کیونکہ ہر انسان اپنے اعزا کے بچے کی پیدائش پر خوش ہوتا ہے اور جو خوشی اللہ کے لیے نہ ہو اس کا کوئی ثواب نہیں ملتا اور پھر کیا وہ خوشی ہر سال مناتا تھا یا اس نے ایک ہی مرتبہ منائی تھی۔ قرآن مجید کی نصوص سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ کفار کے عذاب میں تخفیف نہیں ہو گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۝ وَ هُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا رَبَّنَا اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴾ [الفاطر:٣٦، ٣٧]

''اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ ان پر فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان میں سے ان کے عذاب میں تخفیف ہی کی جائے گی۔ ہم ہر ناشکرے کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ وہ اس میں چلائیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس سے نکال ہم اچھے کام کریں گے، ان کاموں کے علاوہ جو دنیا میں کرتے تھے۔ (اللہ تعالیٰ فرمائیں گے) کیا ہم نے تمھیں عمر نہیں دی تھی کہ اس میں سوچ لو جس نے سوچنا ہے اور تمھارے پاس ڈرانے والے بھی آئے تھے۔ اب چکھو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴾ [الزخرف:٧٤، ٧٥]

''یقیناً مجرم جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور وہ اس میں نا امید ہو کر پڑے رہیں گے۔''

اگر واقعی کسی کے خیال میں ان دلائل سے نبی کریم ﷺ پر خوشی اور جشن منانے کا شرعی حکم ثابت ہوتا ہے تو خود امام الانبیاء اور ان کے ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ بات سمجھ میں نہ آئی؟ اگر انھیں یہ سمجھ تھی تو انھوں نے یہ جشن کیوں نہ منایا؟ پھر اس روایت میں ہے کہ ابولہب نے کہا: ''میں اپنی انگلی سے پانی چوستا ہوں۔'' جب کہ انگلی اس کے ہاتھوں کا جز ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿ تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِيۡ لَهَبٍ ﴾ [لھب:۱]

''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ہلاک ہوگیا۔''

قرآن مجید کی یہ آیت بھی اس کی تردید کر رہی ہے۔ اب بات ابولہب کی درست ماننی ہے یا قرآن کی؟ فیصلہ کریں اور یاد رکھیں! نبی کریم ﷺ پر خوشی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ دین اسلام میں وہ چیزیں داخل کر دیں جن کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے دین پہنچانے میں خیانت کی ہے۔ (نعوذ باللہ)

بلکہ خوشی کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو مضبوطی سے تھام لیں اور اس میں کسی قسم کا اضافہ کرنے سے پرہیز کریں اور دل و جان سے اسلام کے احکامات تسلیم کریں۔ یہی آپ ﷺ کی محبت و اطاعت و اتباع ہے۔

شبینہ کی شرعی حیثیت

سوال شبینہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب مذکورہ صورت میں دو تین باتیں قابل غور ہیں، اولاً نفل نماز باجماعت ادا کرنا، ثانیاً نفل نماز کا اپنی طرف سے مقررہ اہتمام اور اس پر دوام و اصرار کرنا۔ یعنی خاص وقت یا معین مہینا میں اس کا خصوصی اہتمام کرنا۔ اول الذکر بات تو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''میں ایک رات اپنی خالہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ جب رسول اکرم ﷺ نماز تہجد میں مشغول ہوئے تو میں آپ کی بائیں جانب کھڑا ہوگیا اور آپ کی اقتداء میں نماز تہجد پڑھنے لگا حالانکہ آپ ﷺ نے میری امامت کی نیت نہیں کی تھی تو آپ ﷺ نے مجھے سر سے پکڑ کر اپنی دائیں جانب کھڑا کرلیا۔'' [صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اذا لم ینو الامام ان یوم ثم جاء قوم فامھم (٦٩٩)]

اور اسی طرح صحیح بخاری میں محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ سے سیدنا عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ منقول ہے کہ رسول اکرم ﷺ سیدنا عتبان کی فرمائش پر ان کے گھر تشریف لائے اور دو رکعت نماز باجماعت ادا فرمائی۔ [صحیح بخاری، کتاب التھجد: باب صلوۃ النوافل جماعۃ(١١٨٦)]

ان ہر دو احادیث صحیحہ سے ثابت ہوا کہ نفل نماز کی جماعت بلاشک و شبہ جائز ہے۔ لیکن اس کا اعلان کرنا، مردوں اور عورتوں کو بذریعہ اشتہارات جمع کرنا، نوافل با جماعت بالدوام ادا کرنا اور رات کو چراغ گل کرکے دعائیں مانگنا ناجائز اور بدعت ہے کیونکہ مطلقاً نفل نماز باجماعت ادا کرنا تو صحیح ہے لیکن یہ قیود مع اہتمام اس مطلق جواز کو بدعت میں بدل دیتے ہیں

جیسا کہ نماز چاشت صحیح احادیث سے ثابت ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام ہانی رضی اللہ عنہا سے یہ نماز مروی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اس کی پابندی کی وصیت بھی فرمائی۔ [صحیح بخاری، کتاب التھجد، باب صلوۃ الضحی فی الحضر (١١٧٨)]

مگر اس وصیت کے باوصف سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس کو بدعت کہتے ہیں (اس کی وجہ ذیل میں آ رہی ہے) جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ مجاہد کہتے ہیں:

« دَخَلْتُ أَنَا وَعُرْوَةُ ابْنُ الزُّبَيْرِ الْمَسْجِدَ فَإِذَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ جَالِسٌ إِلٰى حُجْرَةِ عَائِشَةَ وَ إِذَا أُنَاسٌ يُّصَلُّوْنَ فِي الْمَسْجِدِ صَلٰوةَ الضُّحٰى فَسَأَلْنَاهُ عَنْ صَلَاتِهِمْ ؟ فَقَالَ بِدْعَةٌ » [صحیح بخاری، کتاب العمرۃ : باب کم اعتمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم (١٧٧٥)، صحیح مسلم (١٢٥٥)]

''میں اور عروہ ابن زبیر دونوں مسجد میں داخل ہوئے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے پاس بیٹھے تھے اور اس وقت کچھ لوگ مسجد میں نماز چاشت پڑھ رہے تھے۔ ہم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ان کی اس نماز کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا: ''یہ بدعت ہے۔''

جب کہ یہ نماز متعدد اسانید صحیحہ سے مروی ہے جیسا کہ اوپر صحیح بخاری کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ مقام غور ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے بدعت کیوں کہا؟ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مسعود میں اس نماز کو با جماعت ادا کرنے کا دستور نہیں تھا۔ چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے:

" مُرَادُهٗ إِنَّ إِظْهَارَهَا وَالْإِجْتِمَاعَ لَهَا بِدْعَةٌ لَا أَنَّ صَلٰوةَ الضُّحٰى بِدْعَةٌ وَ قَدْ سَبَقَتِ الْمَسْئَلَةُ فِيْ كِتَابِ الصَّلٰوةِ "

''سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مراد یہ تھی کہ نماز چاشت کو مسجد میں ظاہر کر کے پڑھنا اور اس کے لیے اجتماع و اہتمام کرنا بدعت ہے نہ کہ نماز چاشت بدعت ہے۔''

امام ابو بکر محمد بن ولید الطرطوشی لکھتے ہیں:

" مَحَلُّهٗ عِنْدِيْ عَلٰى أَحَدِ وَجْهَيْنِ أَنَّهُمْ كَانُوْا يُصَلُّوْنَهَا جَمَاعَةً إِمَّا أَنَّهَا يُصَلُّوْنَهَا مَعًا أَوْ فَذًّا فَذًّا عَلٰى هَيْئَةِ النَّوَافِلِ فِيْ أَعْقَابِ الْفَرَائِضِ " [کتاب الحوادث والبدع (٤٠)]

''ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کی اس نماز کو تو اس لیے بدعت قرار دیا کہ وہ اسے با جماعت پڑھ رہے تھے یا اس لیے کہ اکیلے اکیلے اس طرح پڑھ رہے تھے جیسے فرائض کے بعد ایک ہی وقت میں تمام نمازی سنن رواتب پڑھا کرتے ہیں۔''

اس کی دوسری مثال یہ لے لیں کہ سبحان اللہ، اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کے وظائف اپنے اپنے مقام پر بڑے فضائل کے حامل ہیں اور مفسرین نے انھیں باقیات صالحات میں شمار کیا ہے، یہ بلندی درجات اور نجات اخروی کا بہترین ذریعہ ہیں مگر اس کے باوجود جب انھیں خاص قیود اور غیر ثابت تکلفات و التزامات کے ساتھ پڑھا جائے گا تو یہی وظائف ہلاکت اور

خسارے کا باعث بن جائیں گے۔ جیسا کہ سنن دارمی میں بسند صحیح سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے آتا ہے کہ کچھ لوگ کوفہ شہر کی مسجد میں حلقہ باندھے کنکریوں پر سبحان اللہ، اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ سو سو دفعہ پڑھ رہے تھے تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے انھیں ڈانٹتے ہوئے کہا:

« فَعُدُّوا سَيِّاٰتِكُمْ فَاَنَا ضَامِنٌ اَنْ لَّا يَّضِيعَ مِنْ حَسَنَاتِكُمْ شَيْءٌ وَّيْحَكُمْ يَا اُمَّةَ مُحَمَّدٍ ! مَا اَسْرَعَ هَلَكَتَكُمْ هٰؤُلَاءِ صَحَابَةُ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَوَافِرُونَ وَ هٰذِهٖ ثِيَابُهٗ لَمْ تَبْلَ وَ آنِيَتُهٗ لَمْ تُكْسَرْ...... اَوْ مُفْتَتِحُو بَابِ ضَلَالَةٍ ؟ » [سنن دارمی المقدمة: باب فی کراهية أخذ الرأی (٢٠٨)]

”تم اپنے گناہوں کو شمار کرو میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمھاری نیکیاں ضائع نہیں ہوں گی۔ اے امت محمد! تم پر افسوس ہے کہ تم کتنی جلدی ہلاکت میں مبتلا ہو گئے ہو، ابھی تو تم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بکثرت موجود ہیں، ابھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے بھی پرانے نہیں ہوئے اور آپ کے استعمال میں آنے والے برتن بھی نہیں ٹوٹے...... تم ایسا کر کے گمراہی کا دروازہ کھول رہے ہو۔“

اس روایت سے یہ ثابت ہوا کہ عبادت اور اطاعت جس طرح شریعت میں منقول ہو، اس کو اسی انداز میں ادا کرنا چاہیے یعنی جس ہیئت وصورت میں وہ عبادت ہوئی ہے، اس کو اسی طرز سے اپنانا چاہیے۔ اپنی طرف سے اس میں پابندیاں عائد کرنا، بغیر دلیل کے مطلق کو مقید کرنا، غیر موقت کو موقت کرنا یعنی کسی وقت کے ساتھ خاص کر لینا، غیر معین کو معین بنانا بدعت بن جائے گا، جس سے اجتناب ضروری ہے، وگرنہ ہلاکت میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ یہی وہ نکتہ ہے جس کے پیش نظر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے چاشت کو بدعت کہا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حلقہ باندھ کر اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ وغیرہ کا ذکر کرنے کو بدعت اور ہلاکت قرار دیا۔ امام ابو اسحاق شاطبی رقم طراز ہیں:

” مِنْهَا اِلْتِزَامُ الْكَيْفِيَّاتِ بِهَيْئَةِ الْاِجْتِمَاعِ عَلٰى صَوْتٍ وَّاحِدٍ وَّ اِتِّخَاذُ وِلَادَةِ النَّبِيِّ عِيْدًا وَّ مَا اَشْبَهَ ذٰلِكَ وَ مِنْهَا اِلْتِزَامُ الْعِبَادَاتِ مُعَيَّنَةً فِيْ اَوْقَاتٍ مُعَيَّنَةٍ لَمْ يُوْجَدْ لَهَا ذٰلِكَ التَّعْيِيْنُ فِي الشَّرِيْعَةِ كَالْتِزَامِ يَوْمِ نِصْفٍ مِّنْ شَعْبَانَ وَ قِيَامِ لَيْلَتِهٖ “

”یہ بھی بدعات سے ہے کہ کسی نیک عمل کی ادائیگی کے لیے اجتماع کی صورت میں ایک ہی آواز کے ساتھ ذکر کا التزام کرنا، عید میلاد النبی منانا اور اس کی مثل دیگر امور اور ان بدعات میں سے یہ بھی ہے کہ عبادات کو معین کرنا، معین اوقات کے ساتھ جن کی تعیین شریعت میں نہیں پائی جاتی۔ جیسا کہ ۱۵ شعبان اور اس کی رات کو پابندی کے ساتھ عبادت بجا لانے کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں۔“

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام شاطبی اور دیگر محدثین کی تصریح سے یہ بات ثابت ہوئی کہ شریعت نے جن عبادات و اطاعات کو مطلق چھوڑا ہے، ان میں اپنی طرف سے پابندیاں عائد کرنا ان کی ہیئت و کیفیت کو بدلنا ہے، ان کو اوقات کے ساتھ معین کرنا گویا دین کو بدلنا ہے اور اس کا نام تحریف ہے اور یہ گمراہی ہے۔

لہٰذا لوگوں کا نوافل کے لیے اہتمام، خصوصی شبینہ کرنا، اس کے لیے لوگوں کو تیار کرنا، اس پر اصرار کرنا سراسر سنت اور سبیل المومنین کے خلاف ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین، فقہاء اور محدثین رحمہم اللہ نے اس تکلف اور اہتمام کو پسند نہیں کیا۔ لہٰذا اس بدعت سے اجتناب کرنا چاہیے اور عبادت کا جو طریقہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اس پر عمل کرنا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعمال کا پیش کیا جانا

سوال کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور رشتہ داروں پر ہمارے اعمال پیش کیے جاتے ہیں؟ وضاحت کر دیں۔

جواب روز نامہ جنگ ۱۷ مئی بروز جمعہ ۱۹۹۶ء میں جو مسئلہ لکھا گیا ہے، اس کا عنوان ''اعمال پیش ہونا'' ہے۔ اس کے تحت مفتی صاحب نے داڑھی منڈوانے والوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''داڑھی منڈوانے والو! تمھارے اعمال روزانہ فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حرکات دیکھ کر کتنا دکھ ہوتا ہوگا؟'' اس پر مفتی صاحب نے کنز العمال (۳۱۸/۵) اور حلیۃ الأولیاء (۱۷۹/۶) کا حوالہ دیا پھر مزید عزیز و اقارب کے سامنے اعمال پیش کرنے کی دلیل کے طور پر مسند احمد (۱۶۵/۳) اور مجمع الزوائد (۲۲۸/۲) کا حوالہ ذکر کیا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ داڑھی منڈوانا اسلام میں حرام ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت اور عذاب الیم کو دعوت ہے لیکن اس ضمن میں اعمال پیش ہونے کے متعلق جو روایات پیش کی جاتی ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ [الحج: ۷٦]

''اللہ تعالیٰ جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے اور سارے معاملات اس کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔''

یعنی کائنات میں کسی چھوٹے یا بڑے معاملے کا مرجع اللہ تعالیٰ ہی ہے، کوئی دوسرا نہیں۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ (۲۱۰)، آل عمران (۱۰۹)، حدید (۵) وغیرہ میں بیان کیا ہے اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« تُعْرَضُ الْاَعْمَالُ فِيْ كُلِّ يَوْمِ خَمِيْسٍ وَ اثْنَيْنِ فَيَغْفِرُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ لِكُلِّ امْرِءٍ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا امْرَأً كَانَتْ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اُرْكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا اُرْكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا» [مسلم، کتاب البر والصلة: باب النهی عن الشحناء (۲۵٦۵)]

''ہر جمعرات اور سوموار کو تمام اعمال پیش کیے جاتے ہیں تو اس دن اللہ تعالیٰ ہر اس آدمی کو بخش دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتا سوائے اس آدمی کے کہ جس کے درمیان اور اس کے بھائی کے درمیان عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے ان دونوں کو چھوڑ دیجیے یہاں تک کہ صلح کرلیں۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! شعبان کے مہینے میں جس قدر آپ ﷺ روزے رکھتے ہیں، میں نے آپ کو اس قدر کسی دوسرے مہینے میں روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« ذٰلِكَ شَهْرٌ يَغْفُلُ النَّاسُ عَنْهُ بَيْنَ رَجَبٍ وَ رَمَضَانَ وَ هُوَ شَهْرٌ تُرْفَعُ فِيْهِ الْاَعْمَالُ اِلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فَأُحِبُّ اَنْ يُّرْفَعَ عَمَلِيْ وَ اَنَا صَائِمٌ »[نسائی، كتاب الصيام : باب صوم النبي بأبي هو و امي(۲۳۵۹)]

”یہ رجب اور رمضان کے درمیان ایسا مہینا ہے جس سے لوگ غافل ہیں اور یہ ایسا مہینا ہے جس میں رب العالمین کی طرف اعمال کو اٹھایا جاتا ہے۔ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل اس حالت میں اٹھایا جائے کہ میں روزہ دار ہوں۔“

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ سوموار اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس دن اللہ کے ہاں اعمال پیش کیے جاتے ہیں، میں پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل پیش ہو تو میں روزے کی حالت میں ہوں۔“ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« يُرْفَعُ اِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَ عَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ »[مسلم، كتاب الايمان: باب في قوله تعالىٰ إن الله لا ينام (۱۷۹)]

”اس کی طرف رات کا عمل دن کے عمل سے پہلے اٹھایا جاتا ہے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے۔“

ان تمام احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے محدث شہیر عبدالرحمٰن مبارک پوری رقمطراز ہیں:

” هٰذَا لَا يُنَافِيْ قَوْلَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُرْفَعُ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَ عَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ اَلْفَرْقُ بَيْنَ الرَّفْعِ وَ الْعَرْضِ لِاَنَّ الْاَعْمَالَ تُجْمَعُ فِيْ الْاُسْبُوْعِ وَ تُعْرَضُ فِيْ هٰذَيْنِ الْيَوْمَيْنِ فِيْ حَدِيْثِ مُسْلِمٍ تُعْرَضُ اَعْمَالُ النَّاسِ فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ مُؤْمِنٍ اِلَّا عَبْدٌ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اُنْظُرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا قَالَ ابْنُ حَجَرٍ وَ لَا يُنَافِيْ هٰذَا رَفْعُهَا فِيْ شَعْبَانَ فَقَالَ اِنَّهُ شَهْرٌ تُرْفَعُ فِيْهِ الْاَعْمَالُ وَ اُحِبُّ اَنْ يُّرْفَعَ عَمَلِيْ وَ اَنَا صَائِمٌ لِجَوَازِ رَفْعِ اَعْمَالِ الْاُسْبُوْعِ مُفَصَّلَةً وَ اَعْمَالِ الْعَامِ مُجْمَلَةً “ [تحفة الأحوذي:(۲/۵۵)]

”(سوموار اور جمعرات کو اعمال کا پیش کیا جانا) نبی ﷺ کے اس حکم کے منافی نہیں جس میں ہے کہ رات کا عمل دن سے قبل اور دن کا عمل رات سے قبل اٹھایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ رفع (یعنی اٹھانے) اور عرض (یعنی پیش کیے جانے) میں فرق ہے۔ اس لیے کہ پورے ہفتے میں اعمال جمع کیے جاتے ہیں اور ان دو دنوں (سوموار اور جمعرات) میں پیش

کیے جاتے ہیں۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ ہر جمعہ میں دو مرتبہ سوموار اور جمعرات کو اعمال اللہ کے ہاں پیش کیے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر مومن کو بخش دیتا ہے سوائے ان دو آدمیوں کے جن کی آپس میں عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو مؤخر کر دو یہاں تک کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ احادیث اس حدیث کے بھی خلاف نہیں جس میں ہے کہ اعمال شعبان کے مہینے میں اٹھائے جاتے ہیں اور میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل روزے کی حالت میں اٹھایا جائے۔ اس لیے کہ جائز ہے ہفتے کے اعمال تفصیلاً اٹھائے جاتے ہوں اور سال کے اعمال اجمالی طور پر شعبان میں اٹھائے جاتے ہوں۔''

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ ہمارے تمام اعمال اللہ کی طرف اٹھائے اور پیش کیے جاتے ہیں جو ان کی جزا و سزا کا مالک ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی متصرف الامور نہیں جس کے سامنے ہمارے اعمال پیش کیے جاتے ہوں۔ مسند احمد کے حوالے سے جو روایت پیش کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّ اَعْمَالَكُمْ تُعْرَضُ عَلٰى اَقَارِبِكُمْ وَ عَشَائِرِكُمْ مِنَ الْاَمْوَاتِ فَاِنْ كَانَ خَيْرًا اِسْتَبْشَرُوْا بِهِ وَ اِنْ كَانَ غَيْرَ ذٰلِكَ قَالُوْا اَللّٰهُمَّ لَا تُمِتْهُمْ حَتّٰى تَهْدِيَهُمْ كَمَا هَدَيْتَنَا »[مسند احمد (١٦٥/٣)]

''تمھارے اعمال تمھارے عزیز و اقارب میں سے مرنے والوں پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر اعمال بہتر ہوں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر بہتر نہ ہوں تو وہ کہتے ہیں: ''اے اللہ! تو ان کو اتنی دیر تک موت نہ دے جب تک انھیں ہماری طرح ہدایت نہ دے دے۔''

یہ روایت ضعیف ہے اس لیے کہ اس کی سند میں سفیان اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے درمیان مجہول راوی ہے۔ مفتی صاحب نے مسند احمد کے ساتھ مجمع الزوائد کا بھی حوالہ دیا ہے لیکن تعجب ہے کہ مفتی صاحب نے مجمع الزوائد کا حوالہ تو ذکر کر دیا لیکن امام ہیثمی رحمہ اللہ کی اس روایت پر جرح کو ہضم کر گئے۔ امام ہیثمی رحمہ اللہ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

'' رَوَاهُ اَحْمَدُ وَ فِيْهِ رَجُلٌ لَمْ يُسَمَّ '' [مجمع الزوائد (٣٣١،٣٣٢)]

''اس کو احمد نے روایت کیا ہے اور اس سند میں ایک آدمی ہے جس کا نام نہیں لیا گیا۔''

اس کے بعد امام ہیثمی رحمہ اللہ نے اس روایت کے مطابق ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کی طرف اشارہ کیا ہے اور ابو ایوب رضی اللہ عنہ کی یہ روایت امام ہیثمی رحمہ اللہ اس باب سے پہلے والے باب میں لائے ہیں اور اس کے بعد فرمایا: '' رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْكَبِيْرِ (١٩٤/١) وَالْاَوْسَطِ (٧٢/١) وَ فِيْهِ مَسْلَمَةُ بْنُ عَلِيٍّ وَ هُوَ ضَعِيْفٌ '' (اس روایت کو امام طبرانی ''المعجم الکبیر'' اور ''المعجم الأوسط'' میں لائے ہیں۔ اس کی سند میں مسلمہ بن علی ضعیف راوی ہے۔ مسلمہ بن علی کے متعلق امام بخاری، امام ابن حبان اور امام ابو زرعہ رازی رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ''یہ منکر الحدیث ہے۔'' امام ذہبی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

'' قَالَ الْبُخَارِيُّ كُلُّ مَنْ قُلْتُ فِيْهِ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ فَلَا تَحِلُّ الرِّوَايَةُ عَنْهُ ''

[میزان الاعتدال (٦/١)]

''امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ہر وہ شخص جس کے متعلق میں یہ کہوں کہ یہ منکر الحدیث ہے اس سے روایت بیان کرنا حلال نہیں۔''

امام یعقوب بن سفیان فسوی نے اسے ضعیف الحدیث، امام جوزجانی، امام ازدی، امام نسائی، امام دارقطنی، امام برقانی نے متروک الحدیث، امام آجری نے ابوداؤد سے غیر ثقہ وغیر مامون نقل کیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا:

"يَرْوِيْ عَنِ الْاَوْزَاعِيِّ وَ الزُّبَيْدِيِّ الْمَنَاكِيْرَ وَ الْمَوْضُوْعَاتِ" [تهذيب التهذيب (٤٣٩/٥-٤٤٠) (٧٧٥٨)]

''مسلمہ بن علی امام اوزاعی اور زبیدی سے منکر و موضوع روایات بیان کرتا تھا۔''

لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ روایت انتہائی کمزور ہے۔ حلیۃ الأولیاء اور کنز العمال کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«اِنَّ اَعْمَالَ اُمَّتِيْ تُعْرَضُ عَلَيَّ فِيْ كُلِّ يَوْمِ جُمُعَةٍ وَ اشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلَى الزُّنَاةِ»

[حلية الأولياء(١٧٩/٦)، كنز العمال(٣١٨/٥)]

''ہر جمعہ کو مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، زنا کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب بہت سخت ہوتا ہے۔''

یہ روایت بھی انتہائی ضعیف ہے۔ اس کی سند میں دو راوی مجروح ہیں۔ احمد بن عیسیٰ بن ماہان الرازی، یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں جھوٹی روایتیں بیان کرتا تھا اور عجیب و غریب روایات نقل کرتا تھا۔ محدثین نے اس پر کلام کیا ہے۔[میزان الاعتدال (١٢٨/١)، لسان الميزان(٢٤٤/١)]

اس روایت کا دوسرا راوی عباد بن کثیر بصری بھی متکلم فیہ ہے۔ لہٰذا یہ روایت بھی قابل حجت نہیں۔

اسی مضمون کی دو اور روایتیں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے منسوب ہیں۔ ایک روایت کو امام ابن عدی رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے۔
[الكامل(١٢٤/٢)]

اس کی سند میں فراش بن عبد اللہ ساقط الاعتبار ہے اور دوسری روایت میں محمد بن عبد الملک بن زیاط ابو سلمہ انصاری ہے جو من گھڑت اور جھوٹی روایتیں بیان کرتا ہے۔ جسے امام ابن طاہر نے کذاب کہا ہے۔[سلسلة الأحاديث الضعيفة (٩٧٥)، (٤٠٤/٢-٤٠٦)]

لہٰذا روزنامہ جنگ کے مفتی صاحب کی بیان کردہ روایات ضعیف اور ناقابل حجت ہیں جن سے استدلال کرنا کسی طرح بھی اہل علم کے لیے جائز نہیں، جب کہ قرآن مجید اور صحیح احادیث سے یہ بات بالیقین ثابت ہے کہ تمام اعمال کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جو متصرف الامور، جزا و سزا کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ہستی اسباب عالم سے بالاتر ہو کر متصرف الامور نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو متصرف الامور سمجھنا اور اعمال کو اس کی طرف لوٹانے کا عقیدہ رکھنا قطعاً غلط اور باطل ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کئی ایک ایسے واقعات ہوئے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اوجھل رہے اور وہ اعمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش نہیں کیے گئے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کا ایک خادم (یا خادمہ) تھا جو وہاں صفائی کا کام سرانجام دیتا تھا۔ جب وہ فوت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر اطلاع کیے اسے دفنا دیا گیا۔ چند روز بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق

دریافت کیا تو آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ وہ تو فوت ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« اَفَلَا کُنْتُمْ آذَنْتُمُوْنِیْ بِهِ ؟ دُلُّوْنِیْ عَلٰی قَبْرِهِ »[بخاری، کتاب الصلاة: باب کنس المسجد و التقاط الحرق(٤٥٨)]

”تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی؟ میری اس کی قبر پر رہنمائی کرو۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ سارا عمل رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر مخفی رہا۔ اگر آپ ﷺ پر امت کے اعمال پیش کرنے والی بات درست ہوتی تو یہ معاملہ آپ ﷺ پر کبھی مخفی نہ رہتا۔ اسی طرح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو جب حدیبیہ کے موقع پر سفیر بنا کر بھیجا گیا تو ان کا معاملہ بھی آپ ﷺ سے اوجھل رہا۔ لہٰذا جب آپ ﷺ کی زندگی میں آپ پر اعمال پیش نہیں کیے گئے تو آپ ﷺ کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ ہمارے اعمال آپ ﷺ پر پیش کیے جاتے ہیں اور اعمال صالحہ دیکھ کر آپ ﷺ خوش ہوتے ہیں اور اعمال سیئہ دیکھ کر آپ ﷺ دعا کرتے ہیں اور اسی طرح اعزا و اقارب کے بارے میں ایسا عقیدہ درست نہیں ہے۔

روایت ” لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ “

سوال کیا یہ روایت ” لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ “ صحیح ہے؟

جواب اس روایت کا مطلب ہے: ”اے محمد! اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو جہانوں ہی کو پیدا نہ کرتا۔“

یہ روایت موضوع ہے جیسا کہ امام صنعانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”الاحادیث الموضوعة(ص/٥٢)، (رقم/٧٨)“ میں اور علامہ عجلونی نے ”کشف الخفاء(١٦٤/٢)“ میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے ”الفوائد المجموعة فی الأحادیث الموضوعة(٣٢٦)“میں ذکر کیا ہے۔

ملا علی قاری کا یہ کہنا کہ حدیث کا معنی صحیح ہے اور اس کی تائید کے لیے دیلمی کی روایت ”یَا مُحَمَّدُ ! لَوْ لَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْجَنَّةَ وَ لَوْ لَاكَ مَا خَلَقْتُ النَّارَ “ اور ابن عساکر کی روایت ” لَوْلَاكَ مَا خَلَقْتُ الدُّنْیَا“ پیش کرنا حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہ روایات تب تائید میں پیش کی جا سکتی تھیں جب یہ پایہ ثبوت کو پہنچتیں جب کہ بلاشک و شبہ یہ روایات بھی ثابت نہیں۔ ابن عساکر والی روایت کو سیوطی اور امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے موضوع قرار دیا ہے، اسی طرح دیلمی والی روایت کو بھی علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں تو اللہ تعالیٰ نے جن و انس کی پیدائش کی حکمت بیان کی ہے:

﴿ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاریات:٥٦]

”جن و انس کی پیدائش کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔“

گویا اس مقصد کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے جن و انس کی پیدائش کا کوئی اور مقصد نہیں بتایا۔ کہیں یہ ثابت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے

یہ سب کچھ اس لیے پیدا کیا یا اس کے لیے پیدا کیا۔

پھر لطف کی بات ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اس حدیث کو چرا کر اپنی کتاب حقیقۃ الوحی کے صفحہ (۹۹) پر لکھا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ان الفاظ کے ساتھ مخاطب ہوا ہے: " لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ "

سوچیے! رب کائنات کی تخلیق کی وہ حکمت تسلیم کی جائے گی جو قرآن میں ہے یا وہ جو اس موضوع، من گھڑت اور جھوٹی روایت میں ہے؟

"نُورٌ مِنْ نُورِ اللّٰهِ" والی ایک روایت کی تحقیق

سوال جابر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھے اس بات کی خبر دیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے جابر! اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا کیا پھر یہ نور اللہ کی قدرت سے جہاں چاہا گھومتا رہا...... الخ۔'' فرمائیں کہ کیا یہ حدیث صحیح ہے؟

جواب محدثین کرام رحمہم اللہ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے رسول اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ کو اسناد کے ساتھ جمع کیا اور اس بات کی مکمل کوشش کی کہ کوئی ایسی بات رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب نہ ہو جو آپ نے نہیں کہی۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« مَنْ كَذِبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ »[صحيح بخارى، كتاب العلم: باب من كذب على النبى ﷺ (١٠٧)]

''جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔''

اور ایک روایت میں ہے:

« مَنْ قَالَ عَلَيَّ مَا لَمْ اَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ »[مسند احمد: (١/ ٦٥)]

''جس نے مجھ پر وہ بات کہی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنا لے۔''

اس لیے جو شخص بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف بات منسوب کر کے بیان کرتا ہے اس کے لیے سند کی شرط لگائی گئی پھر سند کی صحت کے لیے بھی کڑی شرائط کو مدنظر رکھا گیا اور جس روایت کی کوئی سند نہیں ہوتی اسے کسی صورت بھی قبول نہیں کیا جاتا۔ امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا:

" اَلْاِسْنَادُ عِنْدِىْ مِنَ الدِّيْنِ وَ لَوْ لَا الْاِسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ وَلٰكِنْ اِذَا قِيْلَ لَهُ مَنْ حَدَّثَكَ بَقِىَ"[تاريخ بغداد(٦/ ١٦٦)، مقدمه صحيح مسلم (٣٢)، معرفة علوم الحديث للحاكم: (ص/٦١)]

''اسناد میرے نزدیک دین میں سے ہیں اور اگر اسناد نہ ہوتیں تو ہر کوئی جو چاہتا کہہ دیتا لیکن جب اسے کہا جائے تجھے یہ حدیث کس نے بیان کی ہے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے۔''

ابن مبارک رحمہ اللہ کے شاگرد عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے یہ بات زنادقہ اور روایات گھڑنے والوں کے ذکر کے وقت کہی۔'' امام زہری رحمہ اللہ نے اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ ضعیف ومتروک راوی سے کہا:

" قَاتَلَكَ اللّٰهُ يَابْنَ اَبِیْ فَرْوَةَ مَا جَرَاكَ عَلَى اللّٰهِ ؟ لَا تَسْنُدُ حَدِيْثَكَ تُحَدِّثُنَا بِاَحَادِيْثَ لَيْسَ لَهَا خَطَمٌ وَلَا اَزِمَةٌ " [معرفة علوم الحديث للحاكم (ص/٦)، طبع جديد (ص/٤٢)]

''اے ابن ابی فروہ! اللہ تجھے ہلاک کرے تو اللہ تعالیٰ پر کس قدر جراَت کرنے والا ہے، تو اپنی روایت کی سند بیان نہیں کرتا، تو ہمیں ایسی روایتیں بیان کرتا ہے جن کی نکیلیں اور مہاریں نہیں ہیں۔''

الغرض محدثین کے نزدیک روایت کے درست ہونے کیلئے سند کا صحیح ہونا ازحد ضروری ہے۔ مذکورہ بالا روایت جابر رضی اللہ عنہ کو کئی سیرت نگاروں نے بغیر سند کے درج کر دیا ہے اور بعض نے اسے امام عبدالرزاق کی طرف منسوب کیا ہے، ہمارے پاس امام عبدالرزاق کی ''المصنف'' گیارہ ضخیم جلدوں میں اور تفسیر عبدالرزاق تین جلدوں میں مطبوعہ موجود ہے لیکن یہ روایت ان میں ہمیں نہیں ملی۔ جو شخص اس روایت کی صحت کا داعی ہے وہ محدثین رحمہم اللہ کے قواعد کے مطابق اس کی ایک بھی صحیح سند پیش کرے۔ آج تک کوئی شخص اس کی ایک بھی صحیح سند پیش نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر طرح کی غلط بیانی، جھوٹی روایات اور عقائد فاسدہ سے محفوظ فرمائے اور سلف صالحین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور ائمہ محدثین کے نقش قدم پر چلائے۔ (آمین!)

نوری ستارے والی روایت کی تحقیق

سوال تحفۃ الصلاۃ الی النبی المختار (۱۸، ۱۹) میں بروایت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ بے شک سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: ''تمہاری عمر کتنی ہے؟'' جبرائیل علیہ السلام نے عرض کی: ''اے میرے آقا! میں نہیں جانتا کہ میری عمر کتنی ہے، ہاں! یا رسول اللہ! حجاب رابع عرش پر ایک نوری ستارہ ستر ہزار سال بعد طلوع ہوتا تھا جس کو میں نے ستر ہزار مرتبہ دیکھا ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے میرے رب کی عزت وعظمت کی قسم! اے جبرائیل! وہ نوری تارہ میں تھا۔'' دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کے متعلق تاریخ بخاری کا حوالہ جو مذکورہ کتاب میں دیا گیا ہے کیا یہ درست ہے؟

جواب رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

« مَنْ قَالَ عَلَیَّ مَالَمْ اَقُلْ فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ » [مسند احمد: (٦٥/١)]

''جس نے مجھ پر ایسی بات کہی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔''

اس لیے ایسے الفاظ جو رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کہے ہوں ان کی نسبت آپ کی طرف کرتے ہوئے ڈرنا چاہیے، ہمیں امام بخاری کی تاریخ کبیر اور تاریخ صغیر سے یہ روایت نہیں ملی بلکہ آج تک اس کی کوئی صحیح سند کسی حدیث کی کتاب سے نہیں ملی،

امام عبداللہ بن مبارک نے فرمایا:

" اَلۡاِسۡنَادُ عِنۡدِیۡ مِنَ الدِّیۡنِ وَلَوۡ لَا الۡاِسۡنَادُ لَقَالَ مَنۡ شَاءَ مَا شَاءَ " [مقدمه صحيح مسلم: باب بيان أن الإسناد من الدين: (٣٢)]

''سند دین میں سے ہے اور اگر سند نہ ہوتی تو جو شخص جو چاہتا کہہ دیتا۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ منہاج السنۃ (۴/۱۱) میں فرماتے ہیں:

''سند اس امت کی خصوصیات میں سے ہے...... لہٰذا کسی روایت کے صحیح ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی صحیح سند ہو، جب کسی روایت کی کوئی سند ہی نہ ہو تو وہ کسی طرح بھی حجت نہیں ہو سکتی۔''

نبی کریم ﷺ کا مسلک

(سوال) آج کل ہم بے شمار فرقے دیکھتے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی ﷺ کے طریقہ پر ہیں براہِ کرم رہنمائی فرمائیں کہ نبی ﷺ کا مسلک کیا تھا؟

(جواب) رسول اکرم ﷺ دین اسلام کی دعوت پیش کرنے والے سچے نبی و رسول تھے۔ آپ ہر قسم کی فرقہ بندی سے منع کرتے تھے۔ قرآن حکیم میں کئی ایک آیات اور رسول اکرم ﷺ کی کئی ایک صحیح احادیث فرقہ بندی کی ممانعت پر نص قطعی ہیں۔ اسلام اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتا ہے، افتراق و تشتت سے منع کرتا ہے۔ شیعہ، دیوبندی، بریلوی اور وہابی جیسے تمام فرقے رسول اللہ ﷺ کے بعد کی پیداوار ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ایسا سوال کرنا نادانی و حماقت ہے۔ یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسے یہود و نصاریٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں دعویٰ کر دیا۔ یہود کہتے تھے ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے اور عیسائی کہتے تھے کہ وہ عیسائی تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا: ''اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل کی گئی ہے؟ کیا تم سمجھتے نہیں۔'' پھر آگے فرمایا:

''ابراہیم (علیہ السلام) نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی بلکہ موحد مسلمان تھے اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔''

[آل عمران:٦٥_٦٧]

امام محمد بن اسحاق، امام ابن جریر اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے دلائل النبوۃ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ نجران کے نصاریٰ اور علمائے یہود رسول اللہ ﷺ کے پاس اکٹھے ہو گئے اور جھگڑنے لگے۔ علمائے یہود نے کہا: ''ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے۔'' اور نصاریٰ نے کہا: ''وہ تو نصرانی تھے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کی تکذیب کی کہ تورات ابراہیم علیہ السلام کے تقریباً ایک ہزار سال بعد نازل ہوئی اور انجیل تقریباً دو ہزار سال کے بعد تو ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی کیسے ہو گئے؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم خلیل اللہ کی طرف نسبت کے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کے دین میں ان کی اتباع کی، محمد ﷺ اور ان کے مہاجرین و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم اور دیگر مسلمان۔ [تيسير الرحمان لبيان القرآن (ص ١٨٥١)]

اس توضیح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اور عیسائی تو ابراہیم علیہ السلام کے بعد وجود میں آئے تو ان کا یہ دعویٰ مردود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی یا عیسائی تھے۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام ان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس دار فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ بالکل اسی طرح یہ بات بھی فضول اور باطل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجودہ فرقوں میں سے کسی ایک مذہب پر تھے کیونکہ یہ فرقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینکڑوں سال بعد میں پیدا ہوئے۔ ان فرقوں میں سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب وہ ہوگا جو اللہ کے نبی کے لائے ہوئے دین کی اتباع و اطاعت کرتا ہوگا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے جاتے ہوئے اپنی امت کے لیے کتاب و سنت دو چیزیں چھوڑی ہیں، جس نے ان دونوں پر عمل کر لیا وہ راہ راست پر ہے اور حق پر قائم ہے، جس نے قرآن و حدیث سے اعراض کیا اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کی وہ گمراہ ہے اور صراط مستقیم سے ہٹا ہوا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم ہر طرح کی فرقہ بندی سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے کتاب و سنت پر عمل پیرا ہو جائیں اور گمراہی سے بچ جائیں۔ (آمین!)

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت

سوال نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب نعت صفت بیان کرنے اور تعریف کرنے کو کہا جاتا ہے، ہمارے ہاں نعت کی اصطلاح نبی رحمت کی تعریف و توصیف کے لیے مخصوص ہے۔ آپ کی نعت بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ عمل باعث اجر و ثواب ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس میں شرک کی آمیزش نہ ہو جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ »

[بخاری، کتاب أحادیث الانبیاء: باب قول اللّٰه تعالیٰ: ﴿ واذكر فی الكتاب مريم ﴾ (٣٤٤٥)]

”مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ چڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھا چڑھا دیا ہے میں اس کا بندہ ہوں لہٰذا یہ کہو کہ (وہ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔“

اس سے ثابت ہوا کہ غیر شرکیہ نعت یا دوسرے اشعار وغیرہ بھی جائز ہیں جیسا کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کافروں کی ہجو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا: ”ان (کافروں) کی ہجو کرو، جبرئیل علیہ السلام تمھارے ساتھ ہیں۔“ [بخاری، کتاب بدء الخلق : باب ذکر الملائكة صلوات اللّٰه عليهم(٣٢١٣)]

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے کئی لوگ غلط استدلال پیش کرتے ہیں کہ اشعار وغیرہ پڑھنا درست نہیں:

﴿ وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ [الشعراء: ٢٢٤۔٢٢٦]

”شاعروں کی پیروی وہ کرتے ہیں جو بہکے ہوئے ہوں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ شاعر ہر وادی میں سر ٹکراتے

پھرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں۔"
اس آیت میں ان شعرا کی مذمت ہے جو اپنے اشعار میں اصول وضوابط کی بجائے ذاتی پسند یا ناپسند کے مطابق اظہار رائے کرتے ہیں، غلو و مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور شاعرانہ خیالات میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کے لیے حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لِاَنْ یَّمْتَلِئَ جَوْفُ الرَّجُلِ قَیْحًا یَرِیْهِ خَیْرٌ مِنْ اَنْ یَّمْتَلِئَ شِعْرًا »[مسلم ، كتاب الشعر: باب فی إنشاد الأشعار و بيان أشعر الكلمة و ذم الشعر(٢٢٥٧)]

"پیٹ کا لہو پیپ سے بھر لینا جو اسے خراب کر دے، شعر کے ساتھ بھر لینے سے بہتر ہے۔"
مذکورہ آیات کے متصل ہی آیت مبارکہ میں ان شاعروں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جن کی شاعری صداقت اور حقائق پر مبنی ہے اور استثناء ایسے الفاظ سے فرمایا گیا ہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایماندار، عمل صالح پر کاربند اور بکثرت ذکر الٰہی کرنے والا شاعر غلط، جھوٹی اور خیالی شاعری کر ہی نہیں سکتا۔ [دیکھیے: الشعراء:٢٢٧]
اس لیے شرک و کذب سے پاک اشعار اور نعت وغیرہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سید کسے کہتے ہیں؟

سوال کیا سید کوئی مخصوص ذات ہے یا ہر شخص کو سید کہا جا سکتا ہے؟
جواب موجودہ دور میں لفظ "سید" ایک مخصوص ذات کے لیے لوگ استعمال کرتے ہیں حالانکہ سید کوئی ذات نہیں ہے بلکہ کتاب و سنت کی رو سے شرافت و بزرگی اور سرداری کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے تمام کلمات استغفار پر " اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ "کو فضیلت دیتے ہوئے اسے سید الاستغفار قرار دیا ہے۔[بخاری، كتاب الدعوات: باب أفضل الاستغفار(٦٣٠٦)]
جمعۃ المبارک کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا:

« سَیِّدُ الْاَیَّامِ یَوْمُ الْجُمُعَةِ فِیْهِ خُلِقَ آدَمُ وَ فِیْهِ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَ فِیْهِ اُخْرِجَ مِنْهَا وَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا یَوْمُ الْجُمُعَةِ »[مستدرك حاكم (٢٧٧/١)، صحيح ابن خزيمة (١١٥/٣)]

"تمام دنوں کا سردار جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اور اسی دن جنت میں داخل کیے گئے اور اسی دن جنت سے نکالے گئے اور قیامت بھی اسی دن قائم ہوگی۔"
حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے "سید الشہداء" کہا۔ [مستدرك حاكم(١٢٠/٢)، (١٩٥/٣)، فتح الباری(٣٦٨/٧)، سلسلة الاحاديث الصحيحة (٣٧٤)]
ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ لفظ سید سرداری، شرافت اور بزرگی ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا:

« اِنَّ ابْنِیْ هٰذَا سَیِّدٌ » ”میرا یہ بیٹا سردار ہے۔“ [بخاری ، کتاب الصلح: باب قول النبی للحسن بن علی...... (۲۷۰۴)]

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَنَا سَیِّدُ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ »[بخاری، کتاب الانبیاء: باب قول الله عزوجل...... الخ (۳۳۴۰)]

”قیامت کے دن میں سب انسانوں کا سردار ہوں گا۔“

الغرض بے شمار صحیح احادیث میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن کہیں بھی یہ کسی مخصوص ذات پر نہیں بولا گیا، ہر مومن موحد اپنے اپنے مقام پر بزرگ و سید ہے۔

ماہ صفر منحوس ہے؟

سوال کچھ لوگ ماہ صفر کو منحوس سمجھتے ہیں کیا ان کی یہ بات درست ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ جب اس دنیائے فانی میں تشریف لائے تو دنیا جہالت اور گمراہی کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی اور کئی طرح کے توہمات اور شیطانی وساوس میں مبتلا تھی۔ زمانہ جاہلیت کے باطل خیالات اور رسومات میں سے ”صفر“ بھی ہے۔ صفر کے متعلق ان کا گمان تھا کہ ہر انسان کے پیٹ میں ایک سانپ ہوتا ہے، جب پیٹ خالی ہو اور بھوک لگی ہو تو وہ کاٹتا اور تکلیف پہنچاتا ہے۔ صفر کے متعلق یہ بھی خیال تھا کہ یہ ایک بیماری ہے جو پیٹ کو کاٹتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی لوگ صفر کے مہینے سے بدفال لیتے تھے کہ اس میں بکثرت مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے توہمات جاہلانہ کا رد فرمایا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« لَا عَدْوٰی وَ لَا صَفَرَ وَ لَا هَامَةَ »[بخاری، کتاب الطب: باب لا صفر و هو داء یاخذ البطن (۵۷۱۷)]

”ایک مرض اڑ کر دوسرے کو نہیں لگتا اور نہ مرض صفر ہی اس طرح ہے اور نہ ہامہ کی کوئی حقیقت ہے۔“

صفر سے مراد پیٹ کا مرض بھی لیا گیا ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ خیال ہے اور یہ بھی مراد لی گئی ہے کہ اس سے مراد صفر کا مہینا ہے یعنی ماہ صفر منحوس نہیں۔ بعض لوگ ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص مجھے ماہ صفر ختم ہونے کی بشارت دے گا میں اسے جنت کی بشارت دوں گا۔“ لیکن یہ روایت من گھڑت ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے الموضوعات الکبیر (ص/۱۱۶) میں لکھا ہے کہ اس روایت کی کوئی اصل نہیں۔ لہٰذا ماہ صفر کو منحوس خیال کرنا جاہلی توہمات سے ہے، اس کی کچھ حقیقت نہیں۔

ترانے کے لیے قیام

(سوال) ہمارے ملک پاکستان میں یہ طریقہ رائج ہے کہ قومی ترانہ کی تعظیم میں تمام لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں کیا یہ قیام نماز کے قیام کی طرح ہے اور کیا یہ درست ہے؟

(جواب) نماز والا قیام ایک شرعی عبادت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے آدمی، عورت یا کسی ترانے و نغمے کی تعظیم کے لیے بھی اپنی جگہ کھڑا ہونا جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَ الصَّلَاةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ ﴾ [البقرة:۲۳۸]

''نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے خاموش ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔''

معلوم ہوا کہ قیام صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرنا چاہیے، اللہ کے علاوہ کسی کے لیے قیام کرنا درست نہیں، جو اس چیز کو پسند کرتے ہیں کہ لوگ ان کے لیے کھڑے ہوں، ان کے لیے رسول اللہ ﷺ نے دوزخ کی وعید سنائی ہے۔ خواہ وہ استاد ہو یا مرشد، چودھری ہو یا وڈیرا، صدر ہو یا وزیراعظم یا کسی بھی شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والا افسر ہو، اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لیا ہے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ » [ابوداؤد، كتاب الأدب: باب فى قيام الرجل للرجل(۵۲۲۹)، ترمذى، كتاب الأدب: باب ما جآء فى كراهية قيام الرجل للرجل(۲۷۵۵)]

''جس آدمی کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔''

ابومجلز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« اَنَّ مُعَاوِيَةَ دَخَلَ بَيْتًا فِيْهِ ابْنُ عَامِرٍ وَ ابْنُ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا فَقَامَ ابْنُ عَامِرٍ وَ جَلَسَ ابْنُ الزُّبَيْرِ فَقَالَ لَهُ مُعَاوِيَةُ اِجْلِسْ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَّتَمَثَّلَ لَهُ الْعِبَادُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهُ بَيْتًا فِي النَّارِ » [مسند احمد(۹۳/۴، ۱۰۰)، شرح السنة (۲۹۵/۱۲) ، (۳۳۳۰)، امام بغوی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ھے۔]

''حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک گھر میں داخل ہوئے، اس گھر میں ابن عامر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما تھے تو ابن عامر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما بیٹھے رہے۔ ابن عامر رضی اللہ عنہ کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بیٹھ جاؤ بلاشبہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ بندے اس کے لیے مطیع ہو کر کھڑے کیے جائیں وہ اپنا گھر آگ میں بنا لے۔''

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے یوں بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّتَمَثَّلَ لَهُ بَنُوْ آدَمَ قِيَامًا وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ »[طبرانی کبیر(۳۶۲/۱۹)، مشكل الآثار

[(۳۹،۳۸/۲)

”جو آدمی اس بات کو پسند کرے کہ اولادِ آدم اس کے لیے قیام کی صورت میں مطیع ہو جائے اس کے لیے آگ واجب ہے۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ محبت تھی لیکن اتنی شدید محبت کے باوجود وہ آپ کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے:

« عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْه قَالَ لَمْ يَكُنْ شَخْصٌ اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ كَانُوْا اِذَا رَاَوْهُ لَمْ يَقُوْمُوْا لِمَا يَعْلَمُوْنَ مِنْ كَرَاهِيَتِهِ لِذٰلِكَ »[ترمذی، کتاب الأدب: باب ما جآء فی کراهية قيام الرجل للرجل(۲۷۵٤)، شرح السنة (۲۹٤/۱۲)]

”انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہیں تھا اور جب وہ آپ کو دیکھ لیتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ اس قیام کو برا سمجھتے ہیں۔“

اس حدیث کو امام ترمذی اور امام بغوی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جب رسول اللہ ﷺ جیسی پاکباز، اعلیٰ و ارفع ہستی کے لیے قیام جائز نہیں تو پھر آپ ﷺ کے علاوہ دوسرا کون ایسا ہوسکتا ہے جس کے لیے قیام کیا جائے؟ لہٰذا کسی سکول ماسٹر، جج، وکیل، پروفیسر، ڈائریکٹر، صدر، وزیراعظم، وزیراعلیٰ، فوجی افسر، جنرل و کرنل، بریگیڈیر، سیاستدان، دینی و سیاسی رہنما کے احترام میں یا کسی گلوکار وغیرہ کے ترانے و نغمے یا گانے پر کھڑے ہونا شرعاً درست نہیں بلکہ جو لوگ اس قیام کو پسند کرتے ہیں وہ اس دنیا ہی میں اپنے لیے جہنم خرید رہے ہیں۔ بعض لوگ قیام کے جواز کے لیے یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے آنے پر نبی کریم ﷺ نے انصار سے فرمایا:

« قُوْمُوْا اِلٰى سَيِّدِكُمْ » ”اپنے سردار کی طرف اٹھو۔“ [بخاری، کتاب المغازی: باب مرجع النبی من الأحزاب (٤١٢١)]

اس حدیث کے متعلق کہتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ کسی کی تعظیم کی خاطر کھڑا ہونا جائز ہے حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ نہیں فرمایا تھا: « قُوْمُوْا لِسَيِّدِكُمْ » ”اپنے سردار کی خاطر اٹھو۔“ بلکہ یوں فرمایا تھا: « قُوْمُوْا اِلٰى سَيِّدِكُمْ » ”اپنے سردار کی طرف اٹھ کر جاؤ۔“ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگِ خندق میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے تھے۔ ایک قریشی حبان بن قیس نے ان کے بازو کی رگ میں تیر مارا تھا جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے تھے۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان کی خبر گیری کرنے کے لیے مسجد میں خیمہ لگوا دیا۔ جب آپ ﷺ خندق سے واپس آئے تو آ کر اسلحہ اتارا اور غسل کیا، آپ ﷺ کے پاس جبرائیل امین تشریف لائے۔ انھوں نے کہا: ”آپ ﷺ نے اسلحہ اتار دیا ہے، اللہ کی قسم! میں نے تو ابھی اسلحہ نہیں اتارا، ان کی طرف نکلیں۔“ نبی کریم ﷺ نے پوچھا: ”کہاں؟“ تو جبرائیل علیہ السلام نے بنو قریظہ کی طرف اشارہ کیا۔ قصہ مختصر یہ کہ آپ ﷺ نے بنو قریظہ کا محاصرہ کیا کیونکہ انھوں نے معاہدہ توڑ کر کفار کی مدد کی تھی۔ جب وہ محاصرہ سے تنگ آ گئے تو انھوں نے قلعوں سے نکل کر اپنے آپ کو مسلمانوں کے

سپرد کرنا اس شرط پر منظور کیا کہ سعد رضی اللہ عنہ جو حکم کریں گے، وہ ہمیں منظور ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سعد رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا تو وہ گدھے پر سوار ہو کر آئے۔ جب سعد رضی اللہ عنہ مسجد کے قریب آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا: ''اپنے سردار (یا بہترین آدمی) کی طرف اٹھو۔'' [بخاری: كتاب المغازي : باب مرجع النبي من الأحزاب (٤١٢١، ٤١٢٢)]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« قُوْمُوْا اِلٰى سَيِّدِكُمْ فَاَنْزِلُوْهُ » [مسند احمد (١٤٢/٦)]

''اپنے سردار کی طرف اٹھو اور انھیں اتارو۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے، جو ان کے نزدیک صحیح یا حسن ہے۔ [فتح الباری (٤١٢/٧)]

یہی بات ظفر احمد تھانوی دیوبندی نے قواعد فی علوم الحدیث میں ذکر کی ہے۔ اس حدیث سے صراحتاً معلوم ہوا کہ سعد رضی اللہ عنہ مریض تھے اور گدھے پر سوار ہو کر آئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں جب دیکھا کہ وہ مسجد کے قریب آ چکے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو انھیں گدھے سے اتارنے کے لیے حکم دیا تھا نہ کہ اپنی جگہ کھڑے ہونے کا۔ علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی تعظیم کے لیے قیام کا حکم دے بھی کیسے سکتے تھے؟ جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لیے تعظیمی قیام بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ترمذی کی حدیث میں اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

''یا محمد'' کا نعرہ

سوال میں نے سنا ہے ایک روایت سے ''یا محمد'' کا نعرہ لگانا ثابت ہے۔ کیا ایسے ہی ہے اس روایت کی استنادی حیثیت کیا ہے؟

جواب اس روایت کو امام بخاری رحمہ اللہ نے بطریق سفیان عن ابی اسحاق عن عبد الرحمٰن بن سعد بیان کیا ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا پاؤں سن ہو گیا تو انھیں ایک آدمی نے کہا: ''جو آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے، اسے یاد کریں۔'' تو انھوں نے کہا: ''یا محمد'' [الأدب المفرد (٩٦٤)]

یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ اس میں مرکزی راوی ابو اسحاق السبیعی ہے جو مدلس ہے اور روایت معنعن ہے۔ پھر ابو اسحاق السبیعی کو اختلاط بھی ہو گیا تھا۔ وہ اس کے بیان کرنے میں اضطراب کا شکار ہے۔ کبھی اس روایت کو الہیثم بن حنش جیسے مجہول راوی سے (ابن السنی: ۱۷۰)، کبھی ابو شعبہ سے (ابن السنی: ۱۶۸) اور کبھی عبد الرحمٰن بن سعد سے (الأدب المفرد: ۹۶۴) بیان کرتا ہے لہٰذا یہ روایت ابو اسحاق کی تدلیس اور اضطراب کی وجہ سے ضعیف ہے۔

مجاہد کہتے ہیں: ''ایک آدمی کی ٹانگ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس سن ہو گئی تو اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''اپنے سب سے محبوب شخص کو یاد کرو۔'' تو اس نے کہا: ''محمد'' تو اس کی ٹانگ کی بے حسی ختم ہو گئی۔'' [ابن السنی (١٢٩)]

یہ روایت موضوع ہے، اس کی سند میں غیاث بن ابراہیم کذاب و خبیث اور وضاع راوی ہے۔

[المغنی (٣٦/٢)، میزان الاعتدال (٣٣٧/٣)، الكامل (٢٠٣٦/٦)، احوال الرجال (٣٧٠)]

نبی ﷺ کی مخالفت پر سزا

سوال کیا یہ واقعہ کسی حدیث میں موجود ہے کہ ایک شخص نے دائیں ہاتھ سے کھانا کھانے میں نبی ﷺ کی مخالفت کی تو اس کا ہاتھ شل ہو گیا؟

جواب سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ کے پاس اپنے بائیں ہاتھ سے کھانا کھانا شروع کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔'' اس نے کہا: میں اس کی طاقت نہیں رکھتا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم طاقت نہیں رکھو گے اسے صرف تکبر نے اس بات سے روکا اس کے بعد اپنا دایاں ہاتھ اپنے منہ کی طرف نہیں اٹھا سکا۔'' [صحيح مسلم كتاب الاشربة: باب آداب الطعام والشراب أحكامها، (٢٠٢١)]

یہ حدیث بالکل صحیح ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مکمل اطاعت کرنی چاہیے، کسی بھی مسئلہ میں نافرمانی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ مسلمان کامیاب تبھی ہوتا ہے جب وہ اپنے پیارے رسول ﷺ کی قولاً وعملاً مکمل پیروی کرے۔

نجد کا صحیح مفہوم

سوال نجد کا صحیح مفہوم کیا ہے اور حدیث نجد سے کون مراد ہے؟

جواب باطل پرست ہمیشہ اہل حق کے بارے میں مختلف قسم کے پروپیگنڈے سے کام لیتے آئے ہیں۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل واحسان سے حق نمایاں اور آشکارا ہو کر رہا اور مخالفین ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ عرب کی سرزمین پر جب شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے توحید کا علم بلند کیا اور شرک و بدعات کی سرکوبی کی تو کلمہ گو مشرکوں نے نبی کریم ﷺ کی احادیث کا معنی ومفہوم بدل کر انھیں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ پر چسپاں کرنا شروع کر دیا۔ انہی احادیث میں سے ایک حدیث نجد ہے۔ جس کا صحیح مصداق عراق کی سرزمین ہے، جہاں بہت سے گمراہ فرقوں نے جنم لیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد عراق سے بہت سے فتنے رونما ہوئے۔ جنگ نہروان، واقعہ کربلا، بنو امیہ اور بنو عباس کی لڑائیاں، پھر تاتاریوں کے خونریز معرکے، اس طرح گمراہ فرقوں یعنی خوارج، شیعہ، معتزلہ، جہمیہ، مرجیہ وغیرہ کا ظہور بھی کوفہ بصرہ اور بغداد جو عراق کے مشہور شہر ہیں، سے ہوا۔ بارہ سو سال تک تمام مسلمانوں کا متفقہ طور پر یہی موقف رہا کہ نجد قرن شیطان سے مراد عراق ہی کا علاقہ ہے لیکن بارھویں صدی کے بعد اہل بدعت نے ان احادیث کا مفہوم بگاڑ کر انھیں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ پر چسپاں کرنا شروع کر دیا۔ اب رسول اللہ ﷺ کی احادیث ملاحظہ کریں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ نجد قرن شیطان سے مراد عراق ہی کا علاقہ ہے۔

① عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انھوں نے کہا:

« ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ شَامِنَا اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ يَمَنِنَا قَالُوْا يَا

رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ فِیْ نَجدِنَا قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْ شَامِنَا اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْ يَمَنِنَا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ فِیْ نَجدِنَا فَاَظُنُّهُ قَالَ فِی الثَّالِثَةِ : هُنَاكَ الزَّلَازِلُ وَ الْفِتَنُ وَ بِهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ » [بخاری، کتاب الفتن: باب قول النبی:الفتنة من قبل المشرق(٧٠٩٤)، مسند احمد (١١٨/٢)، ترمذی، کتاب المناقب: باب فی فضل الشام والیمن (٣٩٥٣)، شرح السنة (٢٠٦/١٤) صحیح ابن حبان (٧٢٥٧)]

''ایک دن رسول اللہ ﷺ نے دعا کی:''اے اللہ! ہمارے لیے شام میں برکت نازل فرما، اے اللہ! ہمارے لیے یمن میں برکت نازل فرما۔'' لوگوں نے کہا:''اے اللہ کے رسول! اور ہمارے نجد (عراق) کے لیے بھی''(دعا کریں)؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:''اے اللہ! ہمارے لیے شام میں برکت نازل فرما، اے اللہ! ہمارے لیے یمن میں برکت نازل فرما۔'' لوگوں نے کہا:''اے اللہ کے رسول! ہمارے نجد کے لیے بھی دعا کریں؟'' میں سمجھتا ہوں کہ آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا:''وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہاں سے شیطان کا سینگ نکلے گا۔''

② عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْ مَدِيْنَتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِیْ مَكَّتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِیْ شَامِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِیْ يَمَنِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِیْ صَاعِنَا وَ مُدِّنَا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ فِیْ عِرَاقِنَا ؟ فَاَعْرَضَ عَنْهُ فَقَالَ : فِيْهَا الزَّلَازِلُ وَ الْفِتَنُ وَ بِهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ »[حلیة الأولیاء(١٣٣/٦)، طبرانی کبیر(١٣٤٢٢)]

''اے اللہ! ہمارے لیے مدینہ میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے مکہ میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے شام میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے یمن میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے صاع اور مد میں برکت نازل فرما۔'' ایک آدمی نے عرض کیا:''اے اللہ کے رسول! اور ہمارے عراق میں بھی؟'' آپ ﷺ نے اس سے اعراض کیا پھر فرمایا:''اس میں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہاں سے شیطان کا سینگ رونما ہوگا۔''

③ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْ مَدِيْنَتِنَا وَ فِیْ صَاعِنَا وَ فِیْ مُدِّنَا وَ فِیْ يَمَنِنَا وَ فِیْ شَامِنَا فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَ فِیْ عِرَاقِنَا ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : بِهَا الزَّلَازِلُ وَ الْفِتَنُ وَ مِنْهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ »[کتاب المعرفة والتاریخ: باب ما جآء فی الکوفة(٧٤٦/١)]

''اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدینہ، صاع، مد، یمن اور شام میں برکت نازل فرما۔'' تو ایک آدمی نے کہا:''اے اللہ کے رسول! اور ہمارے عراق میں بھی؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا:''وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہاں سے شیطان کا سینگ نکلے گا۔''

④ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ مَدِيْنَتِنَا وَ مُدِّنَا وَ صَاعِنَا وَ يَمَنِنَا وَ شَامِنَا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَ فِيْ عِرَاقِنَا ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ مَدِيْنَتِنَا وَ مُدِّنَا وَ صَاعِنَا وَ يَمَنِنَا وَ شَامِنَا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَ فِيْ عِرَاقِنَا ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنْهَا الزَّلَازِلُ وَ الْفِتَنُ وَ مِنْهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ » [كتاب المعرفة والتاريخ : باب ما جآء في الكوفة (۷٤۷/۲)]

”اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدینہ، مد، صاع، یمن اور شام میں برکت ڈال دے۔“ ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اور ہمارے عراق میں بھی؟“ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدینہ، مد، صاع، یمن اور شام میں برکت ڈال دے۔“ ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اور ہمارے عراق میں بھی؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہاں سے زلزلے اور فتنے اٹھیں گے اور شیطان کا سینگ طلوع ہوگا۔“

کتاب ”المعرفة والتاريخ“ کے اسی باب میں یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے جن میں نجد عراق کی تصریح ہے۔

۵ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُشِيْرُ بِيَدِهٖ يَؤُمُّ الْعِرَاقَ : هَا اِنَّ الْفِتْنَةَ هٰهُنَا ، هَا اِنَّ الْفِتْنَةَ هٰهُنَا...... ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ »[مسند احمد (۱٤۳/۲)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو عراق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا (آپ ﷺ نے کہا): ”خبردار! بے شک فتنہ یہاں سے ہوگا، خبردار بے شک فتنہ یہاں سے ہوگا۔ یہ بات آپ نے تین مرتبہ کہی، (پھر کہا): ”یہاں سے شیطان کا سینگ نکلے گا۔“

۶ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز پڑھا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

« اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ مَدِيْنَتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِيْ مُدِّنَا وَ صَاعِنَا اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ شَامِنَا وَ يَمَنِنَا فَقَالَ رَجُلٌ وَ الْعِرَاقُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !؟ فَسَكَتَ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ مَدِيْنَتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِيْ مُدِّنَا وَ صَاعِنَا اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ حَرَمِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِيْ شَامِنَا وَ يَمَنِنَا فَقَالَ رَجُلٌ وَ الْعِرَاقُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !؟ قَالَ مِنْ ثَمَّ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ وَ تَهِيْجُ الْفِتَنُ »[المعجم الأوسط للطبراني (٤١١٠)، مجمع الزوائد(۳/ ۳۰۸)]

”اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدینہ میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے مد اور صاع میں برکت نازل فرما، اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے شام اور یمن میں برکت نازل فرما۔“ ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اور عراق کے بارے میں بھی دعا کریں؟“ آپ ﷺ خاموش رہے، پھر فرمایا: ”اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدینہ

میں برکت نازل فرما! اور ہمارے لیے ہمارے مد اور صاع میں برکت نازل کر، اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے حرم میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے شام ویمن میں برکت نازل فرما۔'' ایک آدمی نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اور عراق کے لیے بھی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہاں سے شیطان کا سینگ نمودار ہو گا اور فتنے ابلیں گے۔''

⑦ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا نبی ﷺ نے دعا فرمائی:

« اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ شَامِنَا وَ يَمَنِنَا فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ ! وَ عِرَاقِنَا فَقَالَ اِنَّ بِهَا قَرْنَ الشَّيْطَانِ وَ تَهِيْجُ الْفِتَنُ وَ اِنَّ الْجَفَاءَ بِالْمَشْرِقِ »[مجمع الزوائد (۳۰۸/۳)]

''اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے شام اور یمن میں برکت پیدا فرما۔'' تو قوم میں سے ایک آدمی نے کہا: ''اے اللہ کے نبی! اور ہمارے عراق کے لیے بھی دعا کریں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک عراق میں شیطان کا سینگ ہے اور فتنے بھڑکیں گے اور بے شک جفا مشرق میں ہے۔''

امام ہیثمی رحمہ اللہ نے کہا: ''اس حدیث کو امام طبرانی نے ''المعجم الکبیر'' میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔''

⑧ سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« يَا اَهْلَ الْعِرَاقِ ! مَا اَسْئَلَكُمْ عَنِ الصَّغِيْرَةِ وَ اَرْكَبَكُمْ لِلْكَبِيْرَةِ ! سَمِعْتُ اَبِيْ ، عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الْفِتْنَةَ تَجِيْءُ مِنْ هٰهُنَا وَ اَوْمَاَ بِيَدِهِ نَحْوَ الْمَشْرِقِ مِنْ حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنَا الشَّيْطَانِ »[مسلم ، کتاب الفتن: باب الفتنة من المشرق من حيث يطلع قرنا الشيطان(۲۹۰۵)]

''اے عراقیو! تم چھوٹے چھوٹے مسائل کس قدر دریافت کرتے ہو اور کبائر کا ارتکاب کرتے ہو۔ میں نے اپنے باپ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا، وہ کہتے تھے میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بلا شبہ فتنہ یہاں سے آئے گا'' اور اپنے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا کہ یہاں سے شیطان کے سینگ نکلیں گے۔''

⑨ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« رَأْسُ الْكُفْرِ نَحْوَ الْمَشْرِقِ »[بخاری، کتاب بدء الخلق : باب خير مال المسلم غنم يتبع بها شعف الجبال (۳۳۰۱)، ابن حبان(۷۲۵۵)، مسند ابی یعلی(۶۳۴۰)، مسلم، کتاب الایمان: باب تفاضل اهل الایمان فيه و رجحان أهل اليمن فيه(۵۲)، مسند ابی عوانة (۶۰/۱)، مسند احمد(۵۰۶/۲)، مسند حمیدی (۴۵۲/۲)]

''کفر کا سرچشمہ مشرق کی طرف ہے۔''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اسی روایت میں ابن حبان اور مسلم وغیرہ میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« اَلْاِیْمَانُ یَمَان وَ الْحِکْمَةُ یَمَانِیَةٌ وَ رَأْسُ الْکُفْرِ قِبَلَ الْمَشْرِقِ »
''ایمان وحکمت کا محل تو یمن ہے اور کفر کا سرچشمہ (مدینہ منورہ سے) مشرق کی جانب ہے۔''

(۱۰) جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« غِلَظُ الْقُلُوْبِ وَ الْجَفَاءُ فِی الْمَشْرِقِ وَ الْاِیْمَانُ فِیْ اَهْلِ الْحِجَازِ »[مسلم ، کتاب الایمان: باب تفاضل اهل الایمان فیه و رجحان أهل الیمن فیه(۵۲)، صحیح ابن حبان(۷۲۵۲)، شرح السنة (۲۰۲/۱٤)]
''لوگوں کی سختی اور جفا مشرق میں ہے اور ایمان اہل حجاز میں ہے۔''

مذکورہ بالا دس صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ حجاز، شام اور یمن یہ تینوں ملک اسلام و ایمان کا مرکز ہیں اور یہاں سے اسلام وایمان کا علم بلند ہوتا رہے گا اور مدینہ سے مشرق کی جانب واقع عراق کا علاقہ فتنوں کا سرچشمہ اور ضلالت و گمراہی کا مرکز ہے، یہاں سے بہت سے فتنوں نے جنم لیا ہے، یہاں خیر کم اور شر زیادہ ہے، آپ ﷺ نے یمن و شام کے لیے خصوصی برکت کی دعا فرمائی۔ اس لیے کہ مکہ مکرمہ جو آپ ﷺ کا پیدائشی اور آبائی علاقہ ہے، یہ یمن کا شہر تھا اور مدینہ منورہ جہاں آپ ﷺ کی وفات ہوئی اور وہ آپ ﷺ کا مسکن و مدفن تھا، وہ شام کا شہر تھا۔ علامہ شرف الدین الطیبی رقمطراز ہیں :

" اِنَّمَا دَعَا لَهَا بِالْبَرَکَةِ لِاَنَّ مَوْلِدَهُ بِمَکَّةَ وَ هِیَ مِنَ الْیَمَنِ وَ مَسْکَنُهُ وَ مَدْفَنُهُ بِالْمَدِیْنَةِ وَ هِیَ مِنَ الشَّامِ " [شرح الطیبی علی مشکاة المصابیح(۳۹۵۸/۱۲)]
''آپ ﷺ نے شام و یمن کے لیے برکت کی دعا اس لیے کی کہ آپ ﷺ کی جائے پیدائش مکہ ہے اور وہ یمن کا علاقہ ہے اور آپ ﷺ کا مسکن و مدفن مدینہ میں تھا اور وہ شام کے علاقوں میں سے ہے۔''

شارح حدیث علامہ اشرف رحمہ اللہ نے بھی یہی بات ذکر کی ہے۔[دیکھیے: مرقاة المفاتیح شرح مشکاة المصابیح (۲۳۹/۱۰)]

معلوم ہوا کہ حجاز مقدس کی سرزمین کے لیے آپ ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی اور وہ نجد جس کے لیے آپ ﷺ نے دعا نہیں کی وہ عراق کا علاقہ ہے جیسا کہ اوپر ذکر کردہ صحیح احادیث میں تصریح ہے۔ عرب کے اندر نجد نام کے بہت سے علاقے ہیں اور ہر ایک نجد کے لیے آپ ﷺ نے خبر نہیں دی کہ وہاں سے زلزلے اور فتنے رونما ہوں گے۔ بلکہ خاص عراق کے بارے میں فرمایا کہ وہاں سے زلزلے اور فتنے جنم لیں گے۔ اس لیے حدیث نجد کا مصداق اصل عراق ہے نہ کہ اہل حجاز۔

آیئے پہلے نجد کا معنی و مفہوم سمجھ لیں کہ لغت عرب میں نجد کسے کہتے ہیں پھر دیکھیں کہ عرب میں نجد نام کے کتنے علاقے ہیں۔

نجد مصدر ہے جس کا معنی بلندی و رفعت ہے، گویا ہر اونچی و بلند چیز کو نجد کہا جاتا ہے۔

علامہ مجد الدین فیروز آبادی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" اَلنَّجْدُ مَا اَشْرَفَ مِنَ الْاَرْضِ اَلطَّرِیْقُ الْوَاضِحُ الْمُرْتَفِعُ وَ مَا خَالَفَ الْغَوْرَ اَیْ تِهَامَةَ اَعْلَاهُ

تِهَامَةُ وَ الْيَمَنُ وَ اَسْفَلُهُ الْعِرَاقُ وَ الشَّامُ وَ اَوَّلُهُ مِنْ جِهَةِ الْحِجَازِ ذَاتُ عِرْقٍ "
[القاموس المحيط (١/٣٥٢)]

"نجد بلند زمین کو کہتے ہیں یعنی بلند اور واضح راستہ جو غور و نشیب یعنی تہامہ کے بالمقابل ہے، وہ تمام اونچی زمین والا علاقہ جو تہامہ اور یمن سے شروع ہوتا ہے اور عراق و شام تک پھیلا ہوا ہے۔ حجاز کی جانب سے اس کی ابتدا ذات عرق مقام سے ہوتی ہے اور ذات عرق اہل عراق کا میقات ہے جہاں سے وہ احرام باندھتے ہیں۔"

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

" اَلنَّجُدُ مِنَ الْاَرْضِ قِفَافُهَا وَ صَلَابَتُهَا وَمَا غَلُظَ مِنْهَا وَ اَشْرَفَ وَ ارْتَفَعَ وَاسْتَوَى"
[لسان العرب (١٤/٤٥)]

"نجد زمین کا وہ حصہ ہے جو بلند و بالا، مضبوط و گاڑھا اور اونچائی پر واقع ہو۔"

مزید فرماتے ہیں:

" وَ مَا ارْتَفَعَ عَنْ تِهَامَةَ اِلَى اَرْضِ الْعِرَاقِ فَهُوَ نَجُدٌ "[لسان العرب(١٤/٤٥)]

"زمین کا وہ بلند حصہ جو تہامہ سے شروع ہو کر عراق کی زمین کی طرف جاتا ہے، وہ نجد ہے۔"

معلوم ہوا کہ سطح مرتفع اور بلند زمین کو نجد کہتے ہیں اور عرب میں بہت سارے نجد ہیں۔ شیخ ابوعبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ الحموی صاحب معجم البلدان نے درج ذیل نجد شمار کیے ہیں:

① نجد اَلوز ② نجد اُجا ③ نجد برق ④ نجد خال ⑤ نجد الثری

⑥ نجد عفر ⑦ نجد العقاب ⑧ نجد کبکب ⑨ نجد مریع ⑩ نجد الیمن

[معجم البلدان(٥/٢٦٥)، لسان العرب(١٤/٤٧)]

معلوم ہوا کہ عرب کی سرزمین میں نجد نام کے بہت سے علاقے ہیں اور اصل میں ہر سطح مرتفع کو نجد کہا جاتا ہے اور مختلف بلند و بالا علاقوں کو نجد کہا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ تمام نجد زلزلوں اور فتنوں کی آماجگاہ ہیں یا کوئی خاص نجد ہے جہاں سے فتنے اور شیطان کا سینگ رونما ہوا ہے یا مزید ہوگا؟ تو اوپر درج کردہ احادیث صحیحہ میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ فتنوں کی آماجگاہ اور فسادیوں کا مسکن نجد عراق ہے اور تاریخ عالم اس بات پر گواہ ہے کہ جتنے فتنے، فرق اور مفسدہ پرداز بالخصوص کوفہ و بصرہ سے رونما ہوئے ہیں، اتنے کسی اور جگہ سے نہیں ہوئے اور شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ کا تعلق نجد عراق سے نہیں بلکہ نجد یمن سے ہے جس کے لیے اللہ کے نبی ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی ہے۔ لہٰذا معترضین کا حدیث نجد کو شیخ پر چسپاں کرنا علم حدیث و تاریخ و جغرافیہ عرب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور یہ سب کچھ وہ اپنی بدعات اور رسم و رواج اور شرک جیسے گھناؤنے عمل پر پردہ ڈالنے کے لیے کرتے ہیں۔

کیا نبی ﷺ نے بدر کے کافر مقتولوں کا ٹھکانا پہلے بتلا دیا تھا؟

(سوال) کیا یہ درست ہے کہ کیا نبی ﷺ نے بدر کے کافر مقتولوں کے قتل ہونے کی جگہ کی پہلے ہی سے نشاندہی فرما دی تھی؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا اس سے نبی ﷺ کا عالم غیب ہونا ثابت نہیں ہوتا؟

(جواب) نبی کریم ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے بدر میں قتل ہونے والے کافروں کے نام لے لے کر یہ بات بتائی تھی کہ یہ فلاں کا مقتل ہے، یہ فلاں کے قتل کی جگہ ہے، یہاں فلاں آدمی مارا جائے گا وغیرہ اور جس طرح آپ ﷺ نے بتایا تھا بالکل اسی طرح ہر ایک آپ ﷺ کی بتائی ہوئی جگہ قتل ہوا تھا۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے مشورہ کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بات کی اور آپ ﷺ نے اعراض کیا پھر عمر رضی اللہ عنہ نے بات کی تو آپ ﷺ نے ان سے بھی اعراض کیا، پھر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر آپ ﷺ ہمیں حکم کریں کہ ہم گھوڑوں کو سمندر میں ڈال دیں تو ہم ضرور ڈال دیں گے اور اگر آپ ﷺ یہ حکم دیں کہ ہم انھیں برک الغماد تک دوڑا دیں تو ہم ایسا ضرور کریں گے۔'' آپ ﷺ نے لوگوں کو بلایا اور وہ چلے یہاں تک کہ بدر میں اترے۔ وہاں انھیں قریش کے پانی پلانے والے ملے اور ان میں بنی حجاج کا ایک سیاہ غلام بھی تھا، انھوں نے اسے پکڑ لیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے متعلق پوچھ گچھ کی تو اس نے کہا: ''مجھے ابوسفیان کا علم نہیں لیکن ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف تو لوگوں میں موجود ہیں۔'' جب اس نے یہ کہا تو صحابہ اس کو مارنے لگے: ''تو وہ کہنے لگا'' میں تمھیں ابوسفیان کے متعلق بتاتا ہوں۔'' جب انھوں نے اسے چھوڑا اور ابوسفیان کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: ''مجھے ابوسفیان کا علم نہیں لیکن ابو جہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف لوگوں میں موجود ہیں۔'' جب اس نے یہ بات کہی تو صحابہ نے پھر اس کو مارنا شروع کیا۔ رسول اللہ ﷺ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ ﷺ نے یہ حالت دیکھی، آپ ﷺ پھرے اور فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جب وہ تم سے سچ بولتا ہے تو تم اسے مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو تم اسے چھوڑتے ہو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

« هٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ وَ يَضَعُ يَدَهُ عَلَى الْأَرْضِ هٰهُنَا وَ هٰهُنَا قَالَ فَمَا مَاطَ اَحَدُهُمْ عَنْ مَوْضِعِ يَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ » [مسلم كتاب الجهاد والسير: باب غزوة بدر (١٧٧٩)]

''یہ فلاں کے مرنے کی جگہ ہے اور ہاتھ زمین پر رکھا، یہ فلاں کے گرنے کی جگہ، یہاں فلاں مرے گا۔ صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''جہاں آپ ﷺ نے ہاتھ رکھا تھا وہاں سے کوئی بھی نہ ہٹا (یعنی اس جگہ ہی وہ شخص مرا جس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس کے قتل ہونے کی جگہ ہے)۔''

یہی حدیث صحیح مسلم میں دوسری جگہ ان الفاظ سے مروی ہے۔

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہم عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان تھے۔ ہم سب چاند دیکھ رہے تھے اور میں تیز نگاہ والا تھا، میں نے چاند دیکھ لیا اور میرے علاوہ کسی نے نہ دیکھا۔ میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''کیا آپ نے نہیں دیکھا؟'' انھیں دکھائی نہ دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''میں عنقریب دیکھوں گا'' اور میں اپنے بچھونے پر چت لیٹا تھا پھر انھوں نے ہم سے بدر والوں کے متعلق دریافت کرنا شروع کیا۔ فرمایا:

« اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يُرِيْنَا مَصَارِعَ اَهْلِ بَدْرٍ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُ هٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ غَدًا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ قَالَ فَقَالَ عُمَرُ فَوَالَّذِىْ بَعَثَهُ بِالْحَقِّ مَا اخْطَأُوا الْحُدُوْدَ الَّتِىْ حَدَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ »[مسلم ، كتاب الجنة و صفة نعيمها : باب عرض مقعد الميت(٢٨٧٣)]

''بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کل کے دن (یعنی لڑائی سے ایک دن پہلے) بدر والوں کے گرنے کا مقام بتانے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ''اگر اللہ نے چاہا تو فلاں شخص کل یہاں مرے گا۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا! جو حدیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی متعین کی تھی وہ وہاں سے نہ ہٹے (یعنی ہر کافر اسی جگہ مارا گیا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشاندہی فرمائی تھی)۔''

علاوہ ازیں یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ مسند احمد(٢٦/١)، ابو داؤد، كتاب الجهاد، نسائی، كتاب الجنائز اور تفسیر ابن کثیر میں آیت ﴿ وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ ...... ﴾ کے تحت ان الفاظ کے ساتھ روایت کی گئی ہے:

« وَ اللّٰهِ لَكَاَنِّىْ الْاٰنَ اَنْظُرُ اِلٰى مَصَارِعِ الْقَوْمِ »[عيون الأثرفى فنون المغازى والشمائل والسير لا بن سيد الناس(٣٢٨/١)]

''اللہ کی قسم! گویا کہ میں اب قوم کے گرنے کی جگہوں کو دیکھ رہا ہوں۔''

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو بعض اوقات غیب کی خبریں دیتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ علم غیب اور اخبار غیب میں بڑا فرق ہے۔ علم غیب صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، اس کے سوا کوئی بھی عالم الغیب نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ [النمل:٦٥]

''آپ کہہ دیں کہ آسمانوں اور زمین والوں میں سے اللہ کے علاوہ کوئی غیب نہیں جانتا۔''

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ ﴾ [الانعام:٥٩]

''اور اسی (اللہ تعالیٰ) کے پاس غیب کی چابیاں ہیں جنھیں صرف وہی جانتا ہے۔''

پتا چلا کہ علم غیب صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔

تحریف شدہ آسمانی کتابوں سے انکار

(سوال) جیسا کہ قرآن مجید نے بتلا دیا ہے کہ پہلی آسمانی کتب بدل دی گئی ہیں تو اگر ان تحریف شدہ کتابوں سے انکار کر دیا جائے تو بندہ مسلمان نہیں رہتا؟

(جواب) تورات اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے، اسی طرح انجیل بھی۔ ان پر ایمان رکھنا لازم ہے کہ اللہ نے تورات موسیٰ علیہ السلام پر اور انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی۔ لیکن اب جو موجودہ بائبل ہے یہ تحریف شدہ ہے۔ یہ وہ آسمانی کتاب نہیں ہے جس پر ایمان لانے کا حکم ہے اس بائبل کی نفی کرنا بالکل درست ہے۔ اس کے محرف ہونے پر مفصل بحث دیکھنی ہو تو مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ کی کتاب ''اظہار الحق'' ملاحظہ کریں۔ اسی طرح احمد دیدات کے عیسائی پادریوں کے ساتھ مناظروں کی کیسٹیں سنیں۔ (واللہ اعلم)

ماہ رجب کے کونڈوں کی شرعی حیثیت

(سوال) کیا رجب کے کونڈے اسلام سے ثابت ہیں اور کیا ان کی کوئی شرعی دلیل میسر ہے؟

(جواب) رجب کے مہینے میں جو ۲۲ تاریخ کو کونڈے پکائے جاتے ہیں اس کا شرعی طور پر کوئی ثبوت نہیں، یہ رسوم و بدعات کی قبیل سے ہے اور ان کی ایجاد لکھنؤ میں ہوئی ہے۔ محمد حسین نجفی شیعہ مجتہد اپنی کتاب "اصلاح الرسوم الظاهرة بكلام العترة الطاهرة (ص:۲۸۳)" پر آٹھویں باب میں (۲۲ رجب کے کونڈے) کے ضمن میں رقمطراز ہیں:

''منجملہ ان غلط رسوم کے ایک ۲۲ رجب کے کونڈے بھی ہیں۔ یہ رسم پہلے پہل ہندوستان سے نکلی اور پھر رفتہ رفتہ مختلف ممالک میں پھیل گئی اور روز بروز پھیل رہی ہے۔ مرزا صاحب (شیعہ مجتہد) نے اپنے انٹرویو میں تسلیم کیا ہے کہ وہ اس ایجاد کے عینی گواہ ہیں کہ ان کے سامنے لکھنؤ میں یہ رسم ایجاد ہوئی، اس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ محدثین سے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح بخاری وغیرہ میں ارشاد ہے

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [بخاري، كتاب الصلح : باب إذا اصطلحوا على صلح جور(۲٦۹۷)]

''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی جو اس دین میں سے نہیں ہے وہ مردود ہے۔''

لہٰذا ایسی رسومات و بدعات سے مکمل اجتناب کیا جائے۔

تعویذ کے متعلق شرعی موقف

(سوال) کیا اسلام تعویذ پہننے کی اجازت دیتا ہے اور اس کا کوئی ثبوت شریعت سے ملتا ہے؟

(جواب) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ عَلَّقَ شَيْئًا وُكِلَ إِلَيْهِ»[مسند احمد (۳۱۱/٤)، حاکم (۲۱٦/٤)]

''جس نے کوئی بھی چیز لٹکائی اسے اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔''

اس مفہوم کی اور بھی احادیث موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماری سے بچنے کے لیے کچھ بھی نہیں لٹکانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے شفا کی درخواست کرتے رہنا چاہیے۔ شرکیہ دم اور تعویذات لٹکانا تمام شرک ہے۔ فتح المجید شرح کتاب التوحید میں ہے کہ تمیمہ وہ منکے یا ہڈیاں ہیں جو نظر بد سے دور رکھنے کے لیے بچوں کے گلے میں لٹکائی جاتی ہیں۔ بیماری سے بچاؤ کے لیے ڈالے جانے والے کڑے، دھاگے، چھلے، درختوں کے پتے وغیرہ سب ناجائز ہیں، کیونکہ یہ اشیاء کسی کے نفع ونقصان کی مالک نہیں۔ قرآن حکیم یا دیگر آیات کو لکھ کر گلے میں ڈالنا یا بازو وغیرہ پر باندھ لینا درست نہیں، نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کا کوئی صحیح ثبوت نہیں ملتا لہٰذا ایسے امور سے کلی اجتناب کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور دیگر مسلمان مریضوں کو شفائے کاملہ نصیب کرے۔ (آمین)

ذکر و اذکار اور شرعی دم سے کام لیں، اللہ پر توکل کر کے یقین کے ساتھ اگر دعا مانگیں گے تو اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ضرور شفا نصیب ہوگی۔

اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ کے لیے لفظ ''عشق'' کا استعمال

(سوال) کیا لفظ ''عشق'' اللہ یا رسول اللہ کے لیے استعمال کرنا جائز ہے؟

(جواب) قرآن حکیم اور حدیث رسول میں اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے جو لفظ کثرت سے آیا ہے وہ محبت ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ﴾
[المائدة:٥٤]

''اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا (یاد رکھیے!) عنقریب اللہ تعالیٰ ایسی قوم لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔''

ایک حدیث میں ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے ایک دن حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ''اے معاذ! یقیناً میں تیرے ساتھ محبت کرتا ہوں۔'' تو معاذ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں بھی آپ کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔'' [مسند احمد(٥/٢٤٥)، (٢٢١١٩)، صحيح ابن خزيمة (٧٥١)، صحيح ابن حبان(٢٠٢٠)، ابو داؤد(١٥٢٢)]

قرآن حکیم میں محبت والی کئی ایک آیات ہیں اور اسی طرح صحیح احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ ؓ ایک دوسرے کے لیے محبت کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا ہمیں اللہ، اس کے رسول ﷺ اور اہل ایمان کے لیے یہی لفظ استعمال کرنا چاہیے اور یہ بھی یاد رہے کہ قرآن حکیم اور رسول اللہ ﷺ کی کسی بھی صحیح حدیث میں لفظ عشق استعمال نہیں کیا گیا۔ البتہ ایک مصنوعی، بناوٹی اور جعلی روایت میں لفظ عشق استعمال ہوا ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس ؓ کی طرف منسوب کر کے یوں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے عشق کیا اور چھپایا اور پاکباز رہا اور مر گیا وہ شہید ہے۔''

یہ روایت تاریخ بغداد(١٦٦/٥۔٢٦٢) (٥٠/٢)،(٢٩٨/١١)،تاریخ دمشق اور العلل المتناھیۃ وغیرہ میں موجود ہے۔

علامہ البانی ؒ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ [سلسلة الأحاديث الضعيفة(٤٠٩)]

معلوم ہوتا ہے کہ جہاد سے باغی اور کسی عشق کے مریض نے یہ روایت بنائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے میدان کارزار میں قتل ہونے والوں کے علاوہ جل کر، غرق ہو کر، پیٹ کے مرض سے، ذات الجنب والے اور ایسی عورت کو شہید قرار دیا ہے جو نفاس میں بچے کی ولادت پر فوت ہو جائے۔ قتیل عشق کو کہیں بھی شہید قرار نہیں دیا۔ یہ کسی قتیل لیلیٰ کی کارروائی معلوم ہوتی ہے۔ امام ابن قیم ؒ نے اس پر بڑی نفیس بحث کی ہے اور فرمایا ہے:

'' اس موضوع روایت سے دھوکا مت کھائیں یہ رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت نہیں ہے اور اس کا آپ کے کلام میں سے ہونا جائز نہیں۔ اس لیے کہ اللہ کے ہاں شہادت ایک بلند درجہ ہے جو صدیقیت کے رتبہ کے ساتھ ملایا گیا ہے، اس کے لیے اعمال اور احوال ہیں جو اس کے حصول کی شروط ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک عام اور دوسری خاص اور خاص تو شہادت فی سبیل اللہ ہے اور عام شہادتیں پانچ ہیں جو صحیح حدیث میں بیان ہوئی ہیں اور عشق ان میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ عشق ان میں سے کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو محبت میں اللہ کے ساتھ شرک ہے۔ یہ دل اور روح پر کنٹرول کرتا ہے اور غیر کے لیے محبت پیدا کرتا ہے اس کے ذریعے شہادت کیسے پائی جا سکتی ہے؟ یہ محال ہے۔ عشق کا فساد ہر فساد سے بڑھ کر ہے بلکہ یہ روح کی خمر (شراب) ہے جو اس کو مست کر دیتی اور اللہ کے ذکر اور اس کی محبت اور اس کی مناجات سے لذت اور انس حاصل کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے اور دل کی عبودیت کو غیر اللہ کے لیے واجب کر دیتی ہے، عاشق کا دل معشوق کی عبادت کرتا ہے۔ بتاؤ جو کسی دوسرے آدمی کی عورت کے ساتھ عشق کرتا ہے یا امرد لڑکوں اور زانیہ و بدکار عورت سے عشق کرتا ہے کیا وہ اس عشق کی وجہ سے شہادت کا درجہ پا لے گا؟؟ یہ تو صریح رسول اللہ کے دین کے خلاف ہے اور پھر عشق تو ان بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے شرعی اور قدرتی علاج مقرر کیا ہے جبکہ جو شہادت حدیث میں بیان کی گئی ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

[مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، زادالمعاد (٣٠٦/٣ ۔ ٣٠٧)]

الغرض لفظ عشق قرآن وحدیث میں کہیں وارد نہیں ہوا اور عشق ایک بیماری ہے جس کا علاج کیا جانا چاہیے اور پھر یہ ہمارے عرف میں اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہے، اس لیے ایسے لفظ کا استعمال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے نہیں

کرنا چاہیے۔ کوئی شخص بھی یہ لفظ اپنی ماں، بہن اور بیٹی کے لیے استعمال کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے کیسے پسند کرتا ہے؟

دم کرکے پانی پر پھونک مارنا

سوال کیا دم کرکے پانی پر پھونک ماری جاسکتی ہے؟ قرآن وسنت کی رو سے مسئلہ کی وضاحت فرما دیں۔

جواب نبی کریم ﷺ نے پینے والی اشیاء میں پھونک مارنے سے منع کیا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَهَى عَنِ النَّفْخِ فِي الشَّرَابِ فَقَالَ رَجُلٌ الْقَذَاةَ اَرَاهَا فِي الْإِنَاءِ ؟ فَقَالَ اَهْرِقْهَا » [ترمذی، کتاب الاشربة، باب ماجآء فی کراھیة النفخ فی الشراب (۱۸۸۷)، مسند احمد (۲٦/۳)]

''نبی کریم ﷺ نے پینے والی چیز میں پھونک مارنے سے منع کیا، ایک آدمی نے کہا: ''اگر برتن میں تنکا دیکھوں تو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر اس پانی کو بہادو۔''

عاملوں سے علاج کروانا اور انھیں ہاتھ دکھانا

سوال کیا کسی عامل کو ہاتھ دکھا کر قسمت کا حال جاننا یا اس سے اپنا علاج کروانا درست ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں واضح فرما دیں۔

جواب ایسے لوگ جو پروفیسروں کے بورڈ لگا کر ''جو چاہو سو پوچھو'' یا ''ہر قسم کی مراد پوری ہوگی'' کے دعوے کرتے ہیں، ان سے علاج کرانا اور انھیں قسمت کا حال دریافت کرنے کے لیے ہاتھ دکھانا بالکل ناجائز ہے۔ ایسے نجومیوں اور کاہنوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

« مَنْ اَتىٰ عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةُ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً » [مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الکھانة (۲۲۳۰) مسند احمد (۲۸/۳) (۳۸۰/۵)]

''جو شخص کسی خبریں بتانے والے (نجومی یا کاہن) کے پاس آیا اور اس سے کچھ پوچھا تو اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہیں ہوگی۔''

ایک دوسری حدیث میں ہے:

« مَنْ اَتىٰ كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلىٰ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ »

[ابوداؤد، کتاب الکھانة و التطیر، باب فی الکھان (۳۹۰٤) ترمذی (۱۳۵) ابن ماجه (٦۳۹)]

”جو شخص کسی کاہن کے پاس آیا اور اس کے اقوال کی تصدیق کی تو اس نے اس بات کا کفر کیا جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی۔“

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ کاہنوں، نجومیوں، نام نہاد جعلی پروفیسروں اور لوگوں کی قسمتوں کے دعوے کرنے والے عاملوں کے پاس جانا حرام ہے اور ان کے دعووں کی تصدیق کرنا شریعت محمدی سے کفر ہے لہٰذا ایسے کاموں سے کلی طور پر اجتناب کرنا چاہیے اور دوسروں کو بھی اس سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کرامت اور صاحب کرامت

سوال کرامت کیا ہے؟ اور صاحب کرامت کیسے بنا جا سکتا ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری اور رسول مکرم ﷺ کی اطاعت و اتباع کرنے والے لوگ اللہ کے ولی اور دوست ہوتے ہیں، کبھی کبھار ان کے ہاتھ پر خلاف عادت کسی کام کا اظہار ہو جاتا ہے اور یہ اتفاقی عمل ہے۔ مستقل صاحب کرامت کا اختیار نہیں۔ انبیاء علیہم السلام سے خرق عادت کے طور پر جو ظاہر ہو اسے معجزہ کہتے ہیں اور اولیاء کے ہاتھ پر اگر ایسی چیز کا اظہار ہو تو وہ کرامت گردانی جاتی ہے۔ ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں:

”معجزہ عجز سے مشتق ہے جو قدرت کی ضد ہے اور تحقیقی بات صرف یہ ہے کہ معجزہ وہ ہے وغیر کے اندر عجز کا فعل پیدا کرے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات بابرکات ہے۔“ [حاشیہ مشکاۃ (ص/۵۳۰)

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ عجز کا فعل پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، بندہ نہیں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جان لیجیے کہ جو خرق عادت امر انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اس کو معجزہ اس لیے کہتے ہیں کہ مخلوق اس کے ظاہر کرنے سے عاجز ہوتی ہے اور جب مخلوق اس سے عاجز ہوئی تو معلوم ہوا کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ جو اس کے نبی کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔“

پھر اس کے بعد فرماتے ہیں:

”جیسے مردوں کا زندہ کرنا اور لاٹھی کا سانپ بنا دینا اور پتھر سے اونٹنی نکالنا اور چاند کا پھٹ جانا وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اللہ کے بغیر کسی اور سے ان کا ہونا ممکن نہیں بلکہ یہ اللہ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے، نبی ﷺ نے جھٹلانے والوں کو چیلنج کر کے انھیں اس فعل کے صادر ہونے سے عاجز کر دیا۔“ [الشفاء (ص/۱۶۲) فتح الباری (۶/۴۲۴)]

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے کافر اور مشرک قوموں نے مطالبہ کیا کہ ہمیں کوئی معجزہ، آیت یا نشانی دکھلاؤ تو انبیاء علیہم السلام نے یوں جواب دیا:

﴿ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [ابراهيم: ۱۱]

”اور ہمارے لائق یہ نہیں کہ ہم تمھارے پاس کوئی معجزہ لا سکیں مگر اللہ تعالیٰ کے اذن و حکم سے۔“

نبی کریم ﷺ سے مشرکین مکہ نے معجزے کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے ان کو یوں جواب دیا:

﴿ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [الانعام:١٠٩]

''آپ کہہ دیں کہ نشانیاں اور معجزے اللہ کے پاس ہیں۔''

معلوم ہوا کہ معجزات ونشانیاں لانا اللہ کے اختیار میں ہے کسی نبی و رسول علیہ السلام کا اختیار نہیں۔

کیا ابراہیم علیہ السلام شیعہ تھے؟

سوال کیا ابراہیم علیہ السلام شیعہ تھے؟

جواب لفظ شیعہ کا معنی گروہ اور فرقہ ہے۔قرآن مجید میں لفظ شیعہ کسی خاص مذہب کے لیے مستعمل نہیں ہوا۔شیعہ حضرات کا اپنے مذہب کی حقانیت کے لیے الصافات کی آیت (٨٣)﴿ وَ اِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرَاهِیْمَ ﴾ پیش کرنا قطعاً درست نہیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہ جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کا معنی گروہ ہے نہ کہ موجودہ شیعہ۔آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سیدنا نوح علیہ السلام کے گروہ سے تھے۔یعنی جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، اسی طرح ابراہیم علیہ السلام بھی نبی تھے۔

قرآن مجید نے جہاں ابراہیم علیہ السلام کے دین کا ذکر کیا ہے، وہاں یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ مَا كَانَ اِبْرَاهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّ لَا نَصْرَانِیًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ﴾[آل عمران:٦٧]

''ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی لیکن وہ تو یک سو مسلم تھے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کا دین بیان کرتے ہوئے ﴿حَنِیْفًا مُّسْلِمًا﴾ کہا ہے۔اگر وہ مذہباً شیعہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے:" مَا كَانَ اِبْرَاهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّ لَا نَصْرَانِیًّا وَ لٰكِنْ كَانَ شِیْعَةً " لیکن قرآن میں اس طرح مذکور نہیں۔

قرآن مجید میں اکثر و بیشتر مواقع پر لفظ شیعہ شریروں، فسادیوں اور فتنہ بازوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ ○ وَ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [الحجر:١٠،١١]

''البتہ ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول اگلے شیعوں میں بھیجے اور ان کے پاس کوئی بھی رسول نہیں آیا مگر وہ ان سے مذاق کرتے تھے۔''

اگر لفظ شیعہ سے مراد شیعہ فرقہ ہے تو پھر اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسولوں کے ساتھ مذاق کرنے والے شیعہ تھے۔اس آیت کی تفسیر میں شیعہ مفسر عمار علی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

''یہاں شیعہ سے مراد وہ کافر ہیں جو رسولوں کے ساتھ ٹھٹھا و مذاق کرتے تھے۔'' [تفسیر عمدة البیان(١٧٤/٢)]

﴿ قُلُ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنُ يَّبُعَثَ عَلَيُكُمُ عَذَابًا مِّنُ فَوُقِكُمُ اَوُ مِنُ تَحُتِ اَرُجُلِكُمُ اَوُ يَلُبِسَكُمُ شِيَعًا وَّ يُذِيُقَ بَعُضَكُمُ بَاُسَ بَعُضٍ ﴾ [الانعام: ٦٥]

''کہہ دیجیے اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تمھارے اوپر سے عذاب بھیج دے یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے یا تم کو شیعہ بنا کر آپس میں لڑا دے۔''

اگر لفظ ﴿ شِيَعًا ﴾ سے شیعہ فرقہ مراد ہے تو ان کے عذاب الٰہی میں گرفتار ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اس آیت کے متعلق شیعہ مفسر عمار علی نے لکھا ہے:

''اس آیت میں لفظ ﴿ شِيَعًا ﴾ شریروں، فسادیوں اور فتنہ بازوں پر بولا گیا ہے۔'' [عمدة البيان (٣٥٣/١)]

﴿ اِنَّ فِرُعَوُنَ عَلَا فِي الْاَرُضِ وَ جَعَلَ اَهُلَهَا شِيَعًا ﴾ [القصص:٤]

''بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور وہاں کے رہنے والوں کو شیعہ بنا دیا۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو شیعہ بنانے والا فرعون تھا۔

﴿ وَ اَقِيُمُوا الصَّلَاةَ وَ لَا تَكُوُنُوُا مِنَ الْمُشُرِكِيُنَ ○ مِنَ الَّذِيُنَ فَرَّقُوُا دِيُنَهُمُ وَ كَانُوُا شِيَعًا ﴾ [الروم : ٣١، ٣٢]

''اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور وہ شیعہ تھے۔''

اس آیت کی تفسیر میں شیعہ مفسر نے لکھا ہے:

''اس آیت میں شیعہ...... مشرکوں، بت پرستوں، وشمنان دین اور یہود و نصاریٰ کو کہا گیا ہے۔'' [عمدة البيان (١٣/٣)]

﴿ اِنَّ الَّذِيُنَ فَرَّقُوُا دِيُنَهُمُ وَ كَانُوُا شِيَعًا لَّسُتَ مِنُهُمُ فِيُ شَيُءٍ ﴾ [الانعام:١٥٩]

''بے شک وہ لوگ جنھوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور شیعہ ہو گئے، ان سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔''

اس آیت نے صراحت کر دی کہ اللہ کے رسول ﷺ کا شیعوں سے کوئی تعلق نہیں۔ جس فرقہ سے اللہ کے رسول ﷺ کا کوئی تعلق نہ ہو، اس کے گمراہ ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں لفظ شیعہ گروہ بندی کے معنی میں ہے۔ اگر لفظ شیعہ سے خاص فرقہ مراد لیں تو خود سمجھ لیں کہ مذکورہ بالا پانچ آیات میں شیعہ کسے کہا گیا ہے۔

کیا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلا فصل اور مشکل کشا ہیں؟

سوال کچھ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ مشکل کشا ہیں اور خلیفہ بلا فصل ہیں، کیا ایسا عقیدہ کتاب وسنت کے خلاف نہیں؟

جواب اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوۡلَاہُ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنۡ وَالَاہُ وَ عَادِ مَنۡ عَادَاہُ » [مسند احمد (٤١٩/٥) (٨٤/١)، طبرانی کبیر(٤٠٥٢)، مجمع الزوائد(١٢٨/٩)، (١٤٦١٠)، سند بزار (٢٥١٩)، کتاب السنة لابن ابی عاصم(٥٩٠/٢)، ابن حبان (٢٢٠٥)، ترمذی(٣٧١٢)، سلسلة الأحاديث الصحيحة (١٧٥٠)]

''جس کا میں دوست ہوں علی رضی اللہ عنہ بھی اس کا دوست ہے، اے اللہ! جو علی سے دوستی لگائے تو بھی اسے دوست بنا اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔''

مذکورہ بالا حدیث کا مفہوم اس کے الفاظ سے بالکل واضح ہے کہ یہاں مولیٰ سے مراد دوست ہے یہاں مولیٰ سے مراد نہ خلیفہ بلافصل ہے اور نہ مشکل کشا اور حاجت روا۔ بلکہ خلیفہ بلافصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور مشکل کشا اللہ تبارک و تعالیٰ ہے، جو ہر کسی کے نفع ونقصان کا مالک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ھُوَ وَ اِنۡ یُّرِدۡکَ بِخَیۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِہٖ یُصِیۡبُ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ وَ ھُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴾ [یونس:١٠٧]

''اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچا دے تو اسے دور کرنے والا کوئی نہیں مگر صرف وہی (یعنی اللہ تعالیٰ) اور اگر وہ آپ کے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو رد کرنے والا کوئی نہیں، وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور وہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مشکل اور مصیبت کو دور کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکۡشِفُ السُّوۡٓءَ وَ یَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴾ [النمل:٦٢]

''بے کس و ناچار جب پکارے تو اس کی پکار کو قبول کر کے کون مصیبت کو دور کرتا ہے؟ اور تمھیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (جو مشکل حل کر سکے) تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

« وَ اِذَا سَاَلۡتَ فَاسۡئَلِ اللّٰہَ وَ اِذَا اسۡتَعَنۡتَ فَاسۡتَعِنۡ بِاللّٰہِ وَ اعۡلَمۡ اَنَّ الۡاُمَّةَ لَوِاجۡتَمَعَتۡ عَلٰۤی اَنۡ یَّنۡفَعُوۡکَ بِشَیۡءٍ لَمۡ یَنۡفَعُوۡکَ اِلَّا بِشَیۡءٍ قَدۡ کَتَبَہُ اللّٰہُ لَکَ وَ اَنِ اجۡتَمَعُوۡا عَلٰۤی اَنۡ یَّضُرُّوۡکَ بِشَیۡءٍ لَمۡ یَضُرُّوۡکَ اِلَّا بِشَیۡءٍ قَدۡ کَتَبَہُ اللّٰہُ عَلَیۡکَ » [ترمذی، کتاب صفة القيامة: باب (٢٥١٦)، مسند احمد (٢٩٣/١-٣٠٣)]

''اور جب بھی تو سوال کرے اللہ سے سوال کر اور جب بھی تو مدد طلب کرے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر۔ یقین کر لے بلاشبہ اگر ساری امت اس بات پر جمع ہو جائے کہ وہ تجھے کسی چیز سے نفع پہنچائے تو وہ نفع نہیں پہنچا سکتی مگر وہی

جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے اور اگر ساری امت تجھے نقصان پہنچانے پر اکٹھی ہو جائے تو نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر وہی جو اللہ نے تیرے خلاف لکھ دیا ہے۔''

مذکورہ بالا آیات اور صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر قسم کے نفع و نقصان کا مالک، مشکل کشا اور حاجت روا صرف اللہ کی ذات ہے، کائنات میں سے کوئی فرد بھی کسی کے نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو نصیحت کرتے ہوئے یہ بات سمجھا دی کہ آپ کی امت میں سے کوئی شخص بھی خواہ وہ نیک ہو یا بد، امیر ہو یا غریب، حکمران ہو یا رعایا، الغرض کوئی بھی کسی کی قسمت کا مالک نہیں۔ ہر قسم کا اختیار اللہ کے پاس ہے وہی مختار کل، مشکل کشا اور حاجت روا ہے۔

شیعہ اثنا عشریہ اور قرآن

سوال کیا شیعہ اثنا عشریہ ہمارے قرآن پر ایمان نہیں رکھتے ؟

جواب اللہ وحدہ لا شریک لہ نے اپنے انبیاء و رسل پر کتب و صحائف نازل فرمائے اور اس سلسلے کی آخری کڑی امام اعظم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر بذریعہ جبریل امین قرآن نازل کیا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلَائِكَتِهِ وَ رُسُلِهِ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرة:۹۷۔۹۸]

''آپ کہہ دیں جو شخص جبریل علیہ السلام کا دشمن ہے جس نے آپ کے دل پر اس قرآن کو اللہ کے حکم سے اتارا ہے جو اس چیز کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس کے سامنے ہے اور یہ ہدایت و خوشخبری ہے ایمان والوں کے لیے (تو اللہ بھی اس کا دشمن ہے)۔ جو شخص اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور رسولوں اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بھی کافروں کا دشمن ہے۔''

اس آیت کریمہ میں واضح کیا گیا ہے کہ جبرئیل امین علیہ السلام یہ قرآن لے کر رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ ﴾ [الحجر:۹]

''بے شک ہم نے اس ذکر (یعنی قرآن) کو نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ وَ إِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ ۝ لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ

لَا مِنۡ خَلۡفِهٖ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ حَکِیۡمٍ حَمِیۡدٍ ﴾ [فصلت:٤١،٤٢]

''بے شک وہ لوگ جنھوں نے قرآن حکیم کے ساتھ کفر کیا جب وہ ان کے پاس آیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے، باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ ہے۔''

معلوم ہوا کہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جس میں باطل کو دخل نہیں اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری رب ذوالجلال والاکرام نے لے رکھی ہے۔ قرآن حکیم لاریب کتاب ہے، اس میں تبدیلی وتحریف ناممکن ہے۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ اس جیسی کتاب نہ کوئی لا سکتا ہے اور نہ لا سکے گا۔ نبی کریم ﷺ نے جب یہ وحی الٰہی لوگوں کو سنانا شروع کی تو کفار نے کہا: ''اس میں کچھ ترمیم کرلو، تب ہم آپ ﷺ کی بات مان سکتے ہیں۔'' تو ارشاد الٰہی ہوا:

﴿ وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَیۡرِ هٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡهُ قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴾ [یونس: ١٥]

''اور جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ آپ ﷺ ان سے کہہ دیجیے کہ میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر وتبدل کرلوں، میں تو بس اس وحی کا پیروکار ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔''

معلوم ہوا کہ وحی الٰہی قرآن پاک میں تغیر وتبدل کا حق کسی کو نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن حکیم ایک مکمل جامع کتاب ہے، اس میں کسی قسم کا شبہ، تغیر وتبدل اور تحریف ممکن نہیں۔ جس طرح نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کرنے کے لیے کہا انھوں نے اسی طرح اس کو جمع کر دیا۔ قرآن پاک کی تحریف کا قائل مسلمان نہیں ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے نصاریٰ کا یہ الزام نقل کیا ہے:

"وَ اَیۡضًا فَاِنَّ الرَّوَافِضَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّ اَصۡحَابَ نَبِیِّکُمۡ بَدَّلُوا الۡقُرۡآنَ وَ اَسۡقَطُوۡا مِنۡهُ وَ زَادُوۡا فِیۡهِ " [الفصل فی الملل والاھواء والنحل(٧٥/٢)]

''نیز روافض دعویٰ کرتے ہیں کہ تمھارے نبی ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن پاک کو تبدیل کر دیا ہے اور اس میں سے کچھ آیات گرا دی ہیں اور کچھ زیادہ کر دی ہیں۔''

اس کا جواب دیتے ہوئے امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ اَمَّا قَوۡلُهُمۡ فِیۡ دَعۡوَی الرَّوَافِضِ تَبۡدِیۡلُ الۡقِرَاءَاتِ فَاِنَّ الرَّوَافِضَ لَیۡسُوۡا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ اِنَّمَا هِیَ فِرَقٌ حَدَثَ اَوَّلُهَا بَعۡدَ مَوۡتِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَ سَلَّمَ بِخَمۡسٍ وَّ عِشۡرِیۡنَ سَنَةً وَ کَانَ مَبۡدَأُهَا اِجَابَةً مِّمَّنۡ خَذَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی لِدَعۡوَةِ مَنۡ کَادَ الۡاِسۡلَامَ وَ هِیَ طَائِفَةٌ تَجۡرِیۡ مَجۡرَی

الیَھُودِ وَ النَّصَارَی فِی الْکَذِبِ وَ الْکُفُرِ" [الفصل فی الملل والھواء والنحل(۷۵/۲)]

"رہا نصاریٰ کا یہ کہنا کہ روافض کا دعویٰ ہے کہ صحابہ نے قرآن تبدیل کر دیا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ روافض کا شمار مسلمانوں میں نہیں ہے۔ یہ ایسے فرقے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ۲۵ سال بعد پیدا ہوئے اور ان فرقوں کی ابتدا اس شخص کی دعوت کو قبول کرنے کی وجہ سے ہوئی جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے والوں کا داعی ہونے کی وجہ سے ذلیل و رسوا کر دیا تھا اور یہ روافض کا گروہ جھوٹا ہونے اور کفر میں یہود و نصاریٰ کے راستے پر گامزن ہے۔"

حافظ ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ اہل حدیث کے نزدیک تحریف قرآن کا قائل مسلمان نہیں ہے۔ روافض کو انھوں نے مسلمانوں میں شمار نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ لوگ تحریف قرآن کے قائل اور عقائد فاسدہ رکھتے تھے۔ شیعہ حضرات کا ایمان موجودہ قرآن کریم پر نہ ہے اور نہ ہو ہی سکتا ہے۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں:

① شیعہ حضرات کے عقائد کا جزو لاینفک ہے کہ ناقلان قرآن اور راویان دین اسلام یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت جھوٹی تھی، ان میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جس نے حق و صداقت کو دل و جان سے قبول کیا ہو اور ان کے نزدیک اصحاب رسول ﷺ کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم اور دیگر ہزاروں صحابہ کی تعداد میں موجود تھا۔ دوسرا گروہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے چند ساتھیوں پر مشتمل تھا۔ پہلے گروہ کے جھوٹ کا نام انھوں نے نفاق رکھا ہے اور دوسرے گروہ کے جھوٹ کا نام تقیہ رکھا ہے۔ شیعہ حضرات کا ثقۃ الاسلام ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی لکھتا ہے کہ امام باقر نے فرمایا:

" کَانَ النَّاسُ اَھلَ رِدَّۃٍ بَعْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ اِلَّا ثَلَاثَۃٌ فَقُلْتُ وَ مَنِ الثَّلَاثَۃُ ؟ فَقَالَ اَلْمِقْدَادُ بْنُ الْاَسْوَدُ وَ اَبُوْ ذَرٍّ الْغَفَارِیُّ وَ سَلْمَانُ الْفَارِسِیُّ "[کتاب الروضة من الکافی(۲۴۵/۸)]

"نبی ﷺ کی وفات کے بعد لوگ مرتد ہو گئے تھے، سوائے تین اشخاص کے۔" راوی کہتا ہے کہ میں نے کہا: "وہ تین کون ہیں؟" تو انھوں نے کہا: "مقداد بن اسود، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی (رضی اللہ عنہم)۔"

قاضی نور اللہ شوشتری نے لکھا ہے کہ امام باقر سے روایت ہے:

" اِرْتَدَّ النَّاسُ اِلَّا ثَلَاثَ نَفَرٍ سَلْمَانُ وَ اَبُوْ ذَرٍّ وَ الْمِقْدَادُ "[مجالس المومنین (۲۰۳/۱)]

"تین کے سوا تمام لوگ مرتد ہو گئے تھے سلمان فارسی، ابوذر غفاری اور مقداد بن اسود (رضی اللہ عنہم)۔"

اس کے بعد لکھتا ہے:

" یعنی حضرت امام فرمود کہ جمیع مشاھیر صحابہ کہ استماع نص نبوی در باب خلافت امیر المومنین نمودہ بودند مرتد شدند الا سہ نفر کہ سلمان و ابو ذر و مقداد است۔" [مجالس المومنین(۲۰۳/۱)]

"امام باقر رحمہ اللہ نے فرمایا: "تمام مشہور صحابہ امیر المومنین کی خلافت کے بارے میں نص نبوی سننے کے باوجود پھر گئے

اور مرتد ہو گئے سوائے تین اشخاص کے یعنی سلمان، ابوذر اور مقداد۔"

احمد بن علی الطبرسی نے لکھا ہے:

" وَ مَا مِنَ الْأُمَّةِ اَحَدٌ بَايَعَ مُكْرِهًا غَيْرَ عَلِيٍّ وَ اَرْبَعَتِنَا " [الاحتجاج (۱/۸٤)]

"امت میں سے کوئی ایسا آدمی نہ تھا جس نے دلی رضا مندی کے بغیر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی ہو چار اشخاص کے سوا یعنی ابوذر، سلمان، مقداد اور عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہم)۔"

طبرسی کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ تمام امت مسلمہ نے دل و جان سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی، صرف مذکورہ چار اشخاص ایسے تھے جنھوں نے مجبوراً بیعت کی اور جو بات ان کے دل میں تھی وہ زبان پر نہ تھی۔ یعنی ان کا ظاہر و باطن ایک نہ تھا (العیاذ باللہ) زبان سے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور دل سے کسی اور کے ساتھ۔ شیخ الطائفہ الامامیہ ابوجعفر الطوسی رقمطراز ہیں:

" عَنْ حُمْرَانَ قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ جَعْفَرَ مَا اَقَلَّنَا لَوِ اجْتَمَعْنَا عَلٰی شَاةٍ مَا اَفْنَيْنَاهَا قَالَ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُكَ بِاَعْجَبَ مِنْ ذٰلِكَ ؟ قَالَ فَقُلْتُ بَلٰى قَالَ اَلْمُهَاجِرُوْنَ وَ الْاَنْصَارُ ذَهَبُوْا اِلَّا وَ اَشَارَ بِيَدِهٖ ثَلَاثَةٌ "[رجال کشی،(ص ۷۱)]

"حمران نے کہا میں نے امام باقر سے کہا: "ہماری تعداد کس قدر کم ہے، اگر ہم ایک بکری پر جمع ہوں تو اسے بھی ختم نہ کر پائیں۔" امام نے کہا: "میں تجھے اس سے بھی عجیب بات نہ بتاؤں؟" میں نے کہا: "کیوں نہیں؟" فرمایا: "مہاجرین و انصار تین کے علاوہ سب چلے گئے یعنی مرتد ہو گئے تھے۔"

شیعہ حضرات کے مذکورہ حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد تمام صحابہ (العیاذ باللہ) مرتد ہو گئے تھے اور یہ عقیدہ انھوں نے اپنے مزعومہ ائمہ معصومین سے نقل کیا ہے۔ شیعہ حضرات کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں موقف مزید معلوم کرنا ہو تو اسد حیدر کی کتاب " الصحابة فی نظر الشیعة الامامیة" مطبوعہ قاہرہ اور باقر مجلسی کی " بحار الأنوار" سے مطاعن پر مشتمل جلدوں کا مطالعہ کریں۔ جس سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک دین اسلام کے راویان اور ناقلان قرآن جھوٹے تھے، جب تک عدالت و عظمت صحابہ کو شیعہ حضرات تسلیم نہیں کر لیتے اتنی دیر تک ان کا قرآن حکیم پر ایمان درست نہیں ہو سکتا اور صحابہ پر تبرا اور سب و شتم کرنا ان کا بنیادی عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کی موجودگی میں قرآن حکیم پر ایمان محال و ناممکن ہے۔ تقیہ اور کتمان کے بارے میں اصول کافی وغیرہ کتب کا مطالعہ کر لیں۔

④ شیعہ علماء کے اقرار کے مطابق اس قرآن کو خلفائے ثلاثہ نے جمع کیا اور انھیں کے انتظام و انصرام سے یہ پوری دنیا میں پھیلایا گیا اور اس موجودہ قرآن کی قابل وثوق تصدیق ان کے ائمہ معصومین سے نہیں ملتی اور خلفائے ثلاثہ کے متعلق شیعہ کا عقیدہ ہے کہ وہ دین دشمن تھے اور اسلام کے لبادے میں حصول حکومت کے لیے رسول اللہ ﷺ کے گرد جمع تھے اور آپ ﷺ پر ان کا رعب و دبدبہ اس قدر تھا کہ آپ ﷺ ان کے پوچھے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں دیتے تھے اور ان کے رعب کی وجہ

سے آپ ﷺ خلافت بلافصل کا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے لیے کھلے عام واضح اور دوٹوک اعلان نہ کر سکے۔ لہٰذا جو چیز دین دشمن لوگوں نے لکھ کر پھیلا دی ہو وہ معتبر اور قابل وثوق کیسے ہو سکتی ہے؟ شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو لوگ مرتد ہو گئے اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے خلاف ہو گئے اور اپنے لیے زمام حکومت پر قابض ہو گئے۔ علی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے غسل اور کفن دفن کے بعد اپنے گھر میں محصور ہو کر قرآن تالیف کرنے لگے۔ جب قرآن پاک جمع کر لیا تو اسے انصار و مہاجرین کے پاس لے کر آئے، اس لیے کہ اس بات کی انھیں رسول اللہ ﷺ نے وصیت کی تھی۔ فصل الخطاب میں ہے:

" فَلَمَّا فَتَحَهُ اَبُوْ بَكْرٍ خَرَجَ فِيْ اَوَّلِ صَفْحَةٍ فَتَحَهَا فَضَائِعُ الْقَوْمِ فَوَثَبَ عُمَرُ وَ قَالَ يَا عَلِيُّ ! اُرْدُدْهُ فَلَا حَاجَةَ لَنَا فِيْهِ فَاَخَذَهُ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ انْصَرَفَ" [فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب(ص:۷)]

''جب اسے ابو بکر نے کھولا تو پہلے صفحہ پر قوم کی فضیحتوں اور رسوائیوں کا ذکر تھا تو عمر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: ''اے علی! اس کو لے جاؤ، ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔'' علی علیہ السلام نے اس قرآن کو لیا اور چلے گئے۔''

پھر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قاری قرآن کو بلا کر نیا قرآن لکھوایا گیا اور اس میں سے انصار و مہاجرین کی ذلت و رسوائی والی آیات کو نکال دیا گیا۔ [الاحتجاج للطبرسی (۱۵۶/۱)]

دوسری روایت میں ہے کہ جب صحابہ نے کہا: ''ہمیں تمھارے جمع کردہ قرآن کی حاجت نہیں۔'' تو علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" وَ اللّٰهِ مَا تَرَوْنَهُ بَعْدَ يَوْمِكُمْ هٰذَا " [فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب(ص:۷)]

''اللہ کی قسم! تم اس قرآن کو آج کے بعد کبھی نہیں دیکھو گے۔''

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ شیعہ حضرات کے نزدیک موجودہ قرآن کے جامع ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما تھے اور انھوں نے اسے حضرت زید بن ثابت سے لکھوا کر دنیا میں پھیلا دیا اور اصل قرآن جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا وہ تسلیم نہ کیا تو علی رضی اللہ عنہ نے اسے غائب کر دیا۔ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا پھیلایا ہوا قرآن ہی آج دنیا میں پڑھا جا رہا ہے اور اس کے حافظین دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہیں اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں شیعہ حضرات کا عقیدہ ملاحظہ ہو۔ ملا باقر مجلسی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

" ابو بکر و عمر ...... هر دو کافر بودندو هر که ایشان را دوست دارد کافر است۔"

''ابو بکر و عمر دونوں کافر تھے اور ان سے دوستی رکھنے والا ہر فرد بھی کافر ہے۔'' (العیاذ باللہ) [حق الیقین (ص/۵۴۲)]

اس کے بعد لکھتا ہے:

" ودریں باب احادیث بسیار است و در کتب متفرق است و اکثر در بحار الانوار مذکور است" [حق الیقین (ص/۵۴۲)]

''اس بارے میں بہت سی روایات ہیں اور متفرق کتب میں موجود ہیں اور اکثر کا ذکر ''بحار الانوار'' میں موجود ہے۔''
بحار الانوار باقر مجلسی ہی کی کتاب ہے، جو ۱۱۰ جلدوں میں چھپی ہے اور راقم الحروف کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مجلسی نے لکھا ہے:

" اعتقاد ما در براء ت آنستکه بیزاری جو یند از بت ھائے چھار گانه یعنی ابو بکر و عمر و عثمان و معاویه و زنان چھارگانه یعنی عائشه و حفصه و ھند و ام الحکم و از جمیع اشیاع و اتباع ایشاں و آنکه ایشاں بدترین خلق خدا یند و آنکه تمام نمی شود اقرار بخدا و رسول و ائمه مگر به بیزاری از دشمنان ایشاں۔" [حق الیقین(ص/۵۳۹)]

'' تبرا کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ چار بتوں سے بیزاری اختیار کریں یعنی ابوبکر، عمر، عثمان اور معاویہ سے اور چار عورتوں سے بیزاری اختیار کریں یعنی عائشہ، حفصہ، ہند اور ام الحکم سے اور ان کے تمام پیروکاروں سے اور یہ اللہ کی مخلوق میں سے بدترین لوگ تھے اور یہ کہ اللہ پر، رسول پر اور ائمہ پر ایمان مکمل نہیں ہوگا جب تک ان دشمنوں سے بیزاری نہ کریں۔''

مشہور شیعہ مفسر علی بن ابراہیم قمی رقمطراز ہیں:

'' آیت ﴿ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ﴾ میں کفر سے مراد ابوبکر، فسوق سے مراد عمر اور عصیان سے مراد عثمان ہیں۔'' (العیاذ باللہ) [تفسیر قمی(۳۱۹/۲)، نیز دیکھیں تفسیر الصافی (۵۹۰/۲)، تفسیر نور الثقلین (۸۳/۵)]

مولوی مقبول حسین دہلوی لکھتا ہے:

'' کافی اور تفسیر قمی میں جناب امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ ﴿ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ ﴾ میں ایمان سے اور ﴿ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ میں ضمیر غائب سے مراد جناب امیر المومنین ہیں اور ﴿ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ﴾ میں کفر سے مراد ہیں حضرت اول اور الفسوق سے مراد ہیں حضرت ثانی اور العصیان سے حضرت ثالث۔'' [ترجمه و تفسیر مقبول دهلوی (ص:۸۲۳)]

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ اہل تشیع کے نزدیک قرآن کا انتظام و انصرام کرنے والے اور اسے نقل کروا کے دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلانے والے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم تھے چنانچہ ان کی سب سے زیادہ دشمنی ان کے ساتھ ہے اور ان سے بیزاری کا اظہار کرنا ان کا عقیدہ ہے، اس عقیدے کی موجودگی میں یہ موجودہ قرآن پر کیسے ایمان رکھ سکتے ہیں؟ کیونکہ اگر وہ اس قرآن کو مان لیں تو ان کا عقیدہ باطل ہو جاتا ہے۔

④ تیسری اہم وجہ یہ ہے کہ تحریف قرآن کے بارے میں شیعہ حضرات کی امہات الکتب میں دو ہزار سے زائد روایات موجود ہیں، جن میں پانچ قسم کی تحریف کا ذکر ہے: (۱) کمی (۲) زیادتی (۳) تبدیلی الفاظ (۴) تبدیلی حروف (۵) آیات و

سور اور کلمات کی خرابی ترتیب، پھر ان روایات میں شیعہ حضرات کے معتبر اور ثقہ علماء کے تین اقرار ہیں۔

① یہ روایات متواتر ہیں اور ان کی تعداد مسئلہ امامت کے متعلق مروی روایت سے کم نہیں ۔

② یہ روایات تحریف قرآن پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں۔

③ ان روایات کے مطابق شیعہ کا تحریف قرآن کا عقیدہ بھی ہے۔

ایران سے مرزا حسین بن محمد تقی نوری طبرسی شیعہ کی ایک کتاب ۱۲۹۸ھ میں بنام " فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الأرباب" شائع ہوئی، جس میں مؤلف نے ہر عقلی ونقلی طریقے سے یہ بات اپنے مذہب کی امہات الکتب سے ثابت کی ہے کہ قرآن محرف و مبدل ہے۔ موجودہ قرآن پر شیعہ کا ایمان نہیں ہے اور یہ شیعہ کے ثقہ علماء میں سے ہے اور شیعہ رجال کے تراجم پر ایران و ہندوستان سے جتنی کتب طبع ہوئیں ان میں سے اکثر کے اندر اس کا ذکر بڑے بھاری القابات سے کیا گیا ہے، مثلاً شیخ عباس قمی نے ''فوائد رضویہ (ص:۱۵۰)'' میں لکھا ہے:

" سَحَابُ الْفَضْلِ ...... بَحْرُ الْعِلْمِ الَّذِیْ لَیْسَ لَهُ سَاحِلٌ "

'' مرزا حسین بن محمد نوری فضل کا بادل......اور علم کا ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔''

نیز ایک اور کتاب میں لکھا ہے:

" اِمَامُ اَئِمَّةِ الْحَدِیْثِ کِبَارُ رِجَالِ الْاِسْلَامِ "[مستدرك ابو سائل (٤/١)]

'' حدیث کے اماموں کا امام ہے اور اسلام کے عظیم آدمیوں میں سے ہے۔''

معلوم ہوا کہ فصل الخطاب کا مؤلف شیعہ حضرات کے ہاں بڑا معتبر محدث اور بحر العلوم ہے اور یہ کتاب اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روضہ میں بیٹھ کر مکمل کی ہے۔ اپنی کتاب کے آخری صفحہ پر لکھتا ہے:

" وَ قَدْ فَرَغَ مِنْ تَنْمِیْقِ هٰذِهِ الْاَوْرَاقِ رَجَاءَ الْاِنْتِفَاعِ بِهَا فِیْ یَوْمٍ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ الْعَبْدُ الْمُذْنِبُ الْمُسِیْءُ الْمَنْسِیُّ حُسَیْنُ بْنُ مُحَمَّدٍ تَقِیُّ النُّوْرِیُّ الطَّبْرَسِیُّ فِیْ مَشْهَدِ مَوْلَانَا اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَیْهِ السَّلَامُ لِلَیْلَتَیْنِ اَنْ بَقِیَا مِنْ شَهْرِ جُمَادَی الْاُخْرٰی مِنْ سَنَةِ اُثْنَتَیْنِ بَعْدَ الْاَلِفِ "

'' امیر المومنین کے روضہ میں بیٹھ کر ان اوراق کے لکھنے سے بندہ گناہ گار حسین بن محمد تقی النوری الطبرسی ۲۸ جمادی الاخریٰ ۱۲۹۲ھ میں قیامت والے دن نفع کی امید کرتے ہوئے فارغ ہوا۔''

اور یہ مقام شیعہ کے ہاں بابرکت اور اقدس البقاع ہے اور جب یہ مؤلف فوت ہوا تو اسے نجف میں مشہد مرتضوی کے صحن میں دفن کیا گیا اور مشہد مرتضوی یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا روضہ شیعہ کے ہاں اتقیاء کے دفن کا مقام ہے۔ لہٰذا اس کتاب کا مؤلف ان کے ہاں بڑا معتبر محدث ہے اور اس نے فصل الخطاب لکھ کر ثابت کر دیا کہ شیعہ اس قرآن کو تسلیم نہیں کرتے۔

اس کتاب میں لکھا ہے:

" اَنَّ الْاَخْبَارَ الدَّالَّةَ عَلٰی ذٰلِكَ تَزِیْدُ عَلٰی اَلْفَیْ حَدِیْثٍ وَ ادَّعٰی اِسْتِفَافَتَهَا جَمَاعَةٌ کَالْمُفِیْدِ وَ

الْمُحَقِّقِ الدَّامَادِ وَ الْعَلَّامَةِ الْمَجْلِسِيِّ وَ غَيْرِهِمْ " [فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب (ص/۲۵۱)]

'' تحریف قرآن پر دلالت کرنے والی احادیث دو ہزار سے زائد ہیں اور ان کے مشہور ہونے کا دعویٰ علماء کی ایک جماعت نے کیا ہے جیسے شیخ مفید، محقق داماد اور علامہ مجلسی وغیرہ ہیں۔''

اس مؤلف نے سید نعمت اللہ الجزائری الشیعی کے حوالے سے لکھا ہے:

" اِنَّ الْاَصْحَابَ قَدْ اَطْبَقُوْا عَلٰى صِحَّةِ الْاَخْبَارِ الْمُسْتَفِيْضَةِ بَلِ الْمُتَوَاتِرَةِ الدَّالَّةِ بِصَرِيْحِهَا عَلٰى وُقُوْعِ التَّحْرِيْفِ فِى الْقُرْآنِ كَلَامًا وَ مَادَّةً وَ اِعْرَابًا وَ التَّصْدِيْقِ بِهَا" [فصل الخطاب (ص/۳۱) ، الأنوار النعمانية(۲/۳۵۷)]

''اصحاب امامیہ نے ان مشہور روایات کی صحت بلکہ تواتر پر اتفاق کیا ہے، ایسا تواتر جو صراحتاً قرآن پاک میں تحریف پر دلالت کرتا ہے، یہ تحریف کلام و مادہ اور اعراب میں ہے اور ان روایات کی تصدیق پر بھی علمائے شیعہ نے اتفاق کیا ہے۔''

شیعہ کی معتبر کتاب اصول کافی میں روایت ہے کہ امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا:

" اِنَّ الْقُرْآنَ الَّذِىْ جَاءَ بِهٖ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِلٰى مُحَمَّدٍ سَبْعَةَ عَشَرَ اَلْفَ آيَةٍ "

'' بلاشبہ جو قرآن جبرئیل علیہ السلام محمد ﷺ کی طرف لے کر آئے اس کی سترہ ہزار آیات تھیں۔''

اس حدیث کی شرح میں ملا باقر مجلسی نے لکھا ہے:

" فَالْخَبَرُ صَحِيْحٌ وَ لَا يَخْفٰى اَنَّ هٰذَا الْخَبَرَ وَ كَثِيْرًا مِنَ الْاَخْبَارِ الصَّحِيْحَةِ صَرِيْحَةٌ فِىْ نَقْصِ الْقُرْآنِ وَ تَغْيِيْرِهٖ وَ عِنْدِىْ اَنَّ الْاَخْبَارَ فِىْ هٰذَا الْبَابِ مُتَوَاتِرَةٌ مَعْنًى وَ طَرْحُ جَمِيْعِهَا يُوْجِبُ رَفْعَ الْاِعْتِمَادِ عَنِ الْاَخْبَارِ رَأْسًا بَلْ ظَنِّىْ اَنَّ الْاَخْبَارَ فِىْ هٰذَا الْبَابِ لَا يَقْصُرُ عَنْ اَخْبَارِ الْاِمَامَةِ فَكَيْفَ يُثْبِتُوْنَهَا بِالْخَبَرِ " [مرأة العقول فی شرح اخبار آل الرسول(۱۲/۵۲۵)]

'' یہ خبر صحیح ہے پس مخفی نہ رہے کہ یہ خبر اور دیگر بہت ساری صحیح روایات صراحتاً قرآن پاک میں کمی اور تبدیلی پر دلالت کرتی ہیں اور میرے نزدیک تحریف قرآن کے مسئلہ میں روایات معناً متواتر ہیں اور ان سب روایات کو ترک کرنا تمام ذخیرہ احادیث سے اعتماد کو اٹھانا ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ تحریف قرآن کی روایات مسئلہ امامت کی روایات سے کم نہیں، اگر ان روایات کا اعتبار نہ ہوا تو مسئلہ امامت روایات سے کیسے ثابت کریں گے؟''

مرزا حسین بن محمد بن تقی نوری طبرسی لکھتا ہے:

" اَلْاَخْبَارُ الْكَثِيْرَةُ الْمُعْتَبَرَةُ الصَّرِيْحَةُ فِىْ وُقُوْعِ السِّقْطِ وَ دُخُوْلِ النُّقْصَانِ فِى الْمَوْجُوْدِ مِنَ الْقُرْآنِ " [فصل الخطاب (ص:۲۳۵)]

"بہت ساری معتبر روایتیں موجودہ قرآن میں کمی پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں۔"

ملا فیض کاشانی لکھتا ہے:

" وَ اَمَّا اِعْتِقَادُ مَشَایِخِنَا فِیْ ذٰلِكَ فَالظَّاهِرُ مِنْ ثِقَةِ الْاِسْلَامِ مُحَمَّدِ بْنِ یَعْقُوْبَ الْكُلَیْنِیِّ اِنَّهٗ كَانَ یَعْتَقِدُ التَّحْرِیْفَ وَ النُّقْصَانَ فِی الْقُرْاٰنِ لِاَنَّهٗ كَانَ رَوٰی رِوَایَاتٍ فِیْ هٰذَا الْمَعْنٰی فِیْ كِتَابِهِ الْكَافِیْ وَ لَمْ یَتَعَرَّضْ لِقَدْحٍ فِیْهَا مَعَ اَنَّهٗ ذَكَرَ فِیْ اَوَّلِ الْكِتَابِ اَنَّهٗ كَانَ یَثِقُ بِمَا رَوَاهُ فِیْهِ وَ كَذٰلِكَ اُسْتَاذُهٗ عَلِیُّ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ الْقُمِّیُّ فَاِنَّ تَفْسِیْرَهٗ مَمْلُوٌّ مِنْهُ وَ لَهٗ غُلُوٌّ فِیْهِ وَ كَانَ الشَّیْخُ اَحْمَدُ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ الطَّبَرَسِیُّ فَاِنَّهٗ اَیْضًا نَسَجَ عَلٰی مِنْوَالِهِمَا فِیْ كِتَابِ الْاِحْتِجَاجِ " [مقدمة تفسير صافی (٣٤/١)]

" بہر کیف تحریف قرآن کے بارے میں ہمارے مشائخ کا عقیدہ تو ظاہر بات ہے کہ ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی قرآن پاک میں تحریف اور کمی کا عقیدہ رکھتے ہیں، اس لیے کہ انھوں نے اپنی کتاب اصول کافی میں اس معنی کی روایات بیان کی ہیں اور ان پر جرح نہیں کی باوجود اس کے کہ انھوں نے اپنی کتاب کی ابتدا میں ذکر کیا ہے کہ جو روایات وہ اس میں لائیں گے اس پر انھیں اعتماد ہے۔ اسی طرح ان کے استاذ علی بن ابراہیم قمی کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ ان کی تفسیر قمی اس بات سے بھری پڑی ہے اور انھوں نے اس میں غلو سے کام لیا ہے اور شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی بھی ان دونوں کے منہج پر اپنی کتاب الاحتجاج میں چلے ہیں۔"

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ فقہ جعفریہ کی امہات الکتب میں دو ہزار سے زائد روایات تحریف قرآن پر دلالت کرتی ہیں اور یہ ان کے ہاں متواتر روایات ہیں۔ ان کا مقام بھی وہی ہے جو مسئلہ امامت کی روایات کا ہے اور مسئلہ امامت ان کے ہاں اصول دین سے ہے۔ اگر ان روایات کا انکار کریں گے تو اپنے اصول دین کا انکار کرنا پڑے گا اور ان روایات میں اس بات کی تصریح ہے کہ قرآن محرف ہو چکا ہے، اس میں کمی بیشی، تبدیلی حروف وکلمات وغیرہ کی صورت میں ہوئی ہے اور تحریف قرآن پر ان کے ثقہ علماء کا اتفاق ہے۔ تفسیر قمی جو ان کی پہلی تفاسیر میں سے ہے اور بڑی معتبر سمجھی جاتی ہے اور اس کا مؤلف علی بن ابراہیم قمی ان کے ہاں ثقہ محدث و مفسر ہونے کے ساتھ گیارھویں امام حسن عسکری کے دور کا ہے۔ اس میں تحریف قرآن پر دلالت کرنے والی کثیر روایات موجود ہیں اور اس کا شاگرد محمد بن یعقوب کلینی جو اصول کافی وغیرہ کا مؤلف ہے اور یہ کتاب ان کے ہاں ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں بخاری شریف ہے۔ یہ بھی تحریف قرآن کا قائل ہے اور اس کے علاوہ ان کے علماء کی بہت بڑی تعداد صراحتاً تحریف قرآن پر عقیدہ رکھتی ہے۔ بعض شیعہ حضرات اپنے چار علماء کا نام لیتے ہیں کہ وہ تحریف کے قائل نہ تھے:

① سید شریف مرتضی ② شیخ صدوق ③ ابو جعفر طوسی ④ ابو علی طبرسی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی تحریف کے قائل تھے۔ انھوں نے قرآن کے محرف نہ ہونے کا قول تقیہ کرتے ہوئے اور بعض

مصلحتوں کی بنیاد پر اختیار کیا کیونکہ سید شریف مرتضی نے اپنے رسالہ " المحکم والمتشابة المعروف بتعید النعمانی (ص:٢٦)" میں لکھا ہے:

" وَ اَمَّا مَا حُرِّفَ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَقَوْلُهُ " كُنْتُمْ خَيْرَ اَئِمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ " فَحُرِّفَتْ اِلٰى خَيْرَ اُمَّةٍ "

مقصود یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "ائمه"کو "امّه" سے بدل دیا گیا ہے۔ اسی طرح کی کئی مثالیں شریف مرتضی نے اس مقام پر ذکر کرکے واضح کر دیا کہ یہ اس بات کا قائل ہے کہ قرآن حکیم میں تحریف کی گئی ہے۔

مرزا حسین بن محمد نے فصل الخطاب میں ذکر کیا ہے کہ ان متقدمین میں کوئی موافق نہیں ہے۔

سید نعمت اللہ الجزائری الشیعی نے لکھا ہے:

" وَ الظَّاهِرُ اَنَّ هٰذَا الْقَوْلَ اِنَّمَا صَدَرَ مِنْهُمْ لِاَجْلِ مَصَالِحَ كَثِيْرَةٍ مِنْهَا سَدُّ بَابِ الطَّعْنِ عَلَيْهَا بِاَنَّهُ اِذَا جَازَ هٰذَا فِي الْقُرْآنِ فَكَيْفَ جَازَ الْعَمَلُ بِقَوَاعِدِهِ وَ اَحْكَامِهِ مَعَ جَوَازِ لُحُوْقِ التَّحْرِيْفِ لَهَا ، كَيْفَ وَ هٰؤُلَاءِ الْاَعْلَامُ رَوَوْا فِيْ مُؤَلَّفَاتِهِمْ اَخْبَارًا كَثِيْرَةً تَشْتَمِلُ عَلٰى وُقُوْعِ تِلْكَ الْاُمُوْرِ فِي الْقُرْآنِ وَ اِنَّ الْآيَةَ هٰكَذَا اُنْزِلَتْ ثُمَّ غُيِّرَتْ اِلٰى هٰذَا "[الأنوار النعمانية(٣٥٨/٢)]

'' ظاہر ہے کہ ان حضرات کا یہ انکار چند مصلحتوں پر مبنی تھا جن میں سے ایک یہ ہے کہ طعن کا دروازہ بند کرنے کے لیے کہ جب قرآن میں تحریف جائز ہے تو اس کے قواعد اور احکام پر عمل کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ باوجود اس کے کہ ان میں تحریف کا واقع ہونا جائز ہے اور یہ قرآن کے غیر محرف ہونے کا عقیدہ کیسے رکھ سکتے تھے؟ جب کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں بہت ساری ایسی روایات درج کی ہیں جو تحریف قرآن پر مشتمل ہیں اور بتاتی ہیں کہ فلاں آیت اس طرح نازل ہوئی پھر اس طرح بدل دی گئی۔''

معلوم ہوا کہ ان چاروں نے بھی تقیہ کرتے ہوئے اور بعض مصلحتوں کی بنا پر کہہ دیا کہ قرآن محرف نہیں حالانکہ یہ تحریف کے قائل تھے۔ بعض شیعہ یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ ہم تو اس قرآن کو مانتے ہیں اور اسے ہی پڑھتے پڑھاتے ہیں، لہٰذا ہم کیسے اس کی تحریف کے قائل ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی صرف مغالطہ ہے کیونکہ یہ تقیہ کی آڑ میں ایسا کہتے ہیں، ان کو یہ حکم ہے کہ جب تک بارھواں امام اصل قرآن لے کر نہیں آتا تم اسے ہی پڑھتے رہو، جب وہ اصل قرآن لے کر آئے گا تو پھر اس کی تلاوت ہو گی۔ مولوی مقبول دہلوی سورۂ یوسف کی آیت (۴۹) میں ''یَعْصِرُوْنَ'' کے لفظ کے بارے میں لکھتا ہے:

'' معلوم ہوتا کہ جب قرآن میں ظاہر اعراب لگا دیے گئے تو شراب خور خلفاء کی خاطر یُعْصَرُوْنَ کو یَعْصِرُوْنَ سے بدل کر معنی کو زیر و زبر کیا گیا ہے یا مجہول کو معروف سے بدل کر لوگوں کے لیے ان کے کرتوت کی معرفت آسان کر دی۔ ہم اپنے امام کے حکم سے مجبور ہیں کہ جو تغیر یہ لوگ کر دیں تم اس کو اس کے حال پر رہنے دو اور تغیر کرنے والے کا عذاب کم نہ کرو، ہاں جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو اصل حال سے مطلع کر دو۔ قرآن کو اس کی اس حالت پر لانا جناب

صاحب العصر علیہ السلام کا حق ہے اور انہی کے وقت میں وہ حسب تنزیل خدائے تعالیٰ پڑھا جائے گا۔'' [ترجمہ و تفسیر مقبول دھلوی (ص/۳۸٤)]

نیز دیکھیں شیعہ حضرات کی معتبر کتب " الأنوار النعمانية(۲/۳٦۰)، المقدمة السادسة من تفسير الصافى (۲۵/۱)، بصائر الدرجات الجزء الرابع(ص/۱۹۳)"

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ اس قرآن کو پڑھنے پر مجبور ہیں اور ان کے نزدیک اصل قرآن ان کا بارھواں امام صاحب العصر و الزماں لے کر آئے گا۔ اس کے ظہور تک یہ اسے ہی پڑھتے رہیں گے، حقیقت میں ان کا اس پر ایمان نہیں ہے۔ لہٰذا واضح ہوگیا کہ ان کا ایمان نہ قرآن پر ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ قرآن پر صحیح ایمان لے آئیں تو فقہ جعفریہ کا خون ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حقائق کو سمجھ کر صحیح عمل کی توفیق نصیب کرے اور باطل مذاہب سے محفوظ رکھے۔ شیعہ حضرات کے اس موقف کی تفصیل کے لیے ان کی کتاب " فصل الخطاب فی اثبات تحريف كتاب رب الارباب" اور علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کی " الشيعة و القرآن" ملاحظہ ہو۔

ماہ محرم کی بدعات اور ناجائز امور

سوال ماہِ محرم کی بدعات اور ان کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈال دیں تاکہ سمجھ دار لوگ اس برائی سے بچ سکیں؟

جواب ماہ محرم میں تعزیہ نکالنا، غازی عباس کے نام کا پنجہ نکالنا، ڈولی بنانا، عورتوں کا بازاروں میں مردوں کے ساتھ مل کر سینہ کوبی کرنا جیسے تمام امور سراسر بدعت اور ناجائز ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[بخاری، كتاب الصلح : باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود(۲٦۹۷)، مسلم، كتاب الاقضية : باب نقض الأحكام الباطلة و رد محدثات الأمور (۱۷۱۸)]

''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی وہ مردود ہے۔''

② یہی حدیث سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ دِيْنِنَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[شرح السنة(۲۱۱/۱)]

''جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو پہلے اس میں نہیں تھی تو وہ مردود ہے۔''

③ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے:

« مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ » [مسلم ، كتاب الأقضية: باب نقض الأحكام الباطلة و رد محدثات الأمور (۱۷۱۸)]

''جس نے ایسا کام کیا جس پر ہمارا حکم نہیں وہ مردود ہے۔''

④ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« إِنَّ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَ أَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَ إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ وَ مَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ » [بخاری، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة : باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ (۷۲۷۷)]

”بے شک سب سے بہترین حدیث اللہ کی کتاب ہے، سب سے اچھی سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے اور سب سے بدترین کام نئے ایجاد کردہ (یعنی بدعات) ہیں۔ بے شک جو تم وعدہ دیے گئے ہو وہ آنے والا ہے اور تم (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو۔“

⑤ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کا خطبہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کہتے تھے:

« فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَ خَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ شَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ » [مسلم، كتاب الجمعة : باب تخفيف الصلاة والخطبة (۸٦۷)]

”یقیناً سب سے بہترین حدیث اللہ کی کتاب ہے، سب سے بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے اور سب سے بدترین کام نئے ایجاد کردہ (یعنی بدعات وخرافات) ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ ہدایت و رہنمائی، طریقہ و راستہ صرف وہی برحق ہے جس پر محمد ﷺ تھے اور جو کام نبی کریم ﷺ کی سنت سے ثابت نہ ہو بلکہ خود تراشیدہ ہو وہ گمراہی و بدعت ہے۔

مذکورہ بالا امور نبی کریم ﷺ سے ہرگز ثابت نہیں بلکہ نبی ﷺ نے تو چہرہ پیٹنے اور سینہ کوبی کرنے سے منع فرمایا ہے:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُودَ وَ شَقَّ الْجُيُوبَ وَ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ » [بخاری، كتاب الجنائز : باب ليس منا من شق الجيوب (۱۲۹٤)، شرح السنة (٤٣٦/٥)]

”جس نے رخسار پیٹے اور گریبان چاک کیے اور جاہلیت کے واویلے کی طرح واویلا کیا وہ ہم میں سے نہیں۔“

اسی طرح نوحہ گری کے متعلق آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

« أَرْبَعٌ فِي أُمَّتِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ لَا يَتْرُكُونَهُنَّ الْفَخْرُ فِي الْأَحْسَابِ وَ الطَّعْنُ فِي الْأَنْسَابِ وَ الْإِسْتِسْقَاءُ بِالنُّجُومِ وَ النِّيَاحَةُ » [مسلم ، كتاب الجنائز: باب التشديد في النياحة (۹۳٤)، شرح السنة (٤٣٧/٥)]

”میری امت میں چار کام جاہلیت کے امر سے ہیں جنھیں یہ ترک نہیں کریں گے: (۱) خاندانی وقار پر فخر کرنا۔ (۲) نسب ناموں میں طعن کرنا۔ (۳) ستاروں کے ذریعے پانی طلب کرنا۔ (۴) نوحہ گری کرنا۔“

اسی طرح اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

« النَّائِحَةُ اِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ عَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قَطِرَانٍ وَ دِرْعٌ مِّنْ جَرَبٍ »

''جب نوحہ کرنے والی نے اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کی تو قیامت والے دن اس طرح اٹھائی جائے گی کہ اس پر گندھک کا کرتہ اور خارش کی قمیص ہوگی۔''

ابو بردہ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو سخت تکلیف تھی کہ غشی طاری ہوگئی اور ان کا سر ان کے گھر کی کسی عورت کی گود میں تھا تو ان کے گھر سے ایک عورت چلائی، انھیں طاقت نہ تھی کہ اس عورت کو کوئی جواب دیتے، جب افاقہ ہوا تو فرمایا:

« اَنَا بَرِیْءٌ مِّمَّا بَرِیَٔ مِنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بَرِیْءٌ مِّنَ الصَّالِقَةِ وَ الْحَالِقَةِ وَ الشَّاقَّةِ »[مسلم ، كتاب الايمان: باب تحريم ضرب الخدود......(١٠٤)]

''جس چیز سے رسول اللہ ﷺ بیزار تھے میں بھی اس سے بیزار ہوں یقیناً رسول اللہ ﷺ مصیبت کے وقت آواز بلند کرنے والی، بال منڈانے والی اور کپڑے پھاڑنے والی سے بری تھے۔''

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ تعزیت کے جلوس نکالنا، آہ و بکا کرنا، سینہ کوبی، ماتم کرنا، مرثیے کہنا اور نوحہ گری کرنا شریعت اسلامیہ میں ممنوع وحرام ہے۔ اب فقہ جعفری کے دو حوالے ذکر کرتا ہوں:

① فقہ جعفریہ کی معروف کتاب " الأنوار النعمانية" میں معراج کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« وَ رَاَيْتُ الْمَرْاَةَ عَلٰى صُوْرَةِ الْكَلْبِ وَ النَّارُ تَدْخُلُ فِیْ دُبُرِهَا وَ تَخْرُجُ مِنْ فِيْهَا وَ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُوْنَ رَأْسَهَا وَ يَدَهَا بِمَقَامِعَ مِنَ النَّارِ فَقَالَتْ فَاطِمَةُ عَلَيْهَا السَّلَامُ حَبِيْبِیْ وَ قُرَّةُ عَيْنِیْ ! اَخْبِرْنِیْ مَا كَانَ عَمَلُهُنَّ حَتّٰى وَضَعَ اللّٰهُ عَلَيْهِنَّ الْعَذَابَ فَاِنَّهَا كَانَتْ قَيْنَةً نَوَّاحَةً حَاسِدَةً »

[الأنوار النعمانية(٢١٦/١)، نيز ديكهيں كتاب حيات القلوب(٥٤٢/٢)، عيون اخبار الرضا (١٠/٢)]

''میں نے ایک عورت کتے کی شکل میں دیکھی، جس کے پیچھے سے آگ داخل ہوتی اور منہ سے نکلتی تھی۔ فرشتے آگ کے ہتھوڑوں سے اس کے سر اور ہاتھوں کو مارتے تھے۔'' فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''میرے محبوب اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک! مجھے بتائیں کہ ان عورتوں کا کیا عمل تھا کہ اللہ نے ان پر عذاب مسلط کر رکھا تھا؟'' (آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری بیٹی!) وہ گانے والی، نوحہ گر اور حسد کرنے والی عورت تھی۔''

② سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

" مَنْ جَدَّدَ قَبْرًا اَوْ مَثَّلَ مِثَالًا فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ " [من لا يحضره الفقيه (١/ ١٢٠)]

''جس نے کسی قبر کی تجدید کی یا کوئی شبیہ بنائی تو وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔''

نیز صاحب کتاب نے " مَثَّلَ مِثَالًا " کی یہ شرح کی ہے:

" مَنْ اَبْدَعَ بِدْعَةً وَ دَعَا اِلَيْهِ اَوْ وَضَعَ دِيْنًا فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ" [من لا يحضره الفقيه (١٢١/١)]

''جس نے کوئی بدعت ایجاد کی اور اس کی طرف دعوت دی یا دین بنایا وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔''

مذکورہ بالا فقہ جعفریہ کے حوالہ جات سے واضح ہوگیا کہ نوحہ گری کرنا یا شبیہ بنانا مثلاً غازی عباس کا علم اور ہاتھ وغیرہ بنانا شرعاً حرام ہے اور ایسے امور ہیں جنھیں دین سمجھ کر اسلام میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ان رسمی جلوسوں، تعزیوں اور نوحہ گری کی پارٹیوں کا گلی بازار وغیرہ میں گھومنا اسلام سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ بدعات خیرالقرون کے بعد کی ایجاد ہیں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ ۳۵۲ھ کے حالات میں رقمطراز ہیں:

" فِيْ عَاشِرِ الْمُحَرَّمِ مِنْ هٰذِهِ السَّنَةِ اَمَرَ مُعِزُّ الدَّوْلَةِ بْنُ بُوَيْهٍ قَبَّحَهُ اللّٰهُ ...... اَنْ تُغْلَقَ الْاَسْوَاقُ وَ اَنْ يَّلْبَسَ النِّسَاءُ الْمَسُوْحَ مِنَ الشَّعْرِ وَ اَنْ يَّخْرُجْنَ فِي الْاَسْوَاقِ حَاسِدَاتٍ عَنْ وُجُوْهِهِنَّ نَاشِرَاتٍ شُعُوْرِهِنَّ يَلْطِمْنَ وُجُوْهَهُنَّ يَنِعْنَ عَلَى الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ وَ لَمْ يُمْكِنْ اَهْلُ السُّنَّةِ مَنْعَ ذٰلِكَ لِكَثْرَةِ الشِّيْعَةِ وَ ظُهُوْرِهِمْ وَ كَوْنِ السُّلْطَانِ مَعَهُمْ "
[البداية والنهاية(١١/ ٢٣٠)]

''اس سال کے دس محرم کو معزالدولہ بن بویہ (اللہ اس کا برا کرے) نے حکم دیا کہ بازار بند کر دیے جائیں اور عورتیں بالوں کے بنے ہوئے کمبل پہن کر بازاروں میں اس طرح نکلیں کہ وہ چہرے ننگے کرنے والیاں اور بال بکھیرنے والیاں ہوں۔ اپنے چہروں کو تھپڑ ماریں، حسین بن علی رضی اللہ عنہما پر نوحہ کریں۔ اس کام سے روکنا اہل سنت کے بس میں نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیعہ حضرات کی اکثریت تھی، انھیں غلبہ حاصل تھا اور بادشاہِ وقت ان کے ساتھ تھا۔''

امام ابن اثیر جزری رحمہ اللہ نے بھی تقریباً یہی بات تحریر کی ہے۔[الكامل لابن الاثير(١٩٧/٢)]

اور یہ بات شیعہ حضرات کو بھی تسلیم ہے۔[مجاهد اعظم (ص:٣٣٣)، لشاكر حسين نقوى]

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ تعزیہ وغیرہ کی بدعات کا رواج چوتھی صدی ہجری میں ہوا ہے اور اس کا بانی معزالدولہ بن بویہ ہے۔ اس سے قبل اس بدعت کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔ لہٰذا ایسی بدعات وخرافات سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے اور ان جلوسوں اور تعزیوں میں شامل ہو کر ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ ان میں حاضری دینے والا گناہ پر تعاون کرتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [المائدة: ٢]

''نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔''

جادو اور جنات نکالنے کی شرعی حیثیت

سوال کیا جنوں کی حقیقت ہے؟ نیز جادو کے علاج اور جنات نکالنے کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمادیں۔

جواب جنوں کا وجود انبیاء علیہم السلام کی متواتر خبروں سے معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ زندہ، ذی عقل اور ارادے کے مطابق عمل کرنے والے، نیکی کا حکم دیے گئے اور برائی سے روکے گئے ہیں۔ ان کی کوئی خاص صفت یا لمبائی چوڑائی مقرر نہیں ہے جیسا کہ بعض ملحدوں کا دعویٰ ہے۔ چونکہ جنوں کا معاملہ انبیاء علیہم السلام سے متواتر ثابت ہے اس لیے ہر خاص و عام اسے متواترہ جانتا ہے لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ کوئی گروہ جو رسولوں کی طرف اپنی نسبت کرتا ہو اور وہ ان کے وجود کا انکار کرے۔

[مجموع الفتاویٰ (۱۰،۹/۱۹)]

کتاب وسنت اور اجماع امت سے یہ بات بالکل عیاں اور ظاہر و باہر ہے کہ جنات کا وجود ہے اور یہ آگ کے شعلے سے پیدا کیے گئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح انسانوں کی طرف رسول بنا کر مبعوث کیا گیا، اسی طرح جنات کی طرف بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر بن کر مبعوث ہوئے ہیں۔ جنات میں بھی نیک و بد ہر طرح کے لوگ موجود ہیں، جو ان میں شیطنت کی صفت کے حامل ہوتے ہیں، وہ انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے مختلف قسم کے وساوس وخطرات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس صورت میں انسانوں کو تعوذ پڑھنا چاہیے اور اللہ پاک کی پناہ پکڑنی چاہیے۔ معاشرے میں جو عمومی صورتحال ہے کہ جوان لڑکیوں کو جنات کی شکایت ہوتی ہے، اکثر اوقات ہوتا یہ ہے کہ لڑکی کی پسند کی شادی والدین نہیں کرتے تو وہ جنات کے سایہ کی شکایت کرنے لگ جاتی ہے اور والدین پریشان ہو کر جنات نکالنے والے عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ آ کر جوان لڑکی کو چھوتے بھی ہیں اور رقم بھی بٹورتے ہیں۔ یہ دھندہ عروج پر ہے۔ اکثر جنات نکالنے والے زر اور زن کے پیاسے ہوتے ہیں۔ پھر وہ طرح طرح کے ڈرامے رچا کر اپنا مقصود پورا کرتے ہیں۔ جب لڑکی کی مرضی سے اس کے آشنا سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو جنات کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ بعض روایات میں صراحتاً جنات کے وجود انسانی میں داخلے کا تذکرہ ملتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

''ایک سفر میں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلا۔ آپ قضائے حاجت کے لیے نہیں جاتے تھے یہاں تک کہ غائب ہو جاتے، دکھائی نہ دیتے۔ ہم ایک چٹیل میدان میں اترے، نہ اس میں درخت تھا اور نہ پہاڑ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' اے جابر! اپنے برتن میں پانی ڈال پھر ہمارے ساتھ چل۔'' جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم چل پڑے یہاں تک کہ ہم دکھائی نہ دیتے تھے۔ ہم ایک چٹیل میدان میں پہنچے، نہ اس میں درخت تھے اور نہ پہاڑ۔ اچانک دو درخت نظر آئے، جن کے درمیان چار ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اے جابر! اس درخت کی طرف جا اور کہہ کہ اللہ کے

رسول تمھیں کہتے ہیں تو اپنے ساتھی (یعنی دوسرے درخت) کے ساتھ مل جا یہاں تک کہ میں تمھارے پیچھے (قضائے حاجت کے لیے) بیٹھوں۔''

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے ایسے کہا وہ درخت اس کی طرف پلٹ آیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں درختوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ پھر وہ دونوں اپنی جگہ کی طرف پلٹ آئے۔ ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوار ہو گئے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان ایسے تھے گویا ہمارے اوپر پرندوں نے سایہ کیا ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک عورت آئی۔ اس کے پاس اس کا بچہ تھا، کہنے لگی: ''اے اللہ کے رسول! بلاشبہ میرے اس بیٹے کو ہر روز تین دفعہ شیطان پکڑ لیتا ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچے کو لے لیا۔ آپ نے اسے اپنے اور کجاوے کے اگلے حصے کے درمیان بٹھا دیا، پھر فرمایا: ''اللہ کے دشمن ذلیل ہو جا، میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ کے دشمن ذلیل ہو جا، میں اللہ کا رسول ہوں۔'' تین مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کہا، پھر بچہ اس عورت کے حوالے کر دیا۔ جب ہم نے اپنا سفر تمام کرلیا اور ہم اس جگہ سے گزرے تو عورت اپنے بچے سمیت ہمارے سامنے آ گئی۔ اس کے ساتھ دو مینڈھے تھے جنھیں وہ ہانک کر لا رہی تھی۔ کہنے لگی: ''اے اللہ کے رسول! میری طرف سے ہدیہ قبول کرلیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا! اس کے بعد وہ شیطان واپس نہیں لوٹا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک مینڈھا اس سے لے لو اور دوسرا اسے واپس کر دو۔'' [دارمی(١/١٦٧،١٦٨)، ابن ابی شیبة (١١/٤٩٠،٤٩٢)، (١١٨٠٣)، التمهيد (١/٢٢٣،٢٢٤) دلائل النبوة لأبی نعیم (٢٨٢)، عبدبن حمید (١٠٥٢)]

اس روایت کی سند میں اسماعیل بن عبدالملک ہے۔ امام ابو حاتم رازی، امام نسائی، امام ابن حبان، امام ابوداود، امام محمد بن عمار، امام عقیلی، امام دولابی، امام ابوالعرب القیروانی، امام ابن شاہین (رحمہم اللہ) نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ [تهذيب الكمال (٣/١٤٢،١٤٣)]

یعلی بن مرہ ثقفی رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت میں ہے:

''دوران سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت بچہ لے کر حاضر ہوئی۔ اس بچے کو جن کی شکایت تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ناک کو پکڑا اور فرمایا: ''نکل جا، بے شک میں محمد اللہ کا رسول ہوں۔'' کہتے ہیں پھر ہم سفر پر روانہ ہو گئے، جب ہم اپنے سفر سے واپس پلٹے، ہم اس پانی والی جگہ کے پاس سے گزرے تو وہ عورت اونٹ اور دودھ لے کر آئی۔ آپ نے اونٹ واپس کرنے کا حکم دیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دودھ پینے کا حکم دیا، انھوں نے دودھ پی لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے بچے کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگی: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! آپ کے بعد ہم نے اس میں کوئی بے قراری نہیں دیکھی۔'' [مسند احمد(٤/١٧٣)(١٧٧٠٨)، شرح السنة(١٣/٢٩٦)]

اس کی سند میں عطا بن السائب ہیں جنھیں اختلاط ہو گیا تھا اور معمر کی روایت ان سے اختلاط کے بعد کی ہے اور عبداللہ بن حفص مجہول راوی ہے۔

عطا کے اختلاط کے متعلق ملاحظہ ہو: [تهذيب الكمال(٩١/٢٠)]

اور عبد اللہ بن حفص کی جہالت کے بارے میں دیکھیں: [تقريب ، تاريخ الدارمی(٤٦٤)، الكامل لابن عدی، نهاية السول، الكاشف وغيرها)]

یہ روایت مستدرک حاکم (۶۱۵/۲) میں بطریق احمد بن عبد الجبار از یونس بن بکیر از اعمش از المنہال بن عمرو از یعلی بن مرہ مروی ہے۔ لیکن اس سند میں احمد بن عبد الجبار ہے۔ امام ابو حاتم رازی رحمہ اللہ نے کہا: ''یہ قوی نہیں ہے۔''

محمد بن عبد اللہ الحضرمی نے کہا: ''یہ جھوٹ بولتا تھا۔'' خود حاکم رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ محدثین کے ہاں قوی نہیں ہے۔'' امام ابو احمد بن عدی فرماتے ہیں: ''اہل عراق اس کے ضعف پر متفق ہیں۔'' الغرض یہ روایت ضعیف ہے۔ [تهذيب الكمال (١٦٦/٢٣-١٦٧)]

پھر اس کی سند میں اعمش کی تدلیس بھی ہے اور روایت معنعن ہے۔

یہ روایت مسند احمد (۱۷۶۹۰) میں عبد اللہ بن نمیر از عثمان بن حکیم از عبد اللہ بن عبد العزیز از یعلی بن مرہ کے طریق سے بھی مروی ہے اور یہ عبد الرحمٰن بن عبد العزیز غیر معروف ہے۔ [تعجيل المنفعة لا بن حجر عسقلانی(ص/٢٥٣)]

اگر اس عبد الرحمٰن سے عبد اللہ بن عبد العزیز بن عبد اللہ بن عثمان بن حنیف الانصاری مراد ہوں تو یہ سند منقطع ہے کیونکہ اس کی وفات ۱۶۲ھ کی ہے۔ اس کی عمر ۷۰ سال سے کچھ زیادہ تھی، تقریباً یہ ۹۵ھ کے قریب پیدا ہوا تھا اور یعلی بن مرہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے اس کی ملاقات کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت اپنا بیٹا لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی: ''اے اللہ کے رسول! بلاشبہ میرے بیٹے کو جنون ہے اور وہ اسے صبح شام کے کھانے کے وقت پکڑ لیتا ہے اور ہمارے اوپر خباثت کرتا ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سینے کو نرم کیا اور دعا کی۔ اس نے ایک بار قے کی۔ اس کے پیٹ سے سیاہ پلے کی طرح کی کوئی چیز نکلی تو اس نے دوڑ لگا دی۔'' [دارمی(١٩)، ١/ ١٧٠) مسند احمد(٢٣٩/١)، طبرانی كبير(٥٧/١٢) دلائل النبوة للبيهقی (١٨٢/٦)]

مسند احمد اور طبرانی کی روایت کے آخر میں ہے کہ اس بچے نے شفا پالی۔ لیکن اس کی سند میں فرقد السنجی ہے۔ جمہور محدثین کے ہاں فرقد بن یعقوب السنجی ابو یعقوب راوی ضعیف ہے۔ [تهذيب اكمال(١٦٦/٢٣-١٦٧)]

اس طرح کی روایت مطر بن عبد الرحمٰن الاعنق عن ہند بن الوازع، عن الوازع کی سند سے بھی مروی ہے۔ [اتحاف المهرة لا بن حجر(٦٥٦/١٣)، اطراف المسند(٤٤٥/٥)، جامع المسانيد والسنن لا بن الكثير(٣٤٦/١٢)]

لیکن اس کی سند میں ہند ام ابان بنت الوازع کی توثیق معلوم نہیں۔ ایک روایت عثمان بن ابی العاص سے بھی مروی ہے جس کا ذکر علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ [مجمع الزوائد (٣/٩)]

انھوں نے کہا ہے کہ اس کی سند میں عثمان بن بسر ہے جسے میں نہیں پہچانتا اور اس کے باقی راوی ثقہ ہیں۔

البتہ اس سلسلے کی ایک صحیح السند روایت امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کی ہے کہ عثمان بن ابی العاص نے کہا: ''جب

رسول اللہ ﷺ نے مجھے طائف پر عامل بنایا، میری نماز میں کوئی چیز مجھے پیش آنے لگی، یہاں تک کہ میں نہیں جانتا تھا جو نماز میں نے پڑھی۔ جب میں نے یہ صورتحال دیکھی تو رسول اللہ ﷺ کی طرف کوچ کیا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابن ابی العاص!'' میں نے کہا: ''ہاں! اے اللہ کے رسول!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کون سی چیز تمھیں لائی ہے؟'' میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! کوئی چیز میری نماز میں مجھے پیش آتی ہے یہاں تک کہ میں نہیں جانتا جو نماز میں نے پڑھی۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شیطان ہے، قریب ہو۔'' میں آپ کے قریب ہوا اور اپنے قدموں کے سروں پر بیٹھ گیا۔ آپ ﷺ نے میرے سینے پر اپنا ہاتھ مارا اور میرے منہ میں لعاب لگایا اور فرمایا: ((أُخْرُجْ عَدُوَّ اللّٰهِ)) ''اے اللہ کے دشمن! نکل جا۔'' آپ ﷺ نے یہ کام تین مرتبہ کیا، پھر فرمایا: ''اپنے کام کے ساتھ الحاق کرلے۔'' عثمان رضی اللہ عنہ قسم کھا کر کہتے ہیں: ''میں گمان نہیں کرتا کہ اس کے بعد کبھی اس نے میرے ساتھ اختلاط کیا ہو۔''

اس حدیث کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی صحیح کہا ہے۔[ابن ماجة، كتاب الطب: باب الفزع والأرق وما يتعوذ منه (٥٤٨)، مصباح الزجاجة المسند الجامع(١٢/٤١١٨)]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان انسان میں داخل ہوتا ہے، اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: « أُخْرُجْ عَدُوَّ اللّٰهِ » ''اللہ کے دشمن نکل جا۔'' امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''انسان کے بدن میں جن کے داخل ہونے پر اہل سنت والجماعت کے ائمہ متفق ہیں۔'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ﴾ [البقرة: ٢٧٥]

''سود خور نہ کھڑے ہوں گے مگر اس طرح جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خبطی بنا دے۔''

اور صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''شیطان انسان کے جسم میں اس طرح گردش کرتا ہے جس طرح کہ خون دوران کرتا ہے۔''[بخاري، كتاب بدء الخلق باب صفة إبليس وجنوده (٣٢٨١)، مسلم (٢١٧٥)، ملاحظه هو مجموع الفتاویٰ لا بن تيميه (٢٤/٢٧٦)]

عبداللہ بن احمد ابن حنبل رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''میں نے اپنے والد (احمد ابن حنبل) سے کہا: ''بہت سے لوگ ایسے کہتے ہیں کہ کوئی جن کسی المصروع (جس پر جن سوار ہو) کے بدن میں داخل نہیں ہوتا۔'' تو انھوں نے کہا: ''اے میرے بیٹے! وہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصلاً یہ شیطان ہی ہے جو ان کی زبان سے (یہ جھوٹ) بولتا ہے۔''[مجموع الفتاوىٰ(٢٤،٢٧٧)]

ایک مقام پر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بعض جاہلی اور گمراہ لوگوں نے جنھیں علم نہیں اس بات کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ معتزلہ میں سے ایک گروہ مثلاً الجبائی اور ابوبکر الرازی وغیرہ نے مصروع کے بدن میں جن کے داخل ہونے کا انکار کیا ہے مگر وہ بھی جن کے وجود کا انکار نہیں کرتے۔''[مجموع الفتاوىٰ(١٩/١٢)]

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ''جادو کی حقیقت'' (ص:۱۸۹ تا ۱۹۱) از غازی عزیر مبارکپوری حفظہ اللہ مطبوعہ مکتبہ دارالسلام) اگر

کسی بھی شخص کو شیطانی وساوس لاحق ہوں تو وہ ان کا شرعی طریقہ کار سے علاج کرے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر پختہ اعتقاد رکھے، توکل و بھروسا اسی کی ذات پر کرے اور نفع و نقصان کا مالک اسے سمجھتے ہوئے اس سے صدق دل سے دعا مانگے اور شیاطین سے بچنے کے لیے استعاذہ سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو پناہ پکڑنے کی ہدایت یوں فرمائی:

﴿ وَ قُلْ رَبِّ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ ○ وَ أَعُوْذُبِكَ رَبِّ أَنْ يَّحْضُرُوْنَ ﴾

[المومنون:۹۷،۹۸]

"اور آپ کہہ دیں اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ پکڑتا ہوں اور اے میرے رب! میں اس بات سے بھی تیری پناہ پکڑتا ہوں کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں۔"

اسی طرح فرض نمازوں کے بعد ذکر و اذکار، سونے اور بیدار ہونے کے اذکار اور صبح شام کے اذکار کے علاوہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت:

« اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَ الْخَبَائِثِ »

غصہ اور گدھے کے رینگنے کے وقت "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" پڑھیں۔

الغرض اگر انسان مختلف مقامات پر تعوذ پڑھتا رہے تو اللہ تعالیٰ ضرور شفا عطا کرے گا۔ کتاب و سنت میں موجود ذکر و اذکار سے ہٹ کر شیطانی عمل کرنے والوں، غیر محرم عورتوں کے سر یا رگ کو پکڑ کر جن نکالنے والے عاملوں کے ہتھے نہ چڑھیں۔ وہ آپ کی عزت بھی برباد کریں گے اور دولت بھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہر قسم کے شیطانی ہتھکنڈوں اور ابلیسی کارروائیوں سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

جنات میں شادی بیاہ اور توالد و تناسل

سوال کیا جنات میں شادی بیاہ اور توالد و تناسل کا سلسلہ ہے؟

جواب شیاطین و جنات میں انسانوں کی طرح شادی بیاہ اور مناکحت و توالد کا سلسلہ موجود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فِيْهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ ﴾ [الرحمن:٥٦]

"ان نعمتوں کے درمیان نیچی نگاہوں والیاں (حوریں) ہوں گی، جنھیں جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہوگا۔"

امام بغوی رحمہ اللہ "لَمْ يَطْمِثْهُنَّ" کا معنی بیان کرتے ہیں "لَمْ يُجَامِعْهُنَّ" یعنی ان سے جنوں اور انسانوں نے کبھی جماع نہیں کیا۔ [معالم التنزیل(٤/٢٧٥)]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

" فِيهِ دَلِيلٌ عَلىٰ اَنَّ الْجِنَّ يَطْمِثُوْنَ " [تفسير انوار التنزيل وأسرار التاويل(٢/٤٥٦)]
''اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جن بھی جماع کرتے ہیں۔''
پس معلوم ہوا کہ انسانوں کی طرح جنوں میں بھی نکاح و جماع کا سلسلہ موجود ہے اور شیطان کی اولاد و ذریت کا تذکرہ بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴾ [الكهف: ٥٠]
''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: ''آدم کے لیے سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، وہ جنات میں سے تھا۔ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمھارا دشمن ہے اور ظالموں کے لیے برا بدلا ہے۔''
اس آیت سے ثابت ہوا کہ شیطان کی اولاد بھی ہے۔ لہٰذا پتا چلا کہ جنات میں بھی مباشرت و مناکحت اور توالد و تناسل کا سلسلہ انسانوں کی طرح قائم ہے۔

جنات سے بچاؤ کے لیے بچوں کے پاس چھری یا لوہے کی چیز رکھنا

(سوال) جنات سے بچاؤ کے لیے بچوں کے پاس چھری یا لوہے کی چیز رکھنا کیسا ہے؟
(جواب) یہ عملی طور پر درست نہیں اور شرعی طور پر اس کی کوئی صحیح بنیاد موجود نہیں۔ شرعی طریقہ یہ ہے کہ بچوں کو شیطان کے شر سے بچانے کے لیے دم کیا جائے، جس طرح رسول اللہ ﷺ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو دم کیا کرتے تھے۔
صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دم کے لیے یہ کلمات کہتے:
« أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّ هَامَّةٍ وَ مِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ » [بخاری، كتاب أحاديث الانبياء: باب قول الله تعالىٰ ﴿ واتخذالله ابراهيم خليلا ﴾ (٣٣٧١)]
''میں ہر شیطان، ہر زہریلے کیڑے اور ہر نظر بد سے اللہ کے تمام کلمات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں۔''
یا بچوں کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے۔ بچوں کے پاس چھری، چاکو یا لوہے وغیرہ کی کوئی چیز اس اعتقاد سے رکھنا کہ یہ انھیں شیطانی چالوں سے محفوظ رکھے گی تو یہ ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ صحیح عمل کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

شرعی احکامات میں ترمیم کی ضرورت سمجھنے والے کا حکم

(سوال) شرعی احکامات میں ترمیم کی ضرورت سمجھنے والے کا حکم کیا ہے؟
(جواب) وہ تمام احکامات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے نازل فرمائے اور ان کی توضیح قرآن حکیم یا احادیث رسول

میں کر دی گئی ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، وراثت، ایلاء، طلاق، حدود وغیرہ، جن پر امت کا اجماع ہے ان پر کسی فرد کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ ان میں ترمیم یا نظر ثانی کا مطالبہ کرنا حرام ہے۔ یہ احکام محکم اور شرعی ہیں اور ہر دور میں اسی طرح لاگو ہوں گے جیسے رسول اکرم ﷺ کے مبارک زمانے میں اور خلفائے راشدین کے دور میں جاری وساری تھے۔ جو شخص شرعی ومحکم احکامات میں ردّ وبدل اور ترمیم کرنا چاہتا ہے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ایسے احکامات کی مخالفت کر کے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر اعتراض کر رہا ہے جو صریح کفر ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی رو سے واجب القتل ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ »[بخاری کتاب الجهاد: باب لا یعذب بعذاب الله (۳۰۱۷)]

''جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کر دو۔''

لہٰذا تجدد پسند نیو جنریشن کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اسلام کے دائرہ میں محدود رکھیں، مغرب زدہ ہو کر اپنے آپ کو جہنم میں نہ جھونکیں۔ مسلمان والدین کو چاہیے کہ اپنے بچوں کی تربیت اسلامی اصولوں پر کریں تاکہ وہ اسلام پر اعتراض کرنے والے نہ ہوں بلکہ اسلام پر عمل کرنے والے سچے مسلمان بنیں۔

شرک ناقابل معافی جرم

سوال کیا شرک ناقابل معافی جرم ہے؟

جواب شرک سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''بلاشبہ شرک ظلم عظیم ہے'' اور شرک کو احادیث میں کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا کبیرہ گناہ کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ﴾ [المائدة:۷۲]

''جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا آگ ہے۔''

لہٰذا جو شخص توبہ کیے بغیر شرک ہی کی حالت میں مر گیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا، اس کے لیے نہ بخشش ہے اور نہ اسے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ہی نصیب ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴾ [التوبة:۱۱۳]

''کسی نبی اور اہل ایمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے بخشش کی دعا کریں اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں اس کے بعد کہ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ جہنمی ہیں۔''

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے ﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ ﴾ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ''مِنْ بَعْدِ مَا مَاتُوْهَا عَلٰى

شِرْکِھِمْ" یعنی ان کے شرک پر مرجانے کے بعد۔ مراد یہ ہے کہ جو شرک کی حالت میں مرجائے اس کے لیے بخشش کی دعا مانگنے کی بھی اجازت نہیں۔ [تفسیر طبری(٤٨٥/٦)]

مذکورہ توضیح سے معلوم ہوا کہ شرک اکبر الکبائر ہے اور اس پر مرنے والے جہنمی ہیں ان کی بخشش نہیں ہو گی، ان پر جنت حرام ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی کو مرنے سے پہلے توبہ کی توفیق دے دے اور موت سے پہلے وہ شرک چھوڑ کر توحید پر گامزن ہو جائے تو شرک کا گناہ معاف ہو جائے گا اور یہ بھی یاد رہے کہ شرکیہ عقائد و اعمال سب کے لیے شرک ہوتے ہیں، کافروں کے لیے بھی اور مسلمانوں کے لیے بھی۔ مسلمان ہو کر بھی اگر شرکیہ عقائد و اعمال اختیار کر لے تو مشرک ہو جائے گا اور شرک یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ذات، صفات اور عبادت میں کسی بھی مخلوق کو حصہ دار بنا لے۔ جیسے اللہ کی صفت عالم الغیب و الشھادۃ ہے۔ یہ صفت اس کی مخلوق میں سے کسی میں تسلیم کرے تو مشرک ہو جائے گا۔ [اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: کتاب التوحید، توحید خالص اور ھدایۃ المستفید]

سچی توبہ کی حیثیت

سوال اگر کوئی نوجوان کسی لڑکی کے بہکاوے میں آجائے اور وہ زنا کر بیٹھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ کام اسلام میں جائز نہیں مگر پھر بھی شیطان کے بہکاوے میں آجائے اور غلطی کا احساس ہونے پر سچے دل سے توبہ کر لے اور آئندہ ایسی غلطی کبھی نہ کرے تو کیا اللہ اس کی توبہ قبول کر لے گا؟

جواب جب کوئی شخص شیطان کے بہکاوے میں آ کر کسی گناہ کا ارتکاب کر لیتا ہے پھر سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اے ایمان والو! اللہ کی طرف سے صاف دل سے توبہ کرلو۔" [تحریم: ٨]

ایک اور مقام پر فرمایا:

"اے ایمان والو! سب اللہ کے آگے توبہ کرلو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔" [نور: ٣١]

بخاری و مسلم میں سو بندوں کے قاتل کا قصہ ہے مختصر یہ کہ جب اس قاتل نے سچے دل سے توبہ کا ارادہ کر لیا اور ایک عالم کے بتانے پر وہ ایک بستی کی طرف روانہ ہوا جہاں لوگ اللہ کی بندگی کرنے والے تھے تو اسے راستے میں موت آگئی اور اسے رحمت کے فرشتے لے گئے۔

اسی طرح ایک عورت نے زنا کر لیا پھر نادم ہو کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، حد لگانے کا مطالبہ کیا بالآخر اسے رجم کیا گیا اور آپ نے اس کا جنازہ پڑھا، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

"یارسول اللہ! آپ اس زانیہ کا جنازہ پڑھ رہے ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ مدینے کے ستر بندوں پر تقسیم کی جائے تو سب کو کافی ہو جائے۔" [مسلم، کتاب الحدود: باب من اعتراف نفسه

بالزنی (١٦٩٦)]

بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ جو شخص توبہ کرتا ہے اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ خالص اور سچی توبہ کی تین شرائط ہیں:۔

① گناہ کرنے والا گناہ سے باز آجائے۔

② گناہ پر نادم ہو۔

③ پختہ عزم کرے کہ پھر وہ اس گناہ میں مبتلا نہ ہوگا۔

جیسا کہ ریاض الصالحین باب التوبہ میں مذکور ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے گناہ پر شرمندہ ہو کر اسے چھوڑ دیتا ہے اور آئندہ پختہ ارادہ کر لیتا ہے کہ وہ گناہ نہیں کرے گا تو اللہ ایسے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے۔

WWW. KITABOSUNNAT. COM

KITABOSUNNAT @ GMAIL. COM

وضو کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

وضو میں پاؤں کا دھونا

(سوال) وضو میں پاؤں دھونے کا حکم ہے یا مسح کا؟ کیا سورۂ مائدہ کی آیت (۶) سے پاؤں پر مسح کا حکم ثابت ہوتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح راہ نمائی فرمائیں۔

(جواب) قرآن حکیم میں بھی پاؤں دھونے کا حکم ہے اور سنت رسول ﷺ بھی یہی ہے۔ قرآن حکیم میں سورۂ مائدہ کی آیت (۶) میں وضو کا حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے: ''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو، سروں پر مسح کرلو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولو۔''

اس آیت میں قابل غور بات یہ ہے کہ دو حکم ہیں: ایک دھونے کا اور دوسرا مسح کرنے کا۔ جن اعضاء کو دھونے کا حکم ہے ان پر زبر ہے جیسے ''وُجُوهَكُمْ ، اَيْدِيَكُمْ'' اور ''اَرْجُلَكُمْ'' اور جس پر مسح کا حکم ہے اس کے نیچے زیر ہے جیسے ''بِرُءُوسِكُمْ''۔ قرآن حکیم کی متواتر قراءت میں اور جتنے مطبوعہ نسخے ہیں ان سب میں ''اَرْجُلَكُمْ'' کی لام پر زبر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاؤں پر مسح نہیں بلکہ پاؤں کے دھونے کا حکم ہے اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل بھی یہی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا کہ ان کی ایڑیوں پر خشکی چمک رہی ہے تو آپ ﷺ نے بلند آواز سے دو یا تین مرتبہ فرمایا: ''ان ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے، لہٰذا وضو اچھی طرح کرو (یعنی ایڑیوں کو اچھی طرح سے دھولو، یہ کہیں سے خشک نہ رہ جائیں)۔'' [مسلم، كتاب الطهارة، باب وجوب الغسل بكمالها: ٢٤١۔ بخاری، كتاب الوضوء: باب غسل الرجلين: ١٦٣۔]

لہٰذا صحیح بات جو قرآن حکیم اور احادیث رسول ﷺ سے ثابت ہے وہ وضو میں پاؤں کا دھونا ہی ہے۔

وضو کی دعا کے متعلق حدیث کی وضاحت

(سوال) میں نے ایک مسجد میں وضو کی دعا ''بِسْمِ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ'' لکھی ہوئی دیکھی ہے اور اس پر مجمع الزوائد کا حوالہ تھا، کیا یہ روایت صحیح ہے؟

(جواب) مجمع الزوائد میں یہ روایت طبرانی کے حوالہ سے علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے درج کی ہے اور اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ طبرانی (۷۳/۱) میں مروی اس روایت کی سند میں ابراہیم بن محمد البصری منکر الحدیث ہے۔ دیکھیں میزان (۵۶/۱) المغنی فی الضعفاء (۱۶۱) دیوان الضعفاء (۲۴۷) للذہبی] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نتائج الافکار (۲۲۷/۱) میں اسے

ضعیف قرار دیا ہے اورلسان المیزان (۹۸/۱)میں اس روایت کو منکرقرار دیا ہے۔ اسی طرح علامہ محمد طاہر پٹنی رحمہ اللہ نے تذکرۃ الموضوعات (ص ۳۱) میں اس روایت کو منکر ہی قرار دیا ہے۔[مزید تفصیل کے لیے دیکھیں کتاب الموضوعات لابن الجوزی (۱٦۸۰)، اورتنزیۃ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاحادیث الشنیعہ الموضوعہ (٢/٤٠٣)]

بعض ائمہ نے ابراہیم بن محمد کے استادعلی بن ثابت کو مجہول قرار دیا ہے۔ (نتائج الافکاراورترتیب الموضوعات) لیکن اسے امام احمد نے ثقہ اورابوحاتم رازی رحمہ اللہ نے ''لَا بَأسَ بِهِ'' قرار دیا ہے۔(الجرح والتعدیل: ۱۷۷/٦) لہٰذا اس کی سند میں اصل علت ابراہیم بن محمد البصری ہے جس کی یہ منکر روایت ہے۔

دوران وضودعائیں پڑھنا

سوال کیا دوران وضو رسول اللہ ﷺ سے کوئی دعا ثابت ہے؟

جواب صحیح احادیث سے وضو کی ابتدا میں ''بسم اللہ'' اور آخر میں یہ دعا ثابت ہے:

« أَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَ اجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ » [ترمذی، کتاب الطهارة: باب ما یقال بعد الوضوء :٥٥]

دوران وضو ایک ایک عضو کے دھونے پر جو لوگ مختلف کلمات پڑھتے ہیں ان کا ثبوت کسی معتبر اور صحیح حدیث میں موجود نہیں ہے۔

وضو کے بعد شرم گاہ کی طرف چھینٹے مارنا

سوال وضو کرنے کے بعد شرم گاہ کی طرف چھینٹے مارنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب وضو کے بعد شرمگاہ کی طرف چھینٹے مارنا شرعی طور پر جائز اور درست ہے، اس کے ذریعے شیطانی وساوس دور ہوتے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا بَالَ يَتَوَضَّأُ وَ يَنْتَضِحُ »[ابوداؤد، کتاب الطهارة: باب فی الانتضاح :١٦٦۔ حاکم :١٧١/١۔ اس روایت کو امام حاکم رحمہ اللہ اور امام ذہبی نے بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے]

''رسول اللہ ﷺ پیشاب کرتے تو وضو کرتے اور شرمگاہ پر پانی کے چھینٹے مارتے۔''

سنن نسائی میں یہ الفاظ ہیں:

« رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ تَوَضَّأَ وَ نَضَحَ فَرْجَهُ » [نسائی ، کتاب الطهارة: باب النضح :١٣٥]

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ نے وضو کیا اور اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑکا۔"

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک آدمی نے شکایت کی کہ میں جب نماز میں ہوتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ میرے ذکر پر تری ہے تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

« قَاتَلَ اللّٰهُ الشَّيْطَانَ إِنَّهُ يَمَسُّ ذَكَرَ الْإِنْسَانِ فِيْ صَلَاتِهِ لِيُرِيَكَ أَنَّهُ قَدْ أَحْدَثَ فَإِذَا تَوَضَّأْتَ فَانْضَحْ فَرْجَكَ بِالْمَاءِ فَإِنْ وَجَدْتَّ قُلْتَ هُوَ مِنَ الْمَاءِ فَفَعَلَ الرَّجُلُ ذٰلِكَ فَذَهَبَ »[عبدالرزاق :١٥١/١ـ ٥٨٣ـ ابن ابی شیبة : ١٩٤/١ـ باب من کان اذا توضأ نضح فرجه]

"اللہ شیطان کو غارت کرے وہ نماز میں انسان کی شرمگاہ کو چھوتا ہے تاکہ اسے یہ خیال دلائے کہ وہ بے وضو ہو گیا ہے، جب تم وضو کرو تو اپنی شرمگاہ پر پانی کے چھینٹے مار لیا کرو۔ پس اگر تو ایسا خیال پائے تو یہ سمجھ لینا کہ یہ پانی ہے۔" تو اس آدمی نے ایسے ہی کیا تو یہ وسوسہ ختم ہو گیا۔"

حضرت نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

« كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا تَوَضَّأَ نَضَحَ فَرْجَهُ »[ابن ابی شیبة : ١٩٤/١]

"حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب وضو کرتے تو اپنی شرمگاہ پر چھینٹے مارتے۔"

داؤد بن قیس فرماتے ہیں میں نے محمد بن کعب القرظی سے سوال کیا:" (میں کیا کروں جب) میں جب وضو کرتا ہوں تو تری کو پاتا ہوں؟" انھوں نے کہا:" جب تم وضو کر لو تو اپنی شرمگاہ پر پانی کے چھینٹے مار لیا کرو، جب تمھیں ایسا وسوسہ آئے تو سمجھنا کہ یہ وہی پانی ہے جس کے میں نے چھینٹے مارے ہیں۔ شیطان تجھے نہیں چھوڑے گا حتی کہ تیرے پاس آئے گا اور تجھے تنگ کرے گا۔" [عبد الرزاق : ١٥٢/١]

مذکورہ بالا حدیث اور آثار سے ثابت ہوا کہ وضو کے بعد اگر کوئی آدمی اپنے تہ بند اور شلوار وغیرہ کے اوپر وساوس شیطانی سے ازالہ کے لیے پانی کے چھینٹے مارے تو یہ شرعی طور پر درست ہے۔

کیا خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ بعض کا خیال ہے کہ خون نکل کر بہ جانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ صحیح موقف کیا ہے؟

جواب جسم سے خون کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اس کے کئی ایک دلائل ہیں:

① امام بخاری رحمہ اللہ نے "کتاب الوضو، باب من لم یر الوضوء الا من المخرجین" کے تحت غزوہ ذات الرقاع کے ایک واقعہ کا مختصر طور پر تذکرہ کیا ہے، جو دیگر کتب حدیث میں مفصل موجود ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے:

" حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ ذات الرقاع میں نکلے۔ ایک

آدمی نے مشرکین کی ایک عورت کو پالیا۔ جب رسول اللہ ﷺ واپس پلٹے تو اس کا خاوند جو اس وقت موجود نہیں تھا، واپس آیا اور اسے اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے حلف اٹھایا کہ وہ اس وقت تک نہیں رکے گا جب تک محمد (ﷺ) کے ساتھیوں کا خون نہ بہا دے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں نکلا۔ جب رسول اللہ ﷺ ایک مقام پر اترے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''آج رات کون چوکیداری کرے گا؟'' آپ کی اس بات پر ایک مہاجر اور ایک انصاری صحابی نے لبیک کہا۔ آپ نے فرمایا: ''اس گھاٹی کے دہانے پر تم دونوں پہرے کے لیے چلے جاؤ کیونکہ وہاں سے دشمن کے آنے کا راستہ ہو سکتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی گھاٹی کی نشیبی جانب چلے گئے۔

جب چوکیداری کرنے والے ساتھی گھاٹی کے دہانے کی طرف گئے تو انصاری ساتھی نے مہاجر سے کہا: ''آپ رات کے اوّل حصے میں پہرا دینا پسند کریں گے یا آخری حصہ میں؟'' انصاری کے لیے رات کا پہلا حصہ قرار پایا۔ مہاجر ساتھی سو گیا اور انصاری نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں وہ آدمی بھی آ پہنچا۔ اس نے گھاٹی کے دہانے پر ایک شخص دیکھا تو وہ جان گیا کہ یہ پہرے دار ہے۔ اس نے ایک تیر مارا۔ انصاری نے وہ تیر نکال کر پھینک دیا اور سیدھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے رہے۔ اس شخص نے دوسرا، پھر تیسرا تیر مارا۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے وہ تیر اپنے جسم سے نکال پھینکے اور برابر نماز پڑھتے رہے، رکوع و سجود مکمل کیے اور پھر بعد میں اپنے ساتھی کو بیدار کیا، جب اس آدمی نے ایک کے بجائے دو (پہرے دار) دیکھے تو بھاگ گیا۔ مہاجر نے جب اپنے انصاری ساتھی کو دیکھا کہ اس کے جسم سے خون ہی خون بہ رہا ہے تو فرمایا: ''سبحان اللہ! تم نے مجھے بیدار کیوں نہیں کیا؟'' انصاری صحابی نے کہا: ''میں جو سورت پڑھ رہا تھا میرا دل نہ چاہا کہ میں اسے ختم کرنے سے پہلے رکوع کروں۔ جب مجھ پر یکے بعد دیگرے تیر برسائے گئے تو مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں مجھے موت آنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے میرے ذمہ جو خدمت لگائی تھی وہ فوت نہ ہو جائے۔ اگر یہ ڈر نہ ہوتا تو میں مر جاتا مگر سورت ختم ہونے سے پہلے رکوع نہ کرتا۔''

[دارقطني: ١/٢٣١، ٨٥٨۔ كتاب الحيض، باب جواز الصلاة مع خروج الدم السائل من البدن، ابو داؤد: ١٩٨۔ كتاب الطهارة: باب الوضوء من الدم، حاكم: ١/١٥٦۔ موارد الظمآن: ٢٥٠۔ ابن خزيمة: ٣٦۔ تلخيص الحبير: ١/١١٥۔ اس روایت کو امام حاکم، امام ذہبی، امام ابن حبان اور امام ابن خزیمہ رحمہم اللہ نے صحیح کہا ہے۔]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم سے خون کے بہ پڑنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اگر خون کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا تو یہ صحابی اپنی نماز توڑ دیتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ یقیناً اس واقعہ کی خبر رسول اللہ ﷺ کو ہوئی ہو گی کیونکہ یہ تو ناممکن ہے کہ اتنا بڑا واقعہ رونما ہو اور آپ ﷺ اس سے بے خبر ہوں۔ اگر آپ کو خبر ہوئی تو اب خون کے ناقض وضو ہونے کی صورت میں ضروری تھا کہ آپ ﷺ اس کی وضاحت کرتے اور نماز کے فاسد ہونے کا ذکر کرتے لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خون ناقض وضو نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ترجمۃ الباب میں تعلیقاً لا کر بھی یہی مسئلہ سمجھایا ہے۔

اس حدیث کے ذکر سے امام بخاری رحمہ اللہ نے احناف کا رد کیا ہے، جو کہتے ہیں کہ خون ناقض وضو ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(وَ اَرَادَ الْمُصَنِّفُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ الرَّدَّ عَلَى الْحَنَفِيَّةِ فِیْ اَنَّ الدَّمَ السَّائِلَ يَنْقُضُ الْوُضُوْءَ)
[فتح الباری : ۲۸۱/۱]

''امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث لا کر احناف کا رد کیا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ بہنے والا خون ناقض وضو ہے۔''

فائدہ: اس انصاری صحابی کا نام عباد بن بشر رضی اللہ عنہ تھا اور مہاجر صحابی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ تھے۔ انصاری صحابی سورۂ کہف کی تلاوت کر رہے تھے۔ یہ بات امام بیہقی رحمہ اللہ نے دوسری سند سے اپنی کتاب ''دلائل النبوۃ'' میں ذکر کی ہے۔ [دار قطنی: ۲۳۱/۱، (۸۵۹)، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ھے۔ فتح الباری : ۲۸۱/۱]

② حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''إِنَّ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ صَلّٰی وَ جُرْحُهُ يَثْعَبُ دَمًا ''[فتح الباری : ۲۸۰/۱۔ سنن بیھقی اور ابن ابی شیبة میں صحیح سند کے ساتھ موصولاً مروی ھے۔ تلخیص الحبیر: ۱۱۴/۱۔ المحلّٰی : ۲۶۰/۱]

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس حالت میں نماز پڑھتے رہے کہ ان کے زخم سے خون بہ رہا تھا۔''

③ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے:

'' عَصَرَ ابْنُ عُمَرَ بَثْرَةً فَخَرَجَ مِنْهَا الدَّمُ وَ لَمْ يَتَوَضَّأْ '' [ابن ابی شیبة : ۱۲۸/۱، (۱۴۷۹)]

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے پھنسی کو نچوڑا، اس میں سے خون نکلا مگر انھوں نے وضو نہیں کیا۔''

ایک روایت میں یہ لفظ ہیں:

''ثُمَّ صَلّٰی وَ لَمْ يَتَوَضَّأْ '' [فتح الباری : ۲۸۰/۱۔ ابن ابی شیبة : ۱۲۸/۱، (۱۴۷۳)]

''پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نماز ادا کی لیکن وضو نہیں کیا۔''

④ امام طاؤس رحمہ اللہ سے مروی ہے:

'' اِنَّهُ كَانَ لَا يَرَی فِی الدَّمِ السَّائِلِ وُضُوْءًا يَغْسِلُ عَنْهُ الدَّمَ ثُمَّ حَسْبُهُ '' [فتح الباری : ۲۸۰/۱]

''وہ خون نکلنے سے وضو کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے، خون کو اپنے آپ سے دھو دیتے اور بس۔''

⑤ امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' مَا زَالَ الْمُسْلِمُوْنَ يُصَلُّوْنَ فِی جِرَاحَاتِهِمْ '' [فتح الباری : ۲۸۱/۱]

''مسلمان ہمیشہ اپنے زخموں کی حالت میں نماز پڑھتے رہے۔''

⑥ ابو جعفر الباقر سے امام اعمش رحمہ اللہ نے پوچھا کہ نکسیر سے بہنے والے خون کا کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا:

'' لَوْ سَالَ نَهْرٌ مِنْ دَمٍ مَا اَعَدْتُ مِنْهُ الْوُضُوْءَ '' [فتح الباری : ۲۸۲/۱]

''اگر (اس) خون کی نہر بھی جاری ہو جائے تو میں اس کی وجہ سے دوبارہ وضو نہیں کروں گا۔''

نیز خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، یہ موقف مدینہ کے فقہائے سبع ہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی ہے۔[فتح الباری: ۲۸۲/۱]

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، خون خواہ جسم کے کسی بھی حصہ سے خارج ہو۔حلق سے خارج ہو یا مسوڑھوں سے، سینگی اور پچھنے لگوانے سے ہو یا چوٹ لگنے سے۔ زخم سے ہو یا کسی پھنسی پھوڑے کے پھٹ جانے سے۔ انجکشن لگا کر نکالا جائے یا فائر لگنے سے نکلے۔ تھوڑا ہو یا زیادہ، کسی بھی صورت یہ ناقض وضو نہیں ہے۔ وضو کے ٹوٹنے کے متعلق جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں، وہ قابل حجت نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے[نصب الرایة(۴۲/۱) اور مجلة الدعوة ستمبر(۱۹۹۸ء)]

شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکانے سے وضو ٹوٹنا

سوال وضو کرنے کے بعد اگر شلوار ٹخنوں سے نیچے چلی جائے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب چادر یا شلوار کا ٹخنوں سے نیچے لٹکانا شدید گناہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

«مَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الْإِزَارِ فِي النَّارِ»[بخاری، کتاب اللباس :باب ما أسفل من الكعبين فهو في النار : ۵۷۸۷]

''کپڑے کا وہ حصہ جو ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہے وہ آگ میں ہے۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

«مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ مِنَ الْخُيَلَاءِ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[مسلم، کتاب اللباس والزينة، باب تحريم جر الثوب خيلاء :۲۰۸۵]

''جو شخص اپنا کپڑا غرور و تکبر سے لٹکائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر نہیں کرے گا۔''

اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر کے ڈھلکنے کا ذکر نبی ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا:

«إِنَّكَ لَسْتَ مِمَّنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ خُيَلَاءَ»[نسائی، کتاب الزينة ، باب إسبال الإزار : ۵۳۳۷]

''تو ان لوگوں میں سے نہیں جو اس فعل کو تکبر سے کرتے ہیں۔''

مذکورہ بالا روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مرد کے لیے کپڑا ٹخنے سے نیچے لٹکانا شدید ترین جرم ہے اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے خود مستثنیٰ قرار دیا ہے، لیکن کسی بھی فقیہ اور محدث نے کتب حدیث کے تراجم و ابواب میں اس کو نواقض وضو میں شمار نہیں کیا۔

نیز اس ضمن میں جو روایت سنن ابی داؤد میں آتی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو اس حالت میں نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کا کپڑا ٹخنوں سے نیچے تھا تو آپ نے اسے حکم دیا: [اِذْهَبْ فَتَوَضَّأْ] ''جا اور وضو کر۔'' یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس کی سند میں ابو جعفر غیر معروف راوی ہے۔ امام منذری رحمہ اللہ نے مختصر سنن ابی داؤد (۳۲۴/۱) اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار (۱۱۸/۳) میں لکھا ہے: '' وَ فِيْ اِسْنَادِهِ اَبُوْ جَعْفَرٍ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ لَا يُعْرَفُ اسْمُهُ '' ''اس حدیث کی سند میں اہل مدینہ میں سے ایک راوی ہے، جس کا نام معروف نہیں۔'' اور مشکوۃ المصابیح پر تعلیق لکھتے ہوئے علامہ البانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''وَ اِسْنَادُهُ ضَعِيْفٌ فِيْهِ اَبُوْ جَعْفَرٍ وَ عَنْهُ يَحْيَى بْنُ اَبِيْ كَثِيْرٍ وَ هُوَ الْاَنْصَارِيُّ الْمَدَنِيُّ الْمُؤَذِّنُ وَ هُوَ مَجْهُوْلٌ كَمَا قَالَ ابْنُ الْقَطَّانِ وَ فِي التَّقْرِيْبِ اَنَّهُ لَيِّنُ الْحَدِيْثِ فَقُلْتُ مَنْ صَحَّحَ اِسْنَادَ الْحَدِيْثِ فَقَدْ وَهَمَ '' [المشكوٰة : ۲۳۸/۱]

''یعنی اس حدیث کی سند ضعیف ہے، اس میں ابو جعفر ہے۔ اس سے بیان کرنے والا یحییٰ بن ابی کثیر ہے اور وہ انصاری مدنی مؤذن ہے جو مجہول ہے۔ جس طرح ابن القطان نے کہا ہے اور تقریب میں ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے کہ اس کی روایت کمزور ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس نے اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اسے وہم ہوا ہے۔''

لہٰذا جب یہ روایت کمزور ہے اور کسی محدث نے اسے نواقض وضو میں شمار نہیں کیا تو جس آدمی کا کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہو جائے اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ البتہ وہ اس جرم کا مرتکب ضرور ہوگا جس پر احادیث میں وعید آئی ہے۔

نیل پالش کے ساتھ وضو

سوال کیا ناخنوں پر نیل پالش موجود ہونے کی صورت میں وضو صحیح ہوگا یا نہیں؟

جواب قرآن حکیم میں وضو کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ ﴾ [المائدة:٦]

''اے ایمان والو! جب تم اقامت صلوٰۃ کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو دھولو۔''

اس آیت کریمہ میں چہرے اور ہاتھوں کو دھونے کا حکم ہے۔ وضو میں ان کا دھونا فرض ہے۔ جب ناخنوں پر نیل پالش لگی ہو تو ناخن دھوئے نہیں جاسکتے جس سے وضو نہیں ہوتا۔ وضو میں ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال اسی لیے ہے کہ پانی کی تری کا اثر ہر عضو پر اچھی طرح پہنچ جائے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ ایک سفر میں ہم سے پیچھے تھے۔ آپ نے ہمیں اس حالت میں پایا کہ نماز کا وقت تھا اور ہم وضو کر رہے تھے، ہم اپنے پاؤں کو ہلکا سا دھو رہے تھے تو آپ نے بلند آواز سے کہا:

« وَيْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ » [بخاری ، كتاب العلم ، باب من رفع صوته بالعلم : ٦٠]
''ایڑیوں کے لیے آگ کی ہلاکت ہے۔''
اسی طرح صحیح بخاری ''كتاب الوضوء، باب غسل الأعقاب'' میں امام ابن سیرین تابعی رحمہ اللہ کے بارے میں ہے کہ وہ جب وضو کرتے تو انگوٹھی والی جگہ کو دھوتے تھے۔ یہ صرف اسی لیے تھا کہ انگلیاں خشک نہ رہ جائیں۔ کیونکہ وضو میں جو اعضاء دھوئے جاتے ہیں ان کا خشک رہ جانا صحیح نہیں۔ نیل پالش لگنے سے ناخنوں پر تہ جم جاتی ہے اور ناخنوں تک پانی نہیں پہنچ پاتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ وضو کے وقت پالش اتار دی جائے تاکہ اعضائے وضو کو اچھی طرح دھویا جا سکے۔ بصورت دیگر اگر نیل پالش لگی رہی تو وضو نہیں ہوگا۔

اگر دورانِ نماز وضو ٹوٹ جائے

سوال دوران نماز اگر نمازی کا وضو ٹوٹ جائے تو کیا کرنا چاہیے؟ وہ نماز مکمل کر لے یا وضو کر کے نئے سرے سے نماز پڑھے؟

جواب نماز کے لیے وضو کا ہونا شرط ہے۔ جب وضو ٹوٹ جائے تو نمازی کو نماز چھوڑ کر چلے جانا چاہیے اور نئے سرے سے وضو کر کے نماز ادا کرنی چاہیے۔ بے وضو ہونے والا اگر امام ہے تو پیچھے سے کسی کو آگے کھڑا کر کے چلا جائے اور نئے سرے سے وضو کر کے نماز ادا کرے اور یہ بھی یاد رہے کہ نماز ابتدا سے شروع کرے نہ کہ جہاں سے چھوڑی تھی وہاں سے۔ سیدنا حضرت علی بن طلیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِذَا فَسَا اَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَلْيَنْصَرِفْ وَ لْيَتَوَضَّأْ وَ لْيُعِدِ الصَّلَاةَ »[ابو داؤد ، كتاب الطهارة ، باب فيمن يحدث فى الصلاة : ٢٠٥۔ ترمذی : ١١٦٤، ١١٦٦۔ عبد الرزاق ١٣٩/١۔ ابن حبان : ٢٠٣ ۔ دارقطنی : ١٥٣/١۔ یہ حدیث حسن ھے۔]
''جب تم میں سے کوئی نماز میں اپنی ہوا خارج کرے تو وہ واپس جا کر وضو کرے اور دوبارہ نماز پڑھے۔''
علمائے احناف کے ہاں مسئلہ یوں ہے کہ اگر نمازی کا وضو ٹوٹ جائے تو وہ چلا جائے اور وضو کر کے آئے اور اگر اس نے نماز کے منافی کوئی حرکت نہیں کی تو جہاں سے نماز چھوڑی تھی، وہیں سے ابتدا کرے، نئے سرے سے نماز ادا نہ کرے اور دلیل میں وہ یہ روایت پیش کرتے ہیں:

« عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَصَابَهُ قَيْءٌ اَوْ رُعَافٌ اَوْ قَلْسٌ اَوْ مَذِيٌّ فَلْيَنْصَرِفْ ثُمَّ لِيَبْنِ عَلٰى صَلَاتِهِ وَ هُوَ فِيْ ذٰلِكَ لَا يَتَكَلَّمْ »[ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها : باب ما جاء فى البناء على الصلاة : ١٢٢١]
''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے قے ، نکسیر، پیٹ کا کھانا یا مذی آجائے تو وہ چلا

جائے، وضو کرے اور اپنی نماز پر بنا کرے بشرطیکہ اس نے اس دوران کلام نہ کیا ہو۔“

یہ روایت ضعیف ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”بلوغ المرام“ میں فرمایا ہے: ”ضَعَّفَهُ أَحْمَدُ وَ غَيْرُهُ“ (اس حدیث کو امام احمد وغیرہ نے ضعیف کہا ہے) لہٰذا اس روایت سے استدلال درست نہیں ہے۔صحیح بات یہی ہے کہ نئے سرے سے وضو کرے اور ابتدا سے نماز پڑھے کیونکہ وضو نماز کے لیے شرط ہے۔

غسل جمعہ کے بعد وضو

سوال کیا غسل جمعہ کے بعد وضو کرنا ضروری ہے؟

جواب اگر وضو کر کے غسل کیا ہے تو پھر دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں بشرطیکہ شرمگاہ کو ہاتھ نہ لگے، کیونکہ شرمگاہ کو ہاتھ لگنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ مَنْ اَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ » [بخاری، کتاب الوضوء: باب لا تقبل صلاة بغير طهور:۱۳۵]

”بغیر وضو کے نماز قبول نہیں ہوگی، یہاں تک کہ نمازی وضو کرے۔“

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

«مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ» [ابوداؤد، کتاب الطھارۃ، باب الوضوء من المس الذكر : ۱۸۱]

”جس نے اپنی شرم گاہ کو چھوا وہ وضو کرے۔“

بغیر وضو تلاوت قرآن مجید کا حکم

سوال وضو کے بغیر قرآن مجید کی تلاوت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ حدیث میں آتا ہے: [لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ اِلَّا طَاهِرًا] ”قرآن کو طاہر کے سوا کوئی نہ چھوئے۔“ صحیح راہ نمائی فرمائیں۔

جواب بے وضو انسان قرآنِ مجید کی تلاوت کر سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی ایسی صریح اور صحیح حدیث موجود نہیں ہے جس میں بے وضو آدمی کو قرآن مجید کی تلاوت سے روکا گیا ہو اور قرآن مجید کی تلاوت کا حکم خود قرآن مجید میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴾ [المزمل:۲۰]

”قرآن مجید سے جو میسر ہو، پڑھو۔“

اس میں یہ نہیں کہ وضو کے بغیر نہ پڑھو۔ جو حدیث آپ نے پیش کی ہے یہ حدیث مجموعی طرق کے لحاظ سے صحیح ہے کہ طاہر کے سوا قرآن مجید کو کوئی نہ چھوئے۔اس کی تفسیر بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کی جماعت میں

آئے، جن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آہستگی سے مجلس سے نکل گئے۔ جب مجلس میں واپس آئے تو سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« سُبْحَانَ اللّٰهِ ! اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ »[بخاری ، کتاب الغسل، باب عرق الجنب و أن المسلم لاینجس : ۲۸۳]

''سبحان اللہ! مومن نجس نہیں ہوتا۔'' (یعنی طاہر ہی رہتا ہے)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ " اِلَّا طَاهِرًا "سے مراد " اِلَّا مُؤْمِنًا " ہے یعنی کافر قرآن مجید کو نہ چھوئے، مومن چھو سکتا ہے خواہ وہ با وضو ہو یا بے وضو۔ صحیح بخاری ہی میں ایک حدیث ہے، جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں۔ اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے، جب اٹھے تو اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے صاف کیا اور پھر:

« قَرَأَ الْعَشْرَ الْاٰيَاتِ الْخَوَاتِمَ مِنْ سُوْرَةِ آلِ عِمْرَانَ ثُمَّ قَامَ اِلٰى شَنٍّ مُعَلَّقَةٍ فَتَوَضَّأَ مِنْهَا فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ قَامَ يُصَلِّيْ »[بخاری ، کتاب الوضو ، باب قراءة القرآن بعد الحدث وغیرہ :۱۸۳]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات کی تلاوت کی، پھر لٹکائے ہوئے مشکیزہ کی طرف بڑھے، وضو کیا اور نماز شروع کر دی۔''

اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا ہے:" بَابُ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ بَعْدَ الْحَدَثِ وَ غَيْرِهٖ " (بے وضو ہونے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرنا۔) یہ بات تو مسلم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بے وضو بھی ہوتے تھے اور مسلم شریف کی صحیح حدیث میں ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ »[مسلم ، کتاب الحیض ، باب ذکر اللہ فی کل حال : ۳۷۳]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے۔''

اور اللہ کے ذکر میں قرآن مجید بھی داخل ہے۔ ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے لیے با وضو ہونا لازمی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ آدمی اپنی عادت ہی بنا لے کہ تلاوت ہمیشہ ہی بے وضو ہونے کی حالت میں کرنی ہے، بہتر یہی ہے کہ با وضو ہو کر تلاوت کرے۔

WWW. KITABOSUNNAT. COM

غسل اور جنابت کا بیان

WWW. KITABOSUNNAT. COM

صرف پانی سے طہارت

(سوال) اگر غسل جنابت کے وقت صابن وغیرہ نہ ہو تو کیا صرف پانی ہی سے پاک ہوا جا سکتا ہے یا صابن وغیرہ ضروری ہے؟

(جواب) پاک اور صاف پانی میں اللہ تعالیٰ نے یہ وصف رکھا ہے کہ وہ خود پاک ہے اور پاک کرتا بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ﴾ (الأنفال:١١)

''اس نے تمھارے لیے آسمان سے پانی اتارا ہے تاکہ اس کے ساتھ تمھیں پاک کردے۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ پانی میں پاک کرنے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔ لہٰذا جنابت کی پلیدی دور کرنے کے لیے پانی کافی ہے۔ صابن، شیمپو وغیرہ ستھرائی اور طہارت کا باعث ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے غسل جنابت کے لیے پانی کا تذکرہ ہی ملتا ہے اور اس پر کتاب و سنت اور اجماع امت دلالت کرتے ہیں کہ پانی بذات خود پاک ہے اور پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ننگے ہو کر غسل کرنے کا حکم

(سوال) کیا تنہائی میں ننگے ہو کر غسل کرنا جائز ہے؟ قرآن و حدیث سے وضاحت فرمائیں۔

(جواب) تنہائی اور خلوت میں ننگے ہو کر غسل کرنا جائز ہے البتہ کپڑا باندھ لینا افضل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری، ''کتاب الغسل'' میں یوں باب باندھا ہے: ''اس شخص کے متعلق بیان جس نے خلوت میں ننگے ہو کر غسل کیا اور جس نے کپڑا باندھ کر غسل کیا اور کپڑا باندھ کر غسل کرنا افضل ہے۔'' حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ لوگوں کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔'' [بخاری، تعلیقاً (٢٧٨)]

امام بخاری رحمہ اللہ نے خلوت و تنہائی میں ننگے نہانا جائز مگر ستر ڈھانپ کر نہانا افضل قرار دیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ننگے نہانے کے جواز پر اس باب میں دو احادیث بیان کی ہیں۔ ایک موسیٰ علیہ السلام کا خلوت و تنہائی میں غسل کرنا اور دوسرا ایوب علیہ السلام کا خلوت میں ننگے غسل کرنا اور یہ واقعات بیان کر کے نبی کریم ﷺ نے اس کی تردید نہیں کی۔ اس لیے ہماری شریعت میں بھی اسی طرح خلوت میں نہانا جائز ٹھہرا لیکن کپڑا باندھ کر غسل کرنا افضل ہے، اس کی دلیل یہ ہے: ''حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو گھر کے صحن میں غسل کرتے دیکھا تو فرمایا:

''بے شک اللہ شرم کرنے والا بردبار اور پردہ پوش ہے جب تم میں سے کوئی غسل کرے تو وہ ستر ڈھانپے اگرچہ دیوار کی اوٹ کے ساتھ ہو۔'' [تاريخ جرجان (٦٢٥/٣٣٢) بحواله إرواء الغليل (٣٦٨/٧)]

مذکورہ بالا احادیث صحیحہ وحسنہ سے معلوم ہوا کہ خلوت وتنہائی میں ننگے ہو کر غسل کرنا اگرچہ جائز ہے لیکن کپڑا باندھ کر غسل کرنا بہتر اور افضل ہے۔

عورت کا غسل جنابت میں بالوں کو تر کرنا

سوال کیا عورت غسل جنابت میں اپنے سر کے بال تر کرے یا تر نہ بھی کرے تو غسل ہو جائے گا؟ اس مسئلے کو احادیث کی روشنی میں اس طرح واضح کریں کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے اور ساتھ غسل کا نبوی طریقہ بھی بیان کر دیں جس میں کمی بیشی کی گنجائش نہ رہے۔

جواب ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، کہتی ہیں:

« قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّيْ امْرَأَةٌ أَشُدُّ ضَفْرَ رَأْسِيْ أَفَأَنْقُضُهُ لِغُسْلِ الْجَنَابَةِ؟ قَالَ: لَا إِنَّمَا يَكْفِيْكِ أَنْ تَحْثِيَ عَلٰى رَأْسِكِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ مِنْ مَاءٍ ثُمَّ تُفِيْضِيْ عَلٰى سَائِرِ جَسَدِكِ الْمَاءَ فَتَطْهُرِيْنَ أَوْ قَالَ فَإِذَا أَنْتِ قَدْ تَطَهَّرْتِ »[ترمذى، كتاب الطهارة: باب هل تنقض المرأة شعرها عند الغسل (١٠٥)، صحيح مسلم كتا ب الحيض باب حكم ضفائر المغتسلة (٥٨/٣٣٠)، ابوداؤد، كتاب الطهارة: باب فى المرأة تنقض شعرها عند الغسل (٢٥١)]

''میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں ایسی عورت ہوں جو مینڈھیاں مضبوطی سے باندھ لیتی ہوں کیا میں غسل جنابت کے لیے انھیں کھولوں؟'' آپ نے فرمایا: ''نہیں تجھے اتنا ہی کافی ہے کہ تو اپنے سر پر تین چلو پانی بہائے پھر اپنے سارے بدن پر پانی ڈالے اور پاکیزگی حاصل کر لے۔'' یا فرمایا: ''تب تو نے اچھی طرح طہارت حاصل کر لی۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کو اس بات کی رخصت ہے کہ وہ اپنی مینڈھیاں نہ کھولے، اصل مقصد پانی کو بالوں کی جڑوں تک پہنچانا ہے کیونکہ جنابت کے غسل میں فرض ہے کہ تمام بال بھیگ جائیں اگر کچھ بال خشک رہ جائیں تو غسل نہیں ہوگا۔ [ملاحظه هو حاشيه مشكوة از مولانا اسماعيل سلفى (٣٤٣/١)]

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے: « أَفَأَنْقُضُهُ لِلْحَيْضَةِ وَالْجَنَابَةِ » کیا میں اپنی مینڈھیاں حیض اور جنابت کے لیے کھولوں' اس سے معلوم ہوا کہ حیض کا غسل ہو یا جنابت کا' مقصود پانی کا بالوں کی جڑوں تک پہنچانا ہے، عورت کو مینڈھیاں نہ کھولنے کی رخصت دی گئی ہے اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث میں ہے:

« ثُمَّ تَصُبُّ عَلٰى رَأْسِهَا فَتَدْلُكُهُ دَلْكًا شَدِيْدًا حَتّٰى تَبْلُغَ شُؤُوْنَ رَأْسِهَا »[مرعاة (١٣٦/٢)، ابن

ماجه، کتاب الطهارة و سننها: باب فی الحائض کیف تغتسل (٦٤٢)، طیالسی (١/ ٦٠)، حمیدی (١٦٧) ابوداؤد (٣١٤ تا ٣١٦)، مسلم (٦١/ ٣٣٢)، ابن خزیمة (٢٤٨)، ابن حبان (١١٩٩)، المنتقی لابن الجارود (١١٧)]

’’پھر اپنے سر پر پانی بہائے اور اسے اچھی طرح ملے یہاں تک کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے۔‘‘

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ حیض یا جنابت کے غسل میں عورت کو شرعاً رخصت ہے کہ وہ اپنے سر کے بال نہ کھولے البتہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچائے بال تر کرنے ضروری ہیں، اب رہا غسل کا نبوی طریقہ تو اس کیلئے احادیث درج ذیل ہیں:

« عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ بَدَأَ فَغَسَلَ يَدَيْهِ ثُمَّ تَوَضَّأَ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ يُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِي الْمَاءِ فَيُخَلِّلُ بِهَا أُصُولَ الشَّعَرِ ثُمَّ يَصُبُّ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ غُرَفٍ بِيَدَيْهِ ثُمَّ يُفِيضُ الْمَاءَ عَلَى جِلْدِهِ كُلِّهِ »

[بخاری، کتاب الغسل: باب الوضوء قبل الغسل (٢٤٨)، مسلم، کتاب الحيض (٣٢١) ابوداؤد، کتاب الطهارة: باب الغسل من الجنابة (٢٤٢)، ترمذی، ابواب الطهارة: باب ماجاء فی الغسل من الجنابة (١٠٤)، ابوعوانة (١/ ٢٩٨-٢٩٩) ابن خزیمة (٢٤٢)، نسائی کتاب الطهارة: باب ذکر وضوء الجنب قبل الغسل (٢٤٧)]

’’نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ جنابت کا غسل کرتے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوتے پھر نماز کی طرح وضو کرتے پھر اپنی انگلیاں پانی میں داخل کرتے اور ان سے بالوں کی جڑوں کا خلال کرتے پھر اپنے ہاتھوں سے تین چلو پانی اپنے سر پر ڈالتے، پھر اپنی ساری جلد پر پانی بہا دیتے۔‘‘

سنن ابی داؤد وغیرہ میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں دونوں ہاتھ دھونے کے بعد « فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ » یعنی اپنی شرمگاہ دھونے کا بھی ذکر ہے۔ اسی طرح بالوں کے خلال کے بعد « حَتَّى إِذَا رَأَى أَنَّهُ قَدْ أَصَابَ الْبَشَرَةَ وَأَنْقَى الْبَشَرَةَ » کا بھی ذکر ہے یعنی اپنے بالوں کا خلال کرتے یہاں تک کہ جب آپ سمجھتے کہ کھال کو پانی پہنچ گیا یا صاف کرلیا ہے تو اپنے سر پر تین بار پانی ڈالتے۔

«عَنْ مَيْمُونَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ تَوَضَّأَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وُضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ غَيْرَ رِجْلَيْهِ وَ غَسَلَ فَرْجَهُ وَمَا أَصَابَهُ مِنَ الْأَذَى ثُمَّ أَفَاضَ عَلَيْهِ الْمَاءَ ثُمَّ نَحَّى رِجْلَيْهِ فَغَسَلَهُمَا هٰذِهِ غُسْلُهُ مِنَ الْجَنَابَةِ » [صحيح بخاری، کتاب الغسل: باب الوضو قبل الغسل (٢٤٩)]

نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ میمونہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ’’رسول اللہ ﷺ نے نماز کی طرح وضو کیا البتہ پاؤں نہیں دھوئے اور اپنی شرمگاہ کو دھویا اور جہاں کہیں نجاست لگی تھی پھر اپنے اوپر پانی بہایا پھر اپنی جگہ سے ہٹ کر اپنے دونوں پاؤں دھوئے یہ آپ ﷺ کا غسل جنابت تھا۔ اس روایت میں کچھ تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے شرمگاہ اور نجاست کے مقام کو وضو سے پہلے دھویا کرتے تھے اور اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ واؤ ترتیب کے لیے نہیں ہوتی۔

میمونہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

« صَبَبْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُسْلاً فَأَفْرَغَ بِيَمِيْنِهِ عَلٰى يَسَارِهِ فَغَسَلَهُمَا ثُمَّ غَسَلَ فَرْجَهُ ثُمَّ قَالَ بِيَدِهِ الْأَرْضَ فَغَسَلَهُمْ بِالتُّرَابِ ثُمَّ غَسَلَهَا ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ وَ أَفَاضَ عَلٰى رَأْسِهِ ثُمَّ تَنَحّٰى فَغَسَلَ فَقَدَمَيْهِ ثُمَّ أُتِيَ بِمِنْدِيْلٍ فَلَمْ يَنْفُضْ بِهَا »

[بخاری، کتاب الغسل: باب المضمضة والاستنشاق فی الجنابة (٢٥٩)، ابن ماجه (٥٧٣)، مسند حمیدی (٣١٦)، مسند احمد (٣٢٩/٦،٣٣٠، ٣٣٥، ٣٣٦)، مسند عبد بن حمید (١٥٥٠)، سنن الدارمی (٧١٨'٧٥٣)، ابوداؤد (٢٤٥)، ترمذی (١٠٣)، نسائی (١٣٢/١)، المسند الجامع (٥١٨/٢٠۔٥٢٠) (١٧٤٤١)]

''میں نے نبی ﷺ کے لیے غسل کا پانی رکھا تو پہلے آپ نے پانی کو اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ بائیں پر ڈالا، اسی طرح دونوں ہاتھوں کو دھویا پھر اپنی شرمگاہ کو دھویا پھر اپنے ہاتھ کو زمین پر رگڑ کر مٹی سے صاف کیا پھر اسے دھویا پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا پھر اپنے چہرے کو دھویا اور اپنے سر پر پانی بہایا پھر ایک طرف ہوکر دونوں پاؤں کو دھویا پھر آپ کے پاس رومال لایا گیا پس آپ نے اس کے ساتھ پانی خشک نہیں کیا۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے غسل سے پہلے نماز کی طرح وضو کا ذکر ہے اور میمونہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں سر پر مسح کا ذکر نہیں ہوا جبکہ وضو کا مفصل ذکر ہے، اسی طرح عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث ہے، بیان کرتی ہیں:

« ثُمَّ يَغْسِلُ يَدَيْهِ ثَلَاثًا وَ يَسْتَنْشِقُ وَ يُمَضْمِضُ وَ يَغْسِلُ وَجْهَهُ وَ ذِرَاعَيْهِ ثَلَاثًا ثَلَاثًا حَتّٰى إِذَا بَلَغَ رَأْسَهُ لَمْ يَمْسَحْ وَ أَفْرَغَ عَلَيْهِ الْمَاءَ فَهٰكَذَا كَانَ غُسْلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ »

[سنن النسائی ، کتاب الطهارة : باب ترك مسح الرأس فی الوضوء من الجنابة (٤٢٢)]

''شرمگاہ کو دھونے کے بعد پھر آپ اپنے دونوں ہاتھوں کو تین بار دھوتے اور ناک میں پانی چڑھاتے اور کلی کرتے اور اپنے چہرے اور بازوؤں کو تین تین بار دھوتے تھے، یہاں تک کہ جب سر تک پہنچے تو آپ نے مسح نہیں کیا اور اس پر پانی انڈیل دیا، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا غسل تھا۔''

علامہ سندھی "لَمْ يَمْسَحْ" کے تحت لکھتے ہیں:

" قَدْ سَبَقَ اَنَّهُ كَانَ يَتَوَضَّأُ وُضُوْءَ الِلصَّلٰوةِ فَاِمَّا اَنْ يُّقَالَ ذٰلِكَ عُمُوْمٌ يُخَصُّ بِهٰذَا اَوْ يُقَالُ لَهُ تَارَةً يَفْعَلُ هٰذَا وَ تَارَةً ذَاكَ لِبَيَانِ الْجَوَازِ "

''یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ آپ نماز کی طرح وضو کرتے یا تو کہا جائے گا اس حدیث میں عموم ہے جو اس حدیث کے ساتھ خاص ہوگیا ہے (یعنی وضو کے عموم میں مسح کرنا بھی آجاتا ہے) جبکہ اس حدیث سے تخصیص ہوگئی کہ مسح نہیں ہے کیونکہ یہ مسح کی نفی میں خاص ہے یا کہا جائے گا کبھی اس طرح کر لیتے اور کبھی اس طرح اور ایسا آپ نے بیان جواز کے لیے کیا ہے (یعنی دونوں طرح جائز ہے)۔'' [نیز دیکھیں تعلیقات سلفیه (ص ٤٧)]

پس معلوم ہوا کہ غسل جنابت کرنے سے پہلے جسم پر لگی ہوئی منی وغیرہ کو صاف کیا جائے، شرمگاہ کو دھویا جائے پھر ہاتھوں کو اچھی طرح صاف کیا جائے اور نماز کی طرح وضو کیا جائے پھر پانی لے کر بالوں کی جڑوں تک پہنچایا جائے، پھر اپنے سارے جسم پر پانی بہادیا جائے، اس طرح غسل جنابت ہو جائے گا۔

غسل خانے میں گفتگو کرنا

سوال کیا غسل خانے میں دوران غسل کوئی ضرورت کی بات کی جا سکتی ہے؟ بعض لوگ بات کرنے کو سخت ناپسند کرتے ہیں، وضاحت کریں۔

جواب بوقت ضرورت بیت الخلاء میں اگر کوئی بات کر لی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حدیث ہے :

''آپ ﷺ غسل فرما رہے تھے تو آپ کے ہاں ام ہانی رضی اللہ عنہا تشریف لائیں تو آپ نے پوچھا:'' کون ؟'' تو انھوں نے جواب میں کہا:''میں ام ہانی ہوں۔'' [بخاری، کتاب الغسل : باب التستر فی الغسل عند الناس : ۲۸۰]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ضرورت کے تحت بات کرے تو کوئی حرج نہیں۔ بلاوجہ گفتگو سے بچنا چاہیے۔

حالت مباشرت میں پہنے گئے کپڑوں کا حکم

سوال کیا ان کپڑوں میں نماز پڑھنا جائز ہے جو حالت مباشرت میں پہنے ہوئے ہوں؟

جواب قرآن وسنت کی رو سے جس مرد نے جس کپڑے کے ساتھ اپنی بیوی سے صحبت کی اگر اس کپڑے میں پلیدی نہیں لگی تو اس کپڑے میں نماز پڑھی جا سکتی ہے ۔ اگر کپڑے کو منی لگ جائے تو تری کی صورت میں دھو ڈالے، دھونے کے بعد اگر کپڑے میں نشان دکھائی دے تو کوئی حرج نہیں اور منی اگر خشک ہو جائے تو اس کو کھرچ دینا ہی کافی ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں :

''میں نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جو نبی ﷺ کی بیوی تھیں، سے دریافت کیا:'' نبی ﷺ جس کپڑے میں مباشرت کرتے تھے کیا اسی میں نماز پڑھ لیتے تھے؟'' تو انھوں نے کہا:'' ہاں! جب اس میں گندگی نہ دیکھتے۔'' [ابوداؤد، کتاب الطھارۃ : باب الصلاۃ فی الثوب الذی یصیب أھله فیه : ۳٦٦۔ نسائی ۱۵۵/۱۔ ابن ماجه : ۱۹۲/۱]

حیض ونفاس کا بیان

WWW. KITABOSUNNAT. COM

حائضہ عورت کا مسجد میں جانا

(سوال) کیا حائضہ عورت مسجد میں جا سکتی ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(جواب) حائضہ عورت کے مسجد میں جانے کے بارے میں کافی اختلافات ہیں لیکن زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ حائضہ اور جنبی مسجد میں سے بامر مجبوری گزر سکتے ہیں۔ انھیں وہاں ٹھہرنا نہیں چاہیے، قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا جا سکتا ہے:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ ﴾ [النساء:٤٣]

''نشے کی حالت میں نماز (اور نماز کی جگہ) کے قریب نہ جاؤ حتیٰ کہ (تمھارا نشہ اتر جائے اور) تمھیں معلوم ہو جائے جو تم کہہ رہے ہو، نیز جنبی بھی (مسجد کے قریب نہ جائے) مگر راہ عبور کرنے یا گزرنے کے لیے۔''

نوٹ: جس جگہ واقعتاً نماز ادا کی جا رہی ہے، وہ جگہ تو مسجد ہے لیکن اگر چھت پر نماز ادا نہیں کی جاتی تو وہ مسجد کے حکم میں نہیں ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ کون سی جگہ مسجد قرار دی گئی ہے؟ اگر چھت پر جماعت نہیں ہوتی تو کوئی حرج نہیں وہاں حائضہ اور جنبی جا سکتے ہیں۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

« اِنَّ الْمَسْجِدَ لَا يَحِلُّ لِجُنُبٍ وَ لَا حَائِضٍ » [ابن ماجه، كتاب الطهارة و سننها : باب في ما جآء في اجتناب الحائض المسجد (٦٤٥)]

''مسجد میں حائضہ اور جنبی کا داخل ہونا حلال نہیں۔''

حیض ونفاس کی حالت میں عبادات کا حکم

(سوال) میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ عورت کا حیض ونفاس کی حالت میں نماز پڑھنا، اس سے جماع کرنا، مسجد میں داخل ہونا، روزہ رکھنا اور قرآن چھونا وغیرہ سب حرام ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں، خاص طور پر مسجد میں داخل ہونا اور قرآن کو چھونے کے متعلق وضاحت کریں؟

(جواب) حیض ونفاس کی حالت میں نماز، روزہ، وطی اور مسجد میں داخل ہونا منع ہے، قرآن کو چھونا مختلف فیہ ہے۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ یا عید الفطر کو عید گاہ کی طرف نکلے۔ آپ ﷺ عورتوں

کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ''اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کیا کرو تم مجھے اکثر جہنم میں دکھلائی گئی ہو۔'' انھوں نے کہا: ''کس وجہ سے اے اللہ کے رسول!؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم کثرت سے لعن طعن کرتی ہو اور شوہروں کے ساتھ کفر کرتی ہو، میں نے کوئی ایسا کم عقل اور کم دین نہیں دیکھا جو تم سے بڑھ کر عقل مند آدمی کی عقل کو زائل کرنے والا ہو۔'' عورتوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہمارے دین اور عقل کا نقصان کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

« أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ؟ قُلْنَ بَلٰى »

'' کیا عورت کی گواہی آدمی کی گواہی سے آدھی نہیں ہے؟'' انھوں نے کہا: ''کیوں نہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ان کی عقل کا نقصان ہے۔'' اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا:

« أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَ لَمْ تَصُمْ ؟ قُلْنَ بَلٰى ، قَالَ فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ دِيْنِهَا » [بخاری، كتاب الحيض، باب ترك الحائض الصوم (٣٠٤)]

'' کیا جب عورت ایام ماہواری میں ہو گی تو (کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ) نہ نماز پڑھے گی اور نہ روزہ رکھے گی؟'' (طہارت کی حالت میں روزہ قضا کرے گی، نماز کی قضا نہیں ہو گی) انھوں نے کہا: ''کیوں نہیں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ان کے دین کا نقصان ہے۔''

حالت نفاس کا بھی یہی حکم ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كَانَتِ النُّفَسَاءُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ تَقْعُدُ بَعْدَ نِفَاسِهَا اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا اَوْ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً » [ابو داؤد، كتاب الطهارة : باب ما جاء في وقت النفساء (٣١١) ،ابن ماجه، كتاب الطهارة : باب النفساء كم تجلس (٦٤٨) ، ترمذى، كتاب الطهارة ، باب ما جاء فى كم تمكث النفساء (١٣٩)]

'' نفاس والی عورتیں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اپنے نفاس کے بعد چالیس دن یا چالیس راتیں بیٹھی رہتی تھیں۔''

ایک دوسری روایت میں ہے کہ مسہ ازدیہ کہتی ہیں کہ میں نے حج کیا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی، میں نے کہا: ''اے ام المومنین! بے شک سمرہ بن جندب عورتوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ حیض والی نمازیں قضا کریں۔'' وہ کہنے لگیں: ''قضا نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے ایک عورت چالیس راتیں نفاس میں بیٹھتی لیکن نبی ﷺ اسے نفاس کی حالت والی نماز قضا کرنے کا حکم نہیں دیتے تھے۔'' [ابو داؤد= كتاب الطهارة ، باب ما جاء فى وقت النفساء(٣١٢)، حاكم (١٧٥/١) بيهقى(٣٤١/١) امام حاكم رحمہ اللہ فرماتے هيں كه يه حديث صحيح الاسناد هے اور امام ذهبى نے ان كى موافقت كى هے۔]

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ قَدْ اَجْمَعَ اَهْلُ الْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ وَالتَّابِعِيْنَ وَ مِنْ بَعْدِهِمْ عَلٰى اَنَّ النُّفَسَاءَ تَدَعُ الصَّلَاةَ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا اِلَّا اَنْ تَرَى الطُّهْرَ قَبْلَ ذٰلِكَ فَاِنَّهَا تَغْتَسِلُ وَ تُصَلِّيْ" [ترمذى مع تحقيق

احمد شاکر(۲۵۸/۱) شیخ احمد شاکرؒ فرماتے ھیں کہ یھی مذھب صحیح ھے اور حدیث کے موافق ھے]

”اہل علم اصحاب النبی، تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ نفاس والی عورتیں چالیس دن نماز چھوڑیں گی۔ ہاں اگر وہ چالیس دن سے پہلے طہر کی حالت دیکھ لیں تو غسل کریں اور نماز پڑھیں۔“

حالت حیض میں جماع اور ہم بستری بھی ممنوع ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴾ [البقرة:۲۲۲]

”اور وہ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیں وہ گندگی ہے۔ حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔ جب وہ ستھرائی کر لیں تو ان کے پاس جاؤں جہاں سے تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں میں جب کوئی عورت حیض والی ہو جاتی تو وہ اسے گھر سے نکال دیتے اور گھر میں نہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے اور نہ جماع کرتے۔

رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی: ﴿وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ﴾ آخر آیت تک۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:”ان کو گھروں میں رکھو اور جماع کے علاوہ باقی تمام کام کرو۔“ یہودیوں نے کہا کہ یہ شخص ہر معاملے میں ہماری مخالفت چاہتا ہے۔ اسید بن حضیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے:”اے اللہ کے رسول! بے شک یہودی اس طرح کہتے ہیں، کیا ہم حالت حیض میں عورتوں سے جماع نہ کریں؟“رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا حتی کہ ہم نے سمجھ لیا کہ آپ ان دونوں سے ناراض ہو گئے ہیں۔ وہ دونوں وہاں سے نکلے، پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان کو دودھ کا تحفہ بھیجا گیا تو ہم نے سمجھا کہ آپ ان سے ناراض نہیں ہیں۔“ [ابو داود، كتاب الطهارة ، باب فی مؤاكلة الحائض و مجامعتها(۲۵۸) ، مسلم، كتاب الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها (۳۰۲)، ترمذی= كتاب تفسير القرآن، باب و من سورة البقرة(۲۹۷۷)، نسائی، كتاب الطهارة ، باب تاويل قول الله عزوجل ﴿ وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ﴾ (۲۸۹)، ابن ماجه، كتاب الطهارة و سننها: باب ما جاء فی مؤاكلة الحائض و سؤرها(٦٤٤)]

اس آیت قرآنی اور صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت سے حالت حیض میں صحبت و جماع حرام ہے۔ البتہ اس کے ہاتھ کا کھانا پینا، کنگھی وغیرہ جیسے دیگر امور جائز و درست ہیں۔

اگر حالت حیض میں صحبت کر بیٹھے تو اسے ایک دینار یا نصف دینار صدقہ دینا پڑے گا جیسا کہ صحیح حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہے۔[ابو داود، كتاب الطهارة ، باب فی إتيان الحائض(٢٦٤)، ترمذی، ابواب الطهارة: باب ما جاء فی الكفارة فی ذالك (١٣٦) ، ابن ماجه= كتاب الطهارة و سننها ، باب فی كفارة من أتى حائضًا (٦٣٠)]

حالت حیض میں عورت مسجد کے اندر عبادت کے لیے نہیں جاسکتی البتہ مسجد سے گزر سکتی ہے اور کوئی چیز مسجد سے اٹھانا ہو تو اٹھا سکتی ہے۔ اس کی رخصت ہے، جیسا کہ سورۂ نساء آیت (۴۳) میں جنبی کو جنابت کی حالت میں مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی البتہ مسجد کے اندر سے گزرنے کی رخصت دی گئی ہے۔ حیض ونفاس کی ناپاکی جنابت سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا حیض ونفاس کی صورت میں بھی مسجد کے اندر ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« قَالَ لِیُ رَسُوُلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَاوِلِيُنِي الْخُمْرَةَ مِنَ الْمَسْجِدِ قُلْتُ اِنِّیُ حَائِضٌ فَقَالَ رَسُوُلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِنَّ حَيْضَتَكِ لَيْسَتُ فِیُ يَدِكِ » [ابو داؤد، كتاب الطهارة : باب في الحائض تناول من المسجد(٢٦١)، مسلم، كتاب الحيض : باب جواز غسل الحائض رأس زوجها (٢٩٨) ، ترمذی، ابواب الطهارة: باب ما جآء في الحائض تناول الشیء من المسجد (١٣٤)، نسائي، كتاب الطهارة: باب استخدام الحائض (٣٨٣)]

''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے مسجد سے چٹائی پکڑا دو۔'' میں نے کہا: ''میں حائضہ ہوں۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے:

''وَ هُوَ قَوُلُ عَامَّةِ اَهُلِ الْعِلُمِ لَا نَعْلَمُ بَيْنَهُمُ اِخْتِلَافًا فِیُ ذٰلِكَ بِاَنُ لَّا بَاُسَ اَنُ تَتَنَاوَلَ الْحَائِضُ شَيْئًا مِّنَ الْمَسْجِدِ'' [ترمذی بتحقيق احمد شاكر(٢٤٢/١)]

''یہ عام اہل علم کا قول ہے۔ اس مسئلہ میں ہم ان کے درمیان اختلاف نہیں جانتے کہ حائضہ کا مسجد سے کسی چیز کے پکڑانے میں کوئی حرج نہیں۔''

رہا حائضہ عورت کا قرآن پاک کو چھونا تو اس کی ممانعت میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ اہل علم اس کے بارے میں مختلف ہیں۔ البتہ افضل اور بہتر یہی ہے کہ مسلمان عورت طہارت کی حالت میں قرآن حکیم کو چھوئے یا کوئی صاف ستھرا کپڑا قرآن مجید کے اوراق کو پلٹنے کے لیے استعمال کرے، ہاتھ لگانے سے اجتناب کرے۔ امام نووی رحمہ اللہ اس صورت کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ اختلاف کے بغیر جائز ہے۔'' [المجموع شرح المهذب (٣٧٢/٣)]

حائضہ عورت کا قرآن کو ہاتھ لگانا

سوال کیا حائضہ عورت قرآن مجید کو پکڑ سکتی ہے یا نہیں؟ اگر پکڑ سکتی ہے تو پھر ﴿لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اس مسئلے کے متعلق اہل علم کی مختلف آراء ہیں۔ عدل وانصاف کے ترازو سے جس بات کو ترجیح ملتی ہے وہ یہ ہے کہ عورت کو ایسی حالت میں بلا وجہ قرآن مجید نہیں چھونا چاہیے لیکن پڑھنے اور پڑھانے کے سلسلہ میں اگر چھو بھی لیتی ہے تو اس

میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید اور نبی کریم ﷺ کے فرامین میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہو۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عورتیں حائضہ ہوتی تھیں، وہ قرآن مجید پڑھتی اور پڑھاتی بھی تھیں لیکن کہیں بھی ان کو یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ وہ ایسی حالت میں قرآن مجید کو چھو نہیں سکتیں۔ اس وقت اس مسئلہ کے بیان کی ضرورت بھی تھی لیکن ضرورت کے باوجود شارع علیہ السلام کی اس پر خاموشی اس کے جواز کی دلیل ہے۔ قرآن مجید کی جس آیت سے ممانعت کا استدلال کرتے ہیں وہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ یہ آیت قرآن مجید کو چھونے کے بارے میں نہیں ہے۔

اس آیت کے سیاق وسباق کا غور سے مطالعہ کریں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ قرآن مجید کے متعلق بلکہ لوح محفوظ کے متعلق کہی گئی ہے ﴿لَا يَمَسُّهُ﴾ کی ضمیر کا مرجع ﴿فِيْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ﴾ ہے اور ﴿لَا يَمَسُّهُ﴾ سے مراد فرشتے ہیں۔ تو اس آیت کا معنی ہے کہ لوحِ محفوظ فرشتوں کے سوا کوئی نہیں چھوتا۔ ﴿اَلْمُطَهَّرُوْنَ﴾ سے مراد فرشتے ہیں۔ اس بات پر حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم کے علاوہ تابعین کی بہت بڑی جماعت متفق ہے۔ احناف کی تفسیر روح المعانی میں ہے:

" اِنَّ الْمُرَادَ بِالْمُطَهَّرِيْنَ الْمَلَائِكَةُ مَرْوِيٌّ مِنْ عِدَةِ طُرُقٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ كَذَا اَخْرَجَهُ جَمَاعَةٌ عَنْ اَنَسٍ وَ قَتَادَةَ وَ ابْنِ جُبَيْرٍ وَ مُجَاهِدٍ وَ اَبِي الْعَالِيَةِ وَ غَيْرِهِمْ "

'' مطہرین سے مراد فرشتے ہیں۔ یہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی اسناد کے ساتھ مروی ہے اور انس، قتادہ، ابن جبیر، مجاہد اور ابی العالیہ وغیرہم سے بھی ایک جماعت نے اس کو روایت کیا ہے۔''

تفسیر رازی میں ہے:

" اَلضَّمِيْرُ عَائِدٌ اِلَى الْكِتَابِ عَلَى الصَّحِيْحِ "

''(لَا يَمَسُّهُ کی) ضمیر کتاب (لوح محفوظ) کی طرف لوٹتی ہے۔''

اشرف الحواشی میں ہے کہ بعض نے اس ضمیر کو قرآن مجید کے لیے مانا ہے اور یہ استدلال کیا ہے کہ بے وضو ہونے کی حالت میں اسے چھونا ناجائز ہے مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے اور قرآن مجید کو بے وضو چھونا جائز ہے گو بہتر یہ ہے کہ وضو کر لیا جائے۔ قرآن مجید کو چھونے کے متعلق جو صحیح حدیث کے الفاظ ہیں:

« لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ اِلَّا طَاهِرٌ »

'' طاہر کے سوا قرآن کو کوئی نہ چھوئے۔''

اس طاہر کی تفسیر صحیح بخاری شریف کی حدیث میں موجود ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ جنبی تھے، نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر دور سے گزر گئے۔ غسل کے بعد واپس آ کر رسول اللہ ﷺ سے ملے تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں کہا: « اَلْمُؤْمِنُ لَا يَنْجُسُ » '' مومن نجس ہوتا ہی نہیں ہے۔''

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ « اِلَّا طَاهِرٌ » سے مراد « اِلَّا مُؤْمِنٌ » ہے یعنی قرآن مجید کو مومن کے سوا دوسرا نہ چھوئے

اور یہ بات مسلم ہے کہ حیض کی حالت میں عورت مومنہ ہی رہتی ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''مجھے مسجد سے مصلیٰ پکڑاؤ۔ انھوں نے کہا: ''میں حائضہ ہوں۔'' تو نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا:

« اِنَّ حَيْضَتَكِ لَيْسَتْ فِيْ يَدِكِ » [مسلم ، كتاب الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها و ترجيله (٢٩٨)]

''بے شک تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔''

نبی ﷺ کے یہ الفاظ اس مسئلہ میں نص کی حیثیت رکھتے ہیں کہ حیض کی نجاست ہاتھ کے اندر نہیں ہے بلکہ حیض کی حالت میں ہاتھ پاک ہی رہتا ہے۔

اس ساری وضاحت کے باوجود اگر مسلمان عورت زیادہ تعظیم اور احترام کے پیش نظر قرآن مجید کو بغیر چھونے کے پڑھ سکتی ہے یا کوئی صاف ستھرا کپڑا قرآن مجید کو پکڑنے اور اوراق الٹانے کے لیے استعمال کرلے تو بہت بہتر اور اچھا ہے۔ اس سے وہ علماء کے اختلاف سے بھی نکل جائے گی۔ ایسی صورت میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جَائِزٌ بِلَا خِلَافٍ'' (یہ بغیر کسی اختلاف کے جائز ہے۔) [المجموع شرح المهذب(٢/ ٣٧٢)]

حائضہ عورت کا قرآن پاک کی تلاوت کرنا

سوال بعض اہل علم حائضہ کو تلاوت قرآن کی اجازت دیتے ہیں اور بعض اس سے منع کرتے ہیں، آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں کہ کیا حائضہ عورت قرآن پڑھ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل علم کی اس مسئلے میں مختلف آراء ہیں۔ امام بخاری، امام ابن جریر طبری، امام ابن منذر، امام مالک، امام شافعی اور امام ابراہیم نخعی، ان سب کے نزدیک حائضہ عورت کے قرآن کی تلاوت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ راجح بات بھی یہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ قرآن وسنت میں کوئی صریح اور صحیح دلیل موجود نہیں جس میں حیض والی عورت کو قرآن مجید کی تلاوت سے روکا گیا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ عورتیں اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں بھی حائضہ ہوتی تھیں۔ اگر قرآن مجید کی تلاوت ان کے لیے حرام ہوتی تو اللہ کے رسول انھیں قرآن مجید کی تلاوت سے روک دیتے جس طرح کہ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے روک دیا تھا اور جب حیض کی کثرت کے باوجود صحابی رسول نے یا امہات المومنین میں سے کسی نے امام الانبیاء سے اس کی ممانعت نقل نہیں کی تو معلوم ہوا کہ جائز ہے۔ اب اس چیز کا علم ہونے کے باوجود کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کی ممانعت بالکل منقول نہیں اس کو حرام کہنا درست نہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ اس بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے:

« لَا يَقْرَأُ الْجُنُبُ وَ الْحَائِضُ شَيْئًا مِّنَ الْقُرْاٰنِ »[ابن ماجه، كتاب الطهارة و سننها: باب ما جآء فى قراءة القرآن على غير طهارة(٥٩٦)]

''حائضہ اور جنبی قرآن سے کچھ بھی نہ پڑھیں۔''

یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش ہے جب یہ شخص حجازیوں سے کوئی روایت بیان کرے تو وہ قابل اعتماد نہیں ہوتی۔ یہ روایت حجازیوں ہی سے ہے۔ دوسری حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَقْرَأُ الْحَائِضُ وَ لَا النُّفَسَاءُ مِنَ الْقُرْاٰنِ شَيْئًا » [دار قطنی، کتاب الجنائز: باب تخفیف القراءة لحاجة(١٨٥٤)]

''حائض اور نفاس والی عورتیں قرآن سے کچھ نہ پڑھیں۔''

یہ حدیث بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ اس کی سند میں محمد بن الفضل ہے، جسے محدثین نے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ احادیث گھڑنے کا بھی اس پر الزام ہے۔

یہی حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی مروی ہے۔ اس کی سند میں یحییٰ بن ابی انیسہ ہے اور یہ کذاب ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ ان دونوں احادیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

" لَا يَصْلُحَانِ لِلْاِحْتِجَاجِ بِهِمَا عَلٰی ذٰلِكَ فَلَا يُصَارُ اِلَی الْقَوْلِ بِالتَّحْرِيمِ اِلَّا بِدَلِيلٍ"
[نيل الأوطار(١/٤٤٦)]

''ان دونوں حدیثوں کو حائضہ عورت کے لیے قرآن مجید کی تلاوت کی ممانعت کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا اور بغیر دلیل کے اسے حرام نہیں کیا جا سکتا۔''

باقی مفتی اعظم شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایسی عورت قرآن کو چھو نہیں سکتی، زبانی پڑھ سکتی ہے لیکن مجھے اس کی کوئی دلیل نہیں ملی۔

« لَا يَمَسَّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ » [إرواء الغليل(١٢٢)]

'' قرآن کو طاہر کے سوا کوئی نہ چھوئے'' اس سے اس پر استدلال درست نہیں ہے کیونکہ "اِلَّا طَاهِرٌ" کا معنی بخاری شریف کی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث متعین کرتی ہے کہ اس کا معنی ہے مومن کے سوا قرآن کو کوئی نہ چھوئے۔ (واللہ اعلم)

دورانِ حج وعمرہ حائضہ کا حکم

سوال اگر کوئی دوران حج وعمرہ حائضہ ہو جائے تو طواف اور دیگر کام کر سکتی ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب حائضہ عورت حج اور عمرہ کا احرام باندھ لے اور حج کے سارے کام کرتی جائے، صرف بیت اللہ کا طواف نہ کرے اور نہ نمازیں ہی ادا کرے پھر جب حیض سے پاک ہو جائے تو خانہ کعبہ کا طواف کرے کیونکہ طواف کے لیے طہارت شرط ہے۔

اگر طہارت نہ ہو تو طواف نہیں ہوتا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

« خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَا نَذْكُرُ إِلَّا الْحَجَّ فَلَمَّا جِئْنَا سَرِفَ طَمِثْتُ فَدَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ أَنَا أَبْكِيْ ...... قَالَ لَعَلَّكِ نُفِسْتِ ؟ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَإِنَّ ذٰلِكَ شَيْءٌ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلٰى بَنَاتِ آدَمَ فَافْعَلِيْ مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ غَيْرَ أَنْ لَا تَطُوْفِيْ بِالْبَيْتِ حَتّٰى تَطْهُرِيْ »[بخاری، کتاب الحیض : باب الأمر بالنفساء إذا نفسن (۲۹۴، ۳۰۵، ۳۱٦) ، مسلم (۱۲۱۱) ، ابو داؤد (۱۷۸۲) ، ابن ماجه (۲۹٦۳) ، نسائی (۱٥٦/٥)]

’’ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلے، ہمارا مقصد صرف حج تھا پھر جب ہم سرف مقام پر پہنچے تو میں حائضہ ہو گئی۔ نبی کریم ﷺ میرے پاس آئے تو میں رو رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’شاید تجھے حیض آنا شروع ہو گیا ہے۔‘‘ میں نے کہا: ’’ہاں!‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے لیے مقرر کر دیا ہے، جو کچھ حاجی کرتے ہیں تو بھی کرتی جا سوائے اس کے کہ پاک ہونے تک بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گی۔‘‘

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت حیض میں عورت بیت اللہ کے طواف کے علاوہ باقی حاجیوں والے تمام کام کر سکتی ہے اور جب حیض سے پاک ہو جائے تو بیت اللہ کا طواف کر لے۔

❁❁❁❁❁❁

WWW.KITABOSUNNAT.COM

طہارت کے متفرق مسائل

WWW. KITABOSUNNAT.COM

سلسل البول کا حکم

(سوال) اگر کسی شخص کو مسلسل پیشاب کے قطرے آتے ہوں تو نماز کس طرح ادا کرے؟ اور کیا ایسا شخص امامت کروا سکتا ہے؟

(جواب) اگر کسی شخص کو مسلسل پیشاب کے قطرے آتے رہتے ہوں تو وہ ہر نماز کے لیے وضو کر کے نماز پڑھ لے، ہر نماز کے لیے وضو کرنا اس کی طہارت ہے۔ لہٰذا وہ امامت بھی کروا سکتا ہے۔ اس کی نظیر شریعت اسلامیہ میں استحاضہ والی عورت کی ہے۔ جیسا کہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش کے بارے میں ہے کہ ان کی استحاضہ کی حالت تھی تو نبی ﷺ نے انھیں فرمایا:

''جب حیض کا خون ہو جو سیاہ ہوتا ہے اور پہچانا جاتا ہے تو نماز سے رک جا اور جب دوسرا خون ہو تو وضو کر اور نماز ادا کر، وہ تو ایک رگ ہے۔'' [ابوداؤد كتاب الطهارة: باب إذا أقبلت الحيضة تدع الصلاة(٢٨٦)، نسائی، كتاب الحيض والاستحاضة(٣٥٩)]

تو جس طرح مستحاضہ عورت کو خون آتا رہتا ہے تو اس حالت میں اسے حکم ہے کہ وہ وضو کر کے نماز پڑھ لے کیونکہ وضو اس کی طہارت ہے، اسی طرح سلسل البول کا مریض بھی جب نماز ادا کرنے لگے تو وضو کرے، یہ اس کی طہارت ہے اور نماز ادا کرے، اسے ترک نہ کرے۔ (واللہ اعلم)

اہل کتاب اور دیگر کفار کے برتنوں اور ذبیحے کا حکم

(سوال) کیا اہل کتاب اور دیگر کفار کا ذبیحہ کھانا جائز ہے؟ اور کیا ان کے برتن استعمال کیے جا سکتے ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

(جواب) اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے علاوہ کفار کے ذبیحے کھانا جائز نہیں ہے، چاہے مجوس ہوں یا بت پرست، کمیونسٹ ہوں یا کافروں کی دوسری کوئی قسم، ان کے ذبیحوں سے ملے ہوئے شوربے بھی جائز نہیں ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے کھانے کے علاوہ ہمارے لیے کسی بھی دوسرے کافر کا کھانا حلال نہیں کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''آج تمھارے لیے ساری چیزیں حلال کر دی گئی ہیں، اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے۔'' [المائدة:٥]

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما و دیگر مفسرین کے بقول ''طعام'' سے مراد ان کے ذبیحے ہیں، البتہ میوہ جات اور اس قسم کی دوسری اشیاء کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ ''طعام محرم'' میں داخل نہیں ہیں۔ مسلمان کا کھانا مسلم وغیر مسلم سبھی کے

لیے حلال ہے اگر وہ سچا مسلمان ہے۔صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور اس کے ساتھ انبیاء، اولیاء، اصحاب قبور اور کفار کے معبودوں کو نہیں پکارتا ہے۔

رہا برتنوں کا مسئلہ تو اس سلسلے میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ کافروں کے برتن سے جن پر ان کے کھانے اور شراب رکھی جاتی ہے اپنا الگ برتن رکھیں، اگر الگ برتن رکھنا مشکل ہو تو مسلمان کے لیے کھانا بنانے والوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کافروں کے استعمال میں آنے والے برتنوں کو اچھی طرح دھولیں پھر ان میں مسلمانوں کے لیے کھانا رکھیں۔

صحیحین میں حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے برتنوں کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا:

''ان میں مت کھاؤ الا یہ کہ تمھیں دوسرا برتن نہ ملے، اگر ایسا ہو تو پہلے انھیں دھولو پھر ان میں کھانا کھاؤ۔'' [بخاری، کتاب الذبائح والصید : باب آنیة المجوس والمیتة (٥٤٩٦)]

WWW. KITABOSUNNAT.COM

❀❀❀

نماز کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

اذان کا بیان

اذانِ فجر میں " اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" کہنا

(سوال) کیا اذانِ فجر میں ''الصلوۃ خیرمن النوم'' کہنا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے یا یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضافہ ہے؟ تفصیل سے رہنمائی فرمائیں۔

(جواب) نبی مکرم ﷺ نے حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو اذان کا جو طریقہ بذات خود سکھایا، اس میں صبح کی اذان کے لیے ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ'' کے بعد دو مرتبہ ''اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کہنا ثابت ہے۔ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ! عَلِّمْنِیْ سُنَّۃَ الْاَذَانِ قَالَ فَمَسَحَ مُقَدَّمَ رَأْسِیْ قَالَ تَقُوْلُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ...... فَاِنْ کَانَ صَلَاۃَ الصُّبْحِ قُلْتَ اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ، اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ »
[ابو داؤد، کتاب الصلاۃ: باب کیف الأذان(٥٠٠،٥٠١)، موارد الظمآن(٢٨٩)، طبرانی کبیر (١٧٤/٧) حلیۃ الأولیاء (٣١٠/٨)، عبد الرزاق(٤٥٨/١)، شرح السنۃ (٢٦٣/٢)، ابن خزیمۃ(٢٠١/١)، دار قطنی (٢٣٣/١)]

''میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے اذان کا طریقہ سکھا دیں۔'' آپ ﷺ نے میرے سر کے اگلے حصہ کو چھوا اور فرمایا: ''تو کہہ اللہ اکبر، اللہ اکبر...... اگر صبح کی نماز (کے لیے اذان) ہو تو تو کہہ " اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ، اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔''

« عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ مِنَ السُّنَّۃِ اِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ فِیْ اَذَانِ الْفَجْرِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ قَالَ الصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ » [ابن خزیمۃ(٣٨٦)، دار قطنی(٢٤٢/١)، التحقیق لابن الجوزی (٣١١/١) ، بیہقی(٤٢٣/١)، امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ نیز دار قطنی میں ''اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ، اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ مَرَّتَیْنِ'' کے الفاظ ہیں۔]

'' حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''یہ سنت ہے کہ جب مؤذن فجر کی اذان میں ''حی علی الفلاح'' کہے تو دو مرتبہ ''اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ " کہے۔''

اور یہ بات اصول حدیث میں واضح ہے کہ جب صحابی کسی امر کے بارے میں کہے کہ یہ سنت ہے تو اس سے مراد نبی کریم ﷺ

کی سنت ہی ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ اَصُحَابُ النَّبِيِّ لَا يَقُولُونَ السُّنَّةَ اِلَّا لِسُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَ سَلَّمَ " [كتاب الأم (١/ ٢٤٠)]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لفظ ''سنت'' صرف سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر بولتے تھے۔''

پس ثابت ہوا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا ''اَلصَّلَاةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ " کو فجر کی اذان میں "حی علی الفلاح" کے بعد دوبار سنت کہنے کا مطلب یہی ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔

« عَنْ بِلَالٍ اَنَّهُ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَ سَلَّمَ يُوذِنُهُ بِصَلَاةِ الْفَجرِ فَقِيلَ هُوَ نَائِمٌ فَقَالَ اَلصَّلَاةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ الصَّلَاةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ فَاُقِرَّتْ فِي تَاذِينِ الْفَجرِ فَثَبَتَ الْاَمْرُ عَلٰى ذٰلِكَ »

[ابن ماجه، كتاب الأذان: باب السنة في الأذان (٧١٦) اس کی سند میں انقطاع هے لیکن چونکه اوپر صحیح سند سے ثابت هے اس لیے بطور تائید اور شاهد کے ذکر کر دیا هے۔]

''بلال رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فجر کی نماز کی اطلاع دینے کے لیے تشریف لائے تو بتایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے ہیں تو بلال رضی اللہ عنہ نے دو بار کہا: ''اَلصَّلَاةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ " (نماز نیند سے بہتر ہے) تو اسے فجر کی اذان میں مقرر کر دیا گیا پھر معاملہ اس پر پختہ ہو گیا۔''

مذکورہ بالا احادیث صحیحہ صریحہ سے معلوم ہوا کہ فجر کی اذان میں ''حی علی الفلاح'' کے بعد دو مرتبہ ''اَلصَّلَاةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ " کہنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم فرمائی۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایجاد نہیں ہے، جیسا کہ روافض کا کہنا ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ بات غلط منسوب ہے اور جس روایت کا حوالہ دے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ ملاحظہ ہو:

« عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ الْمُؤَذِّنَ جَآءَ اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ يُؤذِنُهُ لِصَلَاةِ الصُّبحِ فَوَجَدَهُ نَائِمًا فَقَالَ: اَلصَّلَاةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ فَاَمَرَهُ عُمَرُ اَنْ يَجْعَلَهَا فِي نِدَاءِ الصُّبحِ »[موطا، كتاب الصلاة باب ما جآء في النداء للصلاة(٨) ٤٢ مع ضوء السالك]

''امام مالک رحمہ اللہ کو یہ بات پہنچی کہ مؤذن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس نماز صبح کی اطلاع دینے کے لیے آیا تو اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سوتا ہوا پایا۔ مؤذن نے کہا: ''اَلصَّلَاةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ " حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حکم دیا کہ اسے صبح کی اذان میں کہے۔''

مؤطا کی یہ روایت معضل و مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ یہی روایت سنن دار قطنی (١/ ٢٤٣) میں بھی موجود ہے لیکن اس کی سند بھی صحیح نہیں۔ اس میں کئی علل ہیں: (۱) سفیان ثوری مدلس ہے اور اس روایت میں تصریح بالسماع موجود نہیں۔ (۲) محمد بن عجلان بھی مدلس ہیں اور ان کی بھی تصریح بالسماع نہیں ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ مشکوٰۃ کی تحقیق میں فرماتے ہیں:

" وَ هُوَ ضَعِيفٌ لِاِعْضَالِهِ اَوْ اِرْسَالِهِ" [المشكوٰة (١/ ٢٠٦)]

''یہ روایت معضل یا مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔''

(۳)اس کی سند میں ایک العمری نامی راوی ضعیف ہے۔

اگر یہ روایت صحیح بھی تسلیم کر لی جائے تو اس کی مراد وہ نہیں ہے جو روافض ذکر کرتے ہیں بلکہ مفہوم یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سو رہے تھے اور مؤذن نے آ کر یہ کلمہ ان کے پاس کہا تو انھوں نے بتایا کہ امیر کے دروازے پر آ کر نیند سے بیدار کرنے کے لیے یہ کلمہ نہیں کہتے بلکہ اس کا تعلق فجر کی اذان کے ساتھ ہے، لہٰذا اسے وہاں ہی رکھا جائے۔ جیسا کہ درج بالا صحیح احادیث سے یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ نبی ﷺ نے نماز فجر کی اذان میں یہ کلمہ سکھایا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سنتِ رسول کی حفاظت کس انداز سے کرتے تھے کہ آپ کی تعلیمات میں کمی بیشی کو ناپسند کرتے تھے۔ جو کلمات جہاں رسول اللہ ﷺ نے سکھائے، انھیں وہیں رکھنے کا حکم دیا۔ تو اس لحاظ سے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی منقبت اور شان کی دلیل ہوگی جو روافض کے لیے سم قاتل ہے۔

اور یہ بھی یاد رہے کہ شیعہ حضرات نے جو اپنی اذان میں " اَشْهَدُ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِمَامَ الْمُتَّقِيْنَ عَلِيٌّ حُجَّةُ اللّٰهِ عَلَى الْخَلْقِ " وغیرہ کا اضافہ کیا ہے یہ کسی صحیح تو کجا ضعیف روایت سے بھی ثابت نہیں کہ نبی ﷺ نے ابو محذورہ یا بلال رضی اللہ عنہما میں سے کسی کو سکھایا ہو بلکہ فقہ جعفریہ کی کتب میں ایسا کلمہ کہنے والے پر لعنت وارد ہوئی ہے۔

اذان میں ''اَشْهَدُ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيٌّ وَلِيُّ اللّٰهِ'' کا اضافہ

سوال کیا اذان میں شہادتین کے بعد ''اَشْهَدُ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيٌّ وَ لِيُّ اللّٰهِ'' کلمات کہنا درست ہے؟ قرآن و حدیث سے وضاحت فرمائیں۔

جواب اذان شعائر اسلام میں سے ہے، اس کے الفاظ وہی درست ہیں جو نبی اکرم ﷺ سے منقول ہیں۔ اذان میں نہ اپنی طرف سے اضافہ جائز ہے اور نہ کمی۔ جو شخص اذان میں بعض کلمات کا اضافہ کرتا ہے، وہ بدعتی ہے، بلکہ لعنت کا مستحق ہے۔

سیدنا عبداللہ بن زید بن عبدربہ کی جو روایت اذان کے بارے میں مروی ہے، اس میں یہ بات مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب لوگوں کو نماز کے لیے جمع کرنے کے لیے ناقوس بجانے کا حکم دیا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کے ہاتھ میں ناقوس ہے، تو میں نے اس سے کہا: ''اے اللہ کے بندے! کیا تو ناقوس بیچے گا؟'' اس نے کہا: ''آپ اس کا کیا کریں گے؟'' میں نے کہا: ''میں نماز کے لیے اس کے ذریعے لوگوں کو ندا دوں گا۔'' تو اس نے کہا: ''میں تجھے ایسی بات پر رہنمائی کروں گا جو اس سے بہتر ہے؟'' میں نے کہا: ''کیوں نہیں۔'' اس نے کہا کہ تو کہہ:

« اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ، حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ ، حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ »

صبح میں نے نبی ﷺ کو اپنا خواب سنایا تو انھوں نے فرمایا:

«اِنَّ هٰذَا رُؤْيَا حَقٌّ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ»

''یقیناً یہ خواب سچا ہے اگر اللہ نے چاہا۔''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''بلال کو یہ کلمات سکھا دو تاکہ وہ اذان کہے کیونکہ اس کی آواز تجھ سے بہتر ہے۔''

[ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب كيف الأذان (٤٩٩)، ابن ماجه(٧٠٦)، ترمذی(١٨٩)، احمد(٤٣/٤) ، دارمی (٢١٤/١)]

اسی طرح فجر کی اذان میں '' حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کے بعد دوبار ''اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کہنا سنت سے ثابت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«مِنَ السُّنَّةِ اِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ فِي اَذَانِ الْفَجْرِ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ قَالَ الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ»

[ابن خزيمة(٣٨٦)، دار قطنی(٢٤٣/١)، بيهقی(٤٢٣/١)، ابن منذر(٢١/٣)]

''صبح کی اذان میں ''حی علی الفلاح'' کے بعد ''اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کہنا سنت سے ہے۔''

اور اصول میں یہ بات ثابت ہے کہ صحابی رسول ﷺ کا یہ کہنا کہ '' مِنَ السُّنَّةِ كَذَا ''مسند اور مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے ''المجموع(٢٣٢/٥)'' میں، امام ابن ہمام رحمہ اللہ نے '' التحرير'' میں اور اس کے شارع ابن امیر الحاج نے (۲۲۴/۲) پر جمہور اصولیین اور محدثین سے یہی موقف نقل کیا ہے۔ اسی طرح سیدنا ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اذان سکھائی اور فرمایا صبح کی اذان میں ''اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ '' کہا کرو۔ یہ حدیث سیدنا ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے متعدد طرق کے ساتھ درج ذیل کتب میں مروی ہے۔ [احمد (٤٠٨/٣)، ابو داؤد، (٥٠١)، نسائی(٧/٢) ، ابن خزيمة(٣٨٥)، دار قطنی(٢٢٤/١)، بيهقی (٤٢٢/١)،ابن حبان(٢٨٩)، التاريخ الكبير(١٢٣/١)، عبد الرزاق(٤٧٢/١)، حلية الأولياء(٣١٠/٨)]

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ فجر کی پہلی اذان میں ''اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کہا جاتا ہے۔

[طحاوی(١٣٧/١)، بيهقی(٤٢٣/١)، تلخيص الحبير(٢٠١/١)]

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے اذان میں ترجیع بھی ثابت ہے۔ یعنی شہادتین کے کلمات کو دوبارہ کہنا۔ پہلی بار آہستہ اور دوسری بار اس سے اونچی آواز میں۔ مذکورہ بالا صحیح احادیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اذان کے مذکورہ کلمات ہی سنت نبوی ﷺ سے ثابت ہیں۔ ان میں نہ اضافہ جائز ہے اور نہ کمی ہی۔ اذان میں ''اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ'' وغیرہ کے کلمات نہیں ہیں۔ جو لوگ ان کلمات کا اضافہ کرتے ہیں وہ احداث فی الدین کے مرتکب ہیں اور بدعتی ہیں۔ فقہ جعفریہ سے بھی ان کلمات کا اذان میں کہنا ثابت نہیں ہے بلکہ فقہ جعفریہ کی رو سے یہ کلمات اذان میں کہنا گناہ ہے اور کہنے والا لعنت کا مستحق ہے۔

فقہ جعفریہ کی صحاح اربعہ وغیرہ میں مرقوم اذان اور اہل سنت کی اذان میں فرق صرف یہ ہے کہ ''حی علی الفلاح'' کے بعد فقہ جعفریہ میں ''حی علی خير العمل'' دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔ باقی اذان کے الفاظ وہی ہیں جو اہل سنت کی اذان

کے ہیں۔ شیعہ مذہب کی معتبر کتاب "الفقیه من لا یحضره الفقیه(۱/ ۱۸۸)" پر ابن بابویہ قمی نے اذان کے الفاظ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

" هٰذَا هُوَ الْأَذَانُ الصَّحِيْحُ لَا يُزَادُ فِيْهِ وَ لَا يُنْقَصُ مِنْهُ وَالْمُفَوِّضَةُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ قَدْ وَضَعُوْا اَخْبَارًا وَّ زَادُوْا فِی الْاَذَانِ مُحَمَّدًا وَ اٰلَ مُحَمَّدٍ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ مَرَّتَيْنِ وَ فِیْ بَعْضِ رِوَايَاتِهِمْ بَعْدَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِیُّ اللّٰهِ مَرَّتَيْنِ وَ مِنْهُمْ مَنْ رَّوٰى بَدَلَ ذٰلِكَ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقٌّ مَرَّتَيْنِ وَ لَا شَكَّ فِیْ اَنَّ عَلِيًّا وَلِیُّ اللّٰهِ وَ اَنَّهٗ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقًّا وَ اَنَّ مُحَمَّدًا وَ اٰلَهٗ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ وَ لٰكِنْ لَيْسَ ذٰلِكَ فِیْ اَصْلِ الْاَذَانِ وَ اِنَّمَا ذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِيُعْرَفَ بِهٰذِهِ الزِّيَادَةِ الْمُتَّهَمُوْنَ الْمُدَلِّسُوْنَ اَنَّهُمْ فِیْ جُمْلَتِنَا "

''یہی اذان صحیح ہے، نہ اس میں زیادتی کی جائے گی اور نہ کمی اور مفوضہ فرقہ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، انھوں نے بہت سی روایات گھڑیں اور اذان میں "مُحَمَّدًا وَّ آلَ مُحَمَّدٍ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" (کے کلمات) دو مرتبہ کہنے کے لیے بڑھا دیے اور ان کی بعض روایات میں" اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کے بعد " اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِیُّ اللّٰهِ" دو دفعہ ذکر کیا گیا ہے۔ ان مفوضہ میں سے بعض نے ان الفاظ کی بجائے یہ الفاظ روایت کیے ہیں:" اَشْهَدُ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقًّا " یہ بات یقینی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اللہ کے ولی اور سچے امیر المومنین ہیں اور محمد و آل محمد خیر البریۃ ہیں لیکن یہ الفاظ اصلی اذان میں نہیں ہیں۔ میں نے یہ الفاظ اس لیے ذکر کیے ہیں تاکہ ان کی وجہ سے وہ لوگ پہچانے جائیں جو مفوضہ ہونے کی اپنے اوپر تہمت لیے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود اپنے آپ کو اہل تشیع میں شمار کرتے ہیں۔''

ابن بابویہ قمی شیعہ محدث کی اس صراحت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ "اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِیُّ اللّٰهِ" وغیرہ کلمات اصل اذان کے کلمے نہیں بلکہ اس لعنتی فرقہ مفوضہ نے یہ گھڑے ہیں اور اذان میں داخل کر دیے ہیں۔ ائمہ محدثین کے ہاں ان کا کوئی ثبوت نہیں۔ الفقیه من لا یحضره الفقیه (۱/ ۱۸۸) کے حاشیہ میں مفوضہ فرقے کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

" فِرْقَةٌ ضَالَّةٌ قَالَتْ بِاَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ مُحَمَّدًا وَ فَوَّضَ اِلَيْهِ خَلْقَ الدُّنْيَا فَهُوَ الْخَلَّاقُ وَ قِيْلَ بَلْ فَوَّضَ ذٰلِكَ اِلٰى عَلِیٍّ عَلَيْهِ السَّلَامِ "

''مفوضہ ایک گمراہ فرقہ ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف محمد (ﷺ) کو پیدا کیا، اس کے بعد دنیا کی پیدائش کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کے سپرد کر دیا۔ لہٰذا آپ ہی خلاق (بہت زیادہ پیدا کرنے والے) ہوئے اور ان کے عقائد میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش کا معاملہ نبی ﷺ کی بجائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔''

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ مفوضہ ایک لعنتی فرقہ ہے، جس نے یہ کلمات اذان میں بڑھائے ہیں، سنت کے ساتھ

ان کا کوئی تعلق نہیں۔ شیعہ مذہب کی معتبر کتاب "المبسوط (۹۹/۱)" طبع تھران، لأبی جعفر بن محمد حسین الطوسی میں لکھا ہے:

"فَاَمَّا قَوْلُ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اٰلُ مُحَمَّدٍ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ عَلٰى مَا وَرَدَ فِيْ شَوَاذِّ الْاَخْبَارِ فَلَيْسَ بِمَعْمُوْلٍ عَلَيْهِ فِي الْاَذَانِ وَ لَوْ فَعَلَهُ الْاِنْسَانُ يَاْثَمُ بِهِ غَيْرَ اَنَّهُ لَيْسَ مِنْ فَضِيْلَةِ الْاَذَانِ وَ لَا كَمَالِ فُصُوْلِهِ"

''بہرحال اذان میں "اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اٰلَ مُحَمَّدٍ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" کہنا جیسا کہ شاذ روایات میں آیا ہے، ان کے کہنے پر کوئی کاربند نہیں ہے اور اگر کوئی شخص اذان میں یہ کلمات کہے تو وہ گناہ گار ہوگا، علاوہ ازیں یہ کلمات اذان کی فضیلت اور کمال میں سے نہیں ہیں۔''

اسی طرح شیعہ مذہب کی معتبر کتاب " اللمعة الدمشقية (۲٤٠/۱)" میں لکھا ہے:

''مذکورہ اذان (جو اہل سنت کے مطابق ہے) یہی شرع میں منقول ہے۔ اس کے علاوہ زائد کلمات کا شرعی طور پر درست سمجھنا جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ اذان کے اندر ہوں یا اقامت میں۔ جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کی گواہی کے الفاظ اور محمد و آل محمد کے خیر البریہ یا خیر البشر ہونے کے الفاظ ہیں۔ اگرچہ جو کچھ ان الفاظ میں کہا گیا ہے وہ واقعی درست ہے (یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ولی اللہ ہونا اور محمد و آل محمد کا بہترین مخلوق ہونا) لیکن ہر وہ بات جو واقعتاً درست اور حق ہے، اسے ایسی عبادات میں داخل کر لینا جو شرعی وظیفہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حد بندی کی گئی ہو، جائز نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا ان کلمات کا اذان میں کہنا بدعت ہے اور ایک نئی شریعت بنانا ہے۔''

اسی طرح شیعہ حضرات کی کتاب ''فقه امام جعفر صادق لمحمد جواد (۱۶۶/۱)'' طبع ایران میں لکھا ہے:

" وَاتَّفَقُوْا جَمِيْعًا عَلٰى اَنَّ قَوْلَ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ لَيْسَ مِنْ فُصُوْلِ الْاَذَانِ وَ اَجْزَائِهِ وَ اَنَّ مَنْ اَتٰى بِنِيَّةِ اَنَّهُ مِنَ الْاَذَانِ فَقَدْ اَبْدَعَ فِي الدِّيْنِ وَ اَدْخَلَ فِيْهِ مَا هُوَ خَارِجٌ عَنْهُ "

''سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ " کلمات اذان اور اس کے اجزاء میں سے نہیں ہیں اور اس پر بھی کہ جو شخص ان الفاظ کو اس نیت سے کہتا ہے کہ یہ بھی اذان میں شامل ہیں تو اس نے دین میں بدعت نکالی اور وہ بات دین میں داخل کر دی جو اس سے خارج تھی۔''

اسی طرح شیعہ محدث و مفسر شیخ الطائفہ ابوجعفر محمد بن حسن الطوسی نے اپنے فتاویٰ " النهاية فی مجرد الفقه والفتاویٰ (٦٩)" طبع قم، ایران میں لکھا ہے:

" وَ اَمَّا مَا رُوِيَ فِيْ شَوَاذِّ الْاَخْبَارِ مِنْ قَوْلِ " اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ وَ اٰلَ مُحَمَّدٍ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ " فَمِمَّا لَا يُعْمَلُ عَلَيْهِ فِي الْاَذَانِ وَ الْاِقَامَةِ فَمَنْ عَمِلَ بِهَا كَانَ مُخْطِئًا "

''شاذ روایات میں جو یہ قول مروی ہے: " اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ وَ آلَ مُحَمَّدٍ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ " یہ ان

کلمات میں سے ہے جن پر اذان اور اقامت میں عمل نہیں کیا جاتا، جس شخص نے اس پر عمل کیا وہ غلطی پر ہے۔''

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اذان کے کلمات شعائر اسلام میں سے ہیں اور یہ اللہ کے رسول ﷺ نے مقرر کیے ہیں۔ کسی شخص کو ان میں نہ اضافہ کرنے کی اجازت ہے اور نہ کمی ہی۔ جو شخص اذان میں اضافہ یا کمی کرتا ہے، وہ بدعتی ہے اور موجب لعنت ہے۔ فقہ جعفریہ کی امہات الکتب میں بھی یہی اذان جو اہل سنت کے ہاں مشروع ہے، نقل کی گئی ہے سوائے '' حَيَّ عَلٰی خَيْرِ الْعَمَلِ '' کے اور فقہ جعفریہ کی رو سے '' اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ'' کے کلمات کا اذان میں درج کرنا گناہ ہے اور بدعت ہے بلکہ یہ الفاظ لعنتی فرقہ مفوضہ نے گھڑے ہیں اور اذان میں داخل کر دیے ہیں۔ حالانکہ یہ کلمات اذان میں شامل نہیں ہیں۔

ہم دعویٰ کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ سیدنا علی، سیدنا حسن، سیدنا حسین، علی زین العابدین رضی اللہ عنہم وغیرہ جو شیعہ کے ہاں ائمہ اہل بیت، معصوم عن الخطاء شمار ہوتے ہیں، ان سے صحیح سند کے ساتھ تو کیا ضعیف سند کے ساتھ بھی ان کلمات کا اذان میں کہنا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی نماز کے لیے اذان دی جاتی تھی تو کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات اذان میں کہلوائے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ اذان میں یہ کلمات نہیں کہتے ان کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ اہل بیت سے محبت نہیں ہے۔ یہ بات سراسر غلط ہے، اگر محبت کی یہ علامت ہے کہ جس کے ساتھ محبت ہو اس کا نام اذان میں لیا جائے تو ان حضرات کو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی تمام اولاد، اسی طرح ان کے مزعومہ بارہ امام اور ان کی اولاد کے نام بھی اذان میں لینے چاہییں تاکہ کھل کر محبت کا اظہار ہو اور اگر اس طرح اذان شروع کر دی جائے تو ہو سکتا ہے چوبیس (۲۴) گھنٹوں میں اذان بھی مکمل نہ ہو اور نماز کا وقت ہی نہ ملے۔ اوپر شیعہ مجتہدین سے صراحت کے ساتھ نقل کر دیا ہے کہ جو بات امر واقع میں درست ثابت ہو، اسے اذان میں اپنی طرف سے داخل کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اذان کے کلمات اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے منقول ہیں اور متعین ہیں، ان میں اضافہ کرنا اپنے آپ کو لعنت کا حق دار بنانے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو سنت نبوی پر عمل کی کما حقہ توفیق عنایت فرمائے۔

ترجیع والی اذان ثابت ہے؟

سوال کیا اذان میں ترجیع یعنی شہادتین کا دہرانا سنتِ رسول سے ثابت ہے؟ آگاہ فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

جواب ترجیع والی اذان سے مراد دہری اذان ہے اور دہری اذان شریعت سے ثابت ہے، جس میں شہادتین پہلی بار دوسری بار کی نسبت پست آواز میں ہو اور دوسری بار پہلے کی نسبت بلند آواز میں کہے جائیں۔ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ تا حیات مکہ کے مؤذن رہے ہیں جیسا کہ '' اسد الغابة (٢٧٣/٦)، رقم الترجمة (٦٢٢٩) ''میں موجود ہے اور وہ ایسی ہی اذان کہتے تھے۔

اس میں نمازوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ نماز کوئی بھی ہو اس کے لیے یہ اذان کہی جا سکتی ہے۔ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: '' اے اللہ کے رسول! مجھے اذان کے کلمات سکھائیں۔'' فرماتے ہیں آپ ﷺ نے میرے سر کا اگلا حصہ پکڑا اور

فرمایا کہو:

« اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ »

ان کلمات کے ساتھ اپنی آواز بلند کرو، پھر کہو:

« اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ...... الحديث »[ابو داؤد، كتاب الصلاة: باب كيف الأذان(٥٠٠)، ترمذى، ابواب الصلاة: باب ما جآء فى الترجيع فى الأذان(١٩١)، بيهقى(٣٩٤/١) ، احمد(٤٠٩/٣)، ابن خزيمة (٣٧٧) ، مسلم (٣٧٩/٦) ، ابن حبان(١٦٨٠)،١٦٨١)]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ فِيْ هٰذَا الْحَدِيْثِ حُجَّةٌ بَيِّنَةٌ وَ دَلَالَةٌ وَاضِحَةٌ لِمَذْهَبِ مَالِكٍ وَ الشَّافِعِيِّ وَ اَحْمَدَ وَ جَمْهُوْرِ الْعُلَمَاءِ اَنَّ التَّرْجِيْعَ فِي الْاَذَانِ ثَابِتٌ مَشْرُوْعٌ وَ هُوَ الْعَوْدُ اِلَى الشَّهَادَتَيْنِ مَرَّتَيْنِ بِرَفْعِ الصَّوْتِ بَعْدَ قَوْلِهَا مَرَّتَيْنِ بِخَفْضِ الصَّوْتِ " [شرح مسلم (٧٠/٤)]

''اس حدیث میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور جمہور علماء (رحمہم اللہ) کے مذہب کے لیے کھلی دلیل اور واضح دلالت ہے کہ اذان میں ترجیع ثابت اور مشروع ہے۔ ترجیع یہ ہے کہ دو مرتبہ شہادتین کے کلمات آواز پست کرنے کے بعد بلند آواز سے دوبارہ کہے جائیں۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اہل کوفہ کے نزدیک ترجیع مشروع نہیں، اس لیے کہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ترجیع کا ذکر نہیں۔ جمہور کی دلیل یہ صحیح حدیث ہے اور اس میں ترجیع کا ذکر ہے اور یہ ذکر و زیادت مقدم ہے۔ اس لیے بھی کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بعد کی ہے۔

ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ۸ھ میں حنین کے بعد کی ہے اور عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ والی حدیث اس سے پہلے اذان کی ابتدا کے وقت کی ہے۔ اہل مکہ و مدینہ اور تمام شہروں کا عمل اس میں ضم ہوگیا ہے۔ لہٰذا یہ کلمات اذان میں اضافہ نہیں بلکہ سنت سے ثابت ہے اور ابومحذورہ رضی اللہ عنہ اپنی ساری زندگی مکہ میں یہی اذان کہتے رہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس اذان کیساتھ اقامت بھی دہری کہی جائے گی۔ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے ساتھ اقامت کے کلمات اکہرے ہیں۔ ہمارے حنفی بھائیوں نے اذان بلال رضی اللہ عنہ کی لے لی اور اقامت ابومحذورہ والی۔ کسی بھی حدیث پر پورا عمل نہیں کیا۔ اگر بلال والی اذان لینا ہے تو اقامت بھی انہی کی ہونی چاہیے اور اگر اقامت ابومحذورہ والی کہی جاتی ہے تو ان کی اذان ترجیع والی ہے، اس سے انکار کیوں؟ اللہ تعالیٰ صراط مستقیم پر چلائے۔ (آمین!)

نماز کے لیے اذان دینا

سوال ایک آدمی گھر میں نماز ادا کرتا ہے تو اس کے لیے اذان دینا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نہیں دے گا تو کیا اس کی نماز ہو

جائے گی؟

(جواب) نماز ادا کرنے کے لیے اذان دینا ضروری نہیں ہے، اگر بغیر اذان کے جماعت کروا لی جائے تو نماز ادا ہو جائے گی اور اگر اذان کہہ لیں تو اس کا جواز ہے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے:

''انس رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے تو جماعت ہو چکی تھی تو انھوں نے اذان و اقامت کہی اور جماعت سے نماز ادا کی۔''

[صحيح بخاری، كتاب الأذان: باب فی فضل صلاة الجماعة]

اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اذان و اقامت کے بغیر جماعت کرانا بھی ثابت ہے جیسا کہ طبرانی کبیر اور کتاب الآثار وغیرھما میں منقول ہے۔

کتاب و سنت میں کوئی ایسی دلیل ہمیں معلوم نہیں جس سے یہ لازم آتا ہو کہ جماعت کے لیے اذان کہنا فرض و واجب ہے، اس کے بغیر جماعت نہیں ہوتی۔ اذان تو صرف مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے اطلاع کا نام ہے۔

اذان سے پہلے صلوٰۃ کا حکم

(سوال) اذان سے قبل صلوۃ کے مروجہ کلمات کہنا کیسا ہے؟ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسا کرتے تھے؟

(جواب) اذان کی ابتدا میں نبی ﷺ پر صلوٰۃ (مروجہ کلمات الصلوٰۃ والسلام علیك یا رسول اللہ وغیرہ) سنت سے ثابت نہیں۔ اذان کے بعد مسنون صلوٰۃ و اذکار پڑھنا باعث فضیلت ہے۔ نبی کریم ﷺ کے اصحاب کا یہی معمول تھا اور یہی اہل سنت کا طریقہ ہے۔ اذان سے قبل درود و سلام پڑھنا اہل بدعت کا طریقہ ہے۔

بدعتیوں کی اذان کا جواب

(سوال) کیا ایک ہی وقت میں ہونے والی متعدد اذانوں کا جواب دینا ضروری ہے؟ نیز بدعتیوں کی اذان کا جواب دینا درست ہے؟

(جواب) اذان کا جواب دینے کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا سَمِعْتُمُ النِّدَاءَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ الْمُؤَذِّنُ » [ابو داود، کتاب الصلاة: باب ما يقول اذا سمع المؤذن (۵۲۲)]

''جب تم اذان سنو تو اسی طرح کہو جیسے مؤذن کہتا ہے۔''

اس روایت کی روشنی میں بعض کے نزدیک اذان کا جواب دینا واجب ہے اور بعض کے نزدیک مستحب۔ واجب بھی ہو تو صرف ایک اذان کا جواب دینا کافی ہے باقی سب کا آپ جواب نہ بھی دیں تو کوئی حرج نہیں، دے دیں تو بہر حال ثواب کا کام ہے۔ باقی رہا اہل بدعت کی اذان کا جواب دینے کا مسئلہ تو اذان بہر حال اذان ہے۔ آپ اس کا جواب دیں۔ ان کی

بدعت کلمہ حق پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ غلطی کا گناہ ان پر ہے۔ آپ ان کے ساتھ صرف حق میں ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ اپنی کتاب صحیح بخاری میں سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ کا اثر نقل کرتے ہیں، ان سے بدعتی امام کی اقتدا کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا:

"فَصَلِّ وَ عَلَيْهِ بِدْعَتُهُ" [بخاری، کتاب الصلاة: باب إمامة المفتون المبتداء]

"تم نماز پڑھو اور اس کی بدعت اس پر ہے۔"

اسی طرح عبید اللہ بن عدی بن خیار، جن دنوں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ محصور تھے، ان کے پاس تشریف لائے۔ سوال کیا کہ آپ کو تو امامت عامہ کا حق تھا لیکن اب جو کچھ آپ کے ساتھ گزر رہی ہے، ہمیں معلوم ہے۔ ہمیں باغیوں کا امام نماز پڑھائے تو ہم دل تنگ کرتے ہیں۔ تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

"لوگوں کے اعمال میں سے بہترین عمل نماز ہے، جب وہ نیکی کریں تو ان کے ساتھ نیکی کرو اور جب وہ برے کام کریں تو تم ان کی برائیوں سے بچو۔" [بخاری، کتاب الصلاة: باب إمامة المفتون المبتداء]

اقامت کون کہے؟

سوال کیا ضروری ہے کہ موذن ہی اقامت کہے یا کوئی دوسرا بھی کہہ سکتا ہے؟

جواب افضل اور بہتر یہی ہے کہ اذان کہنے والا ہی اقامت کہے کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے (نماز کی اطلاع کے لیے) آگ اور ناقوس کا ذکر کیا، اسی طرح یہود و نصاریٰ کا بھی ذکر کیا، پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ اذان جفت اور اقامت اکہری کہیں سوائے "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ" کے۔ [بخاری، کتاب الأذان: باب الأذان مثنى مثنى(٦٠٦)]

معلوم ہوا کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اذان بھی کہتے تھے اور اقامت بھی۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مؤذن سیدنا ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ انھوں نے اذان بھی کہی اور اقامت بھی۔ [بیهقی (١/٣٩٩)، ابن ابی شیبة: (١/٢١٦)]

اقامت کے جواب میں "أَقَامَهَا اللّٰهُ وَ أَدَامَهَا" کہنا

سوال بعض بھائی اقامت کے جواب میں "اَقَامَهَا اللّٰهُ وَ اَدَامَهَا" کے الفاظ کہتے ہیں۔ ان الفاظ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب اقامت کا جواب دینے کے لیے جو "اَقَامَهَا اللّٰهُ وَ اَدَامَهَا" کہا جاتا ہے یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ اس سلسلہ میں سنن ابی داؤد میں جو روایت مذکورہ ہے وہ انتہائی ضعیف ہے، اس کے ضعف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں درج ذیل تین علتیں پائی جاتی ہیں۔

① محمد بن ثابت العبدی ضعیف راوی ہے۔ امام علی بن مدینی اور دیگر محدثین نے کہا ہے کہ یہ حدیث میں قوی نہیں ہے۔ امام

ابن معین رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یہ کچھ نہیں ہے۔'' [میزان الاعتدال(۴۹۵/۳)]
امام ابو حاتم نے کہا: '' یہ مضبوط نہیں ہے۔'' امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: '' یہ اپنی بعض احادیث میں ثقات کی مخالفت کرتا ہے۔'' امام نسائی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یہ قوی نہیں ہے۔'' امام ابو داود رحمہ اللہ نے کہا: '' یہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔'' [تهذيب التهذيب (۸۵/۹)]

② ''رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الشَّامِ '' مجہول ہے یعنی یہ بات معلوم نہیں کہ اہل شام میں سے کون سا آدمی ہے جس سے یہ روایت مروی ہے۔

③ تیسری خرابی یہ ہے کہ شہر بن حوشب متکلم فیہ ہے جیسا کہ کتب رجال اس پر شاہد ہیں ۔[میزان الاعتدال (۲۸۳/۲)، تہذیب التہذیب(۳٦۹/٤)حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب میں اسے كثرة الأوهام یعنی کثرت سے وھم میں مبتلا ہونے والا قرار دیا ھے۔]

لہٰذا جب یہ روایت صحیح نہیں تو اس سے استدلال کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ یاد رہے کہ بڑوں کی بات کوئی حجت نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکامات ہی ہمارے لیے حجت ہیں۔ جو بات قرآن وسنت سے ملتی ہے وہ لے لو اور جس کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں اس پر عمل کرنے کے ہم مکلّف نہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت کا سلسلہ شروع کیا تھا تو آپ کو بھی یہی جواب دیا گیا تھا کہ ہمارے بزرگ اور بڑے آج تک اسی طریقہ پر گامزن ہیں۔ کیا وہ غلط ہیں اور تم جو نیا دین لائے ہو وہ صحیح ہے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡــًٔا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴾ [البقرة:۱۷۰]

''جب انھیں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہدایت یافتہ تھے۔''

معلوم ہوا منزل من اللہ دین کی بات کے مقابلے میں آباؤ اجداد کے اقوال و افعال پیش کرنا پرانے مشرکین و کفار کا طرز عمل تھا۔ اہل اسلام کو یہ زیبا نہیں کہ وہ شرعی احکامات کے سامنے اپنے آباؤ اجداد کو پیش کریں۔ لہٰذا جن مسائل کا ثبوت قرآن وسنت کی نصوص سے نصاً یا اشارۃً ملتا ہے انھیں لے لینا چاہیے اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

نومولود کے کان میں اذان اور اقامت کہنا

سوال مسلمان اپنے نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں تکبیر کہتے ہیں کیا یہ فعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

جواب ہمارے علم کے مطابق اس کے متعلق کوئی صحیح و مرفوع حدیث موجود نہیں۔ اس سلسلہ میں جو تین روایات پیش کی جاتی ہیں وہ قابل استناد نہیں ہیں۔ ایک روایت حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں:

« رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَذَّنَ فِيْ اُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ حِيْنَ وَلَدَتْهُ فَاطِمَةُ بِالصَّلَاةِ » [ترمذی،ابواب الاضاحی: باب الأذان فی أذن المولود (١٥١٤)، ابوداؤد،(٥١٠٥)، احمد (٩/٦)، شعب الایمان(٨٦١٧)، حاکم(١٧٩/٣)، بیهقی(٣٠٥/٩)]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے کان میں نماز والی اذان کہی جب اسے سیدنا فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جنم دیا۔''

اس روایت کی سند میں عاصم بن عبید اللہ راوی ہے جس کے ضعف پر تقریباً تمام محدثین متفق ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَ مَدَارُهُ عَلٰى عَاصِمِ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ وَ هُوَ ضَعِيْفٌ " [تلخیص الحبیر(١٩٨٥)، (٣٦٧/٤)، کتاب العقیقة، طبع جدید، اس راوی پر مزید کلام کے لیے دیکھیے، تهذیب التهذیب(٣٥/٣، ٣٦)]

''اس روایت کا دار و مدار عاصم بن عبید اللہ پر ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔''

بعض حضرات نے اس روایت کی تقویت کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت پیش کی ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ أَذَّنَ فِيْ اُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ يَوْمَ وُلِدَ وَ اَقَامَ فِيْ اُذُنِهِ الْيُسْرٰى » [السلسلة الضعیفة(٣٣١/١)، ارواء الغلیل(٤٠١/٤)]

''بیشک نبی ﷺ نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے کان میں اسکی ولادت کے دن اذان کہی اور بائیں کان میں اقامت کہی۔''

اور انھوں نے اس روایت کو ابو رافع رضی اللہ عنہ کی روایت کے لیے شاہد ہونے کی امید ظاہر کی ہے۔ (نوٹ: ''السلسلة الضعیفة " میں اس روایت کے یہ الفاظ طبع ہونے سے رہ گئے ہیں: ''فَاَذَّنَ فِيْ اُذُنِهِ الْيُمْنٰى " (آپ نے حسن کے دائیں کان میں اذان کہی۔) امام بیہقی نے اگرچہ اسے ضعیف قرار دیا ہے لیکن یہ ضعیف کی بجائے موضوع ہے کیونکہ اس میں محمد بن یونس الکدیمی راوی ہے، جس کے متعلق امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " قَدْ اُتُّهِمَ الْكُدَيْمِيُّ بِالْوَضْعِ " (یہ روایت گھڑنے کے ساتھ متہم ہے)۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس راوی نے ہزار سے زیادہ روایات گھڑی ہیں۔'' اسی طرح موسیٰ بن ہارون اور قاسم المطرز نے بھی اس کی تکذیب کی ہے۔ [میزان الاعتدال(٧٤/٤)]

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بھی اسے روایت گھڑنے کی تہمت دی ہے۔ لہٰذا یہ روایت موضوع ہونے کی وجہ سے شاہد بننے کے قابل نہیں ہے۔ اسی طرح اس میں کدیمی کا استاد اور استاد الاستاد بھی ضعیف ہیں۔ نیز حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت میں ہے:

« مَنْ وُلِدَ لَهُ مَوْلُوْدٌ فَاَذَّنَ فِيْ اُذُنِهِ الْيُمْنٰى وَ اَقَامَ فِيْ اُذُنِهِ الْيُسْرٰى لَمْ تَضُرُّهُ اُمُّ الصِّبْيَانِ »

''جس کے ہاں بچہ پیدا ہو، وہ اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہے تو اسے ام الصبیان (بیماری) تکلیف نہیں دے گی۔'' [شعب الایمان(٨٦١٩)]

اس کی سند میں یحیٰی بن العلاء الرازی کذاب راوی ہے۔ لہٰذا بچے کے کان میں اذان اور اقامت والی روایات نبی ﷺ سے ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم)

اکیلا آدمی نماز کے لیے اپنی اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے؟

(سوال) کیا تنہا آدمی اپنی نماز کے لیے اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

(جواب) اگر نمازی اکیلا نماز پڑھے تو اذان و اقامت کہہ سکتا ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« يَعْجَبُ رَبُّكَ عَزَّوَجَلَّ مِنْ رَاعِيْ غَنَمٍ فِيْ رَأْسِ شَظِيَّةٍ بِجَبَلٍ يُؤَذِّنُ لِلصَّلَاةِ وَ يُصَلِّيْ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ أُنْظُرُوْا إِلَى عَبْدِيْ هٰذَا يُؤَذِّنُ وَ يُقِيْمُ الصَّلَاةَ يَخَافُ مِنِّيْ قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِيْ وَ أَدْخَلْتُهُ الْجَنَّةَ » [ابو داود، كتاب صلاة السفر: باب الأذان في السفر(١٢٠٣)]

”تمھارا رب ایسے چرواہے سے خوش ہوتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر اپنا ریوڑ چراتا ہے اور نماز کے لیے اذان کہتا ہے اور نماز ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے:” میرے اس بندے کی طرف دیکھو جو مجھ سے ڈرتے ہوئے نماز کے لیے اذان اور اقامت کہتا ہے۔ میں نے اپنے اس بندے کو معاف کر دیا اور میں نے اسے جنت میں داخل کر دیا۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ آدمی اکیلا نماز پڑھے تو وہ اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے۔ یہ اس کیلئے بخشش کا ذریعہ بنتی ہے۔

WWW. KITABOSUNNAT.COM

❀❀❀

اوقات نماز کا بیان

WWW. KITABOSUNNAT. COM

اوقاتِ نماز اوران کے معلوم کرنے کا طریقہ

سوال اسلام میں اوقات نماز کے کیا احکام ہیں؟ ان کے معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اور کیا اوقات معلوم کرنے کے لیے سایۂ زوال منہا کیا جائے گا یا شامل؟ تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے ہر نماز اس کے اپنے وقت میں فرض کی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ اِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا ﴾ [النساء:١٠٣]

''بلاشبہ نماز مومنوں پر وقت مقررہ میں فرض کی گئی ہے۔''

اس آیت کریمہ سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ نماز اس کے مقررہ وقت میں ادا کرنا ضروری ہے۔ اجمالی طور پر اوقات نماز کو اس آیت میں ذکر کر دیا گیا ہے اور قرآن حکیم میں دیگر مقامات پر اوّل و آخر وقت کے تعیین کے بغیر اللہ تعالیٰ نے اوقاتِ نماز کو بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ اَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ﴾ [هود:١١٤]

''دن کے دونوں سروں میں نماز قائم کرو اور رات کی گھڑیوں میں بھی۔''

اس آیت کریمہ میں ''طَرَفَيِ النَّهَارِ '' سے مراد صبح اور ظہر و عصر کی نماز اور '' زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ '' سے مغرب اور عشاء کی نماز مراد ہے۔ [مرعاة المفاتيح(٢٧١/٢)]

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ اَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْآنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴾
[بنی اسرائیل:٧٨]

''نماز قائم کریں سورج ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک اور فجر کا قرآن پڑھنا بھی۔ یقیناً فجر کے وقت کا قرآن پڑھنا حاضر کیا گیا ہے۔''

اس آیت میں ''لِدُلُوْكِ'' کے معنی زوالِ آفتاب اور ''غَسَقِ '' کے معنی تاریکی کے ہیں۔ زوال آفتاب کے بعد ظہر و عصر کی نماز اور رات کی تاریکی تک سے مراد مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں اور '' قُرْآنَ الْفَجْرِ'' سے مراد نماز فجر ہے۔ یہاں قرآن نماز کے معنی میں ہے، اس کو قرآن سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ فجر کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ ایک

مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴾ [الروم:۱۷، ۱۸]

''پس تم صبح و شام اللہ کی تسبیح کیا کرو، آسمانوں اور زمینوں میں تعریف اسی کی ہے۔ تیسرے پہر اور ظہر کے وقت بھی (اس کی پاکیزگی بیان کرو)۔''

اس آیت کریمہ میں بھی بعض مفسرین نے تسبیح سے نماز مراد لی ہے اور '' تُمْسُوْنَ '' میں مغرب وعشاء، ''تُصْبِحُوْنَ'' میں نماز فجر، '' عَشِيًّا '' میں سہ پہر یعنی عصر اور '' تُظْهِرُوْنَ '' میں نماز ظہر مراد ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا وَ مِنْ اٰنَآءِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴾ [طٰهٰ:۱۳۰]

''سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرو اور رات کے مختلف وقتوں میں بھی اور دن کے حصوں میں بھی تسبیح کرتے رہیں، بہت ممکن ہے کہ آپ راضی ہو جائیں۔''

اس آیت میں بعض مفسرین نے تسبیح سے نماز مراد لی ہے۔ طلوع شمس سے قبل فجر، غروب سے قبل عصر، رات کی گھڑیوں سے مراد مغرب وعشاء اور '' اطراف النهار '' سے مراد نماز ظہر لی ہے کیونکہ ظہر کا وقت نہار اوّل کا آخری طرف اور نہار آخر کا اوّل طرف ہے۔ مزید دیکھیں: [مرعاة المفاتيح (۲/ ۲۸٤)]

ان واضح آیات میں اجمالی طور پر اوقات نماز کو بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ رسول مکرم کی کئی ایک صحیح احادیث میں نمازوں کے اوقات کی ابتدا و انتہا کو متعین کر دیا گیا ہے۔

فجر کی نماز کا وقت طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک ہے۔ ظہر کا وقت زوال آفتاب سے لے کر ہر چیز کا سایہ اس کے ایک مثل ہونے تک ہے اور عصر کا وقت مثل اوّل سے لے کر دو مثل تک اور مغرب غروب آفتاب سے لے کر شفق کے غائب ہونے تک ہے اور عشاء شفق کے غائب ہونے سے لے کر نصف رات تک ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« وَقْتُ الظُّهْرِ اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ وَ كَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُوْلِهِ مَا لَمْ تَحْضُرِ الْعَصْرُ، وَ وَقْتُ الْعَصْرِ مَا لَمْ تَصْفَرَّ الشَّمْسُ وَ وَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ وَ وَقْتُ صَلَاةِ الْعِشَاءِ اِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ الْاَوْسَطِ وَ وَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوْعِ الْفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ فَاِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ فَاَمْسِكْ عَنِ الصَّلَاةِ فَاِنَّهَا تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ » [مسلم، كتاب الصلاة: باب أوقات الصلوات الخمس(٦١٢)]

'' ظہر کا وقت جب سورج ڈھل جائے اور آدمی کا سایہ اس کی مثل ہو جائے اور عصر کی نماز کا وقت نہ ہو اور عصر کا

(آخری) وقت جب تک سورج زرد نہ ہو جائے اور مغرب کا جب تک سرخی غائب نہ ہو اور عشاء کا وقت رات کے نصف تک اور صبح کی نماز کا وقت طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک ہے۔ جب آفتاب نکلنا شروع ہو جائے تو نماز سے رک جا کیونکہ وہ شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِنَّ لِلصَّلَاةِ اَوَّلًا وَ آخِرًا وَ اِنَّ اَوَّلَ وَقْتِ صَلَاةِ الظُّهْرِ حِيْنَ تَزُوْلُ الشَّمْسُ وَ آخِرَ وَقْتِهَا حِيْنَ يَدْخُلُ وَقْتُ الْعَصْرِ وَ اِنَّ اَوَّلَ وَقْتِ صَلَاةِ الْعَصْرِ حِيْنَ يَدْخُلُ وَقْتُهَا وَ اِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِيْنَ تَصْفَرُّ الشَّمْسُ وَ اِنَّ اَوَّلَ وَقْتِ الْمَغْرِبِ حِيْنَ تَغْرُبُ الشَّمْسُ وَ اِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِيْنَ يَغِيْبُ الشَّفَقُ وَ اِنَّ اَوَّلَ وَقْتِ الْعِشَاءِ الْآخِرَةِ حِيْنَ يَغِيْبُ الْاُفُقُ وَ اِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِيْنَ يَنْتَصِفُ اللَّيْلُ وَ اِنَّ اَوَّلَ وَقْتِ الْفَجْرِ حِيْنَ يَطْلُعُ الْفَجْرُ وَ اِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِيْنَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ » [ترمذی، ابواب الصلاۃ: باب مواقیت الصلاۃ (۱۵۱)]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک ہر نماز کے لیے ایک ابتدائی وقت ہے اور ایک انتہائی وقت ہے۔ نماز ظہر کا ابتدائی وقت وہ ہے جب سورج ڈھل جائے اور آخری وقت (وہ ہے) جب نماز عصر کا وقت شروع ہو، نماز عصر کا ابتدائی وقت وہی ہے جب یہ (ظہر کے اختتام کے) وقت شروع ہوتا ہے اور آخری وقت جب سورج زرد ہو جائے۔ مغرب کا ابتدائی وقت جب سورج غروب ہو جائے اور آخری وقت جب شفق غائب ہو جائے۔ عشاء کا ابتدائی وقت جب شفق غائب ہو جائے اور آخری وقت جب آدھی رات گزر جائے۔ فجر کا پہلا وقت جب فجر طلوع ہو اور اس کا آخری وقت جب سورج طلوع ہو۔''

فجر کا ابتدائی وقت جب فجر طلوع ہو جائے اور آخری وقت جب سورج طلوع ہو جائے۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک صحیح احادیث موجود ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فجر کا اول وقت فجر صادق کے طلوع ہونے سے لے کر طلوع آفتاب تک ہے۔ ظہر کا اول وقت سورج ڈھلنے سے لے کر ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہو جانے تک ہے اور عصر کا اول وقت ایک مثل سائے سے لے کر دو مثل تک ہے جب سورج زرد پڑ جائے۔ مغرب کا وقت سورج غروب ہونے سے لے کر شفق یعنی شام کی سرخی غائب ہونے تک ہے اور عشاء کا وقت سرخی کے غائب ہونے سے لے کر نصف رات تک ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ ظہر کی نماز کے لیے مثل اوّل کی پہچان کا طریقہ کیا ہے اور زوال کا سایہ اس میں شامل ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب آفتاب ڈھلنا شروع ہو جائے تو نماز ظہر کا اوّل وقت شروع ہو جاتا ہے اس سے پہلے نماز ظہر کی ابتدا بالکل جائز نہیں اور نہ وہ نماز کفایت ہی کرتی ہے۔ پھر نماز ظہر کا وقت ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہونے تک باقی رہتا ہے۔ اس میں وہ اصلی سایہ شمار نہیں ہوگا جو زوال آفتاب کے وقت اس چیز کا تھا۔ البتہ اس سے جو زیادہ ہوگا وہ شمار ہوگا۔

[المحلی (۳٤٦/۲)، طبع اردو]

مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سورج بعض علاقوں میں سیدھا سر کے اوپر سے گزرتا ہے اور بعض علاقوں میں خم کھا کر گزرتا ہے اور موسم کے لحاظ سے بھی اس کی رفتار میں یہ فرق ظاہر ہوتا ہے۔ گرمی میں وہ سر کے قریب سے گزرتا ہے اور سردیوں میں ایک طرف زیادہ خم کھا کر گزرتا ہے۔ ان دونوں موسموں میں سایہ کا حساب الگ الگ ہوتا ہے۔ جن ممالک سے سورج خم کھائے بغیر گزرتا ہے وہاں دوپہر کے وقت جب سورج سر پر ہوتو ہر چیز کا سایہ اس کے قدموں میں ہوتا ہے ظاہر نہیں ہوتا۔ اس طرح گرمی کے موسم میں چونکہ سورج سر کے قریب ہوتا ہے اس لیے سایہ کم ہوتا ہے کیونکہ سورج کی رفتار میں خم اور انحراف کی وجہ سے کچھ نہ کچھ سایہ عین دوپہر کے وقت بھی ہوتا ہے۔ سردیوں میں جیسے خم بڑھتا ہے سایہ بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اسے سایہ اصلی کہا جاتا ہے، زوال کے بعد اس میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے مثل کا حساب کرنے کے وقت یہ سایہ الگ کر دیا جائے گا، اسے علیحدہ کرنے کے بعد جو سایہ ہوگا مثل یا دو مثل اس سے شمار ہوگا۔''

[حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح: ۱/ ۴۱۴-۴۱۵]

زوال کا سایہ مثل میں شمار نہیں ہوگا، یہی بات امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "فتاویٰ (۲۲/ ۷۴)" میں، فقہ حنفی کتاب "الھدایۃ (۱/ ۴۰)" میں، فقہ شافعی کی کتاب "المجموع (۳/ ۸۱)" میں فقہ حنبلی کی کتاب ''الروض المربع (۱/ ۴۲)" میں موجود ہے۔ الغرض یہ بات متفق علیہ ہے کہ زوال کا سایہ نکال کر مثل کی پیائش ہوگی۔

مثل معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کھلی اور ہموار زمین میں زوال سے پہلے ایک لکڑی گاڑ دی جائے، اس لکڑی کا سایہ آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جائے گا یہاں تک کہ زوال کے وقت کم سے کم رہ جائے گا۔ اس سائے کو ماپ لیا جائے جب یہ سایہ بڑھنا شروع ہوتو وہ اس بات کی علامت ہوگا کہ زوال ہوگیا ہے۔

پھر جب یہ سایہ اس قدر بڑھ جائے کہ لکڑی کے برابر ہو جائے (زوال کے وقت لکڑی کا ماپا ہوا سایہ الگ کرنے کے بعد) تو ایک مثل وقت ہو جائے گا اور جب دوگنا ہو جائے تو دو مثل ہو جائے گا۔ [فقہ السنۃ للشیخ عاصم الحداد (۱/ ۱۱۵)]

ایک طریقہ یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ دوپہر کے وقت سے پہلے ایک یا دو بالشت زمین کی سطح ہموار کر کے اس پر شمالاً جنوباً ایک سیدھا خط کھینچ دیا جائے۔ قطب نما سے اس خط کی رہنمائی لی جا سکتی ہے۔ پھر اس خط کے جنوبی نقطہ پر ایک سیدھی لکڑی گاڑ دیں۔ چونکہ دوپہر سے پہلے کا وقت ہوگا لہٰذا اس لکڑی کا سایہ عین اس خط پر نہیں ہوگا بلکہ اس سے قدرے مغرب کی جانب مائل ہوگا، پھر آہستہ آہستہ اس خط پر آنا شروع ہو جائے گا حتیٰ کہ بالکل اس خط پر آ جائے گا۔ اس وقت اس سایہ کی انتہا پر نشان لگا دیں اور اس سایہ کو کسی اور لکڑی سے ماپ لیں اور یہ پیمانہ محفوظ کر لیں، یہ وقت عین دوپہر کا ہوگا۔ اس کے بعد وہ سایہ مشرق کی طرف بڑھنے لگے گا۔ یہ ظہر کا اوّل وقت ہوگا، پھر اس کے بعد جب سایہ بڑھتا جائے گا تو جس لکڑی کے ساتھ اصل سائے کی پیائش کی تھی اس کے ساتھ اس کے اصل سائے کے نشان سے آگے ایک مثل جب سایہ ہو جائے گا تو وہ ظہر کا آخری وقت ہوگا اور عصر کا اوّل وقت۔

یہ طریقہ مثل معلوم کرنے کا ہے۔ اس کے لیے کچھ وقت نکال کر آپ تجربہ کریں اور شمسی مہینا کے حساب سے ہر ماہ اگر

آپ تجربہ کرتے رہیں گے تو آپ کے پاس ایک سالانہ جنتری مرتب ہو جائے گی۔عصر حاضر میں محکمہ موسمیات کی جانب سے بھی کافی سہولت ہے اور مرتب شدہ جنتریاں بھی مل سکتی ہیں جن میں ٹائم کی صحیح نشاندہی ہوتی ہے۔اگر اطمینان نہ ہو تو آدمی خود تجربہ کرکے مثل اوّل و مثل ثانی معلوم کر سکتا ہے۔

WWW. KITABOSUNNAT. COM
KITABOSUNNAT@GMAIL.COM

مساجد کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

کیا مسجد کو گرایا جا سکتا ہے؟

(سوال) کیا مسجد کو کسی مصلحت اور شدید ضرورت کے باعث کسی دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے؟ قرآن وسنت کے دلائل سے مسئلہ کی وضاحت فرما دیں۔

(جواب) جو چیز وقف کر دی جائے اسے ہبہ کرنا، فروخت کرنا یا اپنی کسی شخصی ضرورت کے لیے استعمال کرنا درست نہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے:

« فَتَصَدَّقَ عُمَرُ اَنَّهُ لَا يُبَاعُ اَصْلُهَا وَ لَا يُوْرَثُ وَ لَا يُوْهَبُ » [بخاری، کتاب الوصایا: باب الوقف کیف یکتب(۲۷۷۲)]

''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر کی زمین کو وقف کیا (اس شرط پر) کہ نہ اس کو بیچا جائے گا، نہ اس کا وارث بنا جائے گا اور نہ اسے تحفہ ہی دیا جائے گا۔''

اس حدیث میں یہ بات ہے کہ اس زمین کا اصل نہ فروخت کیا جا سکتا ہے، نہ کوئی اس کا وارث بن سکتا ہے اور نہ اسے ہبہ کیا جا سکتا ہے۔ مسجد بھی اللہ تعالیٰ کے لیے وقف ہوتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ۱۸]

''اور مسجدیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں (اس کی عبادت کے لیے) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔''

دوسری بات یہ ہے کہ مسجدیں بنانے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِبِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِى الدُّوْرِ وَ اَنْ تُنَظَّفَ وَ تُطَيَّبَ »

[ابو داؤد، کتاب الصلاۃ: باب اتخاذ المساجد فی الدور(۴۵۵)]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلوں میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ان کو صاف ستھرا اور خوشبودار رکھا جائے۔''

مسجد کو گرانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہے۔ اس لیے مسجد کو بلاوجہ گرانا یا کسی شخص کا صرف اپنے تصرف میں لے آنا اور اسے فروخت کرنا درست نہیں۔ ہاں اگر مسجد ایسی جگہ ہے جہاں لوگ اس سے مستفید نہیں ہو سکتے یا وہ کہیں راستے میں ہے، جس سے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی ہے یا کسی اور مصلحت کے لیے مسجد ایک جگہ سے ختم کر کے دوسری جگہ تعمیر کرنا درست ہے۔

اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ کوفہ میں کسی نے مسلمانوں کے بیت المال کو نقب لگا کر چوری کر لیا۔ نقب لگانے والا بھی پکڑا

گیا۔ اس وقت بیت المال کے نگران حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا تو انھوں نے جواب دیا:

« أَنِ انْقُلِ الْمَسْجِدَ وَ صَيِّرْ بَيْتَ الْمَالِ فِيْ قِبْلَتِهِ »

”مسجد کو یہاں سے اس طرح منتقل کرلو کہ بیت المال مسجد کے قبلہ میں آ جائے۔“

کیونکہ مسجد میں کوئی نہ کوئی نمازی تو ضرور ہوتا ہے۔ اس سے بیت المال محفوظ ہو جائے گا، تو حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ نے مسجد وہاں سے ختم کر کے کھجوروں کی منڈی میں بنادی اور منڈی کو مسجد والی جگہ منتقل کر دیا اور یوں بیت المال بھی مسجد کے قبلہ میں بن گیا۔ [فتاویٰ ابن تیمیہ]

یہ سب کچھ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں ہو رہا تھا، کسی نے بھی اس سے نہ روکا۔ اگر یہ کام درست نہ ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کا ضرور انکار کرتے۔

ایک اور دوسری دلیل جس سے اہل علم استدلال کرتے ہیں وہ صحیحین کی حدیث ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

« لَوْ لَا اَنَّ قَوْمَكِ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ لَأَمَرْتُ بِالْبَيْتِ فَهُدِمَ فَأَدْخَلْتُ فِيْهِ مَا أُخْرِجَ مِنْهُ وَ أَلْزَقْتُهُ بِالْاَرْضِ وَ جَعَلْتُ لَهُ بَابَيْنِ ...... » [بخاری، کتاب الحج: باب فضل مكة و بنيانها (١٥٨٦)، مسلم، كتاب الحج: باب نقض الكعبة و بنائها (١٣٣٣)]

”اگر تیری قوم میں نئے نئے مسلمان نہ ہوتے تو میں کعبہ کی عمارت کو گرانے کا حکم دے دیتا تاکہ (نئی تعمیر میں) اس حصہ کو بھی داخل کردوں جو اس سے باہر رہ گیا ہے اور اس کی کرسی زمین کے برابر کردوں اور اس کے دو دروازے بنا دیتا (ایک اندر جانے کے لیے اور دوسرا نکلنے کے لیے)۔“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وقف شدہ عمارت وغیرہ کو تبدیل کرنا جائز ہے۔ ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ اظہار نہ کرتے۔ مسجد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بھی تبدیلی کی ایک قسم ہے لہٰذا جائز ہے۔ لیکن یہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہو اور کسی فتنے کا اندیشہ نہ ہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے متعلق اپنی خواہش کے اظہار کے باوجود فتنے سے بچنے کے لیے ایسا نہ کیا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ جس چیز کی نذر مانی گئی ہو وہ بھی وقف ہو جاتی ہے۔ اس کو تبدیل کرنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے ثابت ہے۔ مثلاً ایک شخص نذر مانتا ہے کہ میں اپنے گھر کو مسجد بناؤں گا، پھر وہ اس سے زیادہ اچھی جگہ مسجد بنوا دیتا ہے تو یہ درست ہے۔ اس کی دلیل صحیح حدیث ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص فتح مکہ کے موقع پر کھڑا ہوا اور اس نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح کر دیا تو میں بیت المقدس جا کر نماز پڑھوں گا۔“ آپ نے اسے کہا: « صَلِّ هٰهُنَا »

''یہیں مسجد نبوی میں نماز پڑھ لو۔'' اس نے پھر وہی بات کی۔ نبی کریم ﷺ نے اسے پھر یہی جواب دیا۔ اس نے تیسری مرتبہ یہی دہرایا تو آپ نے فرمایا: « فَشَأْنُكَ إِذًا » ''پھر جیسے چاہے کر۔'' اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« وَ الَّذِیْ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ لَوْ صَلَّیْتَ هٰهُنَا لَاَجْزَأَ عَنْكَ صَلَاةً فِیْ بَیْتِ الْمَقْدِسِ »

[ابو داؤد، كتاب الأيمان والنذور: باب من نذر أن يصلي في بيت المقدس (٣٣٠٥، ٣٣٠٦)]

''اس ذات کی قسم جس نے محمد (ﷺ) کو حق کے ساتھ مبعوث کیا اگر تو یہاں (مسجد نبوی) میں نماز پڑھتا تو یہ تجھے بیت المقدس میں نماز پڑھنے سے کفایت کر جاتی۔''

مزین مساجد اور منقش جائے نماز پر نماز کا حکم

سوال مساجد کو مزین کرنا کیسا ہے؟ نیز ایسی مساجد میں اور منقش جائے نماز پر پڑھی جانے والی نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب مساجد کا اصل مقصد یہ ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر، تلاوت قرآن اور نماز جیسی عبادات سرانجام دی جائیں اور یہی مساجد کی آبادی ہے۔ لیکن آج کل مساجد کی تعمیر میں نقش و نگار اور بیل بوٹوں پر زر کثیر صرف کیا جا رہا ہے، لیکن عبادات کی طرف توجہ کم ہو گئی ہے۔ نمازیوں کی تعداد میں کم ہو رہی ہے اور مساجد و عبادت گاہوں کی گلکاری میں بہت زور دیا جا رہا ہے۔ یہ قیامت کی نشانی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَتَبَاهَی النَّاسُ فِی الْمَسَاجِدِ » [ابوداؤد، ابواب المساجد: باب في بناء المساجد (٤٤٩)، نسائی (٦٩٠)، ابن ماجه (٧٣٩)، شرح السنة (٣٥٠/٢)، ابن حبان (٣٠٨)، دارمی (٢٦٨/١)، ابو يعلى (١٨٥/٥)، احمد (١٣٤/٣، ١٥٢) طبرانی کبير (٧٥٢)، طبرانی صغير (١١٤/٢)]

''قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ لوگ مسجدوں کے بارے میں فخر کرنے لگیں گے۔''

ابن خزیمہ، ابو یعلی اور شرح السنہ میں یہ الفاظ ہیں:

« یَأْتِیْ عَلٰی أُمَّتِیْ زَمَانٌ یَتَبَاهَوْنَ بِالْمَسَاجِدِ ثُمَّ لَا یَعْمُرُوْنَهَا اِلَّا قَلِیْلًا »

''میری امت پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ مسجدوں پر فخر کریں گے، انھیں بہت تھوڑا آباد کریں گے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« لَتُزَخْرِفُنَّهَا كَمَا زَخْرَفَتِ الْیَهُوْدُ وَ النَّصَارٰی » [سبل السلام (٣٤٧/١)، فتح العلام (٢١٤/١)]

''تم مساجد کو ضرور یہود و نصاریٰ کی طرح منقش کرو گے۔''

اور آج کل بالکل یہی کیفیت ہے کہ مساجد کو اس قدر منقش کر دیا گیا ہے کہ نمازی کا خشوع و خضوع متاثر ہوتا ہے اور اللہ کی طرف توجہ میں خلل اندازی ہوتی ہے۔ مناسب ہے کہ مساجد کی دیواریں، محراب اور جائے نماز سادہ ہوں کیونکہ نبی ﷺ نے دیوار پر لٹکے ہوئے پردے کو صرف اس لیے اتروا دیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کی نماز سے توجہ ہٹاتا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے:

« كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا سَتَرَتْ بِهِ جَانِبَ بَيْتِهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمِيْطِيْ عَنَّا قِرَامَكِ هٰذَا فَاِنَّهُ لَا تَزَالُ تَصَاوِيْرُ تَعْرِضُ فِيْ صَلَاتِيْ » [بخاری، کتاب الصلاة: باب إن صلى في ثوب مصلب أو تصاوير هل تفسد صلاته(٣٧٤) احمد (١٥١/٣، ٢٨٣)]

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک پردہ تھا جوانھوں نے اپنے گھر کی دیوار پر لٹکایا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ پردہ ہم سے دور کر دو (یعنی دیوار سے اتار دو) اس کی تصویریں نماز میں میرے سامنے پھرتی رہتی ہیں۔''

علامہ محمد بن اسماعیل امیر یمنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فِي الْحَدِيْثِ دَلَالَةٌ عَلٰى اِزَالَةِ مَا يُشَوِّشُ عَلَى الْمُصَلِّيْ صَلَاتَهُ مِمَّا فِيْ مَنْزِلِهِ اَوْ فِيْ مَحَلِّ صَلَاتِهِ " [سبل السلام(٤٣٧/١)، فتح العلام (٢١٤/١)]

''اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو چیز نمازی کی نماز میں تشویش کا باعث ہو اسے زائل کر دینا چاہیے۔ وہ چیز اس کے گھر میں ہو یا نماز پڑھنے والی جگہ میں۔''

نواب صدیق الحسن خاں رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح کی عبارت منقول ہے۔ [مسك الختام(٣٣٩/١)]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ صَلّٰى فِيْ خَمِيْصَةٍ لَهَا اَعْلَامٌ فَنَظَرَ اِلٰى اَعْلَامِهَا نَظْرَةً فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ: اذْهَبُوْا بِخَمِيْصَتِيْ هٰذِهِ اِلٰى اَبِيْ جَهْمٍ وَ ائْتُوْنِيْ بِاَنْبِجَانِيَّةِ اَبِيْ جَهْمٍ فَاِنَّهَا اَلْهَتْنِيْ آنِفًا عَنْ صَلَاتِيْ » وَ فِيْ رِوَايَةٍ «كُنْتُ اَنْظُرُ اِلٰى عَلَمِهَا وَ اَنَا فِي الصَّلَاةِ فَاَخَافُ اَنْ تَفْتِنَنِيْ »

[بخاری، کتاب الصلاة: باب إذا صلى في ثوب له أعلام و نظر الى علمها(٣٧٣)، مسلم(٥٥٦)]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونی چادر میں نماز پڑھی جس میں دھاریاں تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نظر ان دھاریوں کی طرف دیکھا۔ جب نماز سے سلام پھیرا تو فرمایا: ''میری یہ اونی چادر ابوجہم کو واپس کر دو اور کڑھائی کے بغیر لے کر آؤ۔ اس کڑھائی والی چادر نے ابھی مجھے میری نماز سے غافل کر دیا۔'' دوسری روایت میں ہے: ''میں نماز میں اس کی طرف دیکھنے لگا تو مجھے ڈر لاحق ہوا کہ یہ مجھے فتنہ میں ڈال دے گی۔''

اس حدیث کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَفِيْهِ الْحَثُّ عَلٰى حُضُوْرِ الْقَلْبِ فِي الصَّلَاةِ وَ تَدَبُّرِ مَا ذَكَرْنَا هَا وَ مَنْعِ النَّظْرِ مِنَ الْاِمْتِدَادِ اِلٰى مَا يُشْغِلُ وَ اِزَالَةُ مَا يُخَافُ اِشْتِغَالُ الْقَلْبِ بِهِ وَ كَرَاهِيَةُ تَزْوِيْقِ مِحْرَابِ الْمَسْجِدِ وَ حَائِطِهِ وَ نَقْشِهِ وَ غَيْرِ ذٰلِكَ مِنَ الشَّاغِلَاتِ لِاَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ جَعَلَ الْعِلَّةَ فِيْ اِزَالَةِ الْخَمِيْصَةِ هٰذَا الْمَعْنٰى " [شرح مسلم (٣٨/٥)]

''اس حدیث میں نماز کے اندر حضور قلب اور ذکر و تلاوت اور مقاصد نماز پر تدبر کرنے میں رغبت دلائی گئی ہے اور جو چیز نماز سے بے خبر کرتی ہے اس کی طرف نظر ڈالنے کی ممانعت، جو چیز نماز سے بے خبر کرتی ہے اس کا ازالہ، مسجد کے محراب اور اس کی دیواروں کو منقش کرنا اور اس جیسی دیگر بے خبر کرنے والی اشیاء کی کراہت ہے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ نے دھاری دار چادر کو ہٹا دینے کی یہی علت ذکر کی ہے۔''

ان صحیح احادیث اور شارحین حدیث کی تشریحات سے معلوم ہوا کہ مساجد کے در و دیوار اور محراب کو منقش کرنا، شیشے وغیرہ سے مزین کرنا، بیل بوٹے والے جائے نماز اور ان جیسی دیگر اشیاء کا استعمال مکروہ ہے جو نماز سے نمازی کی توجہ ہٹاتی ہیں اور خشوع وخضوع اور تذلل و عاجزی میں کمی کرتی ہیں۔ تاہم اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی کیونکہ نبی ﷺ نے اپنی نماز دوبارہ ادا نہیں فرمائی اور نہ نماز کو توڑا ہی ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ نماز تو ہوگئی مگر توجہ بٹ گئی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ شیشے اور بیل بوٹے والی جائے نماز یا منقش محراب نہ بنایا جائے۔ کیونکہ یہ اشیاء نماز سے توجہ ہٹاتی ہیں۔

جنبی کا مسجد میں داخل ہونا

سوال حالتِ جنابت میں کسی شخص کا مسجد میں داخل ہونا اور گزرنا کیسا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب حالت جنابت میں مسجد سے گزرنا پڑے تو اضطراری صورت میں گزر سکتے ہیں لیکن وہاں جنابت کی حالت میں ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ﴾ [النساء:٤٣]

''اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ حتی کہ جو بات منہ سے نکالتے ہو اس کو سمجھنے لگو، اسی طرح حالت جنابت میں بھی مگر راہ چلتے ہوئے حتیٰ کہ تم غسل کرلو۔''

اکثر سلف صالحین جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن مسیب، امام ضحاک، حسن بصری، عکرمہ، نخعی اور زہری رحمہم اللہ وغیرہ کے نزدیک یہاں '' الصلاۃ'' سے مراد مواضع صلاۃ یعنی مساجد ہیں۔ امام ابن جریر نے اسے راجح قرار دیا ہے۔ [تفسیر ابن جریر، معالم التنزیل(١/ ٤٣١)]

اور یہی جمہور علماء کا مسلک ہے کہ جنبی کے لیے مسجد سے گزرنا جائز ہے وہاں ٹھہرنا جائز نہیں۔

مستند روایات میں آتا ہے کہ بعض صحابہ کے گھر مسجد کی طرف اس طرح کھلتے تھے کہ بغیر مسجد سے گزرے وہ مسجد سے باہر نہیں جاسکتے تھے اور گھروں میں غسل کے لیے پانی نہیں ہوتا تھا۔ جنابت کی حالت میں مسجد سے گزرنا ان پر گراں گزرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جیسا کہ تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں موجود ہے۔

چھوٹے بچوں کا مسجد میں آنا

(سوال) کیا والدین اپنے ساتھ چھوٹے بچوں کو مساجد میں لا سکتے ہیں؟ قرآن وسنت سے جواب دیں۔

(جواب) مسجدوں میں چھوٹے بچوں اور بچیوں کا آنا شرعاً جائز و مستحب ہے بشرطیکہ وہ پاک صاف ہوں۔① حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ وَ هُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتَ زَيْنَبَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ لِأَبِيْ الْعَاصِ بْنِ رَبِيْعَةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا وَ إِذَا قَامَ حَمَلَهَا » [بخاری، کتاب الصلوة، باب اذا حمل جارية صغيرة على عنقه فى الصلاة (٥١٦) ، مؤطا، کتاب قصر الصلاة: باب جامع الصلاة(٨١)، مسلم (٥٤٣)، شرح السنة(٢٦٣/٢)، ابوداؤد (٩١٧)]

”رسول اللہ ﷺ اپنی نواسی امامہ بنت زینب کو اٹھائے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے جو ابوالعاص بن ربیع کی بیٹی تھیں۔ جب آپ ﷺ سجدے میں جاتے تو اسے نیچے بیٹھا دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اٹھا لیتے۔“

② حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَخْطُبُ فَجَاءَ الْحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا وَ عَلَيْهِمَا قَمِيْصَانِ اَحْمَرَانِ يَعْثُرَانِ فِيْهِمَا فَنَزَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَطَعَ كَلَامَهُ فَحَمَلَهُمَا ثُمَّ عَادَ إِلَى الْمِنْبَرِ ثُمَّ قَالَ صَدَقَ اللّٰهُ : ﴿ إِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾ رَاَيْتُ هٰذَيْنِ يَعْثُرَانِ فِيْ قَمِيْصَيْهِمَا فَلَمْ اَصْبِرْ حَتّٰى قَطَعْتُ كَلَامِيْ فَحَمَلْتُهُمَا » [نسائی، کتاب الجمعة: باب نزول الامام عن المنبر قبل فراغه من الخطبة و قطعه كلامه (١٤١٤)، ابوداؤد (١١٠٩) ، ترمذی (٣٧٧٤)، ابن ماجه(٣٦٠٠)، احمد(٣٥٤/٥)]

”رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ اس دوران حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما سرخ قمیص زیب تن کیے گرتے ہوئے آگئے تو رسول اللہ ﷺ منبر سے نیچے اترے، اپنا کلام منقطع کیا پھر ان دونوں کو اٹھا کر منبر پر تشریف لے آئے اور فرمایا:”اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے:”تمھارے مال اور اولاد فتنہ ہیں۔“ میں نے ان دونوں بچوں کو گرتے ہوئے قمیصوں میں دیکھا تو صبر نہ کر سکا، یہاں تک کہ میں نے اپنی بات کو روک کر انھیں اٹھا لیا۔“

③ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنِّيْ لَاَقُوْمُ فِي الصَّلَاةِ أُرِيْدُ اَنْ أُطَوِّلَ فِيْهَا فَاَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَاَتَجَوَّزُ فِيْ صَلَاتِيْ كَرَاهِيَةَ اَنْ اَشُقَّ عَلٰى أُمِّهٖ » [بخاری، کتاب الاذان ، باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي(٧٠٧)]

"میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو ارادہ کرتا ہوں کہ قراءت لمبی کروں، مگر میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اپنی نماز مختصر کر دیتا ہوں، اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ اس کی ماں کو مشقت میں ڈال دوں۔"

④ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ مَعَ أُمِّهِ وَ هُوَ فِي الصَّلَاةِ فَيَقْرَأُ بِالسُّوْرَةِ الْخَفِيْفَةِ أَوْ بِالسُّوْرَةِ الْقَصِيْرَةِ » [مسلم، كتاب الصلاة: باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة فى تمام (٤٧٠)، ترمذى (٣٧٦)، احمد(١٠٩/٣)]

"نماز کی حالت میں رسول اللہ ﷺ ماں کے ساتھ (آئے ہوئے) بچے کی رونے کی آواز سنتے تو چھوٹی سورت تلاوت کرتے۔"

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ بچوں کو مسجد میں لانا جائز ہے، لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ بچے صاف ستھرے ہوں اور مسجد میں گندگی و ناپاکی نہ پھیلے۔

امام نووی رحمہ اللہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

" وَ فِيْهِ جَوَازُ صَلَاةِ النِّسَاءِ مَعَ الرِّجَالِ فِي الْمَسْجِدِ وَ أَنَّ الصَّبِيَّ يَجُوْزُ إِدْخَالُهُ الْمَسْجِدَ وَ إِنْ كَانَ الْأَوْلٰى تَنْزِيْهُ الْمَسْجِدِ عَمَّنْ لَا يُؤْمَنُ مِنْهُ حَدَثٌ" [شرح مسلم(١٥٦/٤)]

"اس حدیث میں مسجد میں مردوں کے ہمراہ عورتوں کے نماز پڑھنے کا جواز ہے۔اسی طرح بچوں کو مسجد میں لانا بھی جائز ہے، اگرچہ جس (بچہ) کی ناپاکی سے بچا نہیں جا سکتا اس سے مسجد کو بچانا ہی اولیٰ و بہتر ہے۔"

نیز وہ روایت صحیح نہیں جس میں یہ الفاظ ہیں:

« جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ » [حاشية شرح السنة(٢٦٥/٣)، كشف الخفاء و مزيل الالباس (٣٣٤/١)، المقاصد الحسنة (١٧٥)، الفوائد المجموعة فى الأحاديث الموضوعة(٢٥)، تحقيق مختصر المقاصد (١٠٨)]

"اپنی مسجدوں کو بچوں سے بچاؤ۔"

حافظ عراقی، حافظ ابن حجر اور امام نووی رحمہم اللہ وغیرہم نے اس روایت کو انتہائی ضعیف قرار دیا ہے۔ امام بزار اور امام عبد الحق الاشبیلی رحمہما اللہ نے کہا ہے: "اس کی کوئی اصل نہیں۔"

یاد رہے کہ اگر بچے مسجد میں شور مچائیں یا نمازیوں کے لیے تشویش کا باعث بنیں تو ایسی صورت میں بچوں کو مسجد میں لانا جائز تو ہے لیکن واجب نہیں اور امر جواز پر اصرار کرنا درست نہیں، بالخصوص جب مسجد میں بچوں کی وجہ سے جھگڑا و فساد وغیرہ کھڑا ہو تو جواز پر اصرار کرنا مکروہ ہو گا۔ اس کی مثال یہ سمجھ لیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ایک باب یوں قائم کیا ہے: " بَابُ الْإِنْفِتَالِ وَ الْإِنْصِرَافِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ الشِّمَالِ " (یعنی نماز مکمل کر کے دائیں اور بائیں جانب پلٹنے کا

بیان) پھر اس کے تحت ذکر کرتے ہیں:

« وَ كَانَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ يَنْفَتِلُ عَنْ يَمِيْنِهِ وَ عَنْ يَسَارِهِ وَ يَعِيْبُ عَلٰى مَنْ يَّتَوَخّٰى اَوْ مَنْ يَّعْمِدُ الْاِنْفِتَالَ عَنْ يَمِيْنِهِ »

'' حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ دائیں اور بائیں دونوں جانب پھر کر بیٹھتے تھے اور جو آدمی جان بوجھ کر دائیں جانب سے پھر کر بیٹھتا اس پر اعتراض کرتے تھے۔''

اس کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث درج کی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« لَا يَجْعَلُ اَحَدُكُمْ لِلشَّيْطَانِ شَيْئًا مِّنْ صَلَاتِهِ يَرٰى اَنَّ حَقًّا عَلَيْهِ اَنْ لَا يَنْصَرِفَ اِلَّا عَنْ يَمِيْنِهِ لَقَدْ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَثِيْرًا يَنْصَرِفُ عَنْ يَسَارِهِ » [بخاری، کتاب الأذان: باب الانفتال والإنصراف (٨٥٢)]

'' تم میں سے کوئی آدمی اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کرے کہ خواہ مخواہ یہ سمجھے کہ دائیں طرف سے پھر کر بیٹھنا ہی لازم ہے۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت دفعہ دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بائیں جانب پھرتے تھے۔''

اس باب اور حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز سے سلام پھیر کر دائیں اور بائیں دونوں جانب پھرنا درست و جائز ہے لیکن اگر اس جائز کام کو کوئی شخص لازم جان لے اور صرف ایک طرف ہی پھرنے پر اصرار کرے تو یہ شیطان کی کارستانی ہے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے واضح ہے۔ شارح بخاری امام ابن منیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فِيْهِ اَنَّ الْمَنْدُوْبَاتِ قَدْ تَتَقَلَّبُ مَكْرُوْهَاتٍ اِذَا رُفِعَتْ عَنْ رُتْبَتِهَا لِاَنَّ التَّيَامُنَ مُسْتَحَبٌّ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ اَيْ مِنْ اُمُوْرِ الْعِبَادَةِ لٰكِنْ لَمَّا خَشِيَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ اَنْ يَّعْتَقِدُوْا وُجُوْبَهٗ اَشَارَ اِلٰى كَرَاهَتِهِ " [فتح الباری(٣٣٨/٢)، إرشاد الساری(١٤٥/٢)، مرعاة المفاتيح(٣٠١/٣)]

'' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بلاشبہ مباح امور اس وقت مکروہ ہو جاتے ہیں جب انھیں ان کے مقام سے بلند کر دیا جائے۔ اس لیے کہ عبادت کے تمام امور میں دائیں جانب کا لحاظ رکھنا مستحب ہے لیکن جب عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس بات کا خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں لوگ دائیں طرف پھرنے کو واجب نہ سمجھنے لگیں تو انھوں نے اس کے مکروہ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔''

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فِيْهِ اَنَّ مَنْ اَصَرَّ عَلٰى اَمْرٍ مَنْدُوْبٍ وَ جَعَلَهٗ عَزْمًا وَ لَمْ يَعْمَلْ بِالرُّخْصَةِ فَقَدْ اَصَابَ مِنْهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْاِضْلَالِ فَكَيْفَ بِمَنْ اَصَرَّ عَلٰى بِدْعَةٍ اَوْ مُنْكَرٍ " [شرح الطیبی علی مشکوة المصابیح (١٠٥١/٣) ، مرعاة المفاتيح(٣٠١/٣)، مرقاة المفاتيح (٣١/٣)]

'' اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو آدمی کسی مندوب و مباح کام پر اصرار کرے اور اسے لازم قرار دے لے اور

رخصت پر عمل نہ کرے تو اسے شیطان نے گمراہ کر دیا ہے۔ جب مباح و جائز کام پر اصرار کا یہ حال ہے تو جو شخص کسی بدعت یا منکر پر اصرار کرے اس کا نتیجہ کیسا ہوگا۔''

مذکورہ بالا صحیح احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ نابالغ چھوٹے بچوں اور بچیوں کا مسجد میں آنا جائز و درست ہے لیکن اگر یہ بچے نمازیوں کی نماز میں خلل اور مسجد میں فتنہ وفساد کا باعث بن جائیں تو انھیں مسجد میں لانے سے گریز کیا جا سکتا ہے۔

مسجد میں گردنیں پھلانگ کر آگے آنا

(سوال) جو شخص جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے آئے اس کے بارے میں کتاب سنت کا کیا حکم ہے؟

(جواب) جمعہ والے دن جب مسجد میں تشریف لائیں تو جہاں جگہ مل جائے بیٹھ جائیں، لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آگے جگہ حاصل کرنا مقصود ہو تو جلدی مسجد میں تشریف لائیں تا کہ اگلی صف میں جگہ مل جائے اور پہلے آنے کا ثواب بھی مل جائے۔ عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''جمعہ کے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے آگے آنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے لوگوں کو ایذا پہنچائی ہے اور (آنے میں) دیر کی ہے۔''

[نسائی، كتاب الجمعة: باب النهي عن تخطّي رقاب الناس: (١٣٩٨)]

معلوم ہوا کہ لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنا درست نہیں، جہاں جگہ ملے بیٹھ جانا چاہیے۔

ممنوعہ اوقات میں تحیۃ المسجد پڑھنا

(سوال) کیا تحیۃ المسجد پڑھنا ضروری ہے اور کیا یہ رکعات ممنوعہ اوقات میں بھی ادا کی جا سکتی ہیں؟

(جواب) ہمارے نزدیک سب سے زیادہ صحیح موقف یہ ہے کہ تحیۃ المسجد کی رکعات کسی وقت بھی ادا کی جا سکتی ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم عام ہے جیسا کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يَّجْلِسَ » [بخاری، کتاب الصلاۃ، باب اذا دخل المسجد فلیرکع رکعتین(٤٤٤)، مؤطا (١٦٢/١)، مسلم (٧١٤)، ترمذی(٣١٦)، شرح السنة(٣٦٥/٢)]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں ادا کرے۔''

سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے:

« دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ جَالِسٌ بَيْنَ ظَهْرَانَيِ النَّاسِ قَالَ فَجَلَسْتُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَرْكَعَ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ تَجْلِسَ؟

قَالَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! رَأَيْتُكَ جَالِسًا وَ النَّاسُ جُلُوْسٌ قَالَ فَإِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِسْ حَتّٰى يَرْكَعَ رَكْعَتَيْنِ » [مسلم، كتاب صلاة المسافرين: باب استحباب تحية المسجد بركعتين (٧١٤)، احمد (٣٠٥/٥)]

''میں مسجد میں داخل ہوا تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تجھے بیٹھنے سے قبل دو رکعتیں پڑھنے میں کیا چیز مانع ہوئی؟'' میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو اور لوگوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا (تو میں بیٹھ گیا)۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب بھی تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو دو رکعتیں ادا کرنے سے پہلے نہ بیٹھے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ان دو رکعتوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ سیدنا ابوقتادہ جب دو رکعتیں پڑھے بغیر بیٹھ گئے تو آپ ﷺ نے دو رکعتیں نہ پڑھنے کی وجہ پوچھی، پھر عام حکم دیا کہ مسجد میں داخل ہونے والا شخص دو رکعت ادا کیے بغیر نہ بیٹھے۔
ان دو رکعتوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جمعہ والے دن دوران خطبہ کسی شخص کو بولنے کی اجازت نہیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ أُسْكُتْ وَ الْإِمَامُ يَخْطُبُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَقَدْ لَغَوْتَ » [مسلم، كتاب الجمعة : باب فى الإنصات يوم الجمعة فى الخطبة(٨٥١)، مؤطا(١٠٣/١)، شرح السنة(٢٥٨/٤)]

''جب تم نے جمعہ والے دن امام کے خطبہ کے دوران اپنے ساتھی سے کہا ''چپ ہو جاؤ'' تو تم نے بیکار بات کی۔''

لیکن دوران خطبہ اگر کوئی شخص دو رکعت ادا کیے بغیر بیٹھے تو اسے بھی اس دوران دو رکعت ادا کرنے کا حکم ہے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« دَخَلَ رَجُلٌ الْمَسْجِدَ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَخْطُبُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَقَالَ : اَصَلَّيْتَ ؟ قَالَ لَا ، قَالَ : قُمْ فَصَلِّ الرَّكْعَتَيْنِ »[مسلم، كتاب الجمعة : باب التحية والامام يخطب (٨٧٥)، احمد(٢٩٧/٣)، ترمذى(٥١٠)]

''ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور اس وقت رسول اللہ ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے تو آپ ﷺ نے دریافت کیا: ''کیا تو نے نماز پڑھی ہے؟'' اس نے کہا: نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کھڑے ہو جاؤ اور دو رکعتیں ادا کرو۔''

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے کہ حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ جمعہ کے روز اس وقت مسجد میں آئے جب آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے تو وہ بیٹھ گئے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب بھی تم میں سے کوئی شخص جمعہ والے دن مسجد میں آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو دو (قدرے) ہلکی رکعتیں ادا کرے، پھر بیٹھے۔'' [مسلم، كتاب الجمعة : باب التحية والإمام يخطب(٨٧٥)]

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ جب بھی کوئی آدمی مسجد میں داخل ہو تو اسے دو رکعتیں پڑھے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیے۔
یہ دو رکعت پڑھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ سبب والی نمازوں میں سے ہے، جیسا کہ طواف کی نماز، سورج گرہن کی

نماز، ایسی تمام نمازیں ممنوعہ اوقات میں بھی ادا کی جاسکتی ہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے نماز کسوف کے متعلق فرمایا ہے:

« اِنَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ اٰیَتَانِ مِنْ آیَاتِ اللّٰهِ » [بخاری، کتاب الکسوف: باب الدعاء فی الکسوف (۱۰۶۰)]

''بے شک سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔''

مساجد میں عورتوں کے اجتماعات کا کیا حکم ہے؟

سوال کیا خواتین مساجد میں تبلیغی اجتماعات منعقد کرسکتی ہیں؟ قرآن وسنت کی رو سے جواب دیں۔

جواب دعوت وتبلیغ ہر مسلمان کا حق ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اللہ وحدہ لاشریک لہ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جس طرح مردوں کا وظیفہ ذکر کیا ہے اسی طرح عورتوں کے بارے میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [التوبة: ۷۱]

''مومن مرد وزن آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اچھی بات کا حکم کرتے ہیں اور بری بات سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بہت جلد رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ غلبے والا اور حکمت والا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ مومن مرد اور مومنہ عورت کی صفات وخوبیوں سے ایک خوبی اور صفت امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے، جس طرح مرد کو اچھی بات کہنے اور بری بات سے روکنے کا حکم ہے اسی طرح عورت کو بھی یہ حق ہے کہ وہ اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے منع کرے۔ یاد رہے صدرِ اول میں مردوں کے اجتماعات شکل وصورت کے اعتبار سے ہمارے آج کے جلسوں اور کانفرنسوں کی طرح نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا جواز دعوت وتبلیغ کی عمومی آیات واحادیث سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح عورتوں کا معاملہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے لیے بھی دعوت وتبلیغ کا ہر وہ طریقہ درست ہوگا جس میں وہ شرعی حدود کا خیال رکھتے ہوئے اپنے گھر سے نکلیں مثلاً عورت باپردہ ہو، مہکنے والی خوشبو لگا کر نہ نکلے، فیشن ایبل ہو کر نہ نکلے اور مردوں سے اختلاط نہ ہو۔ اس طرح اجتماعات میں شریک نہ ہوں جیسے آج کل گلوکارائیں اور اداکارائیں فیشن ایبل ہو کر سٹیج پر نمودار ہوتی ہیں۔ یوں معلوم نہ ہو کہ وہ کسی فیشن شو یا حسن وآرائش کے مقابلہ کے لیے آئی ہیں بلکہ مکمل طور پر شرعی لباس میں ملبوس اور آرائش ونمائش سے مبرا ہو کر دعوت وتبلیغ کے اجتماعات میں آئیں اور اگر تبلیغی اجتماع گھر سے دور ہو تو ایسے سفر پر نکلنے کے لیے اپنے محرم کو ساتھ لے کر جائیں۔ محرم کے بغیر بالکل سفر نہ کریں۔ ان تمام شرعی حدود کو مدنظر رکھ کر عورتیں مساجد میں اپنا دعوت وتبلیغ کا پروگرام منعقد کرسکتی ہیں۔ مساجد دین اسلام کا شعائر ہیں اور ان

کا مقصد انھیں آباد کرنا ہے اور مساجد کی آبادی نماز، روزہ، تلاوت، ذکر و اذکار، قرآن وسنت کی تعلیم وتبلیغ اور عبادات ہی سے ممکن ہے۔ جس طرح مسجد کو آباد کرنے کا مرد کو حق ہے، بالکل اسی طرح عورت کا بھی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَمْنَعُوا النِّسَاءَ حُظُوظَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ إِذَا اسْتَأْذَنَّكُمْ» [مسلم، كتاب الصلاة: باب خروج النساء الى المساجد(٤٤٢)]

''جب عورتیں تم سے اجازت طلب کریں تو ان کو مساجد کے حصے سے منع نہ کرو۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ مساجد میں عورتوں کا بھی حصہ ہے اور اس عموم میں تبلیغی و اصلاحی اور اسلامی اجتماعات بھی شامل ہیں۔ اسی طرح عورتوں کا مسجد میں اعتکاف بیٹھنا اور مردوں کے پیچھے آ کر نماز پڑھنا اور عیدگاہ جو مسجد کے حکم میں ہے وہاں عورتوں کو حاضر ہونے کی تاکید کرنا اور بعض بے سہارا خواتین کا مسجد نبوی میں قیام کرنا وغیرہ جیسے امور اس بات کے مؤید ہیں کہ عورت کو بھی مسجد میں قیام کی اجازت ہے اور مسجد میں قیام کا مقصد مسجد میں ذکر اللہ، عبادات اور وعظ ونصیحت ہے۔ لہٰذا عورتیں شرعی حدود میں رہتے ہوئے مردوں کے اختلاط سے اجتناب کرتے ہوئے مسجد میں تبلیغی اجتماع اور دعوت و اصلاح کے پروگرام منعقد کر سکتی ہیں۔ اس میں کوئی شرعی مانع موجود نہیں۔

مسجد میں اعلانات

سوال مسجد میں جنازے کے اعلان کے علاوہ اعلان کرنا مثلاً کسی کی کوئی چیز گم ہوگئی یا کسی بندے کو بلانا ہو وغیرہ، جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو معسکرات کی مساجد میں یہ اعلان کیوں کیے جاتے ہیں کہ فلاں کلاس کا فلاں گروپ اس بستی میں چلا جائے؟ اس کی شرعی دلیل دیں۔

جواب مساجد میں جن اعلانات سے روکا گیا ہے، ان میں گمشدہ چیز کا اعلان ہے جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص کسی آدمی کو مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو وہ اسے کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ تیری چیز تجھ پر نہ لوٹائے کیونکہ مسجدیں اس لیے نہیں بنائی گئیں۔'' [صحیح مسلم، کتاب المساجد: باب النهی عن تشد الضالة (٥٦٨)]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم کسی آدمی کو مسجد میں خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھو تو اسے کہہ دو کہ اللہ تیری تجارت میں نفع نہ دے۔'' [ترمذی کتاب بالأحکام: باب النهی عن البیع فی المسجد (١٣٢١)]

جنازے کے اعلان کو مستثنیٰ کرنے کی بھی کوئی دلیل نہیں۔ [اصلاح المساجد: (ص/١٦٠)]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد میں گمشدہ چیز کا اعلان اور اشیاء کی خرید وفروخت منع ہے، ایسا کام کرنے والے کے لیے بد دعا کی گئی ہے۔ جبکہ مساجد میں مختلف دینی امور کی تقسیم کے لیے افراد کی ذمہ داریاں تقسیم کرنا منع نہیں ہے۔ معسکرات کی مساجد میں ذمہ داریاں تقسیم کی جاتی ہیں جیسے پہرے کے لیے بھیجنا، کھانا تقسیم کرنا، سونے کے لیے کہہ دینا تو ایسے امور کی ممانعت میں کوئی دلیل مجھے معلوم نہیں ۔ رسول اللہ ﷺ اپنے امور کے فیصلے مسجد ہی میں کیا کرتے تھے۔

مسجد میں سترے کی ضرورت

(سوال) کیا مسجد میں نماز کے لیے سترہ ضروری ہے؟ بعض لوگ اسے صحرا کے لیے خاص سمجھتے ہیں۔ صحیح بات کی طرف رہنمائی فرمادیں۔

(جواب) جب آدمی نماز ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان اسے مختلف وساوس میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے حتی کہ کبھی اس قدر حائل ہوتا ہے کہ اسے بھول جاتا ہے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ اس شیطانی حملے سے بچنے کے لیے شریعت اسلامیہ نے جہاں کئی ایک اعمال صالحہ بتائے ہیں وہاں اس بات کی بھی تاکید فرمائی ہے کہ نمازی کو اپنے سامنے کوئی ایسی چیز رکھنی چاہیے جو اس کیلئے سترے کا کام دے۔ یا دیوار وستون کے پیچھے ہو کر نماز ادا کرے۔ کیونکہ اگر سترہ نہ رکھا جائے تو شیطان نماز خراب کرتا ہے اور نمازی کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے۔ اگر سترہ سامنے ہو تو شیطان اس کی نماز کو نہیں توڑ سکتا۔

علاوہ ازیں اگر کوئی آدمی اس کے آگے سے گزرنا چاہے تو وہ سترے کے پیچھے سے گزر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص نمازی اور سترے کے درمیان سے گزرتا ہے یا سترے کی شرعی حد کے اندر سے گزرتا ہے تو وہ گناہ گار ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّيْ مَا ذَا عَلَيْهِ لَكَانَ اَنْ يَّقِفَ أَرْبَعِيْنَ خَيْرًا لَّهُ مِنْ اَنْ يَّمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ » [بخاری، کتاب الصلاة : باب إثم المار بين يدى المصلى(٥١٠)]

"نمازی کے آگے سے گزرنے والا آدمی اگر جان لے کہ اس پر کس قدر گناہ ہے تو وہ چالیس (سال) تک ٹھہر جائے تو یہ اس کے لیے اس کے آگے سے گزرنے سے بہتر ہے۔"

سترے کی شرعی حد تین ہاتھ ہے۔ یعنی نمازی اور سترے کے درمیان تین ہاتھ کا فاصلہ ہونا چاہیے یا اس کے سجدے والی جگہ اور سترہ کے درمیان بکری کے گزرنے کی مقدار کا فاصلہ ہو۔ اس سے زیادہ سترے سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ سترے کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی کئی ایک احادیث ہیں جن میں اس کی اہمیت بتلائی گئی ہے، ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

① حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُصَلِّ اِلَّا اِلٰى سُتْرَةٍ وَ لَا تَدَعْ اَحَدًا يَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْكَ فَاِنْ اَبٰى فَلْتُقَاتِلْهُ فَاِنَّ مَعَهُ الْقَرِيْنُ »

[ابن خزيمة(١٠/٢)، (٨٠٠)، كتاب الصلاة: باب النهى عن الصلاة الى غير سترة]

"سترے کے بغیر نماز نہ پڑھو اور کسی کو اپنے آگے سے نہ گزرنے دو۔ اگر وہ (گزرنے والا) انکار کر دے تو اس سے لڑائی کرو یقیناً اس کے ساتھ شیطان ہے۔"

② ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ فَلْیُصَلِّ اِلٰی سُتْرَةٍ وَلْیَدْنُ مِنْهَا لَا یَقْطَعُ الشَّیْطَانُ عَلَیْهِ صَلَاتَهُ » [ابو داود، کتاب الصلاة: باب الدنو من السترة(٦٩٥)، ابن خزیمة(٨٠٣)، احمد(٢/٤)، الأوسط لابن المنذر(٨٦/٥)، ابن حبان(٤٠٩)، حاکم(٢٥١/١)، امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا هے اور امام ذهبی نے ان کی موافقت کی هے۔]

"جب بھی تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو وہ سترے کی طرف نماز ادا کرے اور اس کے قریب ہو، شیطان اس پر اس کی نماز کو منقطع نہیں کرے گا۔"

③ حضرت سہل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ فَلْیَسْتَتِرْ وَ لْیَقْتَرِبْ مِنَ السُّتْرَةِ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ یَمُرُّ بَیْنَ یَدَیْهِ » [شرح السنة (٤٤٧/٢)،(٥٣٧)] .

"جب بھی تم میں سے کوئی آدمی نماز ادا کرے تو وہ سترہ رکھے اور سترہ کے قریب کھڑا ہو اس لیے کہ شیطان اس کے سامنے سے گزرتا ہے۔"

④ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا وَضَعَ اَحَدُکُمْ بَیْنَ یَدَیْهِ مِثْلَ مُؤَخِّرَةِ الرَّحْلِ فَلْیُصَلِّ وَ لَا یُبَالِ مَنْ مَرَّ وَرَاءَ ذٰلِكَ »

[مسلم، کتاب الصلاة : باب سترة المصلی والندب الی الصلاة الی سترة(٤٩٩)، ترمذی(٣٣٥)، شرح السنة(٥٣٩)، ابن خزیمة(٨٠٥) ، الأوسط لابن المنذر(٢٤٣١)]

"جب تم میں سے کوئی آدمی اپنے سامنے پالان کی پچھلی لکڑی کی مانند کوئی چیز رکھ لے تو نماز پڑھے، اس کے پیچھے سے جو گزرے اس کی پروا نہ کرے۔"

مندرجہ بالا احادیث سے یہ واضح طور پر معلوم ہوا کہ نمازی کو سترے کے بغیر نماز ادا نہیں کرنی چاہیے۔ یہ احادیث عام ہیں، مسجد و غیر مسجد ہر دو صورتوں کو شامل ہیں بلکہ صحیح ابن خزیمہ کی صحیح حدیث میں تو یہاں تک ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا: « لَا تُصَلِّ اِلَّا اِلٰی سُتْرَةٍ » "سترہ کے بغیر نماز نہ پڑھو۔" جس سے واضح ہو گیا کہ سترہ کے بغیر نماز پڑھنا درست نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو مساجد میں بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« وَ رَاٰی عُمَرُ رَجُلًا یُصَلِّیْ بَیْنَ اُسْطُوَانَتَیْنِ فَاَدْنَاهُ اِلٰی سَارِیَةٍ فَقَالَ صَلِّ اِلَیْهَا » [بخاری، ابواب سترة المصلی: باب الصلاة الی الأسطوانة (قبل الحدیث/٥٠٢)]

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے اسے ایک ستون کے

قریب کر دیا اور فرمایا: ’’اس کی طرف نماز ادا کرو۔‘‘

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس اثر کو ابن ابی شیبہ اور حمیدی نے موصولاً بیان کیا ہے۔ مزید فرماتے ہیں:

« وَ اَرَادَ عُمَرُ بِذٰلِكَ اَنْ تَكُوْنَ صَلَاتُهُ اِلٰى سُتْرَةٍ » [فتح الباری(۱/ ۵۷۷)]

’’سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کام کا ارادہ اس لیے کیا کہ اس کی نماز سترہ کی طرف ہو۔‘‘

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« لَقَدْ رَاَيْتُ كِبَارَ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَبْتَدِرُوْنَ السَّوَارِيَ عِنْدَ الْمَغْرِبِ »

[بخاری، ابواب سترة المصلی: باب الصلاۃ الی الأسطوانة(۵۰۳)]

’’میں نے کبار صحابہ کو دیکھا کہ وہ مغرب (کی اذان) کے وقت ستونوں کی طرف جلدی کرتے۔‘‘

مولانا رشید احمد گنگوہی رقمطراز ہیں:

”فَالْاَوْجَهُ عِنْدِيْ اَنَّ الْإِمَامَ الْبُخَارِيَّ اَشَارَ بِالتَّرْجُمَةِ الْاُوْلٰى عَدَمَ تَخْصِيْصِ السُّتْرَةِ بِالصَّحْرَاءِ“ [لامع الداری(۲/ ۵۰۲)]

’’میرے نزدیک صحیح ترین توجیہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ اس ترجمۂ باب سے یہ اشارہ فرماتے ہیں کہ سترہ صحراء کے لیے مخصوص نہیں۔‘‘

یہی بات مولانا محمد زکریا نے بھی کی ہے۔ [شرح ابواب و تراجم صحیح بخاری(ص/ ۷۹)]

اسی طرح صحیح بخاری میں ابو صالح السمان سے روایت ہے:

« رَاَيْتُ اَبَا سَعِيْدٍ الْخُدْرِيَّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِيْ يَوْمِ جُمُعَةٍ يُصَلِّيْ اِلٰى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ فَاَرَادَ شَابٌّ مِنْ بَنِيْ اَبِيْ مُعَيْطٍ اَنْ يَّجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَدَفَعَ اَبُوْ سَعِيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِيْ صَدْرِهِ فَنَظَرَ الشَّابُّ فَلَمْ يَجِدْ مَسَاغًا اِلَّا بَيْنَ يَدَيْهِ فَعَادَ لِيَجْتَازَ فَدَفَعَهُ اَبُوْ سَعِيْدٍ اَشَدَّ مِنَ الْاُوْلٰى فَنَالَ مِنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ ثُمَّ دَخَلَ عَلٰى مَرْوَانَ فَشَكَا اِلَيْهِ مَا لَقِيَ مِنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ وَ دَخَلَ اَبُوْ سَعِيْدٍ خَلْفَهُ عَلٰى مَرْوَانَ فَقَالَ مَا لَكَ وَ لِابْنِ اَخِيْكَ يَا اَبَاسَعِيْدٍ! فَقَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ اِلٰى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ فَاَرَادَ اَحَدٌ اَنْ يَّجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلْيَدْفَعْهُ فَاِنْ اَبٰى فَلْيُقَاتِلْهُ فَاِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ » [بخاری، کتاب الصلاۃ: باب یرد المصلی من مر بین یدیه(۵۰۹)]

’’میں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو جمعہ والے دن سترہ کی طرف نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ بنو ابی معیط سے ایک نوجوان نے ان کے سامنے سے گزرنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے اس کے سینے میں ایک گھونسا مارا۔ نوجوان نے جب ان کے آگے سے گزرنے کے علاوہ کوئی جگہ نہ پائی تو وہ دوبارہ وہاں سے گزرنے لگا۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے اسے

پہلے سے زیادہ سخت گھونسا مارا تو ابو سعید سے اس نوجوان کو رنج پہنچا۔ وہ نوجوان مروان کے پاس پہنچا اور ابو سعید نے جو کیا تھا اس کی شکایت کی۔ ابو سعید اس کے پیچھے ہی مروان کے پاس جا پہنچے تو مروان نے کہا: ''ابو سعید! تیرے اور تیرے بھتیجے کے درمیان کیا جھگڑا ہے؟'' ابو سعید رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی لوگوں سے آڑ کر کے نماز پڑھے، پھر کوئی اس کے سامنے (یعنی آڑ کے اندر) سے گزرنا چاہے تو اس کو روکے، اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے لڑے، وہ شیطان ہے۔''

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جمعہ کے روز ابو سعید سترہ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اور اس کا وہ اہتمام کیا کرتے تھے۔ یحییٰ بن ابی کثیر سے مروی ہے:

« رَاَیْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ قَدْ نَصَبَ عَصًا یُصَلِّیْ اِلَیْهَا »
[ابن ابی شیبة(۱/ ۳۱۰)، الأوسط لابن المنذر(۵/ ۸۹)، طبقات ابن سعد(۷/ ۱۱)]

''میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو مسجد حرام میں دیکھا، وہ لاٹھی گاڑ کر اس کی طرف نماز ادا کر رہے تھے۔''

نافع رحمہ اللہ سے مروی ہے:

« كَانَ ابْنُ عُمَرَ اِذَا لَمْ یَجِدْ سَبِیْلًا اِلٰی سَارِیَةٍ مِنْ سَوَارِی الْمَسْجِدِ قَالَ لِیْ وَلِّنِیْ ظَهْرَكَ »
[ابن ابی شیبة(۱/ ۳۱۳)]

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون کی جانب کوئی جگہ نہ پاتے تو مجھے کہتے کہ میری طرف اپنی پشت کر کے بیٹھ جاؤ۔''

نافع رحمہ اللہ کی دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« اِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ یُقْعِدُ رَجُلًا فَیُصَلِّیْ خَلْفَهٗ وَ النَّاسُ یَمُرُّوْنَ بَیْنَ یَدَیْ ذٰلِكَ الرَّجُلِ »
[ابن ابی شیبة(۱/ ۳۱۳)]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک آدمی کو بٹھاتے پھر اس کے پیچھے نماز پڑھتے اور لوگ اس آدمی کے آگے سے گزرتے۔''

ان صحیح احادیث اور آثار صحابہ سے معلوم ہوا کہ وہ مسجد و غیر مسجد جہاں بھی نماز پڑھتے تو سترے کا خیال رکھتے تاکہ نماز صحیح ادا ہو سکے۔ لہٰذا ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جب بھی نماز ادا کریں خواہ مسجد ہو یا کوئی دوسری جگہ، سترے کا ضرور خیال رکھیں تاکہ اگر کوئی آدمی اس کے سامنے سے گزرنا چاہے تو وہ سترے کے پیچھے سے گزر سکے۔ امام ابن ہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" رَاٰنِیْ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ یَوْمًا وَ اَنَا اُصَلِّیْ وَ لَیْسَ بَیْنَ یَدَیَّ سُتْرَةٌ وَ كُنْتُ مَعَهٗ فِی الْمَسْجِدِ الْجَامِعِ فَقَالَ لِیْ اسْتَتِرْ بِشَیْءٍ فَاسْتَتَرْتُ رَجُلًا " [مسائل احمد لإسحاق بن إبراهيم المعروف بابن هانی(۱/ ٦٦)]

''مجھے امام احمد رحمہ اللہ نے ایک دن نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، میرے سامنے سترہ نہیں تھا اور میں ان کے ساتھ جامع

مسجد میں تھا تو انھوں نے مجھے کہا: ''کسی چیز کو سترہ بنالے۔'' تو میں نے ایک آدمی کو سترہ بنالیا۔''

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ نمازی خواہ مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو یا صحراء میں اسے سترے کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ بات ذکر کر دی گئی ہے کہ وہ جب بھی نماز ادا کرتے، اس کا ضرور اہتمام فرماتے۔

ہم مساجد میں نماز کے لیے آئیں تو اس کا آسانی سے اہتمام کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے آنے والے اگر اگلی صف پوری کریں اور مسجد کی دیوار کے قریب ہوں اور بعد میں آنے والے ان کے پیچھے نماز ادا کریں تو اس طرح یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ایک تو صفوں میں پہلے پہنچنے کا اجر ملے گا اور ساتھ ہی سترے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور اگر علیحدہ علیحدہ بھی نماز ادا کریں تو مسجد کی دیوار، ستون یا کسی اور لکڑی وغیرہ کو سترہ بنا کر نماز ادا کریں۔

WWW. KITABOSUNNAT. COM

❀❀❀

طریقۂ نماز کا بیان

WWW. KITABOSUNNAT.COM

نماز کے لیے زبان سے نیت کرنا

(سوال) کیا نماز کے لیے زبان سے نیت کی جا سکتی ہے اور کیا کسی صحابی کے عمل سے اس کا ثبوت ملتا ہے؟

(جواب) نیت کا معنی قصد اور ارادہ ہے۔ تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ قصد و ارادہ دل کا فعل ہے نہ کہ زبان کا۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" اَلنِّيَّةُ هِيَ الْقَصْدُ وَ الْعَزْمُ عَلٰى فِعْلِ الشَّيْءِ وَ مَحَلُّهَا الْقَلْبُ لَا تَعَلُّقَ لَهَا بِاللِّسَانِ اَصْلًا "
[اغاثة اللهفان(١٥٦)]

"نیت کسی کام کے قصد اور پختہ ارادے کا نام ہے اور اس کا محل دل ہے اور زبان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

مولانا انور شاہ کاشمیری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَالنِّيَّةُ اَمْرٌ قَلْبِيٌّ " (نیت دل کا معاملہ ہے۔) [فیض الباری(۸/۱)]

لہٰذا اگر نمازی نے دل سے نیت کر لی تو تمام ائمہ کے نزدیک اس کی نماز صحیح ہوگی۔ زبان سے نیت کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے اور نہ یہ نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ سے ثابت ہی ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" كَانَ اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ قَالَ : اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَ لَمْ يَقُلْ شَيْئًا قَبْلَهَا وَ لَا تَلَفَّظَ بِالنِّيَّةِ اَلْبَتَّةَ وَ لَا قَالَ اُصَلِّيْ لِلّٰهِ صَلَاةَ كَذَا مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ اِمَامًا اَوْ مَاْمُوْمًا وَ لَا قَالَ اَدَاءً وَلَا قَضَاءً وَ لَا فَرْضَ الْوَقْتِ وَ هٰذِهِ عَشْرُ بِدَعٍ لَمْ يَنْقُلْ عَنْهُ اَحَدٌ قَطُّ بِاِسْنَادٍ صَحِيْحٍ وَّ لَا ضَعِيْفٍ وَّ لَا مُسْنَدٍ وَ لَا مُرْسَلٍ لَفْظَةً وَاحِدَةً مِنْهَا اَلْبَتَّةَ بَلْ وَ لَا عَنْ اَحَدٍ مِّنْ اَصْحَابِهٖ وَ لَا اِسْتَحْسَنَهٗ اَحَدٌ مِنَ التَّابِعِيْنَ وَ لَا الْاَئِمَّةُ الْاَرْبَعَةُ » [زاد المعاد(١/٢٠١)]

"نبی کریم ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے اور اس سے پہلے کچھ نہ کہتے اور نہ زبان سے نیت کرتے اور نہ یوں کہتے کہ میں چار رکعت فلاں نماز، منہ طرف قبلہ کے، امام یا مقتدی ہو کر پڑھتا ہو اور نہ ادا، قضا یا فرض وقت کا نام لیتے ۔ یہ دس بدعات ہیں۔ اس بارے میں ایک لفظ بھی کسی نے رسول اللہ ﷺ سے سندِ صحیح یا سند ضعیف یا مرسل سے قطعاً نقل نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی ایک سے بھی ایسا منقول نہیں اور نہ کسی تابعی نے اسے پسند کیا اور نہ ائمہ اربعہ نے۔"

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی حنفی لکھتے ہیں:

" و حال آنکه از آن سرور علیه و علی آله الصلاة و السلام ثابت است نه بروایت صحیح و نه بروایت ضعیف و نه از اصحاب کرام و تابعین عظام که بزبان نیت کرده باشند بلکه چون اقامت می گفتند تکبیر تحریمه میفرمودند پس نیت بزبان بدعت باشد" [مکتوبات دفتر اول ،حصه سوم ،مکتوب :۱۸۶، صفحه:۷۳)]

" زبان سے نیت کرنا رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند بلکہ ضعیف سند سے بھی ثابت نہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ زبان سے نیت نہیں کرتے تھے بلکہ جب اقامت کہتے تھے تو صرف اللہ اکبر کہتے تھے۔ زبان سے نیت کرنا بدعت ہے۔"

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَلَوْ مَكَثَ اَحَدُهُمْ عُمَرَ نُوحٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُفَتِّشُ هَلْ فَعَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَوْ اَحَدٌ مِّنْ اَصْحَابِهِ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ لَمَا ظَفَرَ بِهِ اِلَّا اَنْ يُّجَاهِرَ بِالْكِذْبِ الْبُحْتِ وَ ط فِي هٰذَا خَيْرٌ لَسَبَقُوْنَا اِلَيْهِ وَ لَدَلُّوْنَا عَلَيْهِ " [كما في إغاثة اللهفان(۱/۱۵۸)]

" اگر کوئی انسان سیدنا نوح علیہ السلام کی عمر کے برابر تلاش کرتا رہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے زبان سے نیت کی ہو تو وہ ہرگز کامیاب نہیں ہوگا سوائے سفید جھوٹ بولنے کے اگر اس میں بھلائی ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب سے پہلے کرتے اور ہمیں بتا کر جاتے۔"

نماز میں پاؤں سے پاؤں ملانا

سوال نماز کے دوران میرے ایک دوست جو پاؤں کی چھوٹی انگلی سے انگلی ملاتے ہیں اس پر کچھ حضرات کہتے ہیں کہ یہ بدعت ہے، براہ کرم قرآن وحدیث سے صحیح جواب دیں؟

جواب نماز کے دوران صف درست کرنا اقامت صلوٰۃ میں سے ہے جیسا کہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "اپنی صفوں کو درست کرو بلاشبہ صفوں کی درستی اقامت صلاۃ میں سے ہے۔"[صحیح بخاری، کتاب الاذان: باب اقامة الصف من تمام الصلاة: (۷۲۳)]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" صفوں کو قائم کرو اور کندھوں کو برابر کرو اور خالی جگہ پر کرو اور اپنے بھائیوں کے آگے نرم ہو جاؤ اور شیطان کے لیے کوئی خالی جگہ نہ چھوڑو اور جو صف کو ملائے اللہ اسے ملائے اور جو صف کو توڑے اللہ اسے توڑے۔" [ابوداؤد، کتاب الصلاة : باب تسوية الصفوف: (٦٦٦)]

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ نمازیوں کو صحیح صف بندی کا حکم دیا گیا اور دو نمازیوں کے درمیان جو خالی جگہ ہوتی ہے اسے پر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر ایک نمازی دوسرے نمازی کے ساتھ کندھا اور پاؤں ملا کر نہیں کھڑا ہوتا، درمیان میں فاصلہ رکھتا ہے تو وہ شیطان کے لیے جگہ چھوڑتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب صفیں باندھتے تھے تو اپنے ساتھی کے کندھے کے ساتھ کندھا اور پاؤں کے ساتھ پاؤں ملاتے تھے۔ لہٰذا دوسرے نمازی کے ساتھ پورا قدم اور کندھا ملانا چاہیے۔

نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟

سوال نماز میں ہاتھ باندھنے کی دلیل کیا ہے؟ اور کیا ہاتھ سینے پر باندھے جائیں یا ناف کے نیچے؟ مہربانی فرما کر آگاہ فرمائیں۔

جواب نماز میں ہاتھ سینے کے اوپر باندھنے چاہئیں جو صحیح حدیث سے ثابت ہے:

« عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى عَلٰى صَدْرِهِ » [ابن خزيمة(٤٧٩)، بيهقى(٣٠/٢)]

”حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر ہاتھ باندھے۔“

ایک روایت میں ہے:

« عَنْ هُلْبٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَنْصَرِفُ عَنْ يَمِينِهِ وَ عَنْ يَسَارِهِ وَ رَأَيْتُهُ قَالَ يَضَعُ هٰذَا عَلٰى صَدْرِهِ » [احمد(٢٢٦/٥)]

”حضرت ہلب صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھا ہوا تھا۔“

شیخ شعیب ارناؤوط نے اس روایت کو ”يَضَعُ هٰذَا عَلٰى صَدْرِهِ“ کے علاوہ صحیح لغیرہ قرار دیا ہے اور ان الفاظ کو ضعیف کہا ہے۔ [مسنداحمد محقق (٢١٩٦٧)]

اس کی تائید اس مرسل روایت سے بھی ہوتی ہے جسے امام ابوداود رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے:

« عَنْ طَاوُسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى يَدِهِ الْيُسْرٰى ثُمَّ يَشُدُّ بَيْنَهُمَا عَلٰى صَدْرِهِ وَ هُوَ فِي الصَّلَاةِ » [ابو داؤد، كتاب الصلاة : باب وضع اليمنى على اليسرى فى الصلاة (٧٥٩)]

”سیدنا طاؤس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر اپنے سینے پر باندھتے تھے۔“

ان احادیث کی رو سے نمازی کو اپنے ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں اور زیر ناف ہاتھ باندھنے والی روایت انتہائی ضعیف

ہے۔امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے: "مُتَّفَقٌ عَلٰی ضُعْفِهِ" (اس روایت کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے) اور جو روایت « تَحْتَ السُّرَّةِ » "ناف کے نیچے" ہاتھ باندھنے کے متعلق ابوداؤد میں مروی ہے اس میں عبدالرحمٰن بن اسحاق الواسطی راوی ضعیف ہے۔

سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ

(سوال) کیا سورۂ فاتحہ سے پہلے پوری "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھنا جائز ہے؟ نیز کیا کسی صحیح حدیث میں مذکورہ عمل موجود ہے؟

(جواب) نعیم المجمر فرماتے ہیں: "میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھی پھر سورۂ فاتحہ پڑھی، جب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پر پہنچے تو "آمین" کہی اور لوگوں نے بھی "آمین" کہی۔ جب رکوع کیا تو اللہ اکبر کہا اور جب رکوع سے سر اٹھایا تو اللہ اکبر کہا پھر جب سجدہ کیا تو اللہ اکبر کہا اور جب سلام پھیرا تو کہا: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ ہو۔"

[صحيح ابن حبان، كتاب الصلاة: باب ذكر ما يستحب للإمام أن يجهر بسم الله...... (١٧٩٧)، سنن النسائي، كتاب الافتتاح: باب قرأءة بسم الله...... الخ (٩٠٤)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ سے پہلے پوری "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھا کر بتایا۔

مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کی قراءت

(سوال) کیا مقتدی امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھے گا یا صرف اپنی تنہا نماز میں؟ قرآن وسنت سے رہنمائی فرمائیں۔

(جواب) صحیح احادیث کی رو سے امام، مقتدی اور منفرد سب کے لیے ہر نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا لازمی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

« عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ لَاصَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ » [بخاری، كتاب الأذان : باب وجوب القراءة للامام و المأموم فی الصلوات كلها(٧٥٦)، ابو داؤد(٨٢٢)، نسائی(١٣٧/٢)، ترمذی(٢٤٧)، ابن ماجه(٨٣٧)]

"سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو بھی نمازی امام ہو یا مقتدی، منفرد ہو یا باجماعت پڑھنے والا اگر سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو اس

کی نماز نہیں ہوتی۔اس حدیث کی شرح میں علامہ قسطلانی ؒ فرماتے ہیں:

" اَیْ فِیْ رَکْعَةٍ مُّنْفَرِدًا اَوْ اِمَامًا اَوْ مَأْمُوْمًا سَوَاءً اَسَرَّ الْاِمَامُ اَوْ جَهَرَ " [قسطلانی شرح بخاری(۴۳۹/۲)]

''اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ ہر رکعت میں ہر نمازی خواہ امام ہو، منفرد ہو یا مقتدی، امام آہستہ پڑھے یا بلند آواز سے، فاتحہ پڑھنا ہر صورت ضروری ہے۔''

اسی طرح علامہ کرمانی شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

"وَ فِیْ الْحَدِیْثِ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ قِرَاءَةَ الْفَاتِحَةِ وَاجِبَةٌ عَلَی الْاِمَامِ وَ الْمَأْمُوْمِ فِی الصَّلَاةِ کُلِّهَا"

''اس حدیث میں دلیل ہے کہ سورۂ فاتحہ امام اور مقتدی پر ہر نماز میں واجب ہے۔''

اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ سیدنا عبادہ ؓ فرماتے ہیں:

''صبح کے وقت ہم آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے اور آپ قراءت کر رہے تھے۔آپ پر قراءت بھاری ہو گئی۔نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا:''شاید تم امام کے پیچھے پڑھتے ہو؟'' ہم نے عرض کیا:'' جلدی جلدی پڑھتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:''صرف سورۂ فاتحہ پڑھا کرو، کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔''

[ابو داؤد، کتاب الصلاۃ : باب من ترك القراءة فی صلاته بفاتحة الکتاب(۸۲۳)، دار قطنی (۳۱۸/۱)، حاکم (۲۳۸/۱)، بیهقی(۱۶۴/۱)، احمد(۳۱۶/۵) ، ابن خزیمة(۳۰۴/۳)]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ہر نمازی پر نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا لازم ہے۔

نماز ظہر میں کبھی کبھار جہراً کوئی آیت پڑھنا

سوال کیا یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ ظہر کی نماز میں کبھی کبھار ایک یا دو آیات صحابہ ؓ کو سناتے تھے۔اگر یہ صحیح ہے تو اب اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا؟ اور کیا اسے مردہ سنت کہنا درست ہے؟ جب کہ سنت کبھی مردہ نہیں ہوتی، اس پر عمل چھوڑ دیا جاتا ہے، وضاحت فرمائیں۔

جواب ابو قتادہ ؓ سے روایت ہے کہ ''نبی کریم ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے تھے اور پچھلی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کی قراءت کرتے تھے اور کبھی کبھار ہمیں ایک آدھ آیت سنا دیا کرتے تھے اور پہلی رکعت میں قراءت دوسری رکعت سے زیادہ کرتے تھے۔اسی طرح عصر اور صبح کی نماز میں بھی کرتے تھے۔''[صحیح البخاری، کتاب الاذان: باب یقرا فی الاخریین بفاتحة الکتاب(۷۷۶)، صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب القراء ة فی الظهر والعصر (۴۵۱)]

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی کبھار ظہر کی نماز جو سری پڑھی جاتی ہے اس میں ایک آدھ آیت سنائی جا سکتی ہے۔حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی لازمی امر نہیں ہے وگرنہ آپ ﷺ اسے ہمیشہ سناتے۔کبھی کبھار کوئی آیت

سنا دینا بالکل جائز ہے اور اس پر آج بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔ سنت کے مردہ ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پر لوگ عمل نہیں کر رہے۔ جس سنت پر لوگ عمل نہ کر رہے ہوں اس کو زندہ کرنا چاہیے تا کہ معلوم ہو کہ یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا۔ البتہ جس کام پر شریعت نے شدت اختیار نہ کی ہو اس پر تشدد کر کے امت مسلمہ میں افتراق و انتشار کا سبب نہیں بننا چاہیے۔

سورۂ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ

سوال نماز میں "بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم" صرف پہلی رکعت میں ثناء کے بعد پڑھی جائے یا ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ؟ اسی طرح "بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم" جہری پڑھنی چاہیے یا سری؟

جواب سورۂ فاتحہ کے شروع میں "بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم" بالاتفاق پڑھنا ثابت ہے، اختلاف اس کے جہری اور سری پڑھنے میں ہے۔ کثرت سے احادیث صحیحہ اس کے سری پڑھنے کی موجود ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

''انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر صدیق، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی وہ بلند آواز سے "بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم" نہیں پڑھتے تھے۔'' [صحيح مسلم، كتاب الصلاة: باب حجة من قال لا يجهر بالبسملة، (٣٩٩)]

البتہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ''بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم" جہراً پڑھنا بھی ثابت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم "بسم اللّٰه" بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ [جزء للخطيب البغدادی: (٤١)، (١٨٠)]

اس طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ''بسم اللّٰه" بلند آواز سے پڑھنا صحیح سند کے ساتھ ابن ابی شیبہ (۴۱۲/۱) میں موجود ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ عرب ممالک سے مطبوعہ قرآن حکیم کے نسخوں میں ''بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم" کو فاتحہ کی ایک آیت شمار کیا گیا ہے۔ بہرکیف ''بسم اللّٰه" آہستہ پڑھنے کے دلائل زیادہ ہیں جبکہ بلند آواز سے پڑھنا بھی درست ہے۔ واللہ اعلم!

دورانِ قراءت ہر آیت پر وقف

سوال قراءت کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ کیا ہر آیت پر ٹھہرنا ضروری ہے؟

جواب قراءتِ قرآن کا مسنون اور افضل طریقہ یہی ہے کہ آدمی تلاوت کرتے وقت ہر آیت پر وقف کرے۔ نبی اکرم ﷺ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ ہر آیت پر ٹھہرتے تھے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُقَطِّعُ قِرَاءَتَهُ يَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ثُمَّ يَقِفُ ثُمَّ يَقُوْلُ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ثُمَّ يَقِفُ وَ فِيْ رِوَايَةٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا قَرَأَ قَطَّعَ اٰيَةً اٰيَةً يَقُوْلُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ثُمَّ يَقِفُ » [ترمذی، ابواب القراء ت : باب فی فاتحة الكتاب(٢٩٢٧)، احمد(٣٠٢/٢)، حاكم (٢٢/١)، ابن خزيمة (٢٤٧/١)، بيهقی (٤٤/٢)، دار

قطنی(۳۱۳/۱)، طحاوی(۱۳۸/۱)، امام حاکم نے اس حدیث کو صحیحین کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام دار قطنی رحمہ اللہ نے اسے صحیح الاسناد اور امام نووی رحمہ اللہ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔[المجموع (۳۳۳/۳)]

"نبی اکرم ﷺ جب قراءت کرتے تو ہر آیت کو علیحدہ علیحدہ پڑھتے۔ آپ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ پڑھتے پھر ٹھہر جاتے، پھر ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھتے پھر ٹھہر جاتے۔" ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ جب قراءت کرتے تو ہر آیت کو الگ الگ کرتے مثلاً ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ کہتے پھر وقف کرتے۔"

امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" قَالَ الْبَيْهَقِيُّ فِي الشُّعَبِ وَ اٰخَرُوْنَ الْاَفْضَلُ الْوُقُوْفُ عَلَى الْآيَاتِ اِتِّبَاعًا هَدْىَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ سُنَّتَهٗ " [الاتقان (ص/۱۲۲)]

"امام بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الایمان میں اور دیگر اہل علم نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں ہر آیت پر وقف افضل ہے۔"

امام ابو عمر الروانی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" وَ قَدْ كَانَ جَمَاعَةٌ مِّنَ الْاَئِمَّةِ السَّلَفِيِّيْنَ وَ الْقُرَّاءِ الْعَافِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْقَطْعَ عَلَيْهِنَّ " [إرواء الغليل(۶۲/۲)]

"ائمہ سلف اور قرائے کرام کی ایک جماعت آیات پر وقف مستحب سمجھتی ہے۔"

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ امام ہو یا منفرد ہر ایک کو چاہیے کہ قراءت کرتے وقت ہر آیت پر وقف کرے۔ یہی طریقہ افضل ہے۔

قصداً ترک کی ہوئی نمازوں کی قضا

(سوال) اگر کوئی شخص جان بوجھ کر نماز ترک کر دے پھر جب اللہ اسے توبہ کی توفیق دے تو کیا وہ اپنی ترک کی ہوئی نمازیں قضا کرے گا یا نہیں؟

(جواب) جب کوئی آدمی جان بوجھ کر نماز چھوڑ دے تو اسے اللہ نماز پڑھنے کی توفیق عطا کرے تو اسے ان چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضا لازم نہیں کیونکہ قصداً نماز ترک کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور کافر آدمی حالت کفر میں ترک کی ہوئی چیزوں کی قضا نہیں کرتا۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ »[صحيح مسلم، كتاب الإيمان: باب بيان إطلاق...... (۸۲)]

"آدمی اور کفر و شرک کے درمیان فرق نماز کا ترک کرنا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''وہ عہد جو ہمارے اور ان کے درمیان ہے، وہ نماز ہے جس نے اسے ترک کیا وہ کافر ہو گیا۔''

[نسائي، كتاب الصلاة: باب الحكم في تارك الصلاة (٤٦٤)، ابن ماجه، كتاب إقامة الصلوات: باب ما جاء فيمن ترك الصلاة (١٠٧٩)]

اور اسی طرح ایک مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جِهَاراً »[مجمع البحرين كتاب الصلاة: باب في تارك الصلاة متعمدا (٥٣٤)]

''جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔''

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قصداً نماز کا تارک دائرۂ اسلام سے نکل جاتا ہے اور جب ایک آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے تو اسے کفر کی حالت میں ترک کی ہوئی چیزوں کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا۔ آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے مرتدین کو جب وہ اسلام میں داخل ہوئے تو حالت ارتداد میں ترک کی ہوئیں اشیاء کے اعادے کا حکم نہیں دیا اور جو علماء بے نماز کے کافر ہونے کے قائل نہیں ان کے نزدیک قصداً فوت شدہ نمازوں کی قضا کی جائے گی لیکن اس کی کوئی پختہ دلیل موجود نہیں البتہ اگر کسی آدمی سے غفلت یا سستی کی بنا پر کوئی نماز چھوٹ جائے تو اسے یاد آجانے پر اس فوت شدہ نماز کی قضا کر لینی چاہیے۔

قراءت میں سورتوں کی ترتیب

(سوال) کیا نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد قراءت میں سورتوں کی ترتیب ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟ ہمارے بعض بھائی اسے سنت کہتے ہیں؟ تفصیل سے جواب دیں۔

(جواب) نماز میں بہتر تو یہی ہے کہ قرآن پاک کی قراءت موجودہ ترتیب کے مطابق کی جائے لیکن اگر کسی وقت ترتیب آگے پیچھے ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ایسا کرنا کئی ایک صحیح احادیث سے ثابت ہے، اس سے نماز میں خلل اور خرابی واقع نہیں ہوتی۔

① « عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَافْتَتَحَ الْبَقَرَةَ فَقُلْتُ يَرْكَعُ عِنْدَ الْمِائَةِ ثُمَّ مَضٰى [يَرْكَعُ عِنْدَ الْمِأَتَيْنِ فَمَضٰى] فَقُلْتُ يُصَلِّي بِهَا فِي رَكْعَةٍ فَمَضَى فَقُلْتُ يَرْكَعُ بِهَا ثُمَّ افْتَتَحَ النِّسَاءَ فَقَرَأَهَا ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَانَ فَقَرَأَهَا يَقْرَأُ مُتَرَسِّلًا اِذَا مَرَّ بِآيَةٍ فِيهَا تَسْبِيحٌ سَبَّحَ وَ اِذَا مَرَّ بِسُؤَالٍ سَأَلَ وَ اِذَا مَرَّ بِتَعَوُّذٍ تَعَوَّذَ ثُمَّ رَكَعَ ...... »

[مسلم، كتاب صلاة المسافرين ، باب استحباب تطويل القراءة في الصلاة الليل(٧٧٢)، نسائي (١٦٦٥)، احمد(٥/ ٣٨٢)، واضح رهے كه بريكٹ والے الفاظ سنن نسائى كے هيں]

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی تو آپ نے سورۂ بقرہ پڑھنی شروع کی، میں نے خیال کیا کہ آپ سو آیات پر رکوع کریں گے، آپ آگے گزر گئے پھر میں نے خیال کیا کہ

دو سو آیات پر رکوع کریں گے، آپ آگے نکل گئے، میں نے سوچا کہ آپ اسی پر سلام پھیریں گے (یعنی اسے دو رکعتوں میں تقسیم کریں گے) مگر آپ آگے نکل گئے۔ میں نے سوچا بقرہ کے آخر پر آپ رکوع کریں گے مگر آپ نے سورۂ نساء شروع کر دی۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ نے سورۂ آل عمران شروع کر دی۔ آپ نے اس کی قراءت کی۔ آپ ٹھہر ٹھہر کر قراءت کرتے تھے، جب کسی ایسی آیت سے گزرتے جس میں تسبیح ہوتی تو آپ تسبیح پڑھتے اور جب سوال والی آیت پڑھتے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے اور جب عذاب والی آیت تلاوت کرتے تو اعوذ باللہ پڑھتے۔"

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ بقرہ پڑھی پھر سورۂ نساء پڑھی پھر سورۂ آل عمران پڑھی حالانکہ سورۂ آل عمران سورۂ نساء سے پہلے ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ سورتوں کی ترتیب قراءت میں لازم نہیں۔

علامہ سندھی فرماتے ہیں:

" قَوْلُهُ " ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَانَ " مُقْتَضَاهُ عَدَمُ لَزِمِ التَّرْتِيبِ بَيْنَ السُّوَرِ فِي الْقِرَاءَ ةِ " [حاشیه سندھی علی النسائی(۲/۵۰)

"اس حدیث کا مقتضیٰ یہ ہے کہ قراءت کے دوران سورتوں کی ترتیب لازم نہیں۔"

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"ایک انصاری آدمی مسجد قباء میں ان کی امامت کرواتا تھا، وہ جب بھی کوئی سورت پڑھتا تو اس سے پہلے ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھتا۔ جب اس سے فارغ ہوتا تو اس کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھتا اور ہر رکعت میں ایسے ہی کرتا۔ اس کے ساتھیوں نے گفتگو کی اور کہا: "تم اس سورت کے ساتھ شروع کرتے ہو پھر اسے کافی نہیں سمجھتے حتی کہ دوسری سورت پڑھتے ہو یا تو ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھا کرو یا اسے چھوڑ کر کوئی اور سورت پڑھ لیا کرو۔"

اس نے کہا: "میں اسے چھوڑنے والا نہیں ہوں، اگر تم پسند کرو تو تمھاری امامت کراؤں گا اور اگر ناپسند کرو تو تمھیں چھوڑ دیتا ہوں۔" وہ اس شخص کو اپنے ساتھیوں میں سے افضل سمجھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس کے علاوہ کسی اور کی امامت کو ناپسند کیا۔ جب نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تجھے اپنے ساتھیوں کی بات ماننے سے کون سی چیز روکتی ہے؟ کس چیز نے تمھیں ابھارا ہے کہ تم ہر رکعت میں اس سورت کو لازماً پڑھو؟" اس نے کہا:

« اِنِّیْ اُحِبُّهَا فَقَالَ حُبُّكَ اِيَّاهَا اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ » [بخاری، کتاب الأذان : باب الجمع بين السورتين في ركعة والقراءة بالخواتيم وبسورة قبل سورة و بأول سورة(۷۷۴)، ترمذی(۲۹۰۱)]

"مجھے اس سورت سے محبت ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "تیری اس سورت سے محبت تجھے جنت میں داخل کر دے گی۔"

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ ترتیب لازمی نہیں ہے کیونکہ انصاری صحابی جب نماز پڑھاتے تو سورۂ فاتحہ کے بعد پہلے سورۂ اخلاص پڑھتے پھر کوئی اور سورت پڑھتے اور ہر رکعت میں اسی طرح کرتے۔ نبی کریم ﷺ کو جب یہ بات بتائی گئی تو آپ نے منع نہیں فرمایا بلکہ اسے اس کے بدلے جنت کا وارث قرار دے دیا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس صحابی کا نام کلثوم بن الھدم تھا۔'' [فتح الباری(۲۵۸/۲)]

③ حضرت عبداللہ بن شقیق سے روایت ہے:

« صَلّٰی بِنَا الْاَحْنَفُ بْنُ قَیْسٍ الْغَدَاۃَ فَقَرَاَ فِی الرَّکْعَۃِ الْاُوْلٰی بِالْکَھْفِ وَ فِی الثَّانِیْ بِیُوْنُسَ وَ زَعَمَ اَنَّہٗ صَلّٰی خَلْفَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَرَاَ فِی الْاُوْلٰی بِالْکَھْفِ وَ فِی الثَّانِیَۃِ بِیُوْنُسَ »

[تغلیق التعلیق (۳۱۳/۲)، بخاری مع الفتح(۲۵۷/۲) ،یہ حدیث کتاب الصلاۃ لجعفر القریابی اور مستخرج ابی نعیم میں بھی موجود ہے]

''ہمیں احنف بن قیس نے صبح کی نماز پڑھائی، انھوں نے پہلی رکعت میں سورۂ کہف اور دوسری میں سورۂ یونس پڑھی اور کہا: ''انھوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے بھی پہلی رکعت میں سورۂ کہف اور دوسری میں سورۂ یونس پڑھی۔''

قرآن پاک میں سورۂ کہف کا نمبر اٹھارواں ہے جبکہ سورۂ یونس کا نمبر دسواں ہے۔خلیفہ راشد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قراءت کرتے ہوئے سورتوں کی ترتیب لازمی نہیں وگرنہ وہ پندرھویں اور سولھویں پارے سے سورۂ کہف پہلی رکعت میں اور گیارھویں پارے سے سورۂ یونس دوسری رکعت میں نہ پڑھتے۔

مذکورہ بالا صحیح احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ نماز میں سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے قراءت کرنا لازمی نہیں، لہٰذا جن حضرات نے اسے بدعت کہا ہے وہ اپنی بات سے رجوع کریں۔ معلوم ہوا ہے کہ ان لوگوں نے جہالت و نادانی اور ضد و تعصب کی وجہ سے ایسے کہا ہے۔ ان حضرات کے پاس اس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ ان کا استہزا وطعن اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت سے نوازے اور صراط مستقیم پر گامزن فرمائے۔ حنفی علماء میں سے کئی ایسے ہیں جو اس صورت کو جائز کہتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے باب " اَلْجَمْعُ بَیْنَ السُّوْرَتَیْنِ فِی رَکْعَۃٍ وَ الْقِرَاءَۃُ بِالْخَوَاتِیْمِ وَ بِسُوْرَۃٍ قَبْلَ سُوْرَۃٍ وَ بِاَوَّلِ سُوْرَۃٍ " میں قراءت کی چار صورتیں ذکر کی ہیں:

① ایک رکعت میں دو سورتوں کو جمع کرنا۔ ② سورتوں کے آخری حصے کی قراءت کرنا۔

③ سورتوں کی تقدیم و تاخیر۔ ④ سورتوں کو ابتدا سے پڑھنا۔

مشہور متعصب حنفی احمد رضا بجنوری اپنے استاد انور شاہ کاشمیری کے بارے میں لکھتا ہے کہ انھوں نے کہا:

''امام طحاوی نے ان چاروں صورتوں کو جائز لکھا ہے اور میرے نزدیک طحاوی کو ترجیح ہے۔'' [انوار الباری(۳۵۰/۲)]

مولوی غلام رسول سعیدی بریلوی نے لکھا ہے:

''ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ترتیب کے خلاف پڑھنا مطلقاً جائز ہے۔'' [شرح مسلم (۵۳۰/۲)]

بہرکیف صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ترتیب کے خلاف پڑھنا جائز ہے، اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ جاہل و ناواقف افراد کا خلافِ سنت و حدیث کا فتویٰ لگانا سوائے گمراہی کے اور کیا ہوسکتا ہے؟ ایسے حضرات کو پیار

اور محبت سے سمجھائیں اور ان میں قرآن و حدیث کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔(آمین!)

نماز میں قرآن سے دیکھ کر قراءت کرنا

(سوال) کیا نفل نماز (جیسے تراویح) میں قرآن مجید سے دیکھ کر قراءت کی جا سکتی ہے؟ احناف اس کے قائل نہیں، قرآن و سنت کی رو سے مسئلہ واضح فرما دیں۔

(جواب) نماز میں قرآن مجید اٹھا کر قراءت کرنا جائز و درست ہے لیکن اسے معمول نہیں بنانا چاہیے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں ہے:

« وَ كَانَتْ عَائِشَةُ يَؤُمُّهَا عَبْدُهَا ذَكْوَانُ مِنَ الْمُصْحَفِ » [بخاری (قبل الحدیث/٦٩٢) کتاب الأذان: باب إمامة العبد والمولی]

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی امامت ان کا غلام ذکوان قرآن دیکھ کر کرواتا تھا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کی شرح کرتے ہوئے فتح الباری میں رقمطراز ہیں:

''وَصَلَهُ أَبُوْ دَاوُدَ فِيْ كِتَابِ الْمَصَاحِفِ مِنْ طَرِيْقِ أَيُّوْبَ عَنِ ابْنِ أَبِيْ مُلَيْكَةَ ......''

''امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے کتاب المصاحف میں اس اثر کو بطریق ایوب عن ابن ابی ملیکہ اور اسی طرح ابن ابی شیبہ نے وکیع عن ہشام بن عروہ عن ابن ابی ملیکہ اور امام شافعی اور امام عبدالرزاق رحمہم اللہ نے بھی اس کو دوسرے واسطوں سے موصولاً بیان کیا ہے۔''

امام مروزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'' سُئِلَ ابْنُ شِهَابٍ عَنِ الرَّجُلِ يَؤُمُّ النَّاسَ فِيْ رَمَضَانَ فِي الْمُصْحَفِ قَالَ مَا زَالُوْا يَفْعَلُوْنَ ذٰلِكَ مُنْذُ كَانَ الْإِسْلَامُ كَانَ خِيَارُنَا يَقْرَءُوْنَ فِي الْمَصَاحِفِ '' [قیام اللیل (ص/١٦٨)]

''امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ سے ایسے آدمی کے متعلق سوال کیا گیا جو رمضان میں لوگوں کی امامت قرآن سے دیکھ کر کرتا تھا تو امام زہری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جب سے اسلام آیا ہے اس وقت سے وہ لوگ جو ہم سے بہتر تھے قراءت قرآن مجید سے کرتے رہے ہیں۔''

اس کے علاوہ امام مروزی رحمہ اللہ نے امام ابراہیم بن سعد، قتادہ، سعید بن مسیب، ایوب، عطاء، یحییٰ بن سعید، عبد اللہ بن وہب اور امام احمد بن حنبل (رحمہم اللہ) سے اس کا جواز نقل کیا ہے۔ نماز میں قرآن مجید سے قراءت کرنے سے امام ابو حنیفہ کے نزدیک نماز فاسد ہو جاتی ہے لیکن ان کے شاگردوں قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے اس مسئلہ میں ان کی مخالفت کی ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

" وَ اِذَا قَرَأَ الْاِمَامُ مِنَ الْمُصْحَفِ فَسَدَتْ صَلَاتُهٗ عِنْدَ اَبِیْ حَنِیْفَةَ وَ قَالَا هِیَ تَامَّةٌ "
[الهداية(١/ ١٣٧)]

" جب امام قرآن مجید دیکھ کر قراءت کرے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک نماز فاسد ہو جاتی ہے جب کہ ان کے شاگردوں کے نزدیک نماز مکمل ہو جاتی ہے۔"

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر تعجب ہے کہ ان کے نزدیک اگر نمازی قرآن دیکھ کر قراءت کرے تو نماز فاسد لیکن اگر نماز میں کسی عورت کی طرف بنظر شہوت دیکھے تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔ امام ابن نجیم حنفی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

" وَ لَو نَظَرَ الْمُصَلِّیْ اِلَی الْمُصْحَفِ وَ قَرَأَ مِنْهُ فَسَدَتْ صَلَاتُهٗ لَا اِلٰی فَرْجِ امْرَأَةٍ بِشَهْوَةٍ "
[الأشباه والنظائر(ص:٤١٨)]

" اگر نمازی نے قرآن سے دیکھ کر قراءت کی تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی لیکن اگر کسی عورت کی طرف بنظر شہوت دیکھا تو نماز فاسد نہیں ہو گی۔"

علمائے احناف کا اسے عمل کثیر کہہ کر رد کرنا تحکم اور سراسر باطل ہے، اگر اتنے عمل کو عمل کثیر کہہ کر نماز کو باطل قرار دے دیں تو اس قدر عمل کثیر نماز کے اندر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں آتا ہے:

« عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ کَانَ یُصَلِّیْ وَ هُوَ حَامِلٌ اُمَامَةَ بِنْتَ زَیْنَبَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ وَ لِاَبِی الْعَاصِ بْنِ رَبِیْعَةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ فَاِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا وَ اِذَا قَامَ حَمَلَهَا »[بخاری، کتاب الصلاة: باب إذا حمل جارية صغيرة علی عنقه فی الصلاة(٥١٦)]

" حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ امامہ بنت زینب بنت رسول اللہ کو نماز پڑھتے ہوئے اٹھائے رہتے تھے۔ ابو العاص بن ربیع بن عبد شمس کی حدیث میں ہے کہ جب سجدہ میں جاتے تو اتار دیتے اور جب قیام فرماتے تو اٹھا لیتے۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

« عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ نِمْتُ عِنْدَ مَیْمُوْنَةَ وَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ عِنْدَهَا تِلْكَ اللَّیْلَةَ فَتَوَضَّاَ ثُمَّ قَامَ یُصَلِّیْ فَقُمْتُ عَنْ یَّسَارِهٖ فَاَخَذَنِیْ فَجَعَلَنِیْ عَنْ یَمِیْنِهٖ »
[بخاری، کتاب الأذان : باب إذا قام الرجل عن يسار الامام فحوله الامام إلى يمينه لم تفسد صلاتهما (٦٩٨)]

" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک رات ام المومنین میمونہ کے گھر میں سویا ہوا تھا، اس رات نبی اکرم ﷺ کی بھی وہیں سونے کی باری تھی۔ آپ ﷺ نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے، میں آپ ﷺ کے بائیں طرف کھڑا ہو گیا تو آپ ﷺ نے مجھے پکڑ کر دائیں طرف کر دیا۔"

ان ہر دو حدیثوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا امامہ بنت زینب کو اٹھا کر نماز پڑھنا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بائیں طرف سے دائیں طرف کرنا عمل کثیر نہیں اور اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی تو قرآن مجید دیکھ کر قراءت کرنا بھی عمل کثیر نہیں اور نہ اس سے نماز فاسد ہی ہوتی ہے۔ عمل کثیر احناف کا من گھڑت مفروضہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں اور تعجب اس بات پر ہے کہ حنفی اس قانون کی خود بھی کئی مقامات پر مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ درمختار میں لکھا ہے:

''کتے کے بچے کو اٹھا کر نماز پڑھنا جائز ہے۔'' [در مختار (ص/ ۲۰)]

اور منیۃ المصلی میں ہے: ''نماز میں ٹھہر ٹھہر کر جوئیں مارنا عمل کثیر نہیں۔'' [منیة المصلی (ص/ ۱۰۰)]

احناف کا وتیرہ ہے کہ جو حدیث امام کے قول کے خلاف ہو اسے حیلوں کے ذریعے رد کر دیتے ہیں اور جو امام کے قول کے مطابق ہو خواہ وہ کتنی ہی ضعیف کیوں نہ ہو وہ ان کے ہاں حجت ٹھہرتی ہے۔ جیسا کہ اس کی مثالیں احناف کی معتبر کتب نور الأنوار، اصول الشاشی اور اصول بزدوی وغیرہ میں موجود ہیں۔

نماز میں آیات کا جواب دینا

سوال ہمارے ہاں نماز میں امام جب سورۃ الاعلیٰ پڑھتا ہے تو مقتدی اس کا جواب دیتے ہیں کیا ایسا کرنا سنت رسول سے ثابت ہے؟

جواب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ اِذَا قَرَأَ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ قَالَ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى » [ابو داود، کتاب الصلاة: باب الدعاء فی الصلاة(۸۸۳)]

''نبی کریم ﷺ جب ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ پڑھتے تو کہتے ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى۔''

یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ابو اسحاق سبیعی ہے جو مدلس ہے اور صیغہ عن سے روایت کرتا ہے اور یہاں تصریح بالسماع نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ثقات رواۃ نے اسے موقوفاً بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں ترمذی شریف میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سورۂ رحمٰن پڑھی اور صحابہ خاموش رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَقَدْ قَرَأْتُهَا عَلَى الْجِنِّ لَيْلَةَ الْجِنِّ فَكَانُوا اَحْسَنَ مَرْدُودًا مِّنْكُمْ »

''میں نے یہ سورت ایک رات جنوں پر پڑھی تو وہ تم سے اچھا جواب دیتے تھے۔''

جب ہر بار میں اس آیت پر پہنچتا تھا: ﴿ فَبِاَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾ تو وہ جواب میں کہتے: « لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ » ''اے ہمارے رب! تیری نعمتوں میں سے ہم کسی چیز کو نہیں جھٹلاتے، پس تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں۔'' [ترمذی، کتاب تفسیر القرآن: باب و من سورة الرحمن (۳۲۹۱)، تفسیر ابن کثیر (۲۸۹/٤)، ابن عدی (۱۰۷٤/۳)، حاکم (٤۷۳/۲)]

یہ روایت اپنے شواہد کی بنا پر حسن درجہ کی ہے مگر اس میں نماز کا ذکر نہیں ہے۔ یہ عام حالات میں تلاوت کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور حسن حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنی بعض نماز میں "اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَسِيْرًا" (اے اللہ! میرا حساب آسان فرما) کہتے۔

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے تلخیص میں ان کی موافقت کی ہے۔

[حاکم (٥٠١-٢٠٠)، احمد (٤٨/٦)، ابن خزيمة (٨٤٩)]

ان احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو آدمی قراءت کرے وہ جواب دے یا عام حالات میں جب تلاوت قرآن ہو تو سامع بھی جواب دے سکتا ہے لیکن مقتدی کا قرآن سن کر جواب دینا مجھے کسی حدیث سے نہیں ملا۔ (واللہ اعلم)

اونچی آواز سے آمین کہنے کا حکم

سوال سورۃ فاتحہ کے بعد بلند آواز سے آمین کہنے کی سنت رسول اور آثار صحابہ سے کیا دلیل ہے؟

جواب آمین بالجہر کئی ایک احادیث سے ثابت ہے جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

① سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَرَأَ ﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ ﴾ وَقَالَ اٰمِيْنَ وَ مَدَّ بِهَا صَوْتَهُ » [ترمذی، كتاب الصلاة، باب ما جاء فی التأمين(٢٤٨)، ابو داود، (٩٣٢)، دارمی (٢٨٤/١)، دارقطنی(٣٣٣/١)، بيهقی(٥٧/١)، ابن ابی شيبة(٤٢٥/٢)]

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا آپ نے ﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ ﴾ پڑھا اور آمین کے ساتھ اپنی آواز کو لمبا کیا۔" بعض روایتوں میں "مَدَّ بِهَا صَوْتَهُ" کی جگہ "رَفَعَ بِهَا صَوْتَهُ" آتا ہے یعنی اپنی آواز کو بلند کیا۔

② صحیح بخاری میں ہے:

« اَمَّنَ ابْنُ الزُّبَيْرِ وَ مَنْ وَرَاءَهُ حَتّٰى اَنَّ لِلْمَسْجِدِ لَلَجَّةً » [بخاری، كتاب الأذان: باب : جهر الإمام بالتأمين (قبل الحديث/ ٧٨٠)، مسند شافعی (٢١٢/١٥)، بيهقی (٥٩/٢)]

"حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کے مقتدیوں نے اس قدر بلند آواز سے آمین کہی کہ مسجد لرز گئی۔"

③ « عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ مَا حَسَدَتْكُمُ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ مَا حَسَدَتْكُمْ عَلَى السَّلَامِ وَ التَّاْمِيْنِ » [ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة: باب الجهر بآمين (٨٥٦)، احمد(١٣٤/٦-١٣٥)، بيهقی(٥٦/٢)، ابن خزيمة (٥٧٤)، امام بوصيری رحمہ اللہ نے اسے صحيح كها هے -[مصباح الزجاجة(٢٩٧/١)]

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہودی جس قدر آمین اور سلام پر حسد کرتے ہیں اس قدر کسی چیز پر حسد نہیں کرتے۔"

④ حضرت عطاء تابعی رحمہ اللہ (جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے استاد ہیں) سے مروی ہے:
''میں نے مسجد حرام میں دوسو (۲۰۰) صحابہ کرام کو پایا، جب امام ﴿ وَلَا الضَّالِّيْنَ ﴾ کہتا تو سب صحابہ بلند آواز سے آمین کہتے تھے۔'' [بیهقی(۲/ ۵۹)، ابن حبان(۱۹۹۶، ۱۹۹۷)]
ان روایات سے معلوم ہوا کہ اونچی آواز سے آمین کہنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے، اس لیے ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔

فرائض کی آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت پڑھنا

(سوال) کیا فرائض کی آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے علاوہ بھی کوئی سورت پڑھ سکتے ہیں؟
(جواب) فرائض کی آخری دو رکعات میں فاتحہ کے علاوہ کوئی سورت پڑھنا جائز ہے اور یہ جواز صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:
''ہم رسول اللہ ﷺ کی ظہر اور عصر کی قراءت کا اندازہ اور تخمینہ لگاتے، آپ ﷺ نے ظہر کی پہلی رکعت میں سورۂ ''آلم تنزیل السجدۃ'' جتنی قراءت کی اور دوسری روایت کے مطابق آپ نے ہر ایک رکعت میں تیس آیات کے برابر قراءت کی اور آخری دو رکعتوں میں پہلی دو رکعتوں کی قراءت کی مقدار سے آدھی قراءت کی اور نماز عصر کی پہلی دو رکعتوں میں نماز ظہر کی آخری دو رکعتوں کی قراءت کے برابر قراءت کی اور آخری دو رکعتوں میں پہلی دو رکعتوں کی قراءت سے آدھی قراءت کی۔'' [مسلم، كتاب الصلوٰة: باب القراءة في الظهر والعصر (۴۵۲)]
اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ آخری دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ کوئی اور سورت بھی پڑھ سکتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ پہلی دو رکعتوں میں اگر تیس آیات پڑھتے تو آخری رکعتوں میں اس سے آدھی قراءت پندرہ آیات بنتی ہیں جبکہ سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں، معلوم ہوا کہ آخری رکعات میں فاتحہ کے علاوہ قراءت جائز و درست ہے۔

کیا رفع الیدین کا حکم منسوخ ہو چکا

(سوال) ہم اہلحدیث نماز میں رفع الیدین کرتے ہیں احناف کہتے ہیں یہ منسوخ ہو چکا کیا واقعی ایسا ہے؟
(جواب) رفع الیدین رسول اللہ ﷺ کی متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ کسی بھی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے کبھی رفع الیدین نہ کیا ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:
« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَ اِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوْعِ وَ اِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ رَفَعَهُمَا كَذٰلِكَ اَيْضًا »[بخاری، كتاب الأذان: باب رفع اليدين في التكبيرة الأولى مع الافتتاح سواء(۷۳۵)، احمد(۲/ ۸)، مؤطا (۱/ ۷۵)، عبد الرزاق(۲۵۱۷)، ابن ماجه (۸۵۸)، دارمی(۱/ ۲۸۵)، دارقطنی(۱/ ۲۸۷)، بیهقی (۲/ ۶۹) ، شرح السنة(۵۵۹)، ابوعوانة

(۹۱/۲) ، ابو داؤد(۷۲۱)]

’’رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتے اور جب رکوع کے لیے تکبیر کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اسی طرح اٹھاتے تھے۔‘‘

اسی طرح رفع الیدین کی روایت سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[ابو داؤد، کتاب الصلاۃ : باب رفع الیدین فی الصلاۃ (۷۲٦)]

سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام صحابی ہیں۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں :

’’ وَائِلُ بْنُ حُجْرٍ اَسْلَمَ فِي الْمَدِيْنَةِ فِي سَنَةِ تِسْعٍ مِّنَ الْهِجْرَةِ ‘‘ [عمدۃ القاری شرح بخاری (۹/۳)]

’’وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ۹ ہجری میں مدینہ میں مسلمان ہوئے۔‘‘

یہ حضر موت کے علاقہ میں رہتے تھے اور حضر موت سے مدینہ تک اس وقت کی مسافت کے لحاظ سے چھ ماہ کا سفر تھا۔ پہلی دفعہ آپ کے پاس آئے اور آپ سے دین کے احکامات سیکھ کر دوبارہ اپنے وطن واپس چلے گئے پھر اس کے بعد ۱۰ ھ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ بیان کرتے ہیں :

« ثُمَّ جِئْتُ بَعْدَ ذٰلِكَ فِيْ زَمَانٍ فِيْهِ بَرْدٌ شَدِيْدٌ فَرَاَيْتُ النَّاسَ عَلَيْهِمْ جُلُّ الثِّيَابِ تَحَرَّكُ اَيْدِيْهِمْ تَحْتَ الثِّيَابِ » [ابوداؤد، کتاب الصلاۃ: باب رفع الیدین فی الصلاۃ(۷۲۷)]

’’اس کے بعد ایک زمانے میں میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ ان دنوں سخت سردی تھی۔ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ ان کے اوپر موٹی چادریں تھیں، ان کے ہاتھ کپڑوں کے نیچے سے حرکت کرتے تھے۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ ۱۰ ھ تک آپ ﷺ سے رفع الیدین ثابت ہے، اس کے بعد آپ وفات پا گئے۔ جو حضرات رفع الیدین کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں وہ ۱۰ ھ کے بعد کی عدم رفع الیدین کی کوئی صحیح روایت پیش کریں اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے رفع الیدین کا حکم اس لیے دیا کہ کافر آپ کے پیچھے بت لے کر کھڑے ہو جاتے تھے تو یہ جاہلوں کا پھیلایا ہوا بہت بڑا جھوٹ ہے، جسے بیان کرنے والا اگر کوئی عالم ہے تو اسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ ایسی بات کا وجود تو پورے ذخیرہ حدیث میں کہیں بھی نہیں، نہ کسی صحیح حدیث میں اور نہ کسی ضعیف حدیث میں۔ محض لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے کے شوق میں اور سیاسی اور جمہوری مصلحتوں میں آ کر نبی اکرم ﷺ سے جھوٹی بات منسوب کرنا اور اس پر اصرار کرنا اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ ایسی مصلحتوں کا دنیا میں تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، لیکن آخرت میں لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر سنت رسول ﷺ کے خلاف ایسی مہم بازی کا جو نتیجہ نکلے گا، اس سے پھر وہاں کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کفار کا آپ ﷺ کے پیچھے نماز کے لیے کھڑا ہونا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ اگر رفع الیدین اس لیے کیا کہ لوگ بغلوں میں جو بت رکھتے تھے ان کو گرانے کا یہ ایک طریقہ تھا تو کیا پہلی دفعہ تکبیر تحریمہ کے ساتھ جو رفع الیدین کی جاتی ہے اس وقت بت نہیں گرتے تھے؟ جو لوگ پہلی دفعہ رفع الیدین کے وقت بت نہیں گرنے دیتے وہ رکوع کی رفع الیدین

کے وقت کیسے گرنے دیں گے؟

نبی کریم ﷺ سے ترک رفع الیدین کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ امام جلال الدین سیوطی نے اپنی مایہ ناز کتاب" الأزهار المتناثرة فی الأخبار المتواترة" میں رفع الیدین کی حدیث کو متواتر کہا ہے۔ اسی طرح " نظم المتناثر" میں "الحدیث المتواتر" اور تدریب الراوی وغیرہ ملاحظہ ہو۔

امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ بھی صحیح روایت کے مطابق رفع الیدین کے قائل و فاعل تھے۔ ان سے اس مسئلہ پر کوئی اختلاف اور بحث مروی نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی رفع الیدین والی حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

« وَ بِهٰذَا يَقُوْلُ اَهْلُ الْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنْهُمْ ابْنُ عُمَرَ وَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ وَ اَنَسٌ وَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الزُّبَيْرِ وَ غَيْرُهُمْ وَ مِنَ التَّابِعِيْنَ الْحَسَنُ الْبَصرِيُّ وَ عَطَاءٌ وَ طَاوُسٌ وَ مُجَاهِدٌ وَ نَافِعٌ وَ سَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَ سَعِيْدُ بْنُ جُبَيْرٍ وَ غَيْرُهُمْ وَ بِهٖ يَقُوْلُ مَالِكٌ وَ مَعْمَرٌ وَ الْاَوْزَاعِيُّ وَ ابْنُ عُيَيْنَةَ وَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْمُبَارَكِ وَ الشَّافِعِيُّ وَ اَحْمَدُ وَ اِسْحَاقُ » [سنن ترمذی، کتاب الصلاة، باب رفع الیدین عند الرکوع (٢٥٦)]

" یہی بات صحابہ کرام میں سے اہل علم کہتے ہیں۔ ان میں سے ابن عمر، جابر بن عبداللہ، ابو ہریرہ، انس، ابن عباس، عبد اللہ بن زبیر وغیرہم رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے حسن بصری، عطا، طاؤس، مجاہد، نافع، سالم اور سعید بن جبیر وغیرہم رحمہم اللہ اور یہی بات امام مالک، امام معمر، امام اوزاعی، امام ابن عیینہ، امام عبداللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کہتے ہیں۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ کی اس صراحت سے معلوم ہوا کہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ وغیرہ بھی رفع الیدین کے قائل تھے۔

لٰہذا یہ کہنا کہ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف تھا جو ختم نہیں ہو سکا، سراسر غلط اور بے بنیاد ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ بفرض محال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ شافعی و مالک میں یہ اختلاف تھا تو پھر بھی ان کے اختلاف کی وجہ سے مسئلہ رفع الیدین پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی، کیونکہ یہ آپ ﷺ کی متواتر سنت ہے جو آپ ﷺ نے کبھی ترک نہیں کی اور آپ ﷺ کی حدیث کے مدمقابل تو کسی امام کی بات قابل حجت نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو ظاہر ہے اس نے حدیث رسول ﷺ کے مقابلے میں امام جو امتی ہے، کو نبی کریم ﷺ سے بھی بڑا درجہ دے دیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھیوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

" يُظْهِرُوْنَ شِعَارَ اَهْلِ الْحَدِيْثِ مِنْ اِفْرَادِ الْاِقَامَةِ وَ رَفْعِ الْاَيْدِيْ فِي الصَّلَوَاتِ وَ غَيْرِ ذٰلِكَ "
[سیر إعلام النبلاء (١٢/ ٤٦٥)]

" امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھی اہل حدیث کے شعار (علامات) اکہری اقامت اور رفع الیدین کا علی الاعلان اظہار

کرتے تھے۔"

لہٰذا رفع الیدین سنت نبوی ہے اور شروع سے لے کر آج تک کتاب و سنت کے متوالوں کا عمل ہے۔ مسئلہ رفع الیدین کی تفصیل کے لیے محدث العصر امام محمد گوندلوی رحمہ اللہ کی کتاب "التحقیق الراسخ فی ان أحادیث رفع الیدین لیس لها ناسخ" اور استاذ الاساتذہ حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ کی کتاب "مسئلہ رفع الیدین، تحریری مناظرہ" وغیرہ ملاحظہ کریں۔

سجدہ کرتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھیں یا گھٹنے؟

سوال سجدہ کرتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھیں یا گھٹنے اگر دونوں کی احادیث صحیح ہیں تو ترجیح کسے دیں گے؟

جواب زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ سجدہ کے لیے جھکتے وقت پہلے زمین پر ہاتھ رکھنے چاہییں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ وَ لْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ » [ابوداود، کتاب الصلاة : باب كيف يضع ركبتيه قبل يديه (٨٤٠)، نسائی(٢/٢٠٧)، دارمی(١/٣٠٣)، احمد(٢/٣٨١)، دارقطنی)(١/٣٤٤)، بیہقی(٢/٩٩-١٠٠)]

"جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے بلکہ اپنے ہاتھ گھٹنوں سے پہلے رکھے۔"

اس حدیث کی سند جید ہے۔ امام نووی، امام زرقانی، امام عبدالحق، شبیلی اور علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ والی حدیث سے زیادہ قوی ہے۔ [ملاحظہ ہو: المجموع(٣/٤٢١)، تحفة الأحوذی(١/٢٢٩)، سبل السلام(١/٣١٦)]

اس حدیث کے لیے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی حدیث بھی شاہد ہے۔ نافع رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھ رکھا کرتے تھے اور فرماتے تھے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے تھے۔" [ابن خزيمة(٦٢٧)، دارقطنی(١/٣٤٤)، بیہقی(٢/١٠٠)، حاکم(١/٢٢٦)]

اس حدیث کو امام حاکم رحمہ اللہ نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔ جو لوگ سجدہ میں جاتے ہوئے پہلے گھٹنے رکھنے کے قائل ہیں وہ یہ روایت پیش کرتے ہیں:

« عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ وَ إِذَا نَهَضَ رَفَعَ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ »[ابو داود، کتاب الصلاة: باب كيف يضع ركبتيه قبل يديه،(٨٣٨) ، نسائی(٢/٢٠٦)، ترمذی (٢٦٨)، ابن ماجه (٨٨٢)، دارمی (١/٣٠٣)، ابن خزيمة(٦٢٦)، طحاوی(١/٢٥٥)، ابن حبان(٤٨٧)، دارقطنی (١/٣٤٥)، بیہقی (٢/٩٨) شرح السنة(٦٤٢)]

"حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ سجدہ کرتے تو دونوں گھٹنے ہاتھوں

سے پہلے زمین پر رکھتے اور جب سجدے سے اٹھتے تو دونوں ہاتھ گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے۔"

لیکن یہ روایت ضعیف ہے اس کی سند میں شریک بن عبد اللہ القاضی راوی ضعیف ہے۔[تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: السلسلة الأحاديث الضعيفة(٣٢٩/٢)]

درج بالا تفصیل سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ راجح اور قوی مذہب یہی ہے کہ سجدے میں جاتے وقت آدمی گھٹنوں کے بجائے پہلے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے۔ امام اوزاعی، امام مالک، امام ابن حزم اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل ﷫ کا بھی یہی موقف ہے۔

اگر حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے پھر بھی ترجیح اسی موقف کو ہے۔ اس لیے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث قولی ہے اور وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث فعلی ہے اور تعارض کی صورت میں قولی حدیث کو فعلی حدیث پر ترجیح دی جاتی ہے اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شاہد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی صحیح حدیث بھی ہے۔ علاوہ ازیں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھنے کی ممانعت ہے اور تعارض کی صورت میں ممانعت والی روایت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

دورانِ سجدہ پاؤں کی کیفیت

سوال دوران سجدہ پاؤں رکھنے کا مسنون طریقہ بتلا کر ممنون فرمائیں؟

جواب دورانِ سجدہ دونوں پاؤں ملا کر کھڑے ہوں اور پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ کر کے دونوں ایڑیاں ملا کر رکھنی چاہییں۔ حدیث میں آتا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ میرے بستر پر تھے اور رات کو میں نے آپ ﷺ کو بستر پر نہ پایا تو میں نے آپ ﷺ کو تلاش کرنا شروع کیا:

«فَوَقَعَتْ يَدِىْ عَلٰى بَطْنِ قَدَمِهٖ وَ هُوَ فِى الْمَسْجِدِ وَ هُمَا مَنْصُوْبَتَانِ»[مسلم، كتاب الصلاة: باب ما يقال فى الركوع والسجود(٤٨٦)]

"میرا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے قدموں کے تلوؤں پر لگا، آپ سجدہ کی حالت میں تھے اور آپ کے قدم مبارک کھڑے تھے۔"

اسی طرح ایک دوسری روایت میں آتا ہے:

«فَوَجَدْتُّهٗ سَاجِدًا رَّاصًّا عَقِبَيْهِ مُسْتَقْبِلًا بِاَطْرَافِ اَصَابِعِهِ الْقِبْلَةَ» [ابن خزيمة(١٢٨/١)، بيهقى فى السنن الكبرىٰ(١١٦/١)، حاكم(١٢٨/١)]

"میں نے آپ ﷺ کو سجدے کی حالت میں اس طرح پایا کہ آپ ﷺ اپنی ایڑیوں کو ملانے والے اور اپنی انگلیوں کے سروں کو قبلہ رخ کرنے والے تھے۔"

دورانِ سجدہ دعا مانگنا

(سوال) سجدے کے دوران دعا کرنا کیسا ہے؟ اور کیا صرف مسنون دعا ہی کرنا جائز ہے؟ تفصیل سے بتا دیں۔

(جواب) فرمان نبوی ﷺ ہے:

① « عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ اَقْرَبُ مَا یَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَ هُوَ سَاجِدٌ فَاَكْثِرُوْا الدُّعَاءَ » [مسلم، كتاب الصلاة: باب ما يقال في الركوع والسجود (٤٨٢)، شرح السنة(١٥١/٣)]

" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے کی حالت میں ہو، پس (تم سجدے کی حالت میں) کثرت سے دعا کرو۔"

② « عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ كَشَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ السِّتَارَةَ وَ النَّاسُ صُفُوْفٌ خَلْفَ اَبِیْ بَكْرٍ فَقَالَ اَیُّهَا النَّاسُ ! اِنَّهٗ لَمْ یَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّةِ اِلَّا الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ یَرَاهَا الْمُسْلِمُ اَوْ تُرٰی لَهٗ اَلَا وَ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَقْرَاَ الْقُرْاٰنَ رَاكِعًا اَوْ سَاجِدًا فَاَمَّا الرُّكُوْعُ فَعَظِّمُوْا فِیْهِ الرَّبَّ عَزَّ وَ جَلَّ وَ اَمَّا السُّجُوْدُ فَاجْتَهِدُوْا فِی الدُّعَاءِ فَقَمِنٌ اَنْ یُّسْتَجَابَ لَكُمْ »
[مسلم، كتاب الصلاة: باب النهي عن قراءة القرآن في الركوع والسجود(٤٧٩)، ابو داؤد ، كتاب الصلاة: باب في الدعاء في الركوع والسجود(٨٧٦)، نسائي(١٠٤٤)، ابن ماجه(٣٨٩٩)، احمد(٢١٩/١)، دارمي (١٣٣١)، ابن خزيمة (٣٠٣/١)]

" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پردہ ہٹایا، لوگ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے صفیں باندھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: " اے لوگو! نبوت کی بشارتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی سوائے اچھے خواب کے جسے مسلمان دیکھتا ہے یا اسے دکھایا جاتا ہے۔ خبردار! مجھے رکوع یا سجدے میں قرآن پڑھنے سے روکا گیا ہے۔ رکوع میں تم اپنے رب کی تعظیم کرو اور سجدے میں دعا کرنے میں مبالغہ کرو، یہ تمھاری دعا کی قبولیت کے زیادہ لائق ہے۔"

③ « عَنْ عَلِیٍّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ رَفَعَهٗ اَنَّهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی اَنْ یَّقْرَاَ الْقُرْاٰنَ وَ هُوَ رَاكِعٌ وَ قَالَ اِذَا رَكَعْتُمْ فَعَظِّمُوْا اللّٰهَ وَ اِذَا سَجَدْتُّمْ فَادْعُوْا فَقَمِنٌ اَنْ یُّسْتَجَابَ لَكُمْ »
[احمد(٥٥/١)]

"سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حالت رکوع میں قرآن پڑھنے سے منع کیا ہے اور فرمایا: "جب تم رکوع کرو تو اللہ کی تعظیم کرو اور جب تم سجدہ کرو تو دعا کرو کیونکہ یہ تمھاری دعا کی قبولیت کے زیادہ لائق ہے۔"

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ سجدے میں دعا مانگنے کی ترغیب دی گئی ہے اور یہ احادیث عام ہیں لہٰذا فرض اور نفلی تمام سجدوں کو شامل ہیں اور ان میں دنیا و آخرت کی خیر طلب کرنا اور ان کے شر سے پناہ مانگنا جائز ہے۔ مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری ﷫ فرماتے ہیں:

" وَالْحَدِيْثُ دَلِيْلٌ عَلٰى مَشْرُوْعِيَةِ الدُّعَاءِ حَالَ السُّجُوْدِ بِاَيِّ دُعَاءٍ كَانَ مِنْ طَلَبِ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَ الْاِسْتِعَاذَةُ مِنْ شَرِّهِمَا" [مرعاة المفاتيح (١٩٧/٣)]

"یہ حدیث سجدوں کی حالت میں دعا کی مشروعیت پر دلیل ہے، دنیا و آخرت کی خیریت طلب کرنے اور ان کے شر سے پناہ مانگنے پر مشتمل کوئی بھی دعا ہو سکتی ہے۔"

حافظ ابن حجر عسقلانی ﷫ فرماتے ہیں:

" اَلْاَمْرُ بِاِكْثَارِ الدُّعَاءِ فِي السُّجُوْدِ يَشْمَلُ الْحَثَّ عَلٰى تَكْثِيْرِ الطَّلَبِ لِكُلِّ حَاجَةٍ كَمَا جَاءَ فِيْ حَدِيْثِ اَنَسٍ لِيَسْئَلَ اَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَةً كُلَّهَا حَتّٰى شِسْعَ نَعْلِهِ اَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَ يَشْمَلُ التَّكْرَارُ لِلسُّوَالِ الْوَاحِدِ" [مرعاة المفاتيح(١٨٨/٣)، فتح البارى(٣٠٠/٢)]

"سجدوں میں کثرت سے دعا مانگنے کا حکم ہر قسم کی حاجت کو کثرت سے طلب کرنے کی ترغیب پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ انس ﷜ کی حدیث میں آیا ہے: "تم میں سے ہر ایک اپنی تمام حاجات اپنے رب سے مانگے یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی۔" اس حدیث کو امام ترمذی ﷫ نے نقل کیا ہے اور یہ حدیث ایک ہی سوال بار بار کرنے کو بھی شامل ہے۔"

سید سابق ﷫ سجدے کی مقدار اور اذکار کے تحت رقمطراز ہیں:

" وَالْمُسْتَحَبُّ لَا يَقْتَصِرُ الْمُصَلِّيْ عَلَى التَّسْبِيْحِ بَلْ يَزِيْدُ عَلَيْهِ مَا شَاءَ مِنَ الدُّعَاءِ "
[فقه السنة(١٤٨/١)]

"مستحب یہ ہے کہ نمازی صرف تسبیح پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس پر جو بھی دعا چاہے اضافی طور پر مانگے۔"

قاضی شوکانی ﷫ فرماتے ہیں:

" اَلْاِسْتِكْثَارُ مِنَ الدُّعَاءِ بِخَيْرِ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ بِمَا وَرَدَ وَ بِمَا لَمْ يَرِدْ" [الدرر البهية(ص/٣٢)]

"نماز میں دنیا و آخرت کی بھلائی کی دعا کثرت سے مانگنی چاہیے خواہ وہ دعا منقول ہو یا نہ ہو۔"

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: [الدرارى المضية(٩١/١)، السموط الذهبية (ص/٥٩)، الروضة الندية(١٠٥/١)]

اگر آپ کہیں کہ کس دلیل سے قاضی شوکانی ﷫ نے نماز کے اندر ماثور وغیر ماثور دعاؤں کو جائز قرار دیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی حدیث جس میں دو سجدوں میں دعا مانگنے کا کہا گیا ہے اور تشہد میں دعا کیلئے اس حدیث کو پیش کیا ہے:

« ثُمَّ لِيَتَخَيَّرْ اَحَدُكُمْ مِنَ الدُّعَاءِ مِمَّا اَعْجَبَهُ اِلَيْهِ » [ابو داود، كتاب الصلاة، باب التشهد (٩٦٨)، بخارى(٨٣١)]

”پھر تم میں سے ہر کسی کو جو دعا پسند ہو اختیار کرے۔“

آپ ﷺ نے نمازی کے لیے دعا میں اختیار دے دیا ہے کہ وہ جو چاہے دعا کرے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ عبادات چونکہ توقیفی ہوتی ہیں اس لیے دعا عربی زبان ہی میں مانگی جائے۔ قرآن وسنت میں کتنی ایسی دعائیں مذکور ہیں جو دنیا و آخرت کی بھلائیوں کو شامل ہیں، ان میں سے کوئی اختیار کرلی جائے۔ اگر کوئی شخص واقعی ایسا ہے کہ وہ عربی میں دعائیں یاد نہیں کرسکتا تو اس کے لیے گنجائش ہوسکتی ہے کیونکہ معذوروں کے لیے الگ شرعی قاعدہ موجود ہے۔

سجدہ سہو کا حکم

(سوال) اگر نمازی بھول کر رکعات میں کمی بیشی کر بیٹھے تو اس کا حل کیا ہے؟ نیز سجدہ سہو کا مسنون طریقہ بتا دیں۔

(جواب) اگر کوئی آدمی بھول کر ایک رکعت کم پڑھ بیٹھے، پھر اسے یاد آجائے کہ میں نے ایک رکعت کم پڑھی ہے تو اسے پوری نماز دہرانے کی بجائے ایک رکعت ہی ادا کر لینی چاہیے، جیسا کہ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز عصر پڑھائی اور تین رکعت ادا کر کے سلام پھیر دیا پھر اپنے گھر چلے گئے پھر ایک شخص جسے خرباق کہا جاتا تھا، اس نے رسول اللہ ﷺ کو جا کر بتایا کہ نماز میں سہو واقع ہوا ہے، تب آپ ﷺ غصے کی حالت میں اپنی چادر کھینچتے ہوئے لوگوں کے پاس آئے اور پوچھا:

« اَصَدَقَ هٰذَا؟ قَالُوْا نَعَمْ فَصَلّٰى رَكْعَةً ثُمَّ سَلَّمَ ، ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ » [مسلم، کتاب المساجد، باب السهو فی الصلاۃ والسجود له(٥٧٤)]

”کیا اس نے سچ کہا ہے؟“ صحابہ نے عرض کیا: ”ہاں!“ پھر آپ ﷺ نے ایک رکعت نماز ادا کی، پھر سلام پھیرا، پھر دو سجدے کیے اور پھر سلام پھیرا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آدمی کی نماز ایک رکعت کم ہوگئی اور اس نے تین رکعت ادا کر لی ہوں اگرچہ اس دوران کچھ باتیں بھی ہو چکی ہوں تو وہ باقی ایک رکعت ہی ادا کر کے سلام پھیرے اور سجدہ سہو کر لے۔ سجدہ سہو کے بارے میں دو قسم کی احادیث مروی ہیں۔ ایک حدیث میں سلام سے پہلے سجدہ سہو کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں سلام کے بعد سجدہ سہو کا ذکر ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں آتا ہے:

« ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يُّسَلِّمَ » [مسلم، کتاب المساجد: باب السهو فی الصلاۃ(٥٧١)]

”پھر سلام سے قبل دو سہو کے سجدے کیے۔“

اس کا طریقہ یہ ہے کہ آخری قعدے میں تشہد، درود اور دعا کے بعد اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں جائے، پھر اٹھ کر بیٹھ جائے، پھر سجدہ کر کے سلام پھیر دے۔ سلام سے پہلے سجدہ سہو کا جو طریقہ ہے وہ متفق علیہ ہے اور جو سجدہ سہو سلام کے بعد مذکور ہے وہ متفق علیہ تو نہیں لیکن صحیح حدیث سے ثابت ہے اور جائز عمل ہے۔

احناف کے ہاں جو سجدہ سہو کا طریقہ معروف ہے کہ التحیات "عبده و رسوله" تک پڑھ کر ایک طرف سلام پھیرا جائے پھر پورا تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے، یہ طریقہ کسی صحیح حدیث میں موجود نہیں ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔

اگر نمازی بھول کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے

(سوال) اگر نمازی بھول کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے اور اسے حالت قیام ہمیں یاد آ جائے کہ میں پانچویں رکعت میں کھڑا ہوں تو کیا اسی وقت بیٹھ جائے یا باقی رکعت ادا کر کے بیٹھے پھر سلام پھیرے؟ احناف کا موقف تو معلوم ہے کہ جیسے ہی یاد آ جائے فوراً حالت تشہد میں واپس آ جائے خواہ کسی حالت میں ہو، براہ کرم صحیح راہ نمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(جواب) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پانچ رکعات پڑھی تو آپ سے کہا گیا: "کیا نماز میں اضافہ کر دیا گیا ہے؟" آپ نے فرمایا: "وہ کیا؟" صحابی نے کہا: "آپ نے پانچ رکعات نماز پڑھی ہے۔" تو آپ نے سلام کے بعد دو سہو کے سجدے کیے۔" [صحيح البخاري، كتاب السهو: باب اذا صلى خمسا (١٢٢٦)، صحيح مسلم، كتاب المساجد، مواضع الصلاة، باب السهو فى الصلاة: (٥٧٢)، ابوداؤد (١٠١٩)]

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں کہ:

"اس حدیث میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور جمہور سلف و خلف رحمہم اللہ کے مذہب کی دلیل ہے کہ جس آدمی نے اپنی نماز میں بھول کر ایک رکعت زائد کر دی اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اہل کوفہ نے کہا: "جب بھول کر ایک رکعت زائد کر دے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے، اس پر نماز کا اعادہ لازم ہے۔" امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مزید کہا: "اگر چوتھی رکعت میں تشہد بیٹھا پھر پانچویں زائد کر دی تو وہ ساتھ چھٹی رکعت ملا کر انھیں جفت کر دے اور یہ دو رکعت نفل ہو جائیں گی، اس پر بنا کرتے ہوئے، اس لیے کہ سلام واجب نہیں ہے اور ہر اس عمل کے ساتھ نماز سے نکل سکتا ہے جو نماز کے منافی ہو اور ایک رکعت اکیلی نماز نہیں ہوتی اور اگر چوتھی رکعت میں تشہد کے لیے نہیں بیٹھا تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے اس لیے کہ بقدر تشہد بیٹھنا واجب ہے جس کی ادائیگی اس نے نہیں کی یہاں تک کہ پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا۔" لیکن مذکورہ بالا حدیث ان تمام باتوں کو رد کرتی ہے اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پانچویں رکعت سے نہ واپس پلٹے ہیں اور نہ ساتھ ایک اور رکعت ملا کر اسے جفت کیا ہے۔"

[شرح صحيح مسلم: (٥/٥٥)۔ مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت]

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اہل علم نے اس باب میں اختلاف کیا ہے، اس حدیث کے ظاہری معنی کے مطابق محدثین کی ایک جماعت کا قول ہے جن میں سے علقمہ، حسن بصری، عطاء نخعی، زہری، مالک، اوزاعی، شافعی، احمد ابن حنبل اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ ہیں۔" سفیان ثوری نے کہا ہے: "اگر نمازی چوتھی رکعت میں نہیں بیٹھا تو مجھے زیادہ پسند ہے کہ وہ اعادہ کرے۔" امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا: "اگر چوتھی رکعت میں بقدر تشہد نہیں بیٹھا اور پانچویں کا سجدہ کر لیا تو اس کی نماز فاسد ہے

اس پر لازم ہے کہ نماز نئے سرے سے ادا کرے اور اگر چوتھی رکعت میں بقدر تشہد بیٹھا ہے تو اس کی نماز ظہر مکمل ہوگئی اور پانچویں رکعت نفل ہے، وہ اس کے ساتھ ایک اور رکعت ملا لے پھر تشہد بیٹھے اور سلام پھیر دے اور سہو کے دو سجدے کر لے۔ تو اس کی نماز پوری ہوگئی۔'' امام خطابی فرماتے ہیں: ''سنت کی پیروی اولیٰ ہے۔''

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی سند اتنی عمدہ ہے کہ اہل کوفہ کے ہاں اس سے زیادہ عمدہ کوئی سند نہیں۔ جو شخص ظاہر حدیث کی طرف گیا ہے تو دو صورتوں میں سے ایک صورت لازمی ہے کہ آپ ﷺ نے چوتھی رکعت میں تشہد کیا یا نہیں کیا۔ اگر آپ نے چوتھی رکعت میں تشہد نہیں کیا تو آپ نے نماز نئے سرے سے ادا نہیں کی بلکہ اس نماز کو شمار کیا اور سہو کے دو سجدے کیے، ہر دو صورتوں میں اہل کوفہ کی بات میں فساد و خرابی داخل ہو جاتی ہے۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیں تحفة الاحوذی: (۴۲۵/۲)، (۴۲۶)، نیل الاوطار، ابواب سجود السهود: (ص/۵۶۹)]

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص بھول کر چار رکعات والی نماز میں پانچویں کا اضافہ کر بیٹھے تو وہ سجدہ سہو کر لے تو اس کی نماز درست ہو جاتی ہے۔ اضافہ کا موقف بلا دلیل ہے۔

تشہد میں انگشت شہادت کو حرکت دینا

سوال کیا دوران تشہد انگشت شہادت کو حرکت دینا مسنون ہے؟

جواب دورانِ تشہد انگشتِ شہادت کو حرکت دینی چاہیے کیونکہ یہ نبی ﷺ کی سنت ہے جب کہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

« ثُمَّ رَفَعَ أُصْبَعَهُ فَرَاَيْتُهُ يُحَرِّكُهَا يَدْعُوْ بِهَا » [نسائی، کتاب الصلاة: باب قبض الثنتين من أصابع اليد اليمنى و عقد الوسطى والإبهام منها (۱۲۶۹)]

''نبی ﷺ نے اپنی انگلی کو اٹھایا پھر اسے حرکت دیتے رہے اور دعا کرتے رہے۔''

مولوی سلام اللہ حنفی شرح موطا میں لکھتے ہیں:

"وَ فِيْهِ تَحْرِيْكُهَا دَائِمًا اِذَا الدُّعَاءُ بَعْدَ التَّشَهُّدِ"

''اس حدیث میں ہے کہ انگلی کو تشہد میں ہمیشہ حرکت دیتے رہنا ہے کیونکہ دعا تشہد کے بعد ہوتی ہے۔''

علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فَفِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ السُّنَّةَ اَنْ يَّسْتَمِرَّ فِى الْاِشَارَةِ وَ فِىْ تَحْرِيْكِهَا اِلَى السَّلَامِ لِاَنَّ الدُّعَاءَ قَبْلَهُ"

[صفة صلاة النبی(ص/۱۵۸)]

''اس حدیث میں دلیل ہے کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ انگلی کا اشارہ اور حرکت سلام تک جاری رہے کیونکہ دعا سلام سے متصل ہے۔''

اس کے علاوہ صرف ایک مرتبہ انگلی اٹھا کر رکھ دینا یا ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' پر اٹھانا، اس کے بارے میں صحیح

احادیث سے کوئی دلیل نہیں ملتی جب کہ یہ عمل مذکورہ حدیث کے منافی ہے۔ جس روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ تشہد میں انگلی کو حرکت نہیں دیتے تھے وہ حدیث بھی ضعیف ہے کیونکہ اس میں محمد بن عجلان عامر بن عبد اللہ بن زبیر سے بیان کرتا ہے اور محمد بن عجلان متکلم فیہ راوی ہے، اس کے علاوہ چار ثقہ راویوں نے عامر بن عبد اللہ سے اسی روایت کو بیان کیا ہے لیکن اس میں «لَا يُحَرِّكُهَا» کے الفاظ نہیں ہیں۔ معلوم ہوا یہ الفاظ شاذ ہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی محمد بن عجلان کے طریق سے یہی روایت ذکر کی ہے، اس میں بھی «لَا يُحَرِّكُهَا» کے الفاظ نہیں ہیں۔ جب کہ اس کے مقابلے میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ والی روایت کو ابن ملقن، ابن قیم اور امام نووی کے علاوہ ناصر الدین البانی (رحمہم اللہ) نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ صرف "الهداية في تخريج أحاديث البداية" کے مؤلف نے اس حدیث کو شاذ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ «يُحَرِّكُهَا» والے الفاظ صرف زائدہ بن قدامہ عاصم سے بیان کرتا ہے، زائدہ کے علاوہ عاصم کے دوسرے شاگرد «يُشِيْرُ بِيَدِهِ» کے الفاظ ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات تحقیق اور انصاف سے عاری ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سب محدثین نے اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اشارہ والی حدیث کے ثبوت سے حرکت دینے کی نفی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے اور صحابہ پیچھے کھڑے تھے «فَاَشَارَ اِلَيْهِمْ اَنِ اجْلِسُوْا» "آپ نے ان کی طرف اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔" [بخاری، كتاب الأذان: باب إنما جعل الإمام ليؤتم به (٦٨٨)]

اس حدیث سے ہر عقلمند آدمی یہ سمجھے گا کہ آپ ﷺ کا اشارہ صرف ہاتھ کو اٹھا دینا نہیں تھا جیسا کہ آپ سلام کے جواب میں کرتے تھے، بلکہ یہ اشارہ تھا جس سے سمجھ آتی تھی کہ آپ ﷺ بیٹھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہ اشارہ حرکت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اشارہ والی احادیث کو تحریک والی احادیث کے مخالف قرار دینا درست نہیں ہے۔ اسی طرح عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی روایت ہے:

«لَهِيَ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنَ الْحَدِيْدِ» [صفة صلاة النبي للألباني (ص/١٥٩)]

"یہ انگلی شیطان کے لیے لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے۔"

اس حدیث کو حرکت نہ دینے کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ اس میں حرکت دینے یا نہ دینے کی صراحت موجود ہی نہیں ہے، جب کہ حرکت دینا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہو چکا ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اس میں حرکت نہ دینے کی صراحت ہے تو پھر صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ دونوں امر جائز ہیں جیسا کہ علامہ صنعانی رحمہ اللہ نے سبل السلام میں اسے ترجیح دی ہے۔ لیکن پہلی بات زیادہ پختہ ہے کیونکہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ایک خاص اہتمام کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی نماز کا طریقہ بیان کر رہے ہیں اور خاص کر تشہد کی حالت کا اور انھوں نے تشہد میں ایسی چیزیں بیان کی ہیں جو کسی نے بیان نہیں کیں۔ اس لیے ان کی روایت کو ترجیح ہوگی۔

مزید تفصیل کے لیے علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی کتاب " تمام المنة" کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

تشہد میں شہادت کی انگلی کا قبلہ رخ ہونا

(سوال) کیا حالت نماز میں شہادت کی انگلی قبلہ رخ ہونی چاہیے اور نظر کا اس پر مرکوز ہونا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

(جواب) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

''نبی ﷺ جب نماز میں بیٹھ جاتے تو اپنی انگلی سے قبلہ رخ اشارہ کرتے اور اپنی نگاہ اسی پر رکھتے۔'' [ابو عوانة، کتاب الصلاة: باب بیان الإشارة (۲۰۱۷)، ابن خزیمة، کتاب الصلاة : باب الإشارة بالسبابة، (۷۱۹)]

دوسری حدیث میں ہے:

''یقیناً نبی ﷺ جب تشہد بیٹھ جاتے تو اپنا بایاں ہاتھ بائیں ران پر اور دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھتے اور شہادت والی انگلی سے اشارہ کرتے، آپ ﷺ کی نگاہ آپ کے اشارے سے تجاوز نہیں کرتی تھی۔'' [ابو عوانة کتاب الصلاة : باب الإشارة بالسبابة: (۲۰۱۸)]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ تشہد کی صورت میں شہادت کی انگلی اٹھا کر قبلہ رخ اشارہ کرنا اور نظر اس پر رکھنا مسنون ہے۔

پہلے تشہد میں درود پڑھنا

(سوال) کیا دونوں تشہدوں میں درود پڑھنا ضروری ہے، پہلے تشہد میں پڑھنے کی کیا دلیل ہے؟

(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾
[الأحزاب:٥٦]

''بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجو۔''

اس آیت کریمہ کا حکم عام ہے اور یہ نماز کو بھی شامل ہے کیونکہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے آ کر سوال کیا کہ ہم نے سلام کہنا تو سیکھ لیا ہے، آپ ﷺ ہمیں بتائیں کہ ہم صلاۃ کیسے پڑھیں اور بعض روایات میں نماز کی صراحت بھی آتی ہے، جیسا کہ سنن دارقطنی میں حدیث ہے:

« عَنْ اَبِيْ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اَقْبَلَ رَجُلٌ حَتّٰى جَلَسَ بَيْنَ يَدَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ نَحْنُ عِنْدَهُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَمَّا السَّلَامُ فَقَدْ عَرَفْنَاهُ فَكَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ اِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا فِيْ صَلَاتِنَا ؟ فَقَالَ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى ......الخ » [سنن دارقطنی (۱/۳۵۵)]

'' حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا، ہم بھی

آپ ﷺ کے پاس تھے، اس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! سلام تو ہم نے جان لیا ہے مگر ہم آپ پر صلاۃ کیسے بھیجیں؟ جب ہم نماز پڑھ رہے ہوں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی......الخ'' کہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں رسول اللہ ﷺ پر سلام تو پہلے ہی پڑھتے تھے لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس کے بعد انھوں نے سلام کے ساتھ صلاۃ بھی آپ ﷺ سے سیکھ لی۔

مذکورہ بالا آیت سورۂ احزاب کی ہے جو ۵ ھ میں نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو رسول اللہ ﷺ پر صلاۃ وسلام پڑھنے کا حکم دیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو تشہد میں سلام پہلے ہی پڑھتے تھے، اب انھوں نے اس کے ساتھ صلاۃ کا بھی اضافہ کر لیا، یعنی جہاں سلام پڑھنا ہے، اس کے ساتھ ہی صلاۃ پڑھنی ہے، یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اگر ہم پہلے تشہد میں صرف سلام پڑھیں، صلاۃ نہ پڑھیں تو ﴿ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ پر تو عمل ہوگا لیکن ﴿صَلُّوْا عَلَيْهِ﴾ پر عمل نہیں ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ سے آخری تشہد سے پہلے تشہد میں صلاۃ پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ سعد بن ہشام سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کے قیام اللیل کے متعلق روایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

« فَقُلْتُ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ ! أَنْبِئِيْنِيْ عَنْ وِتْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَتْ كُنَّا نُعِدُّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ سِوَاكَهُ وَ طَهُوْرَهُ فَيَبْعَثُهُ اللّٰهُ فِيْمَا شَاءَ أَنْ يَبْعَثَهُ مِنَ اللَّيْلِ فَيَتَسَوَّكُ وَ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يُصَلِّيْ تِسْعَ رَكَعَاتٍ لَا يَجْلِسُ فِيْهِنَّ إِلَّا عِنْدَ الثَّامِنَةِ فَيَدْعُوْ رَبَّهُ وَ يُصَلِّيْ عَلٰى نَبِيِّهِ ثُمَّ يَنْهَضُ وَ لَا يُسَلِّمُ ثُمَّ يُصَلِّي التَّاسِعَةَ فَيَقْعُدُ ثُمَّ يَحْمَدُ رَبَّهُ وَ يُصَلِّيْ عَلٰى نَبِيِّهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ يَدْعُوْ ثُمَّ يُسَلِّمُ تَسْلِيْمًا »[ابو عوانة(٢/٣٢٤)، بيهقى(٢/٥٠٠)، نسائى(١٧٢١)]

''میں نے کہا: ''اے ام المومنین! آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کے وتر کے متعلق بتائیں۔'' تو انھوں نے کہا: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے لیے مسواک اور طہارت کے لیے پانی تیار کر دیتے۔ رات کے وقت جب اللہ تعالیٰ چاہتا، آپ ﷺ کو اٹھا دیتا۔ آپ ﷺ مسواک کرتے اور وضو کرتے پھر نو رکعتیں ادا کرتے، آٹھویں کے سوا کسی رکعت میں نہیں بیٹھتے تھے۔ پھر آپ ﷺ اس میں اپنے رب سے دعا کرتے اور اس میں نبی ﷺ پر درود بھیجتے، پھر کھڑے ہو جاتے اور سلام نہیں پھیرتے تھے، پھر نویں رکعت ادا کر کے بیٹھتے اور اللہ کی حمد کر کے اس کے نبی ﷺ پر درود بھیجتے اور دعا کرتے، پھر سلام پھیر دیتے۔''

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی آخری قعدے سے پہلے والے قعدے میں درود پڑھا ہے۔ لہٰذا ہمیں آپ ﷺ کی سنت کے مطابق آخری قعدے سے پہلے والے قعدے میں بھی درود پڑھنا چاہیے۔

آخری تشہد میں دعا

(سوال) کیا حالت تشہد میں کوئی دعا ضروری بھی ہے یا سب اختیاری ہیں؟ کتاب وسنت کی رو سے واضح کریں۔

(جواب) نماز کے آخری تشہد میں چار چیزوں سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی آخری تشہد سے فارغ ہو تو وہ چار چیزوں سے اللہ کی پناہ پکڑے ① جہنم کے عذاب سے ② قبر کے عذاب سے ③ زندگی اور موت کے فتنہ سے ④ مسیح دجال کے شر سے۔'' [صحیح مسلم، کتاب المساجد: باب مایستعاذ منه فی الصلوة (٥٨٨)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر نمازی کو آخری تشہد سے فارغ ہو کر یہ دعا کرنی چاہیے:

« اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ »[مسلم، کتاب المساجد (٥٨٨)]

اس کے بعد جو جی چاہے دعا مانگ لے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں آپ کی حدیث ہے:

« وَلْيَتَخَيَّرْ مِنَ الدُّعَاءِ اَعْجَبَهُ اِلَيْهِ فَيَدْعُوْ »[صحیح بخاری، کتاب الاذان: باب ما یتخیر من الدعاء بعد تشهد: (٨٣٥)]

''جو دعا پسند ہو وہ مانگ لیں۔''

مرد اور عورت کی نماز میں فرق

(سوال) حنفی حضرات مرد اور عورت کے طریقۂ نماز میں فرق روا رکھتے ہیں۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(جواب) نبی کریم ﷺ نے نماز کی جو کیفیت و ہیئت بیان فرمائی ہے اسے ادا کرنے میں مرد و زن برابر ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ » [بخاری، کتاب الأدب: باب رحمة الناس و البهائم(٦٠٠٨)، احمد (٥٣/٥)، إرواء الغليل (٢١٣)]

''تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔''

یاد رکھیں کہ تکبیر تحریمہ سے سلام تک مردوں اور عورتوں کی نماز کی ہیئت ایک جیسی ہے، سب کے لیے تکبیر تحریمہ، قیام، ہاتھوں کا باندھنا، دعائے استفتاح کا پڑھنا، سورۂ فاتحہ، آمین، اس کے بعد کوئی اور سورت، پھر رفع الیدین، رکوع، قیام ثانی، رفع الیدین، سجدہ، جلسۂ استراحت، قعدہ اولیٰ، تشہد، تحریک اصابع، قعدہ اخیرہ، تورک، درود اور اس کے بعد دعا، سلام اور ہر مقام پر پڑھی جانے والی مخصوص دعائیں سب ایک جیسی ہی ہیں۔ عام طور پر حنفی علماء کی کتابوں میں جو مردوں اور عورتوں کی

نماز کا فرق بیان کیا جاتا ہے کہ مرد کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور عورتیں صرف کندھوں تک، مرد حالت قیام میں زیر ناف ہاتھ باندھیں اور عورتیں سینے پر، حالت سجدہ میں مرد اپنی رانیں پیٹ سے دور رکھیں اور عورتیں اپنی رانیں پیٹ سے چپکالیں، یہ فرق کسی بھی صحیح وصریح حدیث میں مذکور نہیں۔ چنانچہ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

① " وَاعۡلَمۡ اَنَّ هٰذِهِ السُّنَّةَ تَشۡتَرِكُ فِيۡهَا الرِّجَالُ وَ النِّسَاءُ وَ لَمۡ يَرِدۡ مَا يَدُلُّ عَلَى الۡفَرۡقِ بَيۡنَهُمَا فِيۡهَا وَ كَذَا لَمۡ يَرِدۡ مَا يَدُلُّ عَلَى الۡفَرۡقِ بَيۡنَ الرَّجُلِ وَ الۡمَرۡاَةِ فِيۡ مِقۡدَارِ الرَّفۡعِ رُوِيَ عَنِ الۡحَنَفِيَّةِ اَنَّ الرَّجُلَ يَرۡفَعُ اِلَى الۡاُذُنَيۡنِ وَ الۡمَرۡاَةُ اِلَى الۡمَنۡكِبَيۡنِ لِاَنَّهٗ اَسۡتَرُ لَهَا وَ لَا دَلِيۡلَ عَلٰى ذٰلِكَ كَمَا عَرَفۡتَ "

[نيل الأوطار (۲/۱۹۸)]

" اور جان لیجیے کہ رفع الیدین ایسی سنت ہے جس میں مرد اور عورتیں دونوں شریک ہیں اور ایسی کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی جو ان دونوں کے درمیان اس کے بارے میں فرق پر دلالت کرتی ہو اور نہ کوئی ایسی حدیث ہی وارد ہے جو مرد اور عورت کے درمیان ہاتھ اٹھانے کی مقدار کے فرق پر دلالت کرتی ہو۔ احناف سے مروی ہے کہ مرد کانوں تک ہاتھ اٹھائے اور عورت کندھوں تک کیونکہ یہ اس کے لیے زیادہ ساتر ہے، لیکن اس کے لیے ان کے پاس کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔"

شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اور علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لَمۡ يَرِدۡ مَا يَدُلُّ عَلَى التَّفۡرِقَةِ فِي الرَّفۡعِ بَيۡنَ الرَّجُلِ وَالۡمَرۡاَةِ "[فتح الباری(۲/۲۲۲)، عون المعبود (۱/۲۶۳)]

" مرد اور عورت کے درمیان تکبیر کے لیے ہاتھ اٹھانے کے فرق کے بارے میں کوئی حدیث وارد نہیں۔"

② مردوں اور عورتوں کو حالت قیام میں یکساں طور پر حکم ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سینے پر باندھیں۔ خاص طور پر عورتوں کے لیے علیحدہ حکم دینا کہ صرف وہی سینے پر ہاتھ باندھیں اور مرد ناف کے نیچے باندھیں، اس کے متعلق حنفیوں کے پاس کوئی صریح اور صحیح حدیث موجود نہیں۔ علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ ترمذی کی شرح میں فرماتے ہیں:

" فَاعۡلَمۡ اَنَّ مَذۡهَبَ الۡاِمَامِ اَبِيۡ حَنِيۡفَةَ اَنَّ الرَّجُلَ يَضَعُ الۡيَدَيۡنِ فِي الصَّلَاةِ تَحۡتَ السُّرَّةِ وَ الۡمَرۡاَةُ تَضَعُهُمَا عَلَى الصَّدۡرِ وَ لَمۡ يُرۡوَ عَنۡهُ وَ لَا عَنۡ اَصۡحَابِهٖ شَيۡءٌ خِلَافَ ذٰلِكَ "

[تحفة الأحوذي (۱/۲۱۳)]

" پس جان لو کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ مرد نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھے اور عورت سینہ پر، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور آپ کے اصحاب سے اس کے خلاف کوئی اور قول مروی نہیں۔"

محدث العصر علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَضۡعُهُمَا عَلَى الصَّدۡرِ الَّذِيۡ ثَبَتَ فِي السُّنَّةِ وَ خِلَافُهٗ اِمَّا ضَعِيۡفٌ اَوۡ لَا اَصۡلَ لَهٗ "

[صفة صلاة النبي (ص/۸۸)]

''اور سینے پر ہاتھ باندھنا سنت سے ثابت ہے اور اس کے خلاف جو عمل ہے وہ یا تو ضعیف ہے یا پھر بے اصل ہے۔''

③ حالت سجدہ میں مردوں کا اپنی رانوں کو پیٹ سے دور رکھنا اور عورتوں کا سمٹ کر سجدہ کرنا، یہ حنفی علماء کے نزدیک ایک مرسل حدیث کی بنیاد پر ہے، جس میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کا کچھ حصہ زمین سے ملا لیا کرو کیونکہ عورتوں کا حکم اس بارے میں مردوں جیسا نہیں۔''

علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" مُرْسَلٌ لَا حُجَّةَ فِيهِ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ فِي الْمَرَاسِيلِ " [صفة صلاة النبی(ص/٨٩)]

''یہ روایت مرسل ہے جو قابل حجت نہیں۔ امام ابو داؤد نے اسے ''مراسیل'' میں یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے۔''

لیکن یہ روایت منقطع ہے اور اس کی سند میں موجود ایک راوی ''سالم'' محدثین کے نزدیک متروک ہے۔

علامہ ابن الترکمانی حنفی نے اس روایت کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔[الجوهر النقی علی السنن الکبری للبیهقی (٢٢٣/٢)]

اس کے متعلق حنفی علماء ایک اور روایت پیش کرتے ہیں، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'' عورت جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں سے چپکا لے، اس طرح کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ پردے کا موجب ہو۔''

[بیهقی فی السنن الکبری(٢/ ٢٢٢-٢٢٣)]

اس روایت کے متعلق خود امام بیہقی رحمہ اللہ نے صراحت کر دی ہے کہ اس جیسی ضعیف روایت سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک اثر یہ بھی پیش کیا جاتا ہے:

« اِنَّهُ كَانَ يَأْمُرُ نِسَاءَهُ يَتَرَبَّعْنَ فِي الصَّلَاةِ » [مسائل احمد لابنه عبد الله (ص/٧١)]

''وہ اپنی عورتوں کو حکم دیتے کہ وہ نماز میں چارزانوں بیٹھیں۔''

لیکن اس کی سند میں عبداللہ بن عمر العمری راوی ضعیف ہے۔[تقریب التهذیب(١٨٢)]

پس معلوم ہوا کہ احناف کے ہاں عورتوں کے سجدہ کرنے کا مروج طریقہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں مگر اس طریقے کے خلاف رسول اللہ ﷺ کے متعدد ارشاد مروی ہیں، چند ایک یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

① « لَا يَنْبَسِطُ اَحَدُكُمْ ذِرَعَيْهِ اِنْبِسَاطَ الْكَلْبِ » [بخاری، كتاب الأذان : باب لا یفترش ذراعیه فی السجود(٨٢٢)]

''تم میں سے کوئی بھی حالت سجدہ میں اپنے دونوں بازو کتے کی طرح نہ بچھائے۔''

② « اِعْتَدِلُوا فِي السُّجُودِ وَ لَا يَفْتَرِشْ اَحَدُكُمْ ذِرَاعَيْهِ اِفْتِرَاشَ الْكَلْبِ »[ابو داؤد، كتاب الصلاة : باب صفة السجود(٨٩٧)]

''سجدہ اطمینان سے کرو اور تم میں سے کوئی بھی حالت سجدہ میں اپنے بازو کتے کی طرح نہ بچھائے۔''

غرض نماز کے اندر ایسے کاموں سے روکا گیا ہے جو جانوروں کی طرح کے ہوں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ نے نماز میں حیوانات سے مشابہت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ اس طرح بیٹھنا جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے یا لومڑی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنا یا جنگلی جانوروں کی طرح افتراش یا کتے کی طرح اقعاء یا کوے کی طرح ٹھونگے مارنا یا سلام کے وقت شریر گھوڑوں کی دموں کی طرح ہاتھ اٹھانا یہ سب افعال منع ہیں۔'' [زاد المعاد (١/١١٦)]

پس ثابت ہوا کہ سجدہ کا اصل مسنون طریقہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کا اپنا تھا اور کتب احادیث میں یوں مروی ہے:

« اِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَ لَا قَابِضِهِمَا » [بخاری، کتاب الأذان : باب سنة الجلوس فی التشهد (٨٢٨)]

''جب آپ سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھوں کو زمین پر نہ بچھاتے اور نہ اپنے پہلوؤں ہی سے ملاتے تھے۔''

قرآن مجید میں جس مقام پر نماز کا حکم وارد ہوا ہے اس میں سے کسی ایک مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کے طریقۂ نماز میں فرق بیان نہیں کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بھی کسی صحیح حدیث سے ہیئت نماز کا فرق مروی نہیں۔ تیسری بات یہ کہ نبی کریم ﷺ کے عہد رسالت سے جملہ امہات المومنین، صحابیات اور احادیث نبویہ پر عمل کرنے والی خواتین کا طریقۂ نماز وہی رہا ہے جو رسول اللہ ﷺ کا ہوتا تھا۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بسند صحیح ام درداء رضی اللہ عنہا کے متعلق نقل کیا ہے:

« اِنَّهَا كَانَتْ تَجْلِسُ فِيْ صَلَاتِهَا جِلْسَةَ الرَّجُلِ وَ كَانَتْ فَقِيْهَةً » [التاریخ الصغیر للبخاری (٩٠)]

''وہ نماز میں مردوں کی طرح بیٹھتی تھیں اور وہ فقیہ تھیں۔''

چوتھی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم عام ہے:

''اس طرح نماز پڑھو، جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔'' [بخاری: (٦٠٠٨)]

اس حکم کے عموم میں عورتیں بھی شامل ہیں۔

پانچویں یہ کہ سلف صالحین یعنی خلفائے راشدین، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، محدثین اور صلحائے امت میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو دلیل کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے مردوں اور عورتوں کی نماز میں فرق کیا ہے۔ بلکہ امام ابوحنیفہ کے استاد امام ابراہیم نخعی سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے:

'' تَفْعَلُ الْمَرْأَةُ فِي الصَّلَاةِ كَمَا يَفْعَلُ الرَّجُلُ '' [ابن ابی شیبة(١/٧٥/٢)]

''نماز میں عورت بھی بالکل ویسے ہی کرے جیسے مرد کرتا ہے۔''

جن علماء نے عورتوں کا نماز میں تکبیر کے لیے کندھوں تک ہاتھ اٹھانا، قیام میں سینے پر ہاتھ باندھنا اور سجدے میں زمین کے ساتھ چپک جانا موجب ستر بیان کیا ہے وہ دراصل قیاس فاسد کی بنا پر ہے، کیونکہ جب اس کے متعلق قرآن و سنت

خاموش ہیں تو کسی عالم کو یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ وہ اپنی من مانی کر کے از خود دین میں اضافہ کرے؟ البتہ نماز کی کیفیت و ہیئت کے علاوہ چند چیزیں مرد و عورت کی نماز میں مختلف ہیں:

① عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ سر پر اوڑھنی لیں اور اپنے پاؤں بھی ڈھانپیں۔ اس کے بغیر بالغہ عورت کی نماز قبول نہیں ہوتی، جیسا کہ حدیث نبوی ہے:

« لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ الْحَائِضِ اِلَّا بِخِمَارٍ » [ابن ماجه، كتاب الطهارة: باب إذا حاضت الجارة لم تصل الا بخمار(٦٥٥)، ابو داؤد(٦٤١)، احمد(١٥٠/٦)]

"اللہ تعالیٰ کسی بھی بالغہ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کرتا۔"

لیکن مردوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر حال میں کپڑا ٹخنوں سے اوپر رکھیں جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

« مَا اَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الْاِزَارِ فِى النَّارِ »[بخاری، كتاب اللباس:باب ما أسفل من الكعبين فهو فی النار(٥٧٨٧)]

"تہ بند کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ آگ میں ہے۔"

② عورت جب عورتوں کی امامت کرائے تو ان کے ساتھ پہلی صف کے وسط میں کھڑی ہو جائے، مردوں کی طرح آگے بڑھ کر کھڑی نہ ہو۔ امام ابوبکر ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے مصنف میں اور امام حاکم رحمہ اللہ نے سیدنا عطا رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے:

« عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّهَا كَانَتْ تَؤُمُّ النِّسَاءَ فَتَقُوْمُ مَعَهُنَّ فِى الصَّفِّ »

[دارقطنی(٤٠٤/١)]

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی امامت کراتی تھیں اور ان کے ساتھ صف میں کھڑی ہوتی تھیں۔"

اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں آتا ہے:

« اَنَّهَا اَمَّتِ النِّسَاءَ فَقَامَتْ وَسْطَهُنَّ »[مزید تفصیل کے لیے ملاحظه هو: عون المعبود(٢١٢/٢)]

"انھوں نے عورتوں کی امامت کرائی اور ان کے درمیان میں کھڑی ہوئیں۔"

③ امام جب نماز میں بھول جائے تو اسے متنبہ کرنے کے لیے مرد سبحان اللہ کہیں اور عورتیں تالی بجائیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں آتا ہے:

« اَلتَّسْبِيْحُ لِلرِّجَالِ وَ التَّصْفِيْقُ لِلنِّسَاءِ » [بخاری، كتاب العمل فى الصلاة: باب التصفيق للسناء (١٢٠٣)]

"مردوں کے لیے سبحان اللہ اور عورتوں کے لیے تالی بجانا ہے۔"

④ مرد کو نماز کسی صورت میں بھی معاف نہیں لیکن عورت کو حالت حیض میں فوت شدہ نماز کی قضا نہیں ہوتی جیسا کہ یہ مسئلہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

⑤ اسی طرح عورتوں کی سب سے آخری صف ان کی پہلی صف سے بہتر ہوتی ہے اور مردوں کی پہلی صف ان کی آخری

صف سے بہتر ہوتی ہے۔ [مسلم، کتاب الصلاۃ : باب تسویة الصفوف و إقامتها و فضل الأول فالأول (٤٤٠)]

یہ تمام مسائل اپنی جگہ درست ہیں مگر قرآن وسنت سے ثابت شدہ فرق کو غیر ثابت شدہ کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ تفریقات علمائے احناف کی خودساختہ ہیں جن کا قرآن وسنت سے کوئی تعلق نہیں۔

فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کی حیثیت

سوال نماز کے بعد مروجہ اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت کے متعلق آگاہ فرما دیں؟

جواب دورِ حاضر میں فرض نمازوں کے بعد امام اور مقتدی مل کر جو اجتماعی دعا کا اہتمام کرتے ہیں اس کا نبی کریم ﷺ سے کوئی ثبوت صحیح سند کے ساتھ موجود نہیں، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسی کوئی بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ رسول کریم ﷺ دن رات میں پانچ نمازیں پڑھاتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی اقتدا میں پڑھتے تھے۔ اگر اس دعا کا کہیں وجود ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ضرور ذکر فرماتے۔ جس طرح صحابہ کرام نے باقی نماز کے مسائل بیان کیے ہیں اس طرح کہیں اس اجتماعی دعا کا ذکر بھی ضرور کیا جاتا۔ بعض لوگ تو اس حد تک آگے نکل گئے ہیں کہ جو لوگ اس مسئلے پر عمل پیرا نہیں ہوتے انھیں بے عمل اور بہت بڑے گناہ کے مرتکب سمجھتے ہیں۔ بہرکیف نبی ﷺ سے کسی صحیح تو کجا ضعیف حدیث میں بھی امام اور مقتدیوں کا مل کر اہتمام کے ساتھ دعا کرنا ثابت نہیں۔ البتہ رسول اللہ ﷺ سے فرض نمازوں کے بعد کچھ اذکار منقول ہیں جو ہم بحمد للہ پڑھتے ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہے:

① ہر نماز کے بعد تکبیر کہنا اور تین بار استغفار پڑھنا۔

② « اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ وَ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ »

③ معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھنا۔

④ « رَبِّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَ شُكْرِكَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِكَ »

⑤ آیت الکرسی پڑھنا۔

⑥ ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھنا۔

کئی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات نماز کے بعد سلام پھیر کر جلد اٹھ جاتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« قَالَ صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ الْعَصْرَ فَسَلَّمَ فَقَامَ مُسْرِعًا فَتَخَطّٰى رِقَابَ النَّاسِ اِلٰى بَعْضِ حُجَرِ نِسَائِهٖ » [بخاری، کتاب الأذان : باب من صلی بالناس فذکر حاجة فتخطاهم (٨٥١)]

” انھوں نے بیان کیا کہ میں نے مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز عصر ادا کی، آپ ﷺ نے سلام پھیرا، پھر

جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ازواجِ مطہرات میں سے کسی ایک کے حجرے کی طرف لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے چلے گئے۔“

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِحْدٰى صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ فَصَلّٰى بِنَا رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ اِلٰى خَشَبَةٍ مَعْرُوْضَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَاتَّكَأَ عَلَيْهَا كَاَنَّهُ غَضْبَانُ » [بخاری، کتاب الصلاة: باب تشبيك الأصابع في المسجد(٤٨٢)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ظہر وعصر کی نمازوں میں سے کوئی ایک نماز پڑھائی، آپ نے ہمیں دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیرا۔ پس مسجد میں گاڑھی ہوئی ایک لکڑی کی جانب کھڑے ہو کر اس پر ٹیک لگائی گویا آپ غصے میں ہیں۔“

ان دونوں حدیثوں میں « فَسَلَّمَ فَقَامَ » ہے اور اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ ”ف“ عربی زبان میں تعقیب مع الوصل کے لیے ہوتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ آپ سلام پھیرتے ہی اٹھ گئے۔ لہٰذا اذکار مسنونہ تو نمازوں کے بعد ثابت ہیں اور کبھی کسی کام کی بنا پر سلام پھیرتے ہی اٹھ جانا بھی درست ہے لیکن کسی صحیح حدیث میں امام اور مقتدیوں کا مل کر اہتمام کے ساتھ دعا کرنا وارد نہیں ہوا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اذان اور اقامت کے درمیان تھویب کا بدعت ہونا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

” وَ كَذٰلِكَ الْجَهْرُ بِالدُّعَاءِ عَقِيْبَ الصَّلَاةِ مِثْلَ دُعَاءِ الْإِمَامِ وَ الْمَأْمُوْمِيْنَ جَمِيْعًا عَقِيْبَ الصَّلٰوةِ لَمْ يَكُنْ وَ لٰكِنَّهُ ثَبَتَ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَجْهَرُوْنَ بِالذِّكْرِ فَالذِّكْرُ ثَابِتٌ وَ مَنِ اعْتَقَدَ مَا لَمْ يَدُلَّ عَلَيْهِ دَلِيْلٌ شَرْعِيٌّ قُرْبَةً فَهُوَ مُخْطِئٌ ظَالِمٌ “ [مختصر الفتاوى المصرية(٤٠-٤١)]

”اسی طرح نمازوں کے بعد جہری طور پر دعا کرنا، جیسا کہ امام اور مقتدیوں کا مل کر نماز کے بعد دعا کرنا ہے، بدعت ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھا۔ لیکن ان سے ثابت ہے کہ وہ جہری ذکر کرتے تھے۔ پس ذکر کرنا ثابت ہے (نہ کہ اجتماعی دعا) جس نے کسی ایسی چیز کے نیک ہونے کا اعتقاد کر لیا جس پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، وہ خطا کار و ظالم ہے۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں:

” وَ اَمَّا دُعَاءُ الْإِمَامِ وَ الْمَأْمُوْمِيْنَ جَمِيْعًا عَقِيْبَ الصَّلَاةِ فَلَمْ يَنْقُلْ اَحَدٌ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَهٰهُنَا شَيْئَانِ :

اَحَدُهُمَا : دُعَاءُ الْمُصَلِّي الْمُنْفَرِدِ كَدُعَاءِ الْمُصَلِّيْ لِصَلَاةِ الْإِسْتِخَارَةِ وَحْدَهُ اِمَامًا كَانَ اَوْ مَامُوْمًا۔

وَالثَّانِيْ: دُعَاءُ الْإِمَامِ وَ الْمَأْمُوْمِيْنَ جَمِيْعًا فَهٰذَا الثَّانِيْ لَا رَيْبَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَفْعَلْهُ فِيْ اَعْقَابِ الْمَكْتُوْبَاتِ كَمَا كَانَ يَفْعَلُ الْاَذْكَارَ الْمَأْثُوْرَةَ عَنْهُ اِذْ لَوْ فَعَلَ

ذٰلِكَ لَنَقَلَ عَنْهُ اَصْحَابُهُ ثُمَّ التَّابِعُوْنَ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ كَمَا نَقَلُوْا مَا هُوَ دُوْنَ ذٰلِكَ " [الفتاوی الکبرٰی لابن تیمیة (١/١٥٨)]

'' بہر حال فرائض کے بعد امام اور مقتدیوں کا مل کر دعا کرنا تو کسی ایک آدمی نے بھی رسول اللہ ﷺ سے نقل نہیں کیا۔ درحقیقت یہاں دو چیزیں ہیں:

① ایک نمازی کا دعا کرنا جیسا کہ نمازی دعائے استخارہ وغیرہ کرتا ہے خواہ نمازی امام ہو یا مقتدی۔

② امام اور مقتدیوں کا مل کر دعا کرنا، یہ دوسری چیز بلاشبہ نبی ﷺ نے فرض نمازوں کے بعد نہیں کی۔ جیسا کہ آپ ﷺ اذکار کیا کرتے تھے جو آپ سے (کتب احادیث میں) منقول ہیں۔ اگر اس موقع پر آپ اجتماعی دعا کرتے تو آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے ضرور نقل کرتے پھر تابعین پھر دیگر علماء جیسا کہ انھوں نے اس سے کم درجہ کی اشیاء آپ ﷺ سے نقل کی ہیں۔''

اسی طرح امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے ایک اور مقام پر صراحت کے ساتھ بدعت قرار دیا ہے۔
[مجموع الفتاوی (٢٢/٥١٩)]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ اَمَّا الدُّعَاءُ بَعْدَ السَّلَامِ مِنَ الصَّلَاةِ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ اَوِ الْمَامُوْمِيْنَ فَلَمْ يَكُنْ ذٰلِكَ مِنْ هَدْيِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَصْلًا وَ لَا رُوِيَ عَنْهُ بِاِسْنَادٍ صَحِيْحٍ وَ لَا حَسَنٍ "[زاد المعاد (١/٢٥٧)]

'' باقی رہا نماز سے سلام پھیرنے کے بعد قبلہ رخ بیٹھ کر یا مقتدیوں کی طرف پھر کر اجتماعی دعا کرنا تو یہ آپ ﷺ کا طریقہ قطعاً نہ تھا اور نہ آپ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ اور نہ حسن سند کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور امام ابن قیم رحمہ اللہ کی اس صراحت سے واضح ہوا کہ اجتماعی دعا جو ہمارے دور میں رائج ہے یہ بدعت ہے، اس کا کوئی شرعی ثبوت موجود نہیں۔ دیوبندی علماء میں سے مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" نَعَمْ اَلْاَدْعِيَةُ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ ثَابِتَةٌ كَثِيْرًا بِلَا رَفْعِ الْيَدَيْنِ وَ بِدُوْنِ الْاِجْتِمَاعِ"[العرف الشذی (ص:٨٦)]

'' ہاں فرض نمازوں کے بعد بہت سی دعائیں بغیر ہاتھ اٹھائے اور بغیر اجتماعی شکل اختیار کیے ثابت ہیں۔''

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

" وَ لَمْ تَثْبُتْ شَاكِلَةُ الْجَمَاعَةِ فِيْهَا كَمَا هُوَ مَعْرُوْفُ الْاٰنَ " [العرف الشذی (ص:٨٦)]

'' اور دعا کی اجتماعی ہیئت جس کا آج کل رواج ہے، ثابت نہیں۔''

مولوی فیض اللہ بنگلہ دیشی لکھتے ہیں: '' شریعت میں ایسی دعا کا اصلاً و قطعاً کوئی ثبوت نہیں، نہ تعامل سلف سے اور نہ احادیث سے، خواہ وہ صحیح ہوں یا ضعیف یا موضوع اور نہ کسی فقہ کی عبارت ہی سے۔ یہ دعا یقیناً بدعت ہے۔''[أحکام الدعوات المروجة (ص/٢١)، مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: دعابعد الفرائض کا مسنون طریقہ (ص/٢٢)، از مفتی محمد

ابراهیم صادق آبادی]

مولوی رفیق دلاوری جو مولوی محمود الحسن دیوبندی کا شاگرد ہے لکھتا ہے: ''الغرض فرض نماز کے سلام کے بعد امام اور مقتدیوں کا مل کر دعا مانگنا بدعت سیہ ہے۔'' [عماد الدین (ص/۳۹۷)]

علاوہ ازیں اس مسئلے پر اب دیوبندی علماء اہل حدیث علماء جیسا موقف اختیار کر رہے ہیں۔ رشید احمد صاحب لدھیانوی نے اپنے احسن الفتاویٰ میں اسے بدعتِ شنیع قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان کے شاگرد مفتی محمد ابراہیم نے ''دعا بعد الفرائض کا مسنون طریقہ'' لکھ کر حنفیہ میں جو بالخصوص یہ رواج ہے، اس کی تردید کی ہے۔ باقی رہا فتاویٰ نذیریہ میں اس موضوع پر پیش کردہ روایات کا تجزیہ تو اس کی مفصل بحث کے لیے صلاۃ الرسول مخرج کا مطالعہ کریں۔ جس میں بالتفصیل ان روایات کا ضعف ذکر کیا گیا ہے اور ابن ابی شیبہ کی جو روایت فتاویٰ نذیریہ میں مرقوم ہے اس میں ''رفع يديه و دعا'' کے الفاظ مطبوعہ ابن ابی شیبہ میں نہیں ملتے۔ باقی یہ مفصل روایت جامع ترمذی وغیرہ میں موجود ہے اور اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔

بہرکیف اجتماعی دعا کا اہتمام کرنا اور اسے سنت سمجھنا غلط ہے۔ فرض نمازوں کے بعد جو مسنون اذکار ہیں انھیں پڑھیں اور یاد کریں۔ کئی لوگ بلاتحقیق یہ بات کہہ دیتے ہیں کہ اہل حدیث نماز کے بعد دعا نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ ہم نماز کے بعد کچھ وقت بیٹھ کر وہ مسنون اذکار و ادعیہ جو ثابت ہیں، پڑھتے ہیں۔

اصل میں جو لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ امام صاحب نے نماز کے بعد ہاتھ نہیں اٹھائے تو وہ فوراً فتویٰ عائد کر دیتے ہیں کہ اس نے دعا نہیں مانگی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا لازم نہیں بلکہ بغیر ہاتھ اٹھائے بھی دعا مانگنا درست ہے۔ مثلاً مسجد میں آنے اور باہر جانے کی دعا، بیت الخلاء میں داخل اور خارج ہونے کی دعائیں وغیرہ احادیث میں موجود ہیں۔ لیکن یہاں کبھی کسی نے جھگڑا نہیں کیا کہ فلاں آدمی نے دعا نہیں مانگی اور نہ یہاں ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ حقیقت میں جب کسی چیز کا غلط رواج پڑ جاتا ہے تو پھر جب لوگ اس کے خلاف عمل دیکھتے ہیں تو وہ فوراً انکار کر دیتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل اچھا نہیں ہے۔ اگر مسئلہ کا علم نہ ہو تو اس کی تحقیق کر لینی چاہیے۔ اہل حدیث اسی بات کی دعوت دیتے ہیں کہ اندھا دھند پیروی نہ کی جائے بلکہ تحقیق والی لائن اختیار کی جائے۔ ہر آدمی اپنی ہمت و بساط کے مطابق مسئلے کی تحقیق کرے۔ اہل علم سے رابطہ کرے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔ (آمین)

کیا رفع الیدین بتوں کی وجہ سے کیا جاتا تھا؟

سوال کیا یہ بات درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رفع الیدین اس لیے کروایا تھا کہ لوگ بغلوں میں بت رکھ کر آتے تھے؟

جواب کسی صحیح تو کجا ضعیف روایت میں بھی یہ بات موجود نہیں ہے، یہ لوگوں کی بنائی ہوئی بات ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ رفع الیدین نماز کے دوران کرنا رسول اللہ ﷺ کی مبارک سنت اور احادیث متواترہ اس پر دلالت کرتی ہیں، لوگوں نے اس عظیم سنت کو ترک کرنے کے جو حیلے تراش رکھے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

امامت کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

صفوں کی درستی

سوال ہمارے امام صاحب نماز سے پہلے صفوں کی درستی پر بڑا زور دیتے ہیں اس کی کیا اہمیت ہے؟

جواب نماز باجماعت میں صف بندی کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ صف درست کرنا اقامت صلاۃ میں سے ہے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« سَوُّوا صُفُوفَكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوفِ مِنْ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ » [بخاری، کتاب الأذان ، باب اقامة الصف من تمام الصلاة(۷۲۳)]

''صفیں درست کرو، بے شک صفوں کی درستی اقامت صلوٰۃ میں سے ہے۔''

اسی طرح ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« سَوُّوا صُفُوفَكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصَّفِّ مِنْ تَمَامِ الصَّلَاةِ » [مسلم،کتاب الصلاة: باب تسوية الصفوف و اقامتها(۴۳۳)، ابو داؤد(٦٦٨)، ابن ماجه(٩٩٣)، ابو عوانة(٣٨/٢)، دارمی(١٢٦٦)، احمد (١٧٧/٣)]

''صفیں درست کرو بے شک صف کی درستی نماز کے پورا کرنے سے ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صفوں کی درستی اقامت صلاۃ اور تمام صلاۃ سے ہے اوران کا ٹیڑھا ہونا نماز کے نقصان کا موجب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَقِيمُوا الصَّفَّ فِي الصَّلَاةِ فَإِنَّ إِقَامَةَ الصَّفِّ مِنْ حُسْنِ الصَّلَاةِ » [بخاری، کتاب الأذان : باب إقامة الصف من تمام الصلاة(٧٢٢)،عبد الرزاق (٢٤٢٤)]

''نماز میں صف قائم کرو، بے شک صف کا قائم کرنا نماز کے حسن میں سے ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَحْسِنُوا إِقَامَةَ الصُّفُوفِ فِي الصَّلَاةِ » [احمد (٤٨٥/٢)]

''نماز میں صفوں کی درستی اچھے طریقے سے کرو۔''

علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ [صحيح الترغيب والترهيب(٤٩٦)]

ان صحیح احادیث سے بھی معلوم ہوا کہ صف کا صحیح و درست رکھنا نماز کے حسن و خوبصورتی میں سے ہے اور اس کا حکم

رسول اللہ ﷺ نے دیا ہے، اگر صف کی درستی صحیح نہ ہوگی تو نماز کے اندر نقصان لازم آئے گا۔ صفوں کی درستی اور ان کا سیدھا ہونا رکوع ہی میں نہیں بلکہ قیام ہی سے ضروری و لازمی ہے۔ نبی کریم ﷺ پہلے صفیں درست کرتے تھے پھر نماز شروع کرتے تھے۔ اگر صف میں نقص ہوتا تو آپ ﷺ اصلاح فرماتے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صف درست کرتے تھے حتیٰ کہ اسے نیزے یا تیر کی مانند کر دیتے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک آدمی کا سینہ آگے بڑھا ہوا دیکھا تو فرمایا: ''اپنی صفوں کو درست کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے چہروں کے درمیان مخالفت ڈال دے گا۔'' بعض روایات میں چہروں کی بجائے دلوں کا ذکر ہے۔ [ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها ،باب إقامة الصفوف(٩٩٤)، ابو داؤد، كتاب الصلاة باب تسوية الصفوف(٦٦٣)، مسلم (٤٣٦)، بخاری(٧١٧۔مختصر)]

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک صفوں میں گھس جاتے۔ آپ ﷺ ہمارے سینوں اور کندھوں کو چھوتے اور کہتے: ''اختلاف نہ کرو، تمھارے دل مختلف ہوجائیں گے۔'' اور کہا کرتے تھے: ''بے شک اللہ عزوجل اور اس کے فرشتے پہلی صفوں پر صلاۃ بھیجتے ہیں۔'' [ابوداؤد، كتاب الصلاة: باب تسوية الصفوف(٦٦٤)، نسائی، كتاب الإمامة: باب كيف يقول الامام الصفوف(٨١٢)]

زوائد ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث کی سند صحیح ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ صف کی درستی نماز شروع کرنے سے پہلے ہونی چاہیے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کا کام صفیں درست کرنا بھی ہے۔ اگر کہیں صف میں خلل ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صحیح کرائے پھر نماز شروع کرے۔ لیکن افسوس کہ ائمہ مساجد آج اس بات کی طرف توجہ نہیں دے رہے۔ اقامت کہنے کے ساتھ ہی نماز شروع کردی جاتی ہے۔ صفوں کی درستی نہیں کرائی جاتی۔ نماز میں ہر شخص کو اس طرح کھڑا ہونا چاہیے کہ اپنے ساتھ والے کے کندھے کے ساتھ کندھا اور پاؤں کے ساتھ پاؤں پورا ملا ہو، درمیان میں کوئی خلا نہ ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خلا پر کرنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''یقیناً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''صفوں کو قائم کرو اور کندھوں اور بازوؤں کو برابر کرو اور شگاف بند کرو اور اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم ہو جاؤ اور شیطان کے لیے خالی جگہ نہ چھوڑو اور جو شخص صف کو ملائے گا اللہ تعالیٰ اسے ملائے گا اور جو صف کو کاٹے گا اللہ تعالیٰ اسے (اپنی رحمت سے) کاٹ دے گا۔'' [ابو داؤد، كتاب الصلاة: باب تسوية الصفوف(٦٦٦)، نسائی، كتاب الإمامة: باب من وصل صفاً(٨١٨)، حاكم(٢١٣/١)، امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ [صحيح الترغيب والترهيب(٤٩٢)]

امام منذری رحمہ اللہ اس حدیث میں موجود لفظ ''فرجات'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' اَلْفُرُجَاتُ جَمْعُ فُرْجَةٍ وَ هِيَ الْمَكَانُ الْخَالِيُ بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ''

''لفظ فرجات ''فرجۃ'' کی جمع ہے اور اس کا مطلب دو آدمیوں کے درمیان خالی جگہ ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صف میں شگاف بند کرنے چاہییں اور دو آدمیوں کے درمیان خالی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ لہٰذا جو لوگ دو نمازیوں کے درمیان چار انگلیوں یا اس سے زیادہ فاصلہ کرتے ہیں، ان کا عمل درست نہیں، انھیں اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« لَقَدْ رَأَيْتُ اَحَدَنَا يُلْزِقُ مَنْكِبَهُ بِمَنْكِبِ صَاحِبِهِ وَ قَدَمَهُ بِقَدَمِهِ وَ لَوْ ذَهَبْتَ تَفْعَلُ ذٰلِكَ لَتَرَى اَحَدَهُمْ كَاَنَّهُ بَغْلٌ شُمُوْسٌ » [ابن ابی شیبۃ(٣٥٢٤)،(١/٣٠٨)، فتح الباری(٢/٢١١)، عمدۃ القاری (٥/٢٦٠)]

''میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر کوئی اپنا کندھا اپنے ساتھی کے کندھے سے اور اپنا پاؤں اپنے ساتھی کے پاؤں سے چپکا دیتا تھا اور اگر تو آج کسی کے ساتھ ایسا کرے تو ان میں سے ہر کسی کو دیکھے گا کہ وہ (ایسے بدکتا ہے) گویا وہ شریر خچر ہے۔''

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''اپنی صفوں کو قائم کرو (یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ کہی) اللہ کی قسم تم ضرور اپنی صفیں سیدھی کرو گے ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں کے درمیان مخالفت ڈال دے گا۔'' صحابی فرماتے ہیں: ''پھر میں نے دیکھا کہ نمازی اپنا کندھا اور بازو اپنے ساتھی کے کندھے اور بازو سے، اپنا گھٹنا اس کے گھٹنے سے اور اپنا ٹخنہ اس کے ٹخنے سے ملا دیتا تھا۔'' [ابوداود، کتاب الصلاۃ: باب تسویۃ الصفوف(٦٦٢)، بخاری، کتاب الأذان: باب إلزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم تعلیقا، احمد(٤/٢٧٦)، ابن حبان(٣٩٦)، دارقطنی(١/٢٨٢)]

ابو عثمان النہدی فرماتے ہیں:

'' كُنْتُ فِيمَنْ ضَرَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَدَمَهُ لِاِقَامَةِ الصَّفِّ فِي الصَّلَاةِ ''

[المحلی لابن حزم(٤/٥٨)، موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ(ص/٤٤٥)، ابن ابی شیبۃ (٣٥٣٠)، (١/٣٠٩)، فتح الباری(٢/٢١٠)]

''میں ان لوگوں میں تھا جنھیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نماز میں صف قائم کرنے کے لیے پاؤں پر مارا تھا۔''

صالح بن کیسان سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے:

« لَاَنْ يَخِرَّ ثِنْتَايَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَرٰى فِي الصَّفِّ خَلَاءً وَ لَا اَسُدُّهُ » [عبد الرزاق (٢٤٧٣)، (٢/٥٧)، ابن ابی شیبۃ(١/٣٣٣)، المحلی(٤/٥٩)]

''مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میرے دو دانت ٹوٹ جائیں اس بات سے کہ اگر میں صف میں شگاف دیکھوں اور اسے بند نہ کروں۔''

درج بالا صحیح اور حسن احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز شروع کرتے وقت پہلے صفیں سیدھی کرنی چاہییں۔ اگر صف میں کوئی خلا ہو تو اس کو بند کیا جائے۔ امام کا یہ فریضہ ہے کہ وہ صفیں درست کرائے۔ ہر نمازی اپنے بھائی کے کندھے کے ساتھ کندھا اور پاؤں کے ساتھ پاؤں ملائے اور اپنے بھائی کے ہاتھ میں نرم ہو جائے۔ جب صف درست ہو جائے تو امام نماز شروع کرے اور یہ عمل قیام ہی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ قیام میں تو کندھوں میں اور پاؤں میں وقفہ ہو اور رکوع میں ملانا شروع کر دیں۔ اسی طرح پاؤں کی صرف ایک انگلی نہیں بلکہ پورا قدم ملایا جائے جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ملایا کرتے تھے اور قدم ملانے سے شریر خچر کی طرح بدکنا نہیں چاہیے۔ پاؤں ملانے اور شگاف بند کرنے سے نمازی اللہ تعالیٰ سے اجر کا مستحق قرار پاتا ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح عمل کی توفیق بخشے اور ہمیں ہر قسم کے افراط و تفریط سے محفوظ رکھے۔

صف میں اکیلے کھڑے ہونا

سوال اگر صف میں جگہ نہ ہونے کے باعث نمازی تنہا صف بنا لے تو کیا نماز ہو جائے گی؟

جواب اگلی صف میں جگہ ہو تو پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کرنی چاہیے، اگر کوئی آدمی اس صورت میں نماز ادا کرے تو اسے نماز دہرانی چاہیے۔ حدیث میں آتا ہے:

«اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ رَاٰی رَجُلًا یُصَلِّیْ خَلْفَ الصَّفِّ وَحْدَهٗ فَاَمَرَهٗ اَنْ یُّعِیْدَ»
[ابو داود، کتاب الصلاة : باب الرجل یصلی وحده خلف الصف(٦٨٢)، ابن ماجه(١٠٠٤)، مسند شافعی (١٧٦)، عبد الرزاق(٢٤٨٢)، ابن ابی شیبة(١٩٢/٢)]

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو صف سے پیچھے اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔"

اگلی صف میں سے کسی کو پیچھے کھینچ لانے کے متعلق صحیح حدیث ثابت نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے طبرانی اوسط میں جو روایت پیچھے کھینچ کر لانے کے متعلق ہے اس کی سند میں بشر بن ابراہیم راوی نہایت ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اور امام ہیثمی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔[تلخیص الحبیر (٣٧/٢)، مجمع الزوائد (٩٦/٢)]

ہمارے معاشرے میں عام طور پر جو یہ بات معروف ہو رہی ہے کہ جماعت ہو رہی ہو اور صف میں جگہ نہ ہو تو اگلی صف میں سے ایک آدمی نماز کے لیے پیچھے کھینچ کر ساتھ ملا لیں، اس کا ثبوت صحیح حدیث میں نہیں ہے بلکہ صف توڑنا درست ہی نہیں، کیونکہ حدیث ہے:

« مَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَ مَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللّٰهُ »[ابو داود، کتاب الصلاة، باب تسویة الصفوف(٦٦٦)]

"جس نے صف کو ملایا اللہ اس کو ملائے گا اور جس نے اسے کاٹا اللہ تعالیٰ اسے کاٹے گا۔"

گزشتہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ صف میں اکیلے نماز پڑھنے سے دوبارہ نماز ادا کرنی پڑے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اگلی صف میں جگہ موجود ہے پھر بھی پیچھے اکیلا نماز پڑھتا ہے تو اسے دوبارہ نماز ادا کرنا ہو گی لیکن اگر اگلی صف میں جگہ ہی

نہیں پھر یہ پیچھے اکیلے نماز پڑھ لیتا ہے تو ان شاء اللہ اس کی نماز صحیح ہو گی۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ اور علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے یہی موقف اپنایا ہے اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف نقل کیا ہے۔ [دیکھیے: فتح الباری(٢/٢١٣)، سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة(٢/٣٢٢)]

امام مالک، امام احمد، امام اوزاعی، امام اسحاق، امام ابوحنیفہ اور امام داؤد رحمہم اللہ ظاہری کا یہی مذہب ہے کہ صف سے آدمی نہ کھینچا جائے۔[المجموع(٤/٢٩٩)]

امامت کا مستحق کون ہے؟

(سوال) امامت کا کیا معیار ہے اور امامت کا سب سے زیادہ کون حق دار ہے؟

(جواب) اس کے متعلق سیدنا ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« يَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ كَانُوْا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَاِنْ كَانُوْا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَاِنْ كَانُوْا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ سِلْمًا وَ لَا يَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهِ وَ لَا يَقْعُدُ فِي بَيْتِهِ عَلٰى تَكْرِمَتِهِ اِلَّا بِاِذْنِهِ »[مسلم ، كتاب المساجد: باب من احق بالإمامة(٦٧٣)]

”لوگوں کا امام وہ ہونا چاہیے جو ان میں اچھی طرح قرآن کی قراءت جانتا ہو۔ اگر وہ قراءت میں برابر ہوں تو پھر وہ امامت کرائے جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو، اگر سنت میں برابر ہوں تو جو ان میں سے ہجرت میں مقدم ہو، اگر ہجرت میں بھی برابر ہوں تو جو سب سے پہلے اسلام لانے والا ہو۔ کوئی آدمی دوسرے آدمی کی جگہ امامت نہ کرائے اور نہ اس کے گھر میں اس کے اپنے بیٹھنے والی جگہ بیٹھے مگر اس کی اجازت لے کر۔“

حدیث کے بعض طرق میں اسلام کی جگہ عمر کا بھی ذکر آتا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ قاری قرآن پھر سنت کے عالم کا علی الترتیب امامت کے لیے انتخاب ہونا چاہیے اور جو امام منتخب ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے مقتدیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے امامت کرائے کیونکہ اس کے پیچھے بچے، ضعیف، بیمار، مسافر اور مختلف قسم کے افراد ہوتے ہیں، لہٰذا نہ زیادہ لمبی نماز پڑھائے اور نہ اس قدر مختصر ہی ہو کہ قیام، رکوع وسجود وغیرہ کا بھی خیال نہ رکھے۔

نوٹ: یاد رہے کہ حنفی حضرات نے امامت کے متعلق کچھ لایعنی، فضول اور مضحکہ خیز شرائط ذکر کی ہیں جیسا کہ درمختار میں امامت کے بیان میں امام کی مختلف شرائط ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھ دیا گیا کہ امام کی بیوی سب سے حسین ہو، امام کا سر بڑا ہو، امام کا آلۂ تناسل چھوٹا ہو وغیرہ۔ یہ شرائط انتہائی مضحکہ خیز اور باعث عار ہیں جن کا کتاب وسنت میں کہیں بھی وجود نہیں پایا جاتا، نہ کسی صحیح سند سے اور نہ کسی ضعیف سند ہی سے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کتاب وسنت جیسی عظیم شاہراہ پر قائم رکھے۔ (آمین!)

ننگے سر جماعت کرانے کا حکم

سوال کیا کوئی آدمی ننگے سر جماعت کرا سکتا ہے؟ اگر کرا سکتا ہے تو دلائل سے آگاہ کریں۔

جواب حافظ عبدالمنان نور پوری ﷾ اس کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں عائشہ صدیقہ ﷞ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ »[ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب المرأة تصلی بغير خمار (٦٤١)]

''اللہ تعالیٰ بالغہ عورت کی ننگے سر نماز کو قبول نہیں کرتا۔''

یہ حدیث صحیح ہے۔ شیخ البانی ﷫ نے اس کو صحیح ابن ماجہ اور صحیح ابوداوٗد میں درج فرمایا ہے، اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بالغ عورت کی نماز ننگے سر نہیں ہوتی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ مرد اور نابالغ عورت کی نماز ننگے سر ہو جاتی ہے، لہٰذا اگر کوئی مرد ننگے سر نماز پڑھتا ہے تو اس سے الجھنا نہیں چاہیے۔ ننگے سر نماز پڑھنے والے کو بھی غور کرنا چاہیے کہ ننگے سر نماز پڑھنے میں سر ڈھک کر نماز پڑھنے سے کوئی زیادہ ثواب نہیں ملتا کہ اس عمل پر اصرار کرے، الغرض سر ڈھک کر نماز پڑھنے کی پابندی بالغ عورت کے لیے ہے، مرد کے لیے سر ڈھک کر نماز پڑھنے کی فرضیت کتاب و سنت میں کہیں وارد نہیں ہوئی، ﴿ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾[الاعراف: ٣١] مرد کے لیے سر ڈھک کر نماز پڑھنے کی فضیلت پر استدلال درست نہیں۔ (هذا ما عندی والله أعلم بالصواب) (احکام و مسائل : ١٠١)

حافظ عبدالمنان نور پوری ﷾ کا جواب بالکل صحیح اور درست ہے، جب کتاب و سنت میں کہیں بھی مرد کے لیے سر ڈھانپ کر نماز پڑھنے کی پابندی وارد نہیں ہوئی تو نمازی خواہ امام ہو یا مقتدی یا منفرد اس کی نماز ننگے سر درست ہوگی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ننگے سر نماز نہیں ہوتی وہ اپنے اس دعویٰ کی کوئی صحیح دلیل پیش کریں۔ انھوں نے مساجد میں ایسی فضول اور عبث ٹوپیاں رکھی ہوتی ہیں جنھیں پہن کر خود مسجد سے باہر جانا بھی پسند نہیں کرتے وہ پہن کر نماز ادا کرتے ہیں اور یہ بھی یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ نے داڑھی مونڈ کر کبھی نماز نہیں پڑھی تو کیا یہ لوگ فتویٰ صادر کریں گے کہ ننگے منہ یعنی داڑھی منڈے کی نماز نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ دین کا صحیح فہم عطا کرے اور کتاب و سنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین!)

داڑھی کٹوانے والے کو مستقل امام بنانا

سوال ہماری مسجد کے امام صاحب اپنی داڑھی کو کٹواتے ہیں اور ان کی داڑھی ایک مٹھی سے بھی کم ہے، کیا ایسے شخص کے پیچھے نماز ادا کرنا جائز ہے یا نہیں اور ایسے شخص کو امام بنانا کیسا ہے؟

جواب امام مسجد ایسا ہونا چاہیے جو شریعت کی صحیح طور پر پیروی کرنے والا ہو اور کتاب و سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے والا ہو اور سب سے زیادہ قرآن و سنت کا عالم ہو۔ داڑھی رکھنا مسلمان مرد پر واجب ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے داڑھی بڑھانے

کا حکم دیا ہے جیسا کہ فرمایا:

« خَالِفُوا الْمُشْرِكِينَ وَفِّرُوا اللُّحَى وَأَحْفُوا الشَّوَارِبَ ...... وَفِي رِوَايَةٍ ...... انْهَكُوا الشَّوَارِبَ وَاعْفُوا اللُّحَى » [بخاری، کتاب اللباس: باب تقليم الأظفار و باب إعفاء اللحى (٥٨٩٢)، (٥٨٩٣)]

''مشرکوں کی مخالفت کرو، داڑھی کو بڑھاؤ اور مونچھوں کو پست کرو۔'' اور ایک روایت میں ہے۔'' مونچھیں اچھی طرح کاٹو اور داڑھی بڑھاؤ۔''

اور خود رسول اللہ ﷺ کی داڑھی گھنی تھی۔ نہ آپ نے داڑھی کاٹی اور نہ کاٹنے کا حکم دیا، لہٰذا نبی ﷺ کا حکم ماننا واجب ہے۔تو امام مسجد کو چاہیے کہ وہ اپنی داڑھی پوری رکھے۔ داڑھی منڈانے اور کٹانے والا فاسق و فاجر ہے، ایسے آدمی کو مستقل امام نہ بنائیں۔ البتہ ایسا شخص اگر کبھی نماز پڑھا دے تو اس کے پیچھے نماز ہو جائے گی کیونکہ فاسق و فاجر کے پیچھے بالاتفاق نماز ہو جاتی ہے۔ امام مسجد کو اچھے طریقے سے سمجھائیں اگر وہ سمجھانے کے باوجود مکمل داڑھی نہیں رکھتا تو اس کا متبادل کوئی بہتر سوچ لیں اور اچھے طریقے سے اور حکمت کے ساتھ فیصلہ کریں، کسی فتنے کا پیش خیمہ نہ بنیں۔

کیا غیر ذمہ دار شخص امامت کے لائق ہے؟

سوال جو شخص کسی ہمسایہ کے گھر میں تانک جھانک کرے، کیا وہ امامت کرانے کا اہل ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب بشرط صحت سوال ایسا امام جو کسی کے گھر میں تانک جھانک کرے اسے امامت کا حق نہیں ہے۔ امام اعلیٰ صفات کا مالک ہونا چاہیے، جیسا کہ سنن الدارقطنی میں حدیث ہے کہ اپنے میں سے بہتر کو امام بناؤ اور ناجائز تانک جھانک شرعاً حرام ہے اور فعل حرام کا ارتکاب بالخصوص امام کے لیے تو قطعاً درست نہیں اور ایسا امام تو مقتدیوں کی نظر میں بھی مقام کھو دیتا ہے اور مقتدی اس سے کراہت کرنے لگ جاتے ہیں، اس کے متعلق یہ حدیث پیش نظر رہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تین آدمیوں کی نماز ان کے سروں سے اوپر ایک بالشت بھی نہیں اٹھائی جاتی، ایک وہ شخص جو قوم کی امامت کرواتا ہے اور وہ اسے ناپسند کرتے ہیں اور وہ عورت جو رات اس حال میں گزارے کہ اس کا خاوند اس سے ناراض ہو، اور وہ دو بھائی جو آپس میں ناراض ہیں۔'' [ابن ماجه، كتاب اقامة الصلوات: باب من أم قوما وهم له كارهون (٩٧١)]

اس حدیث کو امام نووی، امام عراقی اور علامہ بوصیری نے حسن اور صحیح قرار دیا ہے اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے مشکوٰۃ کی تحقیق میں اسے شواہد کی بنا پر حسن قرار دیا ہے اور یہ یاد رہے کہ امام کے ساتھ تعصب مذہبی اور بلا وجہ کوئی عداوت نہ ہو۔ علامہ البانی رحمہ اللہ

اس حدیث پر لکھتے ہیں:

''امام کی نماز اوپر اس لیے نہیں اٹھائی جاتی کہ وہ امامت کے حق کو قائم نہیں کر رہا اور جب مقتدیوں کا اس کے ساتھ معاملہ مذہبی تعصب کی وجہ سے ہو تو یہ چیز اس میں داخل نہیں۔'' [تحقیق ثانی مشکوۃ، کتاب الصلاۃ: باب الإمامة: (١١٢٨)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام شرعی عذر کی بنا پر مقتدیوں کے ہاں ناپسندیدہ ہو جائے تو وہ امامت کے حق کو قائم نہیں کر رہا، اسے اس صورت میں امام رہنے کا حق نہیں۔ مسجد کی انتظامیہ کو چاہیے کہ ایسے امام کی کوتاہی پر اسے متنبہ کریں اور اخلاص کے ساتھ اس کی اصلاح کریں، اگر وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئے تو اسے امامت سے معزول کر دیں اور کسی مخلص، دیانتدار اور شریف شخص کا امامت کے لیے انتخاب کریں جو قرآن حکیم اور حدیث رسول اللہ ﷺ کا علم رکھنے کے ساتھ ساتھ باعمل بھی ہو۔

امام کی اقتدا کا صحیح طریقہ

سوال مقتدی کے لیے امام کی اقتدا کا صحیح طریقہ سنت رسول کی روشنی میں بیان فرما دیں؟

جواب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُبَادِرُوا الْإِمَامَ إِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا وَ إِذَا قَالَ وَ لَا الضَّالِّيْنَ فَقُوْلُوْا آمِيْنَ وَ إِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا وَ إِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ » [مسلم، كتاب الصلاة: باب النهى عن مبادرة الامام بالتكبير وغيره(٤١٥)]

''امام سے جلدی نہ کرو، جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو، جب وہ ﴿ وَلَا الضَّالِّيْنَ ﴾ کہے تو آمین کہو۔ جب رکوع کرے تو تم رکوع کرو، جب « سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ » کہے تو تم « اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ » کہو۔''

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا وَ لَا تُكَبِّرُوْا حَتّٰى يُكَبِّرَ وَ إِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا وَ لَا تَرْكَعُوْا حَتّٰى يَرْكَعَ وَ إِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وَ إِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا وَ لَا تَسْجُدُوْا حَتّٰى يَسْجُدَ » [ابو داؤد، كتاب الصلاة: باب الإمام يصلي من قعود (٦٠٣)]

''جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور تکبیر نہ کہو یہاں تک کہ وہ تکبیر کہے اور جب رکوع کرے تو رکوع کرو اور رکوع نہ کرو حتیٰ کہ وہ رکوع کرے اور جب وہ « سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ » کہے تو تم « اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ » کہو اور جب سجدہ کرے تو تم سجدہ کرو اور جب وہ سجدہ نہ کرے تو تم سجدہ نہ کرو۔''

مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے ''رسول اکرم ﷺ کی نماز'' میں لکھا ہے:

''حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب امام تکبیر کہہ چکے تو مقتدی اس کے بعد تکبیر کہے، جب امام سجدے میں چلا

جائے تو تم سجدے میں جاؤ۔ جب امام سر اٹھا چکے تو تم سر اٹھاؤ۔ جب وہ " سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ " کہہ چکے تو تم " رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ " کہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ مقتدی کو ہر فعل اس وقت کرنا چاہیے جب امام وہ کام کر چکے۔ نہ امام سے پہلے جانا چاہیے نہ اس کے ساتھ بلکہ امام کے بعد وہ رکن ادا کرے، متابعت کرے یعنی پیچھے پیچھے چلے۔"

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ ارکان ادا کرنے میں امام سے سبقت کر رہا تھا، فرمایا: "تم نے نہ تنہا نماز پڑھی نہ امام کی اقتدا میں۔" [بحواله رسالة الصلاة لاحمد]

نیز عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے:

" انھوں نے ایک شخص کو امام سے سبقت کرتے دیکھا تو فرمایا: " تم نے نہ اکیلے نماز ادا کی نہ امام کی اقتدا میں۔"

اسے مارا اور کہا: "نماز لوٹاؤ۔" [رسالة الصلاة (ص/ ۳۵۲) مجموعة الحديث]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایسی نماز کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: « اِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا » کا مطلب یہ ہے کہ امام کی تکبیر ختم ہو جائے پھر مقتدی تکبیر کہے۔ لوگ جہالت کی وجہ سے غلطی کرتے ہیں اور نماز کے معاملے کو ہلکا سمجھتے ہیں، امام ہی کیساتھ تکبیر کہنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ غلطی ہے۔" [رساله الصلاة لأحمد (ص/ ۲۵۲)]

امام احمد رحمہ اللہ نے اس مقام پر بڑے بسط و تفصیل سے لکھا ہے کہ امام سے پہلے یا امام کے ساتھ تمام ارکان ادا کرنا غلط ہے۔ امام جب رکوع و سجدہ میں چلا جائے اور اس کی تکبیر کی آواز ختم ہو جائے تو مقتدی کو اس وقت رکوع و سجود وغیرہ امور شروع کرنے چاہییں۔ ہمارے ملک میں یہ غلطی عام ہے، تمام طبقات یہ غلطی کرتے ہیں۔ اگر سبقت نہ کریں تو امام کے ساتھ ضرور ادا کرتے ہیں، حالانکہ یہ صاف حدیث کے خلاف ہے، خطرہ ہے کہ نماز ضائع ہو جائے گی۔ امام کی اطاعت کا شرعاً یہی مطلب ہے کہ تمام ارکان وغیرہ امام پہلے ادا کرے۔ مقتدی اس وقت شروع کرے جب امام رکن میں مشغول ہو جائے۔ حدیث کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ امام سے سبقت درست ہے، نہ امام کی معیت بلکہ امام جب کسی رکن میں مشغول ہو جائے اس کے بعد مقتدی امام کے ساتھ شریک ہو۔

تعجب ہے کہ تمام مکاتب فکر اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ بریلوی حضرات تو بدعات میں اس قدر محو ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو سنت کی محبت سے خالی کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت نئی سے نئی بدعتوں کی تلاش میں پریشان ہیں۔ اہل حدیث حضرات اور دوسرے موحد گروہ بھی اس غلطی میں از اوّل تا آخر مبتلا ہیں، الا کہ جس پر اللہ نے رحم کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ارشاد کس قدر درست ہے:

" لَوْ صَلَّيْتَ فِيْ مِائَةِ مَسْجِدٍ مَّا رَأَيْتَ اَهْلَ مَسْجِدٍ وَّاحِدٍ يُّقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ عَلٰى مَا جَاءَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ عَنْ اَصْحَابِهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ " [رسالة الصلاة لأحمد (ص ۱۵٤)]

(یہاں مولانا اسماعیل سلفی کا کلام ختم ہوا)

" آپ اگر سو مسجدوں میں نماز ادا کریں تو کسی میں بھی آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریق پر نماز نہیں ملے گی۔"

امام احمد رحمہ اللہ اور مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے ان احادیث کا جو مطلب بیان کیا ہے، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے فرامین کا یہی مطلب سمجھا ہے اور اس کے مطابق عمل کیا ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« كُنَّا نُصَلِّيْ خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَإِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ لَمْ يَحْنُ أَحَدٌ مِنَّا ظَهْرَهُ حَتّٰى يَضَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ جَبْهَتَهُ عَلَى الْأَرْضِ » [بخاری، کتاب الأذان باب السجود علی سبعة اعظم (۸۱۱)]

''ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ'' کہتے تو ہم میں سے کوئی بھی اپنی پشت نہیں جھکاتا تھا حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیشانی زمین پر رکھ لیتے تھے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی صحابی بھی آپ کے زمین پر پیشانی رکھنے سے پہلے اپنی پیٹھ نہیں جھکاتا تھا۔ کیا اب بھی کوئی ایسی مسجد ملتی ہے جس میں تمام لوگ اتنے حوصلے والے ہوں کہ ایک شخص بھی امام کے زمین پر پیشانی رکھنے تک اپنی پیٹھ کو نہ جھکائے۔ کم از کم مجھے تو نہیں ملی۔ ہاں اللہ کی رحمت سے امید ضرور ہے کہ اگر ہم پوری کوشش کریں اور اپنے بھائیوں کو بار بار سمجھائیں تو اس عمل پر پابندی شروع ہو جائے گی۔

جب حجاج بن یوسف کو مسلمانوں کی حکومت میں کوئی عہدہ حاصل نہیں ہوا تھا تو ایک دفعہ اس نے سعید بن مسیب رحمہ اللہ کے پہلو میں نماز ادا کی اور امام سے پہلے سر اٹھانا اور اس سے پہلے سجدہ میں گرنا شروع کر دیا۔ جب اس نے سلام پھیرا تو سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے اس کی چادر کا کنارہ پکڑ لیا اور نماز کے بعد اذکار پڑھتے رہے۔ حجاج چھڑانے کی کوشش کرتا رہا تاآنکہ سعید رحمہ اللہ نے اپنے اذکار مکمل کر لیے پھر حجاج کی طرف متوجہ ہو کر اسے اس کی جلد بازی پر خوب تنبیہ کی اور ساتھ ہی نماز کے آداب سکھائے۔ حجاج نے ساری بات خاموشی سے سنی اور جواب میں کچھ نہ کہا۔ آخر ایک وقت آیا کہ وہ حجاز کا حاکم بن گیا۔ جب مدینہ میں آیا اور مسجد نبوی میں داخل ہوا تو سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی مجلس کا رخ کیا اور ان کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: ''ایک دن وہ باتیں تم ہی نے کی تھیں؟'' سعید رحمہ اللہ نے اس کے سینے پر ہاتھ مار کر کہا: ''ہاں! میں ہی نے کی تھیں۔'' حجاج نے کہا: ''آپ جیسے معلم اور ادب سکھانے والے کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ کے بعد میں نے جو نماز بھی پڑھی آپ کی بات مجھے ضرور یاد آتی رہی۔'' پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ [البداية والنهاية (۹/۱۹۹)]

اسی تادیب کا اثر تھا کہ حجاج کے ہاتھ سے بھلے بھلے لوگ محفوظ نہیں رہے مگر اس نے سعید رحمہ اللہ کے ادب سکھانے کا ہمیشہ خیال رکھا اور انھیں کبھی نہ پریشان کیا اور نہ کوئی تکلیف ہی پہنچائی۔ ہمیں بھی کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے ساتھ نماز پڑھنے والا اگر اس قسم کی جلد بازی کرے تو اسے سمجھائیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح فرما دے اور اس کی درست نمازوں اور نیک دعاؤں میں ہمارا حصہ بھی شامل ہو جائے، اگر وہ قبول نہ بھی کرے تو ہم ادائے فرض سے تو سبکدوش ہو جائیں گے۔

امام سے پہل کرنا

سوال نماز میں امام سے پہل کرنے والے کا کیا حکم ہے؟

جواب امیر کی اطاعت تو مدت ہوئی مسلمانوں سے چھن چکی۔ نہ ان کا کوئی امیر المومنین ہے جس کی اطاعت کو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اس کی نافرمانی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سمجھیں، نہ انھیں اسے حاصل کرنے کی کوئی فکر ہے (الا ماشاء اللہ)، لے دے کر نماز کے امام کی صورت میں انھیں پانچ وقت اطاعت کا سبق یاد کرایا جاتا ہے اور ان سے دنیا کے تمام کام چھڑوا کر اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر امام کی اقتدا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ اب تمھاری ہر حرکت امام کی حرکت کے بعد ہونی چاہیے، اس سے پہلے کوئی حرکت تمھارے لیے جائز نہیں مگر اکثر مسلمان نافرمانی کے ایسے خوگر ہو چکے ہیں کہ نہ انھیں اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی پر کوئی فکر ہے نہ عقل کے تقاضوں کی خلاف ورزی پر، وہ ہر رکن امام سے پہلے کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر سخت سزا سے ڈرایا ہے:

« عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : اَمَا يَخْشَى الَّذِیْ يَرْفَعُ رَأْسَهُ قَبْلَ الْإِمَامِ اَنْ يُّحَوِّلَ اللّٰهُ رَأْسَهُ رَأْسَ حِمَارٍ ؟ » [بخاری، كتاب الأذان : باب إثم من رفع رأسه قبل الامام (٦٩١)، مسلم (٤٢٧)]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص امام سے پہلے اپنا سر اٹھاتا ہے کیا وہ اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کے سر میں نہ بدل دے؟''

نماز کی حالت میں امام سے پہل کرنا عقل کے تقاضوں کے بھی سراسر خلاف ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ایک نکتہ نقل فرمایا ہے کہ اگر غور کریں تو امام سے آگے بڑھنے کی کوئی بھی وجہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ نماز سے جلدی فراغت حاصل ہو جائے۔ اس جلد بازی کا علاج یہ ہے کہ آدمی سوچے کہ وہ امام کے فارغ ہونے سے پہلے تو نماز سے نکل ہی نہیں سکتا پھر یہ جلد بازی کیوں؟ امام کی پیروی اور اس سے پہل نہ کرنے کی ایک اور حدیث درج ذیل ہے:

« عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهُ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ! اِنِّیْ اِمَامُكُمْ وَ لَا تَسْبِقُوْنِیْ بِالرُّكُوْعِ وَ لَا بِالسُّجُوْدِ وَ لَا بِالْقِيَامِ وَ لَا بِالْاِنْصِرَافِ فَاِنِّیْ اَرَاكُمْ اَمَامِیْ وَ مِنْ خَلْفِیْ» [مسلم، كتاب الصلاة باب تحريم سبق الإمام بركوع أو سجود و نحوهما (٤٢٦)]

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ہمیں نماز پڑھائی، نماز سے فارغ ہو کر اپنا چہرہ ہماری طرف پھیر کر فرمایا: ''لوگو! میں تمھارا امام ہوں، تم مجھ سے نہ رکوع میں پہل کرو، نہ سجدے میں، نہ قیام میں اور نہ منہ پھیرنے میں کیونکہ میں تمھیں اپنے سامنے سے اور پیچھے سے دیکھتا ہوں۔''

ایک مسجد میں دو جماعتیں

سوال کیا جماعت ہو جانے کے بعد رہ جانے والے افراد دوسری جماعت کروا سکتے ہیں؟ کچھ لوگ اسے مکروہ خیال کرتے ہیں۔

(جواب) ایک ہی مسجد میں دو بار جماعت کرانے کا جواز صحیح احادیث میں موجود ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور فقہاء و محدثین رحمہم اللہ کا اس پر عمل رہا ہے۔

① سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَبْصَرَ رَجُلًا يُصَلِّيْ وَحْدَهُ فَقَالَ اَلَا رَجُلٌ يَتَصَدَّقُ عَلٰى هٰذَا فَيُصَلِّيْ مَعَهُ » [ابو داؤد، كتاب الصلاة: باب فى الجمع فى المسجد مرتين(٥٧٤)]

''رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ اکیلا نماز پڑھ رہا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا ایسا کوئی آدمی نہیں جو اس پر صدقہ کرے اور اس کے ساتھ نماز پڑھے۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« اَيُّكُمْ يَتَّجِرُ عَلٰى هٰذَا ؟ فَقَامَ رَجُلٌ فَصَلّٰى مَعَهُ » [ترمذى، كتاب الصلاة: باب ما جآء فى الجماعة فى مسجد قد صلى فيه(٢٢٠)، احمد (٦٤/٣، ٨٥)، ابو يعلى(٣٢١/٢)، نصب الراية(٥٧/٢)، حاكم (٢٣٨/٤)، طبرانى صغير (٢١٨/١)]

''تم میں سے کون شخص ہے جو اس کے ساتھ اجرت میں شریک ہو؟'' ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے اس کے ساتھ مل کر نماز پڑھی۔''

علامہ زیلعی حنفی رحمہ اللہ نے ''نصب الراية'' میں اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ''قوت المغتذى'' میں لکھا ہے: ''جس آدمی نے اس آدمی کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز ادا کی تھی وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوسری جماعت ایک ہی مسجد میں جائز ہے اور اگر کوئی شخص اس وقت مسجد میں آئے جب جماعت ہو چکی ہو تو وہ دوبارہ کسی کے ساتھ مل کر جماعت کی صورت میں نماز ادا کرے تو یہ صحیح، مشروع اور جائز ہے اور آپ کا گزشتہ فرمان اس پر شاہد ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے بھی اس حدیث کا یہی مفہوم سمجھا اور وہ اس کے قائل و فاعل تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں لکھا ہے:

« جَآءَ اَنَسٌ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اِلَى الْمَسْجِدِ قَدْ صُلِّيَ فِيْهِ فَاَذَّنَ وَ اَقَامَ وَ صَلّٰى جَمَاعَةً »[بخارى تعليقاً، كتاب الأذان : باب فضل صلاة الجماعة۔ ابن ابى شيبة(١٤٨/١)]

''سیدنا انس رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے، جماعت ہو چکی تھی تو انھوں نے اذان و اقامت کہی اور جماعت سے نماز پڑھی۔''

امام بغوی رحمہ اللہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی گزشتہ حدیث کے متعلق رقمطراز ہیں:

'' وَ فِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّهُ يَجُوْزُ لِمَنْ صَلّٰى فِيْ جَمَاعَةٍ اَنْ يُّصَلِّيَهَا ثَانِيًا مَعَ جَمَاعَةِ آخَرِيْنَ وَ اَنَّهُ يَجُوْزُ اِقَامَةُ الْجَمَاعَةِ فِيْ مَسْجِدٍ مَرَّتَيْنِ وَ هُوَ قَوْلُ غَيْرِ وَاحِدٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ وَ التَّابِعِيْنَ ''
[شرح السنة(٤٣٦/٣)]

"یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے ایک دفعہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لی ہو، اس کے لیے جائز ہے کہ وہ دوسری مرتبہ دوسرے لوگوں کے ساتھ نماز ادا کرے۔ اسی طرح مسجد میں دوبارہ جماعت قائم کرنا بھی جائز ہے۔ یہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا قول ہے۔"

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ لَا يُكْرَهُ إِعَادَةُ الْجَمَاعَةِ فِي الْمَسْجِدِ وَ مَعْنَاهُ أَنَّهُ صَلَّى إِمَامُ الْحَيِّ وَحَضَرَهَا جَمَاعَةٌ أُخْرٰى اِسْتَحَبَّ لَهُمْ اَنْ يُّصَلُّوْا جَمَاعَةً وَ هٰذَا قَوْلُ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَ عَطَاءٍ وَ الْحَسَنِ وَ النَّخْعِيِّ وَ قَتَادَةَ وَ اِسْحَاقَ " [المغنی (١٠/٣)]

"ایک مسجد میں دوبارہ جماعت کروانا مکروہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب محلے کے امام نے نماز پڑھ لی اور دوسری جماعت حاضر ہو گئی تو ان کے لیے مستحب ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ یہ قول عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عطا، نخعی، قتادہ اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا ہے۔"

پھر امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اس کے بعد حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ذکر کی ہے۔

② « عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ فَضْلُ صَلَاةِ الْجَمِيْعِ عَلٰى صَلَاةِ الْوَاحِدِ خَمْسٌ وَّ عِشْرُوْنَ دَرَجَةً » [بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله: انّ قرآن الفجر كان مشهودا(٤٧١٧)، مؤطا(٢٩/١)، نسائی(٢٤١/١)، ترمذی(٢١٦)، ابن ماجه(٧٨٧)، دارمی (٢٣٥/١)، ابو عوانة(٢/٢)، ابن خزيمة(٣٦٤/٢)]

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جماعت کی نماز کی فضیلت اکیلے آدمی کی نماز پر ۲۵ درجے زیادہ ہے۔"

یہ حدیث اپنے عموم کے اعتبار سے پہلی اور دوسری دونوں جماعتوں کو شامل ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آدمی کی پہلی جماعت فوت ہو جائے تو وہ دوسری جماعت کے ساتھ نماز ادا کر لے تو مذکورہ فضیلت پا لے گا۔

③ « عَنِ الْجَعْدِ اَبِيْ عُثْمَانَ قَالَ مَرَّ بِنَا اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِيْ مَسْجِدِ بَنِيْ ثَعْلَبَةَ فَقَالَ اَصَلَّيْتُمْ ؟ قَالَ: قُلْنَا نَعَمْ وَ ذَاكَ صَلَاةُ الصُّبْحِ فَاَمَرَ رَجُلًا فَاَذَّنَ وَ اَقَامَ ثُمَّ صَلّٰى بِاَصْحَابِهٖ » [ابو يعلى (٤٣٥٥)، ابن ابی شيبة(٣٢١/٢)، بيهقى(٧٠/٣)، مجمع الزوائد(٤/٢)، عبدالرزاق (٢٩١/٢)]

"حضرت ابوعثمان الجعد سے مروی ہے کہ بنو ثعلبہ کی مسجد میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہمارے پاس سے گزرے تو انھوں کہا: "کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے؟" تو کہتے ہیں کہ میں نے کہا: "ہاں!" اور وہ صبح کی نماز تھی۔ آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا، اس نے اذان اور اقامت کہی پھر اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی۔"

④ « اِنَّ ابنَ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَ قَدْ صَلَّوْا فَجَمَعَ بِعَلْقَمَةَ وَ مَسْرُوْقٍ وَ الْاَسْوَدَ » [أبكار المنن(ص/٢٥٣) اس کی سند صحیح ہے۔مرعاۃ شرح مشكوٰۃ(١٠٤/٤)]

”سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو لوگوں نے نماز پڑھ لی تھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے علقمہ، مسروق اور اسود کو جماعت کرائی۔“

مذکورہ بالا صریح احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ مسجد میں دوسری جماعت کروا لینا بلا کراہت جائز و درست ہے اور یہ موقف اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔

مسجد میں دوسری جماعت کو مکروہ سمجھنے والوں کے دلائل:

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَقْبَلَ مِنْ بَعْضِ نَوَاحِی الْمَدِيْنَةِ يُرِيْدُ الصَّلَاةَ فَوَجَدَ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا فَانْصَرَفَ اِلٰى مَنْزِلِهٖ فَجَمَعَ اَهْلَهٗ ثُمَّ صَلّٰى بِهِمْ »[مجمع الزوائد(٤٨/٢)، طبراني أوسط (٤٧٣٩)، الكامل لابن عدی(٢٣٩٨/٦)، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔[تمام المنة(ص/١٥٥)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے اطراف سے تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا کرنا چاہتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر چلے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر والوں کو جمع کیا پھر ان کے ساتھ نماز پڑھی۔“

اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کو طبرانی نے معجم کبیر واوسط میں بیان کیا ہے۔ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ اس سے یہ دلیل لی جاتی ہے کہ اگر دوسری جماعت بلا کراہت جائز ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی فضیلت کو ترک نہ کرتے یعنی مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی فضیلت عام مسجد میں نماز ادا کرنے سے بہت زیادہ ہے۔اس کا جواب یوں دیا گیا ہے:

اوّلاً: مولانا عبیداللہ مبارک پوری رحمہ اللہ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

”اس حدیث سے دوسری جماعت کی مکروہیت پر دلیل پکڑنا محل نظر ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیث اس بارے میں نص نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں گھر میں نماز پڑھائی ہو بلکہ اس بات کا بھی احتمال موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نماز مسجد میں پڑھائی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر کی طرف جانا گھر والوں کو جمع کرنے کے لیے تھا نہ کہ گھر میں جماعت کروانے کے لیے۔ تو اس صورت میں یہ حدیث اس مسجد میں جس کا مؤذن و امام متعین ہو، دوسری جماعت کے استحباب کی دلیل ہوگی۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر والوں کو گھر ہی میں جماعت کرائی تو اس سے مسجد میں دوبارہ جماعت کی کراہت ثابت نہیں ہوتی بلکہ انتہائی آخری بات جو ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایک آدمی ایسی مسجد میں آئے جس میں جماعت ہو چکی ہو تو اس کو چاہیے کہ اس مسجد میں نماز نہ پڑھے بلکہ اس سے نکل کر گھر چلا جائے اور گھر میں اپنے اہل کے ساتھ نماز پڑھے۔

بہرحال اس کے لیے مسجد میں دوسری جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کو مکروہ کہنا اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔ جیسا کہ یہ حدیث بعد میں آنے والے اکیلے آدمی کی اس مسجد میں نماز کی کراہت پر دلالت نہیں کرتی ۔ اگر اس حدیث سے مسجد میں دوبارہ جماعت کے مکروہ ہونے پر دلیل لی جائے تو پھر اس سے یہ بھی ثابت ہوگا کہ اکیلے بھی اس مسجد میں نماز نہ پڑھے۔'' [مرعاة المفاتيح(٤/ ١٠٥)]

ثانیاً: اگرچہ علامہ البانی ؒ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے مگر یہ محل نظر ہے، کیونکہ اس کی سند میں بقیہ بن الولید مدلس راوی ہے اور یہ تدلیس التسویہ کرتا ہے جو انتہائی بڑی تدلیس ہے اور اس کی تصریح بالسماع مسلسل نہیں ہے۔

دوسری جماعت کو مکروہ خیال کرنے والوں کی دوسری دلیل:

« عَنِ ابْرَاهِيمَ اَنَّ عَلْقَمَةَ وَ الْاَسْوَدَ اَقْبَلَا مَعَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اِلٰى مَسْجِدٍ فَاسْتَقْبَلَهُمُ النَّاسُ قَدْ صَلَّوْا فَرَجَعَ بِهِمْ اِلَى الْبَيْتِ فَجَعَلَ اَحَدُهُمَا عَنْ يَّمِيْنِهِ وَ الْاٰخَرَ عَنْ شِمَالِهِ ثُمَّ صَلّٰى بِهِمَا » [عبد الرزاق (٣٨٨٣)، (٢/ ٤٠٩)، طبرانی كبير(٩٣٨٠)]

'' ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ علقمہ اور اسود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد کی طرف آئے تو لوگ انھیں اس حالت میں ملے کہ انھوں نے نماز پڑھ لی تھی تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان دونوں کو ساتھ لے کر گھر کی طرف چلے گئے۔ انھوں نے ایک کو دائیں جانب اور دوسرے کو بائیں جانب کیا پھر ان کو نماز پڑھائی۔''

اس روایت کی سند میں حماد بن ابی سلیمان ہیں جو مختلط اور مدلس تھے۔[طبقات المدلس(٣٠)]

اور یہ روایت معنعن ہے اور مدلس راوی کی عن عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔ نیز حماد کے اختلاط سے قبل تین راویوں کی روایت حجت ہوتی ہے۔ علامہ ہیثمی ؒ فرماتے ہیں :

" وَ لَا يُقْبَلُ مِنْ حَدِيْثِ حَمَّادٍ اِلَّا مَا رَوَاهُ عَنْهُ الْقُدَمَاءُ شُعْبَةُ وَ سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ وَالدَّسْتَوَائِيُّ وَ مَنْ عَدَا هٰؤُلَاءِ رَوَوْا عَنْهُ بَعْدَ الْاِخْتِلَاطِ " [مجمع الزوائد(١/ ١٢٥)]

''حماد بن ابی سلیمان کی وہ روایت قبول کی جائے گی جو اس سے قدماء یعنی اختلاط سے پہلے والے راویوں کی روایت ہوگی جیسے شعبہ، سفیان ثوری اور ہشام دستوائی اور جو ان کے علاوہ اس سے روایت کریں وہ بعد از اختلاط ہے۔''

تقریباً یہی بات امام احمد ابن حنبل ؒ سے بھی منقول ہے۔[شرح علل ترمذی لابن رجب(ص/ ٣٢٦)]

اور یہ روایت حماد سے معمر نے بیان کی ہے لہٰذا یہ بھی قابل حجت نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے دونوں شاگردوں کو دائیں بائیں کھڑا کر کے جماعت کرائی اور یہ بات احناف کو مسلم نہیں جیسا کہ محمد بن حسن شیبانی ؒ شاگرد امام ابوحنیفہ ؒ نے ذکر کیا ہے۔[كتاب الآثار لمحمد بن حسن(ص/ ٦٩) مترجم]

تیسری بات یہ ہے کہ اوپر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مسجد میں دوبارہ جماعت کروانا صحیح سند کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا توضیحات سے معلوم ہوا کہ دوسری جماعت کی کراہت کے بارے میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں بلکہ صحیح روایات سے دوسری

جماعت کا جواز نکلتا ہے اور یہی جواز والا مذہب زیادہ درست ہے۔ مولانا عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَارَجَحُ الْاَقْوَالِ عِنْدَنَا هُوَ اَنَّهُ يَجُوزُ وَ يُبَاحُ مَنْ اَتٰى مَسْجِدًا قَدْ صُلِّيَ فِيْهِ بِاِمَامٍ رَاتِبٍ وَ هُوَ لَمْ يَكُنْ صَلَّاهَا وَ قَدْ فَاتَتْهُ الْجَمَاعَةُ لِعُذْرٍ اَنْ يُّصَلِّيَ بِالْجَمَاعَةِ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ "[مرعاة المفاتيح شرح مشكوٰة المصابيح(٤/١٠٧)]

'' ہمارے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ جو آدمی مسجد میں اس حال میں پہنچا کہ امام معین کے ساتھ نماز ادا ہو چکی ہو اور اس نے وہ نماز نہیں پڑھی اور عذر کی بنا پر اس کی جماعت فوت ہو گئی تو اس کے لیے جائز و مباح ہے کہ وہ دوسری جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے۔''

بہرصورت یہ یاد رہے کہ بغیر عذر کے جماعت سے پیچھے رہنا اور خواہ مخواہ سستی و کاہلی کا شکار ہو کر دوسری جماعت کا رواج ڈالنا درست نہیں کیونکہ دوسری جانب جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی بہت تاکید وارد ہوئی ہے اور رسول اللہ ﷺ پسند کرتے تھے کہ مومنوں کی نماز اکٹھی ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَقَدْ اَعْجَبَنِيْ اَنْ تَكُوْنَ صَلَاةُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاحِدَةً حَتّٰى لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اَبُثَّ رِجَالًا فِي الدُّوْرِ يُنَادُوْنَ النَّاسَ بِحِيْنِ الصَّلَاةِ » [ابو داؤد، كتاب الصلاة، باب كيف الأذان(٥٠٦)، ابن خزيمة (١/١٩٩)]

'' مجھے یہ بات پسند ہے کہ مومنوں کی نماز ایک ہو یہاں تک کہ میں نے ارادہ کیا کہ کچھ آدمیوں کو محلوں میں پھیلا دوں اور وہ لوگوں کو نماز کے وقت کی اطلاع دیں۔''

اس کے علاوہ بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی تاکید میں کئی ایک صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہمیں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، سوائے شرعی عذر کے جماعت سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے، کیونکہ اگر ہم گھر سے نماز باجماعت کے ارادے سے نکلتے ہیں اور ہمارے آتے آتے نماز فوت ہو جاتی ہے تو مسجد میں آ کر ادا کرنے سے جماعت کا ثواب مل جائے گا جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے:

« مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ وُضُوْءَهُ ثُمَّ رَاحَ فَوَجَدَ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا اَعْطَاهُ اللّٰهُ مِثْلَ اَجْرِ مَنْ صَلَّاهَا وَ حَضَرَهَا لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اَجْرِهِمْ شَيْئًا »[ابو داؤد ،كتاب الصلاة: باب في من خرج يريد الصلاة فسبق بها (٥٦٤)، نسائي(٢/١١١)، شرح السنة(٣/٣٤٢)، حاكم(١/٢٠٨)، تاريخ كبير للبخاري (٨/٤٦)، احمد (٢/٣٨٠)، امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔ یہ روایت حسن ہے۔ [نيل المقصود (٥٦٤)] اور اس کا ابو داؤد میں ایک شاہد بھی ہے۔ ملاحظہ ہو(٥٦٣)، نیز شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ [صحيح ابو داؤد (٥٢٨)]

'' جس نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا پھر چل پڑا (مسجد کی طرف) اس نے لوگوں کو پایا کہ انھوں نے نماز پڑھ لی ہے تو اللہ تعالیٰ اس آدمی کو نماز باجماعت ادا کرنے اور اس میں حاضر ہونے والے کی طرح اجر دے گا اور ان کا اجر کم

نہیں ہوگا۔"

لہٰذا بغیر شرعی عذر کے جماعت سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے اور اگر کسی عذر کی وجہ سے جماعت سے رہ گیا تو اور افراد کے ساتھ مل کر دوسری جماعت کروا لی تو بلا کراہت جائز ہے۔

میاں بیوی کا باجماعت نماز ادا کرنا

(سوال) کیا میاں بیوی جماعت کروا سکتے ہیں اور اس کی کیفیت کیا ہوگی؟

(جواب) میاں بیوی با جماعت نماز ادا کر سکتے ہیں اور جماعت کی صورت میں مرد اپنی بیوی کو اپنے ساتھ برابر کھڑا نہ کرے بلکہ اسے پیچھے کھڑا کرے کیونکہ عورت اکیلی صف کے حکم میں شمار ہوتی ہے، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں یہ عنوان قائم کیا ہے کہ "بَابُ الْمَرْاَةِ وَحْدَهَا تَكُوْنُ صَفًّا" (اکیلی عورت صف کے حکم میں ہوتی ہے) اور اس کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے:

« عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ صَلَّيْتُ اَنَا وَ يَتِيْمٌ فِيْ بَيْتِنَا خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ اُمِّيْ اُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا » [بخاری، کتاب الأذان، باب المرأة وحدها تكون صفا (٧٢٧)]

"سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: "ہمارے گھر میں ایک یتیم لڑکے اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی اور میری ماں ام سلیم ہمارے پیچھے تھے۔"

اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ استدلال کرتے ہیں کہ عورت اکیلی ایک صف کے حکم میں ہوتی ہے جیسا کہ ام سلیم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ لہٰذا جب عورت اکیلی ایک صف کا حکم رکھتی ہے تو مرد اپنی بیوی کو پیچھے کھڑا کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ سلف صالحین سے ازواج کو پیچھے کھڑا کر کے نماز پڑھانے کے واقعات، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق، طبرانی، اخبار اصفہان اور ابن عساکر وغیرہ میں مذکور ہیں۔

مرد کی عورتوں کے لیے امامت

(سوال) کیا مرد عورتوں کو جماعت کروا سکتا ہے، اگر کروا سکتا ہے تو کس صورت میں یعنی امام کے پیچھے عورتوں کی صف ہوگی یا امام کے پیچھے مردوں کی صف ہونا ضروری ہے، پھر اس کے بعد عورتوں کی صف ہوگی؟

(جواب) مرد عورتوں کی امامت کروا سکتا ہے۔ عورتیں مرد کے پیچھے صف باندھیں گی، ساتھ شریک نہیں ہوں گی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: "میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں نماز پڑھی اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہمارے پیچھے نماز ادا کی۔"
[نسائی، کتاب الأمامة: باب موقف الامام إذا كان معه صبي وامرأة (٨٠٥)]

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اور ان کی ماں یا خالہ کو نماز پڑھائی تو آپ نے مجھے اپنی دائیں جانب کھڑا کیا اور عورت کو ہمارے پیچھے کھڑا کر دیا۔“ [مسلم، كتاب المساجد: باب جواز الجماعة فى النافلة: (٦٦٠)، ابوداؤد، كتاب الصلوٰة : باب الرجلين يؤم أحدهما صاحب كيف يقرمان (٦٠٩)]

قاضی شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یہ دونوں حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جب امام کے ساتھ ایک آدمی اور ایک عورت ہو تو آدمی دائیں جانب اور عورت ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہوگی۔ وہ مردوں کے ساتھ صف میں شامل نہیں ہوگی اور اس کا سبب فتنے سے ڈرنا ہے۔“ [نيل الاوطار: (٢٠٤/٣)]

مذکورہ بالا احادیث سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ امام کے ساتھ کوئی مرد ہو تو عورتیں پیچھے کھڑی ہو کر نماز پڑھ سکتی ہیں۔ اب رہا صرف مرد امام ہو اور خواتین مقتدی تو کیا اس طرح نماز جائز و درست ہے۔ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”عورتوں کا مرد کے پیچھے دیگر مردوں کی موجودگی میں نماز پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس بات میں ہے کہ صرف مرد عورتوں کو نماز پڑھائے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح صحیح نہیں تو دلیل پیش کرنا اس کے ذمہ ہے۔“ [الروضة الندية (١١٩/١)]

جابر رضی اللہ عنہ کا اپنے گھر میں عورتوں کی امامت کروانا پھر اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت اختیار کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ مرد کی اقتداء میں عورتوں کی نماز درست ہے جیسا کہ (مسند ابی یعلیٰ: (۱۷۹۵،۲/۱۹۷،۱۹۸) بتحقیق مصطفیٰ عبدالقادر عطاء میں یہ حدیث ہے: علامہ ہیثمی نے اس کی سند کو حسن ہے۔ اسی طرح صحیح البخاری وغیرہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام ذکان کا انھیں جماعت کرانا بھی اس کا مؤید ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں [بداية المجتهد: (١٠٧/١)]

عورت کا جماعت کروانا

(سوال) کیا عورت دیگر خواتین کی امامت کرواسکتی ہے؟

(جواب) ایک عورت دوسری عورتوں کی جماعت کرواسکتی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ باقی عورتوں کے وسط میں کھڑی ہو، مردوں کی طرح آگے بڑھ کر کھڑی نہ ہو۔

حدیث نبوی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام ورقہ بن عبداللہ بن حارث کے گھر تشریف لاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ایک مؤذن مقرر کیا جو اذان دیتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا:

« وَ اَمَرَهَا اَنْ تَؤُمَّ اَهْلَ دَارِهَا » [ابو داؤد، كتاب الصلاة : باب إمامة النساء(٥٩٢)]

”تو اپنے گھر والوں کی امامت کروایا کر۔“

اس کی شرح میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" ثَبَتَ مِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ اَنَّ اِمَامَةَ النِّسَاءِ وَ جَمَاعَتَهُنَّ صَحِيْحَةٌ ثَابِتَةٌ مِنْ اَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ قَدْ اَمَّتِ النِّسَاءَ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَ اُمُّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا فِيْ الْفَرْضِ وَ التَّرَاوِيْحِ " [عون المعبود (۲/۲۱۱)]

''اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کا امامت اور جماعت کروانا صحیح ہے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ثابت ہے۔ سیدہ عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما عورتوں کی فرض اور تراویح میں امامت کرواتی تھیں۔''

ایک اور روایت میں مذکور ہے:

« عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّهَا كَانَتْ اَمَّتِ النِّسَاءَ فَتَقُوْمُ مِنْهُنَّ فِي الصَّفِّ » [ابن ابی شیبة (۲/۸۹)، حاکم(۱/۲۰۳)]

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی امامت کرواتی تھیں اور ان کے ساتھ ہی صف میں کھڑی ہوتی تھیں۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« اِنَّهَا اَمَّتِ النِّسَاءَ فَقَامَتْ وَسْطَهُنَّ » [ابن ابی شیبة(۲/۸۸)]

''انھوں نے عورتوں کی امامت کروائی اور ان کے وسط میں کھڑی ہوئیں۔''

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت عورتوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر امامت کرواسکتی ہے۔

نیز میرے ناقص علم کے مطابق سلف سے کہیں بھی اس بات کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی عورت نے جمعہ یا عیدین کی نماز پڑھائی ہو۔ لہٰذا ان کے بارے میں سوچنا یا گنجائش نکالنا درست نہیں۔

مسافر کی مقیم کے پیچھے نماز

سوال کیا مسافر شخص مقیم امام کے پیچھے نماز قصر کر سکتا ہے یا وہ پوری ادا کرے؟

جواب مسافر پر واجب ہے کہ مقیم امام کے پیچھے پوری نماز پڑھے خواہ وہ مقیم امام کے ساتھ ابتدا میں داخل ہو یا درمیان میں۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ » [بخاری، کتاب الصلاۃ : باب الصلاۃ فی السطوح والمنبر والخشب (۳۷۸)]

''امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔''

دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« فَمَا اَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَ مَا فَاتَكُمْ فَاَتِمُّوْا » [بخاری، کتاب الأذان:باب قول الرجل فاتتنا الصلوٰۃ(۶۳۵)]

''جو نماز تم امام کے ساتھ پالو وہ پڑھو اور جو تم سے رہ گئی تھی اس کو پورا کرلو۔''

یہ دونوں احادیث مسافر اور مقیم دونوں کے لیے عام ہیں۔ جس طرح مقیم امام کی اقتدا کرتا ہے اسی طرح مسافر بھی امام کی اقتدا کرے گا۔ اسی طرح جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہوئے جو رکعات فوت ہوگئی تھیں ان کو پورا کیا جائے گا۔ مقتدی مسافر ہو یا مقیم کیونکہ یہ حکم عام ہے اور سب کے لیے ہے۔ موسیٰ بن سلمہ کہتے ہیں:

« كُنَّا مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا بِمَكَّةَ فَقُلْتُ إِنَّا إِذَا كُنَّا مَعَكُمْ صَلَّيْنَا أَرْبَعًا وَ إِذَا رَجَعْنَا إِلٰى رِحَالِنَا صَلَّيْنَا رَكْعَتَيْنِ ؟ قَالَ تِلْكَ سُنَّةُ أَبِي الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ »[مسند احمد (۲۱٦/۱)، (برقم/۱۸٦٥)]

''ہم مکہ میں سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھے، میں نے پوچھا: ''جب ہم تمھارے ساتھ ہوتے ہیں تو چار رکعت نماز ادا کرتے ہیں اور جب اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹتے ہیں تو دو رکعت ادا کرتے ہیں (ایسا کیوں ہے)؟''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''یہ ابوالقاسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ مسافر جب اکیلا ہو تو دو رکعت پڑھتا ہے اور جب مقیم کے پیچھے نماز ادا کرے تو پوری پڑھتا ہے، یہ کیوں ہے؟'' انھوں نے کہا: « تِلْكَ السُّنَّةُ » ''یہی سنت ہے۔'' [إرواء الغليل (٥٧١)]

یہ حدیث اس مسئلے میں صریح نص ہے کہ مسافر کے لیے مقیم امام کے پیچھے پوری نماز پڑھنا ہی واجب ہے کیونکہ ایک صحابی رسول کا « مِنَ السُّنَّةِ » یا « تِلْكَ السُّنَّةُ » کہنا مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں دو رکعت نماز ادا کی، آپ کے بعد ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما اس پر عمل کرتے رہے۔'' اس حدیث کے آخر میں ہے:

« فَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا إِذَا صَلّٰى مَعَ الْإِمَامِ صَلّٰى أَرْبَعًا وَ إِذَا صَلَّاهَا وَحْدَهُ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ »[مسلم، كتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب قصر الصلاة بمنىٰ (٦٩٤)]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب امام کے ساتھ نماز پڑھتے تو چار رکعت پڑھتے تھے اور جب اکیلے ہوتے تو دو رکعت پڑھتے۔''

یہ تھا ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سنت پر عمل اور یہی عمل کرنے کا وہ دوسروں کو حکم دیتے تھے۔ ابومجلز کہتے ہیں:

" قُلْتُ لِابْنِ عُمَرَ : الْمُسَافِرُ يُدْرِكُ رَكْعَتَيْنِ مِنْ صَلَاةِ الْقَوْمِ يَعْنِي الْمُقِيمِينَ أَ تُجْزِيهِ الرَّكْعَتَانِ أَوْ يُصَلِّيْ بِصَلَاتِهِمْ؟ قَالَ فَضَحِكَ وَ قَالَ يُصَلِّيْ بِصَلَاتِهِمْ " [بيهقي(١٥٧/٣)]

''میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: '' مسافر مقیم امام کے ساتھ دو رکعت پا لیتا ہے، کیا اسے دو رکعت کفایت کر جائیں گی یا جتنی مقیم لوگوں نے نماز ادا کی ہے اتنی وہ بھی ادا کرے؟'' عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یہ بات سن کر ہنس پڑے اور

کہا: ''جتنی نماز مقیم لوگوں نے پڑھی ہے اتنی ہی مسافر بھی پڑھے گا۔''

اس روایت کو شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔[ارواء الغلیل (۲۲/۳)]

یہ ایک صحابیٔ رسول کا عمل اور فتویٰ بھی ہے کہ مسافر مقیم امام کے پیچھے پوری نماز ادا کرے گا، خواہ وہ شروع میں امام کے ساتھ ملا ہو یا آخری دو رکعتوں میں۔ اس کے برعکس اگر مقیم آدمی مسافر امام کے پیچھے نماز ادا کرتا ہے تو اسے پوری نماز پڑھنا ضروری ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال نماز پڑھائی اور مقیم لوگوں سے کہا: ''تم اپنی نماز پوری کرلو، ہم مسافر ہیں۔''

مسافر کی مقیم کے لیے امامت

سوال کیا مسافر آدمی مقیم افراد کی جماعت کروا سکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اگر کوئی شخص کسی قوم کے ہاں مہمان بنے تو وہ ان کی اجازت کے بغیر امامت نہ کرائے۔ اگر وہ اجازت دے دیں تو انھیں نماز پڑھا سکتا ہے اور جب مسافر مقیم کی امامت کرائے اور دو رکعت پر سلام پھیر دے تو مقیم اٹھ کر اپنی بقیہ دو رکعتیں پوری کرے۔ اس سے مقیم کی نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

ابوعطیہ سے روایت ہے کہ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ہمارے پاس نماز کی جگہ آئے، ایک دن نماز کا وقت آ گیا ہم نے انھیں کہا کہ تم آگے بڑھو تو انھوں نے کہا تم میں سے کوئی شخص آگے بڑھے حتیٰ کہ میں تمھیں بیان کروں کہ میں آگے کیوں نہیں بڑھتا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

« مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَا يَؤُمَّهُمْ وَ لْيَؤُمَّهُمْ رَجُلٌ مِّنْهُمْ » [ترمذی، ابواب الصلاۃ: باب ما جآء فیمن زار قوم لا یصلی بھم (۳۵۶)، ابن خزیمۃ (۱۵۲۰)، بیھقی (۱۲۶/۳)، نسائی (۷۸۶)، ابو داؤد (۵۹۶)، احمد (۴۳۶/۳)]

''جو آدمی کسی قوم کی زیارت کیلئے جائے تو وہ ان کی امامت نہ کروائے بلکہ ان میں سے کوئی آدمی ان کی امامت کرائے۔''

اس کی سند میں ابوعطیہ ہے جس کے بارے میں امام ابوحاتم، امام علی بن مدینی اور یحییٰ القطان نے کہا ہے کہ یہ مجہول ہے لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کی تحسین اور امام ابن خزیمہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ نیز اس حدیث کے بعض شواہد بھی ہیں۔

نافع سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ کی ایک جانب مسجد میں نماز کے لیے اقامت کہی گئی اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس مسجد کے قریب زمین تھی جس میں وہ کام کر رہے تھے اور اس مسجد کا امام ان کا غلام تھا۔ اس غلام اور اس کے ساتھیوں کا مسکن بھی وہیں ہی تھا۔ جب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے انھیں سنا تو ان کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لیے تشریف لائے تو مسجد کے امام نے انھیں کہا کہ آگے بڑھیں اور نماز پڑھائیں تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

« اَنْتَ اَحَقُّ اَنْ تُصَلِّيَ فِيْ مَسْجِدِكَ مِنِّيْ فَصَلَّى الْمَوْلٰى» [کتاب الأم (۱۵۸/۱)، بیھقی (۱۲۶/۳)، کتاب الصلاۃ باب الامام الراتب أولی من الزائر]

"تم اپنی مسجد میں نماز پڑھانے کے مجھ سے زیادہ حق دار ہو۔" پس پھر غلام نے نماز پڑھا دی۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مقرر امام امامت کا زیادہ حق رکھتا ہے اور دوسرے شخص کو اس کے ہوتے ہوئے نماز نہیں پڑھانی چاہیے، ہاں اگر مقرر امام کسی دوسرے شخص کو اجازت دے دے تو وہ نماز پڑھا سکتا ہے جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« وَ لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يَّؤُمَّ قَوْمًا اِلَّا بِاِذْنِهِمْ » [ابو داؤد، كتاب الطهارة : باب يصلي الرجل و هو حاقن (۹۱)، بيهقى(۱۲۹/۳)]

"کسی شخص کے لیے حلال نہیں جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو کہ وہ کسی قوم کی امامت کروائے مگر ان کی اجازت کے ساتھ۔"

ایک حدیث میں ہے:

« وَ لَا يَؤُمُّ الرَّجُلُ فِي سُلْطَانِهِ وَ لَا يَجْلِسُ عَلٰى تَكْرِمَتِهِ فِيْ بَيْتِهِ اِلَّا بِاِذْنِهِ » [ترمذى، ابو اب الصلاة: باب ما جاء من أحق بالإمامة(۲۳۵)، احمد(۲۷۲/۵)، نسائى(۷۷۹)، ابو داؤد (۵۸۲،۵۸۳،۵۸٤)، ابن ماجه(۹۸۰)، ابو عوانة(۳٦/۲)، حميدى(٤۵۷)، عبد الرزاق (۳۸۰۹)، حاكم (۲٤۳/۱)، شرح السنة(۳۹٤/۳)]

"کوئی آدمی دوسرے آدمی کی حکومت میں امامت نہ کرائے اور نہ اس کے گھر میں اس کی عزت کی جگہ (مسند وغیرہ پر) بیٹھے مگر صرف اس کی اجازت کے ساتھ۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر مقرر امام کسی آنے والے شخص کو امامت کی اجازت دے دے تو وہ شخص نماز پڑھا سکتا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ مزید لکھتے ہیں:

"امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ کوئی آدمی کسی آدمی کی حکومت و سلطہ والی جگہ امامت نہ کرائے اور نہ اس کی عزت والی جگہ بیٹھے مگر اس کی اجازت سے، یہ اجازت امامت اور عزت والی جگہ دونوں کے متعلق ہے اور جب اسے نماز پڑھانے کی اجازت دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔" [ترمذى، ابواب الصلاة(٤٦١/١)، بتحقيق احمد شاكر]

علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ نے جو بات استنباط کی ہے یہ اس حدیث کی بعض روایات میں بطور نص واقع ہوئی ہے جیسا کہ نیل الاوطار میں ہے:

« وَ لَا يَؤُمُّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهِ وَ لَا يَقْعُدُ عَلٰى تَكْرِمَتِهِ فِيْ بَيْتِهِ اِلَّا بِاِذْنِهِ » [نيل الأوطار (۱۹۲/۳)]

"کوئی شخص دوسرے شخص کی سلطنت میں اس کی امامت نہ کرائے مگر اس کی اجازت کے ساتھ اور نہ اس کے گھر میں اس کی مسند پر بیٹھے مگر اس کی اجازت کے ساتھ۔"

پس اجازت ان دونوں صورت میں ہے یعنی صاحب بیت کی اجازت سے اس کی مسند پر بھی بیٹھ سکتا ہے اور آدمی کی

حکومت والی جگہ اس کی اجازت سے امامت بھی کرا سکتا ہے۔

مذکورہ توضیح سے معلوم ہوا کہ مسافر اور زائر آدمی مقیم کی اجازت سے نماز پڑھا سکتا ہے، اس میں شرعی طور پر رخصت ہے، اگر چہ زیادہ حق مقرر امام کا ہے اور جب مسافر مقیم امام کی اجازت سے نماز پڑھائے اور وہ قصر کرنا چاہتا ہو تو مقیم کھڑے ہو کر اپنی نماز پوری کر لیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ اِذَا قَدِمَ مَكَّةَ صَلّٰى بِهِمْ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ يَقُوْلُ يَا اَهْلَ مَكَّةَ ! اَتِمُّوْا صَلَاتَكُمْ فَاِنَّا قَوْمٌ سَفْرٌ » [مؤطا، كتاب قصر الصلاة فى السفر: باب صلاة المسافر إذا كان امام أو كان وراء الامام (١٩)، بيهقى(١٢٦/٣)، نصب الراية(١٨٧/٢)]

"بے شک عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب مکہ تشریف لاتے تو انھیں دو رکعت پڑھاتے پھر کہتے:" اے مکہ والو! اپنی نماز پوری کر لو، بلاشبہ ہم مسافر قوم ہیں۔"

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر غزوہ کیا اور فتح مکہ کے موقع پر میں آپ کے ساتھ حاضر تھا، آپ مکہ میں ۱۸ راتیں مقیم رہے۔ آپ صرف دو رکعت نماز پڑھتے اور فرماتے:

"اے شہر والو! تم چار رکعات پڑھو، بے شک ہم مسافر قوم ہیں۔" [ابو داؤد، كتاب الصلاة : باب متى يتم المسافر (١٢٢٩)، بيهقى(١٥٧/٣)، دلائل النبوة(١٠٥/٥)، اس کی سند میں علی بن زید بن جدعان راوی کمزور ہے۔]

صفوان سے روایت ہے:"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عبداللہ بن صفوان رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے آئے تو انھوں نے ہمیں دو رکعت نماز پڑھائی پھر سلام پھیر دیا۔ ہم کھڑے ہو گئے اور ہم نے اپنی نماز مکمل کی۔"[مؤطا، كتاب قصر الصلاة فى السفر(٢١)]

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ مسافر نماز پڑھائے تو اگر وہ دو رکعت پر سلام پھیر دے تو مقیم آدمی کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز پوری کر لیں۔

اس میں شرعی طور پر رخصت ہے، اس سے مقیم لوگوں کی نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اگر کسی قسم کا خلل واقع ہوتا تو خلیفۃ المسلمین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ایسا نہ کرتے، جو لوگ اس بات پر لڑتے جھگڑتے ہیں ان کا یہ رویہ نا مناسب ہے۔ جب شریعت میں رخصت موجود ہے تو اسے شرح صدر کے ساتھ قبول کرنا چاہیے اور مسافر کی اقتدا میں مقیم کی نماز بالاتفاق صحیح ہے اور میرے علم میں کسی اہل علم نے اس میں اختلاف نہیں کیا۔

مزید تفصیل کے لیے فقہ حنفی کی کتاب قدوری، باب صلاة المسافر(ص/٥٣)، فقہ حنبلی کی کتاب المغنی(١٤٦/٣)، فقہ شافعی کی کتاب الأم اور فقہ مالکی کے لیے مؤطا ملاحظہ ہو۔

مشرک امام کے پیچھے نماز

سوال کیا مشرکانہ عقیدہ کے حامل امام کے پیچھے نماز ادا کرنا صحیح و جائز ہے؟

(جواب) قرآن مجید اور صحیح احادیث سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حاضر و ناظر، مشکل کشا اور نفع نقصان کا مالک سمجھنا، شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کو غوث اعظم کہنا اور علی ہجویری کو داتا ماننا شرک ہے اور ان امور پر اعتقاد رکھنے والا بلاشبہ مشرک ہے۔ کیونکہ کسی کو نفع و نقصان سے دوچار کرنا یا کسی کی پریشانی دور کرنا، فریاد رسی کرنا اور اولاد دینا یہ تمام صفات اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہیں، جو اس نے کسی اور کو عطا نہیں کیں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب سید الانبیاء محمد ﷺ کو بھی فرمایا:

﴿ قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ ﴾ [الأعراف:١٨٨]

''اے نبی! آپ کہہ دیں کہ میں اپنی جان کے لیے بھی نفع و نقصان کا مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا رَبِّيْ وَ لَا اُشْرِكُ بِهٖ اَحَدًا ۝ قُلْ اِنِّيْ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا ﴾ [الجن: ٢٠، ٢١]

''کہہ دیجیے! میں تو صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ کہہ دیجیے! میں تمھارے لیے نقصان اور ہدایت کا مالک نہیں ہوں۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کے غیر میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ اپنی ذات و صفات میں یکتا اور وحدہ لا شریک لہ ہے اور جو لوگ اللہ خالق کی صفات اس کی مخلوق میں مانتے ہیں وہ اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور مشرک آدمی کے اعمال تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، وہ اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہوتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الانعام:٨٨]

''اور اگر یہ لوگ بھی شرک کرتے تو ان کے اعمال بھی ضائع ہو جاتے۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ﴾ [الزمر:٦٥]

''اور تحقیق وحی کی گئی آپ کی طرف اور ان لوگوں کی طرف جو آپ سے پہلے تھے، اگر تو نے شرک کیا تو تیرے عمل ضائع ہو جائیں گے اور البتہ تو خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔''

ان آیات سے واضح ہو گیا کہ مشرک آدمی کے اعمال اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں۔ خواہ وہ نماز ہو یا روزہ، حج ہو یا زکوٰۃ۔ غرض کسی قسم کا عمل بھی مشرک کا قبول نہیں بلکہ وہ سارے اعمال اکارت اور ضائع ہوں گے۔ تو جب امام مشرک ہو گا اور اس کا اپنا عمل اللہ کے ہاں مقبول نہیں تو اس کی اقتدا میں ادا کی جانے والی نماز کیسے قبول ہو گی؟ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحیح العقیدہ ہو۔ جس شخص کا عقیدہ صحیح نہیں وہ امامت کے لائق کیسے ہو سکتا ہے؟

منفرد کے ساتھ نماز میں شریک ہونا

سوال اگر کوئی اکیلا شخص نماز پڑھ رہا ہو دوسرا اسکے ساتھ شریک ہو سکتا ہے؟

جواب اگر کوئی شخص اکیلا نماز پڑھ رہا ہو اور دوسرے شخص آ کر اس کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائیں تو جماعت کی صورت بن جاتی ہے، صحیح احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ سیدنا عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« بِتُّ عِنْدَ خَالَتِیْ مَیْمُوْنَةَ فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ یُصَلِّیْ مِنَ اللَّیْلِ فَقُمْتُ اُصَلِّیْ مَعَهُ فَقُمْتُ عَنْ یَّسَارِهِ فَاَخَذَ بِرَأْسِیْ فَاَقَامَنِیْ عَنْ یَّمِیْنِهِ » [بخاری، كتاب الأذان : باب إذا لم ينو الإمام أن يؤم ثم جاء قوم فأمهم(٦٩٩)، مسلم، كتاب صلاة المسافرين:(٧٦٣)، نسائی(٨٠٧)]

''میں نے اپنی خالہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رات بسر کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو میں بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا تو آپ نے میرا سر پکڑا اور مجھے اپنے دائیں جانب کھڑا کر دیا۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص نماز ادا کر رہا ہو اور دوسرا شخص آ جائے تو نماز باجماعت ادا ہو سکتی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر جو باب منعقد کیا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے یعنی جب امام نے امامت کی نیت نہ کی ہو پھر کچھ لوگ آ جائیں تو وہ ان کی امامت کروا دے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" فِیْهِ مَشْرُوْعِیَّةُ الْجَمَاعَةِ فِی النَّافِلَةِ وَ الْاِئْتِمَامِ بِمَنْ لَّمْ یَنْوِ الْاِمَامَةَ وَ بَیَانُ مَوْقِفِ الْاِمَامِ وَ الْمَامُوْمِ " [فتح الباری(٢/٤٨٥)]

''اس حدیث سے نفل نماز کی جماعت، جس آدمی نے امامت کی نیت نہ کی ہو اس کی اقتدا اور امام و مقتدی کے کھڑے ہونے کی جگہ کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے۔''

امام ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ امام کے لیے امامت کی نیت کرنا اقتدا کی صحت کے لیے شرط نہیں ہے۔ انس رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ صَلّٰی فِیْ شَهْرِ رَمَضَانَ قَالَ فَجِئْتُ فَقُمْتُ اِلٰی جَنْبِهٖ وَ جَاءَ آخَرُ فَقَامَ اِلٰی جَنْبِیْ حَتّٰی کُنَّا رَهْطًا فَلَمَّا اَحَسَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ بِنَا تَجَوَّزَ فِیْ صَلَاتِهٖ. وَ هُوَ ظَاهِرٌ فِیْ اَنَّهٗ لَمْ یَنْوِ الْاِمَامَةَ اِبْتِدَاءً وَ ائْتَمُّوْا هُمْ بِهٖ وَ اَقَرَّهُمْ وَ هُوَ حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ اَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَ عَلَّقَهُ الْبُخَارِیُّ » [فتح الباری (٢/١٩٢)، مزید دیکھیں: الإقناع لابن المنذر (١/١١٦)، الأوسط له ، كتاب الإمامة: باب ذكر الائتمام بالمصلى الذى لا ينوى الإمامة (٤/٢١٠،٢١١)]

''بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے مہینے میں نماز ادا کی، میں آیا اور آپ ﷺ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا اور دوسرا آدمی آیا وہ میرے پہلو میں کھڑا ہو گیا حتیٰ کہ ہم ایک گروہ ہو گئے، جب نبی ﷺ نے محسوس کیا تو آپ نے اپنی نماز میں اختصار کیا۔'' یہ حدیث اس مسئلے پر ظاہر ہے کہ آپ نے ابتدا میں امامت کی نیت نہیں کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی اقتدا کی اور آپ نے انھیں برقرار رکھا۔ یہ حدیث صحیح ہے، اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری نے معلق ذکر کیا ہے۔''

امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ اس بات کی طرف گئے ہیں کہ نفل اور فرض نماز کے مابین فرق ہے، فرض نماز میں امامت کی نیت شرط ہے، نفل نماز میں نہیں۔ لیکن امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول محل نظر ہے کیونکہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ بلاشبہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

''کون آدمی اس پر صدقہ کرے گا کہ وہ اس کے ہمراہ نماز ادا کرے۔'' [ابو داؤد، كتاب الصلاة ، باب في الجمع في المسجد مرتين(٥٧٤)]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن اور امام ابن خزیمہ، امام ابن حبان اور امام حاکم رحمہم اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔[فتح الباري (١٩٢/٢)]

یہ حدیث فرض نماز کے بارے میں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص فرض نماز اکیلا پڑھ رہا ہو تو دوسرا آدمی اس کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے تو ان کی جماعت بن جائے گی۔ اس لیے نماز خواہ فرض ہو یا نفل دونوں صورتوں کا جواز حدیث سے واضح ہے کہ اکیلے آدمی کی نماز میں دوسرا ساتھ مل جائے تو جماعت کی صورت بن سکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ کا بھی رجحان ادھر ہی معلوم ہوتا ہے اور صحیح احادیث سے اس موقف کو تقویت ملتی ہے۔

نماز میں مقتدی کا امام کو لقمہ دینا

سوال اگر نماز میں امام بھول جائے تو کیا مقتدی لقمہ دے سکتا ہے؟

جواب مسور بن یزید مالکی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں رسول اللہ ﷺ کے ہاں موجود تھا، آپ نماز میں قراءت کر رہے تھے۔ آپ نے کچھ آیات ترک کر دیں، ان کی قراءت نہ کی۔ ایک آدمی نے آپ ﷺ سے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ نے اس طرح آیت ترک کی ہے۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے مجھے یاد دہانی کیوں نہیں کرائی۔''[ابو داؤد، كتاب الصلاة: باب الفتح على الإمام في الصلاة(٩٠٧)، ابن خزيمة(١٦٤٨)، ابن حبان(٣٧٩)]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نماز ادا کی۔ آپ ﷺ نے اس میں قراءت کی۔ آپ پر قراءت خلط ملط کر دی گئی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز ادا کی ہے؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں!'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں کس چیز نے روکا تھا۔'' [بيهقي(٢١٢/٣)، شرح السنة(١٦٦٥)]

یعنی جب نماز میں مجھ پر قراءت خلط ملط کر دی گئی تو تمھیں لقمہ دینے سے کس چیز نے روکا تھا؟ امام خطابی رحمہ اللہ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں: '' وَ فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى جَوَازِ تَلْقِينِ الْإِمَامِ '' ''اس حدیث میں امام کو لقمہ دینے کے جواز پر

دلیل ہے۔'' اور علی رضی اللہ عنہ سے نماز میں امام کو لقمہ دینے سے ممانعت والی روایت جو ابو داؤد (۹۰۸) میں ہے، اس کے بارے میں امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اس کی سند میں ابو اسحاق راوی ہے، جس نے حارث سے چار روایات کے علاوہ سماع نہیں کیا اور یہ روایت ان کی سنی ہوئی روایات میں سے نہیں ہے، یعنی منقطع ہے اور ابو اسحاق مدلس بھی ہے اور یہ ان کی عن والی روایت ہے اور دوسری علت یہ ہے کہ حارث راوی انتہائی ضعیف ہے۔''

دورانِ قنوت مقتدی کیا کہے؟

سوال جب امام قنوت کر رہا ہو تو مقتدی کیا کہے؟

جواب جب امام رکوع کے بعد نماز میں قنوت نازلہ پڑھتا ہے تو مقتدی اس پر آمین کہیں گے، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

« قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ شَهْرًا مُتَتَابِعًا فِي الظُّهْرِ وَ الْعَصْرِ وَ الْمَغْرِبِ وَ الْعِشَاءِ وَ صَلَاةِ الصُّبْحِ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ إِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ مِنَ الرَّكْعَةِ الْاٰخِرَةِ يَدْعُوْ عَلٰى اَحْيَاءٍ مِنْ بَنِيْ سُلَيْمٍ عَلٰى رِعْلٍ وَ ذَكْوَانَ وَ عُصَيَّةَ وَ يُؤَمِّنُ مَنْ خَلْفَهُ »

[ابو داؤد، ابواب الوتر : باب القنوت فی الصلاۃ (١٤٤٣) علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔]

''رسول اللہ ﷺ نے ایک ماہ مسلسل پانچوں نمازوں کی آخری رکعت میں ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ'' کہنے کے بعد بنی سلیم کے قبیلے رعل، ذکوان اور عصیہ کے خلاف دعا کی تھی اور جو آپ ﷺ کے پیچھے تھے وہ آمین کہتے تھے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقتدی صرف آمین کہیں گے۔

مقتدی بھی ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ'' کہیں

سوال رکوع سے اٹھتے وقت امام اور مقتدی کیا پڑھیں؟ وضاحت فرما دیں۔

جواب رکوع سے اٹھتے وقت مقتدی کو بھی ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ'' کہنا چاہیے، حدیث میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو جس وقت قیام کرتے تکبیر کہتے پھر جب رکوع کرتے تکبیر کہتے اور جب رکوع سے اپنی پشت اٹھاتے تو ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ'' کہتے۔'' [بخاری، کتاب الأذان ، باب التکبیر اذا قام من السجود(٧٨٩)]

نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث عام ہے اور آپ کی حالت امامت کو بھی شامل ہے اور حالت اقتدا کو بھی۔ اگرچہ آپ امام ہوتے تھے لیکن عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں بھی آپ نے نماز ادا کی ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے۔

[ابو داؤد، کتاب الطھارۃ: باب المسح علی الخفین(١٤٩)]

اس حدیث کے عموم سے معلوم ہوا کہ امام اور مقتدی دونوں ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ'' کہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا قَالَ الْإِمَامُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ »

''جب امام '' سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ '' کہے تو تم ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ '' کہو۔''

لہٰذا امام صرف ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ '' کہے اور مقتدی صرف ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ '' کہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ لَا حُجَّةَ لَهُمْ فِيْهِ لِأَنَّهُ أَمَرَ بِأَنْ يَّقُوْلَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وَ نَحْنُ نَقُوْلُهُ فَأَمَّا إِذَا قَالَ مَعَهُ غَيْرَهُ فَلَيْسَ بِمَذْكُوْرٍ فِيْ هٰذَا الْخَبَرِ '' [مختصر خلافیات للبیهقی(۱/۳۹۳)]

''ان لوگوں کے لیے اس حدیث میں دلیل نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ نے ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ '' کہنے کا حکم دیا ہے اور ہم یہ کہتے ہیں لیکن جب امام کیساتھ ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ ''کوئی اور کہے یہ اس حدیث میں ذکر نہیں ہوا''

مزید فرماتے ہیں: ''یہ بات اصول میں طے ہے کہ عدم ذکر نفی کی دلیل نہیں ہوتا اور دوسری حدیث کے عموم سے مقتدی کا ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ '' کہنا ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس حدیث کو یوں ہی سمجھا جائے تو اس کا مطلب ہوا کہ امام صرف ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ'' کہے''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ '' نہ کہے حالانکہ بہت ساری صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ امام کو جیسے ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ''کہنا چاہیے '' رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ '' بھی اسی طرح کہنا چاہیے۔[تفصیل کے لیے دیکھیں: مختصر خلافیات للبیهقی (۱/۳۹۱۔۳۹۳)]

احناف کے ہاں امام محمد، قاضی ابو یوسف اور امام طحاوی کا یہ موقف ہے کہ امام ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ'' اور ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' دونوں کہے۔[عقود الجواهر المنيفه فی أدلة مذهب الإمام أبی حنيفة (ص/٦٣)]

جب ان کے ہاں امام تسمیع وتحمید دونوں کو جمع کرے تو اس حدیث کی مخالفت نہیں تو مقتدی بھی تسمیع وتحمید دونوں کو جمع کرے تو حدیث کے بالکل مطابق اور صحیح ہے لہٰذا مقتدی کو بھی ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ ''کہنا چاہیے۔

امام اور مقتدی کی تکبیر اور سمع اللہ لمن حمدہ میں فرق کیوں؟

سوال امام اللہ اکبر بلند آواز سے کہتا ہے جبکہ مقتدی آہستہ، امام سمع اللہ لمن حمدہ بلند آواز سے کہتا ہے جبکہ مقتدی آہستہ کہتے ہیں، آپ اگر قرآن وحدیث کے دعویدار ہیں تو قرآن یا صحیح حدیث سے یہ چیز ثابت کریں؟

جواب نماز ایک اہم ترین عبادت ہے اور اس کا طریقہ رسول مکرم ﷺ کے ذریعے ہمیں بتایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھاتے تھے تو جہری تکبیر کہتے تھے جیسا کہ سعید بن الحارث بن المعلیٰ بیان کرتے ہیں:

« صَلّٰى لَنَا أَبُوْ سَعِيْدٍ فَجَهَرَ بِالتَّكْبِيْرِ حِيْنَ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُوْدِ وَحِيْنَ سَجَدَ وَحِيْنَ رَفَعَ وَ حِيْنَ قَامَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ » (صحيح البخاری ، كتاب الاذان : باب يكبر وهو ينهض من السجدتين (٨٢٥)

''ہمیں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی تو انھوں نے جس وقت سجدے سے سر اٹھایا اور جس وقت (دوسرا) سجدہ کیا اور جس وقت سر اٹھایا اور جس وقت دو رکعتوں سے اٹھے، اونچی تکبیر کہی اور فرمایا میں نے اس طرح نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہے۔''

سعید بن الحارث فرماتے ہیں:

«اِشْتَكَى أَبُوْ هُرَيْرَةَ أَوْ غَابَ فَصَلَّى لَنَا أَبُوْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيُّ فَجَهَرَ بِالتَّكْبِيْرِ حِيْنَ افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَحِيْنَ رَكَعَ وَ حِيْنَ قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ وَحِيْنَ قَامَ بَيْنَ الرَّكْعَتَيْنِ حَتّٰى قَضَى صَلَاتَهٗ عَلٰى ذٰلِكَ فَلَمَّا صَلَّى قِيْلَ لَهٗ قَدِ اخْتَلَفَ النَّاسُ عَلٰى صَلَاتِكَ فَخَرَجَ فَقَامَ عِنْدَ الْمِنْبَرِ فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ! وَاللّٰهِ مَا أُبَالِي اخْتَلَفَتْ صَلَاتُكُمْ أَوْ لَمْ تَخْتَلِفْ هٰكَذَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي» [المستدرك على الصحيحين (٨٤٤) (١/٢٢٣)، السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الصلوة، باب جهر الامام بالتكبير (٢/١٨)، ابويعلى (١٢٢٩)، صحيح ابن خزيمة (٥٨٠)، مسنداحمد (١١١٤٠) (١٧/٢٢٤، ٢٢٥)]

''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیمار یا موجود نہیں تھے تو ہمیں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی، انھوں نے جس وقت نماز شروع کی' رکوع میں گئے اور رکوع سے سیدھے کھڑے ہوئے تو ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کہا اور سجدے سے اپنا سر اٹھایا دوسرا سجدہ کیا اور سر اٹھایا اور دو رکعتوں سے اٹھے تو اونچی آواز سے تکبیر کہی یہاں تک کہ اپنی نماز مکمل کی، انھیں کہا گیا: ''یقیناً لوگوں نے آپ کی نماز کے بارے اختلاف کیا ہے۔'' ابوسعید رضی اللہ عنہ آئے، منبر پر چڑھے اور کہا: ''اے لوگو! بلاشبہ اللہ کی قسم! تمھاری نماز مختلف ہو یا نہ ہو مجھے کوئی پروا نہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں میں تکبیر جہری اور سری کہنے میں اختلاف رونما ہوا تھا اور مروان وغیرہ بنوامیہ کے لوگ تکبیر آہستہ کہتے تھے جس کی وجہ سے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی نماز پر اختلاف کیا گیا تو انھوں نے اونچی تکبیریں کہہ کر نماز پڑھائی اور لوگوں کی کوئی پروا نہ کی اور بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز اسی طرح تھی۔ یہ حدیث اس مسئلہ پر بالکل واضح ہے کہ امام تکبیریں جہراً کہے گا اور امام بیہقی نے بھی اس حدیث پر باب امام کی جہری تکبیر ہی کا قائم کیا ہے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

''جب نبی ﷺ بیمار ہوئے جس بیماری میں آپ نے وفات پائی تو آپ کے پاس ایک آدمی نے آ کر نماز کی اطلاع دی، آپ نے فرمایا: ''ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔'' میں نے کہا: ''یقیناً ابوبکر کچے دل کے آدمی ہیں، اگر وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوگئے تو رو پڑیں گے اور قراءت پر قدرت نہ رکھ سکیں گے۔'' آپ نے فرمایا: ''ابوبکر کو حکم دو کہ وہ نماز پڑھائیں۔'' میں نے پھر وہی بات کہی تو آپ نے تیسری یا چوتھی دفعہ فرمایا: ''تم تو صواحب یوسف ہو، ابوبکر کو حکم دو کہ وہ نماز پڑھائیں۔'' انھوں نے نماز پڑھائی پھر نبی ﷺ دو آدمیوں کا سہارا لے کر نکلے گویا

کہ میں آپ کی طرف دیکھ رہی ہوں، آپ کے پاؤں زمین پر لکیریں کھینچ رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کو دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگے تو آپ ﷺ نے اشارہ کیا کہ نماز پڑھاؤ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹے اور نبی ﷺ ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

«وَ اَبُوْبَكْرٍ يُسْمِعُ النَّاسَ التَّكْبِيْرَ»

"اور ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو تکبیر سنا رہے تھے۔" (صحيح البخاری ، كتاب الاذان : باب من أسمع الناس تكبير الامام (٧١٢) ، صحيح مسلم كتاب الصلوة (٤١٨)]

جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«اِشْتَكٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلَّيْنَا وَرَاءَهُ وَهُوَ قَاعِدٌ وَ اَبُوْ بَكْرٍ يُسْمِعُ النَّاسَ تَكْبِيْرَهُ »(صحيح مسلم، كتاب الصلوٰة : باب ائتمام المأموم بالأمام (٤١٣/٨٤)، المسند المستخرج (٩٢٠)، ابوداؤد (٦٠٦)، نسائی كبرى (٥٣٥)، ابن ماجه (١٢٤٠)، ابن حبان (٢١٢٢)، مسند احمد (٣٣٤/٣)، الادب المفرد (٩٤٨)، ابن خزيمة (٤٨٦)، سنن النسائی (١١٩٩)، ابويعلى (١٨٩٦)، ابوعوانة (١٠٨/٢)، طحاوی (٢٣٤/١)، المسند الجامع (٤٧٣/٣ ، ٤٧٤)

"رسول اللہ ﷺ بیمار تھے اور ہم نے آپ کے پیچھے (اس طرح) نماز ادا کی کہ آپ بیٹھے ہوئے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو آپ کی تکبیر سنا رہے تھے۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی بیان کرتے ہیں:

«صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ وَاَبُوْ بَكْرٍ خَلْفَهُ فَإِذَا كَبَّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَبَّرَ اَبُوْبَكْرٍ يُسْمِعُنَا » (نسائی ، كتاب الامامة : باب الائتمام لمن يأتم بالإمام (٧٩٩)، مسلم (٤١٣)]

"ہمیں نبی ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے تھے، جب رسول اللہ ﷺ تکبیر کہتے ابوبکر ہمیں تکبیر سناتے تھے۔"

ان احادیث صحیحہ سے بھی معلوم ہوا کہ امام تکبیر جہراً کہے گا اور مقتدی آہستہ اگر مقتدی ہی تکبیر جہری کہتے ہوتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو انھیں رسول اللہ ﷺ کی تکبیر سنانے کی ضرورت نہ تھی۔

معاویہ بن حکم السلمی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

« وَبَيْنَا اَنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الصَّلٰوةِ إِذْ عَطَسَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ فَقُلْتُ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ فَحَدَّقَنِيَ الْقَوْمُ بِاَبْصَارِهِمْ فَقُلْتُ وَاثُكْلَ اُمِّيَاهُ، مَا لَكُمْ تَنْظُرُوْنَ إِلَيَّ؟ قَالَ فَضَرَبَ الْقَوْمُ بِاَيْدِيْهِمْ عَلٰى اَفْخَاذِهِمْ فَلَمَّا رَاَيْتُهُمْ يُسَكِّتُوْنِيْ لٰكِنِّيْ سَكَتُّ فَلَمَّا انْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَانِيْ بِاَبِيْ وَاُمِّيْ هُوَ مَا ضَرَبَنِيْ وَ لَا كَهَرَنِيْ وَ لَا سَبَّنِيْ مَا رَاَيْتُ مُعَلِّمًا قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ اَحْسَنَ تَعْلِيْمًا مِنْهُ قَالَ إِنَّ صَلَاتَنَا هٰذِهِ لَا يَصْلُحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِنْ

كَلَامِ النَّاسِ إِنَّمَا هُوَ التَّسْبِيحُ وَ التَّكْبِيرُ وَ تَلَاوَةُ الْقُرْآنِ » (سنن النسائی ، کتاب الصلوۃ : باب الکلام فی الصلوۃ (۱۲۱۹)، صحیح مسلم ، کتاب المساجد : باب تحریم الکلام فی الصلوۃ (۵۳۷)، ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب تشمیت العاطس فی الصلوۃ (۹۳۰)، مسند احمد (۲۳۷۶۲) (۱۷۵/۳۹)، دارمی (۱۵۰۳)، الاحاد والمثانی (۱۳۹۹)، ابن الجارود (۲۱۲)، ابن خزیمۃ (۸۵۹)، ابوعوانۃ (۱۷۲۸)، ابن حبان (۲۲۴۷)، بیہقی (۲۴۹/۲) (۲۵۰)، الاسماء والصفات للبیہقی (۴۲۱)، التمہید (۷۹/۲۲ـ۸۰)، خلق افعال العباد (۱۹۳)، نسائی کبری (۵۵۶)، طبرانی کبیر (۹۴۵/۱۹، ۹۴۸)]

''میں اللہ کے رسول ﷺ کے ہمراہ نماز میں تھا کہ قوم میں سے ایک آدمی نے چھینک ماری، میں نے کہا: ''اللہ تجھ پر رحم کرے۔'' تو قوم مجھے گھورنے لگی، میں نے کہا: ''مجھے میری ماں گم پائے، تمھیں کیا ہے کہ میری طرف دیکھتے ہو؟'' قوم نے اپنے ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارنا شروع کیا، جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاموش کرا رہے ہیں تو میں نے ان سے جھگڑنے کا ارادہ کیا لیکن خاموش ہوگیا، جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے مجھے بلایا، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ نے مجھے مارا، نہ ڈانٹا اور نہ برا بھلا کہا، میں نے آپ سے پہلے اور آپ کے بعد تعلیم دینے والا اتنا اچھا کوئی معلم نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا: ''یقیناً ہماری اس نماز میں لوگوں کا آپس میں گفتگو کرنا درست نہیں، یہ تو تسبیح وتکبیر اور تلاوت قرآن ہے۔

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ مقتدی کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ نماز میں سکوت اختیار کرے، اپنی آواز بلند نہ کرے۔ صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کے پیچھے آواز بلند نہیں کرتے تھے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب غلطی سے چھینک مارنے والے کو اونچی آواز میں ''یَرْحَمُکَ اللّٰہُ'' کہہ دیا تو صحابہ انھیں گھورنے لگے۔ اس حدیث میں ''یسکتوننی'' ہے اور بعض طرق میں ''یصمتوننی'' کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ مقتدی خاموش رہے گا۔ ہاں جہر مقتدی کے لیے جائز ہوگا مگر اس جگہ جس کی دلیل مل جائے۔

اسی طرح صحیح بخاری وغیرہ میں امام کی اقتدا کے متعلق احادیث میں ہے: « فَإِذَا كَبَّرَ الْإِمَامُ فَكَبِّرُوْا » ''جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو'' سے پتا چلتا ہے کہ امام تکبیر جہری کہے گا کیونکہ مقتدی کو امام کی تکبیر کا تبھی علم ہوگا جب امام تکبیر اونچی کہے گا اور یہ بھی یاد رہے کہ نماز اللہ کے ذکر کے لیے پڑھی جاتی ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿ أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ (طٰہ:۱۴)

''نماز میرے ذکر کے لیے قائم کرو۔''

اور ذکر کے متعلق اللہ کا حکم ہے

''اپنے رب کو اپنے نفس میں عاجزی، خوف سے اور پست آواز سے صبح شام یاد کرتے رہو۔''

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کا اصول تو یہی ہے کہ اسے آہستہ کیا جائے سوائے اس کے کہ جہر کی دلیل آجائے۔

[الاعراف: ۲۰۵]

امام کے جہر کی دلیلیں تو اوپر ذکر کردی گئی ہیں، جو مقتدی کی تکبیرات کے جہر کا مدعی ہو وہ اس کی دلیل پیش کرے، یہ بات علمائے احناف کو بھی مسلم ہے جیسا کہ ان کی کتاب مجموعہ رسائل جلد اول تحقیق مسئلہ آمین میں لکھا ہے: ''قرآن پاک کے انہی ارشادات اور روایات سے نماز کے باقی اذکار کا آہستہ پڑھنا ثابت ہوگیا'' پھر آگے فائدہ دوم کے تحت لکھا ہے: ''دراصل

قاعدہ یہی ہے کہ دعا اور ذکر آہستہ پڑھے جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے بھید سے بھی واقف ہے، ہاں بعض اذکار میں اللہ کی یاد کے ساتھ انسانوں کو اطلاع دینا بھی مقصود ہوتا ہے اور انسان دل کی آواز کو سن نہیں سکتا اس لیے انسانوں کو سنانے کے لیے وہاں آواز بلند کی جاتی ہے جیسے اذان میں انسانوں کو بلانا، اقامت میں مقتدیوں کو بتانا مقصود ہوتا ہے۔ امام تکبیرات انتقال اور سلام اونچی آواز سے کہتے ہیں کیونکہ مقتدیوں کو اطلاع دینا مقصود ہے لیکن مقتدی اور اکیلے نمازی کو یہ ضرورت نہیں، اس لیے وہ آہستہ کہتا ہے۔''

لہٰذا احناف کے اور ہمارے اس متفقہ اصول قرآنی کے مطابق مقتدی تو تکبیر آہستہ ہی کہے گا بہر کیف قرآن وسنت کے بے شمار دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ مقتدی آہستہ اور خاموشی سے ذکر و اذکار اور تلاوت کرے گا جبکہ امام تکبیرات وقراءت جہری کرے گا۔ یاد رہے ایسے حیلے بہانے اور چال بازیاں بعض افراد کی جانب سے کتاب وسنت سے لوگوں کو دور کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں تاکہ انھیں بتایا جائے کہ دین اسلام پورا قرآن وحدیث میں نہیں بلکہ سارے کا سارا دین ان کی مزعومہ فقہ میں ہے اور اس کے لیے آج کل کئی واعظ وخطیب اور کم علم متعصب لوگ بڑی محنت کر رہے ہیں اور دن رات یہ باور کرانے کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں کہ قرآن وحدیث ہماری مکمل راہنمائی نہیں کرتے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُمْ !

اور اللہ تعالیٰ راہ صواب پر استقامت نصیب فرمائے، کتاب وسنت کے دامن سے وابستہ رکھے اور زیغ وضلال سے محفوظ فرمائے۔(آمین!)

❀❀❀

WWW. KITABOSUNNAT. COM
KITABOSUNNAT@GMAIL.COM

نفل نماز کا بیان

نوافل بیٹھ کر پڑھنے چاہییں یا کھڑے ہو کر؟

(سوال) نوافل بیٹھ کر پڑھنے چاہییں یا کھڑے ہو کر؟ بعض لوگ کہتے ہیں عشاء کے بعد بیٹھ کر پڑھنے چاہییں، قرآن وحدیث کی رو سے وضاحت کریں۔

(جواب) نوافل کھڑے ہو کر ادا کرنے چاہییں تا کہ پورا ثواب ملے، اگر کوئی آدمی بغیر عذر کے بیٹھ کر نماز پڑھے گا تو اسے نصف اجر ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ اس سے مستثنیٰ ہیں، انھیں بیٹھ کر نماز پڑھنے پر بھی پورا اجر ملتا تھا۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

''مجھے حدیث بیان کی گئی کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے تو میں آپ ﷺ کے پاس آیا، میں نے آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے پایا تو میں نے اپنا ہاتھ سر پر رکھا، تو آپ نے کہا: ''اے عبداللہ بن عمرو! تجھے کیا ہوا؟'' میں نے کہا: ''مجھے حدیث بیان کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے اور آپ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تم میں سے کسی ایک کی مانند نہیں ہوں۔'' [صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین: باب جواز النافلة قائماً او قاعداً: (۷۳۵)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ہمیں کھڑے ہو کر ہی نوافل ادا کرنے چاہییں، اگر بلا عذر بیٹھ کر پڑھیں گے تو آدھی نماز کا ثواب ملے گا۔ صرف رسول اللہ ﷺ ایسی ہستی تھیں جنھیں بیٹھ کر نماز پڑھنے پر بھی پورا اجر ملتا تھا، لہٰذا ہمیں پورا ثواب لینے کے لیے کھڑے ہو کر نفل ادا کرنے چاہییں، البتہ فرض نماز بلا عذر بیٹھ کر ادا کرنا صحیح نہیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔
[مرعاۃ شرح مشکاۃ : باب القصد فی العمل جلد چهارم]

فرض نماز کی جگہ سنتوں کی ادائیگی

(سوال) جہاں فرض نماز پڑھی ہو وہاں سنتیں پڑھنا کیسا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں؟

(جواب) جس وقت فرض نماز ادا کر لی جائے تو نوافل ادا کرنے کے لیے جگہ بدل لینا چاہیے یا کچھ کلام کر لینا چاہیے تا کہ فرض اور نفل میں فصل ہو جائے، بغیر فصل کیے اسی جگہ سنن ونوافل ادا نہیں کرنے چاہییں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا:

« اَنْ لَا نُوْصِلَ صَلٰوةً بِصَلَاةٍ حَتّٰى نَتَكَلَّمَ اَوْ نَخْرُجَ » [صحیح مسلم، کتاب الجمعة: باب الصلوٰة بعد الجمعة (۸۸۳)]

''ہم نماز کے ساتھ نماز نہ ملائیں حتیٰ کہ ہم بات کرلیں یا وہ جگہ چھوڑ دیں۔''
معلوم ہوا کہ فرض نماز ادا کرنے کے بعد اس جگہ بھی سنتیں پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ فرض نماز کے بعد کچھ کلام کر لیا ہو، اس طرح جگہ بدل کر بھی سنتیں ادا کر سکتے ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے جگہ بدلنے کو افضل قرار دیا تا کہ سجدہ کرنے کی جگہیں زیادہ سے زیادہ ہو جائیں۔

اقامت کے بعد سنتیں پڑھنے کا حکم

(سوال) ایک شخص فجر کی سنتیں پڑھ رہا ہے کہ اقامت کہہ دی جاتی ہے وہ سنتیں پوری کرے یا سلام پھیر کر جماعت میں شامل ہو جائے؟

(جواب) جب فرض نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو فرض کے علاوہ کوئی نماز نہیں ہوتی۔ اگر سنتیں پڑھ رہا ہے تو اسے توڑ ڈالے اور فرض جماعت میں شامل ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« اِذَا اُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ اِلَّا الْمَكْتُوبَةَ » [مسلم، كتاب صلاة المسافرين: باب كراهة الشروع فى نافلة بعد شروع المؤذن (٧١٠)، ترمذى(٤٢١)، ابو داؤد(١٢٦٦)، نسائى(٨٦٦،٨٦٧)، ابن ماجه(١١٥١)،احمد(٢/٢٣١)، بيهقى(٢/٤٨٢)، ابن خزيمة(١١٢٣)]
''جب نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں۔''
عبداللہ بن مالک بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:
« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ رَاَى رَجُلًا وَقَدْ اُقِيمَتِ الصَّلَاةُ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ فَلَمَّا انْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَاثَ بِهِ النَّاسُ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : آلصُّبْحَ اَرْبَعًا ؟ آلصُّبْحَ اَرْبَعًا ؟ » [بخارى، كتاب الأذان: باب إذا أقيمت الصلاة فلا صلاة إلا المكتوبة (٦٦٣)، مسلم(٧١١)]
''بے شک رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا، حالانکہ نماز کے لیے اقامت کہی جا چکی تھی کہ وہ دو رکعت پڑھ رہا تھا، جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو اسے لوگوں نے گھیر لیا۔ تو اسے رسول اللہ ﷺ نے کہا: ''کیا صبح کی چار رکعات پڑھتا ہے؟ کیا صبح کی چار رکعات پڑھتا ہے؟''
عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:
« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ دَخَلَ الْمَسْجِدَ لِصَلَاةِ الْغَدَاةِ وَ اِذَا رَجُلٌ يُّصَلِّيْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ أَ تُصَلِّيْ الصُّبْحَ اَرْبَعًا » [كشف الأستار (٥١٨)، (١/٢٥١)، ابن حبان(٢٤٦٩)، احمد(١/٢٣٨)، ابن خزيمة(١١٢٤)، طبرانى كبير(١١٢٢٧)، مستدرك حاكم (١/٣٠٧)، بيهقى(٢/٤٨٢)، اس روایت کو امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے صحیح کہا ہے۔]

'' بے شک نبی ﷺ صبح کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوئے تو ایک آدمی فجر کی دو رکعت پڑھ رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' کیا تو صبح کی چار رکعت پڑھتا ہے۔''

بعض لوگ صبح کی نماز کے وقت بالخصوص سنتیں پڑھتے رہتے ہیں، یہ بات درست ہے کہ صبح کی سنتوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے لیکن انھیں فرض سے پہلے ادا کرنے کا بتایا گیا ہے، لہٰذا نماز کے لیے وقت پر بیدار ہو کر فرض سے قبل پڑھ لینی چاہیے۔ اگر فرض جماعت کھڑی ہو تو پھر کوئی بھی نماز فرض کے علاوہ نہیں ہوتی ۔ خواہ فجر کی سنتیں ہوں یا کسی اور نماز کی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسجد کے ایک کونے میں سنت پڑھ لے پھر فرض جماعت میں شریک ہو جائے، ایسے لوگ اس حدیث پر غور کریں۔ عبد اللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« دَخَلَ رَجُلٌ الْمَسْجِدَ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِيْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ فِيْ جَانِبِ الْمَسْجِدِ ثُمَّ دَخَلَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَلَمَّا سَلَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ يَا فُلَانُ ! بِاَيِّ الصَّلَاتَيْنِ اعْتَدَدْتَّ ؟ اَبِصَلَاتِكَ وَحْدَكَ اَمْ بِصَلَاتِكَ مَعَنَا ؟ » [مسلم ، كتاب صلاة المسافرين: باب كراهة الشروع فى نافلة بعد شروع المؤذن فى إقامة الصلاة(٧١٢)، ابو داود(١٢٦٥)، ابن ماجه(١١٥٢)، احمد (٨٢/٥)، نسائى مع السنن الكبرىٰ(٨٥١)، ابن خزيمة(١١٢٥)، ابوعوانة(٣٠/٢)، ابن حبان(٢١٩١)، بيهقى(٤٨٢/٢)]

'' ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز میں تھے، اس نے مسجد کے ایک کونے میں دو رکعت نماز پڑھی پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز میں شامل ہو گیا، جب رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیرا تو فرمایا: '' اے فلاں! تم نے دو نمازوں میں سے کون سی شمار کی ہے؟ کیا وہ نماز جو تو نے اکیلے ادا کی یا وہ نماز جو ہمارے ساتھ ادا کی ہے؟''

اس صحیح حدیث سے واضح ہو گیا کہ فرض جماعت کے ہوتے ہوئے مسجد کے کونے میں بھی نفل نماز یعنی سنت وغیرہ نہیں پڑھ سکتے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا:

« أُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَقُمْتُ أُصَلِّي الرَّكْعَتَيْنِ فَجَذَبَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ أَتُصَلِّي الصُّبْحَ اَرْبَعًا؟ » [مستدرك حاكم(١١٩٥)،ابو داود طيالسى(٢٧٣٦)، ابن حبان(٢٢١/٦)]

'' نماز کے لیے اقامت کہی گئی، میں دو رکعتیں پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے کھینچ لیا اور کہا: '' کیا تم صبح کی چار رکعت پڑھتے ہو۔''

علامہ غلام رسول سعیدی صحیح مسلم کی شرح میں رقمطراز ہیں: '' امام شافعی رحمہ اللہ اقامت کے وقت مطلق سنتیں پڑھنے سے منع کرتے تھے۔ بظاہر اس حدیث سے امام شافعی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ فجر کی سنتوں کی تاکید بھی رسول اللہ ﷺ نے کی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ ہی نے اقامت فجر کے وقت سنتیں پڑھنے پر ناراضی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس لیے اتباع حدیث کا تقاضا ہے کہ اقامت فجر کے وقت سنتیں پڑھنا شروع نہ کرے، کیونکہ جن کے حکم سے سنتیں پڑھی جاتی ہیں وہ خود منع فرما رہے ہیں۔''

علامہ وشتانی لکھتے ہیں: ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس شخص کو مارتے تھے جو اقامت فجر کے وقت سنتیں پڑھتا تھا۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ یہ انتہائی غلط طریقہ مروج ہے کہ مسجد میں فجر کی جماعت کھڑی ہوتی ہے اور لوگ جماعت کی صفوں سے متصل کھڑے ہو کر سنتیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ امام با آواز قرآن پڑھ رہا ہے جس کا سننا فرض ہے اور سنتوں میں مشغول شخص اس فرض کو ترک کر رہا ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ سنتوں میں مشغول شخص بظاہر فرض اور جماعت سے اعراض کر رہا ہے اور تیسری خرابی یہ ہے کہ اس کا یہ عمل اس باب کی احادیث کی مخالفت کو مستلزم ہے۔“ [شرح صحيح مسلم(٢/ ٤٢٠-٤٢١)، مطبوعه فريد بك سٹال، اردو بازار لاهور]

علامہ غلام رسول سعیدی بریلوی کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ فرض نماز کے ہوتے ہوئے جو لوگ سنتوں میں مشغول رہتے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی مخالفت کرتے ہیں اور عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک پٹائی کے لائق ہیں اور سنت ادا کر کے فرض سے اعراض کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہر نمازی کو چاہیے کہ نماز کے لیے بڑی مستعدی کے ساتھ حاضر ہو اور سنتیں اس کے وقت پر ادا کرے، جب فرض جماعت کے لیے اقامت ہو تو نماز توڑ کر جماعت میں شامل ہو جائے جیسے رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نماز توڑ دی تھی اور انھیں کھینچ کر جماعت میں شامل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ صحیح عمل کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

فجر کی سنتوں کی قضا کا طریقہ

سوال اگر فجر کی سنتیں جماعت سے پہلے ادا نہ کی جا سکیں تو کیا بعد میں پڑھ لی جائیں؟ ازراہِ کرم جواب عنایت فرما دیں۔

جواب اگر کسی آدمی کی فجر کی سنتیں کسی سبب کے باعث فوت ہو جائیں یعنی وہ انھیں وقت پر ادا نہ کر سکے تو نماز فجر ادا کرنے کے بعد پڑھ سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تقریری سنت سے یہ بات واضح ہے۔ آپ ﷺ کی احادیث تین اقسام کی ہیں:

① ......قول ② ......فعل ③ ......تقریر

تقریر کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے کوئی عمل سرانجام دیا گیا ہو اور آپ ﷺ نے اس سے منع نہ کیا ہو۔ آپ ﷺ کا منع نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے اسے برقرار رکھا ہے۔ وگرنہ غلط کام کو نبی ﷺ برقرار نہیں رکھ سکتے۔ صحابی رسول قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّهُ صَلّٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الصُّبْحَ وَ لَمْ يَكُنْ رَكَعَ الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَمَّا سَلَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَامَ فَرَكَعَ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَنْظُرُ اِلَيْهِ فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيْهِ » [موارد الظمآن(٦٢٤)، ابن خزيمة(١١١٦)، مستدرك حاكم (١/ ٢٧٤)، دارقطني(١/ ٣٧٢)، بيهقي :(٢/ ٤٨٣)، المحلى لابن حزم (٣/ ١١٢) ، نيل المقصود (١٢٦٨)]

”انھوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی اور نماز فجر سے پہلے دو رکعت سنتیں ادا نہیں کی تھیں۔ جب رسول

اللہ ﷺ نے سلام پھیرا تو انھوں نے کھڑے ہو کر فجر کی دو سنتیں ادا کیں۔ نبی ﷺ ان کی طرف دیکھ رہے تھے، آپ ﷺ نے اس بات کا انکار نہیں کیا۔‘‘

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کی فجر کی سنتیں فوت ہو جائیں تو وہ نماز فجر کے بعد انھیں ادا کر سکتا ہے۔ علامہ ابو الحسن سندھی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’ يَدُلُّ عَلَى الْإِذْنِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ لِمَنْ فَاتَهُمَا ذٰلِكَ ‘‘ [حاشیه سندهی علی ابن ماجه (۱/۳۵۲)]

’’جس آدمی کی فجر سے پہلے دو رکعت فوت ہو جائیں یہ حدیث اسے فجر کی نماز کے بعد ادا کرنے کی اجازت پر دلالت کرتی ہے۔‘‘

علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

’’ وَ قَالَ ابْنُ الْمَلِكِ : سُكُوتُهُ يَدُلُّ عَلٰى قَضَاءِ سُنَّةِ الصُّبْحِ بَعْدَ فَرْضِهِ لِمَنْ لَّمْ يُصَلِّهَا قَبْلَهُ وَ بِهِ قَالَ الشَّافِعِيُّ ‘‘ [مرعاة المفاتيح (۳/٤٦٥)]

’’ابن الملک نے کہا: ’’نبی ﷺ کا اس بات پر خاموش رہنا دلالت کرتا ہے کہ صبح کی سنتیں فرض ادا کر لینے کے بعد اس آدمی کے لیے بطور قضا ادا کرنا جائز ہے جس نے یہ سنتیں فرض سے پہلے ادا نہیں کیں اور یہی قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔‘‘

شیخ حسین بن محمود الزیدانی نے مشکوٰۃ کے حاشیہ ’’المفاتیح‘‘ میں، شیخ علی بن صلاح الدین نے ’’منهل الينابيع شرح المصابيح‘‘ میں اور علامہ زینی نے ’’شرح المصابيح‘‘ میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔ [ملاحظہ ہو: مرعاة المفاتيح (۳/٤٦٥)]

ہمارے حنفی بھائیوں کا کہنا ہے کہ فرض ادا کرنے کے بعد طلوع شمس تک سنتیں ادا نہیں کر سکتا، وہ اس کی دلیل میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ لَّمْ يُصَلِّ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فَلْيُصَلِّهِمَا بَعْدَ مَا تَطْلُعُ الشَّمْسُ » [ترمذی، کتاب الصلاة: باب ماجاء فی إعادتهما بعد طلوع الشمس (٤٢٣)]

’’جس نے فجر کی دو رکعت نہیں پڑھیں وہ انھیں طلوع شمس کے بعد پڑھے۔‘‘

اولاً: یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں قتادہ بن دعامہ السدوسی مدلس راوی ہے اور یہ روایت معنعن ہے، چنانچہ ضعیف ہے۔

ثانیاً: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جن کے حنفی حضرات مقلد ہیں، کے نزدیک اگر فجر کی سنتیں رہ جائیں تو نہ فرضوں کے بعد ادا کرے اور نہ طلوع شمس ہی کے بعد۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے:

’’ وَ اِذَا فَاتَتْهُ رَكْعَتَا الْفَجْرِ لَا يَقْضِيهَا قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ لِاَنَّهُ يَبْقٰى نَفْلًا مُطْلَقًا وَ هُوَ مَكْرُوهٌ بَعْدَ الصُّبْحِ وَ لَا بَعْدَ ارْتِفَاعِهَا عِنْدَ اَبِي حَنِيفَةَ وَ اَبِي يُوسُفَ ‘‘ [الهداية (۱/۷۲)، طبع بیروت، باب إدراك الفريضة]

"اور جب آدمی سے فجر کی دو رکعتیں فوت ہو جائیں تو انھیں سورج نکلنے سے پہلے قضا نہ کرے۔ اس لیے کہ اب وہ مطلق نفل ہیں اور صبح کی نماز کے بعد نفل ادا کرنا مطلق طور پر مکروہ ہیں اور نہ انھیں سورج نکلنے کے بعد ہی ادا کرے، یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کا موقف ہے۔"

صاحب ہدایہ کی توضیح سے معلوم ہوا کہ فقہ حنفی میں شیخین کے نزدیک جس کی صبح کی سنتیں رہ جائیں نہ وہ صبح کی نماز کے بعد ادا کرے اور نہ طلوع شمس ہی کے بعد۔ یعنی ان کا موقف صحیح حدیث کے بھی خلاف ہے اور ضعیف حدیث کے بھی۔ کیونکہ صحیح حدیث کی رو سے فجر کی فوت شدہ سنتیں نماز فجر ادا کرنے کے بعد قضا کی جا سکتی ہیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور جن احادیث میں مطلق طور پر نماز فجر کے بعد نماز کی ممانعت ہے ان میں سے یہ دو رکعت صحیح حدیث کی رو سے مقید ہیں۔ لہٰذا ان کے ادا کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔

فجر کی سنتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا

(سوال) فجر کی سنتوں کے بعد بعض بھائی لیٹ جاتے ہیں، کیا ایسا کرنا سنت ہے اور اس کی دلیل کیا ہے؟

(جواب) فجر کی سنتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ صحیح بخاری میں امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا ہے: " بَابُ الضَّجْعَةِ عَلَى الشِّقِّ الْاَيْمَنِ بَعْدَ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ "(یعنی فجر کی دو رکعتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنے کا بیان۔) اور اس کے تحت یہ حدیث درج کی ہے:

« عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ اضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْمَنِ » [بخاری، كتاب التهجد، باب الضجعة على الشق الايمن بعد ركعتي الفجر(۱۱۶۰)]

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب فجر کی دو رکعتیں پڑھتے تو دائیں کروٹ لیٹ جاتے۔"

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فَلْيَضْطَجِعْ عَلٰى يَمِينِهِ »[ترمذی، كتاب الصلوٰة: باب ما جآء فى الاضطجاع بعد ركعتي الفجر(۴۲۰)]

"جب تم میں سے کوئی فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) پڑھ لے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جائے۔"

رسول اللہ ﷺ کی ان قولی اور فعلی احادیث سے معلوم ہوا کہ فجر کی دو رکعت پڑھ لینے کے بعد دائیں پہلو پر لیٹنا آپ ﷺ کا پسندیدہ فعل بھی تھا اور آپ ﷺ اس کا حکم بھی دیا کرتے تھے۔

لہٰذا ہر نمازی کے لیے دو رکعت کے بعد دائیں پہلو پر لیٹنا سنت ہے، اس پر عمل کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ کی متروکہ سنتوں میں سے یہ سنت بھی ہے جس پر بہت کم عمل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ظہر سے پہلے چار کی بجائے دو سنتیں پڑھنا

(سوال) ہمارے ہاں بعض افراد ظہر سے پہلے چار کی بجائے دو سنتیں پڑھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ بھی جائز ہے کیا یہ درست ہے؟

(جواب) ظہر کی فرض نماز سے پہلے رسول اکرم ﷺ چار رکعات پڑھتے اور کبھی دو رکعت پڑھ لیتے۔ دونوں طرح رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

« عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ حَفِظْتُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَشْرَ رَكْعَاتٍ • رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ وَ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا ......» [بخاری، کتاب التهجد : باب الركعتين قبل الظهر (۱۱۸۰)]

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے دس رکعتیں یاد کیں ہیں، دو رکعتیں ظہر سے پہلے اور دو رکعتیں ظہر کے بعد اور دو رکعتیں مغرب کے بعد گھر میں اور دو رکعتیں عشاء کے بعد گھر میں اور دو رکعتیں صبح کی نماز سے پہلے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ لَا يَدَعُ اَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ وَ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الْغَدَاةِ »

[بخاری، کتاب التهجد: باب الركعتين قبل الظهر(۱۱۸۲)]

''نبی ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور فجر سے پہلے دو رکعتیں نہیں چھوڑتے تھے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ الْاَوْلٰى اَنْ يُّحْمَلَ عَلٰى حَالَيْنِ فَكَانَ تَارَةً يُّصَلِّي اثْنَتَيْنِ وَ تَارَةً يُّصَلِّيْ اَرْبَعًا وَ قِيْلَ هُوَ مَحْمُوْلٌ عَلٰى اَنَّهٗ كَانَ فِي الْمَسْجِدِ يَقْتَصِرُ عَلٰى رَكْعَتَيْنِ وَ فِيْ بَيْتِهٖ يُصَلِّيْ اَرْبَعًا "[نيل الأوطار (۱۸/۳)، فقه السنة(۱۸۷/۱)]

''بہتر یہ ہے کہ ان احادیث کو دونوں حالتوں پر محمول کیا جائے۔ آپ ظہر سے پہلے کبھی دو رکعتیں پڑھتے تھے اور کبھی چار رکعات۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی ﷺ گھر میں چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور مسجد میں دو رکعتیں۔''

سیدنا ابن عمر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم نے جیسے دیکھا ویسے ہی بیان کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کے گھر میں چار رکعتیں پڑھنے کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:

« عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ يُصَلِّيْ فِيْ بَيْتِيْ قَبْلَ الظُّهْرِ اَرْبَعًا » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين: باب جواز النافلة قائماً و قاعداً (۷۳۰)، ابو داؤد(۱۲۵۱)]

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں ظہر سے پہلے چار رکعتیں ادا کرتے تھے۔''

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ظہر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے اور اگر چار پڑھے تب بھی درست ہے۔

خطبہ جمعہ کا اہتمام

(سوال) کیا کسی مسجد میں خطبہ جمعہ شروع کرنے کی شرائط ہیں؟ کیا کسی حدیث میں تصریح ہے کہ کتنی بڑی بستی ہو اور کتنی تعداد میں لوگ موجود ہوں تو خطبہ جمعہ کا اہتمام کیا جائے؟

(جواب) جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر فرض عین ہے سوائے چار اشخاص کے یعنی غلام، عورت، بچہ اور مریض۔ [ابوداؤد، کتاب الصلوة: باب الجمعة للمملوك والمرأة (١٠٦٧)]

اس کی فرضیت نص قطعی سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! جب جمعہ والے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ آؤ اور لین دین چھوڑ دو۔'' (الجمعة: ٩)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جہاں بھی اہل ایمان ہوں گے وہاں جمعہ پڑھا جائے گا، کیا دیہات والوں میں اہل ایمان نہیں ہوتے؟ تو کہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے شہر یا بستی شرط نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی اہل ایمان ہوں گے وہ نماز جمعہ پڑھیں گے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس آیت میں ﴿ وَذَرُوا الْبَيْعَ ﴾ سے مراد کاروباری منڈیاں ہیں اور یہ صرف شہروں میں ہوتی ہیں دیہاتوں میں نہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی گاؤں ایسا نہیں جہاں خرید وفروخت اور کاروبار نہ ہوتا ہو، لوگ آپس میں لین دین نہ کرتے ہوں۔ یہاں بیع سے مراد دنیا کے مشاغل ہیں اور وہ جیسے بھی ہوں اور جس قسم کے بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں جمعہ کی اذان کے بعد انھیں ترک کرنے کا حکم ہے، کیا اہل دیہات کے لیے مشاغل دنیا نہیں ہوتے؟ کیا کھیتی باڑی، دکانداری اور کاروبار مشاغل دنیا سے کوئی مختلف چیزیں ہیں؟

مذکورہ آیت کریمہ اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان پر جمعہ ضروری ہے خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ شہروں میں جمعہ ادا کرو اور دیہاتوں میں نہ کرو بلکہ آیت کریمہ اور حدیث میں مطلق طور پر جمعہ کی فرضیت کا ذکر ہے۔

ابو داؤد اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ ہزم النبیت جو حرہ بنی بیاضہ میں ایک جگہ ہے، وہاں جمعہ ادا کیا گیا تھا اور وہاں چالیس آدمی تھے۔ یہ گاؤں مدینہ سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری اور ابو داؤد میں ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ والی مسجد کے علاوہ اسلام میں پہلا جمعہ ''جواثی'' میں ادا کیا گیا جو بحرین کے دیہاتوں میں سے ایک دیہات تھا۔

کتب احادیث میں جمعہ کے قیام کے لیے لوگوں کی تعداد یا بستی کا بڑا اور چھوٹا ہونا کوئی شرط نہیں لگائی گئی، یہ لوگوں کی اپنی وضع کردہ شرائط ہیں۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اہل بحرین کی طرف لکھا تھا:

« جَمِّعُوا حَيْثُ كُنْتُمْ » [ابن ابی شیبة، کتاب الصلوات: باب من کان یری الجمعة فی القری وغیرها (٥٠٦٨)]
''تم جہاں کہیں بھی ہو جمعہ ادا کروں۔''
اہل دیہات کے جمعہ کے متعلق علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ کی کتاب ''التحقیقات العلی'' ملاحظہ فرمائیں۔

علاقائی زبانوں میں خطبہ جمعہ

سوال کیا جمعہ کے دونوں خطبوں میں عربی کے علاوہ اور کوئی زبان استعمال کر کے مخاطبین کو مسائل سمجھائے جا سکتے ہیں؟ صحابہ کرام مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، انھوں نے وہاں جا کر کون سی زبان استعمال کی تھی؟ اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔

جواب خطبہ کا مقصود سامعین و حاضرین کو وعظ و نصیحت ہے، جس بیان میں افہام (سمجھانا) نہ ہو وہ تو وعظ ہی نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کو ان کی قوم کی زبان سمجھا کر بھیجا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور ہم نے کوئی بھی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قومی زبان کے ساتھ تا کہ ان کے سامنے وضاحت سے بیان کر دے۔'' [ابراهيم : ٤]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ خطاب کرنے والے حضرات کا خطبہ تب ہی مؤثر ہوگا جب وہ سامعین کی زبان میں ہوگا اور اگر سامعین کی زبان کوئی اور ہو اور خطیب کی کوئی اور تو سامعین کو اس وعظ کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور مقصود فوت ہو جائے گا۔ صحیح مسلم وغیرہ میں خطبہ جمعہ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

« يَقْرَءُ الْقُرْآنَ وَ يُذَكِّرُ النَّاسَ » [مسلم، کتاب الجمعة: باب ذکر الخطبتين قبل الصلوة (٨٦٢)]
''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھتے اور لوگوں کو وعظ کرتے۔''

اور ظاہر ہے کہ افہام (سمجھانا) نہ ہو تو وعظ ہی نہیں ہوتا اور لفظ خطبہ بھی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ سامعین کی زبان کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ کیونکہ خطبہ خطاب سے ہے اور خطاب پر صرف عربی زبان کی پابندی اصل مقصود کو فوت کرتی ہے، جو خطاب سے مقصود ہوتا ہے۔ فتاویٰ شامی (۵۴۳/۱) میں مذکورہ مسئلہ کے بارے میں لکھا ہے:

''مصنف نے خطبہ کے عربی میں ہونے کی قید نہیں لگائی کیونکہ باب ''صفۃ الصلاۃ'' میں گزر چکا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ شرط نہیں خواہ سامعین عربی پر قادر ہی ہوں برخلاف صاحبین کے کیوں کہ ان کے نزدیک عربی میں ہونا شرط ہے مگر عربی سے عاجز ہو تو پھر نزدیک بھی غیر عربی میں جائز ہے۔''

معلوم ہوا کہ ائمہ احناف کے ہاں بھی خطبہ کے لیے عربی زبان شرط نہیں۔ صحابہ کرام میں عربی زبان کے علاوہ خطبہ دینے کی مثال اس لیے نہیں کہ ان کی اور ان کے سامعین کی زبان عربی تھی۔

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ کا فتاویٰ : (۳۷۱/۲) تا (۳۸۷)

نماز جمعہ کی کل رکعتیں

(سوال) نماز جمعہ کی کل رکعتیں کتنی ہیں اور کس ترتیب سے پڑھی جاتی ہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

(جواب) نماز جمعہ کی صرف دو رکعتیں فرض ہیں اور ان سے پہلے جمعہ کے نام سے سنن ثابت نہیں البتہ نوافل جتنے قسمت میں ہوں پڑھ لے، کم از کم دو رکعت پڑھ کر مسجد میں بیٹھیں، اس کے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص جمعہ والے دن غسل کرے اور حسب استطاعت پاکیزگی حاصل کرے، تیل یا خوشبو لگائے پھر گھر سے نکلے دو آدمیوں کے درمیان تفریق نہ کرے پھر جتنی مقدر ہو نماز پڑھے اور امام کے کلام کے وقت خاموش ہو جائے تو اس کے گناہ جو اس جمعہ اور گزشتہ جمعہ کے درمیان ہوئے ہیں بخش دیے جاتے ہیں۔'' [صحیح بخاری، کتاب الجمعة: باب الدهن، اللجمعة (٨٨٣)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے خطبہ سے پہلے مقدور بھر نوافل پڑھے جا سکتے ہیں، ان کی تعداد مقرر نہیں، اگر کوئی شخص حالت خطبہ میں آجائے تو دو رکعت پڑھ کر بیٹھ جائے جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی شخص اس وقت آئے جب امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعت نماز ادا کرے۔'' [بخاری، کتاب التهجد: باب ما جاء في التطوع مثنى مثنى (١١٦٦)]

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو جمعہ کے بعد نماز پڑھنا چاہے وہ چار رکعت پڑھ لے۔'' [صحيح مسلم كتاب الجمعة: باب الصلاة بعد الجمعة (٨٨١)]

اور صحیح بخاری و صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے۔'' [صحيح بخاری، كتاب الجمعة: باب الصلاة بعد الجمعة وقبلها: (٩٣٧)، صحيح مسلم كتاب الجمعة: باب الصلاة بعد الجمعة: (٨٨٢)]

پہلی حدیث قولی ہے اور دوسری فعلی ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھی جائیں، یہ افضل ہے اور اگر کوئی دو بھی پڑھ لے تو جائز ہے۔

نماز جمعہ کا صحیح وقت

(سوال) کیا جمعہ کے دن زوال ہے؟ اگر زوال کا وقت جمعہ کے دن 12:38 ہو اور مسجد میں خطبہ 12:30 پر شروع ہو تو کیا ایسی مسجد میں خطبہ سے پہلے سنتیں پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا امام صاحب کا اتنی جلدی خطبہ دینا درست ہے؟

(جواب) جمعہ کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے کیونکہ یہ ظہر کا قائم مقام ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام

بخاری اور جمہور صحابہ وتابعین ائمہ محدثین رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز اس وقت پڑھا کرتے تھے جب سورج ڈھل جاتا۔'' [صحيح بخاری، كتاب الجمعة: باب الجمعة إذا زالت الشمس: (٩٠٤)]

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عمر فاروق، علی بن ابی طالب، نعمان بن بشیر اور عمرو بن حریث رضی اللہ عنہم سے اسی طرح مروی ہے۔''

علامہ عبیداللہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث میں جمہور کی دلیل ہے کہ جمعہ کا اول وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب سورج ڈھل جائے جیسے ظہر کا وقت ہے اور جمعہ زوال کے بعد ہی پڑھا جائے، اسی طرح اس بات پر سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ اس وقت ادا کرتے تھے جب سورج ڈھل جاتا پھر ہم لوٹتے اور سایہ تلاش کرتے۔''

[مرعاة المفاتيح: (٤٨٧/٤)، مسلم كتاب الجمعة: باب صلاة الجمعة، حين تزول الشمس (٨٦٠)]

اسی طرح جو بھائی جمعہ زوال سے قبل پڑھنے کے قائل ہیں ان کے دلائل کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''جو دلائل ہم نے ذکر کیے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زوال سے قبل جمعہ ادا کرنے کی کوئی صحیح صریح دلیل موجود نہیں۔'' [مرعاة المفاتيح (٤٩٠/٤)، نیز دیکھیں تحفة الاحوذی (٣٧/٣)، طبع بیروت]

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وہ بات جس پر اکثر اہل علم کا اجماع ہے کہ جمعہ کا وقت سورج ڈھل جائے تو شروع ہوتا ہے جیسے ظہر کا وقت ہے اور یہی قول امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا ہے۔'' [ترمذی، ابواب الجمعة: باب ماجاء فی وقت الجمعة]

لہٰذا راجح اور درست بات جو صحیح وصریح احادیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ نماز جمعہ زوال کے بعد ادا کی جائے۔ رہا مسجد میں آکر سنت ادا کرنا، تو یاد رہے کہ تحیۃ المسجد جب بھی آپ مسجد میں داخل ہوں گے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھ کر بیٹھیں، احادیث صحیحہ صریحہ سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔

جمعہ کے روز سورۃ الکہف پڑھنے کی فضیلت

سوال جمعۃ المبارک کے دن سورۃ الکہف پڑھنے کی کیا فضیلت ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس آدمی نے جمعہ والے دن سورۃ الکہف کی قراءت کی اس کے لیے دو جمعوں کے درمیان نور روشن ہو جاتا ہے۔''

[المستدرك للحاكم، كتاب التفسير، تفسير سورة الكهف (٣٦٨/٢)]

انہی سے دوسری حدیث میں ہے:

”جس نے جمعہ والے دن سورۃ الکھف کی تلاوت کی اس کے لیے اس کے اور بیت اللہ کے درمیان نور روشن ہو جاتا ہے۔“
[بیھقی: (۲۴۹/۳)]

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے جبکہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے نعیم بن حماد کو ”ذومناکیر“ (منکر روایات بیان کرنے والا) قرار دیا ہے۔ امام ذہبی کی جرح درست نہیں ہے۔ کیونکہ نعیم اس روایت میں منفرد نہیں ہے۔ یزید بن مخلد اور سعید بن منصور نے اس کی متابعت کی ہے۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے ارواء الغلیل (۶۲۶، ۹۶/۳، ۹۵) ملاحظہ ہو۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ والے دن سورۃ الکھف کی تلاوت کرنے سے دو جمعوں کے درمیان تک نور روشن کر دیا جاتا ہے یا اس آدمی سے لے کر بیت اللہ تک نور روشن کر دیا جاتا ہے۔

لہٰذا اسے جمعۃ المبارک والے دن پڑھنا بالکل صحیح ہے۔

جمعہ کے روز عید آنے پر جمعہ کی رخصت

سوال اگر کے جمعہ روز عید آجائے تو کیا جمعہ ادا نہ کرنے کی رخصت شرعی طور پر ہے؟

جواب اگر جمعہ کے روز عید آجائے تو عید کی نماز ادا کی جائے گی البتہ جمعہ کے بارے میں اختیار ہے جو پڑھنا چاہے پڑھ سکتا ہے۔

ایاس بن ابی رملہ کہتے ہیں کہ میری موجودگی میں معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے پوچھا:
”کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں دو عیدوں (یعنی جمعۃ المبارک اور عید الفطر یا عید الاضحیٰ) کو ایک دن جمع ہوتے دیکھا؟“ انھوں نے کہا: ”ہاں!“ ”معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر کیا کیا؟“ انھوں نے کہا: ”آپ نے عید پڑھائی اور جمعہ کے بارے رخصت دی اور فرمایا: ”جو پڑھنا چاہے پڑھ لے۔“ [ابوداود، كتاب الصلاة : باب اذا وافق يوم جمعة: يوم عيد (١٠٧٠)]

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عہد رسول ﷺ میں دو عیدیں اکٹھی ہوگئیں، آپ ﷺ نے لوگوں کو عید کی نماز پڑھائی پھر فرمایا: ”جو جمعہ ادا کرنا چاہے وہ آئے اور جو پیچھے رہنا چاہے وہ پیچھے رہ جائے۔“ (ابن ماجه: كتاب إقامة الصلوات : باب ما جاء فيما اجتمع العيدان: (١٣١٢)]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا:
”ایک دن میں دو عیدیں اکٹھی ہوگئی ہیں جو جمعہ پڑھنا چاہے وہ پڑھ لے اور جو (اپنے گھر میں) بیٹھنا پسند کرے بیٹھا رہے۔“ [عبدالرزاق، كتاب الصلاة: باب في العيدين يجتمعان: (٥٨٣٨)]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر عید اور جمعہ اکٹھے آجائیں تو عید کی نماز پڑھی جائے اور جمعہ کے لیے رخصت ہے۔

منبر کی تیسری سیڑھی پر خطبہ دینا

سوال کیا منبر کی تیسری سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا جائز ہے؟ اگر جائز ہے، تو اس کی شرعی دلیل کیا ہے، یہ عمل سنت

نبوی ﷺ ہے یا خاصہ نبوی ﷺ؟

(جواب) بعض احادیث میں نبی کریم ﷺ کا منبر کی تیسری سیڑھی پر چڑھنے کا ذکر ملتا ہے۔ جیسا کہ کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ ایک دن منبر کی طرف تشریف لائے، جب آپ پہلی سیڑھی پر چڑھے تو کہا'' آمین'' پھر دوسری پر چڑھے تو کہا'' آمین'' پھر تیسری پر چڑھے تو کہا'' آمین'' پھر جب آپ منبر سے نیچے (فارغ ہوکر) اترے تو ہم نے کہا: ''یا رسول اللہ! آج آپ سے خلاف معمول ایک بات کو سنا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''کیا تم نے میری بات کو سنا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''جی ہاں!'' آپ نے فرمایا: ''جب میں سیڑھی پر چڑھا تو جبریل (علیہ السلام) میرے سامنے آئے اور کہا: ''جس نے اپنے والدین یا ان دونوں میں سے ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر جنت میں داخل نہ ہوا وہ (رحمت الٰہی سے) دور ہوا۔'' تو میں نے: '' آمین'' کہا۔ جبریل (علیہ السلام) نے پھر کہا: ''جس کے سامنے آپ کا ذکر کیا گیا اور اس نے آپ پر درود نہ پڑھا تو وہ بھی (رحمت الٰہی سے) دور ہوا'' اس پر بھی میں نے ''آمین'' کہا۔ پھر جبریل (علیہ السلام) نے کہا: ''جس نے رمضان کو پایا لیکن گناہوں سے مغفرت حاصل نہ کی وہ بھی (رحمت الٰہی سے) دور ہوا'' تو میں نے کہا'' آمین''۔ [المستدرك للحاكم، كتاب البر والصلة (١٥٣/٤)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منبر کی تیسری سیڑھی پر چڑھنا بھی جائز و درست ہے۔ اس مسئلہ میں نبی کریم ﷺ کی خصوصیت کے بارے میں کوئی دلیل موجود نہیں۔

خطبہ جمعہ کے دوران سنتوں کا حکم

(سوال) خطبہ جمعہ کے دوران آنے والے افراد بیٹھ کر خطبہ سنیں یا پہلے دو رکعت ادا کریں؟ قرآن و حدیث سے مسئلہ بتا دیں۔

(جواب) جب امام خطبہ جمعہ دے رہا ہو اور اس وقت کوئی آدمی آئے تو اسے دو رکعت پڑھے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے اور دو رکعت پڑھے بغیر ہی بیٹھ گئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: « أَصَلَّيْتَ؟ » ''کیا تو نے (دو رکعتیں) پڑھ لی ہیں؟'' تو اس نے جواب دیا: ''نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: « فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ » ''(کھڑے ہو جاؤ اور) دو رکعتیں ادا کرو۔'' [بخاری، کتاب الجمعة: باب من جاء و الإمام يخطب صلى ركعتين خفيفتين(٩٣١)، ابن ماجه(١١١٤)، ابن خزيمة(١٨٣٥)]

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ ہی کے ساتھ خاص ہے، کسی دوسرے شخص کو دو رکعت ادا کرنے کا حکم نہیں ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے اور سراسر صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عام حکم بھی دیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

« إِذَا جَآءَ اَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ وَ لْيَتَجَوَّزْ فِيهِمَا » [مسلم،

کتاب الجمعة: باب التحیة والإمام یخطب(۸۷۵)]
"جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے روز اس وقت آئے جب امام خطبہ دے رہا ہو تو اسے ہلکی سی رکعتیں پڑھ لینی چاہییں۔"
صحیحین کی ان دونوں روایات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ خطبہ جمعہ کے دوران دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنا سنت ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ فِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ مَنْ دَخَلَ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ لَا يَجْلِسُ حَتّٰى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ وَ هُوَ قَوْلُ كَثِيْرٍ مِّنْ اَهْلِ الْعِلْمِ " [شرح السنة(٢٦٦/٤)]
"یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص خطبہ کے دوران آئے وہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے، یہی اکثر اہل علم کا مسلک ہے۔"

جمعہ کے بعد سنتیں دو ہیں یا چار؟

سوال نمازِ جمعہ کے بعد دو رکعتیں پڑھی جائیں گی یا چار، مسئلہ کی رو سے صحیح کیا ہے؟ وضاحت فرما دیں۔

جواب کتب احادیث کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد آپ ﷺ نے دو رکعتیں بھی ادا کی ہیں اور چار کی بھی اجازت ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيُصَلِّ بَعْدَهَا اَرْبَعًا وَ فِيْ رِوَايَةٍ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُصَلِّيًا بَعْدَ الْجُمُعَةِ فَلْيُصَلِّ اَرْبَعًا » [نسائی، کتاب الجمعة، باب عدد الصلوة بعد الجمعة فی المسجد(١٤٢٧) ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب الصلاة بعد الجمعة(١١٣١)، ترمذی(٥٢٣)، ابن ماجه(١١٣٢)]
"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی آدمی نماز جمعہ ادا کرے تو اس کے بعد چار رکعتیں پڑھے۔"
اس روایت سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے بعد جو چار رکعتیں پڑھنا چاہے وہ چار رکعتیں پڑھ سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ چار رکعت پڑھنا فرض نہیں بلکہ مستحب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ قَبْلَ الظُّهْرِ رَكْعَتَيْنِ وَ بَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَ بَعْدَ الْمَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ فِيْ بَيْتِهِ وَ بَعْدَ الْعِشَاءِ رَكْعَتَيْنِ وَ كَانَ لَا يُصَلِّيْ بَعْدَ الْجُمُعَةِ حَتّٰى يَنْصَرِفَ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ » [بخاری، کتاب الجمعة: باب الصلاة بعد الجمعة و قبلها (٩٣٧)، ابوداؤد(١٢٥٢)، ترمذی (٥٢٢)]
"رسول اکرم ﷺ ظہر سے پہلے اور ظہر کے بعد دو دو رکعتیں پڑھتے، مغرب کے بعد دو رکعتیں گھر میں، دو رکعتیں عشاء کے بعد اور جمعہ کے بعد آپ گھر میں دو رکعتیں پڑھتے۔"

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھنا بھی درست ہے اور دو بھی۔ لیکن یاد رہے کہ چار پڑھنا افضل ہے کیونکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث قولی ہے اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث فعلی ہے اور قولی حدیث فعلی حدیث پر مقدم ہوتی ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ سنت خواہ چار رکعتیں پڑھی جائیں یا دو ان کا مسجد کی نسبت گھر میں پڑھنا زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ صحیح حدیث میں آتا ہے:

« فَإِنَّ اَفْضَلَ الصَّلٰوةِ صَلَاةُ الْمَرْءِ فِيْ بَيْتِهِ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ » [بخاري، كتاب الاذان: باب صلاة الليل(٧٣١)، أبوعوانة(٢/٢٩٤)، ابو داؤد(١٤٤٧)، ترمذي (٤٥٠)]

''آدمی کا فرض نماز کے علاوہ باقی نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے۔''

لہٰذا اس طرح کے معاملات کہ جن میں اختیار ہے، فضول بحث و تکرار درست نہیں۔ جو چار پڑھنا چاہے وہ چار پڑھ لے اور جو دو پڑھنا چاہے وہ دو پڑھ لے، دونوں طرح جائز اور درست ہوگا۔

خطبہ جمعہ اور نماز جمعہ کے لیے الگ الگ امام

سوال اگر خطیب خطبہ جمعہ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نمازِ جمعہ کی امامت کروائے تو کیا نماز ہو جائے گی؟

جواب نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا معمول تو یہی تھا کہ وہ خطبہ بھی خود ہی دیتے تھے اور نماز بھی خود ہی پڑھاتے تھے لیکن اگر کسی وقت ایک آدمی نے خطبہ دیا اور دوسرے نے جماعت کروا دی تو نماز ادا ہو جائے گی، نماز نہ ہونے کی کوئی دلیل معلوم نہیں۔

خطبہ چھوٹا اور نماز لمبی والی حدیث کا مفہوم

سوال صحیح مسلم کی حدیث کا مفہوم ہے کہ چھوٹا خطبہ اور لمبی نماز امام کے عقل مند ہونے کی نشانی ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ اگر واقعی یہ مراد ہے کہ خطبہ چھوٹا اور نماز لمبی ہونی چاہیے تو اس صحیح حدیث پر عمل کب ہوگا؟

جواب صحیح مسلم میں عمار رضی اللہ عنہ سے حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

« اِنَّ طُوْلَ صَلَاةِ الرَّجُلِ وَ قَصَرَ خُطْبَتِهِ مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ فَاَطِيْلُوْا الصَّلَاةَ وَاَقْصِرُوا الْخُطْبَةَ وَاِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا » [مسلم، كتاب الجمعة: باب تخفيف الصلوٰة والخطبة (٨٦٩)]

''بلاشبہ آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور اس کے خطبے کا چھوٹا ہونا اس کی فقاہت کی علامت ہے، تم نماز لمبی کرو اور خطبہ چھوٹا کرو، بلاشبہ بیان (مؤثر ہونے کے لحاظ سے) جادو (اثر) ہوتے ہیں۔''

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ جمعہ کی نماز خطبہ جمعہ سے لمبی ہو بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ نماز جمعہ عام نمازوں سے لمبی ہو اور خطبہ جمعہ عام خطبات سے چھوٹا ہو۔ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ نے طویل خطبہ بھی دیا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ

آپ نے فجر کے بعد ظہر تک پھر ظہر سے عصر تک پھر سورج غروب ہونے تک بھی خطبہ دیا جس میں آپ نے گزشتہ اور مستقبل کی باتوں کا ذکر فرمایا۔ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو خطبے ارشاد فرماتے تھے، ان دونوں کے درمیان آپ بیٹھتے تھے۔ آپ (ان میں) قرآن پڑھتے اور لوگوں کو نصیحت کرتے، آپ کی نماز درمیانی ہوتی اور خطبہ بھی درمیانہ ہوتا۔'' [صحيح مسلم، كتاب الجمعة: باب ذكر الخطبتين قبل الصلوٰة (٨٦٢)، (٨٦٦)]

اسی طرح ام ہشام کی روایت میں ہے کہ انھوں نے سورۂ ق والقرآن المجید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطبہ جمعہ میں سن کر یاد کی۔ [صحيح مسلم، كتاب الجمعة: باب تخفيف الصلوٰة والخطبة: (٨٧٣)]

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ درمیانہ ہونا چاہیے، عام خطبوں کی طرح لمبا نہ ہو اور نماز جمعہ عام نمازوں سے لمبی ہو کیونکہ عام طور پر امام کو نماز ہلکی پڑھانے کا حکم ہے جو نمازیوں پر مشقت کا باعث نہ ہو اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ خطبہ ایک نہیں بلکہ دو ہوتے ہیں، اس لیے جمعہ کے دو خطبوں کا وقت تو نماز سے زیادہ ہی ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب!

تین رکعات وتر تقسیم کر کے پڑھنا

سوال کیا وتروں کا یہ طریقہ درست ہے کہ دو پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے اور پھر الگ سے ایک رکعت پڑھی جائے؟ اور کیا یہ سنت سے ثابت ہے؟

جواب نماز وتر کی تین رکعات اس طرح ادا کرنا کہ دو پڑھ کر سلام پھیر دیں پھر ایک رکعت الگ ادا کر لیں، بالکل صحیح اور سنت نبوی کے مطابق ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و فعلی احادیث اس کی مؤید ہیں۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رات کی نماز کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى فَإِذَا خَشِيَ اَحَدُكُمُ الصُّبْحَ صَلّٰى رَكْعَةً وَاحِدَةً تُوتِرُ لَهُ مَا قَدْ صَلّٰى »
[بخاري، ابواب الوتر: باب ماجآء في الوتر(٩٩٠)]

''رات کی نماز دو دو رکعت ہے، جب تم میں سے کسی ایک کو صبح کا ڈر ہو تو وہ ایک رکعت ادا کرے، جو نماز اس نے ادا کی ہے وہ اسے وتر بنا دے گی۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ اِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً يُوْتِرُ مِنْهَا بِوَاحِدَةٍ فَإِذَا فَرَغَ مِنْهَا اضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْمَنِ » [ابو داود، كتاب التطوع، باب صلاة الليل(١٣٣٥)، مسلم (٧٣٦)، ترمذي(٤٤٠، ٤٤١)، نسائي(١٦٩٧)]

''بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گیارہ رکعات نماز ادا کرتے، ان میں سے ایک رکعت وتر ادا کرتے، جب اس سے فارغ ہو جاتے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔''

انس بن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: ''صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتوں کے بارے میں مجھے بتاؤ، ہم ان میں لمبی قراءت کرتے ہیں؟'' تو انھوں نے کہا:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى وَ يُوْتِرُ بِرَكْعَةٍ وَ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْغَدَاةِ » [بخاری، كتاب الوتر: باب ساعات الوتر(٩٩٥)]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو دو دو رکعت پڑھتے تھے اور ایک رکعت وتر ادا کرتے تھے اور صبح کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھتے تھے۔''

اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طویل حدیث میں بھی ایک رکعت وتر کا ذکر ہے۔ [ابو داؤد(١٣٥٣، ١٣٥٥)، مسلم (٧٦٣)]

ان قولی اور فعلی احادیث سے واضح ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا کہ رات کو دو دو رکعت نماز پڑھتے پھر آخر میں ایک رکعت وتر ادا کر لیتے، لہٰذا یہی صورت افضل معلوم ہوتی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يُوْتِرُ بِرَكْعَةٍ وَ كَانَ يَتَكَلَّمُ بَيْنَ الرَّكْعَتَيْنِ وَ الرَّكْعَةِ »
[مصنف ابن ابی شيبة(٢/٢٩١)، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل(٢/١٥٠)]

''بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت وتر ادا کرتے تھے اور دو رکعتوں اور ایک رکعت کے درمیان کلام کیا کرتے تھے۔''

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُسَلِّمُ فِيْ كُلِّ ثِنْتَيْنِ وَ يُوْتِرُ بِوَاحِدَةٍ » [ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة: باب ما جآء في الوتر بركعة (١١٧٧، ١٣٥٨)]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر دو رکعت پر سلام پھیر دیتے تھے اور ایک رکعت وتر ادا کرتے تھے۔''

اس روایت کے متعلق علامہ بوصیری فرماتے ہیں: ''هٰذَا اِسْنَادٌ صَحِيْحَةٌ رِجَالُهُ ثِقَاتٌ '' (یہ سند صحیح ہے اس کے رجال ثقہ ہیں) [زوائد ابن ماجه(ص/١٨٠)، (رقم/٣٨٦)]

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَفْصِلُ بَيْنَ الْوِتْرِ وَ الشَّفْعِ بِتَسْلِيْمَةٍ وَ يُسْمِعُنَاهَا »
[احمد(٩/٣٣٣)، صحيح ابن حبان(٢٤٣٣)، طبرانی اوسط(٧٥٧)، تاريخ بغداد(١٢/٣١٤)، شرح معانی الآثار(١/٢٧٨)، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو قوی کہا ہے۔ [فتح الباری(٢/٤٨٢)]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر اور جفت میں سلام کے ذریعے فصل کرتے تھے اور آپ سلام ہمیں سناتے تھے۔''

نافع رحمہ اللہ سے روایت ہے:

« اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يُسَلِّمُ بَيْنَ الرَّكْعَةِ وَالرَّكْعَتَيْنِ فِي الْوِتْرِ حَتّٰى يَأْمُرَ بِبَعْضِ حَاجَتِهٖ »
[بخاری، كتاب الوتر : باب ما جآء في الوتر(٩٩١)، شرح معانی الآثار: (١/٢٧٩) ،مؤطا (ص/١٢١)، مسند شافعي (١/١٠٩)]

"بلاشبہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما وتر کی ایک اور دو رکعت کے درمیان سلام پھیر دیتے تھے حتیٰ کہ اپنی کسی حاجت کے لیے حکم کر دیتے۔"

بکر بن عبد اللہ المزنی رحمہ اللہ سے روایت ہے:

«اَنَّ ابْنَ عُمَرَ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ ثُمَّ قَالَ ادْخُلُوْا اِلَيَّ نَاقَتِيْ فُلَانَةَ ثُمَّ قَامَ فَاَوْتَرَ بِرَكْعَةٍ»

[ابن ابی شیبۃ (۲/۲۹۲)]

"بے شک ابن عمر رضی اللہ عنہما نے دو رکعت نماز ادا کی پھر سلام پھیر دیا پھر کہا: "میرے پاس میری فلاں اونٹنی لے آؤ۔" پھر کھڑے ہو گئے اور ایک رکعت وتر ادا کیا۔"

علامہ البانی رحمہ اللہ اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں: "هٰذَا اِسْنَادٌ صَحِيْحٌ" (یہ سند صحیح ہے) [إرواء الغلیل (۲/۱٤۰)]

امام طحاوی رحمہ اللہ نے سعید بن منصور کے طریق سے بیان کیا ہے کہ بکر بن عبد اللہ المزنی نے کہا:

« صَلّٰى ابْنُ عُمَرَ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ قَالَ يَا غُلَامُ ! اَرْحِلْ لَنَا ثُمَّ قَامَ فَاَوْتَرَ بِرَكْعَةٍ »[شرح معانی الآثار (۲۷۹/۱)، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سعید بن منصور نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔" [فتح الباری (۲/٤۸۲)]

"ابن عمر رضی اللہ عنہما نے دو رکعت نماز ادا کی پھر کہا: "اے لڑکے! ہماری سواری لاؤ۔" پھر کھڑے ہو گئے اور ایک رکعت وتر ادا کیا۔"

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ تین وتر اس طرح ادا کرنا کہ دو پڑھ کر سلام پھیر دیں، پھر ایک رکعت ادا کر لیں بالکل صحیح اور درست ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ قَدْ صَحَّ وِتْرُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِثَلَاثَ عَشْرَةَ وَ اِحْدٰى عَشْرَةَ وَ تِسْعٍ وَ سَبْعٍ وَ خَمْسٍ وَ ثَلَاثٍ وَ وَاحِدَةٍ وَ اَصَحُّهَا وِتْرُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِرَكْعَةٍ وَاحِدَةٍ " [مستدرک حاکم (۱/۶۱۰)، (رقم/۱۱۹)]

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تیرہ، گیارہ، نو، سات، پانچ، تین اور ایک رکعت وتر ثابت ہیں اور صحیح ترین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک رکعت وتر ادا کرنا ہے۔"

بہر کیف صحیح احادیث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وتر کی ایک رکعت علیحدہ ادا کرنا بالکل صحیح اور درست ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی احادیث سے ثابت ہے اور اس پر طعن کرنا صحیح احادیث اور صحابہ کرام پر طعن کرنے کے مترادف ہے اور اس کا انکار کرنا بجز جہالت کے اور کچھ نہیں۔

وتروں میں قنوت سے پہلے تکبیر

سوال کیا قنوت سے قبل اللہ اکبر کہنے والی روایت صحیح ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں؟

جواب عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت میں قنوت کرنے سے پہلے اللہ اکبر کہنے کا ذکر ہے، جسے امام ابن عبد البر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ [الاستیعاب لابن عبد البر (٤/٤٥۰-٤٥۱)]

لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ اس میں ابان بن ابی عیاش متروک راوی ہے۔ ابان سے اس کو روایت کرنے والا حفص بن سلیمان بھی متروک ہے۔[ابان کے متعلق مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: المغني في الضعفاء ١٠/١٣)، تهذيب الكمال(٤٨/١)، تهذيب التهذيب(٢/ ٤٠٠)، ميزان الاعتدال(١/ ٥٥٨)، لسان الميزان(٧/ ٢٠٠)]

لہٰذا یہ روایت باطل ہے۔ اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ اس حدیث کو ابان بن ابی عیاش سے حفص بن سلیمان کے علاوہ یزید بن ہارون، سفیان ثوری اور ہشام جیسے ثقات نے بھی بیان کیا ہے مگر ان میں سے کسی نے اللہ اکبر کہنے والا یہ اضافہ ذکر نہیں کیا۔

اسی طرح عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک موقوف روایت میں بھی قنوت سے پہلے اللہ اکبر کہنے کا ذکر ہے۔[ابن ابي شيبة (٢/ ١٠٠) (رقم/٢٧٢٩)]

مگر یہ لیث بن ابی سلیم کی وجہ سے ضعیف ہے، لیث کو امام احمد نے مضطرب الحدیث، امام ابن معین اور امام نسائی رحمہ اللہ نے ضعیف اور امام ابن حبان اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اختلاط کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔ [المغني في الضعفاء(٢/ ٢٥٣)، تهذيب التهذيب(٨/ ٤٦٥)، ميزان الاعتدال(٣/ ٤٢٠)، لسان الميزان(٧/ ٣٤٧)]

لہٰذا دعائے قنوت کے لیے اللہ اکبر کہہ کر کانوں تک ہاتھ اٹھانے والی روایات باطل ہیں، اس کا کوئی صحیح ثبوت موجود نہیں۔

وتر کی آخری رکعت

سوال کیا وتر کی آخری رکعت میں شامل ہونے سے ایک وتر ادا ہو جاتا ہے؟

جواب نماز با جماعت کی صورت میں مقتدی کو اتنی رکعات ہی ادا کرنی چاہییں جتنی امام پڑھتا ہے، یہ بات درست نہیں کہ امام تین رکعات نماز پڑھائے اور مقتدی آخری رکعت میں شریک ہونے سے سمجھ لے کہ مجھے ایک رکعت وتر مل گیا ہے۔ مقتدی کی تعداد رکعات اتنی ہی ہونی چاہیے جتنی امام نے پڑھائی ہیں۔ اس کی دلیل ایک تو یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ » [بخاري، كتاب الأذان : باب إنما جعل الأمام ليؤتم به(٦٨٩)]

”امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔“

اور دوسری حدیث میں ہے:

« فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا » [بخاري، كتاب الأذان: باب لايسعى إلى الصلاة وليأ تها بالسكينة والوقار (٦٣٦)]

”جو نماز تم امام کے ساتھ پالو وہ پڑھ لو اور جو تم سے رہ جائے اسے پورا کرلو۔“

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اگر تین وتر پڑھائے اور مقتدی ایک رکعت پائے تو اسے اٹھ کر باقی دو رکعت پوری کرنی چاہییں۔

وتروں کے بعد نماز

(سوال) کیا وتروں کے بعد کوئی نفل نماز پڑھی جا سکتی ہے اور سنت رسول ﷺ سے اس کا ثبوت ملتا ہے؟

(جواب) نماز وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعت پڑھنا رسول کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ اس کے متعلق کئی ایک صحیح احادیث موجود ہیں:

① ابو سلمہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا:

« سَأَلْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنْ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَتْ كَانَ يُصَلِّيْ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً يُصَلِّيْ ثَمَانَ رَكْعَاتٍ ثُمَّ يُوْتِرُ ثُمَّ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ وَ هُوَ جَالِسٌ فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَّرْكَعَ قَامَ فَرَكَعَ ثُمَّ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ بَيْنَ النِّدَاءِ وَ الْإِقَامَةِ مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ »[مسلم، كتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب صلاة الليل و عدد ركعات النبى ﷺ فى الليل(٧٣٨)، ابن ماجه (١١٩٦)]

''میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا: ''آپ ﷺ تیرہ (۱۳) رکعات پڑھتے تھے، آٹھ رکعتیں پڑھتے پھر وتر ادا کرتے پھر بیٹھ کر دو رکعت پڑھتے لیکن جب رکوع کرتے تو کھڑے ہو کر رکوع کرتے، پھر صبح کی اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعت پڑھتے۔''

② سعد بن ہشام کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وتر کے بارے میں جب انھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا تو انھوں نے بتایا: ''آپ نو رکعت وتر اس طرح ادا کرتے کہ آٹھویں میں تشہد بیٹھتے، اللہ کا ذکر، حمد اور دعا کرتے پھر سلام پھیر دیتے:

« ثُمَّ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ وَ هُوَ قَاعِدٌ » [مسلم، كتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب جامع صلاة الليل و من نام عنه أو مرض(٧٤٦)]

''پھر بیٹھ کر سلام پھیرنے کے بعد دو رکعت پڑھتے۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''اس حدیث کے ظاہر سے امام اوزاعی اور امام احمد رحمہ اللہ نے وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کو مباح قرار دیا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ نے اس سے انکار کیا ہے۔'' پھر فرماتے ہیں:

'' قُلْتُ: اَلصَّوَابُ أَنَّ هَاتَيْنِ الرَّكْعَتَيْنِ فَعَلَهُمَا بَعْدَ الْوِتْرِ جَالِسًا لِبَيَانِ جَوَازِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْوِتْرِ وَ بَيَانِ جَوَازِ النَّفْلِ جَالِسًا وَ لَمْ يُوَاظِبْ عَلٰى ذٰلِكَ بَلْ فَعَلَهُ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ أَوْ مَرَّاتٍ قَلِيْلَةً ''
[شرح مسلم للنوى(١٩/٦)]

''میں کہتا ہوں کہ درست بات یہ ہے کہ ان دو رکعتوں کو رسول اللہ ﷺ نے وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھنے کا جواز بیان کرنے کے لیے ادا کیا ہے اور اس پر دوام نہیں کیا بلکہ اسے ایک یا دو مرتبہ یا بہت تھوڑی دفعہ کیا ہے۔''

مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فِيهِ مَشْرُوعِيَّةُ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْوِتْرِ عَنْ جُلُوسٍ" [مرعاة المفاتيح(٤/٢٢٥)]

"حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کی مشروعیت ہے۔"

مزید فرماتے ہیں:

"وَ الرَّاجِحُ عِنْدِىْ مَا ذَهَبَ اِلَيْهِ النَّوَوِيُّ اَنَّ الْاَمْرَ فِىْ قَوْلِهٖ اِجْعَلُوْا ...... لِلنُّدْبِ لَا لِلْاِيْجَابِ" [مرعاة المفاتيح (٤/٢٦٥)]

"میرے نزدیک راجح بات وہی ہے جس کی طرف امام نووی رحمہ اللہ گئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان: «اِجْعَلُوْا آخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْرًا» میں حکم وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے۔"

③ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يُصَلِّىْ بَعْدَ الْوِتْرِ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ وَ هُوَ جَالِسٌ»

[ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها: باب ما جآء فى الركعتين بعد الوتر جالساً (١١٩٥) ، ترمذى، ابواب الصلاة: باب ما جآء لا وتر ان فى ليلة(٤٧١)، احمد(٦/٢٩٨)، دار قطنى (٢/٢٦) ، بيهقى (٣/٣٢)، الكامل لابن عدى(٦/٢٤١٠)]

"بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد بیٹھ کر دو ہلکی سی رکعتیں ادا کرتے تھے۔"

④ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْهِمَا بَعْدَ الْوِتْرِ وَ هُوَ جَالِسٌ يَقْرَأُ فِيْهِمَا اِذَا زُلْزِلَتِ وَ قُلْ يٰاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ» [مسند احمد(٥/٢٦٠-٢٦٩)، بيهقى(٣/٣٣)، كتاب الوتر- طحاوى(١/٢٣٦)]

"بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ ان دو رکعتوں میں سورۂ زلزال اور سورۂ کافرون کی قراءت کرتے۔"

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس کے راوی ثقہ ہیں۔" [مرعاة المفاتيح(٤/٢٩٩)]

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ [المشكوٰة محقق(١/٤٠١)]

⑤ اسی معنی کی روایت سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ [بيهقى(٣/٣٣)]

⑥ «عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مَوْلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِىْ سَفَرٍ فَقَالَ اِنَّ السَّفَرَ جُهْدٌ وَ ثِقْلٌ فَاِذَا اَوْتَرَ اَحَدُكُمْ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ فَاِنِ اسْتَيْقَظَ وَ اِلَّا كَانَتَا لَهٗ» [دار قطنى، كتاب الوتر: باب فى الركعتين بعد الوتر(١٦٦٥)،

دارمی(١٦٠٢)، بیهقی(٣٣/٣)، مجمع الزوائد(٢٤٩/٢)، طحاوی (٢٣٦/١)]

”ثوبان رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ ﷺ کے غلام ہیں، ان سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: ”ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ سفر پر مشقت اور طبیعت پر گراں ہوتا ہے، جب تم میں سے کوئی وتر ادا کرے تو وہ دو رکعت بھی ادا کرے، اگر وہ بیدار ہو گیا (اور نماز پڑھ لی تو ٹھیک) اور اگر بیدار نہ ہوا تو یہ دو رکعتیں اس کے لیے (رات کے قیام سے کافی) ہوں گی۔“

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْكَبِيرِ وَ الْاَوْسَطِ وَ فِيهِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ صَالِحٍ كَاتِبُ اللَّيْثِ وَ فِيهِ كَلَامٌ“

[عبد الله بن صالح ابو صالح كاتب الليث بن سعد کے بارے میں ملاحظه هو: المغنى فى الضعفاء (٥٤٤/١)، تهذيب التهذيب (١٦٧/٣)، الكاشف (٥٦٢/١)، الجرح والتعديل(٣٩٨/٥)، تقريب التهذيب (ص/١٧٧٠)]

”اس حدیث کو امام طبرانی نے المعجم الکبیر اور المعجم الأوسط میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں عبداللہ بن صالح کاتب اللیث ہے اور اس میں کلام ہے۔“

اس کے متعلق راجح بات یہ ہے کہ یہ حسن درجے کا راوی ہے بشرطیکہ اس کی روایت ثقات کے خلاف نہ ہو۔ مذکورہ حدیث میں اس کی متابعت عبداللہ بن وہب دارمی کے ہاں ہے۔ علامہ عبداللہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے دارمی کی سند کو جید قرار دیا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

”اہل علم کا اس بات پر اختلاف ہے کہ جو شخص پہلی رات وتر ادا کرے پھر آخری رات میں اٹھ کھڑا ہو، آپ کے صحابہ میں سے بعض اہل علم اور کچھ ان کے بعد والے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ وتر توڑ دے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ایک رکعت ملا دے اور پھر جو ظاہر ہو نماز پڑھے پھر آخر میں وتر ادا کرے۔ اس لیے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں اور اسی بات کی طرف امام اسحاق بن راہویہ گئے ہیں اور بعض اہل علم صحابہ وغیرہ نے کہا ہے کہ جب اوّل رات وتر ادا کرے پھر سو جائے، پھر رات کے آخر میں قیام کرے تو جو حصہ اس کے لیے ظاہر ہو پڑھ لے اور اپنے وتر کو نہ توڑے اور وتر کو اسی حال میں چھوڑ دے۔

یہ قول امام سفیان ثوری، امام مالک، امام عبداللہ بن مبارکپوری، امام شافعی، اہل کوفہ اور امام احمد رحمہم اللہ کا ہے اور یہی صحیح ترین قول ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ سے کئی طرق سے مروی ہے کہ آپ نے وتر کے بعد نماز ادا کی ہے۔“

[جامع ترمذی(٣٢٤/٢)، بتحقیق احمد شاکر]

اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ذکر کی ہے۔

مذکورہ بالا تحقیق سے معلوم ہوا کہ عشاء کی نماز کے ساتھ جس نے وتر ادا کر لیے تو وہ اس کے بعد دو رکعت پڑھے تو جائز و درست ہے اور جس روایت میں ہے: ”تم اپنی آخری نماز وتر بناؤ“ اس میں حکم وجوب کے لیے نہیں بلکہ ندب و استحباب کے لیے ہے اور جس شخص نے اوّل رات وتر ادا کر لیے ہوں اور اسے پچھلی رات بیداری نصیب ہو جائے تو وہ قیام کرے اور رات

میں ادا کیے ہوئے وتروں کو نہ توڑے۔[واللہ اعلم بالصواب]

نماز عشاء کے بعد وتروں کی تعداد

(سوال) وتروں کی تعداد کے متعلق آگاہ فرمائیں کہ وہ کتنے پڑھے جائیں؟

(جواب) نماز عشاء کے بعد تین وتر بھی پڑھے جا سکتے ہیں اور ایک بھی۔ سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَلْوِتْرُ حَقٌّ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّوْتِرَ بِخَمْسٍ فَلْیَفْعَلْ وَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّوْتِرَ بِثَلَاثٍ فَلْیَفْعَلْ وَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّوْتِرَ بِوَاحِدَةٍ فَلْیَفْعَلْ »[ابو داؤد، کتاب الصلاۃ: باب کم الوتر(۱۴۲۲)، نسائی(۱۷۱۰)، ابن ماجه(۱۱۱۰)، بیهقی(۲۳/۳)، التمهید(۲۵۸/۱۳)،مستدرك حاكم(۳۰۲/۱)]

”وتر ہر مسلمان پر لازم ہے، جو پانچ وتر ادا کرنا پسند کرے وہ پانچ پڑھ لے اور جو تین وتر پڑھنا پسند کرے وہ تین پڑھ لے اور جو ایک رکعت پسند کرے وہ ایک پڑھ لے۔“

لہٰذا ان صورتوں میں سے کوئی بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔

قنوت وتر رکوع سے پہلے ہے یا بعد میں؟

(سوال) وضاحت کر دیجیے کہ قنوت وتر پڑھنے کا صحیح محل کیا ہے رکوع سے پہلے یا بعد میں؟ جزاکم اللہ خیراً

(جواب) رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے وتر میں دعائے قنوت رکوع سے پہلے ثابت ہے اور اکثر روایات رکوع سے پہلے ہی قنوت وتر پر دلالت کرتی ہیں۔

(۱) سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يُوْتِرُ فَيَقْنُتُ قَبْلَ الرُّكُوْعِ »[ابن ماجه، کتاب إقامة الصلاة: باب ما جاء فی القنوت قبل الرکوع و بعده(۱۱۸۲) ، نسائی(۲۳۵/۳)، دار قطنی(۳۱/۲)]

”رسول اللہ ﷺ وتر ادا کرتے تو دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھتے۔“

(۲) سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

« عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَنْ اَقُوْلَ اِذَا فَرَغْتُ مِنْ قِرَاءَتِیْ فِی الْوِتْرِ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ..........» [كتاب التوحيد لابن مندة(۹۱/۲) إرواء الغليل(۱۶۸/۲)]

”مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات وتر میں قراءت سے فارغ ہونے کے بعد پڑھنے کے لیے سکھائے: « اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ ......» “

یہ روایت اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ وتر میں دعائے قنوت قراءت سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے کرنی چاہیے۔

③ علقمہ سے روایت ہے:

« اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانُوْا يَقْنُتُوْنَ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ » [ابن ابی شیبة(۲/۳۰۶)، علامه البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو مسلم کی شرط پر صحیح کہا ھے۔ [إرواء الغلیل(۲/۱٦٦)]

''ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے۔''

④ عاصم احول کہتے ہیں:

''میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قنوت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا: ''رکوع سے پہلے ہے۔'' پھر میں نے کہا: ''فلاں شخص آپ کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ رکوع کے بعد ہے۔'' تو انس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''وہ غلط کہتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کے بعد صرف ایک ماہ قنوت کی۔ یہ اس وقت ہوا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر (۷۰) قراء صحابہ کو مشرکوں کی ایک قوم (بنی عامر) کی طرف تعلیم دینے کے لیے بھیجا تھا، ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان وعدہ تھا (انھوں نے عہد شکنی کرتے ہوئے ان ستر (۷۰) قراء کو شہید کر ڈالا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک رکوع کے بعد قنوت کی اور ان پر بد دعا فرمائی۔'' [بخاری، کتاب المغازی: باب غزوة الرجیع(٤٠٩٦)، ابوعوانة (۲/۲۸۵)، دارمی(۱/۳۷٤) الطحاوی(۱/۱٤۳)، بیھقی(۲/۲۰۷)، احمد (۳/۱٦۷)]

اس روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جو دعا ہنگامی حالات میں مسلمانوں کی خیر خواہی، کفار و مشرکین اور دشمنان اسلام کے لیے بد دعا کے طور پر کی جاتی ہے وہ رکوع کے بعد ہے، جسے قنوت نازلہ کہا جاتا ہے اور جو دعا رکوع سے پہلے مانگی جاتی ہے وہ قنوت وتر ہے اور قنوت وتر میں ہاتھوں کا اٹھانا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ رکوع سے پہلے قراءت سے فارغ ہونے کے بعد اسی طرح بغیر ہاتھ اٹھائے دعا مانگنی چاہیے، جو لوگ قنوت وتر میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں وہ اسے قنوت نازلہ پر قیاس کرتے ہیں۔

قنوت نازلہ کا حکم

سوال قنوت نازلہ کا کیا مطلب ہے، یہ کیوں اور کیسے کی جاتی ہے؟ مکمل وضاحت سے سمجھا دیں۔

جواب قنوت دعا کو کہتے ہیں اور نازلہ کا معنی مصیبت میں گرفتار ہونا ہے۔ زمانے کے حوادثات میں پھنس جانے کے وقت نماز میں اللہ تعالیٰ سے گریہ و زاری کر کے ان حوادثات و وقائع سے نجات پانے کے لیے التجا و دعا کرنا قنوتِ نازلہ کہلاتا ہے۔

دنیا میں مصائب و آلام کئی طرح کے ہوتے ہیں، مثلاً دنیا کے کئی خطوں میں مسلمانوں پر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ

ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں، دن رات ان کو پریشانیوں میں مبتلا کر رہے ہیں، ان کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں اور کمزور و لاغر مسلمان ان کے ظلم وستم کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں، تو ان تمام حالات میں قنوتِ نازلہ کی جاتی ہے اور یہ نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام، فقہاء ومحدثین اور سلف صالحین رحمہم اللہ کا طریقہ رہا ہے۔ اس دعا کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے انتہائی تذلل اور عجز و انکسار کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی چاہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اے اللہ! ہمیں ان مصائب و آلام سے محفوظ فرما، ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں قنوت اس لیے کرتا ہوں تاکہ تم اپنے پروردگار کو پکارو اور اس سے اپنی ضروریات کے بارے میں سوال کرو۔''

[مجمع الزوائد(٢/١٣٨)]

نبی کریم ﷺ نے مصیبت و پریشانی اور رنج وغم کے پیش نظر کبھی پانچوں نمازوں میں قنوت کی اور کبھی بعض نمازوں میں۔

چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« وَاللّٰهِ ! لَأُقَرِّبَنَّ بِكُمْ صَلَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَكَانَ أَبُوْهُرَيْرَةَ يَقْنُتُ فِي الظُّهْرِ وَ الْعِشَاءِ الْآخِرَةِ وَ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَ يَدْعُوْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ يَلْعَنُ الْكُفَّارَ » [مسلم، كتاب المساجد: باب استحباب القنوت فى جميع الصلوات(٦٧٦)]

''اللہ کی قسم! میں تمھارے قریب وہ نماز ادا کروں گا جو رسول اللہ ﷺ کی نماز ہے۔'' پس سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ظہر، عشاء اور فجر کی نماز میں قنوت کرتے تھے اور مومنوں کے لیے دعا کرتے تھے اور کافروں پر لعنت کرتے تھے۔''

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ صبح اور مغرب کی نماز میں قنوت کرتے تھے۔''[مسلم، كتاب المساجد و مواضع الصلاة: باب استحباب القنوت فى جميع الصلوات إذا نزلت بالمسلمين نازلة(٦٧٨)]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِيْ صَلَاةِ الْعَتَمَةِ شَهْرًا »[ابو داؤد، كتاب الوتر: باب القنوت فى الصلاة(١٤٤٢)]

''رسول اللہ ﷺ نے نماز عشاء میں ایک ماہ قنوت کی۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ شَهْرًا مُتَتَابِعًا فِي الظُّهْرِ وَ الْعَصْرِ وَ الْمَغْرِبِ وَ الْعِشَاءِ وَ صَلَاةِ الصُّبْحِ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ إِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ مِنَ الرَّكْعَةِ الْآخِرَةِ يَدْعُوْ عَلٰى أَحْيَاءٍ مِنْ بَنِيْ سُلَيْمٍ عَلٰى رِعْلٍ وَّ ذَكْوَانَ وَ عُصَيَّةَ وَ يُؤَمِّنُ مَنْ خَلْفَهُ »[ابو داؤد، كتاب الوتر: باب القنوت فى الصلاة(١٤٤٣)]

''رسول اللہ ﷺ متواتر ایک ماہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی نماز میں جب آخری رکعت میں "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہتے تو قنوت کرتے اور بنوسلیم کے چند قبیلوں رعل، ذکوان اور عصیہ پر بددعا کرتے اور مقتدی آمین کہتے۔''

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ مختلف حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کبھی ایک نماز میں، کبھی دو تین اور کبھی پانچوں نمازوں میں قنوت کرتے تھے۔ تو ہمیں بھی حالات و واقعات کے تقاضے کے مطابق ایسا کرنا چاہیے اور یہ معاملہ اس وقت تک جاری رہے جب تک دشمنوں کی مکمل سرکوبی نہیں ہو جاتی اور مسلمانوں کے مصائب و آلام میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَنَتَ بَعْدَ الرَّكْعَةِ فِي صَلَاةٍ شَهْرًا اِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ يَقُوْلُ فِيْ قُنُوْتِهِ اَللّٰهُمَّ نَجِّ الْوَلِيْدَ بْنَ الْوَلِيْدِ، اَللّٰهُمَّ نَجِّ سَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ ، اَللّٰهُمَّ نَجِّ عَيَّاشَ بْنَ اَبِيْ رَبِيْعَةَ ، اَللّٰهُمَّ نَجِّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ، اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَكَ عَلٰى مُضَرَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ. قَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ ثُمَّ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ تَرَكَ الدُّعَاءَ بَعْدُ فَقُلْتُ اُرَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَدْ تَرَكَ الدُّعَاءَ لَهُمْ قَالَ فَقِيْلَ وَ مَا تَرَاهُمْ قَدْ قَدِمُوْا ؟ » [مسلم، كتاب المساجد و مواضع الصلاة : باب استحباب القنوت في جميع الصلوات (٦٧٥)]

''نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ تک رکوع کے بعد قنوت کی۔ جب آپ "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہتے تو اپنی قنوت میں کہتے: ''اے اللہ! ولید بن ولید کو نجات دے اے اللہ! سلمہ بن ہشام کو نجات دے اے اللہ! عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات دے۔ اے اللہ! ضعیف مومنوں کو نجات دے۔ اے اللہ! اپنا عذاب قبیلہ مضر پر سخت کر۔ اے اللہ! ان پر یوسف علیہ السلام کے زمانے جیسا قحط ڈال دے۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''پھر میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے دعا کرنا چھوڑ دی تو میں نے کہا میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا کرنا چھوڑ دیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا: ''تم دیکھتے نہیں کہ جن کے لیے رسول اللہ ﷺ دعا کرتے تھے وہ آ گئے ہیں (یعنی کفار کے غلبے سے انھیں نجات مل گئی ہے)۔''

موجودہ حالات میں چونکہ مسلمان کئی ممالک (مثلاً فلسطین، کشمیر اور الجزائر وغیرہ) میں سفاک و خونخوار دشمن کے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور کئی ممالک میں مسلمان سالہا سال سے جور و جفا کی چکی میں پس رہے ہیں تو ان کی نصرت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جب ہم جہاد بالسیف وغیرہ جیسی تدابیر کے ساتھ صف آراء ہیں تو ہمیں قنوتِ نازلہ جیسے مجرب ہتھیار سے بھی کام لینا چاہیے۔ تمام مسلمان اپنی نمازوں میں رکوع کے بعد ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کہہ کر سجدہ میں جانے سے پہلے مجاہدین اور مظلوم مسلمانوں کے لیے دعا کریں۔ دعا کرتے وقت امام مختلف دعائیں پڑھے جب کہ پیچھے مقتدی آمین کہیں۔ قنوت نازلہ سے مقصود مظلوم و مقہور مسلمانوں کی نصرت و کامیابی اور سفاک و جابر دشمن کی ہلاکت و بربادی ہے۔ اس

لیے اس مقصد کو جو دعا بھی پورا کرے وہ مانگی جاسکتی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَ الصَّحِيحُ اَنَّهُ لَا يَتَعَيَّنُ فِيهِ دُعَاءٌ مَخْصُوصٌ بَلْ يُحْصَلُ بِكُلِّ دُعَاءٍ وَ فِيهِ وَجْهٌ اَنَّهُ لَا يُحْصَلُ اِلَّا بِالدُّعَاءِ الْمَشْهُوْرِ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيمَنْ هَدَيْتَ اِلٰى آخِرِهِ وَالصَّحِيحُ اَنَّ هٰذَا مُسْتَحَبٌّ لَا شَرْطٌ " [شرح مسلم(۲۳۷/۱)]

"صحیح بات یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی مخصوص دعا متعین نہیں بلکہ ہر اس دعا کو پڑھا جاسکتا جس سے یہ مقصود حاصل ہو اور « اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيمَنْ هَدَيْتَ ......الخ » پڑھنا مستحب ہے شرط نہیں۔"

یاد رہے کہ اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ یہ مذکورہ دعا بھی پڑھی جائے اور اس کے بعد وہ دعائیں بھی پڑھی جائیں جو اس معنی کی قرآن مجید اور حدیث نبوی میں موجود ہیں۔ مختلف دعائیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمہم اللہ سے ثابت ہیں جیسا کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جب رمضان المبارک میں تراویح پڑھاتے تو ہنگامی حالات کے پیش نظر مخالفین اسلام کے لیے بد دعا کرتے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور مسلمانوں کے لیے استغفار کرتے تھے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« وَ كَانَ يَلْعَنُ الْكَفَرَةَ فِي النِّصْفِ اَللّٰهُمَّ قَاتِلِ الْكَفَرَةَ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِكَ وَ يُكَذِّبُوْنَ رُسُلَكَ وَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِوَعْدِكَ وَ خَالِفْ بَيْنَ كَلِمَتِهِمْ وَ اَلْقِ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ وَ اَلْقِ عَلَيْهِمْ رِجْزَكَ وَ عَذَابَكَ اِلٰهَ الْحَقِّ ثُمَّ يَسْتَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ » [ابن خزيمة(۱۵۶/۱۵۵/۲)، قيام رمضان للألباني (ص/۳۲)]

" نصف رمضان میں کافروں پر لعنت کرتے اور کہتے:" اے اللہ! ان کافروں کو جو تیرے راستے سے روکتے ہیں اور تیرے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں اور تیرے وعدوں پر ایمان نہیں لاتے، تباہ کر دے اور ان کے کلمات میں مخالفت ڈال دے اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دے اور ان پر عذاب و سزا نازل فرما۔" پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتے اور مسلمانوں کے لیے اپنی استطاعت سے بھلائی کی دعا کرتے اور مومنوں کے لیے استغفار کرتے۔"

قنوت نازلہ میں ہاتھ اٹھانا درست ہے

سوال کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قنوتِ نازلہ میں ہاتھ اٹھایا کرتے تھے؟

جواب قنوت نازلہ کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کے بعد ہاتھ اٹھا کر ہی دعا مانگتے تھے جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« فَلَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِيْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ فَدَعَا عَلَيْهِمْ »

[مسند احمد(۱۳۷/۳)، اس روایت کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔[ارواء الغليل]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو صبح کی نماز میں دیکھا کہ آپ نے ہاتھ اٹھائے اور دشمنان اسلام پر بد دعا کی۔''

یاد رہے کہ دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے متعلق کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ اس کے متعلق جتنی روایات مروی ہیں وہ سب کی سب ضعیف ہیں، جو قابل حجت نہیں۔ امام بیہقی ؒ نے '' السنن الصغریٰ'' میں لکھا ہے '' فَإِنَّهَا مِنَ الْمُحْدَثَاتِ '' کہ یہ عمل بدعات میں سے ایک بدعت ہے۔

نمازِ تہجد میں سورۂ اخلاص کی مخصوص تعداد میں قراءت

سوال کیا تہجد کی بارہ رکعات اس طرح پڑھی جا سکتی ہیں کہ پہلی دو رکعات میں سے پہلی رکعت میں سورۂ اخلاص بارہ مرتبہ اور دوسری رکعت میں گیارہ مرتبہ پڑھے پھر دو رکعات میں سے پہلی میں دس بار اور دوسری میں نو بار۔ اسی طرح جب رکعتیں کم ہوتی جائیں تو سورۂ اخلاص پڑھنے کی تعداد بھی کم ہوتی جائے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کریں۔

جواب نماز کے اندر سورۂ فاتحہ کے بعد انسان جتنی چاہے قراءت حسب استطاعت کر سکتا ہے جیسا کہ آپ نے ایک آدمی کو نماز کی تعلیم دیتے ہوئے کہا:

''جب تم قبلہ رو ہو جاؤ تو سورۂ فاتحہ پڑھو اور اس کے بعد جو چاہو قراءت کرو۔'' [ابن حبان]

لیکن تہجد کی نماز میں مذکورہ سورت کی تخصیص میں کوئی صحیح حدیث ہمیں معلوم نہیں، یہ کسی انسان کی ذاتی اختراع معلوم ہوتی ہے۔

نمازِ عید کے لیے عورتوں کا عیدگاہ جانا

سوال کیا نماز عیدین کے لیے عورتوں کا عیدگاہ میں جانا ضروری ہے؟

جواب عیدین کی نماز میں عورتوں کی شرکت لازمی ہے، جو عورتیں ایام ماہواری میں بھی ہوں وہ بھی عیدگاہ کی طرف جائیں، وہ اگرچہ نماز ادا نہیں کریں گی لیکن مسلمانوں کی دعاؤں میں شرکت کریں گی۔ ام عطیہ ؓ کہتی ہیں:

''ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم عیدین کے دن حیض والی اور پردہ دار دوشیزاؤں کو لے کر آئیں تا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت اور ان کی دعا میں شریک ہو جائیں اور حائضہ عورتیں نماز والی جگہ سے علیحدہ رہیں، ایک عورت نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کسی کے پاس بڑی چادر نہ ہو تو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے اس کے ساتھ والی چادر اوڑھا دے۔'' [بخاری ، کتاب الصلوٰة: باب وجوب الصلوة فی الثیاب: (٣٥١)، مسلم ، کتاب صلوٰة العیدین : باب ذکر اباحة النساء فی العیدین إلی المصلی: (٨٩٠)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ خواتین کو عیدین کی نماز ادا کرنے کے لیے عیدگاہ کی طرف جانا چاہیے، اگر عورت کے ایام ماہواری شروع ہو جائیں تب بھی وہ عیدگاہ کی طرف جائے گی، مسلمانوں کی دعا میں شرکت کرے گی، امام ابن قدامہ مقدسی ؒ نے اپنی کتاب ''المغنی'' میں یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد بعض ایسے حضرات کے اقوال نقل کیے ہیں جو عورتوں کے

لیے عید گاہ کی طرف جانا پسند نہیں کرتے، پھر اس کے متعلق انتہائی جامع اور مؤثر تبصرہ یوں کیا ہے:

''رسول اللہ ﷺ کی سنت سب سے زیادہ اتباع کی حق دار ہے۔'' (المغنی: ٤/٢٦٥)

اسی لیے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں خواتین عید گاہ میں حاضر ہوتی تھیں۔ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں:

''نبی ﷺ عید الفطر کے دن اٹھے، پہلے نماز ادا کی پھر خطبہ دیا، جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو عورتوں کے پاس تشریف لے گئے آپ ﷺ نے انھیں نصیحت کی اور آپ ﷺ بلال رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ٹیک لگائے ہوتے تھے۔''

[صحیح بخاری ، کتاب العیدین : باب المشی والرکوب الی العید (٩٦١)]

الغرض اس معنی کی کئی ایک احادیث صحیحہ موجود ہیں کہ عورتوں کو نماز عید کی ادائیگی کے لیے عید گاہ کی طرف جانا چاہیے۔

نماز عید کہاں ادا کی جائے؟

سوال کیا نماز عید مسجد میں ادا کرنی چاہیے یا مسجد سے باہر کھلے میدان میں؟ کتاب وسنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب رسول اکرم ﷺ کی سنت یہ ہے کہ نماز عید عید گاہ میں ادا کی جائے، آپ ﷺ عید والے دن مدینہ سے نکل کر باہر عید گاہ میں نماز ادا کرتے تھے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ کی طرف نکلتے تھے۔'' [صحیح بخاری، کتاب العیدین: باب الخروج الی المصلی بغیر منبر (٩٥٦)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ''اخبار المدینہ'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''المصلیٰ (عید گاہ)'' مدینہ میں ایک معروف جگہ ہے، اس کے اور مسجد کے دروازے کے درمیان ایک ہزار ہاتھ کی مسافت ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ عید گاہ کی طرف نکلتے تھے تو آپ ﷺ کے ساتھ ایک نیزہ ہوتا جسے آپ کے آگے عید گاہ میں نصب کیا جاتا، آپ اس کی طرف نماز ادا کرتے تھے۔''[صحیح بخاری، کتاب العیدین: باب حمل العنزة أو الحربة بین یدی الامام یوم العید: (٩٧٣)]

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ ہے کہ نماز مسجد کی بجائے عید گاہ میں پڑھی جائے، البتہ عذر کی صورت میں مسجد میں ادا کی جا سکتی ہے، اس کے بارے میں روایت تو ضعیف ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ بارش کی صورت میں مسجد میں نماز عید ادا کی لیکن امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے عید کے دن بارش کی بنا پر لوگوں کو مسجد میں نماز عید پڑھائی۔''

[المحلیٰ (١٢٨/٥)، (١٢٩)]

لہٰذا عذر کی وجہ سے نماز عید مسجد میں ادا کی جا سکتی ہے۔

عید کے دن روزہ رکھنا

(سوال) عید والے دن روزہ رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کئی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عید والے دن قربانی کرنے تک روزہ ہوتا ہے۔

(جواب) عید والے دن روزہ رکھنے کی شریعت میں ممانعت ہے۔ ابو عبید مولیٰ ابن ازہر سے روایت ہے کہ میں عید کے دن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے کہا:

''ان دو دنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے سے منع کیا ہے یعنی تمہارے روزے چھوڑنے کا دن اور دوسرا دن جس میں تم اپنی قربانی (کے گوشت) سے کھاتے ہو۔'' [بخاری، كتاب الصوم: باب صوم يوم الفطر: (١٩٩٠)]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ حدیث عیدین کے دونوں دنوں میں روزے رکھنے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے، وہ روزے خواہ نذر کے ہوں یا کفارہ کے یا نفلی یا حج تمتع کے اور اس بات پر اجماع ہے۔'' [فتح الباری: (٤/ ٢٣٩)]

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو روزوں سے منع کیا ہے یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دنوں کے۔'' [صحيح مسلم، كتاب الصيام: باب تحريم صوم يومي العيدين: (١١٤٠)]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان دو دنوں میں کسی بھی قسم کے روزے رکھنے کے حرام ہونے پر علماء کا اجماع ہے، خواہ کوئی شخص نذر کا روزہ رکھے یا نفلی روزہ رکھے یا بطور کفارہ روزہ رکھے یا کسی اور نیت سے رکھے۔''

علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

''ان دو دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت میں حکمت یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے لیے تیار کردہ ضیافت سے اعراض ہے''۔ [نيل الاوطار (٤/ ٣٥١)، (٣٥٢)]

ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں بال اور ناخن نہ اتروانا

(سوال) کیا صاحب قربانی کے لیے ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں بال اور ناخن اتروانا جائز ہے؟ اور جس نے قربانی نہ کرنی ہو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

(جواب) جو آدمی قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اسے ذی الحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد بال یا ناخن کاٹنے سے باز رہنا چاہیے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جب تم ذی الحجہ کا چاند دیکھ لو اور تمہارا قربانی کرنے کا ارادہ ہو تو بالوں اور ناخنوں کو تراشنے سے رک جاؤ۔''
[صحیح مسلم، کتاب الاضاحی: باب نهی من دخل علیه عشر ذی الحجة ......الخ (۱۹۷۷)]
اور جس شخص نے قربانی نہ کرنی ہو وہ عید والے دن اگر ناخن تراش لے، بال اتار لے، مونچھیں کاٹ لے، زیر ناف بال اتار لے تو اسے بھی قربانی کا ثواب مل جاتا ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
''مجھے یوم الاضحیٰ کو عید کا حکم دیا گیا ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے مقرر کیا ہے۔'' ایک آدمی نے کہا:
''آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر میں قربانی کے لیے دودھ دینے والی بکری کے سوا نہ پاؤں تو کیا اس کی قربانی کروں؟''
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں لیکن تم اپنے بال، ناخن تراش لینا اور اپنی مونچھیں کاٹنا اور شرمگاہ کے بال مونڈ دینا، اللہ کے ہاں یہ تیری پوری قربانی شمار ہوگی۔'' [ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب ما جاء فی ایجاب الاضاحی: (۲۷۸۹)، نسائی، کتاب الضحایا: باب من لم یجد الاضحیة: (۴۳۷۰)]
اسے امام ابن حبان (۲۰۴۳)۔ اور امام حاکم (۴/۲۲۳) اور امام ذہبی نے صحیح کہا ہے، اس کی سند میں عیسیٰ بن ہلال الصدفی صدوق ہے۔ جس کی وجہ سے یہ حدیث حسن ہے۔ [تقریب مع تحریر: (۳/۱۴۵)]
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس نے قربانی نہ کرنی ہو وہ عید والے دن اپنے بال اور ناخن تراش لے تو اس کو بھی اللہ کے ہاں سے پوری قربانی کا ثواب مل جائے گا۔

نماز اشراق کا بیان

سوال نمازِ اشراق کسے کہتے ہیں اور اس کا صحیح وقت کونسا ہے؟
جواب اشراق کے معنی ''طلوع آفتاب'' یعنی جب آفتاب طلوع ہو کر ذرا بلند ہو تو اس وقت نوافل ادا کرنا نماز اشراق کہلاتا ہے۔ قاسم شیبانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:
« اَنَّ زَيْدَ بْنَ اَرْقَمَ رَاٰى قَوْمًا يُصَلُّوْنَ مِنَ الضُّحٰى فَقَالَ اَمَا قَدْ عَلِمُوْا اَنَّ الصَّلَاةَ فِيْ غَيْرِ هٰذِهِ السَّاعَةِ اَفْضَلُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ : صَلَاةُ الْاَوَّابِيْنَ حِيْنَ تَرْمِضُ الْفِصَالَ » [مسلم ، کتاب صلاة المسافرین و قصرها : باب صلاة الأوابین حین ترمض الفصال (۷۴۸) ، بیهقی(۳/۴۹)]
''سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے ایک قوم کو صلاۃ الضحیٰ پڑھتے دیکھا تو فرمایا: ''کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ نماز اس وقت کے علاوہ وقت میں افضل ہے؟ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صلاۃ الاوابین اس وقت ہے جب شدت گرمی کی وجہ سے اونٹ کے بچوں کے پاؤں جلتے ہیں۔''
ایک دوسری حدیث میں ہے:

« خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَلٰى اَهْلِ قُبَاءٍ وَ هُمْ يُصَلُّوْنَ الضُّحٰى فَقَالَ صَلَاةُ الْاَوَّابِيْنَ اِذَا رَمَضَتِ الْفِصَالُ مِنَ الضُّحٰى » [احمد (٣٦٦/٤)، بيهقى(٤٩٠/٣)، طبرانى كبير (٢٣٤/٥)، صحيح ابن خزيمة (١٢٢٧)، شرح السنة (١١٤٥/٤)، ابن ابى شيبة(٤٠٦/٢)، إرواء الغليل (٢٢٠/٢)]

''رسول اللہ ﷺ اہل قبا پر نکلے، وہ صلاۃ الضحیٰ پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: صلاۃ الاوابین اس وقت ہے جب دھوپ کی شدت کی وجہ سے اونٹ کے بچوں کے پاؤں جلتے ہیں۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ''صلاۃ الضحیٰ'' یعنی نماز اشراق اول وقت کی بجائے اچھی طرح دھوپ میں پڑھنا افضل ہے۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری ﷾ فرماتے ہیں: ''یہ وقت نصف النہار سے کچھ پہلے ہے۔'' [منة المنعم (٤٧١/١)]

اور اسے ہی نبی ﷺ نے ''صلاۃ الاوابین'' قرار دیا ہے۔ اوابین اواب کی جمع ہے اور اواب وہ شخص ہے جو اخلاص اور عمل صالح کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی کے لیے اللہ کی طرف کثرت سے رجوع کرنے والا ہوتا ہے۔ نصف النہار سے کچھ دیر پہلے عام طور پر لوگوں کے لیے استراحت و آرام کا وقت ہوتا ہے اور اواب شخص راحت وسکون کو پس پشت ڈال کر اللہ کی عبادت میں لگ جاتا ہے، اس لیے یہ وقت صلاۃ الضحیٰ کا افضل وقت قرار دیا گیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يُحَافِظُ عَلَى الصَّلَاةِ الضُّحٰى اِلَّا اَوَّابٌ قَالَ وَ هِيَ صَلَاةُ الْاَوَّابِيْنَ » [صحيح ابن خزيمة (١٢٢٤)، مستدرك حاكم(٣١٤/١)، سلسلة الأحاديث الصحيحة(١٩٩٤، ٧٠٣)، مجمع الزوائد (٢٣٩/٢)، طبرانى أوسط(٣٨٧٧)]

''صلاۃ الضحیٰ کی اواب ہی حفاظت کرتا ہے'' اور فرمایا: ''یہی صلاۃ الاوابین ہے۔''

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ صلاۃ الضحیٰ کا دوسرا نام صلاۃ الاوابین ہے۔

عام اہل علم نے نماز اشراق کو صلاۃ الضحیٰ ہی قرار دیا ہے البتہ بعض نے فرق کیا ہے۔ مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری ؒ نے ذکر کیا ہے: ''صلاۃ الاشراق ضحوہ صغریٰ میں اور صلاۃ الضحیٰ ضحوہ کبریٰ میں ادا کی جاتی ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے جن احادیث میں نماز اشراق کی ترغیب دی ہے ان میں ہے کہ فجر کی نماز کے بعد بیٹھ کر انسان انتظار کرتا رہے حتیٰ کہ سورج نکل آئے پھر دو رکعت پڑھے۔

ملا علی قاری نے کہا ہے کہ تحقیق یہ ہے کہ صلاۃ الضحیٰ کا اول وقت وہ ہے جب کراہت کا وقت چلا جائے اور اس کا آخری وقت زوال سے پہلے کا ہے، لہٰذا جو اول وقت میں نماز ادا ہوئی اسے صلاۃ الاشراق اور جو اس کے آخری وقت تک ادا ہوئی اسے صلاۃ الضحیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ ایک روایت میں ہے:

''جب سورج اپنے مطلع سے نکل کر ایک دو نیزوں کی مقدار تک بلند ہو جاتا ہے جیسے سورج ڈوبنے سے پہلے نماز عصر کی مقدار تک ہوتا ہے تو نبی کریم ﷺ دو رکعت پڑھتے پھر مہلت رکھتے یہاں تک کہ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو آپ ﷺ چار رکعات نماز پڑھتے۔'' [نسائى فى السنن الكبرىٰ (١٧٨/١)]

امام ترمذی ﷫ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ صلاۃ الضحیٰ اور صلاۃ الاشراق میں فرق اس لحاظ سے ہے کہ سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد نماز ادا کریں تو اسے صلاۃ الاشراق کہتے ہیں اور اگر سورج اچھی طرح بلند ہو، دھوپ کی شدت ہو جائے اور زوال سے قبل نماز پڑھیں تو یہ صلاۃ الضحیٰ ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز مغرب کے بعد چھ رکعات کی ادائیگی کو صلاۃ الاوابین قرار دینا ثابت نہیں۔ جیسا کہ بعض احناف کا یہ موقف ہے بلکہ یہ بات سابقہ صحیح احادیث کے خلاف ہے کیونکہ ان میں ''صلاۃ الضحیٰ'' ہی کو ''صلاۃ الاوابین'' کہا گیا ہے۔

نماز استخارہ کا طریقہ

سوال استخارہ کا صحیح طریقہ کیا ہے اور کیا کسی دوسرے شخص سے استخارہ کروایا جا سکتا ہے؟

جواب جب کسی جائز کام کے کرنے کا ارادہ ہو تو ایسے موقع پر استخارہ کرنا سنت ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نماز ادا کرے، اس کے بعد یہ دعا مانگے:

« اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡتَخِیۡرُكَ بِعِلۡمِكَ وَ اَسۡتَقۡدِرُكَ بِقُدۡرَتِكَ وَ اَسۡئَلُكَ مِنۡ فَضۡلِكَ الۡعَظِيۡمِ فَاِنَّكَ تَقۡدِرُ وَ لَا اَقۡدِرُ وَ تَعۡلَمُ وَ لَا اَعۡلَمُ وَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ اَللّٰهُمَّ اِنۡ كُنۡتَ تَعۡلَمُ اَنَّ هٰذَا الۡاَمۡرَ خَيۡرٌ لِّیۡ فِیۡ دِيۡنِیۡ وَ مَعَاشِیۡ وَ عَاقِبَةِ اَمۡرِیۡ فَاقۡدُرۡهُ لِیۡ وَ يَسِّرۡهُ لِیۡ ثُمَّ بَارِكۡ لِیۡ فِيۡهِ وَ اِنۡ كُنۡتَ تَعۡلَمُ اَنَّ هٰذَا الۡاَمۡرَ شَرٌّ لِّیۡ فِیۡ دِيۡنِیۡ وَ مَعَاشِیۡ وَ عَاقِبَةِ اَمۡرِیۡ فَاصۡرِفۡهُ عَنِّیۡ وَ اصۡرِفۡنِیۡ عَنۡهُ وَ اقۡدُرۡ لِیَ الۡخَيۡرَ حَيۡثُ كَانَ ثُمَّ رَضِّنِیۡ بِهٖ» [بخاری، کتاب التهجد: باب ما جآء فی التطوع مثنی مثنی (۱۱٦۲)]

یہ استخارہ دن یا رات میں کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بعض لوگوں نے استخارے کو ایک کاروبار بنا لیا ہے اور یہ طریقہ ایک وبا کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ لوگوں نے جگہ جگہ استخارہ کے اڈے بنا لیے ہیں حالانکہ مسنون تو یہ ہے کہ آدمی خود استخارہ کرے، کسی دوسرے سے استخارہ کروانا نبی ﷺ یا صحابہ کرام ﷢ سے ثابت نہیں ہے۔ استخارہ کروانے والوں نے پھر یہ اعتقاد بنا لیا ہے کہ فلاں بزرگ سے استخارہ کراؤں گا تو مجھے کوئی پکی بات مل جائے گی، جس پر میں عمل کرلوں گا اور وہ خواب دیکھ کر صحیح صورتحال سے آگاہ کر دیں گے۔ حالانکہ استخارہ ضرورت مند آدمی اللہ وحدہ لا شریک لہ سے کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا سینہ کھول دے گا اور کسی جانب اس کی توجہ مبذول کر دے گا۔ اچھے کام کے لیے استخارہ کے علاوہ اصحاب الخیر سے مشورہ بھی جاری رکھنا چاہیے۔

رکعاتِ نماز تراویح کی تعداد

سوال نبی ﷺ اور صحابہ کرام ﷢ کے عمل سے کتنی رکعات تراویح ثابت ہیں؟ وضاحت فرما دیں۔

(جواب) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

« مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَ احْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ » [بخاری، کتاب الایمان: باب تطوع قیام رمضان فی الایمان(۳۷)، مسلم(۷۶۰)]

''جس نے رمضان المبارک کا قیام ایمان اور ثواب سمجھ کر کیا، اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے۔''

نماز تراویح کو قیام رمضان، صلاۃ فی رمضان، قیام اللیل اور صلاۃ اللیل وغیرہ کہا جاتا ہے اور اس کا وقت نماز عشاء سے لے کر نماز فجر تک ہے، رات کے کسی بھی حصے میں پڑھی جا سکتی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ فِيْمَا بَيْنَ اَنْ يَّفْرُغَ مِنْ صَلَاةِ الْعِشَاءِ اِلَى الْفَجْرِ اِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً وَ يُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَ يُوْتِرُ بِوَاحِدَةٍ » [مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا: باب صلاۃ اللیل و عدد رکعات النبی فی اللیل(۷۳۶)]

''نبی کریم ﷺ نماز عشاء اور نماز فجر کے درمیان گیارہ رکعت ادا کرتے تھے اور ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے اور ایک رکعت وتر ادا کرتے۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« مَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَزِيْدُ فِيْ رَمَضَانَ وَ لَا فِيْ غَيْرِهِ عَلٰى اِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً » [مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا: باب صلاۃ اللیل و عدد رکعات النبی فی اللیل (۷۳۸)]

''رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔''

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو گیارہ رکعت پڑھانے کا حکم دیا۔[مؤطا (۱/۱۱٤)، بیھقی (۲/٤۹٦)]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ گیارہ رکعت تراویح ادا کرتے تھے۔[سنن سعید بن منصور بحوالہ التعلیق الحسن (۱/۳۹۲)، الحاوی للفتاوی(۱/۳٤۹)]

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اٰخُذُ لِنَفْسِيْ فِيْ قِيَامِ رَمَضَانَ هُوَ الَّذِيْ جَمَعَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَلَيْهِ النَّاسَ اِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً وَ هِيَ صَلَاةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ لَا اَدْرِيْ مَنْ اَحْدَثَ هٰذَا الرُّكُوْعَ الْكَثِيْرَ " [الصلاۃ والتھجد(ص/۲۸۷)، لعبد الحق الأشبیلی]

''تراویح کے متعلق جو بات میں اپنے لیے اختیار کرتا ہوں، وہ گیارہ رکعت ہے جس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا تھا اور یہی رسول اللہ ﷺ کی نماز تھی اور میں نہیں جانتا کہ کس نے یہ (گیارہ رکعات سے) زیادہ نماز ایجاد کی ہے۔''

مذکورہ بالا صحیح احادیث و آثار اور امام مالک رحمہ اللہ کی وضاحت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی سنت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل مبارک گیارہ رکعت تراویح ہی کا ہے اور اسی کو امام مالک رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔

تراویح کے امام کے علاوہ دوسرے امام کا وتر پڑھانا

سوال نماز تراویح میں یہ عمل دیکھنے میں آیا ہے کہ تراویح ایک امام پڑھاتا ہے جبکہ وتر کی جماعت دوسرا امام کراتا ہے، کیا یہ عمل قرآن و سنت کے مطابق ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ سے امام کے لیے جو شرائط ملتی ہیں ان میں یہ بات کہیں بھی موجود نہیں کہ تراویح اور وتر کے لیے ایک امام ہونا چاہیے، کوئی بھی صحیح العقیدہ امام ہو اس کی اقتداء میں نماز ادا کر لیں۔ تراویح اور وتر کی ایک امام بھی جماعت کروا سکتا ہے اور الگ الگ امام بھی، اس میں کوئی قباحت نہیں۔

صدقہ فطر ادا کرنے کا صحیح وقت

سوال فطرانہ یعنی صدقہ عیدالفطر نماز عید سے کتنے روز پہلے دیا جا سکتا ہے اور کیا پہلے ادا کرنا ضروری ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ نے صدقہ فطر نماز عید سے پہلے نکالنے کا حکم دیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ اَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَ الْحُرِّ وَ الذَّكَرِ وَ الْاُنْثٰى وَ الصَّغِيْرِ وَالْكَبِيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ اَمَرَ بِهَا اَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ اِلَى الصَّلَاةِ » [بخاری، کتاب الزکوٰۃ: باب فرض صدقة الفطر (۱۵۰۳)، مسلم (۹۸٤)]

”رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو مسلمانوں کے غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے پر فرض کیا ہے اور لوگوں کو نماز عید کی طرف نکلنے سے پہلے اس کے ادا کرنے کا حکم فرمایا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر نماز عید سے پہلے نکالنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عید سے ایک یا دو دن پہلے صدقہ فطر نکال دیتے تھے۔ جیسا کہ صحیح روایت میں مذکور ہے: « وَ كَانُوْا يُعْطُوْنَ قَبْلَ الْفِطْرِ بِيَوْمٍ اَوْ يَوْمَيْنِ »
”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عید الفطر سے ایک یا دو دن پہلے صدقہ فطر دے دیتے تھے۔“ [بخاری ، کتاب الزکوة: باب صدقة الفطر علی الحر والمملوك (۱۵۱۱)]

نافع رحمہ اللہ سے روایت ہے:

« اَنَّ ابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانَ يَبْعَثُ زَكٰوةَ الْفِطْرِ اِلَى الَّذِيْ يَجْمَعُ عِنْدَهُ قَبْلَ الْفِطْرِ بِيَوْمَيْنِ اَوْ ثَلَاثَةٍ » [فتح الباری (۳/۳۷٦)]

"سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عید الفطر سے دو یا تین دن پہلے صدقہ فطر اس آدمی کی طرف بھیج دیتے تھے جو صدقہ جمع کرتا تھا۔"

اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی صدقہ فطر جمع کرنے کی ذمہ داری لگائی اور شیطان تین راتیں مسلسل ان کے جمع کردہ ڈھیر سے چوری کے لیے آتا رہا، بالآخر اس نے تیسری مرتبہ آیت الکرسی بتا کر جان چھڑائی۔ [بخاری، کتاب الوكالة: باب إذا وكل رجلا فترك الوكيل شيئًا(٢٣١١)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَ يَدُلُّ عَلٰى ذٰلِكَ اَيْضًا مَا اَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ فِي الْوَكَالَةِ وَ غَيْرِهَا عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ وَكَّلَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِحِفْظِ زَكَاةِ رَمَضَانَ .... اَلْحَدِيْثُ وَ فِيْهِ اَنَّهُ اَمْسَكَ الشَّيْطَانَ ثَلَاثَ لَيَالٍ وَهُوَ يَأْخُذُ مِنَ التَّمْرِ فَدَلَّ عَلٰى اَنَّهُمْ كَانُوْا يُعَجِّلُوْنَهَا "

[فتح الباری(٣/٣٧٦-٣٧٧)]

"نماز عید سے دو تین دن پہلے صدقہ فطر نکالنے پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے "کتاب الوكالة" وغیرہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر کی حفاظت پر مامور فرمایا۔ اس حدیث میں ہے کہ انھوں نے تین راتیں مسلسل شیطان کو کھجوریں چوری کرتے ہوئے پکڑا۔ اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ صحابہ کرام صدقہ فطر نکالنے میں جلدی کرتے تھے۔"

لہٰذا نماز عید سے دو تین دن پہلے صدقہ فطر ادا کرنا زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

WWW. KITABOSUNNAT.COM

نماز کے متفرق مسائل کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

نماز میں قضائے حاجت کا مسئلہ

(سوال) اگر کسی آدمی کو حالت نماز میں پیشاب تنگ کر رہا ہو تو کیا ایسی صورت میں نماز ادا کرنا درست ہے؟

(جواب) حالت نماز میں اگر پیشاب کی حاجت ہو جائے تو نماز ترک کر کے قضائے حاجت کی جائے پھر نماز ادا کر لی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

« لَا صَلٰوۃَ بِحَضْرَۃِ الطَّعَامِ وَلَا هُوَ يُدَافِعُهُ الْأَخْبَثَانِ » [مسلم ، كتاب المساجد : باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام (٥٦٠)]

''کھانے کی موجودگی میں اور جب دو خبیث ترین چیزیں تنگ کر رہی ہوں تو نماز نہیں ہوتی۔''

دو خبیث ترین چیزوں سے مراد پیشاب و پاخانہ ہیں۔ اسی طرح زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا اَرَادَ اَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلْيَبْدَأْ بِهِ قَبْلَ الصَّلٰوۃِ » [مؤطا (١/١٥٩) ،احمد (٣/٤٨٣)]

''جب تم میں سے کوئی ایک پاخانہ کرنا چاہتا ہو تو وہ اسے نماز سے پہلے کر لے۔''

لہٰذا پہلے قضائے حاجت کر لی جائے پھر نماز پڑھی جائے تاکہ نماز اطمینان و سکون سے ادا کی جا سکے۔

جوتے پہن کر نماز پڑھنا

(سوال) جوتے پہن کر نماز ادا کرنا ٹھیک ہے اور کیا یہ واجب ہے؟

(جواب) جوتے اگر پاک اور صاف ستھرے ہوں، ان کے نیچے گندگی نہ لگی ہو تو پھر ان میں نماز پڑھنا درست ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا جَآءَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَنْظُرْ فَاِنْ رَاٰى فِىْ نَعْلَيْهِ قَذَرًا اَوْ اَذًى فَلْيَمْسَحْهُ وَ لْيُصَلِّ فِيْهِمَا »

[ابو داؤد، كتاب الصلاة: باب الصلاة فى النعل (٦٥٠)]

''جب بھی تم میں سے کوئی آدمی مسجد کی طرف آئے تو وہ دیکھے اگر اس کے جوتوں میں کوئی گندگی وغیرہ لگی ہو تو اسے صاف کرے اور ان میں نماز پڑھے۔''

سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« خَالِفُوا الْيَهُودَ فَإِنَّهُمْ لَا يُصَلُّونَ فِي نِعَالِهِمْ وَ لَا خِفَافِهِمْ » [ابو داؤد، کتاب الصلاۃ: باب الصلاۃ فی النعل(٦٥٢)]

''یہودیوں کی مخالفت کرو، وہ اپنے جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے۔''

یہ حکم وجوب کے لیے نہیں کیونکہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ننگے پاؤں بھی اور جوتوں میں بھی نماز پڑھتے تھے۔[ابوداؤد، کتاب الصلاۃ : باب الصلاۃ فی النعل (٦٥٣)]

نماز میں آستینیں چڑھانا

سوال نماز میں قمیص کی آستینوں کی کفوں کو اوپر چڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ صحیح حدیث کی رو سے واضح کریں۔

جواب قمیص کی کفیں چڑھا کر نماز پڑھنا سخت منع ہے جیسا کہ امام المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں حدیث بیان کی ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے (اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے) کہ نماز میں نہ بالوں کا جوڑا بناؤ اور نہ کپڑوں کو اکٹھا کرو۔''[صحیح بخاری، کتاب الأذان : باب السجود علی السبعة، (٨١٠)]

نماز کے دوران اکثر و بیشتر افراد کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بالوں یا کپڑوں کو درست کرتے رہتے ہیں، یہ امور نماز کے منافی ہیں، جب نماز ادا کر رہے ہوں تو ساری توجہ اور دھیان عبادت میں ہونا چاہیے اور ان تمام حرکات سے اجتناب کرنا چاہیے جن کا نماز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مباشرت کے دوران پہنے گئے کپڑوں میں نماز کا حکم

سوال وہ کپڑے جنھیں پہن کر مباشرت کی گئی، کیا انھیں ہوئے نماز ادا کرنا صحیح ہوگا؟

جواب قرآن وسنت کی رو سے اپنی بیوی سے جن کپڑوں میں صحبت کی ہے اگر ان میں پلیدی نہیں لگی تو انہیں نماز پڑھی جاسکتی ہے، اگر کپڑے پر منی لگ جائے تو تری کی صورت میں دھو ڈالے۔ دھونے کے بعد اگر کپڑے میں نشان دکھائی دے تو کوئی حرج نہیں اور اگر منی خشک ہو تو اس کا کھرچ دینا ہی کافی ہے۔

۱۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

« سَأَلْتُ أُمَّ حَبِيبَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُصَلِّيْ فِي الثَّوْبِ الَّذِيْ يُجَامِعُهَا فِيْهِ ؟ فَقَالَتْ نَعَمْ إِذَا لَمْ يَرَ فِيْهِ أَذًى »[ابوداؤد، کتاب الطهارة: باب الصلاة فی الثوب الذی یصیب أهله فیه(٣٦٦)، نسائی(١/١٥٥)، ابن ماجه (١/١٩٢)،

دارمی(۱/۲٦۰)، احمد (٦/۳۲٥)، ابن خزیمة(۱/۳۸۰)، ابن حبان(۲۳۷)، بیهقی (۲/٤۱۰)]
''میں نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں، سے پوچھا: ''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کپڑے میں مجامعت کرتے تھے اس میں نماز پڑھ لیتے تھے؟'' تو انھوں نے کہا: ''ہاں! جب اس میں گندگی نہ دیکھتے۔''

۲۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كُنْتُ اَفْرُكُ الْمَنِيَّ مِنْ ثَوْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَيُصَلِّيْ فِيْهِ » [ابو داؤد، كتاب الطهارة: باب المني يصيب الثوب(۳۷۲) ، نسائی(۱/۱٥٦)، ابن ماجه(۱/۱۹۲)، احمد(٦/۳٥)، ابن خزيمة (۱/۱٤٦)، شرح السنة(۲/۸۹)]
''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کھرچ دیتی تھی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی میں نماز پڑھ لیتے تھے۔''

۳۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كُنْتُ اَغْسِلُهُ مِنْ ثَوْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ثُمَّ يَخْرُجُ اِلَى الصَّلَاةِ وَ اَثَرُ الْغَسْلِ فِيْهِ بُقَعُ الْمَاءِ » [بخاری، كتاب الوضو: باب إذا غسل الجنابة أو غيرها فلم يذهب أثره(۲۳۱)، ترمذی (۱/۲۰۱)، دارقطنی(۱/۱۲٥)، بیهقی(۲/٤۱۸)، شرح السنة(۲/۱۸۸)، ابن ماجه(٥۳٦)، احمد (٦/۱٤۲)]
''میں اسے (منی کے اثرات کو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے دھوتی تھی پھر آپ نماز کے لیے نکلتے اور کپڑے میں دھونے کے نشانات دکھائی دیتے۔''

ان تینوں احادیث سے معلوم ہوا کہ انسان جس کپڑے میں اپنی بیوی سے مباشرت کرے، وہی کپڑے پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے، اگر اس میں منی وغیرہ لگی ہو تو اسے دھو ڈالے یا کھرچ ڈالے۔ حالت جنابت میں لباس پہننے سے کپڑے پلید نہیں ہوتے۔

مرد کی ننگے سر نماز

سوال کیا آدمی کی ننگے سر نماز ہو جاتی ہے؟ دلیل سے وضاحت فرما دیں۔

جواب نماز میں ستر ڈھانپنا واجب ہے اور کندھوں پر بھی کسی چیز کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کپڑے شریعت میں ضروری طور پر ثابت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک کپڑے میں بھی نماز پڑھی ہے جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

محمد بن منکدر راوی کا بیان ہے کہ ایک دن میں جب جابر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو وہ ایک کپڑے کو جسم پر لپیٹے نماز پڑھ رہے تھے جب کہ دوسرا کپڑا قریب رکھا ہوا تھا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو کسی نے کہا: ''آپ ایک ہی کپڑے میں نماز ادا کر رہے ہیں جب کہ دوسرا کپڑا بھی آپ کے پاس موجود ہے۔'' انھوں نے کہا: ''ہاں! میں چاہتا ہوں کہ تمھارے جیسے جاہل مجھے دیکھ لیں۔'' پھر فرماتے ہیں:

« رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُصَلِّيْ كَذَا » [بخاری، كتاب الصلاة: باب الصلاة بغير رداء (۳۷۰)]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔''

صحیح بخاری کی دوسری روایت میں ہے:

« رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ یُصَلِّیْ فِیْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ مُشْتَمِلًا بِهِ فِیْ بَیْتِ اُمِّ سَلَمَةَ وَاضِعًا طَرَفَیْهِ عَلٰی عَاتِقَیْهِ » [بخاری ، کتاب الصلاة: باب الصلاة فی الثوب الواحد ملتحفًا به (٣٥٦)]

'' میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں نماز پڑھتے دیکھا، اس کپڑے کے دو کنارے آپ ﷺ کے کندھوں پر بندھے ہوئے تھے۔''

ہاں عورت کی نماز ننگے سر نہیں ہوتی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

« لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ اِلَّا بِخِمَارٍ » [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب المرأة تصلی بغیر خمار (٦٤١)، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے]

'' اللہ تعالیٰ بالغہ عورت کی نماز دوپٹا (اوڑھنی) کے بغیر قبول نہیں کرتا۔''

یہ حدیث بھی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مرد کی نماز ننگے سر ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ایسا کپڑا ضروری نہیں ورنہ نبی کریم ﷺ یہ کہہ دیتے کہ مرد اور عورت کی نماز ننگے سر نہیں ہوتی۔ حالانکہ کسی حدیث میں ایسے مذکور نہیں۔

اب دلائل سے کوئی یہ مت سمجھے کہ ایک کپڑے میں اس وقت نماز درست تھی جب مسلمانوں کے پاس کپڑے کم تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے وسعت دے دی تو سر ڈھانپنا واجب ہو گیا۔ اس بات کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ہم امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں، کیونکہ وہ یقیناً ہم سے بڑھ کر شریعت کو سمجھنے والے تھے۔ ایسے ہی حالات میں کسی شخص نے ان سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک سے زیادہ کپڑوں کو شمار کر لیا مگر اس میں سر ڈھانپنے والے کپڑوں کا نام ہی نہیں۔ [بخاری، کتاب الصلاة : باب الصلاة فی القمیص والسراویل (٣٦٥)]

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو تو فراخی و وسعت کے وقت بھی یہی بات سمجھ میں آئی کہ سر ڈھانپنا واجب نہیں۔ اب ان صحیح و مرفوع احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فہم کو ترک کرکے اپنی عقل کو سامنے رکھنا ہرگز انصاف نہیں۔

قبروں والی مسجدوں میں نماز

سوال ایسی مساجد جہاں قبریں ہوں، نماز پڑھنا جائز ہے؟ کیا نماز ادا ہو جائے گی؟

جواب ایسی مسجدیں جہاں قبریں ہوں وہاں نماز ادا کرنے سے اجتناب برتنا چاہیے۔ قبروں والی جگہ یا قبروں کی طرف منہ کرکے نماز ادا کرنے کے متعلق پہلے چند احادیث ملاحظہ فرمائیے:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبشہ کے ایک گرجے اور اس میں لگائی گئی تصویروں کا ذکر نبی ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِنَّ أُولٰئِكَ اِذَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا وَ صَوَّرُوْا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ فَأُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [بخاری ،کتاب الصلاة: باب هل تنبش قبور مشركی الجاهلية(٤٢٧)، مسلم(٥٢٨)، نسائی (٧٠٥)]

''بے شک جب ان میں کوئی نیک آدمی مر جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں تصویریں بناتے۔ یہ لوگ قیامت کے دن مخلوق میں سے اللہ کے ہاں بدترین ہوں گے۔''

(٢) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ» [بخاری، کتاب الجنائز: باب ماجاء فی قبر النبی ﷺ و أبی بكر و عمر رضی الله عنهما (١٣٩٠)، مسلم (٥٢٩)]

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔''

(٣) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِ هِمْ مَسَاجِدَ » [مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة: باب النهی عن بناء المساجد علی القبور(٥٣٠)]

''اللہ یہودیوں کو تباہ کرے جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔''

(٤) سیدنا جندب رضی اللہ عنہ سے طویل روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے قبل فرمایا:

« اَلَا وَ اِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِ هِمْ وَ صَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّیْ اَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ » [مسلم ، کتاب المساجد و مواضع الصلاة: باب النهی عن بناء المساجد علی القبور(٥٣٢)]

''خبردار! جو لوگ تم سے پہلے تھے (یہود و نصاریٰ) وہ اپنے نبیوں اور نیک لوگوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا، میں تمھیں اس کام سے روکتا ہوں۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ قبروں پر مسجدیں بنانا شرعاً حرام و ممنوع ہے تو ایسی مساجد میں نماز ادا کرنا بالاولیٰ منع ہے۔
اسے اس مثال سے سمجھیں کہ شراب کی خرید و فروخت منع ہے۔ اسی منع کے اندر شراب پینے کی حرمت بھی موجود ہے کیونکہ شراب کی خرید و فروخت ذریعہ ہے اور اس کا مقصود شراب نوشی کرنا ہے اور شرعی اصول یہ ہے کہ وسیلے کی حرمت اس ذریعے کے مقصود کو بھی شامل ہوتی ہے۔

اسی طرح مسجد بنانا ذریعہ ہے اور مقصود نماز ادا کرنا ہے۔ جب قبروں پر مسجدیں بنانا حرام ہے تو ان مساجد کے اندر نماز ادا کرنا بھی حرام ٹھہرے گا۔ مسجدیں بنانے کا جب شریعت نے حکم دیا ہے تو اس ضمن میں نماز پڑھنے کا حکم بھی موجود ہے کیونکہ مسجد بنانے کا مقصد نماز ادا کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے امام ابن حزم رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

'' مَنْ صَلّٰی فِیْ مَقْبَرَةٍ اَوْ اِلٰی قَبْرٍ اَعَادَ اَبَدًا '' [المحلی لابن حزم(٤/ ٢٧، ٢٨)]

”جس نے قبروں والی جگہ یا قبر کی طرف نماز ادا کی، وہ اپنی نماز کو ضرور لوٹائے۔“

سیدنا ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

« لَا تُصَلُّوْا اِلَى الْقُبُوْرِ وَ لَا تَجْلِسُوْا عَلَيْهَا »[مسلم، كتاب الجنائز : باب النهى عن الجلوس على القبر و الصلاة عليه(٩٧٢)، ابو يعلى (١٥١٤)، احمد(١٣٥/٤)، ترمذى(١٠٥٠)، ابوداؤد(٣٢٢٩)، نسائى (٧٦١)، ابن خزيمة (٧٩٣)، ابن حبان(٢٣١١)]

”قبروں کی طرف نماز ادا نہ کرو اور نہ ان پر بیٹھو۔“

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلْاَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ اِلَّا الْمَقْبَرَةَ وَ الْحَمَّامَ » [ترمذى، ابواب الصلاة: باب ما جآء أن الأرض كلها مسجد (٣١٧)، ابو داؤد(٤٩٢)، ابن ماجه (٧٤٥)، احمد(٨٣/٣)، دارمى(١٣٩٧)، كتاب الأم (٤٩٢/١)، ابن خزيمة(٧٩١)، ابن حبان (٣٣٨)، حاكم(٢٥١/١)]

”ساری زمین مسجد ہے سوائے قبروں والی جگہ اور حمام کے۔“

اس حدیث کو ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم اور ذہبی رحمہم اللہ نے صحیح کہا ہے۔ بعض ائمہ نے اسے معلل قرار دیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ مرسل اور موصول دونوں طرح سے مروی ہے اور موصول بیان کرنے والا راوی ثقہ ہے۔ جب مرسل و موصول کا جھگڑا ہو تو حکم موصول کا ہوتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں خاص طور پر امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک جب مرسل و موصول میں جھگڑا ہو تو حکم موصول کا ہوگا۔ [شرح مسلم(٢٥٦/١-٢٨٢)]

اسی طرح علامہ عراقی نے بھی یہی بات کی ہے۔ [شرح الفيه(٨٣/١)]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَهٰى اَنْ يُّصَلّٰى بَيْنَ الْقُبُوْرِ » [موارد الظمآن(٣٤٥)، مسند بزار (٤٤١)، مجمع الزوائد(٣٠/٢)، طبرانى أوسط(٥٦٢٧)، امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے امام بزار نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ اس کا ایک شاہد عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے صحیح ابن حبان میں موجود ہے۔ [موارد الظمآن (٣٤٢)، تلخيص الحبير(٢٧٧/١)، اور دوسرا شاہد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ابو داؤد(٤٩٠)، بيهقى (١٤٥١/٢) اور تلخيص الحبير(٢٧٧/١) میں موجود ہے]

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کے درمیان نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔“

سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِجْعَلُوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ مِنْ صَلَاتِكُمْ وَ لَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا » [بخارى، كتاب الصلاة: باب كراهية الصلاة فى المقابر(٤٣٢)، ترمذى(٤٥١) ، مسلم ، كتاب صلاة المسافرين و قصرها(٢٠٨)، مسند احمد (١٦/٢)، ابو داؤد (١٤٤٨)، ابن ماجه (١٣٧٧)]

”اپنی نماز کا کچھ حصہ گھروں میں ادا کیا کرو، انھیں قبرستان مت بناؤ۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِرَ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِیْ تُقْرَأُ فِيهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ »[مسلم ، كتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب استحباب صلاة النافلة فى بيته و جوازها فى المسجد و سواء فى هذا الراتبة و غيرها (۷۸۰)]

''اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ بے شک شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ قبروں والی جگہ نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے اور حدیث ابن عمرو اور ابی ہریرہ رضی اللہ عنہما میں جو گھروں کو قبرستان بنانے سے منع کیا ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ قبروں والی جگہ نماز نہیں پڑھی جاتی اور نہ قرآن پڑھا جاتا ہے، اس لیے تم گھروں کو قبرستان نہ بناؤ بلکہ نفل نمازیں گھروں میں پڑھ لیا کرو تاکہ یہ قبرستان نہ بنیں۔

امام سیوطی رحمہ اللہ حاشیہ نسائی میں فرماتے ہیں:" وَ لَا تَتَّخِذُوهَا قُبُوْرًا " کا مفہوم امام کرمانی رحمہ اللہ نے یہ ذکر کیا ہے: ''انھیں قبروں کی طرح نہ بناؤ کیونکہ قبروں میں نماز نہیں پڑھی جاتی۔''[حاشيه سندهى مع سيوطى على النسائى (۲۱۹/۳)]

اور اسی مقام پر علامہ سندھی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" اَیْ کَالْقُبُوْرِ فِی الْخُلُوِّ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَالصَّلَاةِ "

''گھروں کو قبروں کی طرح نہ بناؤ جہاں اللہ کا ذکر اور نماز نہیں ہوتی۔''

ان احادیث میں قبروں والی جگہ نماز پڑھنے کی ممانعت عام ہے خواہ قبر دائیں طرف ہو یا بائیں طرف، آگے ہو یا پیچھے اس لیے کہ منع کی حدیث عام ہے اور جب تک عموم کی تخصیص کتاب وسنت کی کسی دلیل سے نہ ہو عام کی دلالت باقی رہتی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نہ تو قبر والی جگہ اور نہ قبر کی طرف نماز صحیح ہوتی ہے اور اس سے ممانعت کی وجہ شرک کا ذریعہ بند کرنا ہے۔ ہمارے بعض اصحاب نے یہ بات ذکر کی ہے کہ ایک یا دو قبریں نماز سے مانع نہیں، اس لیے کہ ان پر مقبرہ کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ مقبرہ تین یا تین سے زائد قبروں کو کہتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ اور ان کے عام اصحاب میں یہ فرق نہیں ہے، بلکہ ان کا کلام علت اور استدلال کی عمومیت ایک قبر کے پاس بھی نماز پڑھنے کو مانع ہے اور یہی بات درست و برحق ہے اور مقبرہ ہر وہ جگہ ہے جس میں قبر بنائی جائے نہ کہ قبروں کا مجموعہ۔'' [الاختيارات العلمية لابن تيمية(۲۵)]

ہمارے اصحاب نے کہا ہے قبروں کے ماحول میں ہر وہ جگہ جو مقبرہ کے نام کے تحت آتی ہے اس میں نماز نہ پڑھی جائے۔ یہ بات اسے متعین کر دیتی ہے کہ نماز کی ممانعت ایک قبر کو بھی شامل ہے۔

قرآن وسنت کے مذکورہ بالا دلائل اور ائمہ ومحدثین کی توضیحات سے معلوم ہوا کہ قبر والی جگہ نماز نہیں ہوتی لہٰذا اس سے اجتناب نہایت ضروری ہے۔

گھر میں فرض نماز ادا کرنا

(سوال) کیا بغیر کسی شرعی عذر کے گھر میں فرض نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

(جواب) تندرست اور غیر معذور آدمی پر فرض نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ ارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ [البقرة:٤٣]

''رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

یہ امر ہے اور یہاں امر (حکم) وجوب کے لیے ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يَأْتِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ إِلَّا مِنْ عُذْرٍ » [ابن ماجه، كتاب المساجد: باب التغليظ في التخلف عن الجماعة (٧٩٣)]

''جس شخص نے اذان سنی، پھر وہ بغیر کسی عذر کے مسجد میں نہ آیا تو اس کی نماز ہی نہیں۔''

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے:

''ایک نابینا شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا: ''مجھے کوئی مسجد میں لانے والا نہیں، گھر میں نماز ادا کرنے کی رخصت دے دیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے رخصت دے دی۔ جب وہ واپس پلٹا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''تو اذان سنتا ہے؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں!'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « فَأَجِبْ » ''تو پھر قبول کر (یعنی تیرا مسجد میں آنا لازمی ہے)۔'' [مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة: باب يجب إتيان المسجد على من سمع النداء (٦٥٣)]

اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نابینا شخص کو اذان سننے کے بعد اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی تو بینائی والے شخص کو بغیر شرعی عذر کے بھلا گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت کس طرح ہو سکتی ہے؟ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے ارادہ کیا کہ لکڑیاں اکٹھی کرنے کا حکم دوں، پھر اذان کہلاؤں اور ایک شخص کو نماز پڑھانے کیلئے کھڑا کر کے ایسے لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز باجماعت کے لیے حاضر نہیں ہوتے اور انھیں ان کے گھر سمیت جلا ڈالوں۔

یہ سخت وعید اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں پر باجماعت نماز ادا کرنا فرض ہے، لیکن افسوس کہ ہمارے معاشرے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں، لوگ اذان سننے کے بعد اپنے کاموں ہی میں مشغول رہتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو اپنے اپنے مقام ہی پر نماز پڑھ لینا کافی سمجھتے ہیں حالانکہ بغیر کسی شرعی عذر کے ایسے لوگوں کی نماز ہوتی ہی نہیں جیسا کہ گزشتہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

دوران نماز جیب میں روپے رکھنا

(سوال) دورانِ نماز اکثر ہماری جیبوں میں تصویر والے نوٹ ہوتے ہیں، اس سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

(جواب) اس بات میں قطعاً شبہ نہیں کہ جاندار کی تصویر شرعاً حرام ہے اور اس پر نصوص قطعیہ، صحیحہ اور حسن درجہ کی احادیث دلالت کرتی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا:

« اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا عِنْدَ اللّٰهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ الْمُصَوِّرُوْنَ » [بخاری، کتاب اللباس: باب عذاب المصورین یوم القیامة(٥٩٥٠)، مسلم، کتاب اللباس (٢١٠٩)، مسند احمد(١/٣٧٥)، مسند حمیدی (١١٧)، مسند ابی یعلی (٥١٠٧)، نسائی (٥٣٦٦)]

''بیشک اللہ کے ہاں انسانوں میں سے سخت ترین عذاب کے مستحق قیامت کے دن تصویر بنانے والے ہوں گے۔''

سعید بن ابی الحسن فرماتے ہیں: میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا، ان کے پاس ایک آدمی آیا، اس نے کہا: ''اے ابن عباس! میں ایسا انسان ہوں کہ میری معیشت میرے ہاتھ کی کاریگری ہے اور میں تصاویر بناتا ہوں۔'' عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''میں تمھیں وہی حدیث سناتا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ صَوَّرَ صُوْرَةً فَاِنَّ اللّٰهَ مُعَذِّبُهٗ حَتّٰی یَنْفُخَ فِیْهَا الرُّوْحَ وَ لَیْسَ بِنَافِخٍ فِیْهَا اَبَدًا »

''جس آدمی نے کوئی تصویر بنائی بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دے گا، یہاں تک کہ وہ اس میں روح پھونک دے اور وہ اس تصویر میں کبھی روح نہیں پھونک سکے گا۔''

یہ بات سن کر اس کا سانس چڑھ گیا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''کم بخت! اگر تو نے تصویر بنانی ہی ہے تو درخت وغیرہ کی بنا جن میں روح نہیں ہے۔'' [بخاری، کتاب البیوع: باب بیع التصاویر التی لیس فیها الروح و ما یکره من ذلك(٢٢٢٥)، مسلم، کتاب اللباس(٢١١٠)، نسائی(٥٣٦٢)، ابو داؤد(٥٠٢٤)، ترمذی (١٧٥١)، شرح السنة(٣٢١٩)، صحیح ابن حبان(٥٦٨٦)، احمد(١/٣٥٩)، مسند حمیدی(٥٣١)، ابو یعلی (٢٥٧٧)، بیهقی(٧/٢٧٠)]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جاندار کی تصویر بنانا شرعاً حرام ہے اور مصور کو قیامت کے دن شدید ترین عذاب دیا جائے گا اور ایسی جگہ جہاں تصاویر آویزاں ہوں، عبادت کرنا درست نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ لَمَّا قَدِمَ مَكَّةَ اَبٰی اَنْ یَّدْخُلَ الْبَیْتَ وَ فِیْهِ الْاٰلِهَةُ فَاَمَرَ بِهَا فَاُخْرِجَتْ فَاُخْرِجَ صُوْرَةُ اِبْرَاهِیْمَ وَ اِسْمَاعِیْلَ فِیْ اَیْدِیْهِمَا مِنَ الْاَزْلَامِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ لَقَدْ عَلِمُوْا مَا اسْتَقْسَمَا بِهَا قَطُّ ثُمَّ دَخَلَ الْبَیْتَ فَكَبَّرَ فِیْ نَوَاحِی، الْبَیْتِ وَ خَرَجَ وَ لَمْ یُصَلِّ فِیْهِ »[بخاری، کتاب المغازی: باب أین رکز النبی الرایة یوم الفتح (٤٢٨٨)]

''بے شک رسول اللہ ﷺ جب مکہ تشریف لائے تو آپ نے بیت اللہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس میں (مشرکین کے) معبود تھے، آپ نے انھیں نکالنے کا حکم دیا تو انھیں نکال دیا گیا۔ اس میں سے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی تصاویر بھی نکالی گئیں، ان دونوں کے ہاتھوں میں تیر تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: '' اللہ ان مشرکین کو تباہ کرے یقیناً انھیں علم ہے کہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے تیروں کے ذریعے کبھی فال نہیں نکالی۔'' پھر آپ ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ نے اس کے مختلف کونوں میں ''اللہ اکبر'' کہا اور باہر نکل آئے اور آپ نے اس میں نماز نہیں پڑھی۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ فِیْ الْحَدِیْثِ کَرَاهِیَةُ الصَّلَاةِ فِی الْمَکَانِ الَّذِیْ فِیْهِ صُوَرٌ لِکَوْنِهَا مَظِنَّةُ الشِّرْكِ وَكَانَ غَالِبُ کُفْرِ الْاُمَمِ مِنْ جِهَةِ الصُّوَرِ'' [فتح الباری (۱۷/۸)]

''اس حدیث سے تصویروں والی جگہ نماز ادا کرنے کی کراہت معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ اس جگہ شرک کا گمان ہے اور امتوں میں کفر اکثر تصویروں کی جانب سے داخل ہوا ہے۔''

حافظ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ تَلَاعَبَ بِهِمْ فِیْ تَصْوِیْرِ الصُّوَرِ فِی الْکَنَائِسِ وَ عِبَادَتِهَا فَلَا تَجِدُ کَنِیْسَةً مِنْ کَنَائِسِهِمْ تَخْلُوْ عَنْ صُوْرَةِ مَرْیَمَ وَ الْمَسِیْحِ وَ جَرْجَسِ وَ بَطْرَسِ وَغَیْرِهِمْ مِنَ الْقُدِّیْسِیْنَ عِنْدَهُمْ وَ الشُّهَدَاءِ وَ اَکْثَرُهُمْ یَسْجُدُوْنَ لِلصُّوَرِ وَ یَدْعُوْنَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تَعَالٰی'' [إغاثة اللهفان فی مصائد الشيطان (۳۸۸/۲)]

''شیطان نے عیسائیوں کے ساتھ جو کھیل کھیلے ہیں ان میں سے ایک گرجا گھروں میں تصویریں رکھنا اور ان کی عبادت کرنا بھی ہے۔ آپ عیسائیوں کے گرجا گھروں میں سے کوئی گرجا گھر بھی مریم و عیسیٰ علیہما السلام، جرجس اور بطرس وغیرہ جو ان کے ہاں قدسی شمار ہوتے ہیں، ان کی تصاویر سے خالی نہیں پائیں گے اور ان کی اکثریت تصویروں کو سجدہ کرتی اور انھیں اللہ کے سوا پکارتی ہے۔''

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ تصویر بنانا حرام ہے اور انھیں عبادت گاہوں میں آویزاں کرنا عیسائیت کی تلبیس ہے اور جہاں تصاویر آویزاں ہوں وہاں عبادت کرنا درست نہیں۔ البتہ رہی یہ بات کہ تصویر ہماری جیب میں بھی ہوتی ہے تو کیا اس سے نماز میں خلل واقع ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں چند ایک باتیں قابل توجہ ہیں:

- نوٹوں اور سکوں پر تصاویر حکومت شائع کرتی ہے اور وہ اس کی ذمہ دار ہے اور اللہ کے ہاں جوابدہ ہوگی۔
- ان نوٹوں اور سکوں کو اس ملک میں رہتے ہوئے استعمال کرنا ہماری مجبوری ہے کیونکہ ہر قسم کی خرید و فروخت کا دار و مدار انہی نوٹوں اور سکوں پر ہے۔
- اگر عبادت کے وقت مساجد وغیرہ میں انھیں باہر نکال کر رکھیں تو دولت کے ضیاع کا قوی اندیشہ ہے۔

شریعت اسلامی میں اضطراری کیفیت میں شرعی حکم تبدیل ہو جاتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَ لَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ [البقرة:۱۷۳]

''جو شخص مجبور ہو، بغاوت کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو اس پر حرام کھانا گناہ نہیں۔''

لہٰذا جیب میں نوٹ اور سکے ایک تو پوشیدہ ہوتے ہیں، عبادت کے وقت سامنے نہیں ہوتے، جس کی وجہ سے عبادت میں خلل نہیں آتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ہماری مجبوری ہے اور بامر مجبوری گناہ نہیں۔ لہٰذا اقرب الی الصواب بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ جیب میں اگر روپے ہوں تو نماز ادا کرنے میں خلل نہیں ہوتا کیونکہ تصاویر اگر سامنے یا عبادت والے کمرے میں آویزاں ہوں تو وہاں نماز ادا نہیں کرنی چاہیے، تاوقتیکہ اس مکان اور کمرے کو تصاویر سے پاک کر دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

ڈرائیور حضرات کی نماز

سوال ڈرائیور حضرات جو زندگی کے اکثر اوقات سفر میں ہوتے ہیں ان کی نماز قصر ہوگی یا مکمل پڑھی جائے گی؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

جواب ڈرائیور شخص جب تک گاڑی چلاتا ہے اور سفر میں رہتا ہے تو وہ مسافر ہے اور وہ نماز قصر ادا کرے گا۔ جب وہ اپنے گھر میں آئے تو پوری نماز ادا کرے گا کیونکہ یہاں وہ مقیم ہے اور گاڑی چلانے کے وقت وہ سفر میں ہے اور سفر کی نماز قصر ہے۔

دوران نماز خیالات و وساوس اور ان کا علاج

سوال نماز میں ہمیں مختلف وسوسے آتے رہتے ہیں۔ ان سے نماز کی صحت پر اثر پڑتا ہے یا نماز باطل ہو جاتی ہے؟ قرآن وسنت سے رہنمائی فرمائیں۔

جواب نماز کے اندر وسوسے اور خیالات کے آنے سے نماز باطل نہیں ہوتی جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

« صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ الْعَصْرَ فَسَلَّمَ ثُمَّ قَامَ مُسْرِعًا فَتَخَطّٰى رِقَابَ النَّاسِ اِلٰى بَعْضِ حُجَرِ نِسَائِهِ فَفَزِعَ النَّاسُ مِنْ سُرْعَتِهِ فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ فَرَاٰى اَنَّهُمْ عَجِبُوْا مِنْ سُرْعَتِهِ فَقَالَ ذَكَرْتُ شَيْئًا مِنْ تِبْرٍ عِنْدَنَا فَكَرِهْتُ اَنْ يَّحْبِسَنِىْ فَاَمَرْتُ بِقِسْمَتِهِ »

[بخاري، كتاب الأذان: باب من صلى بالناس فذكر حاجة فتخطاهم (٨٥١)]

''میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مدینہ میں عصر کی نماز ادا کی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو جلدی سے اٹھ

کھڑے ہوئے اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے اپنی کسی بیوی کے حجرے کی طرف چلے گئے۔ لوگ آپ ﷺ کی اس جلدی سے گھبرا گئے۔ جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہ آپ کی جلدی پر تعجب کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے یاد آ گیا تھا کہ ہمارے گھر میں سونے کی ایک ڈلی ہے، میں نے ناپسند کیا کہ وہ مجھے روک رکھے، میں نے اس کی تقسیم کا حکم دیا ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کی حالت میں کسی چیز کی یاد آئے یا کوئی خیال آ جائے تو اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

اسی طرح سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« قَالَ عُثْمَانُ بْنُ اَبِی الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ حَالَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ صَلَاتِیْ وَ قِرَاءَتِیْ یُلَبِّسُهَا عَلَیَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذَاكَ شَیْطَانٌ یُقَالُ لَهُ خِنْزَبٌ فَاِذَا اَحْسَسْتَهُ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْهُ وَ اتْفُلْ عَلٰی یَسَارِكَ ثَلَاثًا قَالَ فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ فَاَذْهَبَهُ اللّٰهُ عَنِّیْ » [مسلم ، کتاب السلام: باب التعوذ من شیطان الوسوسة فی الصلاة (۲۲۰۳)]

''سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! شیطان میرے اور میری نماز اور قراءت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور مجھ پر قراءت خلط ملط کر دیتا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس شیطان کا نام خنزب ہے۔ جب اس کا اکسانا محسوس کرو تو (دورانِ نماز) ''اعوذ باللہ'' پڑھو اور دائیں طرف تین مرتبہ تھوکو۔'' سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں نے ایسا ہی کیا اور اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مجھ سے دور کر دیا۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں اپنا لشکر روانہ کرتا ہوں حالانکہ میں نماز میں ہوتا ہوں۔'' [نیل الأوطار(۲/۳۸۳)]

یعنی بعض اوقات نماز کے دوران میرا خیال لشکر کی تیاری کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

« قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ اَوْ تَتَكَلَّمْ » [بخاری، کتاب العتق: باب الخطاء والنسیان فی العتاقة(۲۵۲۸)]

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے میری امت سے وہ خیالات و وساوس جو ان کے سینوں میں پیدا ہوتے ہیں، معاف کر دیے ہیں، جب تک وہ انھیں عملی جامہ نہ پہنا لیں یا ان خیالات کے ساتھ کلام نہ کر لیں۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ شیطان نماز کے اندر وسوسے ڈالتا ہے لہٰذا جب کسی شخص کو نماز میں کوئی خیال آئے یا وسوسہ پیدا ہو تو وہ ''اعوذ باللہ'' پڑھ کر بائیں جانب تین مرتبہ تھوکے، اللہ تعالیٰ اس سے یہ وسوسہ دور فرما دیں گے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وسوسہ اور خیال آ جانے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ انسان کو حالت نماز میں ان خیالات کو دور کر کے اپنی پوری توجہ نماز کی طرف مبذول کر دینی چاہیے تاکہ پورے انہماک اور دھیان سے نماز ادا کی جائے اور اللہ تعالیٰ سے صحیح طور پر مناجات ہو، البتہ جتنا دھیان نماز میں کم ہوتا ہے، اتنا ثواب کم ہو جاتا ہے جیسا کہ دیگر صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے۔

نماز میں مصروف افراد کو سلام کرنا

(سوال) ہم جب مسجد میں آتے ہیں تو کچھ لوگ نماز میں مصروف ہوتے ہیں کیا انھیں سلام کہا جا سکتا ہے؟

(جواب) نماز کی حالت میں سلام کرنا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب مسجد میں آتے تو سلام کہتے۔ رسول اللہ ﷺ اگر نماز میں ہوتے تو ہاتھ کے ساتھ اشارہ کر دیتے تھے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بلال رضی اللہ عنہ سے کہا: ''نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھ رہے ہوتے اور کوئی سلام کہہ دیتا تو کیسے جواب دیتے تھے؟'' بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: « كَانَ يُشِيرُ بِيَدِهِ » ''آپ ﷺ اپنے ہاتھ سے اشارہ کر دیتے تھے۔'' [ترمذی، کتاب الصلاة: باب ما جاء في الإشارة في الصلاة (٣٦٨)]

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ باہر سے مسجد میں داخل ہونے والا سلام کہہ سکتا ہے، خواہ جماعت ہو رہی ہو۔ اگر یہ درست نہ ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ خود ہاتھ کے اشارے سے جواب نہ دیتے بلکہ اس سے روک دیتے، جیسا کہ آپ نے منہ سے جواب دینے سے روک دیا تھا۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''ہم حبشہ جانے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو سلام کہتے تھے تو نبی کریم ﷺ نماز ہی کے دوران ہمیں جواب دیتے تھے، جب ہم حبشہ سے واپس آئے تو میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ نماز میں مشغول ہیں، میں نے سلام کیا تو آپ نے جواب نہ دیا، نماز کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُحْدِثُ مِنْ أَمْرِهِ مَا يَشَاءُ وَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ أَحْدَثَ مِنْ أَمْرِهِ أَنْ لَا تَكَلَّمُوْا فِي الصَّلَاةِ » [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب رد السلام في الصلاة (٩٢٤)]

''اللہ تعالیٰ اپنا جو نیا حکم دینا چاہتا ہے، دے دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو ایک نیا حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ نماز میں کلام نہ کرو۔''

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ مسجد میں داخل ہونے والا سلام کہے اور نماز میں مشغول آدمی ہاتھ کے اشارے سے جواب دے، منہ سے جواب دینا اس حالت میں درست نہیں۔

نماز میں بالوں اور کپڑوں کو سنوارنا

(سوال) کیا نماز میں کپڑے درست کرنے اور بال سنوارنے سے متعلق حدیث میں کوئی ممانعت آئی ہے؟ آگاہ فرما دیں۔

(جواب) نماز میں اطمینان و سکون کے ساتھ کھڑے ہونا چاہیے اور نماز کے ارکان کی ادائی کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔ عام لوگوں کی جو عادت ہے کہ کبھی سر کے بالوں سے کھیلتے ہیں اور کبھی داڑھی کے بالوں سے۔ نماز میں ایسے افعال سے پرہیز کرنا

چاہیے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰی سَبْعَةٍ وَلَا اَكُفَّ شَعْرًا وَ لَا ثَوْبًا» [بخاری، کتاب الأذان: باب لا یکف ثوبه فی الصلاة(٨١٦)]

''مجھے سات اعضا پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ نماز میں کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹوں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں کپڑوں اور بالوں سے کھیلنا اور انھیں سمیٹنا درست نہیں ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

نماز میں خشوع وخضوع کا طریقہ

سوال میری نماز میں خشوع وخضوع اور حضورِ قلبی نہیں ہوتا، مجھے نماز میں خشوع پیدا کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟

جواب یہ بات ظاہر ہے کہ کامیاب مومن بننے کے لیے نماز میں عجز وانکسار اور خشوع وخضوع کی ضرورت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''یقیناً فلاح وکامیابی ان ایمان والوں نے پائی ہے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔'' [المومنون: ٢/١]

نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں، چند ایک درج ذیل ہیں:۔

① انسان کو نماز کا معنی ومفہوم سیکھنا چاہیے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اور کر رہا ہے اس کو سمجھے، قراءت، دعا، ذکر واذکار کے الفاظ ومعانی پر غور کرے اور ذہن میں یہ بات ہو کہ میں عبادت کرتے ہوئے اللہ کو دیکھ رہا ہوں اور اپنے رب سے محوِ گفتگو ہوں جیسا کہ حدیث جبریل علیہ السلام میں احسان کا معنی بتلایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو کم از کم یہ خیال ضرور رہے کہ اللہ تعالیٰ تو مجھے دیکھ رہا ہے۔'' [بخاری، کتاب الایمان: باب سؤال جبریل النبی عن الایمان (٥٠)]

اس طریقے سے انسان نماز کی لذت کو محسوس کرے گا اور یوں نماز آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔'' [مسند احمد: (١٢٨/٣)،(١٩٩)،(٢٨٥)، حاکم: (١٦٠/٢)]

لہٰذا نماز کے معنی ومفہوم سے آدمی کو باخبر رہنا چاہیے۔

② ایسی سوچ بچار کو دور کرنے کی کوشش کرے جو نماز میں آڑے آتی ہے، وساوس شیطانی کو دفع کرے تاکہ دل شہوات نفسانی سے نکل کر اللہ کی محبت میں اٹک جائے۔

③ نماز پر سکون طریقے سے ادا کرے، جلد بازی سے کام نہ لے، جب تک نماز میں سکون واطمینان نہ ہو نماز ادا نہیں ہوتی جیسا کہ حدیث میں جو نماز میں رکوع وسجدہ صحیح ادا نہیں کرتا اسے نماز کا چور قرار دیا گیا ہے۔ [حاکم: (٢٢٩/١)، مسند احمد: ٥/ ٣١٠)]

ایک حدیث میں رکوع وسجدہ میں ٹھونگے مارنے والے کو اس بھوکے آدمی کی طرح قرار دیا گیا ہے جو ایک یا دو کھجوریں کھاتا ہے اور یہ اسے کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔ [صحیح ابن خزیمة: (٣٣٢/١)۔ طبرانی کبیر: (١١٥/٤)]

④ نماز کے اندر موت کو یاد کرے، جب موت یاد آئے گی تو نماز اچھے طریقے سے ادا کرے گا اور یہ یقین کر کے نماز پڑھے کہ اسے شاید اگلی نماز پڑھنے کا موقع نہ ملے جیسا کہ مسند احمد، ابن ماجہ، المعجم لابن الاعرابی میں حدیث ہے اور شیخ البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

⑤ نماز کی دعائیں اور اذکار زیادہ سے زیادہ یاد کرے اور مختلف نمازوں میں مختلف دعائیں اور اذکار جو احادیث صحیحہ میں وارد ہیں، پڑھے۔ کیونکہ ایک مختصری دعا جو یاد کی ہوتی ہے وہ آدمی کی عادت اور روٹین میں آ جاتی ہے پھر اس کا زبان پر ورد تو جاری ہوتا ہے لیکن دل فکر سے خالی ہوتا ہے یعنی ہماری نماز بطور عادت ہوتی ہے عبادت نہیں، جب نماز کے اذکار مختلف یاد ہوں گے اور بدل بدل کر پڑھے گا تو نماز میں دھیان اور توجہ رہے گی اور خشوع وخضوع حاصل ہو گا۔ نماز کے اذکار کے لیے راقم کی کتاب ''صلاۃ المسلم'' یا ''حصن المسلم'' وغیرہ کا مطالعہ کریں۔

⑥ اگر نماز میں وسوسہ آ جائے تو اپنے بائیں جانب تھوک کر ''اعوذ باللہ'' پڑھ لیں۔ [صحیح مسلم، کتاب الاسلام: باب التعوذ من شیطان الوسوسة فی الصلاة: (۲۲۰۳)، احمد: (۲۱۶/۴)]

اس طرح شیطان جو نماز کو بھلا دیتا ہے اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

⑦ جس جگہ نماز ادا کرے اس جگہ نقش و نگار اور تصاویر وغیرہ نہ ہوں۔ [صحیح مسلم، کتاب اللباس: باب تحریم تصویر صورة الحیوان (۲۱۰۷)]

کیونکہ یہ اشیاء نماز سے توجہ ہٹا دیتی ہیں۔

⑧ اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کریں تا کہ نیکی کی رغبت ہو اور برے لوگوں کی صحبت سے اجتناب کریں۔

⑨ اگر حاجت تنگ کر رہی ہے تو پہلے حاجت کو جائے پھر نماز ادا کرے، کیوں کہ پیشاب یا پاخانہ روک کر نماز ادا کرنا درست نہیں۔ [ابن ماجة، کتاب الطهارة و سننها: باب ما جاء فی النهی للحاقن أن یصلی: (۶۱۷)]

⑩ نیند کا غلبہ ہو تو پہلے نیند پوری کر لے پھر نماز پڑھے۔ [صحیح مسلم، کتاب صلاة، المسافرین (۷۸۶)]

⑪ گفتگو کرنے والے آدمی کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھے۔ [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب الصلاة الی المتحدثین و النیام: (۶۹۴)، حاکم (۲۷۰)]

⑫ دوران نماز نظر ادھر ادھر نہ گھمائے۔ [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب الالتفات فی الصلاة (۹۰۹)]

⑬ اسی طرح کبھی رات کا قیام بھی کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو معمول بنا لیں، اس سے بھی خشیت الٰہی نصیب ہوتی ہے۔

اگر مذکورہ بالا امور پر توجہ دی جائے تو اللہ کے فضل و کرم سے نماز میں خشوع نصیب ہو جاتا ہے، اللہ ہمیں ایسا نمازی بنائے کہ ہم اس کی بندگی صحیح نہج پر کر سکیں اور شیطانی وساوس اور عجز و انکسار سے دور کرنے والے ذرائع سے اللہ محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنا

(سوال) امام کے پیچھے تراویح پڑھتے وقت نیند یا کوئی دوسرا خیال آئے تو ''اعوذ باللہ'' پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

(جواب) عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے کہا:

''اے اللہ کے رسول! بلاشبہ شیطان میرے اور میری نماز اور قراءت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، وہ اسے مجھ پر خلط ملط کر دیتا ہے۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ شیطان ہے جسے ''خنزب'' کہا جاتا ہے، جب تو اسے محسوس کرے تو اس سے اللہ کی پناہ مانگ یعنی ''اعوذ باللہ'' پڑھ اور اپنی بائیں جانب تین بار تھوک۔'' میں نے ایسا کیا تو اللہ نے اسے مجھ سے دور کر دیا۔'' [مسلم، کتاب السلام: باب التعوذ من شیطان الوسوسته: (۲۲۰۳)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں اگر شیطان وسوسہ ڈالے تو ''اعوذ باللہ'' پڑھ سکتے ہیں، اگر نیند کا ایسا غلبہ ہو کہ الفاظ کی پہچان مشکل ہو رہی ہو تو پہلے نیند پوری کر لیں پھر نماز پڑھیں اور اگر ایسا غلبہ نہیں تو نماز پوری کر لیں اور سستی و کاہلی دور کریں۔

ایک رات میں قرآن ختم کرنا؟

(سوال) تین دن سے کم میں قرآن مجید ختم کرنا کیسا ہے جبکہ بعض اسلاف ایسا کرتے رہے؟

(جواب) صحیح احادیث سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی ایک رات میں قرآن حکیم ختم نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ کی قراءت مختلف اوقات میں مختلف ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کبھی زیادہ قرآن پڑھتے اور کبھی کم۔ چند ایک احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَافْتَتَحَ الْبَقَرَةَ فَقُلْتُ يَرْكَعُ عِنْدَ الْمِائَةِ ثُمَّ مَضٰى فَقُلْتُ يُصَلِّيْ بِهَا فِيْ رَكْعَةٍ فَمَضٰى فَقُلْتُ يَرْكَعُ بِهَا ثُمَّ افْتَتَحَ النِّسَاءَ فَقَرَأَهَا ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَانَ فَقَرَأَهَا يَقْرَأُ مُتَرَسِّلًا إِذَا مَرَّ بِآيَةٍ فِيْهَا تَسْبِيْحٌ سَبَّحَ إِذَا مَرَّ بِسُؤَالٍ سَأَلَ وَ إِذَا مَرَّ بِتَعَوُّذٍ تَعَوَّذَ ثُمَّ رَكَعَ » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب استحباب تطويل القراءة في صلاة الليل(۷۷۲)، نسائی(۲۲۶/۳)، احمد (۳۸۲/۵)، ابو داؤد(۸۷۳)، شرح السنة(۲۰/۴)]

''میں نے ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ نے سورۂ بقرہ شروع کی۔ میں نے خیال کیا آپ ﷺ سو آیت پر رکوع کریں گے لیکن آپ ﷺ نے قراءت جاری رکھی، میں نے سوچا یہ سورت ایک رکعت میں پڑھیں گے مگر آپ جاری رہے۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ پڑھ کر رکوع کریں گے مگر آپ ﷺ نے سورۂ نساء شروع کر دی۔ اسے پڑھا پھر آل عمران شروع کر دی، آپ ﷺ نے اسے بھی پڑھا۔ آپ ﷺ ٹھہر ٹھہر کر تلاوت

کرتے۔ جب ایسی آیت کے پاس سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ تسبیح کرتے اور جب سوال والی آیت کے پاس سے گزرتے تو سوال کرتے اور جب پناہ والی آیت کے پاس سے گزرتے تو پناہ پکڑتے، پھر آپ ﷺ نے رکوع کیا۔“

۲۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَأَطَالَ حَتّٰى هَمَمْتُ بِاَمْرِ سُوْءٍ قَالَ قِيْلَ وَ مَا هَمَمْتَ بِهِ ؟ قَالَ هَمَمْتُ اَنْ اَجْلِسَ وَ اَدَعَهُ » [مسلم ، كتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب استحباب تطويل القراءة في صلاة الليل(٧٧٣)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ نے قراءت لمبی کردی حتیٰ کہ میں نے غلط معاملے کا ارادہ کرلیا۔“ آپ سے کہا گیا: ”آپ نے کیا ارادہ کیا؟“ کہنے لگے: ”میں نے ارادہ کیا کہ بیٹھ جاؤں اور آپ ﷺ کو چھوڑ دوں۔“

۳۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« وَ لَا اَعْلَمُ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ كُلَّهُ فِيْ لَيْلَةٍ » [مسلم ، كتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب جامع صلاة الليل و من نام عنه أو مرض(٧٤٦)]

”میں نہیں جانتی کہ رسول اللہ ﷺ نے (کبھی) ایک رات میں پورا قرآن پڑھا ہو۔“

۴۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِقْرَإِ الْقُرْاٰنَ فِيْ شَهْرٍ قُلْتُ اِنِّيْ اَجِدُ قُوَّةً حَتّٰى قَالَ فَاقْرَأْهُ فِيْ سَبْعٍ وَ لَاتَزِدْ عَلٰى ذٰلِكَ »
[بخاری ، كتاب فضائل القرآن:باب في كم يقرأ القرآن؟(٥٠٥٤)، مسلم، كتاب الصيام: باب النهى عن صوم الدهر(١١٥٩)]

”ایک مہینے میں قرآن پڑھ۔“ میں نے کہا: ”میں (اس سے کم وقت میں پڑھنے کی) قوت رکھتا ہوں حتیٰ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”سات دنوں میں پڑھ اور اس سے زیادہ نہ کر۔“

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے انھیں مزید رخصت دیتے ہوئے فرمایا:

« لَا يَفْقَهُ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فِيْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ » [ابو داؤد ، كتاب الصلاة : باب تحزيب القرآن (١٣٩٤)]

”جس نے تین دن سے کم میں قرآن پڑھا اس نے اسے نہیں سمجھا۔“

۵۔ اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ خود بھی تین دنوں سے کم میں قرآن ختم نہیں کرتے تھے:

« كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَا يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ فِيْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ »[صفة صلاة النبى للألبانى(ص/١٢٠)]

”نبی کریم ﷺ تین دن سے کم میں قرآن نہیں پڑھتے تھے۔“

۶۔ سنن سعید بن منصور میں صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«اِقْرَءُوا الْقُرْآنَ فِیْ سَبْعٍ وَ لَا تَقْرَءُوْا فِیْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ» [فتح الباری(۹/۹۷)]

''قرآن مجید کو سات دنوں میں پڑھو اور تین سے کم میں نہ پڑھو۔''

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ ایک رات میں قرآن مجید ختم نہیں کرتے تھے اور آپ ﷺ تین راتوں سے کم میں قرآن مکمل نہیں کرتے تھے اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو بھی فرمایا: ''جس نے تین دن سے کم میں قرآن پڑھا اس نے اسے سمجھا نہیں۔'' لہٰذا سب سے پسندیدہ اور بہترین بات یہی ہے کہ تین دنوں سے کم میں قرآن نہ پڑھا جائے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَ هٰذَا اِخْتِیَارُ اَحْمَدَ وَ اَبِیْ عُبَیْدَةَ وَ اِسْحَاقَ بْنَ رَاهُوْیَةَ وَ غَیْرِهِمْ" [فتح الباری(۹/۹۷)]

''یہی مذہب امام احمد، امام ابو عبیدہ اور امام اسحاق بن راہویہ (رحمہم اللہ) وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔''

مولانا عبد الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"وَالْمُخْتَارُ عِنْدِیْ مَا ذَهَبَ اِلَیْهِ الْاِمَامُ اَحْمَدُ وَ اِسْحَاقُ بْنُ رَاهُوْیَةَ وَ غَیْرُهُمَا"

[تحفة الأحوذی(٤/٦٣)]

''میرے نزدیک مختار مذہب وہی ہے جسے امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔''

سلف صالحین میں سے کئی افراد سے تین دنوں سے کم میں قرآن پڑھنے کا ذکر کتب احادیث میں ملتا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کا عمل اور حکم سب پر فائق ہے۔ ممکن ہے ان اسلاف تک یہ احادیث نہ پہنچی ہوں۔ اس لیے ہمیں نبی اکرم ﷺ کے اسوہ کو سامنے رکھنا چاہیے۔ آپ ﷺ سے بہتر عمل کسی کا نہیں ہوسکتا، اس لیے ہمارے نزدیک راجح بات یہی ہے کہ قرآن مجید کو تین دنوں سے کم میں نہ ختم کیا جائے۔

نماز میں ایک آیت سے کم تلاوت کرنا

سوال کیا نماز میں ایک آیت سے کم (سورۂ بقرہ کی آخری آیت) قراءت کرنے سے نماز ہو جائے گی؟

جواب نماز کے اندر ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ لازم ہے، اس سے زائد جتنی چاہے قراءت کر لیں، خواہ فاتحہ کے بعد ایک آیت پڑھیں یا زیادہ، نماز درست ہوگی۔

رفاعہ بن رافع الزرقی صحابی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''ایک شخص آیا اور رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، اس نے آپ کے قریب ہی نماز پڑھی پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''دوبارہ نماز پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی۔'' اس نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! مجھے بتایئے کہ میں کیسے نماز پڑھوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب قبلہ کی طرف منہ کرو تو تکبیر کہو پھر سورۂ فاتحہ پڑھو پھر (قرآن میں سے) جو چاہو پڑھو۔ جب تم رکوع کرو تو اپنی ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر رکھ دو اور

اپنی پشت پھیلا دو، اپنا رکوع اطمینان سے کرو، جب تم اپنا سر اٹھاؤ تو اپنی کمر سیدھی کرو، یہاں تک کہ ہڈیاں اپنے جوڑوں تک لوٹ جائیں، جب تم سجدہ کرو تو اپنا سجدہ اطمینان سے کرو پھر جب سر اٹھاؤ تو اپنی بائیں ران پر بیٹھ جاؤ، پھر اسی طرح ہر رکعت میں کرو۔" [مسند احمد (٤/ ٣٤٠)، (١٨٩٩٥)] علامہ نیموی حنفی لکھتے ھیں که اس کی سند حسن ھے، [آثار السنن: (ص/ ٢١٤)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ ضروری ہے، اس کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے اور فاتحہ سے زائد قراءت نمازی کی منشا پر چھوڑ دی جائے۔ لہٰذا آپ سورۂ فاتحہ ضرور پڑھیں اور اس سے زائد قراءت جتنی چاہے کریں آپ کی نماز درست ہوگی۔

اگر جمعہ فوت ہو جائے؟

(سوال) اگر کسی شخص کا جمعہ فوت ہو جائے تو کیا وہ بعد میں جمعہ کی دو رکعت پڑھ لے؟ قرآن وسنت سے وضاحت فرمائیں۔

(جواب) برحق بات یہ ہے کہ جس شخص کا جمعہ فوت ہو جائے وہ نماز ظہر ادا کرے۔ جمعہ فوت ہونے کی صورت میں نماز جمعہ ہی ادا کرنا کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں جیسا کہ ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ اس سلسلے میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یوں مروی ہے:

« إِذَا أَدْرَكَ الرَّجُلُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ رَكْعَةً صَلّٰى إِلَيْهَا رَكْعَةً أُخْرٰى فَإِنْ وَجَدَهُمْ جُلُوسًا صَلّٰى أَرْبَعًا » [مصنف عبدالرزاق(٣/ ٢٣٤)،(٥٤٧١)، المحلى لابن حزم(٥/ ٧٥)، بيهقى(٣/ ٢٠٤)، الأوسط لابن المنذر(٤/ ١٠١)، ابن ابى شيبة(٥٣٣٤)]

"جب آدمی جمعہ والے دن ایک رکعت پالے تو وہ اس کے ساتھ پچھلی رکعت ادا کرے لیکن اگر لوگوں کو جلسہ کی حالت میں پائے تو چار رکعات ادا کرے۔"

امام بغوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"جو شخص امام کو نماز جمعہ میں پائے اور اگر اس کے ساتھ ایک مکمل رکعت پالے تو اس نے جمعہ پالیا، پھر جب امام سلام پھیر دے تو اس کے ساتھ پچھلی رکعت ملالے تو جمعہ مکمل ہو گیا۔ لیکن اگر امام کے ساتھ مکمل رکعت نہ پائے جیسا کہ دوسری رکعت میں امام کو رکوع کے بعد اٹھنے کی صورت میں پائے تو اس کا جمعہ فوت ہو گیا، اب اس پر واجب ہے کہ وہ چار رکعات نماز ادا کرے۔" [شرح السنة(٤/ ٢٧٣)]

اس لیے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ » [مسلم، كتاب المساجد و مواضع الصلاة: باب من ادرك ركعة من الصلاة فقد أدرك تلك الصلاة(٦٠٧)]

"جس شخص نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز کو پالیا۔"

ابونضرہ کہتے ہیں:

" جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ فَقَالَ رَجُلٌ قَدْ فَاتَتْهُ الْجُمُعَةُ کَمْ یُصَلِّیْ ؟ قَالَ عِمْرَانُ وَ لِمَ تَفُوْتُهُ الْجُمُعَةُ ؟ فَلَمَّا وَلَّی الرَّجُلُ قَالَ عِمْرَانُ : اَمَا اِنَّهُ لَوْ فَاتَتْنِی الْجُمُعَةُ صَلَّیْتُ اَرْبَعًا "

[عبد الرزاق (٥٤٨٢)، (٢٣٦/٣)]

" ایک آدمی سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اس نے کہا: " جس آدمی کا جمعہ فوت ہو جائے وہ کتنی نماز ادا کرے؟ " عمران رضی اللہ عنہ نے کہا: " اس کا جمعہ کیوں فوت ہوتا ہے؟ " جب آدمی پیٹھ پھیر کر جانے لگا تو عمران رضی اللہ عنہ نے کہا: " بہرکیف اگر میرا جمعہ فوت ہو جاتا تو میں چار رکعات ادا کرتا۔ "

اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ جس کا جمعہ فوت ہو جائے اسے چار رکعات ادا کرنی چاہییں۔ علاوہ ازیں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے:

« مَنْ اَدْرَكَ مِنَ الْجُمُعَةِ رَکْعَةً فَلْیُضِفْ اِلَیْهَا اُخْرٰی وَ مَنْ فَاتَتْهُ الرَّکْعَتَانِ فَلْیُصَلِّ اَرْبَعًا »

[مجمع الزوائد ، کتاب الصلاة: باب فیمن أدرك من الجمعة رکعة(٣١٧١)، (٢/ ٤٢٠)، امام ہیثمی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے]

" جس آدمی نے جمعہ کی ایک رکعت پالی وہ اس کے ساتھ پچھلی رکعت ملا لے اور جس کی دو رکعت فوت ہو جائیں وہ چار رکعات ادا کرے۔ "

مذکورہ بالا روایات سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ جس شخص کی نماز جمعہ فوت ہو جائے وہ چار رکعات ادا کرے۔ عبداللہ بن عمر، عمران بن حصین اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور کثیر ائمہ و محدثین رحمہم اللہ سے یہی بات منقول ہے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اس بات کا کوئی بھی مخالف نہیں۔ نیز بعض ائمہ نے تو اس پر اجماع بھی نقل فرمایا ہے۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: موسوعة الإجماع فی الفقه الإسلامی(٢/ ٧٠١)، (٢٤٦٣)]

قضا نمازوں کی ادائیگی کا طریقہ

(سوال) قضا نماز کی ادائیگی کا کیا طریقہ کار ہے اور جس آدمی سے سفر میں نماز قضا ہو جاتی ہے، اس کا کیا طریقہ ہے، کیا وہ پوری نماز پڑھے یا قصر؟

(جواب) فوت شدہ نمازوں کو ترتیب کے ساتھ پڑھنا چاہیے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غزوۂ احزاب میں بعض نمازیں فوت ہوگئیں تو انہوں نے ترتیب سے ادا کی تھیں۔ صحیحین میں ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خندق والے دن آئے تو کفار قریش کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور کہا:

" اے اللہ کے رسول آج میں بمشکل سورج ڈوبتے نماز پڑھ سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " اللہ کی قسم! میں نے تو ابھی بھی نماز نہیں پڑھی۔ " اس کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وادی بطحان اترے، آپ نے نماز کے لیے وضو کیا

اور ہم نے بھی وضو کیا پھر غروب شمس کے بعد عصر کی نماز پڑھی پھر مغرب کی نماز پڑھی۔" [بخاری، کتاب المغازی: باب غزوة الخندق: (٤١١٢)]

نبی ﷺ کو اس نماز کے فوت ہو جانے کا اس قدر ملال تھا کہ آپ نے مشرکین پر بد دعا کی۔ چنانچہ صحیح بخاری میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے خندق والے دن کہا:

"اللہ! ان مشرکین کے لیے ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے جس طرح انھوں نے ہمیں نماز وسطیٰ سے مشغول رکھا یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا۔" [بخاری، كتاب المغازی: باب غزوة الخندق: (٤١١١)]

مسند احمد اور مسند شافعی میں ہے کہ کفار نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں سے روکے رکھا تو آپ ﷺ نے ساری نمازیں اکٹھی پڑھیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان روایتوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جنگ خندق کئی روز جاری رہی تو کسی دن دوسری صورت بن گئی ہوگی۔ [الرحیق المختوم (عربی)، (ص/٣٠٥)]

معلوم ہوا کہ فوت شدہ نمازیں ترتیب سے ادا کرنی چاہییں۔ مسافر کو اللہ نے حالت سفر میں دو سہولتیں عطا کی ہیں:

① نماز قصر

② جمع کر کے پڑھنا یعنی ظہر و عصر اور مغرب و عشاء اور جس نے حالت سفر میں اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھایا اور واپس گھر آ گیا تو یہاں حالت اقامت میں پوری نماز ادا کرے۔

نماز کے متعلق شک

سوال جب کسی شخص کو شک ہو کہ اس نے نماز پڑھی ہے یا نہیں تو وہ کیا کرے؟

جواب جب کسی مسلمان کو فرض نماز کے بارے میں شبہ ہو کہ اس نے نماز پڑھی ہے یا نہیں تو اس صورت میں اسے فوراً نماز ادا کر لینی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَ لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذٰلِكَ » [بخاریکتاب مواقيت الصلاة: باب من نسی صلاة فليصل إذا ذكر (٥٩٧)]

"جو آدمی نماز پڑھنا بھول جائے تو جب اسے یاد آ جائے اسے پڑھ لے، بس اس کا یہی کفارہ ہے۔"

نمازوں کا اہتمام کرنا مسلمان پر لازم ہے اور با جماعت نماز ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ [البقرة: ٢٨]

"نمازوں کی حفاظت کرو اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔"

اور فرمایا:

﴿وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ﴾ [البقرة : ٤٣]
”نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“
لہٰذا نماز کا اہتمام کرنا چاہیے اور جماعت کے ساتھ ادا کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، جو نماز کسی وجہ سے رہ جائے اسے یاد آنے پر جلدی ادا کرنا چاہیے، نماز کی ادائیگی ہی اس کا کفارہ ہے۔

بارش کی وجہ سے نمازیں جمع کرنا

(سوال) کیا بارش کی وجہ سے نمازیں جمع کی جا سکتی ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمادیں۔
(جواب) اللہ تبارک وتعالیٰ نے مقررہ اوقات میں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے لہٰذا ہمیں ہر نماز اس کے وقت میں ادا کرنی چاہیے۔ وقت کے علاوہ صرف وہی نماز ادا ہو سکتی ہے جس کی کوئی شرعی دلیل موجود ہو، بغیر دلیل کے کسی نماز کو اس کے وقت سے پہلے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح نمازوں کو جمع کرنے کے لیے بھی دلیل کی ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازوں کو جمع کیا ہے۔ اگر سفر زوال شمس کے بعد شروع کرتے تو ظہر کے وقت میں عصر بھی پڑھ لیتے تھے۔ اسی طرح مغرب کے وقت میں عشاء ادا کر لیتے تھے اور اگر سفر زوال سے پہلے شروع کرتے تو ظہر کو مؤخر کر دیتے اور عصر کو اوّل وقت میں ادا کر لیتے۔ اسی طرح مغرب کو تاخیر سے ادا کرتے اور عشاء کو اوّل وقت میں پڑھ لیتے۔[ابوداؤد، كتاب صلاة السفر : باب الجمع بين الصلاتين(١٢٢٠)، بيهقی(١٦٢/٣)، دارقطنی(٣٩٣/١)، ترمذی(٥٥٣)، المسند المستخرج لأبی نعيم (٢٩٤/٢)]
اب رہا مقیم آدمی کے لیے نماز جمع کرنا اور اس کا طریقہ کار تو بعض اوقات مقیم آدمی بھی نماز جمع کر سکتا ہے۔[مسلم ، كتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب الجمع بين الصلاتين فی الحضر(٧٠٥)]
یہاں محل نزاع یہ بات ہے کہ مقیم کی جمع کا طریقہ کار کیا ہے؟ کیا مقیم ظہر کے ساتھ عصر اور مغرب کے ساتھ عشاء پڑھ سکتا ہے یا ظہر کو مؤخر کر کے عصر کو اوّل وقت میں ادا کرے۔ اسی طرح مغرب کو مؤخر کرے اور عشاء کو اوّل وقت میں پڑھے؟ تو ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ مقیم ظہر کے ساتھ عصر اور مغرب کے ساتھ عشاء جمع نہیں کر سکتا، اگر جمع کرنا چاہے تو ظہر کو مؤخر کرے اور عصر کو اوّل وقت میں پڑھے، اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کرے۔
جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ مقیم بھی مسافر کی طرح نمازیں جمع کر سکتا ہے انھیں حدیث سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ حالانکہ یہ مطلق جمع کا ذکر ہے، اس کا طریقہ کار بیان نہیں ہوا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو نقل کیا ہے:
« اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ صَلّٰی بِالْمَدِيْنَةِ سَبْعًا وَ ثَمَانِيًا الظُّهْرَ وَ الْعَصْرَ وَ الْمَغْرِبَ وَ الْعِشَاءَ » [بخاری ، كتاب مواقيت الصلاة: باب تأخير الظهر الی العصر (٥٤٣)]
”بے شک نبی ﷺ نے مدینہ میں سات اور آٹھ رکعات جمع کر کے ادا کیں یعنی ظہر وعصر اور مغرب وعشاء۔“

اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا ہے: " بَابُ تَأْخِيرِ الظُّهْرِ إِلَى الْعَصْرِ " (یعنی ظہر کو عصر تک مؤخر کرنے کا بیان)

سید الفقہاء، امام المحدثین، حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس حدیث میں ظہر کی نماز کو عصر تک مؤخر کرنے اور مغرب کو عشاء تک مؤخر کرنے کا بیان ہے تا کہ نمازیں جمع بھی ہوں اور اپنے اپنے وقت میں بھی ادا ہوں اور امام نسائی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو مفصل بیان کر کے بات بالکل واضح کر دی ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ ثَمَانِيًا جَمِيْعًا وَ سَبْعًا جَمِيْعًا اَخَّرَ الظُّهْرَ وَ عَجَّلَ الْعَصْرَ وَ اَخَّرَ الْمَغْرِبَ وَ عَجَّلَ الْعِشَاءَ » [نسائی، کتاب المواقیت : باب الوقت الذی یجمع فیه المقیم (۵۹۰)]

'' میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ میں آٹھ اور سات رکعات اکٹھی ادا کیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کو مؤخر کیا اور عصر کو جلدی کیا اور مغرب کو موخر کیا اور عشاء کو جلدی کیا۔''

اس روایت پر امام نسائی رحمہ اللہ نے یوں باب قائم کیا ہے: " اَلْوَقْتُ الَّذِیْ یَجْمَعُ فِیْهِ الْمُقِیْمُ " (اس وقت کا بیان جس میں مقیم نماز جمع کرے۔)

ان صحیح احادیث اور محدثین کی فقاہت سے واضح ہو گیا کہ مقیم آدمی نمازیں جمع کرنا چاہے تو اپنے اپنے اوقات میں پڑھے یعنی ظہر کو تاخیر سے اور عصر کو اوّل وقت میں، اسی طرح مغرب آخری وقت میں اور عشاء اول وقت میں۔ (واللہ اعلم)

عصر کے بعد نفل پڑھنا

سوال کیا عصر کے بعد نفل پڑھنا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

جواب کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں نماز عصر کے بعد نماز پڑھنے کی ممانعت ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَهٰى عَنِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰى تَشْرُقَ الشَّمْسُ وَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغْرُبَ » [بخاری، کتاب مواقیت الصلاة : باب الصلاة بعد الفجر حتی ترتفع الشمس (۵۸۱)، ابو داؤد (۱۲۷۶)، ابن خزیمة (۱۲۷۱)، ابن ماجه (۱۲۵۰)]

'' بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کے بعد نماز ادا کرنے سے منع کیا ہے حتیٰ کہ سورج نکل آئے اور عصر کے بعد بھی حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ بَيْعَتَيْنِ وَ عَنْ لِبْسَتَيْنِ وَ عَنْ صَلَاتَيْنِ نَهٰى عَنِ

الصَّلَاةِ بَعْدَ الْفَجْرِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ » [بخاری، کتاب مواقیت الصلاة: باب الصلاة بعد الفجر حتی ترتفع الشمس(٥٨٤)]

'' بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے دوسودوں، دولباسوں اور دو نمازوں سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فجر کے بعد طلوع شمس تک اور عصر کے بعد غروب شمس تک نماز سے منع فرمایا ہے۔''

اسی طرح اور احادیث میں بھی ذکر ہے لیکن یہ احادیث اپنے عموم پر نہیں ہیں بلکہ ان میں تخصیص ہو چکی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُصَلُّوْا بَعْدَ الْعَصْرِ اِلَّا اَنْ تُصَلُّوْا وَ الشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ » [مسند طیالسی(١/١٧)، مسند ابی یعلی (٥٨١،٤١١)، ابو داؤد (١٢٧٤)، ابن ابی شیبة(٣٤٨/٢)، نسائی (٥٧٤)، مسند احمد(١٠٧٦، ١٠٧٣)، ابن خزیمة(١٢٨٥)، صحیح ابن حبان(٦٢١)، بیھقی(٤٥٩/٢)، سلسلة الأحادیث الصحیحة (٢٠٠)]

'' عصر کے بعد نماز نہ پڑھو مگر سورج بلند ہو تو پھر پڑھ لو۔''

مندرجہ ذیل حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُصَلُّوْا عِنْدَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ لَا عِنْدَ غُرُوْبِهَا فَاِنَّهَا تَطْلُعُ وَ تَغْرُبُ عَلٰى قَرْنِ شَيْطَانٍ وَ صَلُّوْا بَيْنَ ذٰلِكَ مَا شِئْتُمْ » [مسند ابی یعلی(٤٢١٦)، (٢٢٠/٧)]

'' سورج کے طلوع اور غروب ہوتے وقت نماز نہ پڑھو، اس لیے کہ یہ شیطان کے سینگ پر طلوع و غروب ہوتا ہے اور اس کے دوران جس قدر چاہوں نماز پڑھ لو۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد نماز کی ممانعت مطلق طور پر نہیں بلکہ جب تک سورج بلند ہو، زردی مائل نہ ہو تو نوافل وغیرہ پڑھے جا سکتے ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ سے عصر کے بعد نماز پڑھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

« وَالَّذِیْ ذَهَبَ بِهٖ مَا تَرَكَهُمَا حَتّٰى لَقِیَ اللّٰهَ تَعَالٰى حَتّٰى ثَقُلَ عَنِ الصَّلَاةِ ......» [بخاری، کتاب مواقیت الصلاة: باب ما یصلی بعد العصر من الفوائت نحوھا(٥٩٠)]

'' اس کی قسم جو آپ ﷺ کو لے گیا آپ نے ان دو رکعتوں کو نہیں چھوڑا حتیٰ کہ اللہ سے جا ملے اور اللہ سے نہیں ملے حتیٰ کہ نماز سے بوجھل ہو گئے اور عصر کے بعد دو رکعتیں اکثر بیٹھ کر ادا کرتے تھے اور نبی ﷺ ان دو رکعتوں کو پڑھا کرتے تھے اور انھیں مسجد میں اپنی امت پر ثقیل ہونے کی وجہ سے ادا نہیں کرتے تھے، وہ امت کے لیے تخفیف پسند کرتے تھے۔''

دوسری روایت میں ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« رَكْعَتَانِ لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَدَعُهُمَا سِرًّا وَ لَا عَلَانِيَةً رَكْعَتَانِ قَبْلَ

الصُّبحِ وَ رَكْعَتَانِ بَعْدَ الْعَصرِ » [بخاری، کتاب مواقیت الصلاة: باب ما يصلى بعد العصر من الفوائت و نحوها(٥٩٢)]

''دو رکعتیں رسول اللہ ﷺ نہ خفیہ طور پر چھوڑتے تھے اور نہ علانیہ طور پر، دو رکعتیں صبح کی نماز سے پہلے اور دو رکعتیں عصر کی نماز کے بعد۔''

ایک روایت میں ہے کہ عبدالعزیز بن رفیع رحمہ اللہ کہتے ہیں:

« وَ رَأَيْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ وَ يُخْبِرُ اَنَّ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا حَدَّثَتْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَمْ يَدْخُلْ بَيْتَهَا اِلَّا صَلَّاهُمَا » [فتح الباری(٦٦/٢)]

''میں نے ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو عصر کے بعد دو رکعتیں ادا کرتے دیکھا، وہ بیان کرتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے انھیں خبر دی: ''نبی ﷺ ان کے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر آپ یہ دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔''

ام موسیٰ کہتی ہیں: ''میں نے علی رضی اللہ عنہ کو عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا۔'' [مسند ابی یعلی(٤٧٢٤، ٤٧٢٥)، المقصد الأعلى فى تقريب أحاديث الحافظ أبي يعلى (٥٤٠، ٥٤١)، (١٦٥/١)]

اسی طرح بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ سے بھی عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنا ثابت ہے جس کی تفصیل امام ابن حزم رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔ [المحلى (٣/ ٦٠٥)]

انھوں نے تیئس صحابہ کا تذکرہ کیا ہے جن میں خلفائے راشدین اور کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

بعض حضرات کا یہ کہنا کہ نبی ﷺ نے عصر کے بعد صرف فوت شدہ سنت کی قضا کی تھی اور ہمیں منع کر دیا ہے تو یہ بات درست نہیں۔ اوّلاً اس لیے کہ قضا تو صرف ایک دفعہ کرنی تھی نہ کہ ساری عمر، ثانیاً قضا کی ممانعت والی روایت درست نہیں اور وہ روایت مختلف کتب احادیث میں موجود ہے۔ [احمد(٣١٥/٢)، (٢٧٢١٣)، موارد الظمآن(٦٢٣)، مجمع الزوائد (٢٢٣/٢)، المقصد الأعلى (٥٣٨)]

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے نماز ادا کی پھر میرے گھر میں داخل ہوئے اور دو رکعتیں ادا کیں۔ میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے وہ نماز ادا کی ہے جو (پہلے) آپ ادا نہیں کرتے تھے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس وفد آ گیا تو اس نے مجھے ان دو رکعتوں سے مشغول کر دیا جو میں ظہر کے بعد پڑھتا تھا، سو میں نے اب انھیں ادا کر لیا ہے۔'' میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! جب یہ دونوں فوت ہو جائیں تو ہم بھی انھیں قضا کر لیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔'' [احمد (٣١٥/٦)]

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے کیونکہ حماد بن سلمہ کی کتب میں یہ روایت نہیں اور اس کی سند میں انقطاع بھی ہے چونکہ اس کی سند میں ذکوان ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بیان کر رہا ہے۔ ذکوان نے اس حدیث کو ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نہیں

سنا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابو ولید طیالسی نے اس حدیث کو حماد بن سلمہ سے ازازق از ذکوان از عائشہ از ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کیا ہے اور اس روایت میں قضا کی ممانعت کا ذکر نہیں، جس سے معلوم ہوا کہ ذکوان کی روایت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے اور اس میں ممانعت کا ذکر بھی نہیں، لہٰذا یہ اضافہ ساقط ہے۔

اسی طرح حماد بن سلمہ سے اس کو حجاج بن منہال نے [طبرانی(٢٤٨/٢٣)] اور عبد المالک بن ابراہیم [بیهقی(٤٥٧/٢)] نے بھی روایت کیا ہے اور ان میں بھی ممانعت والا اضافہ موجود نہیں۔ نیز ام سلمہ والی حدیث صحیح بخاری(۱۲۳۳، ۴۳۷۱) اور صحیح مسلم (۸۳۴) وغیرہ میں بھی موجود ہے، اس میں بھی قضا کی ممانعت مذکور نہیں۔ لہٰذا ممانعت والی روایت منکر ہے اور اس میں بیان کردہ اضافہ ساقط ہے۔ بہرکیف مذکورہ توضیح سے معلوم ہوا کہ نماز عصر کے بعد مطلق طور پر نماز منع نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ نے وفات تک عصر کے بعد دو رکعت ادا کی ہیں اور آپ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہ اللہ کی ایک جماعت اسی پر عمل پیرا رہی۔

سجدۂ تلاوت کا حکم

سوال وہ کون سی آیت ہے جس پر سجدہ لازم ہے؟

جواب قرآن مجید میں پندرہ ایسے مقامات ہیں جہاں سجدہ کرنا مسنون ہے۔ بعض اہل علم نے سورۃ الحج کے دوسرے سجدے کو شمار نہیں کیا جبکہ کچھ لوگوں نے اس کی جگہ سورۂ صٓ کے سجدے کو شمار نہیں کیا اور تعداد چودہ ذکر کی ہے۔ راجح بات یہی ہے کہ یہ دونوں سجدے بھی مسنون ہیں۔ سورۂ صٓ کا سجدہ صحیح بخاری (۱۰۲۹) میں مذکور ہے اور سورۃ الحج کے دونوں سجدے ابو داؤد (۱۴۰۲) کی حسن حدیث سے ثابت ہیں۔ ان مقامات پر سجدہ کرنا یا نہ کرنا دونوں امور جائز ہیں، البتہ نہ کرنے سے کر لینا افضل ہے، لیکن اسے لازم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے سورۃ النجم کا سجدہ کیا (بخاری: ۱۰۸۱)، صحیح بخاری کی دوسری حدیث میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے نبی ﷺ کو سورۃ النجم سنائی اور آپ ﷺ نے سجدہ نہیں کیا۔'' [بخاری، کتاب القرآن : باب من قرأ السجدة ولم يسجد (١٠٧٢)]

امام بخاری نے بھی سجدہ تلاوت کے مسنون ہونے کا باب ذکر فرمایا ہے:

﴿ بَابَ مَا جَاءَ فِيُ سَجُوُدِ الْقُرْآنِ وَ سُنَّتِهَا ﴾

سجدۂ تلاوت کے ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ ملتا ہے کہ آپ نے جمعہ کے دن سورۂ نحل کی تلاوت فرمائی، جب سجدے کا مقام آیا تو منبر سے نیچے اتر کر سجدہ کیا اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ آئندہ جمعہ آپ نے دوبارہ سورۂ نحل تلاوت فرمائی، جب سجدہ کی آیات پر پہنچے تو فرمایا: ''لوگو! ہم آیات سجدہ سے گزرتے ہیں، جو سجدہ کر لے اس کا عمل صحیح ہے اور جو نہ کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔'' (یہ کہہ کر) آپ نے سجدہ نہ کیا۔ اس روایت میں نافع حضرت عبداللہ بن عمر کا قول بیان فرماتے ہیں:

« إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَفْرِضْ عَلَيْنَا السُّجُوْدَ إِلَّا أَنْ نَّشَاءَ »[صحیح بخاری، ابواب ال: باب من رأى أن الله عزوجل لم یوجب السجود (۱۰۷۷)]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر سجدہ فرض نہیں کیا مگر ہم میں سے جو سجدہ کرنا چاہے (اس پر بھی کوئی حرج نہیں)۔''

رسول اللہ ﷺ کا نماز میں عمامہ باندھنا

(سوال) کیا رسول اللہ ﷺ کو حالت نماز میں عمامہ یا ٹوپی کے ساتھ دیکھا گیا ہے؟

(جواب) نبی مکرم ﷺ کا معمول تھا کہ آپ پگڑی و عمامہ باندھتے لیکن یہ تصریح کہ حالت نماز میں آپ کو دیکھا گیا ہو اس کا علم نہیں، البتہ بعض احادیث ایسی موجود ہیں جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ نے پگڑی باندھ کر ہی نماز پڑھائی ہوگی۔ عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ''میں نے نبی ﷺ کو پگڑی اور موزوں پر مسح کرتے دیکھا ہے۔'' [صحیح البخاری، کتاب الوضوء: باب المسح علی الخفین (۲۰۴)]

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''سفر میں رسول اللہ ﷺ پیچھے رہ گئے اور میں بھی آپ کے ساتھ پیچھے رہ گیا، جب آپ ﷺ قضائے حاجت سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''کیا آپ کے پاس پانی ہے؟'' میں آپ ﷺ کے پاس پانی لے کر آیا، آپ ﷺ نے اپنی ہتھیلیاں اور چہرہ دھویا اور اپنے بازوؤں سے کپڑا ہٹانے لگے تو جبہ کی آستین تنگ تھی، آپ نے جبے کے نیچے سے ہاتھ نکالا اور جبہ اپنے کندھوں پر ڈال دیا اور بازوؤں کو دھویا اور اپنی پیشانی اور پگڑی اور اپنے موزوں پر مسح کیا پھر سوار ہو گئے اور میں بھی سوار ہو گیا، ہم جب قوم کے پاس پہنچے تو وہ نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے، انھیں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے، آپ ﷺ نے ان کے ساتھ ایک رکعت پائی۔ جب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو محسوس کیا تو پیچھے ہٹنے لگے، آپ ﷺ نے ان کی طرف اشارہ کیا تو انھوں نے ان کو نماز پڑھائی۔'' [مسلم، کتاب الطهارة: باب المسح على الناصية والعمامة (۲۷۴)]

نبی ﷺ سے عمامہ اتارنا اس موقع پر ثابت نہیں جس سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ آپ نے عمامہ باندھ کر ہی نماز پڑھی ہو گی۔ (واللہ اعلم!)

عورتوں کا نماز میں پاؤں ڈھانپنا

(سوال) کیا نماز میں عورتوں کا جرابیں پہننا ضروری ہے؟

(جواب) عورت کو نماز کی ادائیگی کے وقت اپنا سارا جسم چھپانا چاہیے، ایک قمیص اور بڑے دوپٹے کے ساتھ بھی نماز پڑھ سکتی ہے بشرطیکہ قمیص اتنی لمبی ہو کہ پاؤں کی بالائی سطح بھی چھپ جائے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ''انہوں نے رسول

اللہ ﷺ سے سوال کیا: ''کیا عورت تہ بند کے بغیر قمیص اور اوڑھنی (بڑی چادر) میں نماز پڑھ سکتی ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''اگر قمیص اتنی لمبی ہو کہ قدموں کی پشت کو چھپالے تو درست ہے۔'' [ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ : باب فی کم تصلی المرأۃ (٦٤٠)]

اس روایت کو کئی ایک ائمہ نے موقوف قرار دیا ہے اور امام حاکم و امام ذہبی نے اسے بخاری کی شرط پر مرفوع قرار دیا ہے۔ علامہ امیر یمانی رحمہ اللہ ''سبل السلام'' میں فرماتے ہیں: ''یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے لیکن حکماً مرفوع ہے اس لیے کہ اس میں اجتہاد کو دخل نہیں۔'' [سبل السلام: ۳۰۵/۱]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کو نماز کی حالت میں اپنے پاؤں بھی چھپانے چاہییں، خواہ پاؤں قمیص کے اندر چھپ جائیں جب کہ قمیص لمبا ہو یا جرابیں پہن لی جائیں۔

❀❀❀❀❀❀

WWW. KITABOSUNNAT. COM
KITABOSUNNAT@GMAIL. COM

زکوٰۃ کے مسائل

WWW.KITABOSUNNAT.COM

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی سزا کیا ہے؟

(سوال) بہت سے مسلمان نماز تو پڑھتے ہیں اور حج بھی کرتے ہیں لیکن شریعت کے مطابق زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے بارے میں کیا شرعی حکم ہے؟

(جواب) (۱) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ○ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوبُهُمْ وَ ظُهُورُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ﴾ [التوبة:۳۴،۳۵]

''جو لوگ سونے اور چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجیے کہ جس دن اس خزانے کو آتشِ دوزخ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے جسے تم نے اپنے لیے خزانہ بنا کر رکھا تھا، پس اپنے خزانوں کا مزہ چکھو۔''

۲۔ ایک اور آیت میں ہے:

﴿ وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ [آل عمران:۱۸۰]

''جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کچھ دے رکھا ہے وہ اس میں کنجوسی کو اپنے لیے بہتر نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے لیے نہایت بدتر ہے، عنقریب قیامت والے دن یہ اپنی کنجوسی کی چیز کے طوق ڈالے جائیں گے۔''

۳۔ « عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَنْ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ مُثِّلَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا أَقْرَعَ لَهُ زَبِيبَتَانِ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ يَأْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ يَعْنِي بِشِدْقَيْهِ ثُمَّ يَقُولُ أَنَا مَالُكَ أَنَا كَنْزُكَ » [بخاری، کتاب الزکوٰۃ: باب إثم مانع الزکاۃ(۱۴۰۳)]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا لیکن اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اس کا مال گنجے زہریلے سانپ کی شکل اختیار کرے گا، جس کی آنکھوں پر دو سیاہ نقطے ہوں

گے اور وہ اس کے گلے کا ہار ہوگا، وہ اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑے گا اور کہے گا: ''میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔''

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کو روزِ قیامت سخت عذاب سے دوچار کیا جائے گا، اس لیے اس فریضہ کی ادائی میں کوتاہی ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

سونے چاندی کے نصاب پر زکوٰۃ

سوال اگر کسی کے پاس تین چار تولے سونا اور چھ سات سو روپے کی چاندی ہے تو کیا اس صورت میں اس مال پر زکوٰۃ عائد ہوگی؟

جواب نبی کریم ﷺ نے سونے اور چاندی کو الگ الگ نصاب مقرر کیا ہے، جس پر سال کا عرصہ گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، جو چالیسواں حصہ یعنی اڑھائی فیصد ہوتی ہے۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں صدقہ نہیں۔'' [بخاری، کتاب الزکاۃ: باب لیس فیما دون خمس: (۱٤٥۹)]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب تمھارے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو ان میں ۵ درہم ہیں، اس کے علاوہ اور تم پر کچھ لازم نہیں آتا جب تک تمھارے پاس بیس دینار نہ ہوں، جب تمھارے پاس بیس دینار ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو نصف دینار ہے پھر جو زیادہ ہو وہ اس کے حساب سے ہوگا۔'' [ابوداود، کتاب الزکاۃ: باب زکاۃ فی السائمۃ: (۱۵۷۳)]

معلوم ہوا کہ سونے کا نصاب ۲۰ دینار اور چاندی کا نصاب ۵ اوقیہ چاندی یعنی ۲۰۰ درہم ہے۔ ان کا وزن پاک و ہند کے عام علماء کے ہاں مشہور و معروف ہے کہ سونا ساڑھے سات تولے اور چاندی ساڑھے باون تولے پر مشتمل ہے۔ بعض علماء کے ہاں ۷۰ گرام سونا اور ۴۶۰ گرام چاندی ہو تو زکوٰۃ پڑتی ہے۔ [احکام زکوۃ وعشر (۲۱) از حافظ عبدالسلام بھٹوی]

لہٰذا آپ کے پاس موجود مقدار پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، ہاں اگر خوشی سے نفلی صدقہ کریں تو وہ آپ کی مرضی ہے۔

رجب میں زکوٰۃ دینا اور روزے رکھنا

سوال کیا رجب کے مہینے میں خاص اہتمام سے روزے رکھنا اور زکوٰۃ نکالنا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟ کیونکہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ رجب کا مہینا زکوٰۃ کا مہینا ہے۔

جواب رجب ایک ایسا مہینا ہے جسے عامۃ الناس نے عید و میلہ کا مہینا سمجھ رکھا ہے، خصوصاً ۲۷ رجب کی رات کو اور جتنا اس مہینا میں لوگ بعض علاقوں میں صدقات و خیرات کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ روزے رکھتے ہیں اور عمرے کا اہتمام کیا جاتا ہے شاید یہ اہتمام عام مہینوں میں نہیں کیا جاتا، جب کہ اس ماہ خصوصیت کے ساتھ روزے رکھنے اور زکوٰۃ نکالنے کے

متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں، سلف صالحین سے اس کی مخصوص فضیلت میں کوئی روایت ثابت نہیں ہے۔ عام حالت میں جس طرح ہر ہفتہ میں سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھا جاتا ہے یا چاند کی ۱۳،۱۴،۱۵ کے روزے یا ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزے رکھے جاتے ہیں وہ اس ماہ میں بھی اسی طرح رکھے جاسکتے ہیں لیکن اگر کوئی یہ سمجھے کہ رجب کے مہینے کے کوئی خاص روزے ہیں تو اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ اس ماہ کا احترام زمانہ جاہلیت میں لوگ خاص طور پر کرتے تھے۔ جیسا کہ المصنف لابن ابی شیبہ میں روایت ہے:''اہل جاہلیت اس کی تعظیم کرتے تھے۔[ابن ابی شیبة (۹۷۵۸)]

اور عاصم بن محمد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں:

''ابن عمر رضی اللہ عنہما جب لوگوں کو اور ان کی رجب کے لیے تیار کردہ چیزوں کو دیکھتے تو ناپسند کرتے۔'' (ابن ابی شیبہ، کتاب الصیام: باب فی صوم رجب ما جاء فیه (۹۷۶۱)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

ماہ رجب کی فضیلت، اس ماہ کے روزوں اور خصوصی طور پر اس کی راتوں کے قیام کے بارے کوئی صحیح حدیث جو قابل حجت ہو مروی نہیں اور مجھ سے پہلے اس پر امام ابو اسماعیل المروزی الحافظ نے جزم کیا ہے۔'' تبیین العجب عما ورد فی فضل رجب: (ص/ ۲۱) اور حافظ ابن رجب اس ماہ میں خصوصاً زکوٰۃ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس شہر کے لوگوں نے رجب میں زکوٰۃ نکالنے کو عادت بنا لیا ہے، اس کی سنت میں کوئی اصل نہیں اور نہ ہی سلف میں سے کسی ایک سے یہ بات معروف ہے۔'' [لطائف المعارف (ص/ ۱۲۵)، بحواله السنن والمبتدعات لعمرو عبد سلیم]

زکوٰۃ کے لیے قاعدہ شرعیہ یہ ہے کہ جس ماہ میں آدمی کے پاس اتنا مال آجائے جس پر زکوٰۃ لاگو ہوتی ہے تو وہاں سے حساب کر کے ایک سال گزرنے پر زکوٰۃ دی جائے تو سال کے بعد جو بھی مہینا آئے اس میں زکوٰۃ دی جائے۔ ہر شخص کے لیے رجب کا مہینا زکوٰۃ کے لیے مختص نہ کیا جائے۔ بہرکیف رجب کے مہینا میں مخصوص نماز، روزہ اور زکوٰۃ نکالنے کے متعلق کوئی صحیح بات موجود نہیں۔

زیورات پر زکوٰۃ

سوال زیر استعمال زیورات یا استعمال کے لیے عاریتاً دینے کے لیے تیار کرائے گئے زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں علماء کا اختلاف معروف ہے، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور اگر ان زیورات میں زکوٰۃ واجب ہونے کی بات مان لیں تو کیا اس کا بھی نصاب ہے؟ اور اگر کہتے ہیں کہ ان کا بھی نصاب ہے تو ان احادیث کا کیا جواب ہے جو زیورات میں زکوٰۃ کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں اور جن کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیورات کی زکوٰۃ نہ دینے والوں کو جہنم کی آگ کی وعید سنائی ہے مگر ان سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ کو نہیں پہنچتے ہیں؟

جواب سونے اور چاندی کے زیورات جو زیر استعمال ہیں یا استعمال کے لیے عاریتاً دینے کے لیے بنوائے گئے ہیں ان میں

زکوٰۃ کے واجب ہونے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف معروف ومشہور ہے لیکن راجح قول یہی ہے کہ ان زیورات میں بھی زکوٰۃ واجب ہے، کیونکہ سونے اور چاندی میں زکوٰۃ واجب ہونے کے جو دلائل ہیں وہ عام ہیں۔ نیز عبداللہ بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''ایک خاتون نبی ﷺ کے پاس آئی اور ان کی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے دو موٹے کنگن تھے۔ اسے دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟'' اس نے جواب دیا: ''نہیں'' آپ نے فرمایا: ''کیا تم کو یہ اچھا لگے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تمھیں آگ کے دو کنگن پہنائے؟'' چنانچہ اس نے وہیں دونوں کنگن اتار دیے اور کہا: ''یہ دونوں اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہیں۔'' [ابوداؤد، كتاب الزكاة: باب الكنز ما هو؟ (١٥٦٣)]

اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے حدیث ہے کہ وہ سونے کے زیورات پہنتی تھیں تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: ''کیا یہ کنز ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''جو مال زکوٰۃ کے نصاب کو پہنچ جائے اور پھر اس کی زکوٰۃ دے دی جائے تو کنز نہیں۔'' [ابوداؤد، كتاب الزكاة: باب الكنز ما هو؟: (١٥٦٤)]

آپ نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ زیورات میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

یہ ساری حدیثیں ان زیورات پر محمول کی جائیں گی جو نصاب زکوٰۃ کو پہنچ گئے ہوں تا کہ ان احادیث کے درمیان اور زکوٰۃ کے تعلق سے وارد دیگر دلائل کے درمیان تطبیق ہو جائے کیونکہ جس طرح قرآنی آیات ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں اور احادیث نبوی ﷺ بھی آیات کی تفسیر کرتی ہیں۔ نیز آیات کے عام کو خاص اور مطلق کو مقید کرتی ہیں، اسی طرح احادیث بھی بعض بعض کی تصدیق وتفسیر کرتی ہیں۔ زیورات میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے جس طرح ان کا مقدار نصاب تک پہنچنا ضروری ہے اسی طرح دیگر امور زکوٰۃ مثلاً روپے پیسے، سامان تجارت اور چوپایوں کی طرح زیورات پر ایک سال کی مدت کا گزرنا بھی ضروری ہے۔ واللہ ولی التوفیق!

مصارف زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟

سوال کتاب وسنت کی روشنی میں مصارف زکوٰۃ واضح فرما دیجیے؟

جواب مصارف زکوٰۃ کا مطلب ہے کہ وہ مدیں (جگہیں) جہاں پر زکوٰۃ صرف کی جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَ الْمَسَاكِينِ وَ الْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغَارِمِينَ وَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ [التوبة: ٦٠]

'' صدقات (زکوٰۃ کا مال) فقراء اور مساکین، زکوٰۃ وصول کرنے والے عاملین، نومسلموں کی تالیفِ قلب، غلاموں، قرضداروں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لیے، فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ

علم وحکمت والا ہے۔''

یہ آٹھ مصارف زکوٰۃ ہیں، ان آٹھوں کی مختصر وضاحت درج ذیل ہے۔

فقراء ومساکین:...... فقیر سے مراد وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس تھوڑا بہت خرچ موجود ہو یعنی اس کی آمدنی اس کی ضرورت سے بہت تھوڑی ہو۔

عاملین:...... وہ لوگ جو خلیفۂ اسلام یا مسلمانوں کے امیر کی طرف سے زکوٰۃ جمع کرنے پر مامور ہوں۔ ان کی تنخواہوں وغیرہ پر زکوٰۃ کا مال صرف ہو سکتا ہے۔

مؤلفۃ القلوب:...... اس سے مراد وہ ضعیف الایمان مسلمان ہیں جن کی اگر دلجوئی یا مالی اعانت نہ کی جائے تو ان کے اسلام سے منحرف ہونے کا خطرہ ہو۔

فی الرقاب:...... یعنی اگر کوئی مسلمان آدمی غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو مال زکوٰۃ سے اسے غلامی سے آزادی دلا دی جائے تو درست ہے۔

غارمین:...... ان سے مراد وہ مقروض ہیں جن پر اتنا قرض چڑھ چکا ہو کہ جس کے اتارنے کی وہ سکت نہ رکھتے ہوں۔ مگر یاد رہے کہ اگر کوئی آدمی خلاف شرع کاموں مثلاً شراب، جوا، وغیرہ میں مال خرچ کرنے کی وجہ سے مقروض ہو گیا ہو تو اس پر زکوٰۃ کا مال صرف کرنے سے گریز کرنا چاہیے جب تک وہ توبہ نہ کر لے۔

فی سبیل اللہ:...... اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو محاذ جنگ پر دشمنان اسلام کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ یہ لوگ غنی بھی ہوں تب بھی ان کی اعانت مال زکوٰۃ سے کرنا جائز ہے تاکہ وہ سامان حرب جیسا کہ دورِ حاضر میں کلاشنکوف، گرینوف، زیکویک وغیرہ گنیں خرید کر دشمن اسلام کا مقابلہ کر سکیں۔

ابن السبیل:...... اس سے مراد وہ مسافر ہیں جو اپنے وطن سے دور ہیں اور ان کے پاس خرچ ختم ہو گیا ہے تو مال زکوٰۃ سے ان کی اعانت کرنا جائز ہے۔

مجاہدین کو زکوٰۃ دینا

سوال بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مجاہدین زکوٰۃ کے مستحق نہیں کیا کتاب وسنت کی رو سے مجاہدین کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟

جواب اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والوں کو زکوٰۃ دینا شرعی طور پر درست اور جائز ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے ایک مد مجاہدین کے لیے رکھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَ الْمَسَاكِيْنِ وَ الْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغَارِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [التوبة:٦٠]

''صدقات صرف فقیروں کے لیے ہیں اور مسکینوں کے لیے اور ان کے وصول کرنے والوں کے لیے اور ان کے لیے

جن کے دل پرچائے جاتے ہوں اور گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں (جہاد کرنے والوں کے لیے) اور مسافروں کے لیے، فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے۔''

اس آیت میں آٹھ مصارف زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سے ایک فی سبیل اللہ ہے ۔ فی سبیل اللہ کا مصرف جو باقی سات کے مقابلے میں ذکر ہوا ہے اس سے بالاتفاق جہاد مراد ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" وَ اَمَّا فِیُ سَبِیُلِ اللّٰهِ فَمِنُهُمُ الُغُزَاةُ الَّذِیُنَ لَا حَقَّ لَهُمُ فِی الدِّیُوَانِ " [تفسیر ابن کثیر (ص:٦١٦)، مطبوعة دار السلام]

''فی سبیل اللہ میں وہ مجاہدین ،غازی داخل ہیں جن کا (سرکاری) دفتر میں کوئی حق نہیں ہوتا۔''

ابن عبدالحکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" وَ یُجُعَلُ مِنَ الصَّدَقَةِ فِی الُکُرَاعِ وَ السِّلَاحِ وَ مَا یَحُتَاجُ اِلَیُهِ مِنُ آلَاتِ الُحَرُبِ وَ کَفِّ الُعَدُوِّ عَنِ الُحَوُزَةِ لِاَنَّهُ کُلُّهُ مِنُ سَبِیُلِ الُغَزُوِ وَ مَنُفِعَتِهِ " [البحر المحيط(٦٠/٥)]

''صدقہ وزکوٰۃ میں سے گھوڑے، خچر، گدھے، اسلحہ اور آلات حرب میں سے جس کی ضرورت ہو، حاصل کیے جائیں گے اور دشمن کو سرحدوں سے روکنے کے لیے یہ تمام اشیاء لڑائی کی راہ میں اور اس کی منفعت میں سے ہیں۔''

امام ابوبکر بن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا:

" سُبُلُ اللّٰهِ کَثِیُرَةٌ وَ لٰکِنِّیُ لَا اَعُلَمُ خِلَافًا فِیُ اَنَّ الُمُرَادَ فِیُ سَبِیُلِ اللّٰهِ هٰهُنَا الُغَزُوُ مِنُ جُمُلَةِ فِیُ سَبِیُلِ اللّٰهِ " [احکام القرآن (٩٦٩/٢)]

''اللہ کے راستے بہت زیادہ ہیں لیکن میں اس کے بارے میں نہیں جانتا کہ کسی نے اس بات میں اختلاف کیا ہو کہ یہاں سبیل اللہ سے مراد لڑائی یا غزوہ ہے۔''

یعنی اس آیت میں فی سبیل اللہ سے مراد بالاتفاق اللہ کے راستے میں لڑائی وغزوہ ہے اور ان پر زکوٰۃ صرف کرنا بالکل صحیح ہے۔

عصر حاضر میں کتنے ہی ایسے بھائی ہیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اپنا سب کچھ وقف کر چکے ہیں اور اللہ کے دین کی سر بلندی کے لیے کفار سے برسر پیکار ہیں۔ ان کی خدمت کرنا اور آلات حرب خرید کر دشمنان دین کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ اس لیے مجاہدین کی زکوٰۃ فنڈ سے امداد کرنا بالکل صحیح اور درست ہے اور وقت کی اہم ضرورت بھی ہے کیونکہ جتنا کفر مجاہدین سے خائف ہے اتنا دیگر مسلمانوں سے نہیں۔

صدقہ فطر کا حکم

سوال صدقہ فطر کا کیا حکم ہے اور کیا اس میں بھی نصاب ہے؟ اور کیا صدقہ فطر میں جو غلہ جات نکالے جاتے ہیں وہ متعین ہیں؟ اور اگر متعین ہیں تو کیا کیا ہیں؟ اور کیا مرد پر سارے گھر کی جانب سے، جن میں بیوی اور خادم بھی ہیں، صدقہ فطر نکالنا واجب ہے؟

(جواب) صدقہ فطر ہر مسلمان پر فرض ہے،خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح حدیث ہے وہ بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے ہر مسلمان مرد اور عورت، چھوٹے اور بڑے، آزاد اور غلام پر ایک صاع کھجور یا ایک صاع ''جو'' صدقہ فطر فرض قرار دیا ہے اور مسلمانوں کے نماز عید کے لیے نکلنے سے پہلے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔'' [صحیح بخاری، كتاب الزكاة : باب فرض صدقة الفطر (۱۵۰۳)]

صدقہ فطر کے لیے نصاب شرط نہیں بلکہ ہر وہ مسلمان جس کے پاس اپنے لیے اور اپنے بال بچوں کے لیے ایک دن اور ایک رات کی خوراک سے زائد غلہ ہو اسے اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے جن میں اس کے بچے، بیویاں اور زرخرید غلام اور لونڈی شامل ہیں، صدقہ فطر نکالنا ہوگا۔

وہ غلام یعنی خادم جسے اجرت، تنخواہ پر رکھا گیا ہو وہ اپنے صدقہ فطر کا خود ذمہ دار ہے، الا یہ کہ مالک بطور احسان اپنی طرف سے ادا کر دے یا خادم نے مالک پر صدقہ فطر کی شرط لگا رکھی ہو۔ لیکن زرخرید غلام کا صدقہ فطر تو جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے، مالک کے ذمہ ہے۔ صدقہ فطر کا علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق شہر کی خوراک کی جنس سے نکالنا ضروری ہے، خواہ کھجور ہو یا جو، گیہوں ہوں یا مکئی یا اس کے علاوہ کوئی اور غلہ ہو اور اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں کسی خاص قسم کے غلے کی شرط نہیں رکھی ہے اور اس لیے بھی کہ اس سے غرباء و مساکین کے ساتھ ہمدردی مقصود ہوتی ہے۔

مسجد کے قاری کو صدقہ فطر دیا جا سکتا ہے؟

(سوال) کیا ہم اپنی مسجد میں قرآن پڑھانے والے قاری صاحب کی تنخواہ صدقہ فطر سے ادا کر سکتے ہیں؟

(جواب) صدقہ فطر فقراء و مساکین کا حق ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ زَكَاةَ الْفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَ الرَّفَثِ وَ طُعْمَةً لِلْمَسَاكِيْنِ » [ابن ماجه، كتاب الزكاة : باب صدقة الفطر (۱۸۲۷)]

''نبی اکرم ﷺ نے صدقہ فطر فرض قرار دیا ہے جو روزہ دار کے لیے فضول و بے کار باتوں سے طہارت کا باعث ہے اور مساکین کے لیے کھانے کا باعث ہے۔''

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر مساکین کا حق ہے لہٰذا اس مال سے قاری صاحب کی تنخواہ ادا نہیں کی جا سکتی۔ ہاں اگر وہ مساکین کے زمرے میں داخل ہیں تو انھیں صدقہ فطر دیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

مقروض آدمی کا عشر دینا

(سوال) ایک ایسا آدمی جس نے کسی دوسرے آدمی سے زمین ٹھیکا پر لے کر گندم کی فصل کاشت کی ہو اور اس پر قرض بھی ہو تو

کیا اس آدمی پر بھی پورا پورا عشر دینا فرض ہے یا کہ کمی بیشی ہو سکتی ہے؟ براہ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(جواب) کوئی آدمی مقروض ہو اور اس کے پاس زمین کی آمدنی کے علاوہ دیگر ذرائع آمدنی ہوں جس میں سے وہ قرض ادا کر سکتا ہو تو اسے زمین سے حاصل ہونے والی ساری آمدنی سے عشر ادا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! خرچ کرو پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس میں سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے۔'' [البقرة:٢٦٧]

اس آیت میں اللہ نے زمین سے نکلنے والی ساری آمدنی میں سے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر اس کے پاس زمینی آمدنی کے علاوہ اور کوئی ذریعہ آمدن نہیں ہے تو وہ زمین کی آمدنی سے اپنا قرض اتارے اور باقی سے عشر دے اور اگر قرض اتنا ہے کہ ادا کرنے کے بعد آمدنی سے کچھ نہیں بچتا ہے تو قرض ادا کر دے، اس پر عشر فرض نہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے مسلمانوں پر جو صدقہ فرض کیا ہے وہ اغنیاء سے لیا جاتا ہے اور فقراء پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری (۴۳۹۵) میں موجود ہے۔

جس آدمی کا سارا مال ہی قرض میں جا رہا ہو تو وہ غنی نہیں بلکہ فقیر ہے اور اللہ تعالیٰ کسی آدمی کو اس کی وسعت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔

زمین ٹھیکا پر دینا اور ٹھیکا والی زمین کے عشر کا حکم

(سوال) زمین ٹھیکے پر دینا جائز ہے یا ناجائز؟ دلائل سے ثابت کریں۔ اگر جائز ہے تو عشر مالک دے گا یا مزارع؟

(جواب) زمین کو اگر کرائے پر دینا ہو تو روپے پیسے کے عوض یا کل پیداوار میں سے مقرر کردہ حصہ کے بدلے میں دے، شرعی طور پر اس کی رخصت موجود ہے۔ صحیح بخاری (۲۳۳۱) میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو زمین اس شرط پر دی کہ وہ اس میں کاشت کاری کریں تو کل پیداوار میں سے نصف حصہ ان کا ہوگا اور نصف ہمارا۔ اسی طرح مسلم میں ہے کہ رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''ہم زمین کو کرائے پر اس طرح دیتے تھے کہ طے کر لیتے کہ زمین کے اس حصے کی پیداوار ہماری اور اس حصے کی ان کے لیے، تو اس طرح کبھی ایک طرف پیداوار ہوتی اور دوسری طرف نہ ہوتی تو آپ ﷺ نے ہمیں اس سے منع کر دیا لیکن چاندی کے عوض دینے سے منع نہیں کیا۔'' [صحيح مسلم، كتاب البيوع : باب كراء الأرض: (١٥٤٧)]

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین اگر کرائے یا ٹھیکے پر دینا ہو تو اس کا کرایہ یا ٹھیکا رقم کی صورت میں بھی لیا جا سکتا ہے اور غلے کی صورت میں بھی۔ اس زمین سے جو پیداوار ہوتی ہے اس کا عشر مزارع دے گا کیونکہ فصل کا مالک کاشتکار ہے مالک زمین نہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم نے کمائی ہیں اور اس میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے

زمین سے نکالا ہے۔'' [البقرۃ:٢٦٧]

اور جو زمین کا مالک ہے جس نے ٹھیکے یا کرائے پر زمین دی ہے اسے جو رقم ملے اگر اس کے پاس پہلے سے اتنی رقم ہے جو نصاب زکوٰۃ کو پہنچتی ہے تو اس میں ملا کر زکوٰۃ کا حساب کر کے زکوٰۃ دے گا اور اگر اس سے پہلے وہ صاحب نصاب نہیں اور جو رقم اسے ٹھیکے میں ملی ہے وہ اتنی ہے کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے تو سال کا عرصہ گزرنے پر اس میں سے زکوٰۃ دے گا۔

آل رسول ﷺ کو زکوٰۃ دینا

سوال کیا سید یعنی آل رسول کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟ یعنی وہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں یا نہیں؟

جواب زکوٰۃ اور صدقات کے اصل حق دار آٹھ ہیں جن کا ذکر سورۂ توبہ کی آیت (٦٠) میں موجود ہے اور ان میں سید اور آل رسول کا ذکر نہیں ہے، کیونکہ ان کے لیے زکاۃ کا مال حلال نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« وَ اِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَ لَا لِآلِ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ) »[مسلم ، كتاب الزكاة : باب ترك استعمال آل النبى على الصدقة(١٠٧٢)]

''بلاشبہ صدقہ محمد اور آل محمد (ﷺ) کے لیے حلال نہیں۔''

لہٰذا جو بھی رسول اللہ ﷺ کے خاندان کا ہے خواہ مرد ہو یا عورت اس کے لیے صدقہ و زکوٰۃ حلال نہیں ہے۔

کن فقراء کو زکوٰۃ دینی چاہیے

سوال آج کل مانگنا ایک پیشہ بن چکا ہے مہربانی کر کے بتا دیں کہ کس قسم کے فقیروں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾ [البقرۃ:٢٧٢،٢٧٣]

''اور جو بھی تم بھلی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ خود پاؤ گے۔ تمھیں صرف اللہ کی رضا مندی طلب کرنے کے لیے خیرات کرنی چاہیے اور جو بھی تم بھلی چیز خرچ کرو گے تمھیں اس کا پورا پورا بدلا دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ صدقات کے مستحق صرف وہ فقراء ہیں جو اللہ کی راہ (جہاد) میں روک دیے گئے ہیں، جو زمین میں (کاروبار وغیرہ) کے لیے چل پھر نہیں سکتے۔ نادان لوگ ان کی بے سوالی کی وجہ سے انھیں مالدار خیال کرتے ہیں۔ آپ ان کی علامت سے انھیں پہچان لیں گے۔ وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے اور تم جو کچھ مال خرچ کرو گے بے شک اللہ تعالیٰ اسے جاننے والا ہے۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ہمارے صدقات و خیرات اور اموال کے مستحق وہ لوگ ہیں جو'' جہاد فی سبیل اللہ'' میں روکے گئے ہیں اور وہ جو فقیر و محتاج ہیں مگر ضرورت ہوتے ہوئے بھی لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر دست سوال دراز نہیں کرتے، کیونکہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا ان کی خود داری اور عزت نفس کے منافی ہے۔ اس آیت کریمہ میں فقیر و غریب کے جو اوصاف ذکر کیے گئے ہیں وہ انتہائی قابل توجہ ہیں مثلاً:

۱۔ التعفف: اس کا مطلب سوال سے بچنا، یعنی فقر و غربت کے باوجود یہ لوگ لوگوں سے سوال کرنے سے گریز کریں گے۔ کیونکہ شریعت اسلامیہ میں بھیک مانگنے کو پسند نہیں کیا گیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَاَنْ یَّاْخُذَ اَحَدُکُم حَبْلَهُ فَیَاْتِی الْحَبَلَ فَیَجِیْءُ بِحَزْمَةِ حَطَبٍ عَلٰی ظَهْرِهِ فَیَبِیْعَهَا فَیَسْتَسْقِیْ بِثَمَنِهَا خَیْرٌ لَهُ مِنْ اَنْ یَّسْأَلَ النَّاسَ اَعْطَوْهُ اَوْ مَنَعُوْهُ » [ابن ماجه، کتاب الزکاة: باب کراهية المسئلة(١٨٣٦)، بخاری، کتاب الزکاة: باب الاستعفاف عن المسئلة(١٤٧١)، مسند احمد(١٦٤/١)]

'' تم میں سے کوئی شخص اپنی رسی پکڑ کر پہاڑ پر جائے اور اپنی پشت پر لکڑیوں کا گٹھا لاد کر لائے اور اسے فروخت کر کے اس کی قیمت پر قناعت کرے تو اس کے حق میں لوگوں سے سوال کرنے سے بہتر ہے کہ لوگ اسے دیں یا نہ دیں۔''

اسی معنی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث مروی ہے۔ [بخاری ، کتاب الزکاة: باب الاستعفاف عن المسئلة(١٤٧٠)، نسائی، کتاب الزکاة: باب المسئلة(٢٥٨٥)، مسند احمد(٢٥٧/٢۔٣٠٠)]

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« وَ مَنْ یَّتَقَبَّلُ لِیْ بِوَاحِدَةٍ وَ اَتَقَبَّلُ لَهُ بِالْجَنَّةِ قُلْتُ اَنَا قَالَ لَا تَسْأَلِ النَّاسَ شَیْئًا قَالَ فَكَانَ ثَوْبَانُ یَقَعُ سَوْطُهُ وَ هُوَ رَاكِبٌ فَلَا یَقُوْلُ لِاَحَدٍ نَاوِلْنِیْهِ حَتّٰی یَنْزِلَ فَیَاْخُذَهُ » [ابن ماجه، کتاب الزکاة: باب کراهية المسئلة(١٨٣٧)، ابو داؤد ، کتاب الزکاة: باب کراهية المسئلة (١٦٤٣)، نسائی، کتاب الزکاة: باب فضل من لا یسأل الناس شیئًا (٢٥٩١)، حاکم (٤١٢/١)، الترغیب والترھیب (٥٨١/١)]

'' جو شخص میری ایک بات قبول کرے گا میں اس کے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں۔'' میں نے کہا:'' میں قبول کرتا ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' لوگوں سے کسی چیز کا بھی سوال نہ کر۔'' ثوبان رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی کہ وہ سوار ہوتے اور ان کا کوڑا گر جاتا تو وہ کسی سے یہ نہ کہتے کہ میرا کوڑا مجھے پکڑا دو بلکہ خود اتر کر اٹھاتے۔''

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ سَأَلَ وَ لَهُ مَا یُغْنِیْهِ جَاءَتْ مَسْئَلَتُهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ خُدُوْشًا اَوْ خُمُوْشًا اَوْ كُدُوْحًا فِیْ وَجْهِهِ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَ مَا یُغْنِیْهِ ؟ قَالَ خَمْسُوْنَ دِرْهَمًا اَوْ قِیْمَتُهُ مِنَ الذَّهَبِ »

[ابن ماجه، کتاب الزکاة : باب من سأل عن ظهر غنی (١٥٠٢)، نسائی، کتاب الزکاة: باب حد الغنی(٢٥٩٣)، ابو داؤد، کتاب الزکاة ، باب من یعطی من الصدقة و حد الغنی(١٦٢٦)، ترمذی، کتاب الزکاة: باب ما جاء من تحل له الزکاة (٦٥٠،٦٥١)، سلسلة الأحادیث الصحیحة (٤٩٩)]

’’جس شخص نے سوال کیا اور اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے کفایت کرتا ہے تو قیامت کے دن وہ سوال اس کے چہرے پر چھلا ہوا نشان بن کر آئے گا۔‘‘ سوال کیا گیا: ’’اے اللہ کے رسول! آدمی کو کتنا مال کفایت کرتا ہے؟‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’پچاس درہم یا اتنی قیمت کا سونا۔‘‘

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنا معیوب ہے، کوئی خود دار انسان اسے پسند نہیں کرتا۔ جس شخص کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ اسے کفایت کرتا ہو پھر بھی وہ بھیک مانگے تو اس کے بھیک مانگنے کے باعث قیامت کے دن اس کے منہ پر زخم کا نشان ہوگا اور جو آدمی مسلسل بھیک مانگتا رہتا ہے، قیامت والے دن اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَا زَالَ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ حَتّٰى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِيْ وَجْهِهِ مُزْعَةُ لَحْمٍ » [بخاری ، كتاب الزكاة : باب من سأل الناس تكثرا (١٤٧٤)، مسلم، كتاب الزكاة: باب كراهة المسئلة للناس (١٠٤٠)، نسائی، كتاب الزكاة: باب المسئلة(٢٥٨٦)]

’’آدمی لوگوں سے ہمیشہ سوال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت والے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔‘‘

لہٰذا لوگوں سے بھیک مانگنے سے حتی الوسع بچنا چاہیے اور جو آدمی لوگوں سے بھیک مانگنے سے بچنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے توفیق عطا کر دیتا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بعض انصاری صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے انھیں دے دیا، انھوں نے پھر سوال کیا تو آپ ﷺ نے انھیں پھر دے دیا۔ انھوں نے پھر سوال کیا آپ نے انھیں دے دیا، حتیٰ کہ آپ کے پاس جو کچھ بھی تھا ختم ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَا يَكُوْنُ عِنْدِيْ مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ أَدَّخِرَهُ عَنْكُمْ وَ مَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَ مَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ وَ مَنْ يَّتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ وَ مَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَ أَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ » [بخاری، كتاب الزكاة: باب الاستعفاف عن المسئلة(١٤٦٩)، مسلم، كتاب الزكاة: باب فضل التعفف والصبر(١٠٥٣)، ترمذی، كتاب البر و الصلة: باب ما جآء فی الصبر(٢٠٢٤)، نسائی، كتاب الزكاة: باب الاستعفاف عن المسئلة(٢٥٨٩)، ابو داؤد، كتاب الزكاة: باب فی الاستعفاف(١٦٤٤)]

’’جو کچھ میرے پاس مال ہوتا ہے میں اسے تم سے روک کر نہیں رکھتا۔ جو شخص سوال سے بچاؤ طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بچا لیتا ہے اور جو غنا طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے غنا دے دیتا ہے اور جو صبر کرنے کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے صبر کی توفیق دے دیتا ہے۔ کسی شخص کو صبر سے بڑھ کر وسیع اور خیر والی چیز نہیں دی گئی۔‘‘

لہٰذا ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنے اور بھیک مانگنے سے بچا کر رکھے۔ وہ مسلمان کامیاب ہے جو اپنے رزق پر قناعت کرے اور کسی سے سوال نہ کرے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن

عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَ رُزِقَ كَفَافًا وَ قَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ » [مسلم، كتاب الزكاة: باب في الكفاف و القناعة(١٠٥٤)، ابن ماجه، (٤١٣٨)، ترمذى (٢٣٤٨)، شرح السنة(٢٤٠/١٤)، مسند احمد (١٦٨/٢)، بيهقى(١٩٦/٤)، حلية الأولياء (١٢٩/٦)]

''وہ شخص کامیاب ہوگیا جو اسلام لایا اور حسب ضرورت روزی دیا گیا اور جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا اس پر اسے قناعت کی توفیق بخشی۔''

لہٰذا بہترین مسلمان وہ بھی ہے جو حسب ضرورت روزی دیا گیا تو اس نے اسی پر قناعت کی اور لوگوں سے بھیک نہیں مانگی، اللہ تعالیٰ ہمیں بھیک مانگنے سے محفوظ فرمائے اور جتنی روزی وہ عطا کرے اس پر قناعت کی توفیق بھی عطا کرے۔ (آمین!)

اگر سوال کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو تو نیک لوگوں سے سوال کر لینا چاہیے کیونکہ نیک لوگ جو بھی صدقات و خیرات کرتے ہیں وہ محض اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں اور سائل کو محروم نہیں کرتے۔ عام دنیا دار لوگ اگر ایک آدھ بار تعاون کر بھی دیں تو وہ لوگ انسان کی عزت نفس اور خود داری کو مجروح بھی کر دیتے ہیں جب کہ اللہ کا خوف رکھنے والے لوگ انسان کی محتاجی اور فقر سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے اور کسی موقع پر کیے ہوئے اپنے تعاون کو جتلاتے تک نہیں۔ اس سے انسان کی حرمت و عزت بھی محفوظ رہتی ہے، جس طرح انصاری صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا۔ (واللہ اعلم)

۲۔ الحاف: سورۂ بقرہ کی اس آیت کریمہ میں، جسے ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے، مسکین کی دوسری صفت ''الحاف'' کی نفی بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بالکل سوال نہیں کرتے، کیونکہ ان کی پہلی صفت ''عفت'' بیان کی گئی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ سوال میں الحاح و زاری نہیں کرتے اور جس چیز کی انھیں ضرورت نہیں ہے اسے لوگوں سے طلب نہیں کرتے۔ اس لیے کہ الحاف یہ ہے کہ ضرورت نہ ہونے کے باوجود (بطور پیشہ) لوگوں سے مانگے۔ [تفسیر احسن البیان(ص/١٥٤)]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ بِهٰذَا الطَّوَافِ الَّذِىْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ فَتَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَ اللُّقْمَتَانِ وَ التَّمْرَةُ وَ التَّمْرَتَانِ قَالُوْا فَمَا الْمِسْكِيْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَالَ الَّذِىْ لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ وَ لَا يُفْطَنُ لَهُ فَيُتَصَدَّقَ عَلَيْهِ وَ لَا يَسْأَلُ النَّاسَ شَيْئًا » [بخارى، كتاب الزكاة: باب قول الله عزوجل لا يسألون الناس الحافًا (١٤٧٦)، مسلم، كتاب الزكاة: باب المسكين الذى لا يجد غنى ولا يفطن له فيتصدق عليه (١٠٣٩)]

''مسکین وہ نہیں ہے جو ایک ایک دو دو لقمے یا ایک ایک دو دو کھجور کے لیے لوگوں کے در پر جا کر سوال کرتا ہے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! پھر مسکین کون ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسکین وہ ہے جو حسب ضرورت مال نہیں پاتا، اس کا ادراک نہیں کیا جاتا کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ وہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال ہی کرتا ہے۔''

صحیح مسلم میں مذکورہ باب کے تحت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح بھی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ بِالَّذِیْ تَرُدُّهُ التَّمْرَةُ وَ التَّمْرَتَانِ وَ لَا اللُّقْمَةُ وَ اللُّقْمَتَانِ اِنَّ الْمِسْكِيْنَ الْمُتَعَفِّفُ اِقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ ﴿ لَا يَسْأَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ » [نیز دیکھیں، بخاری، کتاب التفسیر: باب لا یسألون الناس الحافا(٤٥٣٩)]

''مسکین وہ نہیں جو ایک ایک دو دو کھجور یا ایک دو لقمے کے لیے در در پھرتا ہے، مسکین تو وہ ہے جو سوال کرنے سے بچتا ہے، اگر تم چاہو تو یہ آیت کریمہ پڑھ لو: ''وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے۔''

الحاف کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُلْحِفُوْا فِی الْمَسْئَلَةِ فَوَاللّٰهِ لَا يَسْأَلُنِیْ اَحَدٌ مِّنْكُمْ شَيْئًا فَتُخْرِجُ لَهُ مَسْئَلَتُهُ مِنِّیْ شَيْئًا وَ اَنَا كَارِهٌ فَيُبَارَكَ لَهُ فِيْمَا اَعْطَيْتُهُ » [مسلم، کتاب الزکاۃ: باب النهی عن المسائلة(١٠٣٨)، نسائی، کتاب الزکاۃ: باب الإلحاف فی المسئلة(٢٥٩٤) ، مسند احمد (٩٨/٤)، بیهقی(١٩٦/٤)، مستدرك حاكم (٦٢/٢)، طبرانی کبیر(٣٤٨/١٩)، حلية الأولياء (٨١/٤)]

''گڑگڑا کر اور چمٹ کر سوال نہ کرو، اللہ کی قسم! تم میں سے جو کوئی مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے اور اس کا سوال مجھ سے کوئی چیز نکلوا لیتا ہے اور میں اسے ناپسند کر رہا ہوتا ہوں تو جو میں اس کو دیتا ہوں اللہ اس میں برکت نہ دے گا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ الحاف یعنی کسی کے سامنے الحاح و زاری کر کے اور چمٹ کر سوال کرنا منع ہے۔ جس شخص کے پاس چالیس درہم ہوں پھر وہ لوگوں سے گریہ و زاری کر کے سوال کرے تو وہ الحاف کرنے والا ہے۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« سَرَّحَتْنِیْ اُمِّیْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَاَتَيْتُهُ وَ قَعَدْتُ فَاسْتَقْبَلَنِیْ وَ قَالَ مَنِ اسْتَغْنٰی اَغْنَاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَ مَنِ اسْتَعَفَّ اَعَفَّهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَ مَنِ اسْتَكْفٰی كَفَاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَ مَنْ سَأَلَ وَ لَهُ قِيْمَةُ اُوْقِيَّةٍ فَقَدْ اَلْحَفَ فَقُلْتُ نَاقَتِی الْيَاقُوْتَةُ خَيْرٌ مِّنْ اُوْقِيَةٍ فَرَجَعْتُ وَ لَمْ اَسْأَلْهُ »[نسائی ، کتاب الزکاۃ: باب من الملحف (٢٥٩٦)، ابو داؤد، کتاب الزکاۃ : باب من یعطی من الصدقة و حد الغنی (١٦٢٨)، ابن خزیمة(٢٤٤٧)، ابن حبان(٨٤٦۔موارد) مسند احمد (٧/٣)، بیهقی (٢٤/٧)]

'' میری ماں نے مجھے رسول اللہ ﷺ کی طرف روانہ کیا۔ میں آپ ﷺ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا۔ آپ ﷺ میری طرف منہ کر کے بیٹھ گئے اور فرمایا: '' جو شخص لوگوں سے بے پروائی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے بے پروا کر دے گا اور جو شخص سوال سے بچے گا اللہ تعالیٰ اسے بچا لے گا اور جو تھوڑے پر کفایت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے کفایت دے گا اور جو شخص سوال کرے گا اور اس کے پاس ایک اوقیہ (۴۰ درہم) کے برابر مال ہو گا تو اس نے الحاف کیا۔'' میں نے دل میں کہا: '' میری یاقوتہ اونٹنی ایک اوقیہ سے بہتر ہے، میں واپس پلٹ آیا اور آپ ﷺ سے سوال نہ کیا۔''

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ سَاَلَ وَ لَهُ اَرْبَعُوْنَ دِرْهَمًا فَهُوَ الْمُلْحِفُ»[نسائی، کتاب الزکاة: باب من الملحف(٢٥٩٥)، بیهقی(٢٤/٧)]

"جس شخص نے سوال کیا اور اس کے پاس چالیس درہم ہوں تو وہ ملحف ہے یعنی لوگوں سے چمٹ کر سوال کرنے والا ہے۔"

بنو اسد میں سے ایک آدمی نے کہا:

"میں اور میرے گھر والے بقیع الغرقد (مدینہ کے قبرستان کا نام) میں اترے تو میری اہلیہ نے مجھے کہا:" رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر کھانے کے لیے کسی چیز کا سوال کر۔" میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا تو آپ کے پاس میں نے ایک آدمی کو پایا جو آپ ﷺ سے سوال کر رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اسے کہہ رہے تھے:" میرے پاس کچھ نہیں ہے جو میں تمھیں دوں۔" وہ ناراض ہو کر پیٹھ پھیر کر چلا اور کہنے لگا:" مجھے عمر دینے والے کی قسم ہے! تم اس کو دیتے ہو جسے چاہتے ہو۔" آپ ﷺ نے فرمایا:" یہ شخص مجھ پر غصے ہوتا ہے اس بات پر کہ میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔" اور فرمایا:

«مَنْ سَأَلَ مِنْكُمْ وَ لَهُ اُوْقِيَّةٌ اَوْ عِدْلُهَا فَقَدْ سَأَلَ اِلْحَافًا»

"تم میں سے جس آدمی نے سوال کیا اور اس کے پاس ایک اوقیہ (۴۰ درہم) یا اس کے برابر مال ہو تو اس نے چمٹ کر سوال کیا۔"

اسدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے دل میں کہا:" میرے پاس تو ایک اونٹنی چالیس درہم سے بہتر ہے۔" میں واپس پلٹ آیا اور رسول اللہ ﷺ سے سوال نہ کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس جو اور خشک انگور آئے تو آپ ﷺ نے ہمیں بھی اس میں سے ایک حصہ دیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غنی کر دیا۔"[نسائی، کتاب الزکاة: باب اذا لم یکن عنده دراهم و کان له عدلها(٢٥٩٧)، ابو داؤد ، کتاب الزکاة: باب من یعطی الصدقة و حد الغنی (١٦٢٧)، مسند احمد (٣٦/٤)، بیهقی(٢٤/٧)]

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ مسکین اور فقیر وہ ہے جس کے پاس حسب ضرورت اخراجات نہیں ہیں اور وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال بھی نہیں کرتا اور ناواقف و نادان اس کے چہرے کی چمک دیکھ کر اسے مالدار تصور کر لیتا ہے اور عام طور پر معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ آدمی صدقات و خیرات کا مستحق ہے اور جس شخص کے پاس چالیس درہم یا اس کے برابر مالیت ہو تو وہ اس کی ضرورت کو کفایت کر جاتا ہے اور وہ ملحف (یعنی چمٹ کر سوال کرنے والا) نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے دیے ہوئے مال پر قناعت کر لیتا ہے۔

موجودہ دور میں لاری اڈوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں گھومنے والے بھکاری اور گداگر پیشہ ور لوگ ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو محنت مزدوری کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے بدن میں اتنی سکت اور ہمت رکھی ہے کہ اگر وہ اسے کام میں لائیں تو سوال کرنے سے بچ سکتے ہیں لیکن یہ لوگ حصول مال کے لیے محنت و مزدوری سے جی چرا کے آسان راستہ اختیار کرتے ہیں اور حرام و حلال کی تمیز کیے بغیر ہر طریقے سے مال اکٹھا کرنے میں مصروف ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ

بھی ہیں جن کا پورا کنبہ ہی در در کا بھکاری اور سوالی بنا ہوا ہے۔

نوجوان عورتیں اپنے بچوں کو اٹھائے ہوئے لاری اڈوں کی خاک چھان رہی ہیں۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے یہ لوگ صدقات وعطیات کے مستحق معلوم نہیں ہوتے۔ مال و زر والے افراد اور احسان و نیکی کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ صاحب حاجات اور صدقات و خیرات کے مستحق افراد کو پہچان کر ان پر اپنے اموال صرف کریں اور یقیناً حاجت مند مسلمان اللہ کے دین کے حامل ہوں گے اور نماز روزہ جیسی عبادات سرانجام دیتے ہوں گے کیونکہ وہ تو ذلت وخواری سے بچنے کے لیے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے اور نہ ان کی خود داری اور عزت نفس ہی انھیں اس بات کی اجازت دیتی ہے، جب کہ پیشہ ور بھکاریوں میں تو بہت سارے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو نشہ آور اشیاء خرید کر استعمال کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے تعاون گناہ پر تعاون ہے جو شرعاً حرام ہے۔امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" وَ اخْتَلَفَ اَصْحَابُنَا فِیْ مَسْئَلَةِ الْقَادِرِ عَلَى الْكَسْبِ عَلٰی وَجْهَیْنِ اَصَحُّهُمَا : اِنَّهَا حَرَامٌ لِظَاهِرِ الْاَحَادِیْثِ وَ الثَّانِیْ حَلَالٌ مَعَ الْكَرَاهَةِ بِثَلَاثَةِ شُرُوْطٍ : لَا یُذِلُّ نَفْسَهُ، وَ لَا یُلِحُ فِیْ السُّؤَالِ وَ لَا یُوْذِی الْمَسْئُوْلَ فَاِنْ فَقَدَ اَحَدُ هٰذِهِ الشُّرُوْطِ فَهِیَ حَرَامٌ بِالْاِتِّفَاقِ " [شرح مسلم للنووی (۱۱۳/۷)]

" جو شخص کمائی پر قادر ہے اس کے سوال کرنے کے متعلق دو وجہوں سے ہمارے اصحاب نے اختلاف کیا ہے۔ ان میں سے صحیح ترین بات یہ ہے کہ اس کے لیے سوال کرنا حرام ہے، ظاہر احادیث کی وجہ سے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کراہت کے ساتھ تین شرطوں کے ساتھ حلال ہے: ① ...... وہ اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔ ② ......اور نہ سوال کرنے میں گریہ وزاری سے کام لے۔ ③ ......اور جس سے سوال کر رہا ہے اسے تنگ نہ کرے۔ اگر ان تین شرطوں میں سے ایک بھی مفقود ہوگئی تو سوال کرنا بالاتفاق حرام ہے۔"

دور حاضر کے بھکاری تو در در کی ذلت و رسوائی بھی اٹھاتے ہیں اور مانگتے وقت انتہائی درجے کی گریہ وزاری کرتے ہیں اور لوگوں کو تنگ بھی کرتے ہیں، انھیں اگر کہا جائے" بھائی معاف کرو" تو پھر بھی جان نہیں چھوڑتے لہٰذا ان کا سوال کرنا تو کسی صورت بھی صحیح نہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ جو شرعی لحاظ سے اور واقعی مسکین ہو اس کی معاونت کریں تا کہ اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو اور پیشہ ور گداگروں کی حوصلہ شکنی بھی ہو۔

www.Kitabosunnat.com

روزے کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

چاند دیکھ کر روزہ رکھنا

سوال کیا روزہ رکھنا چاند دیکھنے سے مشروط ہے؟ قرآن وحدیث سے مسئلہ بتا دیں۔

جواب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَصُومُوا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ وَ لَا تُفْطِرُوا حَتّٰى تَرَوْهُ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ »

[بخاری، کتاب الصوم: باب قول النبی إذا رأیتم الهلال فصوموا(١٩٠٦)، مسلم (١٠٨٠)]

''تم روزہ نہ رکھو حتیٰ کہ چاند دیکھ لو اور افطار نہ کرو حتیٰ کہ چاند دیکھ لو۔ اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو گنتی پوری کر لو۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَ اَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ فَاِنْ غُبِّيَ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِيْنَ »[بخاری ، کتاب الصوم: باب قول النبی إذا رأیتم الهلال فصوموا (١٩٠٩)، مسلم (١٠٨١)]

''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور اسے دیکھ کر افطار کرو اور اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کی گنتی کے تیس(٣٠)دن پورے کر لو۔''

یعنی شعبان کی انتیس تاریخ کو چاند دیکھو، اگر نظر آ جائے تو دوسرے دن روزہ رکھو اور اگر نظر نہ آئے یا مطلع ابر آلود ہو تو پھر شعبان کے تیس دن پورے کر کے رمضان کا روزہ رکھو۔ شک کا روزہ کسی صورت میں بھی نہیں رکھنا چاہیے۔

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے :'' جس شخص نے اس دن (یعنی شک کے دن) کا روزہ رکھا اس نے یقیناً ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔''[ابن ماجه، کتاب الصیام: باب ما جآء فی صیام یوم الشك (١٦٤٥)، ابو داؤد (٢٣٣٤)، ترمذی(٦٨٦)، نسائی (٢١٩٠)، دارمی(١٦٨٢)]

واضح رہے کہ رویت ہلال کے لیے عادل و قابل اعتماد ایک شخص ہی کی گواہی کافی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے :

« تَرَاءَ ى النَّاسُ الْهِلَالَ فَاَخْبَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِنِّيْ رَاَيْتُهُ فَصَامَهُ وَ اَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ » [ابوداؤد، کتاب الصوم: باب شهادة الواحد علی رؤیة هلال رمضان (٢٣٤٢)، دارمی، کتاب الصیام: باب الشهادة علی رؤیة هلال رمضان (١٦٩٨)، دارقطنی(١٥٦/٢)، بیهقی (٢١٢/٤)، ابن حبان (٨٧١)، حاکم (٤٢٣/١)، تلخیص الحبیر(١٨٧/٢)]

''لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی، میں نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے تو آپ ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضان کے چاند کی رویت کے بارے میں ایک عادل مسلمان کی گواہی کفایت کر جاتی ہے۔

اس کی تائید میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

« جَاءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ رَاَیْتُ الْهِلَالَ یَعْنِیْ رَمَضَانَ فَقَالَ اَتَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ؟ قَالَ نَعَمْ ، قَالَ اَتَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ یَا بِلَالُ! اَذِّنْ فِی النَّاسِ فَلْیَصُوْمُوْا غَدًا »[ابو داؤد، کتاب الصیام: باب فی شهادة الواحد علی رؤیة هلال رمضان(٢٣٤٠)، بیهقی (٢١٢/٤)، المنتقی لابن الجارود(٣٧٩)]

''ایک دیہاتی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا:'' میں نے رمضان المبارک کا چاند دیکھا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:'' کیا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ؟'' اس نے کہا:''ہاں !'' آپ ﷺ نے فرمایا:'' کیا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں؟'' اس نے کہا:''ہاں!'' آپ ﷺ نے فرمایا:''اے بلال! لوگوں میں اعلان کردو کہ وہ کل روزہ رکھیں۔''

یہ روایت نسائی ، ترمذی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابن حبان، دارقطنی ،مستدرک حاکم اور طحاوی میں بھی موجود ہے لیکن اس کی سند میں سماک بن حرب از عکرمہ از عباس کے طریق سے مروی ہے اور اس سند میں اضطراب ہے۔ بہرکیف میں نے بطور تائید اس کو ذکر کیا ہے وگرنہ یہ مسئلہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

رمضان کے چاند کے لیے ایک فرد کی گواہی

سوال کیا رمضان المبارک کا چاند دیکھنے کے لیے ایک شخص کی گواہی کفایت کرتی ہے؟

جواب رمضان کی رؤیت ہلال کے لیے ایک عادل اور قابل اعتماد شخص کی گواہی کافی ہے، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

« تَرَاءَ ی النَّاسُ الْهِلَالَ فَاَخْبَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَنِّیْ رَاَیْتُهُ فَصَامَ وَاَمَرَ النَّاسَ بِصِیَامِهِ »

''لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش، کی میں نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے تو آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔'' [ابوداؤد، کتاب الصوم: باب فی شهادة الواحدعلی روية هلال رمضان: (٢٣٤٢)، سنن الدارمی (١٦٩٨)، ابن حبان(٨٧١)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضان المبارک کے چاند کی رویت کے بارے ایک مسلمان عادل شخص کی گواہی کافی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی گواہی پر خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ اس مسئلہ کی تائید ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نبی ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگا ''میں نے رمضان کا چاند دیکھ لیا ہے تو آپ نے فرمایا:'' کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں؟ اس نے کہا:''ہاں!'' پھر آپ نے فرمایا:'' کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں؟'' اس نے کہا:

''ہاں!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ کل روزہ رکھیں۔'' [ابوداؤد کتاب الصیام: باب فی شهادة الواحد علی رؤية هلال رمضان(٢٣٤٠)،بیهقی (٢١٢/٤)]
لہٰذا ایک عادل کی گواہی پر روزہ رکھ لیا جائے۔

سحری کھانا لازمی ہے؟

(سوال) کیا روزہ رکھنے کے لیے سحری کھانا ضروری ہے اور کیا یہ سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے؟

(جواب) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« تَسَحَّرُوْا وَ لَوْ بِجُرْعَةٍ مِّنْ مَّاءٍ » [موارد الظمآن(٨٨٤)]

''سحری کھاؤ اگرچہ پانی کے ایک گھونٹ سے ہو۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سحری کھانے کے لیے بیدار ہونا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« فَصْلُ مَا بَيْنَ صِيَامِنَا وَ صِيَامِ اَهْلِ الْكِتَابِ اَكْلَةُ السَّحَرِ » [مسلم ، کتاب الصیام: باب فضل السحور و تأكيد استحبابه (١٠٩٦)]

''ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق سحری کا کھانا ہے۔''

سحری میں اللہ تعالیٰ نے برکت بھی رکھی ہوئی ہے جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِي السُّحُوْرِ بَرَكَةً » [بخاری، کتاب الصوم: باب برکة السحور من غیر ایجاب (١٩٢٣)]

''سحری کھاؤ اس لیے کہ سحری کھانے میں برکت ہے۔''

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« دَعَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِلَى السُّحُوْرِ فِيْ رَمَضَانَ فَقَالَ هَلُمَّ اِلَى الْغَدَاءِ الْمُبَارَكِ » [ابو داؤد، کتاب الصیام: باب من سمی السحور الغداء (٢٣٤٤)، نسائی(٢١٦٤)، موارد الظمآن (٨٨٢)، نیل المقصود (٢٣٤٤)]

'' مجھے رسول اللہ ﷺ نے رمضان المبارک میں سحری کھانے کی دعوت دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''صبح کے بابرکت کھانے کی طرف آؤ۔''

سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کا شاہد حسن سند کے ساتھ صحیح ابن حبان میں موجود ہے۔[موارد الظمآن (٨٨١)، (١٨٤/٣)]

سحری کے لیے بہترین چیز

(سوال) مہربانی فرما کر ہماری رہنمائی فرمادیں کہ سحری میں کونسی چیز افضل ہے؟

(جواب) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« نِعْمَ سُحُوْرُ الْمُؤْمِنِ التَّمْرُ » [ابوداؤد ، كتاب الصيام: باب من سمى السحور الغداء(٢٣٤٥)، موارد الظمآن (٨٨٣)، (١٨٦/٣)]

''مومن کی بہترین سحری کھجور ہے۔''

تاخیر سے سحری کھانا

(سوال) ہمیں ایک بھائی نے بتایا کہ دیر سے سحری کھانا زیادہ ثواب کا باعث ہے کیا یہ درست ہے؟

(جواب) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَنَا مَعْشَرُ الْاَنْبِيَاءِ اُمِرْنَا اَنْ نُؤَخِّرَ سُحُوْرَنَا وَ نُعَجِّلَ فِطْرَنَا وَ اَنْ نُمْسِكَ يَمِيْنَنَا عَلٰى شَمَائِلِنَا فِيْ صَلَاتِنَا » [موارد الظمآن (٨٨٥)، طبرانی کبیر(١١/ ١٩٩)، (١١٤٨٥)]

''یقیناً ہم انبیاء علیہم السلام کا گروہ ہیں، ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنی سحری میں تاخیر کریں اور افطاری جلدی کریں اور نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھیں۔''

اس کی سند صحیح ہے اور اس کے کئی ایک شواہد بھی ہیں۔

اذانِ سحری کی شرعی حیثیت

(سوال) کیا نماز کی طرح سحری کے لیے بھی اذان کہی جا سکتی ہے؟ اور قرآن و حدیث میں اس کی دلیل کیا ہے؟

(جواب) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّ بِلَالًا يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ فَكُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يُنَادِيَ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ قَالَ وَ كَانَ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ رَجُلًا اَعْمٰى لَا يُنَادِيْ حَتّٰى يُقَالَ لَهٗ اَصْبَحْتَ اَصْبَحْتَ » [بخاری، كتاب الأذان: باب اذان الأعمى إذا كان له من يخبره(٦١٧) ، مسلم، كتاب الصيام (١٠٩٢)]

''یقیناً بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان دیتے ہیں، سو تم کھاؤ، پیو یہاں تک کہ عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دے۔'' (راوی نے) کہا: ''عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا تھے، وہ اتنی دیر تک اذان نہیں دیتے تھے جب تک انھیں کہا نہ جائے کہ تو

نے صبح کر دی، تو نے صبح کر دی۔"

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَمْنَعَنَّ اَحَدَكُمْ اَذَانُ بِلَالٍ مِنْ سُحُوْرِهِ فَاِنَّهُ يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ لِيَرْجِعَ قَائِمُكُمْ وَ لِيُنَبِّهَ نَائِمَكُمْ »
[بخاری، کتاب الأذان : باب الأذان قبل الفجر (٦٢١)]

"تم میں سے کسی کو بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری کرنے سے نہ روکے، اس لیے کہ وہ رات کو اذان دیتے ہیں تاکہ قیام کرنے والا لوٹ آئے اور سونے والا بیدار ہو جائے۔"

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« وَ لَمْ يَكُنْ بَيْنَهُمَا اِلَّا اَنْ يَّنْزِلَ هٰذَا وَ يَصْعَدَ هٰذَا » [نسائی، کتاب الأذان: باب هل يؤذنان جميعا أو فرادى (٦٤٠)]

"دونوں کی اذان میں اتنا وقفہ ہوتا کہ یہ اذان کہہ کر اترتا اور وہ چڑھ جاتا۔"

علامہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس حدیث سے مراد دونوں کے درمیان وقفے کی قلت ہے نہ کہ حد کا تعین۔" نیز امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" قَالَ الْعُلَمَاءُ مَعْنَاهُ اَنَّ بِلَالًا كَانَ يُؤَذِّنُ قَبْلَ الْفَجْرِ وَ يَتَرَبَّصُ بَعْدَ اَذَانِهِ لِلدُّعَاءِ وَ نَحْوَهُ ثُمَّ يَرْقُبُ الْفَجْرُ فَاِذَا قَارَبَ طُلُوْعُهُ نَزَلَ فَاَخْبَرَ ابْنَ اُمِّ مَكْتُوْمٍ فَيَتَاَهَّبُ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِالطَّهَارَةِ وَ غَيْرِهَا ثُمَّ يَرْقٰى وَ يَشْرَعُ فِى الْاَذَانِ مَعَ اَوَّلِ طُلُوْعِ الْفَجْرِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ"
[شرح مسلم للنووى (١٧٧/٧)]

"علماء نے کہا ہے کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ فجر سے پہلے اذان دیتے تھے اور اذان کے بعد دعا وغیرہ کے لیے بیٹھے رہتے تھے۔ جب طلوع فجر قریب ہوتی تو اتر آتے اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو خبر کر دیتے تو وہ وضو وغیرہ کی تیاری کرتے پھر اوپر چڑھ جاتے اور فجر طلوع ہوتے ہی اذان شروع کر دیتے۔"

غرض سحری کی اذان اور صبح صادق میں اتنا وقفہ ضرور ہونا چاہیے جس سے آدمی آسانی سے سحری کر لے، قیام کرنے والا واپس پلٹ آئے، سویا ہوا بیدار ہو جائے اور روزے کی تیاری کر لے، کیونکہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کھانے پینے سے مانع نہ تھی، اس لیے کہ وہ صبح کاذب میں ہوتی تھی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ اس حدیث کی رو سے سمجھایا ہے کہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

« تَسَحَّرْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ثُمَّ قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ قُلْتُ كَمْ كَانَ بَيْنَ الْاَذَانِ وَ السُّحُوْرِ ؟ قَالَ قَدْرُ خَمْسِيْنَ آيَةً » [بخاری، کتاب الصوم : باب قدر كم بين السحور و صلاة الفجر (١٩٢١)]

"ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔" میں (انس رضی اللہ عنہ) نے کہا:

''اذان اور سحری کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟'' تو انھوں نے کہا: ''پچاس آیات کے برابر۔''

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سحری کے وقت فرمایا:

« يَا أَنَسُ ! إِنِّيْ أُرِيْدُ الصِّيَامَ أَطْعِمْنِيْ شَيْئًا فَأَتَيْتُهُ بِتَمْرٍ وَ إِنَاءٍ فِيْهِ مَاءٌ وَ ذٰلِكَ بَعْدَ مَا أَذَّنَ بِلَالٌ فَقَالَ يَا أَنَسُ ! أُنْظُرْ رَجُلًا يَأْكُلُ مَعِيَ فَدَعَوْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَجَاءَ فَقَالَ إِنِّيْ قَدْ شَرِبْتُ شُرْبَةَ سَوِيْقٍ وَ أَنَا أُرِيْدُ الصِّيَامَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ أَنَا أُرِيْدُ الصِّيَامَ فَتَسَحَّرَ مَعَهُ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ » [نسائی، کتاب الصیام: باب السحور بالسویق والتمر(۲۱٦٦)]

''اے انس! میرا روزے کا ارادہ ہے، مجھے کوئی چیز کھلاؤ۔'' میں آپ کے پاس کھجور اور پانی والا برتن لایا اور یہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے بعد کا قصہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے انس! کوئی آدمی تلاش کر جو میرے ساتھ کھانا کھائے۔'' میں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو دعوت دی تو وہ تشریف لائے اور کہا: ''میں نے ستو کا ایک گھونٹ پی لیا ہے اور روزے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں بھی روزے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' انھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ سحری کی پھر کھڑے ہوئے، دو رکعت سنت پڑھی اور پھر نماز صبح کے لیے گھر سے نکلے۔''

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اذان بلال رضی اللہ عنہ کے بعد اتنا وقفہ ضرور ہوتا تھا جس میں آدمی سحری کا انتظام کر کے کھانا کھالے۔ لہٰذا دونوں اذانوں کے درمیان اتنا وقفہ ضرور ہونا چاہیے جس میں سحری کا بندوبست ہو سکے۔

اذان کے دوران کھانا پینا

سوال کیا اذان شروع ہوتے ہی سحری کھانے سے رک جانا ضروری ہے یا اذان ختم ہونے تک کھا پی سکتے ہیں؟

جواب مؤذن کے بارے میں اگر یہ معروف ہو کہ وہ فجر طلوع ہونے کے ساتھ ہی اذان دیتا ہے تو ایسی صورت میں اس کی اذان سنتے ہی کھانے پینے اور دیگر تمام مفطرات سے رک جانا ضروری ہے، لیکن اگر کیلنڈر کے اعتبار سے ظن و تخمین سے اذان دی جائے تو ایسی صورت میں اذان کے دوران کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ نبی ﷺ کی حدیث ہے، آپ نے فرمایا:

« إِنَّ بِلَالًا يُنَادِيْ بِلَيْلٍ فَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يُنَادِيَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُوْمٍ »

''بلال رضی اللہ عنہ رات میں اذان دیتے ہیں سو کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ ابن ام مکتوب اذان دیں۔'' [بخاری، کتاب الاذان: باب الاذان قبل الخبر(٦٢٠)]

نیز فرمایا: ''جو شخص شبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا۔'' [بخاری، کتاب الإیمان: باب فضل من استبرأ الدینه (٥٢)]

لیکن اگر یہ بات متعین ہو کہ مؤذن کچھ رات باقی رہنے پر طلوع فجر سے پہلے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے اذان دیتا ہے، جیسا کہ بلال کرتے تھے، تو ایسی صورت میں مذکورہ بالا حدیث پر عمل کرتے ہوئے کھاتے پیتے رہنے میں کوئی حرج نہیں،

یہاں تک کہ طلوع فجر کے ساتھ اذان دینے والے مؤذن کی اذان شروع ہو جائے۔

سحری کھانے کا آخری وقت

(سوال) کیا دوران اذان سحری کھائی جاسکتی ہے؟ یا اذان کے شروع ہوتے ہی کھانا بند کر دیا جائے۔ صحیح مسئلہ کی طرف رہنمائی فرمادیں۔

(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾
[البقرة:١٨٧]

''اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمھارے لیے سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے واضح ہو جائے۔''

اس آیت کریمہ میں '' الخیط الأبیض '' سے مراد صبح صادق اور '' الخیط الأسود '' سے مراد رات ہے۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: '' جس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو میں نے اونٹ باندھنے والی ایک سیاہ رسی اور ایک سفید رسی اپنے تکیے کے نیچے رکھ لی۔ میں رات کے وقت انھیں دیکھنے لگا تو مجھے صاف نظر نہ آئیں۔ میں نے صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آکر سارا ماجرا سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّمَا ذٰلِكَ سَوَادُ اللَّيْلِ وَ بَيَاضُ النَّهَارِ » [بخاري، كتاب الصوم: باب قول الله تعالىٰ:﴿ وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ......﴾ (١٩١٦)]

''اس آیت کریمہ میں سیاہ اور سفید دھاگے سے مراد رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی ہے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے سحری کا وقت بتا دیا ہے کہ صبح صادق تک تم کھا پی سکتے ہو، وقت کی حدود متعین کرنے میں کچھ وسعت معلوم ہوتی ہے کیونکہ جس طرح آج گھڑیاں موجود ہیں ظاہر بات ہے زمانہ رسالت اور زمانہ خلفائے راشدین وغیرہ میں یہ ایجادات موجود نہ تھیں، لوگ ستاروں اور چاند کے ساتھ رات کے اوقات معلوم کرتے تھے۔ اس لیے اگر سحری میں ایک دو منٹ کی تاخیر ہو جائے تو کوئی قیامت بپا نہیں ہوتی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِذَا سَمِعَ اَحَدُكُمُ النِّدَاءَ وَ الْاِنَاءُ عَلٰى يَدِهِ فَلَا يَضَعْهُ حَتّٰى يَقْضِيَ حَاجَتَهُ مِنْهُ » [ابو داؤد، كتاب الصوم : باب في الرجل يسمع النداء والاناء في يده(٢٣٥٠)، حاكم (٤٢٦/١)، بيهقي(٢١٨/٤)، دارقطني(٢١٦٢)]

''جب تم میں سے کوئی آدمی اذان سنے اور برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو وہ اس برتن کو حاجت پوری کرنے سے پہلے نہ رکھے۔''

مولانا عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ فِيْهِ اِبَاحَةُ الْاَكْلِ وَ الشُّرْبِ مِنَ الْاِنَاءِ الَّذِيْ فِيْ يَدِهِ عِنْدَ سَمَاعِ الْاَذَانِ لِلْفَجْرِ وَ اَنْ لَا يَضَعَهُ حَتّٰى يَقْضِيَ حَاجَتَهُ '' [مرعاة المفاتيح (٤٦٩/٦)]

''اس حدیث میں فجر کی اذان سنتے وقت اس برتن سے کھانے اور پینے کی اباحت معلوم ہوتی ہے جو اس کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ وہ اسے اپنی حاجت پوری کرنے سے پہلے نہ رکھے۔''

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کا شاہد بھی موجود ہے۔ [مسند احمد(۳/۳٤۸)]

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [مرعاة المفاتیح(٦/٤٧٠)]

روزے کے لیے نیت کرنا

(سوال) کیا روزے کی بھی نیت ہے اور کیا یہ درست ہے کہ اگر نیت نہ کی تو روزہ نہ ہوگا؟

(جواب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ لَّمْ يُجْمِعِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَا صِيَامَ لَهُ » [ابو داؤد، کتاب الصوم: باب النية فى الصيام (٢٤٥٤)، ترمذی، کتاب الصوم: باب ما جآء لا صيام لمن لم يعزم من الليل(٧٣٠)، نسائی، کتاب الصيام(٢٣٣٤)، دارمی(١٧٠٥)]

''جس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں ہے۔''

چونکہ تمام اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے اور نیت کے بغیر کوئی عمل قابل قبول نہیں، مثلاً روزہ کی نیت نہ کی گئی اور روزہ جیسی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں تو روزہ نہ ہوگا بلکہ فاقہ ہوگا۔ یہ بھی یاد رہے کہ نیت کے لیے زبان سے تلفظ کی ضرورت نہیں۔ یہ دل کا فعل ہے۔ بعض حضرات نے روزے کی نیت کے یہ الفاظ وضع کیے ہیں:" وَ بِصَوْمِ غَدٍ نَوَيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ " (میں نے ماہ رمضان کے کل کے روزے کی نیت کی) یہ الفاظ کسی حدیث سے ثابت نہیں اور نیت بھی کل آنے والے دن کی کر رہا ہے۔ علامہ ابن منظور رقمطراز ہیں :" اَصْلُ الْغَدِ وَهُوَ الْيَوْمُ الَّذِىْ يَأْتِىْ بَعْدَ يَوْمِكَ " ''غد کا اصل یہ ہے کہ وہ دن جو تیرے آج کے دن کے بعد ہوگا۔'' [لسان العرب(١٠/٢٦)]

بعض حضرات نے لفظ ''غد'' کا مطلب یہ بیان کیا ہے:'' آئندہ کل، دور کا دن جس کا انتظار ہو۔'' [مصباح اللغات (ص/٥٩٣)]

لہٰذا یہ الفاظ معنوی طور پر بھی درست معلوم نہیں ہوتے۔

روزے کے لیے زبان سے نیت کی حیثیت

(سوال) نیت زبان سے کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ نیز نیت کے مروجہ الفاظ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(جواب) ہر سال رمضان المبارک کے آنے سے قبل ہی افطاری وسحری کے اوقات کے تجارتی کیلنڈر شائع ہو کر تقسیم ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جن پر اوقات نامہ، روزہ رکھنے کی نیت " وَبِصَوْمِ غَدٍ نَوَيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ " کے الفاظ بھی عموماً دیکھے

گئے ہیں ۔جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے کل کے رمضان کے روزے کی نیت کی۔

جہاں تک نیت کا تعلق ہے تو تمام اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے اور نیت کے بغیر کوئی عمل بھی قابل قبول نہیں ہے۔ مثلاً اگر نماز کی نیت کی طرح روزہ کی نیت نہ کی گئی اور روزہ جیسی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں اور اس کے لوازمات کو بھی ادا کرنے میں سارا دن کوئی کوتاہی نہ کی، تو پھر بھی روزہ نہ ہوگا بلکہ فاقہ ہوگا جس کا اس کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا کوئی روزہ نہیں ہے۔'' [ابو داؤد ، کتاب الصوم: باب النية في الصيام(٢٤٥٤)، ترمذی، کتاب الصوم: باب ما جاء لا صيام لمن لم يعزم من الليل (٧٣٠)، نسائی ، کتاب الصيام(٢٣٣٤)]

تمام عبادات میں نیت ضروری ہے، چاہے نماز ہو، زکوٰۃ ہو یا روزہ۔جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

''تمام اعمال کا دارو مدار نیت پر ہے۔'' [بخاری ، کتاب بدء الوحی (١)]

امام ابو حنیفہ ؒ کے ہاں اعمال کی دو اقسام ہیں:

١۔ وہ اعمال جو اصل مقصد کے لیے ہوں جیسے نماز، روزہ وغیرہ ، ان کی نیت ضروری ہے ،اگر نیت نہ کی جائے گی تو اعمال باطل ہوں گے۔

٢۔ وہ اعمال جو اصل مقصد کے لیے تو نہیں لیکن اصل مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہوں جیسے وضو اور غسل ، ان کی نیت اگر نہ بھی کی جائے تو درست ہوگا۔

آخر الذکر مسئلہ کا حکم امام ابو حنیفہ ؒ کی اپنی رائے اور قیاس تک محدود ہے۔شرعی دلائل میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور نہ کوئی دلیل اس مسئلہ کی مؤید ہے۔ کیونکہ « اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » کے الفاظ مطلق اعمال پر دلالت کر رہے ہیں، اس سے کوئی عبادت بھی (چاہے وہ واسطہ ہو یا بذات خود عبادت) مستثنیٰ نہیں ہے۔

روزے میں نیت احناف کے ہاں بھی ضروری ہے مگر مروجہ نیت من گھڑت اور خود ایجاد کردہ ہے۔ چنانچہ احادیث مبارکہ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نیت زبان سے نہیں ہوتی بلکہ اس کا محل دل ہے ۔ دل سے نیت ضروری ہے ۔ اس بات کی شہادت فقہ کی معتبر کتب میں بھی موجود ہے کہ نیت کا محل دل ہے زبان نہیں۔لیکن اگر یہ الفاظ زبان سے ادا کر بھی لیے جائیں تو نیت ، نیت نہیں رہتی بلکہ کلام بن جاتی ہے، جس کا جواز کہیں موجود نہیں ہے۔ جملہ عبادات مثلاً طہارت، نماز ، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ میں بالاتفاق نیت کی جگہ دل ہے زبان نہیں۔

حافظ ابن حجر ؒ فرماتے ہیں:

" وَ الشَّرْعُ خَصَّصَهُ بِالْإِرَادَةِ الْمُتَوَجِّهَةِ نَحْوَ الْفِعْلِ لِابْتِغَاءِ رَضَاءِ اللّٰهِ وَ امْتِثَالِ حُكْمِهِ "
[فتح الباری]

''شریعت نے نیت کے لفظ کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کسی کام کے ارادے کے لیے خاص کیا ہے۔''

معلوم ہوا کہ اعمال میں اعتبار قلبی نیت کا ہوگا، اگر اس کے خلاف زبان سے کچھ کہے تو اعتبار محض لفظوں کا نہیں ہوگا۔ اگر محض زبان سے نیت کرے مگر دل میں نہ ہو تو بالاتفاق یہ ناجائز ہے کیونکہ نیت تو قصد وعزم کا نام ہے۔ لہٰذا روزہ دار اور نمازی کو روزہ رکھنے اور نماز شروع کرنے سے پہلے الفاظ کے ساتھ نیت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ لفظی نیتیں بدعت اور من گھڑت ہیں، جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''ہر گھڑی ہوئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔'' [نسائی، كتاب صلاة العيدين: باب كيف الخطبة (١٥٧٩)]

معزز قارئین! نماز اور روزہ دونوں ہی اہم ترین عبادتیں ہیں، لیکن اگر ان کو بھی بدعات سے نہ بچایا گیا اور اہل بدعت کے حربے کو ناکام نہ بنایا گیا تو پھر ہماری کوئی عبادت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہ ہوگی۔

لہٰذا روزے سے پہلے بول کر نیت کرنے کی کوئی وقعت نہیں، صرف دل ہی میں پختہ ارادے کے ساتھ روزے کی نیت کر لینا قابل قبول ہوگا۔

روزے کا اجر ضائع کر دینے والے اعمال

سوال وہ کون سے ایسے اعمال ہیں جن کے کرنے سے روزے کا اجر ضائع ہو جاتا ہے ازراہِ کرم نشاندہی فرما دیں۔

جواب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَ الْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهُ وَ شَرَابَهُ » [بخاری، كتاب الصوم: باب من لم يدع قول الزور والعمل به فى الصوم(١٩٠٣)]

''جس آدمی نے روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا ترک نہ کیا تو اللہ وحدہ لاشریک لہ کو اس کا کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی حاجت نہیں۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« وَ اِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَ لَا يَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّهُ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهُ فَلْيَقُلْ اِنِّی امْرُءٌ صَائِمٌ » [بخاری، كتاب الصوم: باب هل يقول إنى صائم إذا شتم (١٩٠٤)]

''جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو وہ شہوت انگیز گفتگو نہ کرے اور نہ شور وغوغا سے کام لے، اگر اسے کوئی گالی گلوچ کرے یا اس سے لڑائی کرے تو کہہ دے: ''میں روزہ دار ہوں۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« كَمْ مِّنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ اِلَّا الظَّمَأُ وَ كَمْ مِّنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ اِلَّا السَّهَرُ »

[دارمی (٢٧٣٣)، احمد(٣٧٣/٢)، حاكم (١٣١/١)، بيهقى(٢٧٠/٤)،شرح السنة (٢٤٧/٦)، ابن ماجه (١٦٩٠)]

'' کتنے روزہ دار ایسے ہیں جنھیں اپنے روزہ سے پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور کتنے ہی قیام کرنے والے ایسے ہیں جنھیں اپنے قیام سے بیداری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔''

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ روزہ دار کو حالت روزہ میں گالی گلوچ، بدکلامی، فحش گوئی، تہمت طرازی، عیب جوئی، دروغ گوئی، جھوٹ کی اشاعت، جھوٹ پر عمل، کذب بیانی، غیبت اور دیگر شیطانی امور سے اجتناب از حد ضروری ہے وگرنہ روزے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ جو آدمی بھوکا پیاسا رہ کر امور بالا کا مرتکب ہوگا اس کا روزہ نہیں بلکہ فاقہ ہوگا۔

اسی طرح شب زندہ دار ہو کر اخلاق رذیلہ کا پیکر بنے اور برے اعمال کا مرتکب ہو تو اسے رات کی بیداری کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہمارے ملکی اخبارات و جرائد کے ایڈیٹر حضرات کو بھی سوچنا چاہیے جو جھوٹ کی اشاعت اور جرائم کو ہوا دینے سے رمضان المبارک میں بھی باز نہیں آتے اور تقریباً تمام اخبارات فاحشہ اور بدکار عورتوں کی تصاویر نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں۔ اگر حالت روزہ میں ایسے امور سے اجتناب نہ کیا گیا تو روزے کا کوئی فائدہ نہیں۔

روزہ توڑ دینے کا کفارہ

سوال اگر کوئی شخص جان بوجھ کر روزہ توڑ دے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟

جواب جو آدمی کسی بھی وجہ سے عمداً روزہ توڑ دے اس کے لیے یہ کفارہ ہے کہ وہ ایک غلام آزاد کرے۔ اگر یہ طاقت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے۔ [بخاری، کتاب الصوم: باب إذا جامع فی رمضان(۱۹۳۶)]

روزہ افطار کرنے کا وقت

سوال روزہ جلدی افطار کرنا چاہیے یا تاخیر سے قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا احکامات ہیں؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيۡلِ ﴾ [البقرة:۱۸۷]

'' روزہ رات تک پورا کرو۔''

یعنی رات ہوتے ہی روزہ افطار کر دو، تاخیر مت کرو۔ رات (لیل) کی ابتدا غروب آفتاب سے ہوتی ہے۔ علامہ محمد بن یعقوب فیروز آبادی رقمطراز ہیں:

'' اَللَّيۡلُ وَ اللَّيۡلَاةُ مِنۡ مَغۡرِبِ الشَّمۡسِ اِلَى طُلُوۡعِ الۡفَجۡرِ الصَّادِقِ اَوِ الشَّمۡسِ '' [القاموس المحیط (۱۳٦٤)]

''رات غروب شمس سے لے کر فجر صادق کے طلوع ہونے تک یا طلوع شمس تک ہے۔''

علامہ ابن منظور الافریقی فرماتے ہیں: " مَبْدَئُهُ مِنْ غُرُوْبِ الشَّمْسِ " (رات کی ابتدا غروب شمس سے ہے۔)
[لسان العرب(۱۲/۳۷۸)، المعجم الأوسط (۸۵۰)]

ائمہ لغات کی توضیح سے معلوم ہوا کہ لیل کی ابتدا غروب آفتاب سے ہوتی ہے، لہٰذا جوں ہی سورج غروب ہو روزہ افطار کر لیا جائے، تاخیر نہ کی جائے کیونکہ تاخیر سے روزہ افطار کرنا یہود ونصاریٰ کا کام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

« لَا یَزَالُ الدِّیْنُ ظَاهِرًا مَا عَجَّلَ النَّاسُ الْفِطْرَ لِاَنَّ الْیَهُوْدَ وَ النَّصَارٰی یُؤَخِّرُوْنَ » [ابوداؤد، کتاب الصوم: باب ما یستحب من تعجیل الفطر (۲۳۵۳)،ابن ماجه، کتاب الصیام: باب ما جآء فی تعجیل الإفطار (۱۶۹۸)، ابن خزیمة(۲۰۶۰)، ابن حبان(۸۸۹)، حاکم (۱/۴۳۱)]

"دین ہمیشہ غالب رہے گا جب تک لوگ افطاری میں جلدی کرتے رہیں گے کیونکہ یہود و نصاریٰ افطاری کرنے میں تاخیر کرتے ہیں۔"

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ روزہ دیر سے کھولنا یہود و نصاریٰ کا کام ہے اوران کے متبعین کا روزہ موجودہ دور میں بھی مسلمانوں سے دس یا پندرہ منٹ بعد افطار ہوتا ہے۔ کئی لوگ افطاری کے لیے سائرن کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور سائرن بھی غروب آفتاب کے بعد دیر سے بجایا جاتا ہے، اس کے بارے میں یاد رہے کہ عبادات کے لیے سائرن بجانا بھی یہود ونصاریٰ کا عمل ہے۔ اہل اسلام کے ساتھ اس عمل کا کوئی تعلق نہیں بلکہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی روزہ کھول دینا چاہیے:

« عَنْ سَهْلٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ لَایَزَالُ النَّاسُ بِخَیْرٍ مَا عَجَّلُوْا الْفِطْرَ » [بخاری، کتاب الصوم: باب تعجیل الافطار(۱۹۵۷)، مسلم ، کتاب الصیام: باب فضل السحور(۱۰۹۸)]

"سیدنا سہل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تک لوگ روزہ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے بھلائی سے رہیں گے۔"

« عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا اَقْبَلَ اللَّیْلُ مِنْ هٰهُنَا وَ اَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هٰهُنَا وَ غَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ اَفْطَرَ الصَّائِمُ » [بخاری، کتاب الصوم:باب متی یحل فطر الصائم (۱۹۵۴)، مسلم ، کتاب الصیام(۱۱۰۰)]

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب رات ادھر سے آ جائے اور دن ادھر سے پیٹھ پھیر جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ دار روزہ کھول دے۔"

« عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ لَا تَزَالُ اُمَّتِیْ عَلٰی سُنَّتِیْ مَا لَا تَنْتَظِرُ بِفِطْرِهَا النُّجُوْمَ » [موارد الظمآن(۸۹۱)]

"سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میری امت ہمیشہ میری سنت پر رہے گی جب تک روزے کی افطاری کے لیے ستاروں کا انتظار نہیں کرے گی۔"

مندرجہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ افطاری کا وقت غروب آفتاب ہے، اس لیے روزہ سورج غروب ہوتے ہی افطار کرلیں، دیر نہ کریں۔

کس چیز سے روزہ افطار کرنا چاہیے؟

(سوال) مہربانی فرما کر ہمیں آگاہ فرمادیں کہ رسول اکرم ﷺ کس چیز سے روزہ افطار فرمایا کرتے تھے؟

(جواب) سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا اَفْطَرَ اَحَدُکُمْ فَلْيُفْطِرْ عَلٰى تَمْرٍ فَاِنَّهٗ بَرَكَةٌ فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ فَلْيُفْطِرْ عَلٰى مَاءٍ فَاِنَّهٗ طَهُوْرٌ »
[ترمذی، کتاب الزکاۃ، باب ما جاء فی الصدقۃ علی ذی القرابۃ (٦٥٨) ابو داؤد، (٢٣٥٥)، احمد (١٧/٤، ١٨)، ابن ماجه (١٦٩٩)، دارمی (١٧٠٨)، موارد الظمآن (٨٩٢)]

''جب تم میں سے کوئی روزہ کھولے تو وہ کھجور سے کھولے کیونکہ اس میں برکت ہے اگر کھجور نہ پائے تو پانی سے روزہ کھولے اس لیے کہ وہ پاک کرنے والا ہے۔''

« عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُفْطِرُ عَلٰى رُطَبَاتٍ قَبْلَ اَنْ يُّصَلِّيَ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ رُطَبَاتٌ فَعَلٰى تَمَرَاتٍ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ حَسَا حَسَوَاتٍ مِنْ مَاءٍ » [ابوداؤد، کتاب الصیام: باب ما یفطر علیه (٢٣٥٦)، ترمذی (٦٩٦)، دارقطنی (١٨٥/٢)، مستدرک حاکم (٤٣٢/١)]

''انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ''رسول اللہ ﷺ نماز پڑھنے سے پہلے چند تازہ کھجوریں کھا کر روزہ افطار کرتے تھے، اگر تازہ کھجوریں دستیاب نہ ہوتیں تو خشک کھجوریں کھا کر افطار کرتے، اگر وہ بھی نہ ملتیں تو پانی کے چند گھونٹ بھر لیتے۔''

« عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ مَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَطُّ صَلّٰى صَلَاةَ الْمَغْرِبِ حَتّٰى يُفْطِرَ وَ لَوْ عَلٰى شُرْبَةٍ مِّنْ مَاءٍ » [موارد الظمآن (٨٩٠)، مسند ابی یعلی (٤٢٤/٦)، (٣٧٩٢)]

''انس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں نے نبی کریم ﷺ کو افطاری سے پہلے مغرب کی نماز پڑھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، اگرچہ آپ ﷺ پانی کے ایک گھونٹ ہی پر افطار کرتے۔''

مندرجہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ کھجور کے ساتھ روزہ کھولنا بہتر ہے اور اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے افطار کرلیں۔ روزے کی وجہ سے جسم میں نقاہت و کمزوری واقع ہوتی ہے، کھجور سے جسم کو تقویت ملتی ہے، کھجور نہایت مفید اور مقوی غذا ہے۔

روزہ افطار کرنے کی دعا

(سوال) ہمیں پتا چلا ہے کہ افطاری کی بعض دعائیں من گھڑت یا ضعیف ہیں تو صحیح دعا کونسی ہے؟

(جواب) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا اَفْطَرَ قَالَ: ذَهَبَ الظَّمَأُ وَ ابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَ ثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ » [ابوداؤد، كتاب الصيام: باب القول عند الافطار (٢٣٥٧)، مستدرك حاكم (٤٢٢/١) دارقطنی (١١٨٥/٢) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اسے صحیح کہا ہے جب کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب روزہ افطار کرتے تو کہتے: "پیاس چلی گئی، رگیں تر ہوگئیں اور اگر اللہ نے چاہا تو اجر ثابت ہو گیا۔"

نیز « اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ لَكَ صُمْتُ وَ عَلٰى رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ » یہ دعا مرسل روایت میں ہے اور مرسل روایت محدثین کے ہاں ضعیف کی اقسام سے ہے۔

فرضی روزوں کی قضا اور نفلی روزے

(سوال) جس شخص کے ذمہ رمضان کے روزوں کی قضا ہو اس کے لیے نفلی روزے مثلاً شوال کے چھ روزے، عشرہ ذی الحجہ کے روزے اور عاشوراء کا روزہ رکھنا کیسا ہے؟

(جواب) جس کے ذمہ رمضان کے روزوں کی قضا ہو علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق نفلی روزوں سے پہلے اس پر رمضان کے روزوں کی قضا واجب ہے، کیونکہ فرائض نوافل سے اہم ہیں۔ [مجموع فتاویٰ لا بن باز: (٣٩٢/١٥)]

روزہ میں بھول کر کھانا پینا

(سوال) جس شخص نے روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھا پی لیا اس کا کیا حکم ہے؟

(جواب) ایسے شخص پر کچھ حرج نہیں اور اس کا روزہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

"اے ہمارے رب! ہم اگر بھول گئے یا غلطی کر بیٹھے تو ہماری گرفت نہ کر۔"

نیز ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھا لیا یا پی لیا، وہ اپنا روزہ پورا کرلے، کیونکہ اسے اللہ نے کھلایا پلایا ہے۔"

[بخاري كتاب الصوم: باب الصائم اذا أكل أو شرب ناسيا (١٩٣٣)، مستدرك حاكم: (٤٣٠/١)]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: "جس نے رمضان میں بھول کر روزہ توڑ دیا تو اس پر نہ قضا ہے نہ کفارہ۔"

اس حدیث امام حاکم نے نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔اس حدیث کے الفاظ میں جماع اور دیگر تمام مفطرات شامل ہیں۔

تارک نماز کے روزے کا حکم

(سوال) تارک نماز کے روزہ رکھنے کا کیا حکم ہے؟ اور اگر وہ روزہ رکھے تو کیا اس کا روزہ درست ہے؟

(جواب) صحیح بات یہ ہے کہ عمداً نماز ترک کرنے والا کافر ہے، لہٰذا جب تک وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ نہ کر لے اس کا روزہ اور اسی طرح دیگر عبادات درست نہیں، کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الانعام : ۸۸]

''اور اگر انہوں نے شرک کیا ہوتا تو وہ سب اکارت ہو جاتا جو وہ کرتے تھے۔''

نیز اس معنی کی دیگر آیات اور احادیث بھی تارک نماز کے اعمال اکارت ہو جانے کی دلیل ہیں۔

لیکن کچھ اہل علم اس طرف گئے ہیں کہ تارک نماز اگر نماز کی فرضیت کا معترف ہے لیکن سستی و بے پروائی کی وجہ سے نماز چھوڑتا ہے، تو اس کا روزہ اور دیگر عبادات برباد نہیں ہوں گی، لیکن پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے، یعنی عمداً نماز ترک کرنے والا کافر ہے، بھلے وہ نماز کی فرضیت کا معترف ہو، کیونکہ اس قول پر بے شمار دلائل موجود ہیں، انہی دلائل میں سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ''بندہ کے درمیان اور کفر و شرک کے درمیان بس نماز چھوڑنے کا فرق ہے۔'' [مسلم ، کتاب الایمان : باب بیان اطلاق اسم الکفر (۸۲)]

اور آپ ﷺ نے مزید فرمایا:

''ہمارے اور ان (کافروں) کے درمیان جو معاہدہ ہے وہ نماز ہے، تو جس نے نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔''

[ترمذی، کتاب الایمان: باب ما جآء فی ترک الصلاۃ (۲۶۲۱)]

اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ نے بریدہ بن حصین اسلمی رضی اللہ عنہ کے طریق سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

اس بارے میں امام ابن قیم رحمہ اللہ نے نماز کے احکام اور نماز چھوڑنے کے احکام پر مشتمل ایک مستقل رسالہ ''حکم تارک الصلاۃ'' میں سیر حاصل گفتگو کی ہے، یہ رسالہ بڑا مفید اور قابل مطالعہ ہے، اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔

روزے کی حالت میں قے آنا

(سوال) روزہ کی حالت میں کسی کو خود بخود قے آ جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ وہ اس روزہ کی قضا کرے یا نہ کرے؟

(جواب) روزہ کی حالت میں خود بخود قے آ جانے سے روزہ کی قضا نہیں لیکن اگر کسی نے عمداً قے کی تو اسے اس روزہ کی قضا کرنی ہوگی، کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

''جسے خود بخود قے آ جائے اس پر قضا نہیں، اور جس نے عمداً قے کی اس پر قضا ہے۔'' [ابوداؤ، کتاب الصیام: باب الصائم یستقی عامداً: (۲۳۸۰)]

اس حدیث کو امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

جھوٹ بولنے والے کا روزہ

(سوال) جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بولے یا جھوٹی بات پر عمل کرے تو کیا اس کا روزہ اللہ کے ہاں قبول ہو جاتا ہے؟

(جواب) روزے کی حالت میں جھوٹ بولنے والے یا جھوٹی باتوں پر عمل کرنے والے کا روزہ ضائع ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَ شَرَابَهٗ »

[صحیح بخاری کتاب الصوم : باب من لم یدع قول الزور والعمل به (۱۹۰۳)]

''جس آدمی نے روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا ترک نہ کیا تو اللہ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی حاجت نہیں۔''

اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور حدیث میں ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الظَّمَأُ وَكَمْ مِّنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ قِيَامِهٖ اِلَّا السَّهَرُ »

[سنن الدارمی، کتاب الرقاق (۲۷۲۳)]

''کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جنہیں اپنے روزے سے پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں اور کتنے ہی قیام کرنے والے ایسے ہیں جنہیں اپنے قیام سے بیداری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

مذکورہ احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ روزہ دار آدمی کو حالت روزہ میں گالی گلوچ، تہمت طرازی، عیب جوئی، جھوٹ پر عمل اور اس کی اشاعت وغیرھا جیسے اعمال قبیحہ سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے ورنہ اسے روزے سے سوائے فاقہ کے کچھ حاصل نہ ہو گا، اللہ کریم کو وہی روزہ قبول ہو گا جو منع کیے گئے کاموں سے بچایا ہوا ہو گا۔

ہوائی سفر کرنے والے کا وقت افطار

(سوال) اگر کوئی روزہ دار سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ قبل یا اس سے کم وقت میں ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہے اور وہ شہر سے دور بھی ہو جاتا ہے تو اس صورت میں روزہ کس وقت افطار کیا جائے گا؟

(جواب) اگر روزہ دار جہاز میں سورج غروب ہونے سے قبل سوار ہوا ہے تو وہ جہاز میں اس وقت تک افطار نہیں کرے گا جب تک وہ سورج کو غروب ہوتا نہ دیکھ لے یا سورج غروب ہو جائے یا وہ کسی ایسے شہر میں اترے جہاں سورج غروب ہو چکا ہے۔

اس کی دلیل میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا أَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هَاهُنَا وَأَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هَاهُنَا وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ أَفْطَرَ الصَّائِمُ»

[بخاري، كتاب الصوم : باب متى يحل فطر الصائم (١٩٥٤)]

''جب رات اس سمت سے آئے اور دن اس سمت سے چلا جائے اور سورج غروب ہوجائے تو اس وقت روزہ دار روزہ افطار کرلے۔''

اور صحیح مسلم میں ہے: ''عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان میں سفر میں تھے کہ جب غروب شمس قریب ہوگیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''اے فلاں! سواری سے نیچے اتر کر ہمارے لیے ستو تیار کرو۔''

تو اس نے کہا: ''ابھی تو دن باقی ہے (یعنی ابھی سورج غروب نہیں ہوا)۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: ''نیچے اتر کر ستو تیار کرو، پس اس نے نیچے اتر کر ستو تیار کیے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پیے اور ہاتھ کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''جب سورج اس سمت سے غائب ہوجائے اور رات اس سمت سے آجائے تو روزہ دار روزہ افطار کرلے۔'' [مسلم، كتاب الصيام: باب وقت انقضاء الصوم وخروج النهار (١١٠١)]

صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم رات کو اس سمت سے آتا دیکھو تو اس وقت روزہ دار روزہ افطار کرلے۔'' [بخاري، كتاب الصوم: باب متى يحل فطر الصائم: (١٩٥٥)]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یعنی مشرق کی سمت سے دن آجائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کا اندھیرا محسوس ہونے لگے۔'' [فتح الباري (٤/ ٢٥٠)]

غروب شمس سے رات کا آنا اور دن کا چلے جانا ثابت ہوتا ہے اور اس وقت ہی صائم افطار کرتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے۔ پس یہ مسئلہ غروب شمس سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے جب سورج ایسے مقام پر غائب ہو جہاں سے صائم اسے دیکھ سکتا ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ بغیر تردد کے روزہ افطار کرے۔ جیسا کہ ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب سورج مکمل غائب ہوجائے اور مشرق سے تاریکی ظاہر ہوجائے تو اس وقت صائم افطار کرے گا اور آسمان پر باقی سرخی کا کوئی اعتبار نہیں۔ [مجموع الفتاوى (٢٥/ ٢١٥)، (٢١٦)]

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب جہاز ریاض سے غروب شمس سے پہلے مغرب کی جانب پرواز کر جائے تو آپ اس وقت تک روزے کی حالت میں ہوں گے جب تک سورج غروب نہ ہوجائے اور آپ اس وقت فضا میں ہوں، یعنی سورج غروب ہونے تک آپ افطار نہیں کر سکتے۔ یا دوسری صورت میں آپ کسی ایسے شہر میں اتر جائیں جہاں سورج غائب ہوچکا ہے۔''

(مجموع فتاوى ومقالات: [(١٥/ ٣٢٢)]

حاصل کلام یہ کہ جب تک سورج غروب نہ ہوجائے جہاز میں سوار صائم روزہ افطار نہیں کرسکتا۔ (واللہ اعلم!)

آکسیجن اور روزہ

(سوال) کیا کسی ایسے مریض کو جسے سانس کی تکلیف ہو، آکسیجن وغیرہ گیس لگائی جا سکتی ہے جبکہ اسے سانس لینے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے، کیا اس عمل سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

(جواب) آکسیجن یا کوئی اور گیس جو سانس کے مریضوں کو لگائی جاتی ہے، اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، جس کی وجوہ درج ذیل ہیں۔

① یہ ایک ہوا ہے جو سانس کی بحالی کے لیے استعمال ہوتی ہے اور ہوا سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

② اس گیس یا آکسیجن میں کوئی غذائی مواد یا دوائی نہیں ہوتی جو جسم میں داخل ہو۔ ڈاکٹر محمد علی البار لکھتے ہیں: ''ایسی آکسیجن جو سانس کے مریضوں کو لگائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی غذائی مواد یا دوائی نہیں ہوتی اور یہ زیادہ تر سانس کی بحالی کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور ہوا میں سانس لینا انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے اور ہوا کے جسم میں داخل ہونے سے روزے کے فاسد ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔'' (مجله مجمع الفقه الاسلامی (۱۰/۲/۲٤۰)

اسی طرح ڈاکٹر حسان شمسی پاشا لکھتے ہیں: ''جو آکسیجن سانس کے مریضوں کو لگائی جاتی ہے، اس میں کوئی غذائی اجزا یا دیگر جسم میں داخل ہونے والا مواد نہیں ہوتا اور یہ سانس کی بحالی کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔''

حاصل کلام یہ ہے کہ اس طرح کی گیس وغیرہ کا استعمال روزے کو فاسد نہیں کرتا۔ (واللہ اعلم!)

مریض کا روزہ

(سوال) روزے دار مریض کے لیے شریعت میں کیا حکم ہے؟ کیا روزہ توڑنا اس کے لیے جائز ہے؟ اور مرض کی وجہ سے روزہ ترک کرنا کب واجب ہوتا ہے؟

(جواب) روزے دار کے لیے اس کے مرض کے مطابق فیصلہ کیا' جاتا ہے یعنی بعض حالات میں اس کے لیے روزہ چھوڑنا جائز ہوتا ہے اور کبھی ناجائز، اسی طرح کبھی اس کے لیے روزہ چھوڑنا واجب ہوتا ہے اور کبھی افضل۔ یہ مریض اور بیماری کے حساب سے حکم لگایا جاتا ہے۔

شیخ صالح العثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض امراض سے روزہ متاثر نہیں ہوتا مثلاً زکام یا ہلکا سر درد یا دانت کا درد اور اس جیسے دیگر امراض، ان امراض سے روزہ ترک کرنا حلال نہیں۔ اگرچہ بعض علماء اس آیت کریمہ: ''وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا'' کو سامنے رکھتے ہوئے ترک روزہ کو درست قرار دیتے ہیں، لیکن ہم کہتے ہیں بے شک یہ حکم معلل بعلۃ ہے، وہ یہ ہے کہ اگر روزہ ترک کرنے میں اس کے لیے آسانی ہو تو ہم کہیں گے کہ روزہ ترک کرنا افضل ہے اور اگر روزہ رکھنے سے اس کا مرض متاثر نہیں ہوگا تو اس پر روزہ رکھنا واجب ہے اور روزہ چھوڑنا جائز نہیں۔

دوسری حالت یہ ہے کہ جب روزہ اس پر شاق ہو مگر اسے تکلیف نہ پہنچائے تو روزہ رکھنا یا ترک کرنا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ جب روزہ اس پر شاق ہو اور اسے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو، مثلاً مکمل بیمار آدمی یا شوگر کا مریض یا اس جیسے دیگر امراض ہوں تو اس صورت میں روزہ رکھنا حرام ہے۔

یعنی ایسا مرض جو ہلاکت کا سبب بنتا ہو خواہ وہ شوگر کا مرض ہو یا کوئی اور مرض ہو، مگر جب مریض کو اس کی بیماری سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو جبکہ اسے کوئی مستند ڈاکٹر روزہ رکھنے کی اجازت بھی دے دے تو اس پر روزہ رکھنا ضروری ہے۔

بحری، بری اور فضائی سفر میں روزہ کی رخصت

(سوال) ایسا شخص جس نے ہوائی جہاز یا گاڑی میں سفر کرنا ہے اور اسے مشقت کا کوئی احساس بھی نہیں ہوتا تو کیا وہ روزہ ترک کر سکتا ہے؟

(جواب) ایسے شخص کے لیے سفر میں روزہ ترک کرنا جائز ہے، خواہ سفر ہوائی جہاز میں ہو۔ اس لیے کہ روزہ ترک کرنے کی وجہ سفر میں مشقت نہیں بلکہ سفر ہی ہے، خواہ اسے سفر میں مشقت حاصل ہو یا نہ ہو۔ روزہ ترک کرنا اس کے لیے جائز ہے، اور قرآن وحدیث کے عمومی دلائل اس پر موجود ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ [البقرة: ١٨٤]

''پس تم میں جو مریض ہو یا مسافر ہو تو وہ دیگر ایام میں روزوں کی گنتی مکمل کرے۔''

اس آیت کریمہ میں سفر کی وجہ سے روزہ ترک کرنے کا جواز ملتا ہے، اس میں مشقت کا ذکر نہیں ہے۔ نیز ایک حدیث ہے کہ محمد بن کعب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس رمضان میں آیا تو وہ سفر کی تیاری کر رہے تھے اور ان کی سواری اور سازوسامان تیار ہو چکا تھا۔ اسی اثنا میں انھوں نے کھانا منگوا کر کھایا تو میں نے ان سے پوچھا: ''کیا یہ عمل سنت ہے؟'' تو انھوں نے کہا: ''ہاں! سنت ہے۔'' پھر سواری پر سوار ہو گئے۔'' [ترمذی ، كتاب الصوم : باب ما جاء فيمن أكل ثم خرج يريد سفرا (٧٩٩، ٨٠٠) ، بيهقي (٢٤٨/٤)]

اس حدیث مبارکہ کو امام ترمذی نے حسن قرار دیا ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ''صحیح الترمذی (۷۹۹)'' میں ذکر کیا ہے۔

اب انس رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں کوچ کرنے سے قبل ہی روزہ نہیں رکھ رہے۔ حالانکہ انہیں ابھی کوئی مشقت بھی نہیں پہنچی اور اس عمل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ یہ حدیث درج کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ اکثر اہل علم نے اس حدیث کو دلیل بنا کر یہ فرمایا ہے کہ مسافر کے لیے درست ہے کہ وہ گھر سے نکلنے سے پہلے ہی روزہ افطار کرے، مگر نماز اپنے شہر یا بستی سے نکلنے سے قبل قصر نہیں کر سکتا۔ یہی مذہب اسحاق بن ابراہیم الحنظلی یعنی اسحاق بن راہویہ کا بھی ہے۔

عبید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں صحابی رسول ابوبصرہ غفاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ ماہ رمضان میں کشتی میں سوار تھا کہ

انھوں نے کشتی روکی پھر ان کے لیے کھانا لایا گیا حالانکہ ابھی ہم گھروں سے زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ ابو بصرہ رضی اللہ عنہ نے دستر خوان منگوا کر کہا: ''قریب آ جاؤ۔'' میں نے کہا: ''آپ گھروں کو نہیں دیکھ رہے (یعنی ہم ابھی زیادہ دور نہیں آئے)؟'' تو ابو بصرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بے رغبتی کرتا ہے۔'' پھر انھوں نے کھانا کھا لیا۔''
[مسند احمد (٤٨٨/١٨) بیهقی ٢٤٦/٤)]

اب ابو بصرہ رضی اللہ عنہ نے کشتی میں سوار ہوتے ہی روزہ افطار کر لیا اور سفر کی مشقت کا انتظار نہیں کیا۔ پس ان دلائل سے ثابت ہوا کہ سفر میں مشقت و تکلیف کا کوئی اعتبار نہیں اور شارع نے سفر میں افطار کرنے کا یہ وصف بیان نہیں کیا۔

نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سفر کرتے تو ان میں سے بعض کا روزہ ہوتا اور بعض روزہ نہیں رکھتے تھے لیکن کوئی دوسرے پر نکتہ چینی نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ سفر میں روزہ سے رخصت ہے۔ اب جس نے روزہ رکھ لیا تو اس نے بھی درست کام کیا اور اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ رخصت قبول کرنے کو پسند کرتا ہے، جس طرح کہ وہ دیگر عطا کردہ امور پر عمل کو پسند کرتا ہے۔

حیض و نفاس والی عورتوں کے لیے روزوں کی قضا

سوال حیض و نفاس والی عورتوں کے لیے روزہ رکھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب حیض اور نفاس والی عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ حیض اور نفاس کے وقت وہ روزہ توڑ دیں، حیض اور نفاس کی حالت میں روزہ رکھنا اور نماز پڑھنا جائز نہیں اور نہ ایسی حالت میں نماز اور روزہ صحیح ہے، انہیں بعد میں صرف روزوں کی قضا کرنی ہوگی، نماز کی نہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، ان سے سوال کیا گیا کہ کیا حائضہ عورت نماز اور روزے کی قضا کرے؟ تو انہوں نے فرمایا:

''ہمیں روزوں کی قضا کرنے کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضا کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔'' [ابوداؤد، کتاب الطهارة: باب في الحائض لاتقضى الصلاة (٢٦٣)]

عائشہ رضی اللہ عنہا کی بیان کردہ حدیث پر علماء کا اتفاق ہے کہ حیض و نفاس والی عورتوں کو صرف روزوں کی قضا کرنی ہے نماز کی نہیں اور یہ اللہ سبحانہ کی طرف سے ایک طرح کی رحمت اور آسانی ہے کیونکہ نماز ایک دن میں پانچ مرتبہ پڑھی جاتی ہے اس لیے نماز کی قضا مذکورہ عورتوں پر بھاری تھی، اس لیے برخلاف روزہ سال میں ایک بار فرض ہے اور وہ ماہ رمضان کا روزہ ہے، اس لیے اس کی قضا میں کوئی مشقت و دشواری نہیں۔

دوران روزہ ٹوتھ پیسٹ کا استعمال

سوال کیا ٹوتھ پیسٹ کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب دوران روزہ ٹوتھ پیسٹ کے ذریعے دانت صاف کرنے سے بالکل اسی طرح روزہ نہیں ٹوٹتا جیسے مسواک کرنے سے

نہیں ٹوٹتا، اسی طرح آنکھ اور ناک میں دوا کے قطرے بھی ڈالے جا سکتے ہیں اور اگر ان قطروں کا ذائقہ حلق میں محسوس کرے تو اس روزہ کی قضا کر لینا احتیاط کی بنا پر ہے، واجب نہیں کیونکہ آنکھ اور کان کھانے پینے کے راستے نہیں ہیں، البتہ ناک کے قطرے استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ ناک کھانے پینے کے راستے میں شمار ہوتی ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا: ''ناک میں (وضو کرتے وقت) خوب اچھی طرح پانی چڑھاؤ الا کہ تم روزہ دار ہو۔''

لہٰذا مذکورہ حدیث اور اس معنی کی دیگر احادیث کی روشنی میں اگر کسی نے روزہ کی حالت میں ناک کے قطرے استعمال کیے اور حلق میں اس کا اثر محسوس ہوا تو اس روزہ کی قضا واجب ہے۔

❀❀❀

WWW. KITABOSUNNAT.COM

اعتکاف کے مسائل

WWW. KITABOSUNNAT. COM

اعتکاف کی شرعی حیثیت

سوال مہربانی فرما کر ہماری رہنمائی فرما دیں کہ اعتکاف کی شرعی حیثیت کیا ہے اور یہ کہ یہ کس رات سے شروع ہوتا ہے؟

جواب لغوی اعتبار سے اعتکاف کا معنی کسی چیز پر جم کر بیٹھ جانا اور نفس کو اس کے ساتھ لگائے رکھنا ہے اور شرعی اعتبار سے تمام دنیاوی معاملات ترک کر کے عبادت کی نیت سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی خاطر مسجد میں ٹھہرنے کا نام اعتکاف ہے۔ اعتکاف بیٹھنے والے کو "مُعْتَکِف" اور جائے اعتکاف کو "مُعْتَکَف" کہا جاتا ہے۔ اعتکاف سال میں کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔ نبی ﷺ سے شوال کے مہینے کا اعتکاف بھی ثابت ہے لیکن آپ ﷺ رمضان المبارک میں ہمیشہ اعتکاف بیٹھتے تھے۔ آپ نے رمضان کے درمیانے عشرے کا بھی اعتکاف کیا ہے لیکن افضل آخری عشرے کا اعتکاف ہے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ آخری عشرے کا اعتکاف کرتے رہے حتیٰ کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

« اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ کَانَ یَعْتَکِفُ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰی تَوَفَّاهُ اللّٰهُ تَعَالٰی ثُمَّ اعْتَکَفَ اَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهِ » [بخاری ، ابواب الاعتکاف :باب الاعتکاف فی العشر الأواخر (۲۰۲۶)]

"نبی ﷺ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کیا کرتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فوت کر دیا پھر آپ کے بعد آپ کی بیویاں اعتکاف کرتی تھیں۔"

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ یَعْتَکِفُ فِی الْعَشْرِ الْاَوْسَطِ مِنْ رَمَضَانَ فَاعْتَکَفَ حَتّٰی اِذَا کَانَ لَیْلَةُ اِحْدٰی وَ عِشْرِیْنَ وَ هِیَ اللَّیْلَةُ الَّتِیْ یَخْرُجُ مِنْ صَبِیْحَتِهَا مِنِ اعْتِکَافِهِ قَالَ مَنْ کَانَ اعْتَکَفَ مَعِیَ فَلْیَعْتَکِفِ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ » [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب الاعتکاف فی العشر الأواخر (۲۰۲۷)]

"رسول اللہ ﷺ رمضان کے درمیانے عشرے کا اعتکاف کیا کرتے تھے۔ ایک سال آپ نے حسب معمول اعتکاف کیا، جب اکیسویں رات ہوئی، یہ وہ رات تھی جس کی صبح کو آپ ﷺ اپنے اعتکاف سے نکلتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: "جس نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہے وہ آخری عشرے کا بھی اعتکاف بیٹھے۔"

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَّعْتَكِفَ صَلَّى الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ الْمَكَانَ الَّذِيْ يُرِيْدُ أَنْ يَّعْتَكِفَ فِيْهِ » [ابن ماجه، كتاب الصيام: باب ماجآء فيمن يبتدى الاعتكاف و قضاء الاعتكاف (١٧٧١)، نسائي (٧١٠)، احمد (٢٤٥٩٨)]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھ کر اپنی جائے اعتکاف میں داخل ہو جاتے۔''

اعتکاف کے طریقے کے متعلق اہل علم کے دو اقوال ہیں:

① ایک قول یہ ہے کہ اعتکاف مسنون آخری عشرے کا ہے اور آخری عشرے کا آغاز بیس رمضان کا سورج غروب ہوتے ہی ہو جاتا ہے لہٰذا معتکف کو چاہیے کہ وہ اکیسویں رات شروع ہوتے ہی مسجد میں آ جائے، رات بھر تلاوت قرآن، ذکر الٰہی، تسبیح و تہلیل اور قیام میں مصروف رہے اور نماز فجر ادا کر کے اپنے اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جائے۔

② دوسرا موقف یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری عشرے کا اعتکاف کیا اور دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر پڑھ کر اعتکاف کی جگہ میں داخل ہوتے تھے لیکن اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ وہ اکیس کی یا بیس کی صبح ہے۔ بہتر یہ ہے کہ معتکف بیس رمضان کی فجر پڑھ کر اعتکاف کا آغاز کرے تاکہ آخری عشرے کی اکیسویں کی طاق رات جائے اعتکاف میں گزارے، کیونکہ اعتکاف لیلۃ القدر کی تلاش کا ایک ذریعہ ہے جیسا کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے واضح ہوتا ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ درمیانے عشرے کا اعتکاف کیا۔

کئی صحابہ کرام یہ اعتکاف کر کے اپنا بوریا بستر باندھ کر گھروں کو چلے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہے وہ آخری عشرے کا بھی اعتکاف کرے۔'' یہ بیس رمضان کو فرمایا تھا۔ غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ آخری عشرے کی اکیسویں رات بعد از غروب آفتاب شروع ہوتی ہے، آپ نے بیسویں کے دن کا صحابہ سے اعتکاف کروایا حالانکہ آپ انھیں رات کو بھی بلا سکتے تھے اور کہہ دیتے کہ تم نے اعتکاف کے مقام پر داخل ہونا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر بیس کی صبح کو مسجد میں آ جائے تو ذہنی طور پر لیلۃ القدر کی تلاش کے لیے تیار ہو جائے گا اور جائے اعتکاف سے مانوس بھی ہو جائے گا۔ اس طرح اس کی اکیسویں رات معتکف میں گزرے گی۔ جب کہ دوسرے موقف کے لحاظ سے ان کی اکیسویں رات جائے اعتکاف سے باہر گزرے گی، جو ایک نقص بھی ہے لہٰذا زیادہ مناسب اور موزوں یہ ہے کہ بیسویں کی صبح کو مسجد میں آئے اور نماز ادا کرنے کے بعد اپنے معتکف میں تیار ہو کر بیٹھے۔ اس صورت میں دونوں احادیث پر عمل ہو جائے گا۔ صرف آخری عشرے سے بارہ گھنٹوں کا اضافہ ہوگا اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (واللہ اعلم)

دوسرا موقف مبنی بر احتیاط ہے وگرنہ اعتکاف تو ایک دن یا رات کا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ كُنْتُ نَذَرْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ أَنْ

أَعْتَكِفَ لَيْلَةً فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ قَالَ أَوْفِ بِنَذْرِكَ» [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب الاعتکاف لیلا (۲۰۳۲)]

''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے رسول کریم ﷺ سے سوال کیا: ''میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک رات مسجد حرام میں اعتکاف کی نذر مانی تھی۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی نذر پوری کرو۔''

معلوم ہوا کہ اعتکاف ایک عشرے سے کم کا بھی ہوسکتا ہے۔

اعتکاف کے لیے نیت

(سوال) کیا دیگر اعمال کی طرح اعتکاف کے لیے بھی نیت کرنا ضروری ہے؟

(جواب) چونکہ اعتکاف عبادت ہے اس لیے اس کے لیے بھی نیت ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہر عبادت کے لیے نیت کو لازمی قرار دیا ہے۔سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» [بخاری ، کتاب بدء الوحی: باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللّٰه(۱)]

''تمام اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔''

لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لیے زبان سے کوئی تلفظ ثابت نہیں۔ یہ دل کا فعل ہے۔بعض لوگوں نے مسجد میں داخل ہو کر اعتکاف کے لیے: '' نَوَيْتُ سُنَّةَ الْإِعْتِكَافِ'' (میں نے اعتکاف کی نیت کی) کے الفاظ مختص کر رکھے ہیں، یہ غلط ہیں اور کسی حدیث سے ثابت نہیں ہیں، اس لیے ان سے بچنا چاہیے۔

جائے اعتکاف میں کس وقت داخل ہونا چاہیے

(سوال) جائے اعتکاف میں کس وقت داخل ہونا چاہیے اور اعتکاف میں جائز امور کون کون سے ہیں؟

(جواب) اعتکاف کے متعلق اللہ کے نبی ﷺ کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے۔

[بخاری، کتاب الاعتکاف: باب الاعتکاف فی العشر الأواخر(۲۰۲۶)]

دوسری حدیث ہے:

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف بیٹھنے کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھ کر جائے اعتکاف میں داخل ہو جاتے۔'' [ابو داؤد ، کتاب الصیام : باب الاعتکاف : (۲٤٦٤)]

ان احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے عام اہل علم یہ بات لکھتے ہیں کہ آخری عشرہ کا آغاز بیس رمضان کا سورج غروب ہوتے ہی ہو جاتا ہے۔لہٰذا معتکف کو چاہیے کہ اکیسویں رات شروع ہوتے ہی مسجد میں آ جائے۔ رات بھر تلاوت قرآن، ذکر، تسبیح و تہلیل اور نوافل میں مصروف رہے اور صبح نماز فجر ادا کر کے اپنے اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جائے۔

جبکہ دوسرا موقف جو ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اعتکاف کا آغاز نماز صبح کے بعد کرتے اکیس یا بیس کی صبح کو، اس کا تعین واضح نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ معتکف بیس رمضان کی فجر کی نماز پڑھ کر اعتکاف کا آغاز کرے تاکہ اکیس کی رات معتکف میں آئے کیونکہ اعتکاف لیلۃ القدر کی تلاش کا ایک ذریعہ ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے لیلۃ القدر میں دو عشرے اعتکاف کیا۔ نہ ملی تو پھر آپ ﷺ نے تیسرے اور آخری عشرے کا اعتکاف کیا، تسلسل بھی جاری رکھا حتیٰ کہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے ساتھ اعتکاف کر رہے تھے ان میں سے بعض بیسویں کی صبح اپنا بوریا بستر اٹھا کر گھر میں بھی پہنچا چکے تھے۔ تب آپ ﷺ نے اعلان فرمایا: ''جو میرے ساتھ اعتکاف کر رہا ہے وہ اپنے اعتکاف کو جاری رکھے۔'' بیسویں رمضان تھی اور صحابہ نے پھر سے آخری عشرے کا آغاز کر دیا۔ [بخاری، کتاب الاعتکاف:باب الاعتکاف فی العشر الأوخر (۲۰۲۷)]

ذرا غور فرمائیں کہ اگر آخری عشرے کا اعتکاف اکیسویں رات بعد از غروب آفتاب شروع ہوتا تو آپ ﷺ نے بیسویں کے دن کا اعتکاف صحابہ رضی اللہ عنہم سے کیوں کروایا، آپ ﷺ انہیں اکیسویں رات ہی کو بلا لیتے اور کہہ دیتے کہ تم نے معتکف تو توڑ چھوڑ دیا ہے اب رات مسجد میں گزارو اور کل صبح یعنی اکیسویں کی صبح کی نماز کے بعد دوبارہ داخل ہو جاؤ۔ (مولانا عبدالسلام بستوی کے ''اسلامی خطبات'') ان حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اگر بیس کی صبح کو مسجد میں آجائے تو ذہنی طور پر لیلۃ القدر کی تلاش کے لیے اکیسویں کو پورا تیار ہو جاتا ہے جبکہ دوسرے موقف کے لحاظ سے اکیسویں رات جائے اعتکاف سے باہر گزار دی اور اعتکاف کے ارادے سے اکیس کی صبح کو معتکف میں داخل ہوا تو آخری عشرے سے ایک رات خارج ہو جائے گی جو ایک نقص بھی ہے، لہٰذا زیادہ مناسب اور موزوں یہ ہے کہ بیسویں کی صبح کو مسجد میں آجائے اور نماز کی ادائیگی کے بعد اپنے معتکف میں تیار ہو کر بیٹھ جائے۔ اس صورت میں دونوں احادیث پر بہتر عمل ہو جائے گا صرف آخری عشرہ سے ۱۲ گھنٹوں کا اضافہ ہوگا اور اس اضافے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حافظ عبداللہ بہاولپوری رحمہ اللہ بھی اسی موقف کے قائل تھے اور یہ موقف مبنی بر احتیاط ہے۔ واللہ اعلم۔

جائز امور: معتکف کے لیے حالت اعتکاف میں نہانا، سر میں کنگھی کرنا، تیل لگانا اور ضروری حاجات مثلاً پیشاب، پاخانہ، فرض غسل وغیرہ کے لیے جانا درست ہے اور اعتکاف بیٹھنے والے کو شرعی بلا عذر اپنے معتکف سے باہر نہیں جانا چاہیے۔
[بخاری (۲۷۲/۱)]

دوران اعتکاف ممنوع افعال

سوال مہربانی فرما کر ان امور کے متعلق آگاہی فرما دیں اعتکاف میں جن سے رک جانا چاہیے؟

جواب ① جماع و ہم بستری کرنا۔ [البقرۃ:۱۸۷]، ابن ابی شیبۃ(۳/ ۲۹)، عبد الرزاق(۴/ ۳۶۳)] ② بیمار پرسی کے لیے باہر نکلنا۔ ③ کسی کے جنازے میں شریک ہونا۔ ④ کسی ضروری حاجت کے بغیر باہر نکلنا۔ [ابوداؤد ، کتاب الصیام: باب المعتکف یعود المریض (۲۴۷۳) بیھقی(۴/ ۳۱۷)]

خواتین کا اعتکاف

(سوال) بعض خواتین گھر میں اعتکاف بیٹھ جاتی ہیں تو کیا ضروری ہے کہ خواتین بھی مسجد ہی میں اعتکاف کریں؟
(جواب) خواتین کو بھی چاہیے کہ وہ مسجد ہی میں آ کر اعتکاف بیٹھیں، ان کے لیے گھر میں اعتکاف بیٹھنے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ ﴾ [البقرة:١٨٧]

''اور تم ان عورتوں سے جماع نہ کرو اس حال میں کہ تم مسجدوں میں اعتکاف کرنے والے ہو۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اعتکاف مسجد میں کیا جاتا ہے۔ ازواج مطہرات بھی مسجد ہی میں اعتکاف کیا کرتی تھیں جیسا کہ اس کے متعلق حدیث پیچھے بیان کر دی گئی ہے۔

دورانِ اعتکاف چند جائز کام

(سوال) ہمیں ان کاموں کے متعلق بتا دیں جنھیں اعتکاف میں سرانجام دیا جا سکتا ہے؟
(جواب) ① کسی ضروری حاجت کے لیے انسان مسجد سے نکل سکتا ہے۔ [بخاری، ابواب الاعتکاف : باب هل يخرج المعتكف بحوائجه الى باب المسجد (٢٠٣٥)]

② مسجد میں خیمہ لگانا۔ [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب الأخبية فى المسجد (٢٠٣٤)]

③ اعتکاف کرنے والے کی بیوی اس سے ملاقات کے لیے مسجد میں آ سکتی ہے اور وہ بیوی کو محرم ساتھ نہ ہونے کی صوت میں گھر چھوڑنے تک ساتھ جا سکتا ہے۔ [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب هل يخرج المعتكف لحوائجه الى باب المسجد(٢٠٣٥)]

④ استحاضہ کی بیماری میں مبتلا عورت اعتکاف کر سکتی ہے۔
[بخاری، ابواب الاعتکاف : باب اعتكاف المستحاضة (٢٠٣٧)]

⑤ اعتکاف کرنے والا اپنا سر مسجد سے باہر نکال سکتا ہے اور اس کی بیوی حالت حیض میں بھی ہو تو اسے کنگھی کر سکتی ہے اور اس کا سر دھو سکتی ہے۔ [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب الحائض ترجل رأس المعتكف (٢٠٢٨، ٢٠٢٩)]

لیلۃ القدر کی تلاش

(سوال) لیلۃ القدر کسی خاص رات میں واقع ہوتی ہے یا پورے عشرے میں کسی بھی رات؟ مہربانی فرما کر جواب سے مطلع فرمائیں۔
(جواب) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ » [بخاری، کتاب فضل ليلة القدر: باب تحری ليلة القدر فی الوتر من العشر الأواخر(۲۰۱۷)]

''شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہوتی ہے، ان میں سے کوئی خاص رات متعین نہیں۔ یہ بعض دفعہ اکیسویں رات کو بھی پائی گئی ہے۔[مسلم (۱۱۶۷)]اور بعض دفعہ ستائیسویں رات کو بھی۔ [مسلم (۷۶۲)]

لیلۃ القدر کی علامات

(سوال) لیلۃ القدر کی بعض لوگ بہت سی نشانیاں بیان کرتے ہیں ان میں سے قرآن و سنت میں کونسی علامات وارد ہوئی ہیں؟

(جواب) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« صَبِيحَةُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ تَطْلُعُ الشَّمْسُ لَا شُعَاعَ لَهَا كَأَنَّهَا طَشْتٌ حَتّٰى تَرْتَفِعَ »[مسلم، كتاب صلاة المسافرين و قصرها : باب الندب الأكيد الى قيام ليلة القدر (۷۶۲)،كنز العمال (۲٤۰۵۳)]

''شب قدر کی صبح کو سورج کے بلند ہونے تک اس کی شعاع نہیں ہوتی، وہ ایسے ہوتا ہے جیسے کہ تھالی۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب لیلۃ القدر کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَيُّكُمْ يَذْكُرُ حِينَ طَلَعَ الْقَمَرُ وَ هُوَ مِثْلُ شِقِّ جَفْنَةٍ » [مسلم ، كتاب الصيام: باب فضل ليلة القدر والحث على طلبها(۱۱۷۰)]

''تم میں سے کون اسے یاد رکھتا ہے، (اس رات) جب چاند نکلتا ہے تو ایسے ہوتا ہے جیسے بڑے تھال کا کنارہ۔''

ایک اور روایت میں ہے:

« لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةٌ سَمِحَةٌ طَلْقَةٌ لَا حَارَّةٌ وَ لَا بَارِدَةٌ تُصْبِحُ الشَّمْسُ صَبِيحَتُهَا ضَعِيفَةً حَمْرَاءُ »

[مسند بزار(۱/٤۸٦)، مسند طیالسی(۳٤۹)، ابن خزيمة(۲۳۱/۳)]

''شب قدر پر سکون و معتدل رات ہے جس میں نہ گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی۔ اس کی صبح کو سورج اس طرح طلوع ہوتا ہے کہ اس کی سرخی مدہم ہو جاتی ہے۔''

شیخ سلیم الہلالی اور شیخ علی حسن عبدالحمید نے اس روایت کی سند کو حسن کہا ہے۔[صفة صوم النبی(ص/۹۰)]

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے شب قدر کی بہت زیادہ فضیلت معلوم ہوتی ہے لہٰذا اس عظیم رات میں قیام، تلاوت قرآن، کثرت دعا جیسے امورِ بخشش کو ضرور اختیار کیجیے اور اپنی بخشش کا سامان پیدا کرلیں۔ وہ انسان کتنا ہی بدنصیب ہوگا جسے یہ ماہ مبارک نصیب ہو لیکن وہ اپنی بخشش اور جہنم سے رہائی نہ کروا سکے۔

حج کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والے کا حکم

(سوال) جو شخص استطاعت کے باوجود فریضۂ حج ادا نہیں کرتا اسلام کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے؟

(جواب) ہر صاحب استطاعت شخص پر زندگی میں ایک مرتبہ بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے جیسا کہ پیچھے دلائل ذکر کر دیے گئے ہیں۔ امام ابن قدامہ مقدسی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

" وَ اَجۡمَعَتِ الۡاُمَّةُ عَلٰى وُجُوۡبِ الۡحَجِّ عَلَى الۡمُسۡتَطِيۡعِ فِي الۡعُمۡرِ مَرَّةً وَاحِدَةً " [المغنی(٦/٥)]

''امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ صاحب استطاعت پر عمر میں ایک مرتبہ حج واجب ہے۔''

قرآن کی اس آیت: ﴿ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا ﴾ کی تفسیر نبی ﷺ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے " الزَّادُ وَ الرَّاحِلَةُ " یعنی زادِ سفر اور سواری مروی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر(٤١٤/١)]

اس سے معلوم ہوا کہ جس آدمی کے پاس سامان سفر اور سواری کا انتظام ہو اس پر حج فرض ہے اور جو آدمی طاقت کے باوجود حج نہ کرے وہ ایک فرض کا تارک ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« مَنۡ اَطَاقَ الۡحَجَّ فَلَمۡ يَحُجَّ فَسَوَاءٌ عَلَيۡهِ مَاتَ يَهُوۡدِيًّا اَوۡ نَصۡرَانِيًّا » [تفسیر ابن کثیر(٤١٥/١)]

''جو شخص حج کی طاقت رکھنے کے باوجود حج نہ کرے، برابر ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر۔''

لہٰذا صاحب استطاعت آدمی بیت اللہ کا حج ضرور کرے اور کوشش کرے کہ استطاعت ہوتے ہوئے جلد حج کر لے کیونکہ موت کا علم کسی کو نہیں نہ جانے وہ کب آن گھیرے اور بندہ اس مبارک عمل سے محروم رہ جائے۔ اس لیے اپنی زندگی میں اس فریضہ کو جلد ادا کر لینا چاہیے۔

حج کتنی مرتبہ فرض ہے؟

(سوال) کیا ایک حج کر لینے والے کو اگر موقع مل جائے اور وہ عمرہ کر لے تو اس پر دوبارہ حج فرض ہو جائے گا؟ نیز پہلی بار عمرے کا کیا حکم ہے؟

(جواب) حج صرف زندگی میں ایک بار فرض ہے، عمرہ کر لینے پر دوبارہ حج فرض ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے

پس تم حج کرو۔'' تو ایک آدمی نے کہا: ''یا رسول اللہ ! کیا ہر سال؟'' آپ خاموش رہے یہاں تک کہ اس نے یہ بات تین مرتبہ کہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اگر میں ''ہاں'' کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا اور تم اس کی استطاعت نہیں رکھ سکو گے۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''میں تمہارے لیے جو چیز چھوڑ دوں اسے تم چھوڑ دیا کرو، اس کے پیچھے نہ پڑو کیونکہ تم سے پہلے لوگ کثرت سوال اور اپنے انبیاء سے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہوگئے، پس جب میں تمہیں کسی کام کے کرنے کا حکم دوں تو اسے حسب استطاعت کرو اور جب کسی چیز سے منع کر دوں تو اسے چھوڑ دو۔''

[مسلم ، کتاب الحج: باب فرض الحج مرة في العمر: (١٣٣٧)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج زندگی میں ایک بار فرض ہے دو بار نہیں۔

عمرہ بھی آدمی پر ایک دفعہ ہی واجب ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''کوئی شخص ایسا نہیں مگر اس پر حج اور عمرہ ضروری ہے۔'' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب میں حج کے ساتھ عمرے کا بھی ذکر ہے۔'' جیسا کہ فرمایا: ''حج اور عمرہ پورا کرو۔'' [البقرة : ١٩٤]

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ''كتاب العمرة، باب وجوب العمرة وفضلها'' قائم کر کے یہ آثار ذکر کیے ہیں اور سمجھایا ہے کہ عمرہ واجب ہے۔

حج کی کون سی قسم افضل ہے

سوال ہمارے لیے حج کی کون سی قسم افضل ہوگی جبکہ ہم نے ابھی سے قربانی کے جانور کیلئے رقم اپنے وکیل کو جمع کرا دی ہے؟

جواب حج کی تین قسمیں ہیں، پہلے ان کی معرفت اچھی طرح سمجھ لیں تا کہ آپ جان لیں کہ ہم نے حج کا کون سا طریقہ اختیار کرنا ہے:

① **حج تمتع:**...... حج تمتع یہ ہے کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھیں اور '' لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ عُمْرَةً '' کہیں پھر تلبیہ جائیں، مکہ پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کریں۔ مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت پڑھیں، اس کے بعد صفا و مروہ کی سعی کریں، بال کٹوائیں اور احرام کھول دیں اور عام معمول کے مطابق زندگی بسر کریں اور اب آپ احرام کی پابندیوں سے آزاد ہیں، پھر آٹھ ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھیں اور مناسک حج ادا کریں۔

② **حج قران:**......اس کے لیے میقات سے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھیں، مکہ پہنچ کر عمرہ کریں لیکن احرام نہیں کھولیں گے اور نہ احرام کی پابندیوں سے آزاد ہوں گے بلکہ حالت احرام ہمیں رہیں گے اور اس حالت میں ۸ ذوالحجہ کو منیٰ چلے جائیں اور احکام حج ادا کریں۔

③ **حج مفرد:**......اس صورت میں صرف منیٰ سے حج کی نیت کر کے احرام باندھیں، طواف قدوم اور سعی کریں مگر احرام نہ کھولیں بلکہ اسی طرح منیٰ چلے جائیں اور تمام مناسک پورے کر کے احرام کھول دیں۔

یہ حج کی تین اقسام بالاتفاق صحیح ہیں، اب اختلاف یہ ہے کہ ان میں سے افضل قسم کون سی ہے؟ بعض نے حج قران کو افضل قرار دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حج کیا تھا اور بعض نے تمتع کو افضل قرار دیا۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی تمنا کی تھی۔ بعض نے کہا اگر قربانی لے کر جا رہا ہو تو حج قران افضل ہے اور اگر قربانی لے کر نہ گیا ہو تو حج تمتع افضل ہے۔

ہمارے نزدیک صحیح دلائل کی رو سے حج تمتع افضل ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اگرچہ حج قران کیا تھا مگر افسوس کا اظہار کیا تھا اور فرمایا تھا:

''جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی ہے وہ اگر پہلے معلوم ہو جاتی تو اپنے ساتھ قربانی نہ لاتا۔'' [صحیح بخاری، کتاب التمنی: باب قول النبی لو استقبلت من أمری ما استدرت (7229)، ابوداؤد (۱۷۸٤)]

جن صحابہ کرام کے پاس قربانی کے جانور نہیں تھے اور انہوں نے حج قران کی نیت سے احرام باندھے ہوئے تھے آپ نے انھیں حکم دیا کہ وہ عمرہ کر کے احرام کھول دیں اور قران کی نیت ختم کر کے تمتع کی نیت کر لیں جیسا کہ صحیح مسلم (۱۲۱۸) اور بیہقی (۳۳۸/۴) میں موجود ہے۔

اور جنہوں نے آپ کے اس حکم کو مشورہ سمجھا اور احرام نہ کھولا آپ نے ان پر شدید ناراضی کا اظہار فرمایا جیسا کہ [صحیح مسلم(٦٥٤/٨،١٥٥)، ابن خزیمة(٢٦٠٦)، بیہقی (١٩/٥)اور مسند احمد (١٧٥/٦)] میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں موجود ہے۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ کا حج تمتع کی تمنا کرنا اور جن صحابہ کے پاس قربانیاں نہ تھیں انھیں عمرہ کر کے احرام کھولنے کا حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ حج تمتع افضل ہے اور یہی کثیر اہل علم کا موقف ہے۔ جیسا کہ [نیل الاوطا (١٣٠/٤،١٣١) اور الفتح الربانی (٩٠/١١-٩٩)]وغیرہ میں مرقوم ہے۔

دوران طواف جوتا ساتھ اٹھانا

سوال کیا حالت طواف میں اپنے ساتھ جوتا اٹھانا جائز ہے؟

جواب بیت اللہ کے طواف کے وقت جوتا ساتھ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، اگر جوتا صاف ستھرا ہو، کوئی گندگی نہ لگی ہو تو اسے پاؤں میں پہنے رکھیں پھر بھی درست ہے کیونکہ صاف وستھری جوتی کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثبوت کئی ایک احادیث صحیحہ صریحہ میں موجود ہے۔ جیسا کہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ننگے پاؤں اور جوتا پہن کر بھی نماز پڑھتے تھے۔ (ابوداؤد کتاب الصلاة: باب الصلاة فی النعل : ٦٥٣)

لہٰذا صاف جوتے میں عبادت کرنا جائز ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔

کیا ہر طواف میں اضطباع ضروری ہے؟

سوال اضطباع کسے کہتے ہیں؟ کیا ہر طواف میں اضطباع ضروری ہے، اگر نہیں تو کم از کم کتنے چکروں میں ضروری ہے؟

(جواب) اضطباع یہ ہے کہ احرام کی اوپر والی چادر کو اپنی دائیں بغل کے نیچے سے گزار کر اپنے بائیں کندھے پر ڈال لیں اور اپنا دایاں کندھا ننگا رکھیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے جعرانہ سے (احرام باندھ کر) عمرہ کیا اور بیت اللہ کے گرد رمل چال سے طواف کیا اور اپنی اوپر والی چادر کو اپنی دائیں بغلوں کے نیچے سے گزار کر انھیں اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔'' [ابو داؤد، کتاب

المناسك:باب الاضطباع في الطواف (١٨٨٤)]

یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کا طواف اضطباع کی حالت میں کیا اور آپ پر سبز چادر تھی۔'' [سنن ابی داؤد، کتاب المناسك:باب الاضطباع في الطواف (١٨٨٣)]

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری سے نقل کر کے لکھتے ہیں:

''اضطباع اور رمل ہر اس طواف میں سنت ہے جس کے بعد سعی ہے اور اضطباع تمام چکروں میں سنت ہے برخلاف رمل کے، رطواف کے دوران اضطباع مستحب نہیں اور عوام الناس جو ابتدائے احرام سے لے کر حج یا عمرے میں اضطباع کیے رکھتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں بلکہ نماز کی حالت میں مکروہ ہے۔'' [تحفة الاحوذی (٢/٢)، مرعاة المفاتيح (١٢٣/٩)]

مقام ملتزم پر دعا کرنا

(سوال) مقام ملتزم پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس وقت گڑگڑا کر دعا کرنے کا حکم دیا ہے؟ حج یا عمرہ یا دونوں میں؟

(جواب) حجر اسود اور باب کعبہ کے درمیان والی جگہ جسے ملتزم کہتے ہیں، اس کے ساتھ چمٹنا اور اس پر اپنا سینہ، ہاتھ، بازو اور چہرہ رکھنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے جیسا کہ ابو داؤد (کتاب المناسك باب الملتزم) اور ابن ماجہ (باب الملتزم) وغیرھما میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، اس التزام کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں، یہ پورے موسم حج میں کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ میں داخل ہوتے وقت ہی کر لیا کرتے تھے۔

رمل کس طواف میں ضروری ہے؟

(سوال) رمل کس طواف میں ضروری ہے؟

(جواب) پہلے طواف کے صرف پہلے تین چکروں میں مردوں کے لیے رمل چال اور بقیہ چار چکروں میں عام چال سے چلنا سنت سے ثابت ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس پر تمام ائمہ وفقہاء کا اجماع نقل کیا ہے۔ [الفتح الربانی (٢٣/١٢)]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم حج اور عمرہ کے لیے آنے پر سب سے پہلے جو طواف کرتے اس میں تین چکر

دوڑ کر (رمل) لگاتے اور باقی چار چکروں میں عام چال چلتے، پھر مقام ابراہیم پر دو رکعت پڑھتے، پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے۔'' [صحیح بخاری ، کتاب الحج: باب استلام الحجر الأسود، حین یقدم مکة أول ما یطوف و یرمل ثلاثا (۱٦۰۳)]

حج یا عمرے سے واپسی پر دعوت کرنا

سوال کیا حج یا عمرہ سے واپسی پر دوست احباب کی دعوت کرنا مسنون ہے؟

جواب سفر حج سے واپس آنے پر دوستوں کی دعوت کرنا مستحب ہے جیسا کہ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب (سفر حج) سے واپس مدینہ منورہ لوٹے تو لوگوں کی دعوت کے لیے یوں اہتمام کیا کہ ایک اونٹ یا گائے (راوی کو شک ہے) ذبح کی۔ [بخاری، کتاب الجهاد والسیر : باب الطعام عند القدوم(۳۰۸۹)]

❀❀❀

حج سے متعلق چند متفرق مسائل

دوران حج حیض و نفاس والی عورت کیا کرے؟

(سوال) اگر دوران حج عورت پر حیض و نفاس کی حالت طاری ہو جائے تو وہ کیا کرے؟

(جواب) جب ۸ ذوالحجہ کو منیٰ کی طرف روانگی کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو روتے دیکھا۔ آپ ﷺ نے وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ میں بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی۔ اب سب لوگ منیٰ میں جا رہے ہیں اور میں بدستور حالت حیض میں ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''(غسل کرو اور حج کا احرام باندھ لو اور) سب وہ ارکان ادا کرو جو حاجی کریں البتہ بیت اللہ کا طواف نہ کرنا۔''
[بخاری، كتاب الحيض: باب تقضى الحائض المناسك كلها الا الطواف(۳۰۵)]

اسی طرح سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے ہاں بیٹا (محمد بن ابی بکر) پیدا ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''غسل کرلو اور کس کر لنگوٹ باندھ لو اور پھر احرام کی حالت اختیار کرلو۔'' [مسلم، كتاب الحج: باب حجة النبی(۱۲۱۸)]

ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنے کا حکم

(سوال) کیا مکہ میں رہتے ہوئے بار بار عمرہ کرنے کی ممانعت آئی ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

(جواب) مکہ مکرمہ میں رہ کر ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنا درست ہے، جس طرح کثرت سے طواف بیت اللہ درست ہے۔ اس کے لیے احرام حرم سے باہر جا کر بھی باندھا جا سکتا ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقام تنعیم (مسجد عائشہ) سے احرام باندھنے کا واقعہ ہے۔ اسی طرح مکہ میں حرم کے اندر اپنی رہائش سے بھی احرام باندھنا درست ہے جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« فَمَنْ كَانَ دُوْنَهُنَّ فَمُهَلُّهُ مِنْ اَهْلِهِ ...... حَتّٰى اَهْلُ مَكَّةَ يُهِلُّوْنَ مِنْهَا » [بخاری، كتاب الحج: باب مهل أهل الشام(۱۵۲۶)]

''جو لوگ میقات کے اندر ہیں وہ اپنی رہائش سے احرام باندھیں گے حتیٰ کہ مکہ والے مکہ ہی سے احرام باندھیں گے۔''

اگر کوئی کہے کہ مکہ میں رہ کر بار بار عمرہ کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے تو جواب یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں رہ کر بار بار طواف کرنا بھی تو ثابت نہیں۔ کیونکہ آپ عمرہ کر کے اپنے ساتھیوں سمیت مکہ سے باہر ابطح میں ٹھہر گئے تھے اور آٹھ ذوالحجہ کو وہاں سے منیٰ چلے گئے تھے۔ اگر کوئی کہے کہ طواف سے منع نہیں کیا گیا تو جواب یہ ہے کہ عمرہ کرنے سے بھی منع نہیں کیا گیا۔ (واللہ اعلم)

میت کی طرف سے حج کرنا

(سوال) کیا میت کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے؟

(جواب) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا: ''میری والدہ نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ حج کرنے سے پہلے ہی فوت ہوگئی تو کیا اس کی طرف سے حج ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اگر اس کے ذمے قرض ہوتا تو تم اسے ادا کرتے؟'' اس نے کہا: ''ہاں!'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔'' [بخاری، كتاب الجزاء الصيد ، باب الحج والنذور عن الميت والرجل يحج عن المرأة (١٨٥٢)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے۔

حج بدل کا حکم

(سوال) حج بدل اور عمرۂ بدل کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ رہنمائی فرمادیں۔

(جواب) کسی ایسے مسلمان کی طرف سے حج کرنا جو مالدار ہو لیکن کمزوری، بڑھاپے یا کسی دائمی مرض کی وجہ سے معذور ہو ''حج بدل'' کہلاتا ہے۔ یہ درست ہے بشرطیکہ حج بدل کرنے والا پہلے خود اپنا حج کر چکا ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ کہہ رہا تھا: « لَبَّيْكَ عَنْ شُبْرُمَةَ » یعنی ''شبرمہ کی طرف سے لبیک۔'' آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''یہ شبرمہ کون ہے؟'' اس نے کہا ''میرا بھائی ہے'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: « حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ ثُمَّ عَنْ شُبْرُمَةَ » ''پہلے خود اپنا حج کرو پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرنا۔'' [ابوداؤد، كتاب المناسك : باب الرجل يحج عن غيره (١٨١١)]

حج بدل کرنے والا شخص قریبی رشتہ دار ہو، یہ ضروری نہیں، دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حج کو قرض کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا قرض دوسرا کوئی بھی شخص ادا کر سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ غریبوں کے قرض کی ادائیگی کے ضامن بن جایا کرتے تھے۔ نیز مرد کی طرف سے عورت اور عورت کی طرف سے مرد حج بدل کر سکتا ہے۔

عمرہ بدل بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سیدنا ابو رزین عقیلی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میرا باپ بہت بوڑھا ہے، وہ حج اور عمرہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے باپ کی طرف سے حج اور عمرہ کرو۔'' [ترمذی ، كتاب الحج: باب منه (٩٣٠)]

رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت

(سوال) رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے موقع پر کیا پڑھا جائے؟

(جواب) مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کے بعد جب رسول اللہ ﷺ، سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی قبروں پر حاضر ہوں تو وہی دعا پڑھیں جو رسول اللہ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس وقت سکھائی تھی جب انھوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا تھا: ''قبروں کی زیارت کے موقع پر میں کیا کہوں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کلمات کہا کرو:

« اَلسَّلَامُ عَلٰى اَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَ الْمُسْتَاْخِرِيْنَ وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ » [مسلم، كتاب الجنائز: باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها (٩٧٤)]

''دیار میں رہنے والے مومنو! اور مسلمانو! تم پر سلامتی ہو اور اللہ تعالیٰ رحم فرمائے جو ہم سے پہلے چلے گئے اور جو ہم سے پیچھے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم تمھیں ملنے والے ہیں۔''

آب زمزم کے فوائد

(سوال) کیا آب زم زم کو دیگر پانیوں پر فضیلت حاصل ہے نیز اس کے فوائد کیا ہیں؟

(جواب) بلاشبہ آب زمزم کے فضائل بہت زیادہ ہیں اور یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک واضح نشانی ہے اور بہت زیادہ برکتوں والا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« خَيْرُ مَاءٍ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ مَاءُ زَمْزَمَ فِيْهِ طَعَامُ الطُّعْمِ وَ شِفَاءُ السُّقْمِ »[مسندبزار (١١٧١- كشف الأستار) الترغيب والترهيب(١٧٥٤)، امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے بزار اور طبرانی نے المعجم الصغير میں روایت کیا ہے اور بزار کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ [مجمع الزوائد(٢٨٦/٣)]

''زمین کی سطح پر سب سے بہتر پانی زمزم کا پانی ہے، اس میں پینے والوں کے لیے کفایت ہے اور بیماری کی شفا ہے۔''

آب زمزم کی فضیلت میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب معراج ہوئی تو جبرائیل علیہ السلام نے آ کر زمزم کے پانی سے آپ کے قلب مبارک کو غسل دیا۔[بخاری، كتاب الصلاة: باب كيف فرضت الصلاة في الإسراء(٣٤٩)]

اور یہ بات کئی ایک ائمہ نے اپنے مشاہدات میں بیان کی ہے کہ آب زمزم واقعی کھانے سے کفایت کرتا ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے ایسے آدمی کا مشاہدہ کیا ہے جو آب زمزم سے گنتی کے دن غذائیت حاصل کرتا رہا، تقریباً نصف ماہ یا اس سے زائد اور اسے بھوک نہیں لگتی تھی۔ لوگوں کے ساتھ عام آدمی کی طرح طواف کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بعض اوقات اس پر یہ کیفیت چالیس دن تک رہتی۔'' [زاد المعاد(٣٩٣/٤)]

علامہ فاکہی نے لکھا ہے کہ صفیہ بنت بحرہ کہتی ہیں: ''میں نے ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا کا ایک بڑا پیالہ دیکھا جو مسجد میں رکھا ہوا تھا۔ اس میں زمزم کا پانی ڈالا جاتا تھا، جب ہم اپنے گھر والوں سے کھانا مانگتے تو وہ کہتے: ''ام ہانی کے پیالے کی

طرف چلے جاؤ۔"[اخبار مکہ(٤٧/٢)]

زمزم کے پانی کے بہت سارے فوائد ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زمزم جس نیک مقصد کے لیے پیا جائے اللہ تبارک وتعالیٰ وہ پورا کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ فاکہی نے ایک روایت نقل کی ہے:

"جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے حج کیا، ہم نے بھی ان کے ساتھ حج کیا، جب انھوں نے بیت اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کی پھر زمزم کے پاس سے گزرتے ہوئے صفا کو نکلنے لگے تو کہا: "اے لڑکے! میرے لیے زمزم کا ایک ڈول نکال۔" ان کے لیے ڈول نکالا گیا، انھوں نے پیا اور اپنے سر اور چہرے پر بھی ڈالا اور کہا:

" زَمْزَمُ شِفَاءٌ وَ هِيَ لِمَا شُرِبَ لَهُ " [أخبار مکہ(٣٧/٢) اس روایت کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اپنی کتاب " جزء ماء زمزم لما شرب له" میں فرماتے ھیں: " یہ سند موقوف ہونے کے ساتھ حسن ھے اور اس حدیث کے لیے جس بھی سند پر میں واقف ھوا ھوں ان سب سے بہتر ھے۔"]

"زمزم شفاء ہے اور جس مقصد کے لیے پیا جاتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے۔"

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ روایت اگرچہ موقوف ہے لیکن حکماً مرفوع ہے، اس لیے کہ اس میں جو بات بتائی گئی ہے اس میں رائے اور اجتہاد کو دخل نہیں۔ سنن ابن ماجہ میں ایک روایت ان لفظوں سے موجود ہے:

« مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ » [ابن ماجه، كتاب المناسك : باب الشرب من زمزم(٣٠٦٢)، ابن ابی شيبة (٣٥٨/٤)، احمد (٣٥٧/٣)، أخبار أصفهان(٣٧/٢)، عقيلي(٣٠٣/٢)،تاريخ بغداد(١٧٩/٣)]

"زمزم کے پانی سے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لیے اسے پیا جائے۔"

اس روایت کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔[صحيح ابن ماجه(٢٤٨٤)]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ اِنْ شَرِبْتَهُ تَسْتَشْفِيْ بِهِ شَفَاكَ اللّٰهُ وَ اِنْ شَرِبْتَهُ لِشَبْعِكَ اَشْبَعَكَ اللّٰهُ بِهِ وَ اِنْ شَرِبْتَهُ لِيُقْطَعَ ظَمَأُكَ قَطَعَهُ اللّٰهُ وَ هِيَ هَزْمَةُ جِبْرِيْلَ وَ سُقْيَا اللّٰهِ اِسْمَاعِيْلَ » [دارقطنی (٥٤٥/٢)، (٢٧٠٢)، مستدرك حاكم(٣٧٣/١)]

"زمزم کا پانی جس غرض سے پیا جائے وہ پوری ہوتی ہے، اگر تم اس لیے پیو کہ اس کے ذریعے تم کو شفا چاہیے تو اللہ تعالیٰ تمھیں شفا عطا کرے گا اور اگر تم نے اس لیے پیا کہ تم سیراب ہو جاؤ تو اللہ تمھیں سیراب کر دے گا اور اگر تم اس لیے پیو کہ تم اپنی پیاس ختم کر دو تو اللہ اسے ختم کر دے گا۔ یہ جبریل علیہ السلام کے پاؤں کی ضرب ہے اور اللہ تعالیٰ کا اسماعیل علیہ السلام کو پلانا ہے۔"

بہت سارے محدثین نے آب زمزم کو مختلف نیک مقاصد کے لیے استعمال کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مقاصد پورے کر دیے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی کتاب " جزء ماء زمزم لما شرب له" میں فرماتے ہیں: "میں نے اسے ایک مرتبہ پیا اور اللہ سے دعا کی کہ مجھے حفظ حدیث میں امام ذہبی جیسی اہلیت عطا کر دے، میں اس وقت حدیث کا ابتدائی طالب علم تھا۔ پھر میں

نے ایک مدت بعد حج کیا جو تقریباً بیس سال کے قریب ہے، اس وقت میں اپنے اندر اس سے زائد رتبے کی طلب پاتا تھا پھر میں نے اس سے اونچے رتبے کا سوال کیا، مجھے اللہ سے امید ہے کہ میں اسے پالوں گا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ابو بکر بن المقری کے فوائد میں سے سوید بن سعید کے طریق سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: ''میں نے ابن مبارک کو زمزم میں داخل ہوتے دیکھا تو انھوں نے کہا: ''اے اللہ! عبداللہ بن مؤمل نے مجھے ابوالزبیر از جابر حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آب زمزم جس مقصد کے لیے پیا جائے وہ حاصل ہو جاتا ہے'' اے اللہ! میں اس لیے پی رہا ہوں کہ قیامت کے دن کی پیاس سے بچ جاؤں۔'' اس مسئلے کی مزید تفصیل کے لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا رسالے کا مطالعہ کریں۔

حج کے موقع پر کی قربانی

سوال کیا حج کے موقع پر کی جانے والی قربانی سنت ابراہیم ہے؟ وضاحت فرما دیں۔

جواب حج کے موقع پر جو قربانی کی جاتی ہے وہ سنت ابراہیمی ہے۔ مفسر قرآن حکیم سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ابوالطفیل نے سوال کیا:

" يَزْعَمُ قَوْمُكَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ سَعٰى بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَ اَنَّ ذٰلِكَ سُنَّةٌ "

''آپ کی قوم کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کی ہے اور یہ سنت ہے۔'' تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''انھوں نے سچ کہا ہے۔''

بلاشبہ جب ابراہیم علیہ السلام کو ارکان حج کا حکم دیا گیا تو سعی کے مقام پر شیطان ان کے سامنے آیا، اس نے آگے نکلنے کی کوشش کی تو ابراہیم علیہ السلام اس پر سبقت لے گئے پھر جبرائیل علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کو جمرہ عقبہ کے پاس لے گئے، پھر ان کے سامنے شیطان آ گیا تو انھوں نے اسے سات کنکریاں ماریں یہاں تک کہ وہ چلا گیا، جمرہ وسطی کے پاس پھر سامنے آ گیا، انھوں نے اسے پھر سات کنکریاں ماریں۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ اسماعیل علیہ السلام نے سفید قمیص زیب تن کی ہوئی تھی، وہ کہنے لگے: ''اے میرے ابا جان! میرے پاس اس کے علاوہ کوئی کپڑا نہیں جس میں آپ مجھے کفن دے سکیں۔'' ابراہیم علیہ السلام وہ قمیص اتارنے کی کوشش کرنے لگے تو انھیں پچھلی جانب سے آواز دی گئی: ''اے ابراہیم! بلاشبہ تو نے خواب سچا کر دکھایا۔'' ابراہیم علیہ السلام نے جب مڑ کر دیکھا تو اچانک ایک سفید سینگوں والا مینڈھا موجود تھا۔'' [مسند احمد(١/٢٩٧)، (٤/٤٣٧)، المعجم الكبير(١٠/٢٦٨)، مسند طيالسی(٢٦٩٧)، بيهقی (٥/١٥٣)، شعب الايمان(٤٠٧٧)، تفسير ابن كثير (٥/٣٥٢)، تهذيب الآثار (ص/٦٠)، تفسير طبری(٢/٥١٦)]

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو ارکان حج کا جب حکم ملا تھا اور شیطان کو جمرات کے پاس کنکریاں ماری

تھیں، اس موقع پر اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید مینڈھا قربانی کے لیے دے دیا اور ان کے خواب کو سچا کر دیا۔ لہٰذا حج کے موقع پر قربانی کرنا سنت ابراہیمی ہے، اس میں کسی بھی اہل علم کو اختلاف نہیں۔ یہ چند متجددین کے ناقص اجتہاد کا کرشمہ ہے، وہ ایسے شوشے چھوڑ کر اسلام کی تعلیمات پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں لیکن یہ چراغ پھونکوں سے بجھایا نہ جائے گا اور تا قیامت سنت ابراہیمی زندہ رہے گی۔ ان شاء اللہ!

WWW. KITABOSUNNAT.COM
KITABOSUNNAT@GMAIL.COM

جنازے کے احکام

WWW. KITABOSUNNAT.COM

میت کو غسل دینے کا طریقہ

(سوال) میت کو غسل دینے کا مسنون طریقہ بیان فرما کا ممنون فرمائیں؟

(جواب) ① میت کو تین مرتبہ یا اس سے زیادہ مرتبہ حسب ضرورت غسل دیا جائے۔

② غسل دینے کی تعداد طاق ہونی چاہیے۔

③ غسل دیتے وقت پانی میں نظافت وطہارت کی غرض سے بیری کے پتے ڈال دینے چاہییں یا جو بھی اس کے قائم مقام ہو مثلاً صابن وغیرہ۔

④ میت کو آخری مرتبہ غسل دیتے وقت پانی میں کوئی خوشبو ملا لینی چاہیے۔کافور مل جائے تو یہ سب سے بہتر ہے۔

⑤ عورت کے بالوں کی مینڈھیاں کھول کر بال اچھی طرح دھوئے جائیں۔

⑥ پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرنی چاہیے۔

⑦ عورت کے بالوں کی تین مینڈھیاں بنا کر انھیں اس کے پیچھے ڈال دینا چاہیے۔

⑧ غسل دیتے وقت میت کے داہنے اعضا اور وضو کی جگہوں سے ابتدا کرنی چاہیے۔

⑨ اگر فوت ہونے والا شخص محرم ہو تو اسے خوشبو نہیں لگائی جائے گی۔

⑩ غسل دیتے وقت کسی کپڑے یا تولیے وغیرہ کے ساتھ میت کے ستر کو ڈھانپ کر رکھنا ضروری ہے۔

⑪ میت کو غسل دینے والے کے لیے بعد میں خود غسل کرنا مستحب ہے۔

⑫ معرکے میں شہید ہونے والے کو غسل نہیں دیا جائے گا۔

⑬ میدان جنگ کے شہید کے علاوہ دیگر شہداء (مثلاً پیٹ کے مرض سے فوت ہونے والا، طاعون سے اور جل کر فوت ہونے والا وغیرہ) کو بالاتفاق غسل دیا جائے گا۔

میت کو غسل دینے والے پر غسل

(سوال) کیا میت کو غسل دینے والے پر غسل اور کندھا دینے والے پر وضو واجب ہو جاتا ہے؟

(جواب) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو میت کو غسل دے وہ غسل کرے اور جو اسے اٹھائے وہ وضو کرے۔''[ابو داؤد، کتاب الجنائز: باب فی الغسل من غسل المیت (۳۱۶۱)]

اور ابن ماجہ میں ہے:

''جو میت کو غسل دے وہ غسل کرے۔''[ابن ماجه، کتاب الجنائز: باب ما جاء فی غسل المیت (۱۴۶۳)]

امام ابو داؤد تو اسے منسوخ سمجھتے ہیں جیسا کہ انہوں نے اس حدیث کے بعد لکھا ہے لیکن انہوں نے ناسخ بیان نہیں کیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر ذکر کیا ہے کہ انہوں نے سعید بن زید کے ایک بیٹے کو خوشبو لگائی، اٹھایا، نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔[بخاری، کتاب الجنائز: باب غسل المیت، ووضوءہ بالماء و السدر]

ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ گویا امام بخاری نے اشارہ کیا ہے کہ ابو داؤد والی روایت کمزور ہے پھر انہوں نے اس پر کلام کیا۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ جب ان کو سعید بن زید بن عمرو کی وفات کی خبر ملی تو اس وقت وہ عقیق میں تھے، خبر ملتے ہی آئے اور ان کو غسل دیا، کفنایا اور خوشبو لگائی پھر اپنے گھر آئے اور غسل کیا، غسل کرنے کے بعد انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''میں نے غسل دینے کی وجہ سے غسل نہیں کیا، اگر وہ نجس ہوتے تو میں انہیں ہاتھ نہ لگاتا، میں نے تو گرمی کی وجہ سے غسل کیا ہے۔''[فتح الباری: (۱۲۵/۳)]

ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:''میت کو غسل دینے والے پر غسل واجب نہیں۔''

معلوم ہوا کہ میت کو غسل دینے والے پر غسل واجب نہیں اور اٹھانے والے پر وضو ضروری نہیں۔ البتہ اگر کوئی غسل یا وضو کرے تو درست ہے۔

میاں بیوی کا ایک دوسرے کو غسل دینا

سوال کیا میاں بیوی کسی ایک کی موت پر ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں؟

جواب میاں بیوی میں سے جو بھی پہلے وفات پا جائے دوسرا اسے غسل دے سکتا ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« رَجَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنَ الْبَقِيْعِ فَوَجَدَنِيْ وَ اَنَا اَجِدُ صُدَاعًا فِيْ رَأْسِيْ وَ اَنَا اَقُوْلُ وَارَاْسَاهُ فَقَالَ بَلْ اَنَا يَا عَائِشَةُ ! وَارَاْسَاهُ ثُمَّ قَالَ: مَا ضَرَّكِ لَوْ مِتِّ قَبْلِيْ فَقُمْتُ عَلَيْكِ فَغَسَّلْتُكِ وَ كَفَّنْتُكِ وَ صَلَّيْتُ عَلَيْكِ وَ دَفَنْتُكِ »[ابن ماجه، کتاب الجنائز: باب ما جآء فی غسل الرجل امرأته و غسل المرأة زوجها (۱۴۶۵)، دارقطنی (۱۸۰۹)، السنن الکبری للبیهقی(۳۹۶/۶)، کتاب الجنائز : باب الرجل یغسل امرأته إذا ماتت دارمی(۳۹/۱) مسند ابی یعلی(۵۶/۸)]

''رسول اللہ ﷺ (ایک آدمی کے جنازے سے فارغ ہوکر) بقیع سے واپس لوٹے۔ آپ ﷺ نے مجھے اس حالت میں پایا کہ میرے سر میں درد ہو رہا تھا اور میں ہائے ہائے کر رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:'' اے عائشہ! بلکہ میرے

سر میں بھی درد ہو رہا ہے۔'' پھر فرمایا: ''تجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہوگئی تو میں تجھے غسل دوں گا اور کفن پہناؤں گا اور تیرا جنازہ پڑھوں گا اور تجھے دفن کروں گا۔''

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

«لَوْ كُنْتُ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا غَسَّلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرُ نِسَائِهِ»

[ابن ماجه، كتاب الجنائز:باب ما جآء فی غسل امرأته و غسل المرأة زوجها (١٤٦٤)، مسند ابی یعلی (٤٦٨/٧)،مسند احمد (٢٦٧/٦)، ابو داؤد، كتاب الجنائز: باب فی ستر المیت عند غسله (٣١٤١)، السنن الكبرىٰ للبیهقی (٣٩٨/٣)، مستدرك حاكم (٥٠/٣)، موارد الظمآن (٢١٥٧)، شرح السنة (٣٠٨/٥)، مسند شافعی (٢١١/١)]

''اگر مجھے پہلے یہ بات یاد آ جاتی جو مجھے بعد میں یاد آئی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی بیویوں کے سوا کوئی غسل نہ دیتا۔''

قاضی شوکانی رحمہ اللہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اوپر والی حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:

" فِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الْمَرْأَةَ يُغَسِّلُهَا زَوْجُهَا اِذَا مَاتَتْ وَ هِيَ تُغَسِّلُهُ قِيَاسًا "[نيل الأوطار (٣١/٤)]

''اس حدیث میں دلیل ہے کہ عورت جب مر جائے تو اسے اس کا خاوند غسل دے سکتا ہے اور اس دلیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت بھی خاوند کو غسل دے سکتی ہے۔''

کیونکہ شوہر اور بیوی کا ایک پردہ ہے، جس طرح مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے اسی طرح عورت بھی مرد کو دیکھ سکتی ہے۔ علامہ محمد بن اسماعیل صاحب سبل السلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فِيْهِ دَلَالَةٌ عَلٰى اَنَّ لِلرِّجَالِ اَنْ يُغَسِّلَ زَوْجَتَهُ وَ هُوَ قَوْلُ الْجُمْهُوْرِ"[سبل السلام(٧٤١/٢، ٧٤٢)]

''اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے اور یہی قول جمہور ائمہ محدثین کا ہے۔''

اسی طرح سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی اہلیہ محترمہ سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے غسل دیا تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ عبد اللہ بن ابی بکر سے روایت کرتے ہیں:

«اَنَّ اَسْمَاءَ بِنْتَ عُمَيْسٍ غَسَّلَتْ اَبَا بَكْرِ الصِّدِّيْقَ حِيْنَ تُوُفِّيَ» [مؤطا للامام مالك، كتاب الجنائز (١٣٣)، عبد الرزاق (٤١٠/٣)، الأوسط لابن المنذر (٣٣٥/٥)، شرح السنة(٣٠٨/٥)]

''جس وقت ابو بکر رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے انھیں غسل دیا۔''

سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«اَنَّ فَاطِمَةَ اَوْصَتْ اَنْ يُغَسِّلَهَا زَوْجُهَا عَلِيٌّ وَ اَسْمَاءُ فَغَسَّلَاهَا» [دار قطنی، كتاب الجنائز: باب الصلاة على القبر(١٨٣٣)، السنن الكبرىٰ للبیهقی (٣٩٦/٣)، مصنف عبد الرزاق (٤١٠/٣)، شرح السنة (٣٠٩/٥)، مسند شافعی(٢١١/١)، حلیة الأولیاء (٤٣/٢)]

''بلاشبہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی کہ انھیں ان کا خاوند علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا غسل دیں تو

ان دونوں نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا۔"

علامہ احمد حسن محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ الْمَرْأَةَ يُغَسِّلُهَا زَوْجُهَا وَ هِيَ تُغَسِّلُهُ بِاِجْمَاعِ الصَّحَابَةِ لِاَنَّهُ لَمْ يُنْقَلْ مِنْ سَائِرِ الصَّحَابَةِ اِنْكَارٌ عَلٰى اَسْمَاءَ وَ عَلِيٍّ فَكَانَ اِجْمَاعًا " [حاشیه بلوغ المرام(۱۰۵)]

"یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کو اس کا شوہر غسل دے سکتا ہے اور وہ اپنے شوہر کو غسل دے سکتی ہے، اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ اس لیے کہ اسماء بنت عمیس اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما پر کسی بھی صحابی کا انکار منقول نہیں ،تو یہ مسئلہ اجماعی ہوا۔"

عورت کا اپنے شوہر کو غسل دینا تو سب اہل علم کے ہاں متفق علیہ ہے۔[الأوسط لابن المنذر(۵/ ۳۳۴)]

البتہ مرد کا اپنی بیوی کو غسل دینا مختلف فیہ ہے۔ جمہور ائمہ و محدثین کے ہاں یہ جائز و درست ہے اور یہی بات صحیح ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے۔

امام ابو بکر محمد بن ابراہیم المعروف بابن المنذر رحمہ اللہ نے علقمہ، جابر بن زید، عبدالرحمٰن بن اسود، سلیمان بن یسار، ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن ، قتادہ، حماد بن ابی سلیمان، مالک ، اوزاعی، شافعی، احمد ابن حنبل اور اسحاق بن راہویہ جیسے کبار ائمہ و محدثین رحمہم اللہ سے یہی بات نقل کی ہے۔[الأوسط (۵/ ۳۳۵-۳۳۶)]

کفن دینے کا بیان

کفن کا کپڑا

(سوال) کیا کفن کے لیے ایک کپڑا کافی ہے یا تین کپڑے پہنانے چاہییں؟ مہربانی فرما کر جواب عنایت فرما دیں۔

(جواب) میت کیلئے کفن کا کپڑا اتنا ہونا چاہیے جو اس کے تمام بدن کو ڈھانپ لے جیسا کہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ خَطَبَ يَوْمًا فَذَكَرَ رَجُلًا مِّنْ اَصْحَابِهِ قُبِضَ فَكُفِّنَ فِيْ كَفَنٍ غَيْرَ طَائِلٍ وَ قُبِرَ لَيْلًا فَزَجَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَنْ يُّقْبَرَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهِ اِلَّا اَنْ يُّضْطَرَّ اِنْسَانٌ اِلٰى ذٰلِكَ وَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا كَفَّنَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ فَلْيُحْسِنْ كَفَنَهُ » [مسلم ، کتاب الجنائز: باب فی تحسین کفن المیت (۹۴۳)، المنتقی لابن الجارود(۵۴۶)، ابوداؤد(۳۱۴۸)، نسائی(۳۳/۴)، مسند احمد(۲۹۵/۳)، مستدرک حاکم (۳۶۸/۱)، بیہقی (۴۰۳/۳)، شرح السنة(۴۱۵/۵)]

''بلاشبہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن خطبہ ارشاد فرمایا اور اپنے ایک صحابی کا ذکر کیا جو فوت ہو گیا تھا۔ اسے ایسے کپڑے میں کفن دیا گیا جو لمبا نہ تھا اور رات کے وقت قبر میں اتارا گیا تو نبی ﷺ نے رات کے وقت آدمی کو قبر میں اتارنے سے ڈانٹا، یہاں تک کہ اس پر جنازہ پڑھا جائے بجز اس کے کہ انسان اس بات کی طرف مجبور ہو جائے اور نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن پہنائے تو اسے اچھا کفن دے۔''

سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا وَلِيَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ فَلْيُحْسِنْ كَفَنَهُ »[ترمذی، کتاب الجنائز: باب أمر المومن بإحسان کفن أخیه (۹۹۵)، ابن ماجه(۱۴۷۴)]

''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کا ولی بنے تو اسے اچھا کفن دے۔''

اچھا کفن دینے کا مفہوم یہ ہے کہ کفن میں نظافت، ستھرائی، موٹائی ہو اور وہ ستر کو ڈھانپنے والا اور متوسط ہو۔[تحفة الأحوذی (۵۱/۴)]

میت کو ایک کپڑے میں بھی کفن دیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ایک چادر میں کفن دیا گیا جب وہ جنگ احد میں شہید کر دیے گئے۔[ترمذی (۳۸۵۳)، ابو داؤد(۳۱۵۵)، نسائی(۳۸/۴)، عبد الرزاق(۴۲۷/۳)، مسند

احمد (۱۰۹/۵)، مسند حمیدی(۱۵۵)، المنتقی لابن الجارود(۵۲۲)]

اسی طرح سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی ایک ہی کپڑے میں کفن دیا گیا۔[مسند احمد(۳۹۵/۶)، حلیة الأولیاء (۱۳۵/۱)، طبرانی (۳۶۷۴)]

اسی طرح شداد بن الہاد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایک صحابی کے شہید ہونے پر نبی ﷺ نے اسے اپنے جبہ مبارک میں کفن دیا اور اس کا جنازہ پڑھا اور اللہ سے اس کے لیے دعا کی: ''اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے، تیری راہ میں مہاجر ہو کر نکلا اور شہید کر دیا گیا، میں اس پر گواہی دیتا ہوں۔''[عبدالرزاق (۹۵۹۷)، شرح معانی الآثار(۲۹۱/۱)، مستدرك حاكم(۵۹۵/۳)، بیهقی (۱۵/٤)، دلائل النبوة(۲۲/٤)، نسائی (۲۷۷/۱)]

سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بھی ہے کہ جب انھیں شہید کیا گیا تو ان کی بہن صفیہ رضی اللہ عنہا انھیں کفن دینے کے لیے دو کپڑے لے کر آئیں لیکن ان کے پہلو میں ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ والا سلوک کیا گیا اور اس انصاری کے لیے کفن کا کپڑا نہ تھا تو ایک کپڑا اسے دے دیا گیا۔[بیهقی(۴۰۱/۳)]

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی کپڑا میسر ہو تو اس میں بھی کفن دیا جا سکتا ہے البتہ کفن کے لیے تین کپڑے ہونا مستحب ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« كُفِّنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِيْ ثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ يَمَانِيَّةٍ لَيْسَ فِيْهَا قَمِيْصٌ وَ لَا عَمَامَةٌ »

[بخاری، کتاب الجنائز: باب الکفن بغیر قمیص(۱۲۷۱)، المنتقی لابن الجارود (۵۲۱)، ابوداؤد (۳۱۵۱)، نسائی (۳۵/٤)، ترمذی(۹۹۶)، ابن ماجه(۱٤٦۹)، مسند احمد(۱۱۸/٦)، مسند طیالسی (۱٤۵۳)، عبد الرزاق (٤۲۱/۳)، بیهقی(۳۹۹/۳)]

''نبی ﷺ کو تین یمنی کپڑوں میں کفن دیا گیا، ان میں قمیص اور پگڑی نہیں تھی۔''

کفن تین کپڑوں سے زائد نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو کفن دیا گیا تھا یہ اس کے خلاف ہے اور پھر اس میں مال کا ضیاع بھی ہے۔ عورت کا کفن مرد کی طرح ہے، دونوں کے کفن میں تفریق پر کوئی صحیح دلیل موجود نہیں۔ عورت کے کفن کے پانچ کپڑوں کے بارے میں جو روایات مروی ہیں وہ ثابت نہیں۔ مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔[احکام الجنائز للألبانی]

عورت کا کفن

سوال عورت کے کفن کے کتنے کپڑے ہونے چاہییں، کیا عورت کے لیے پاجامہ جائز ہے؟

جواب عام فقہاء و محدثین کا کہنا ہے کہ عورت کو پانچ کپڑوں میں کفن دیا جائے (۱) ازار (تہ بند)۔ (۲) قمیص۔ (۳) خمار یعنی اوڑھنی (جس کو دامنی یا سر بند بھی کہتے ہیں)۔ (۴) اور (۵) دو لفافے یعنی دو بڑی چادریں جس میں لپیٹا جائے۔ اس کی دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ لیلیٰ بنت قائف ثقفیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

''میں ان عورتوں میں تھی جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے پہلے

ہمیں تہ بند دیا پھر قمیص پھر خمار (اوڑھنی) پھر ایک چادر پھر اس کے بعد ایک دوسرے کپڑے میں لپیٹی گئیں اور رسول اللہ ﷺ دروازے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ کے پاس سیدہ ام کلثوم (رضی اللہ عنہا) کا کفن تھا، آپ ہمیں ایک ایک کپڑا کر کے دیتے تھے۔'' [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب في كفن المرأة: (٣١٥٧)، مسند احمد: (٣٨٠/٦)]

لیکن یہ روایت درست نہیں، اس کی سند میں نوح بن حکیم مجہول آدمی ہے، اس کی عدالت نا معلوم ہے اسی طرح اس میں داؤد نامی آدمی کا بھی کوئی پتا نہیں کہ وہ کون ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا جب فوت ہوئی تھیں تو رسول اللہ ﷺ میدان بدر میں تھے، ان کے پاس موجود نہ تھے۔ ملاحظہ ہو: [نصب الراية: (٢٥٨/٢)]

اسی لیے علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَالْمَرْأَةُ فِيْ ذٰلِكَ كَالرَّجُلِ اِذْ لَا دَلِيْلَ عَلَى التَّفْرِيْقِ '' [احکام الجنائز: (ص/٨٥)]

''اس مسئلہ میں عورت بھی مرد کی طرح ہے، عورت اور مرد کے کفن میں فرق کی کوئی دلیل موجود نہیں۔''

نبی کریم ﷺ کو تین سفید سوتی سحولی چادروں میں کفن دیا گیا، اس میں نہ قمیص تھی اور نہ پگڑی۔

[مسند احمد: (٤٠/٦)، (١١٨)]

لہٰذا مسنون یہی ہے کہ میت مرد ہو یا عورت اسے تین کپڑوں میں دفنا دیا جائے۔ واللہ اعلم!

کفن پر کلمہ یا قرآنی آیات لکھنا

سوال میت کے کفن پر کلمہ یا قرآنی آیات لکھنا شرعاً کیسا ہے؟ کیا اس سے میت کو کوئی فائدہ ہو سکتا ہے؟

جواب میت کے کفن پر قرآنی آیات، کلمہ شہادت، اہل بیت کے اسماء اور دیگر دعائیہ کلمات لکھنا کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فوت ہوئے، آپ کی بیٹیاں، بیٹے، زوجہ محترمہ وغیرہ اس دار فانی سے رخصت ہوئے آپ ﷺ یا آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے بارے میں بھی یہ ثابت نہیں کہ انھوں نے کفن پر دعائیہ کلمات وغیرہ لکھے ہوں اور ظاہر ہے جو کام رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں نہیں ہوا اور نہ خیر القرون ہی میں اس کا کوئی وجود ہے تو وہ بدعت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [بخاری ، کتاب الصلح: باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود (٢٦٩٧)]

''جس نے ہمارے اس دین میں ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہیں تو وہ مردود ہے۔''

امام ابن الصلاح رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا:

'' فِي الْكَفْنِ هَلْ يَجُوْزُ اَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهِ سُوَرٌ مِّنَ الْقُرْآنِ يٰسٓ وَ الْكَهْفُ وَ اَيُّ سُوْرَةٍ اَرَادَ اَوْ لَا يَحِلُّ هٰذَا خَوْفًا مِّنْ صَدِيْدِ الْمَيِّتِ وَ سَيَلَانِ مَا فِيْهِ عَلَى الْآيَاتِ وَ اَسْمَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰى

اَلْمُبَارَكَةِ الْمُحْتَرَمَةِ الشَّرِيْفَةِ"

''کیا کفن پر قرآنی سورتیں یٰسین ، الکھف یا جو بھی سورت لکھنا چاہے، جائز ہے یا یہ حلال نہیں میت کے بدن سے پیپ نکلنے اور آیات مقدسہ اور اسمائے مبارکہ پر بہ جانے کے خوف سے؟''

تو انھوں نے جواب دیا:" لَا يَجُوْزُ ذٰلِكَ" (یہ جائز نہیں ہے۔)[فتاویٰ و مسائل ابن الصلاح(۲٦٢/١)]

اس فتویٰ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان آیات مقدسہ اور اسمائے حسنیٰ کی توہین کا پہلو بھی اس میں موجود ہے۔ میت کا وجود پھٹ سکتا ہے یا گل سڑ سکتا ہے اور میت کے بدن سے پیپ نکلنے کی وجہ سے ان اسماء کی توہین ہو سکتی ہے، اس لحاظ سے بھی یہ درست نہیں ہے۔ بہر کیف انسان کی نجات عقائد حسنہ اور اعمال صالحہ پر ہے اور جو اس دنیا کی زندگی میں بوئے گا وہی اخروی زندگی میں کاٹے گا، قبر اخروی زندگی کا پہلا مرحلہ ہے۔ وہاں اعمال ہی کام آئیں گے اور عقائد کی بنا پر نجات ہوگی۔ جو آدمی دنیا کی زندگی میں بہترین اعمال کر کے گیا وہ تو سوالوں کے جواب دے گا اور جو یہاں اللہ کا باغی تھا، اس کے لیے مشکل ہوگی اور کفن پر لکھی ہوئی تحریریں اس کے کام نہیں آئیں گی۔ جو لوگ عہد نامے، قرآن حکیم، یا دیگر دعاؤں پر مشتمل مجموعے میت کیساتھ قبر میں رکھ دیتے ہیں، یہ بالکل عبث اور کسی کام نہیں آئیں گے، ہمیں ایسے اعمال سرانجام دینے چاہییں جو رسول اللہ ﷺ کی سنت و حدیث سے ثابت ہوں یا قرآن کریم سے ماخوذ ہوں۔ شیخ البانی رحمہ اللہ جنازے کی بدعات کے تحت لکھتے ہیں:

" كِتَابَةُ اسْمِ الْمَيِّتِ وَ اَنَّهٗ يَشْهَدُ الشَّهَادَتَيْنِ وَ اَسْمَاءِ اَهْلِ الْبَيْتِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ بِتُرْبَةِ الْحُسَيْنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِنْ وُجِدَتْ وَ اِلْقَاءُ ذٰلِكَ فِي الْكَفَنِ وَ كِتَابَةُ دُعَاءٍ عَلَى الْكَفَنِ"

[احکام الجنائز للألبانی(ص/۳۱۲)]

''میت کا نام لکھنا اور یہ کہ وہ شہادتین کی گواہی دیتا تھا اور حسین رضی اللہ عنہ کی مٹی اگر پائی جائے تو اس کے ساتھ اہل بیت کے نام لکھ کر کفن میں رکھنا اور کفن پر دعا لکھنا یہ سب بدعات و خرافات میں سے ہیں۔''

نماز جنازہ کا بیان

نماز جنازہ کے لیے طاق صفیں بنانا

سوال کیا نماز جنازہ کے لیے طاق صفیں بنانا ضروری ہے یا کہ جفت بھی بنائی جاسکتی ہیں؟

جواب نماز جنازہ کے لیے طاق صفیں بنانا ضروری نہیں بلکہ جفت بھی بنائی جاسکتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے پاس جب نجاشی کی وفات کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ أَخًا لَكُمْ قَدْ مَاتَ فَقُوْمُوْا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ قَالَ فَقُمْنَا فَصَفَّنَا صَفَّيْنِ »[صحیح مسلم کتاب الجنائز باب صلوة النبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ علی النجاشی وهو غائب (۹۵۲)]

''یقیناً تمھارا بھائی فوت ہوچکا ہے، اٹھواس کا جنازہ پڑھو۔'' جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:'' ہم اٹھے اور آپ نے ہماری دو صفیں بنا دیں۔''

اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ جنازے کی صفیں دو بھی ہوسکتی ہیں کیونکہ نجاشی کا جنازہ پڑھانے کے لیے آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دو صفیں بنائی تھیں۔ لہٰذا طاق صفیں بنانا کوئی ضروری نہیں۔

نماز جنازہ میں رفع الیدین

سوال ان روایات کی حیثیت کیا ہے جن میں پہلی تکبیر کے علاوہ رفع الیدین کی ممانعت ہے؟

جواب کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ نماز جنازہ میں صرف پہلی تکبیر ہی کے ساتھ رفع الیدین کرنا چاہیے اور باقی تکبیروں کے ساتھ رفع الیدین نہیں کرنا چاہیے۔ جو حضرات اس بات کے قائل ہیں وہ ضعیف روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

① سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَبَّرَ عَلٰى جَنَازَةٍ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فِىْ اَوَّلِ تَكْبِيْرَةٍ وَ وَضَعَ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى » [ترمذی، کتاب الجنائز: باب ما جآء فی رفع الیدین علی الجنازة (۱۰۷۷)، دارقطنی (۱۸۱۳)، السنن الکبریٰ للبیهقی(۳۸/٤)]

''بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے جنازے پر تکبیر کہی، پہلی تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کیا اور دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا۔''

یہ روایت ضعیف ہے، اس میں تین علتیں ہیں:

① پہلی علت یہ ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی یحییٰ بن یعلی الاسلمی القطوانی ہے، اس کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مضطرب الحدیث ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے اسے ہیچ قرار دیا ہے۔ امام ابو حاتم نے اسے ضعیف الحدیث کہا ہے۔[تهذيب التهذيب (١٩٢/٦)، المغني في الضعفاء (٥٣٣/٢)، كتاب الضعفاء والمتروكين (٢٠٦/٣)، ميزان الاعتدال(٤١٥/٤)، الكامل في ضعفاء الرجال (٢٦٨٨/٧)، الكاشف (٣٧٩/٢)، تقريب التهذيب (ص/٣٨٠)]

امام ابن القطان الفاسی نے بھی اس روایت کے ضعیف ہونے کی ایک وجہ یحییٰ بن یعلی الاسلمی ابو زکریا القطوانی کو قرار دیا ہے۔[بيان الوهم والإيهام(٤٢١/٣)]

② دوسری علت یحییٰ بن یعلی الأسلمی کا استاد ابوفروہ یزید بن سنان ہے۔ امام احمد ابن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام علی بن المدینی، امام ابو حاتم، امام ابو داؤد، امام نسائی، امام دارقطنی، امام جوزجانی، امام ابوزرعہ رازی، امام ازدی، امام حاکم اور امام عقیلی رحمہم اللہ نے اسے ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے۔[تهذيب التهذيب(٢١١/٦)، المغني في الضعفاء (٥٣٨/٢)، ميزان الاعتدال(٤٢٧/٤)، تقريب التهذيب(٢٨٢)، كتاب الضعفاء والمتروكين لابن الجوزي (٢١٠/٣)]

③ تیسری علت یہ ہے کہ اس کی سند میں امام زہری ''عن'' سے روایت کرتے ہیں اور وہ مدلس ہیں، مدلس کا عنعنہ مردود ہے۔ لہٰذا ان تین علتوں کی وجہ سے مذکورہ روایت صحیح نہیں۔

② سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ عَلَى الْجَنَازَةِ فِي اَوَّلِ تَكْبِيْرَةٍ ثُمَّ لَا يَعُوْدُ » [دارقطني، كتاب الجنائز(١٨١٤)، تحفة الأحوذي(١٩١/٤)]

''بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازے پر پہلی تکبیر میں رفع الیدین کرتے تھے پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔''

اس کی سند میں الفضل بن السکن الکوفی راوی ہے جس کے بارے میں امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ غیر معروف ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔[المغني في الضعفاء(١٩١/٢)]

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ عدم رفع الیدین والی روایات درست نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" رَوَى الدَّارُ قُطْنِيُّ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا صَلّٰى عَلَى الْجَنَازَةِ رَفَعَ يَدَيْهِ فِيْ اَوَّلِ تَكْبِيْرَةٍ ثُمَّ لَا يَعُوْدُ وَ اِسْنَادُهُمَا ضَعِيْفَانِ وَ لَا يَصِحُّ فِيْهِ شَيْءٌ " [تلخيص الحبير(٣٣٢/٢)]

'' دارقطنی نے عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز جنازہ ادا کرتے

تو پہلی تکبیر میں رفع الیدین کرتے تھے پھر نہیں کرتے تھے۔ ان دونوں کی سندیں ضعیف ہیں اور اس کے متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں۔"

نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنے کا حکم

(سوال) کیا نماز جنازہ میں ہر تکبیر پر رفع الیدین کیا جائے گا؟ مہربانی فرما کر دلیل کے ساتھ واضح فرما دیں۔

(جواب) نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنے کے بارے میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک مرفوع روایت مروی ہے جس میں ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ عِنْدَ التَّكْبِيْرِ فِيْ كُلِّ صَلَاةٍ وَ عَلَى الْجَنَائِزِ » [طبرانی أوسط (٨٤١٢)، (١٩١/٦)، مجمع البحرين فی زوائد المعجمين (١٢٨٢)، مجمع الزوائد (٤١٥٤)، (١٣٧/٣)]

"رسول اللہ ﷺ ہر نماز میں اور جنازوں پر تکبیر کے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے۔"

اس روایت کی سند انتہائی ضعیف ہے، اس میں کئی ایک علتیں ہیں:

① امام طبرانی کے استاد موسیٰ بن عیسیٰ الجزری کے حالات نہیں ملے۔

② موسیٰ بن عیسیٰ کا استاد صہیب بن محمد بن عباد بھی مجہول ہے۔

③ عباد بن صہیب البصری متروک ہے۔[المغنی فی ضعفاء الرجال (١/ ٥١٤)، تقریب التهذيب (ص/ ١٩٧)]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے منکر الحدیث قرار دیا ہے۔[تهذيب التهذيب (٣/ ٢٥٠)]

اور جسے امام بخاری رحمہ اللہ منکر الحدیث قرار دے دیں اس سے روایت لینا جائز نہیں۔[ميزان الاعتدال (١/ ٦)]

لہٰذا یہ سند تو انتہائی ضعیف ہے البتہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ایک روایت ان لفظوں میں بیان کی ہے:

« عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا صَلّٰى عَلَى الْجَنَازَةِ رَفَعَ يَدَيْهِ فِيْ كُلِّ تَكْبِيْرَةٍ وَ اِذَا انْصَرَفَ سَلَّمَ »

"سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز جنازہ ادا کرتے تو ہر تکبیر میں رفع الیدین کرتے تھے اور جب پھرتے تو سلام کہتے تھے۔"

اس کے بعد خود ہی فرمایا ہے:

"اسی طرح عمر بن شبہ نے اسے مرفوع بیان کیا ہے اور ایک جماعت نے اس کی مخالفت کی ہے، انھوں نے یزید بن ہارون سے اسے موقوف روایت کیا ہے اور یہی درست ہے۔"[علل الدارقطنی بحواله نصب الراية (٢/ ٢٨٥)، تلخيص الحبير (١/ ٣٣٣)]

یزید بن ہارون کی یحییٰ بن سعید سے روایت کرنے میں ثقات کی ایک جماعت نے متابعت کی ہے۔ بعض نے متابعت تامہ اور بعض نے متابعت قاصرہ۔ جن روایات کی اسناد میں یہ متابعت کی گئی ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① امام نافع رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« اَنَّ عَبۡدَ اللّٰهِ بۡنَ عُمَرَ كَانَ اِذَا صَلّٰى عَلَى الۡجَنَازَةِ رَفَعَ يَدَيۡهِ »[جزء رفع اليدين للبخاری(١١١)، (ص/١٩٥)، مع جلاء العینین]

''بلاشبہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب نماز جنازہ ادا کرتے تو رفع الیدین کرتے تھے۔''

② « عَنِ ابۡنِ عُمَرَ اَنَّهٗ كَانَ يَرۡفَعُ يَدَيۡهِ مَعَ كُلِّ تَكۡبِيۡرَةٍ عَلَى الۡجَنَازَةِ »[مصنف ابن ابی شیبة، كتاب الجنائز: باب يرفع يديه في التكبير على الجنازة(١٨١/٢)]

''سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جنازے پر ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کیا کرتے تھے۔''

③ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا اَنَّهٗ كَانَ يَرۡفَعُ يَدَيۡهِ فِيۡ كُلِّ تَكۡبِيۡرَةٍ عَلَى الۡجَنَازَةِ وَ اِذَا قَامَ مِنَ الرَّكۡعَتَيۡنِ » [جزء رفع اليدين (١٦٠)،(ص/١٩٥) مع جلاء العينين]

''سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے اور جب دو رکعتوں سے اٹھتے تو پھر بھی رفع الیدین کرتے تھے۔''

④ امام نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

« اَنَّ ابۡنَ عُمَرَ كَانَ يَرۡفَعُ فِي التَّكۡبِيۡرَاتِ الۡاَرۡبَعِ عَلَى الۡجَنَازَةِ »[عبد الرزاق(٦٣٦٠)، (٢٧٠/٢)]

''سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جنازے پر چاروں تکبیروں میں رفع الیدین کیا کرتے تھے۔''

مذکورہ بالا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع و موقوف صحیح روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنا چاہیے۔ نیز عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی نماز جنازہ میں تکبیرات کے ساتھ رفع الیدین کرنا ثابت ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ قَدۡ صَحَّ عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا اَنَّهٗ كَانَ يَرۡفَعُ يَدَيۡهِ فِيۡ تَكۡبِيۡرَاتِ الۡجَنَازَةِ رَوَاهُ سَعِيۡدُ بۡنُ مَنۡصُوۡرٍ " [تلخيص الحبير (٣٣٣/١)]

''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح ثابت ہے کہ وہ جنازے کی تکبیروں میں رفع الیدین کیا کرتے تھے، اسے سعید بن منصور نے روایت کیا ہے۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ نے نماز جنازہ میں رفع الیدین کے متعلق لکھا ہے:

" فَرَاَى اَكۡثَرُ اَهۡلِ الۡعِلۡمِ مِنۡ اَصۡحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ سَلَّمَ وَ غَيۡرِهِمۡ اَنۡ يَّرۡفَعَ الرَّجُلُ

يَدَيْهِ فِيْ كُلِّ تَكْبِيرَةٍ عَلَى الْجَنَازَةِ وَ هُوَ قَوْلُ ابْنِ الْمُبَارَكِ وَ الشَّافِعِيِّ وَ اَحْمَدَ وَ اِسْحَاقَ "
[ترمذی مع تحفۃ الأحوذی(۲/۱۹۰)]
''اکثر اہل علم صحابہ کرام اور ان کے علاوہ کے نزدیک نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنا چاہیے اور یہی قول عبداللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا ہے۔'' پھر فرماتے ہیں: ''بعض اہل علم نے کہا ہے کہ صرف پہلی مرتبہ ہی رفع الیدین کرنا چاہیے، یہ قول سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا ہے۔"
علامہ سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
" وَ كَثِيْرٌ مِّنْ اَئِمَّةِ بَلَخِ اِخْتَارُوْا رَفْعَ الْيَدَيْنِ عِنْدَ كُلِّ تَكْبِيرَةٍ فِيْهَا "[المبسوط (۲/۶۴)]
''کثیر ائمہ بلخ نے نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کو اختیار کیا ہے۔''

نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا

(سوال) کیا نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے اور بعض لوگوں کا اسے مکروہ کہنا کیسا ہے؟

(جواب) نماز جنازہ ادا کرنا مسلمان کا حق ہے اور صحیح حق کی ادائیگی تب ہی ہوتی ہے جب اسے رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ادا کیا جائے۔ دورِ حاضر میں دیکھا گیا ہے کہ جنازہ پڑھنے کے لیے ایک تو افراد کی بہت کمی ہوتی ہے، لوگ اسے فرض کفایہ سمجھ کر رسمی طور پر ادا کرنے لگے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جنازہ پڑھانے والے افراد بھی ایک آدھ منٹ میں جنازہ پڑھا کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ میت کے ساتھ صحیح وفاداری تب ہی ہوتی ہے جب اس آخری وقت میں اس کا جنازہ سنت کے مطابق ادا کیا جائے۔ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی سورت پڑھیں۔ سورۂ فاتحہ پڑھنا تو لازم ہے، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

① حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف کہتے ہیں:
« صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَلٰى جَنَازَةٍ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ قَالَ لِتَعْلَمُوْا اَنَّهَا سُنَّةٌ »[بخاری، کتاب الجنائز: باب قراءة فاتحة الكتاب على الجنازة(۱۳۳۵)، ابو داود(۳۱۹۸)، ترمذی (۱۰۲۷)]
''میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی، انھوں نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور فرمایا:'' (یہ اس لیے ہے) تاکہ تم جان لو کہ یہ سنت ہے۔''

② حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف ہی بیان کرتے ہیں:
« صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَلٰى جَنَازَةٍ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَ سُوْرَةٍ وَ

جَهَرَ حَتّٰى اَسۡمَعَنَا فَلَمَّا فَرَغَ اَخَذۡتُ بِيَدِهِ فَسَأَلۡتُهُ قَالَ سُنَّةٌ وَ حَقٌّ » [نسائی ، کتاب الجنائز: باب الدعاء (١٩٨٩، ١٩٩٠)، المنتقى لابن الجارود (٥٣٦، ٥٣٧)، بیہقی (٣٨/٤)، مسند ابی یعلی (٦٧/٥)، الأوسط لابن المنذر(٤٣٧/٥)]

''میں نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ ادا کی تو انھوں نے سورۂ فاتحہ اور ایک سورت جہری طور پر پڑھی حتیٰ کہ ہمیں سنایا۔ جب فارغ ہوئے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اس کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: '' یہ سنت اور حق ہے۔''

ایک اور روایت میں بھی یہی الفاظ موجود ہیں۔[کتاب الأم للشافعی(١/ ٢٧٠)، بیہقی(٤/ ٣٩)، شرح السنة (٣٥٣/٥)، المحلی (١٢٩/٥)، مسند طیالسی(٢٧٤١)، دارقطنی(٧٢/٢)، شرح معانی الآثار(١/ ٥٠٠)، مستدرك حاكم (٣٥٨/١)]

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ اور ایک اور سورت پڑھ کر تعلیم دے دی ہے کہ نماز جنازہ میں فاتحہ پڑھنا مسنون ہے اور جب صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہے کہ یہ عمل سنت ہے تو اس سے مراد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوتی ہے جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

''جس سال حجاج بن یوسف عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے جنگ کرنے کے لیے مکہ میں اترا، اس زمانہ میں اس نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا: ''عرفہ کے دن آپ عرفات کی قیام گاہ میں کیا کرتے ہیں؟ سالم نے کہا: ''اگر تو سنت چاہتا ہے تو عرفہ کے دن ظہر کی نماز کو جلدی ادا کر لے۔'' عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ''سالم نے سچ کہا ہے، کیونکہ سنت نبوی ادا کرنے کے لیے لوگ ظہر وعصر کی نمازوں کو جمع کر کے پڑھتے ہیں۔'' امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے سالم سے پوچھا: ''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تھا؟'' تو سالم نے کہا: '' وَ هَلۡ تَتَّبِعُوۡنَ فِيۡ ذٰلِكَ اِلَّا سُنَّتَهٗ '' (یعنی اس فعل سے مراد محض سنت کا اتباع ہی تو ہے۔) [بخاری، کتاب الحج: باب الجمع بین الصلاتین بعرفة (١٦٦٢)]

معلوم ہوا کہ صحابی جب مطلق طور پر لفظ سنت بولتے ہیں تو مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی ہوتی ہے۔ حد خمر کے بارے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« جَلَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ سَلَّمَ اَرۡبَعِيۡنَ وَ جَلَدَ اَبُوۡ بَكۡرٍ اَرۡبَعِيۡنَ وَ عُمَرُ ثَمَانِيۡنَ وَ كُلٌّ سُنَّةٌ » [مسلم، کتاب الحدود: باب حد الخمر(١٧٠٧)]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس کوڑے لگائے، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی چالیس کوڑے لگائے اور عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے لگائے اور یہ سب سنت ہے۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ مطلق سنت سے مراد اولاً سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوتی ہے، نیز خلیفہ راشد کے فعل کو بھی سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے تحت امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " وَ قَدْ اَجْمَعُوْا عَلٰی اَنَّ قَوْلَ الصَّحَابِيِّ سُنَّةٌ حَدِيْثٌ مُسْنَدٌ " (فقہاء و محدثین کا اس بات پر اجماع ہے کہ صحابی کا کہنا کہ یہ سنت ہے مسند حدیث کے حکم میں ہے۔)[مستدرك حاكم (۳۵۸/۱)]

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ اَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَا يَقُوْلُوْنَ السُّنَّةُ اِلَّا لِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى " [الأم(۲٤۰/۱)، حاشية نصب الراية(۲۷۱/۲)]

" نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت کا لفظ صرف سنت رسول ﷺ ہی پر بولتے تھے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔"

واضح رہے کہ یہ متفق علیہ قاعدہ ہے اور فقہ و اصول کی معتبر کتب میں موجود ہے۔[ملاحظه هو: عمدة القاری (۱٤۰/۸)، المجموع(۲۳۲/۵)، التحرير لابن الهمام (۱٤۹/۳)، فتح القدير شرح هداية (۹۵/۲)، مرقاة شرح مشكوٰة(٦۳۸/۲)، نصب الراية (٤۱۳/۱)، فتح الباری (۲۰٤/۳)، الفيه سيوطى(ص/۲۱)، شرح نخبة الفكر (ص/۱۱۰)، الباعث الحثيث (ص/٤٤)، ارشاد الفحول (ص/۹۳)، المغنى لابن قدامة (٤۰۳/۳)، بذل المجهود(۱۲٦/۲)]

لہٰذا اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا۔

③ ابو امامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" اَلسُّنَّةُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَائِزِ اَنْ يُكَبِّرَ ثُمَّ يَقْرَأَ بِاُمِّ الْقُرْآنِ ثُمَّ يُصَلِّيَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ثُمَّ يُخْلِصُ الدُّعَاءَ لِلْمَيِّتِ وَ لَا يَقْرَأُ اِلَّا فِي التَّكْبِيْرَةِ الْاُوْلٰى ثُمَّ يُسَلِّمُ فِيْ نَفْسِهِ عَنْ يَمِيْنِهِ " [عبد الرزاق (٦٤۲۸)، (٤۸۹/۳)، المنتقى لابن الجارود(٥٤۰)، فتح الباری(۲۰۳/۳)، نسائی (۱۹۹۱)، الأوسط لابن المنذر(٤۳۷/٥)]

" نماز جنازہ میں سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلی تکبیر کہیں پھر سورۂ فاتحہ پڑھیں پھر (دوسری تکبیر کے بعد) نبی ﷺ پر درود پڑھیں پھر (تیسری تکبیر کے بعد) میت کے لیے خلوص کے ساتھ دعا کریں، پہلی تکبیر کے سوا کسی میں قراءت نہ کریں پھر آہستہ سے دائیں جانب سلام پھیر دیں۔"

④ ابو امامہ بن سہل بن حنیف سے روایت ہے اور وہ انصار کے بڑے لوگوں اور علماء میں سے تھے اور ان صحابہ کے بیٹوں میں سے ہیں جو بدر میں نبی ﷺ کے ساتھ شریک تھے۔ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے کسی نے انھیں خبر دی:

« اَنَّ السُّنَّةَ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ اَنْ يُكَبِّرَ الْإِمَامُ ثُمَّ يَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ سِرًّا فِيْ نَفْسِهِ ثُمَّ يَخْتِمُ الصَّلَاةَ فِي التَّكْبِيْرَاتِ الثَّلَاثِ » [شرح معانی الآثار(۵۰۰/۱)، مستدرك حاكم(۳٦۰/۱)، بيهقى(٤۰/٤)، اسے امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے۔]

" نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ امام تکبیر کہے پھر سورۂ فاتحہ آہستہ پڑھے پھر نماز کو باقی تین تکبیروں میں ختم کر دے۔"

علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" هٰذَا هُوَ الْاَوْلٰى لِثُبُوْتِ ذٰلِكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَصْحَابِهِ " [التعليق الممجد (ص/١٦٩)]

'' نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا ہی اولیٰ ہے اس لیے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ ثابت ہے۔''

علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' ائمہ کا نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی مشروعیت میں اختلاف ہے۔ امام ابن منذر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود، حسن بن علی، عبداللہ بن زبیر اور مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہم کا نماز جنازہ میں فاتحہ پڑھنا نقل کیا ہے اور یہی بات امام شافعی اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ نے بیان کی ہے۔'' [عمدة القاري (١٣٩/٨)]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ مِنَ السُّنَّةِ قِرَاءَةُ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ لِاَنَّهَا خَيْرُ الْاَدْعِيَةِ وَ اَجْمَعِهَا " [حجة الله البالغة (٣٦/٢)]

''نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کرنا سنت ہے، اس لیے کہ یہ تمام دعاؤں سے بہترین اور جامع ہے۔''

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: '' پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ پڑھی جائے۔'' [غنية الطالبين (١٣٣/٢)]

مذکورہ بالا صحیح احادیث و آثار اور اکابر علمائے احناف کے فتاویٰ سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ دین کا طریقہ اور معمول ہے اور اس کے مکروہ ہونے پر کوئی واضح اور صریح دلیل موجود نہیں۔

سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت ملانا

سوال کیا نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ پڑھنا بھی ثابت ہے؟

جواب نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھنا بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ جیسا کہ طلحہ بن عبداللہ فرماتے ہیں:

« صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلٰى جَنَازَةٍ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَ سُوْرَةٍ فَجَهَرَ حَتّٰى سَمِعْنَا فَلَمَّا انْصَرَفَ اَخَذْتُ بِيَدِهِ فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ سُنَّةٌ وَ حَقٌّ »[المنتقى لابن الجارود(٥٣٧)، نسائي، كتاب الجنائز، باب الدعاء(١٩٨٦)، بيهقي(٣٨/٤)، مسند ابي يعلى(٢٦٦١)]

'' میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی تو انھوں نے سورۃ الفاتحہ اور ایک (اور) سورت پڑھی اور بلند آواز سے قراءت کی، یہاں تک کہ ہم نے سن لیا۔ جب وہ نماز سے پھرے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا:'' یہ سنت اور حق ہے۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں سورۃ الفاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھنا بالکل صحیح ہے اور سنت رسول ﷺ ہے، کیونکہ جب کوئی صحابی کسی مسئلے کے بارے میں یہ کہے کہ یہ سنت ہے تو اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی سنت ہوتی ہے۔ اکثر ائمہ محدثین ؒ کا یہی قول ہے۔ بلکہ امام حاکم ؒ نے تو اس پر اجماع نقل فرمایا ہے:

" وَ قَدْ اَجْمَعُوْا عَلٰی اَنَّ قَوْلَ الصَّحَابِيِّ سُنَّةٌ حَدِيْثٌ مُسْنَدٌ " [مستدرك حاكم(١/٣٥٨)]

''فقہاء ومحدثین کا اس بات پر اجماع ہے کہ صحابی کا کہنا کہ یہ سنت ہے، مسند حدیث ہے۔''

لہٰذا ثابت ہوا کہ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھنا بھی نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔

نماز جنازہ میں قراءت

(سوال) نماز جنازہ میں قراءت سری کی جائے گی یا جہری؟

(جواب) نماز جنازہ میں قراءت جہری اور سری دونوں طرح درست ہے البتہ دلائل کی رو سے سری طور پر پڑھنا زیادہ درست ہے۔ دلیل یہ ہے۔

ابوامامہ بن سہیل بن حنیف سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے کسی نے انھیں خبر دی:

« اَنَّ السُّنَّةَ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ اَنْ يُّكَبِّرَ الْاِمَامُ ثُمَّ يَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ سِرًّا فِيْ نَفْسِهِ ثُمَّ يَخْتِمُ الصَّلَاةَ فِي التَّكْبِيْرَاتِ الثَّلَاثِ » [شرح معانی الآثار(١/٥٠٠) مستدرك حاكم (١/٣٦٠)بيهقی(٤/٤٠)]

''نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ امام تکبیر کہے پھر سری طور پر سورۂ فاتحہ پڑھے پھر نماز کو باقی تین تکبیروں میں ختم کرے۔''

امام حاکم اور امام ذہبی ؒ نے اس کی سند کو شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ جہری قراءت کے قائل حضرات نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ سیدنا عوف بن مالک ؓ فرماتے ہیں:

« صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَلٰى جَنَازَةٍ فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهِ وَ هُوَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَ ارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَ اعْفُ عَنْهُ » [مسلم، كتاب الجنائز: باب الدعا الميت فی الصلاة (٩٦٣)]

'' رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازے کی نماز پڑھائی، میں نے آپ ﷺ کی دعا سے (ان کلمات کو) یاد کر لیا، آپ ﷺ کہہ رہے تھے: ''اے اللہ! اس کو بخش دے، اس پر رحم فرما اور اس کو عافیت و معافی سے نواز دے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابی نے آپ ﷺ کے جنازہ پڑھانے سے یہ دعا حفظ کی اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب آپ نے جہری پڑھی ہو۔ بہر کیف سری پڑھنا حدیث سے صراحتاً اور جہری پڑھنا استدلالاً ثابت ہے۔ اس لیے آہستہ پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔

نماز جنازہ میں میت پر نام لے دعا مانگنا

(سوال) کیا نماز جنازہ میں میت پر نام لے کر دعا مانگنا جائز ہے؟

(جواب) سیدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ ﷺ سے مندرجہ ذیل الفاظ ثابت ہیں:

« اَللّٰهُمَّ اِنَّ فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ فِيْ ذِمَّتِكَ فَقِهِ عَذَابَ الْقَبْرِ » [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب الدعاء للميت (۳۲۰۲)]

''اے اللہ! بے شک فلاں بن فلاں تیری پناہ میں ہے، تو اسے عذاب قبر سے بچا۔''

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جنازہ میں یہ دعا میت کا نام لے کر پڑھنی چاہیے کیونکہ فلاں بن فلاں سے مراد ہی خاص شخص ہوتا ہے۔ صرف لفظ فلاں بن فلاں دہرا دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس حدیث کے متعلق شیخ شمس الحق عظیم آبادی عون المعبود میں فرماتے ہیں:

" فِيْهِ دَلِيْلٌ عَلَى اسْتِحْبَابِ تَسْمِيَةِ الْمَيِّتِ بِاسْمِهٖ وَ اسْمِ اَبِيْهِ وَ هٰذَا اِنْ كَانَ مَعْرُوْفًا وَّ اِلَّا جُعِلَ مَكَانَ ذٰلِكَ اَللّٰهُمَّ اِنَّ عَبْدَكَ اَوْ نَحْوَهٗ "

''اس حدیث میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ میت پر اس کا اور اس کے باپ کا نام لینا جائز ہے یہ اس وقت ہو گا جب اس کا نام معلوم ہوگا لیکن اگر اس کا نام معلوم نہیں تو پھر "اَللّٰهُمَّ اِنَّ عَبْدَكَ" کہا جائے گا یا اس کی مثل کوئی اور الفاظ۔''

نماز جنازہ میں دعائیں

(سوال) کیا نماز جنازہ میں اپنے مسلمان بھائی کے لیے ایک سے زیادہ دعائیں کی جا سکتی ہیں؟

(جواب) جب کوئی موحد مسلمان فوت ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ ادا کرنا دوسرے مسلمانوں پر حق ہے اور نماز جنازہ میں اخلاص کے ساتھ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَاَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَاءَ » [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب الدعاء للميت (۳۱۹۹)، ابن ماجه، کتاب الجنائز: باب الدعاء فی الصلاة علی الجنازة(۱۴۹۷)، بیهقی(۴۰/۴)، صحیح ابن حبان(۷۵۴)]

''جب تم میت کی نماز جنازہ پڑھنے لگو تو اس کے لیے اخلاص سے دعا کرو۔''

اسی طرح ابو امامہ بن سہل رحمہ اللہ سے روایت ہے:

« اَلسُّنَّةُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ اَنْ تُكَبِّرَ ثُمَّ تَقْرَاُ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ تُصَلِّيَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيۡهِ وَ سَلَّمَ ثُمَّ تُخۡلِصُ الدُّعَاءَ لِلۡمَيِّتِ وَ لَا تَقۡرَأُ اِلَّا فِي التَّكۡبِيرَةِ الۡاُوۡلٰى ثُمَّ تُسَلِّمُ فِيۡ نَفۡسِهٖ عَنۡ يَمِيۡنِهٖ » [المنتقى لابن الجارود (٥٤٠)، عبد الرزاق(٦٤٢٨)، مستدرك حاكم(١/ ٣٦٠)، بيهقى (٣٩/٣)]

''نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ تم تکبیر کہو پھر سورۂ فاتحہ پڑھو (پھر دوسری تکبیر کہو) پھر نبی ﷺ پر درود پڑھو(پھر تیسری تکبیر کہو) پھر میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا کرو اور پہلی تکبیر کے علاوہ کسی میں قراءت نہ کرو (پھر چوتھی تکبیر کہو) پھر اپنی دائیں جانب آہستہ سے سلام پھیر دو۔''

ان دونوں صحیح احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا کرنی چاہیے اور لفظ ''الدعا'' مصدر ہے اس کا اطلاق قلیل وکثیر پر ہوتا ہے لہٰذا ایک سے زیادہ دعائیں بھی جنازے میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی یاد رہے کہ ہمارے عام بھائی نماز جنازہ میں یہ دعا پڑھتے ہیں:

« اَللّٰهُمَّ اغۡفِرۡ لِحَيِّنَا وَ مَيِّتِنَا وَ شَاهِدِنَا وَ غَائِبِنَا وَ صَغِيۡرِنَا وَ كَبِيۡرِنَا وَ ذَكَرِنَا وَ اُنۡثَانَا اَللّٰهُمَّ مَنۡ اَحۡيَيۡتَهٗ مِنَّا فَاَحۡيِهٖ عَلَى الۡاِسۡلَامِ وَ مَنۡ تَوَفَّيۡتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الۡاِيۡمَانِ اَللّٰهُمَّ لَا تَحۡرِمۡنَا اَجۡرَهٗ وَ لَا تُضِلَّنَا بَعۡدَهٗ » [ابن ماجه، كتاب الجنائز: باب ما جاء فى الدعاء فى الصلاة على الجنازة(١٤٩٨)، مسند احمد(٨٨٠٩)، صحيح ابن حبان(٨٥٧)]

''اے اللہ! ہمارے زندہ اور مردہ، حاضر اور غائب، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت کو بخش دے۔ اے اللہ! ہم میں سے جسے بھی تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور ہم میں سے جسے بھی فوت کرے اسے ایمان پر فوت کر۔ اے اللہ! ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ کر اور اس کے بعد ہمیں گمراہ نہ کر۔''

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ دعا عام ہے، میت کے لیے خاص نہیں ہے اس میں زندہ مردہ، مرد عورت، چھوٹے بڑے، حاضر غائب سب کے لیے دعا ہے اور ہمیں خاص میت کے لیے بھی دعا کا حکم ہے تو لامحالہ اس دعا کے ساتھ خاص میت کی بخشش والی دعا بھی مانگنی پڑے گی جیسا کہ حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کی روایت میں دعا موجود ہے:

« اَللّٰهُمَّ اغۡفِرۡ لَهٗ وَ ارۡحَمۡهُ وَ عَافِهٖ وَ اعۡفُ عَنۡهُ وَ اَكۡرِمۡ نُزُلَهٗ وَ وَسِّعۡ مُدۡخَلَهٗ وَاغۡسِلۡهُ بِالۡمَاءِ وَ الثَّلۡجِ وَ الۡبَرَدِ وَ نَقِّهٖ مِنَ الۡخَطَايَا كَمَا نَقَّيۡتَ الثَّوۡبَ الۡاَبۡيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَ اَبۡدِلۡهُ دَارًا خَيۡرًا مِّنۡ دَارِهٖ وَ اَهۡلًا خَيۡرًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَ زَوۡجًا خَيۡرًا مِّنۡ زَوۡجِهٖ وَ اَدۡخِلۡهُ الۡجَنَّةَ وَ اَعِذۡهُ مِنۡ عَذَابِ الۡقَبۡرِ وَ عَذَابِ النَّارِ » [مسلم، كتاب الجنائز: باب الدعا للميت فى الصلاة (٩٦٣)]

''اے اللہ! اسے بخش دے اور اس پر رحم فرما اور اسے عافیت دے اور اس سے درگزر فرما، اس کی مہمان نوازی کر، اس کی قبر کو فراخ کر دے، اس کے گناہوں کو پانی، برف اور اولوں کے ساتھ دھو دے۔ اسے گناہوں سے ایسے صاف کر دے جیسے تو نے سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کر دیا ہے، اسے اس کے گھر کے بدلے میں زیادہ بہتر گھر عطا

فرما، اس کے گھر والوں کے بدلے میں زیادہ بہتر گھر والے عطا فرما اور اس کی بیوی کے بدلے میں اسے زیادہ بہتر بیوی عطا فرما اور اسے جنت میں داخل فرما اور اسے قبر کے عذاب سے اور آگ کے عذاب سے بچا۔"

شداد بن الهاد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نبی ﷺ کے پاس آیا، آپ پر ایمان لایا اور آپ کے تابع ہو گیا، پھر کہنے لگا: "میں آپ کے ساتھ ہجرت کرتا ہوں۔" نبی ﷺ نے اس کے متعلق اپنے بعض صحابہ کو تاکید فرمائی۔ جب ایک جنگ ہوئی تو نبی ﷺ کو کچھ غنیمت حاصل ہوئی۔ آپ نے اسے تقسیم کر دیا، اس کا بھی حصہ نکالا اور اس کا حصہ اس کے ساتھیوں کو دے دیا۔ وہ ساتھیوں کی سواریاں چرایا کرتا تھا، جب آیا تو انھوں نے اس کا حصہ اسے دیا۔ وہ پوچھنے لگا: "یہ کیا ہے؟" اس کے ساتھی نے کہا: "تمھارا حصہ ہے جو نبی ﷺ نے تمھارے لیے نکالا ہے۔" اس دیہاتی نے اپنا حصہ لیا اور نبی ﷺ کے پاس آیا، کہنے لگا: "یہ کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے مال غنیمت سے تمھارا حصہ نکالا ہے۔" وہ کہنے لگا: "میں اس کے لیے آپ کے پیچھے نہیں چلا بلکہ میں تو اس مقصد کے لیے آپ کے پیچھے لگا ہوں کہ مجھے (اس نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) یہاں تیر لگے تو میں فوت ہو کر جنت میں داخل ہو جاؤں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر تم اللہ سے سچ کہو گے تو اللہ بھی تم سے سچ کا سلوک کرے گا۔" تھوڑی دیر گزری تھی کہ وہ دشمن سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور شہید ہو گیا، اسے اٹھا کر نبی ﷺ کے پاس لایا گیا۔" اس کو وہیں تیر لگا تھا جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا یہ وہی ہے؟" صحابہ نے عرض کیا: "جی ہاں!" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس نے اللہ تعالیٰ سے سچ کہا تو اللہ نے اس سے سچ کا سلوک کیا۔" پھر نبی ﷺ نے اسے خود اپنے جبے میں کفن دیا اور سامنے رکھ کر اس پر جنازہ پڑھا:

« فَكَانَ مِمَّا ظَهَرَ مِنْ صَلَاتِهِ اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَبْدُكَ خَرَجَ مُهَاجِرًا فِيْ سَبِيْلِكَ فَقُتِلَ شَهِيْدًا اَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى ذٰلِكَ » [نسائی ، کتاب الجنائز: باب الصلاة على الشهداء (۱۹۵۲)، مستدرك حكم (۵۹۵/۳)، بیهقی (۱۵/٤)، السنن الكبرىٰ للنسائی (۲۰۸۰)، شرح معانی الآثار (۲۸۱۸) ، (۳۵/۲)]

" تو آپ کی دعا سے جو الفاظ ظاہر ہوئے ان میں سے چند ایک یہ تھے: "اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے، تیری راہ میں ہجرت کر کے نکلا، پس شہید ہو کر قتل ہوا، میں اس بات پر گواہ ہوں۔"

اس حدیث میں بھی " فَكَانَ مِمَّا ظَهَرَ مِنْ صَلَاتِهِ " قابل توجہ الفاظ ہیں۔ آپ ﷺ کی دعا میں سے جو الفاظ ظاہر ہوئے، وہ صحابی نے بیان کر دیے۔ معلوم ہوا اس کے علاوہ بھی آپ ﷺ نے دعا کی جو ظاہر نہیں ہوئی۔ لہٰذا نماز جنازہ میں متعدد دعائیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ یزید بن رکانہ بن مطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَامَ لِلْجَنَازَةِ لِيُصَلِّيَ عَلَيْهَا قَالَ اَللّٰهُمَّ عَبْدُكَ وَ ابْنُ اَمَتِكَ احْتَاجَ اِلٰى رَحْمَتِكَ وَاَنْتَ غَنِيٌّ عَنْ عَذَابِهِ اِنْ كَانَ مُحْسِنًا فَزِدْ فِيْ حَسَنَاتِهِ وَ اِنْ كَانَ مُسِيْئًا فَتَجَاوَزْ عَنْهُ، ثُمَّ يَدْعُوْ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّدْعُوَ »[طبرانی کبیر (۲۴۹/۲۲)، (٦٤٧)، مجمع الزوائد (٤١٦٧)، (۱٤٠/۳)، الإصابة (٥١٥/٦)]

"نبی کریم ﷺ جب نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوتے تو یہ دعا فرماتے: "اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے اور تیری بندی کا بیٹا ہے، تیری رحمت کا محتاج ہوگیا ہے اور تو اس کو عذاب دینے سے بے پروا ہے۔ اگر یہ احسان کرنے والا تھا تو اس کی نیکیوں میں اضافہ فرما اور اگر گناہ گار تھا تو اس سے درگزر فرما۔" پھر آپ اس کے بعد جو اللہ چاہتا دعا کرتے۔"

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ جنازے میں کئی دعائیں مانگتے تھے۔ اس حدیث کے آخری الفاظ" پھر اس کے بعد جو اللہ چاہتا دعا کرتے" اس مسئلے میں صریح نص ہیں۔ مذکورہ بالا صحیح دلائل سے یہ بات بالکل عیاں ہوگئی کہ مسلمان موحد کا جنازہ پڑھتے وقت ایک سے زائد دعائیں مانگی جا سکتی ہیں، رسول کریم ﷺ کے مبارک عمل سے یہ ثابت ہے اور شرعاً بالکل صحیح اور درست ہے۔

نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا

سوال کیا نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا بھی سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے؟

جواب نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا بھی صحیح ہے اور دونوں طرف بھی۔ ایک طرف سلام پھیرنے والی حدیث یہ ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فَكَبَّرَ عَلَيْهَا اَرْبَعًا وَسَلَّمَ تَسْلِيْمَةً وَاحِدَةً »[دارقطنی(۱۹۱)، حاکم(۱/۳۶۰)]

"بے شک رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازہ پڑھا، اس پر چار تکبیریں کہیں اور ایک سلام پھیرا۔"

اس حدیث کے بعد امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"وَ قَدْ صَحَّتِ الرِّوَايَةُ فِيْهِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ وَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ وَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ وَ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ وَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ اَوْفٰى وَ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهُمْ كَانُوْا يُسَلِّمُوْنَ عَلَى الْجَنَازَةِ تَسْلِيْمَةً وَاحِدَةً"

"سیدنا علی، سیدنا عبد اللہ بن عمر، سیدنا عبد اللہ بن عباس، سیدنا جابر بن عبد اللہ، سیدنا عبد اللہ بن ابی اوفیٰ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے صحیح روایات سے ثابت ہے کہ وہ جنازے پر ایک سلام پھیرا کرتے تھے۔"

رہا یہ مسئلہ کہ عموماً جو جنازوں پر سلام پھیرا جاتا ہے وہ دونوں طرف ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« ثَلَاثُ خِلَالٍ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَفْعَلُهُنَّ تَرَكَهُنَّ النَّاسُ اِحْدَاهُنَّ التَّسْلِيْمُ عَلَى الْجَنَازَةِ مِثْلَ التَّسْلِيْمِ فِي الصَّلَاةِ »[بیهقی(۴/۴۳)]

"تین کام رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے جنھیں لوگوں نے ترک کر دیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ نماز جنازہ پر اس طرح سلام پھیرنا جس طرح نماز میں سلام پھیرا جاتا ہے۔"

امام نووی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ [شرح مسلم(۵/۲۳۹)]

امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس حدیث کو امام طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔" [مجمع الزوائد(۳/۳٤)]

اور نماز میں دونوں طرف سلام پھیرنا صحیح ثابت ہے لہٰذا نماز جنازہ میں جو عموماً اہل حدیث اور دیگر حضرات دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں بالکل جائز و درست ہے اور اسی طرح ایک طرف سلام پھیرنا بھی مشروع ہے۔

نماز جنازہ کے فوراً بعد دعا

سوال جیسا کہ ہمارے ہاں مروج ہے نمازِ جنازہ کے فوراً بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت قرآن وحدیث سے ملتا ہے یا یہ خود ساختہ بدعت ہے؟

جواب نماز جنازہ ادا کرنے کا جو طریقہ کتب احادیث میں ملتا ہے اس میں میت کے لیے دعا کرنے کے دو مواقع کا ذکر ہے۔ ایک دعا نماز جنازہ کے اندر اور دوسری دعا قبر میں میت کو دفن کرنے کے بعد۔ نماز جنازہ کے بعد وہیں بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر دعا کرنے کا جو رواج بریلوی یا بعض دیوبندی حضرات میں پایا جاتا ہے اس کا ثبوت نہ اللہ کے رسول ﷺ سے ہے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ ہی سے۔ قرآن مجید سے اشارۃً میت کے لیے دعا کے دو مواقع معلوم ہوتے ہیں۔ جب آپ ﷺ نے منافق عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ ادا کی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی:

﴿ وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ﴾ [التوبة:٨٤]

"اے پیغمبر! ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کی نماز جنازہ کبھی ادا نہ کرنا اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہی ہونا۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون میں نماز جنازہ ادا کرنے اور دفن کے بعد قبر پر دعا کرنے کا طریقہ ضرور موجود تھا اور ان سے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حق میں آیت کے اندر صریحاً ممانعت کر دی ہے۔

اگر تیسری دعا کا وجود ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی ضرور روک دیتے۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کرنے سے تو فقہائے احناف نے بھی منع کیا ہے، جیسا کہ سید الحموی رقمطراز ہیں:

" لَا يَقُوْمُ بِالدُّعَاءِ بَعْدَ صَلَاةِ الْجَنَازَةِ لِاَنَّهُ يَشْبَهُ الزِّيَادَةَ فِيْ صَلَاةِ الْجَنَازَةِ " [کشف الرمز علی الکنز (١٣١)]

"نماز جنازہ کے بعد دعا نہ کرو، اس لیے کہ یہ نماز جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے۔"

نماز جنازہ سے فراغت کے فوراً بعد دعا کروانے کے قائل حضرات کی دلیل یہ حدیث ہے: « اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ

فَاَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَاءَ» [ابو داؤد، کتاب الجنائز : باب الدعاء للمیت (۳۱۹۹)]
انھوں نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''جب تم میت پر نماز جنازہ پڑھ چکو تو اس کے لیے خالص دعا کرو۔'' حالانکہ اس کا ترجمہ یہ ہے: ''جب تم نماز جنازہ پڑھو تو اس کے لیے خالص دعا کرو۔'' پہلا ترجمہ تو حدیث کی روح کے خلاف ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ تو یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ جب میت پر نماز جنازہ ادا کی جائے تو نہایت اخلاص کے ساتھ میت کے لیے دعا کی جائے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جنازہ تو بغیر اخلاص کے ساتھ پڑھ لو اور بعد میں اخلاص کے ساتھ دعا کرو۔
جس اصول کے تحت یہ ترجمہ کیا گیا ہے اگر تسلیم کر لیا جائے تو مندرجہ ذیل آیت اور حدیث کے مفہوم کو کیا یہ صحیح سمجھیں گے۔قرآن میں ہے ﴿ وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ﴾ ''جب تم قرآن پڑھو تو اللہ کی پناہ مانگو۔''
اگر ان حضرات کا ترجمہ کیا جائے تو یوں ہوگا: ''جب تم قرآن پڑھ لو تو اللہ تعالیٰ سے شیطان مردود کی پناہ مانگو۔'' کیا یہ اسے صحیح تسلیم کریں گے اور پھر اس پر عمل کریں گے۔اور ایک حدیث میں ہے:

« وَ اِذَا لَبِسْتُمْ وَ اِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَؤُوْا بِمَيَامِنِكُمْ » [ابو داود، کتاب اللباس: باب فی الانتعال (٤١٤١)]
''جب تم لباس پہنو اور وضو کرو تو دائیں طرف سے شروع کرو۔''
اگر ان کی منطق تسلیم کر لی جائے تو ترجمہ یوں ہوگا: ''جب تم لباس پہن لو اور وضو کر لو تو پھر دائیں جانب سے شروع کرو۔''
معلوم ہوا کہ ان حضرات کا مذکورہ حدیث سے استدلال بالکل بے بنیاد ہے۔لہٰذا ثابت ہوا کہ نماز جنازہ کے فوراً بعد کوئی دعا کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں بلکہ دین میں ایک ایجاد ہے۔

مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا

سوال مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا کیسا ہے؟
جواب نماز جنازہ مسجد میں بھی ادا کی جا سکتی ہے، دلائل مندرجہ ذیل ہیں:
① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« لَمَّا تُوُفِّیَ سَعْدُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَرْسَلَ اَزْوَاجُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ اَنْ يَّمُرُّوْا بِجَنَازَتِهٖ فِی الْمَسْجِدِ فَيُصَلِّيْنَ عَلَيْهِ فَفَعَلُوْا فَوُقِفَ بِهٖ عَلٰی حُجَرِهِنَّ يُصَلِّيْنَ عَلَيْهِ اُخْرِجَ بِهٖ مِنْ بَابِ الْجَنَائِزِ الَّذِیْ كَانَ اِلَی الْمَقَاعِدِ فَبَلَغَهُنَّ اَنَّ النَّاسَ عَابُوْا ذٰلِكَ وَ قَالُوْا مَا كَانَتِ الْجَنَائِزُ يُدْخَلُ بِهَا الْمَسْجِدَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ عَائِشَةَ فَقَالَتْ مَا اَسْرَعَ النَّاسِ اِلٰی اَنْ يَّعِيْبُوْا مَا لَا عِلْمَ لَهُمْ بِهٖ عَابُوْا عَلَيْنَا اَنْ يُّمَرَّ بِجَنَازَةٍ فِی الْمَسْجِدِ وَ مَا صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَلٰى سُهَيْلِ بْنِ بَيْضَاءَ اِلَّا فِيْ جَوْفِ الْمَسْجِدِ»[مسلم، كتاب الجنائز : باب الصلاة على الجنازة في المسجد (٩٧٣)، مسند احمد(٧٩/٦)، ابوداؤد، كتاب الجنائز: باب الصلاة على الجنازة في المسجد(٣١٩٠)، ترمذى(١٠٣٣)، نسائى (١٩٦٩،١٩٧٠)، ابن ماجه(١٥١٨)، شرح معانى الآثار (٣٣٠/١)، بيهقى(٥١/٤)، الأوسط لابن المنذر(٤١٦/٥)، عبد الرزاق (٦٥٧٨)، شرح السنة (٣٥٠/٥)، ابن ابى شيبة (١١٩٧٠)]

’’جب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو ازواج مطہرات نے پیغام بھیجا کہ ان کا جنازہ مسجد میں لائیں تا کہ وہ بھی ان پر نماز جنازہ پڑھ لیں۔ سو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ازواج مطہرات کے حجروں کے پاس جنازہ رکھا گیا کہ وہ بھی نماز پڑھ لیں اور جنازہ کو باب الجنائز سے جو مقاعد کی طرف تھا، نکالا گیا۔ ازواج کو یہ بات پہنچی کہ لوگ اسے معیوب سمجھ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جنازے مسجد میں داخل نہیں کرنے چاہییں، جب یہ بات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچی تو انھوں نے فرمایا: ’’لوگ جلدی عیب لگانے لگ جاتے ہیں، اس بات میں جس کا انھیں علم نہیں ہوتا۔ انھوں نے ہم پر عیب لگایا کہ جنازہ مسجد میں لایا گیا ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل بن بیضاء کی نماز جنازہ مسجد ہی میں ادا کی تھی۔‘‘

علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

’’ هٰذَانِ الْحَدِيْثَانِ يَدُلَّانِ عَلٰى مَشْرُوْعِيَّةِ الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَائِزِ فِي الْمَسْجِدِ قَالَ الْحَافِظُ فِي الْفَتْحِ وَ بِهِ قَالَ الْجُمْهُوْرُ ‘‘ [عون المعبود (١٨٢/٣)، فتح البارى (١٩٩/٣)]

’’یہ دونوں حدیثیں مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنے کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں: ’’یہی جمہور ائمہ و محدثین کا قول ہے۔‘‘

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’ وَ فِيْ هٰذَا الْحَدِيْثِ دَلِيْلٌ لِّلشَّافِعِيِّ وَ الْاَكْثَرِيْنَ فِيْ جَوَازِ الصَّلَاةِ عَلَى الْمَيِّتِ فِي الْمَسْجِدِ وَ مِمَّنْ قَالَ بِهِ اَحْمَدُ وَ اِسْحَاقُ ‘‘ [شرح مسلم للنووى(٣٤/٧)]

’’اس حدیث میں امام شافعی رحمہ اللہ اور اکثر فقہاء و محدثین کی دلیل ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا جائز ہے اور یہی قول امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ کا ہے۔‘‘

علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’ وَ الْحَدِيْثُ يَدُلُّ عَلٰى جَوَازِ اِدْخَالِ الْمَيِّتِ فِي الْمَسْجِدِ وَ الصَّلَاةِ عَلَيْهِ فِيْهِ وَ بِهِ قَالَ الشَّافِعِيُّ وَ اَحْمَدُ وَ اِسْحَاقُ وَ الْجُمْهُوْرُ ‘‘ [مرعاة المفاتيح(٣٨٦/٥)]

’’مذکورہ حدیث میت کو مسجد میں داخل کرنے اور اس پر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے پر دلالت کرتی ہے اور یہی قول امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ اور جمہور فقہاء و محدثین رحمہم اللہ کا ہے۔‘‘

② عروہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" مَا صُلِّيَ عَلٰى اَبِيْ بَكْرٍ اِلَّا فِي الْمَسْجِدِ " [ابن ابی شیبة(٣/٤٤)، (١١٩٦٧)، عبد الرزاق (٣/٥٢٦)، (٦٥٧٦)، شرح السنة (٥/٣٥١)، الأوسط لابن المنذر (٥/٤١٥)، الإقناع(١/١٦٠)، بيهقى (٤/٥٢)]

''ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر مسجد ہی میں جنازہ پڑھا گیا۔''

③ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« صُلِّيَ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِي الْمَسْجِدِ » [موطا، كتاب الجنائز: باب الصلاة على الجنائز فى المسجد (١/١٩٩)، ابن ابى شيبة (١١٩٦٩)، عبدالرزاق(٦٥٧٧)، الأوسط لابن المنذر(٥/٤١٥)، بيهقى (٢/٥٢)، طحاوى (١/٤٩٢)، شرح السنة(٥/٣٥١)]

''عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر نماز جنازہ مسجد میں ادا کی گئی۔''

مذکورہ بالا صحیح احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا صحیح و درست ہے بلکہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے کیونکہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جنازے میں ہزاروں انصار و مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شرکت کی مگر کسی نے بھی انکار نہیں کیا اور یہ جنازے مسجد میں ادا کیے گئے تھے۔

نماز جنازہ میں خواتین کی شرکت

سوال کیا خواتین نماز جنازہ میں شرکت کر سکتی ہیں؟

جواب اگر خواتین نماز جنازہ ادا کرنا چاہیں تو ادا کر سکتی ہیں۔ عبداللہ بن ابی طلحہ اپنے باپ ابوطلحہ سے بیان کرتے ہیں کہ جب عمیر بن ابی طلحہ فوت ہوئے تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو بلایا، رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور عمیر پر ان کے گھر میں نماز جنازہ ادا کی، نبی ﷺ آگے تھے اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے تھے اور ام سلیم رضی اللہ عنہا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے تھیں اور ان کے ساتھ ان کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ [المستدرك للحاكم (١/٣٦٥)، (١٣٥٠)]

امام حاکم اور امام ذہبی نے اس حدیث کو بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں: ''عورتوں کے نماز جنازہ ادا کرنے کی اباحت پر یہ ایک سنت غریبہ ہے۔'' اسی طرح سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پر امہات المومنین رضی اللہ عنہن کا نماز جنازہ پڑھنا صحیح مسلم (۹۷۳/۹۹۱) وغیرہ میں مذکور ہے۔ لہٰذا خواتین اگر نماز جنازہ ادا کرنا چاہیں تو وہ بھی شرکت کر سکتی ہیں البتہ انہیں اپنے حجاب اور پردے کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔

مردہ بچے کی نماز جنازہ

سوال بچہ اگر مردہ پیدا ہو تو کیا اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے؟

(جواب) مردہ یا ناتمام بچے کی نماز جنازہ ادا کرنا شرعاً مشروع و جائز ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ الرَّاكِبُ يَسِيْرُ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَ الْمَاشِيْ يَمْشِيْ خَلْفَهَا وَ اَمَامَهَا وَ عَنْ يَّمِيْنِهَا وَ عَنْ يَّسَارِهَا قَرِيْبًا مِّنْهَا وَ السِّقْطُ يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَ يُدْعٰى لِوَالِدَيْهِ بِالْمَغْفِرَةِ وَ الرَّحْمَةِ »[ابو داود، کتاب الجنائز: باب المشي أمام الجنازة (۳۱۸۰)، احمد(۱۷۷۰۹)]

''مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' سوار جنازہ کے پیچھے چلے اور پیدل آگے پیچھے، دائیں بائیں اور اس سے قریب رہ کر چلیں اور نا تمام بچے پر بھی نماز جنازہ پڑھی جائے اور اس کے ماں باپ کے لیے رحمت اور بخشش کی دعا کی جائے۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

'' اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ'' ناتمام'' سے مراد وہ بچہ ہے جس کے چار ماہ مکمل ہو چکے ہوں اور اس میں روح پھونکی گئی ہو، پھر وفات پائے۔ البتہ اس سے پہلے کی صورت میں اگر ساقط ہو جائے تو اس پر نماز جنازہ ادا نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ وہ میت کہلا ہی نہیں سکتی۔''[احکام الجنائز(ص/۸۱)]

اس بات کی وضاحت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس مرفوع روایت سے ہوتی ہے:

« اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِيْ بَطْنِ اُمِّهِ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ يَكُوْنُ فِيْ ذٰلِكَ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ فِيْ ذٰلِكَ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ الْمَلَكَ فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ »[مسلم، کتاب القدر: باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه(۲٦٤٣)]

''یقیناً تمھاری تخلیق کا طریقہ کار یہ ہے کہ چالیس دن تک وہ ماں کے پیٹ میں نطفے کی شکل میں پڑا رہتا ہے، پھر اتنے ہی دن تک لوتھڑے کی شکل میں، پھر اتنے ہی دن تک بوٹی کی طرح رہتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے۔''

لہٰذا جس بچے کے چار ماہ مکمل ہوں اور اس میں روح پھونکی گئی ہو، وہ ناتمام پیدا ہوا ہو تو اس کی نماز جنازہ ادا کی جاسکتی ہے اور جو روح پھونکے جانے سے قبل ہی ساقط ہو جائے ، اس کی نماز جنازہ ادا نہیں کی جائے گی ، کیونکہ اس کو میت نہیں کہا جا سکتا۔ بعض علماء نے یہ شرط لگائی ہے کہ بچہ زندہ پیدا ہو خواہ اس نے سانس ایک دفعہ ہی لیا ہو، اس کی دلیل میں یہ روایت پیش کرتے ہیں:

« اِذَا اسْتَهَلَّ السِّقْطُ صُلِّيَ عَلَيْهِ وَ وُرِّثَ » [أحكام الجنائز للألباني(ص/۸۱)،تلخيص الحبير (۱٤٦/٦)، المجموع (۲٥٥/٥)، نقد التاج الجامع للأصول الخمسة(۲۹۳)]

'' جب پیدا ہونے والا بچہ چیخے تو اس کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی اور وہ وارث بھی ہوگا۔''

یہ روایت ضعیف ہے۔

خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ کا حکم

(سوال) کیا خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنا ممنوع ہے؟

(جواب) سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''ایک آدمی بیمار ہو گیا، اس پر چیخ پکار کی گئی، اس کا پڑوسی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، اس نے کہا:'' وہ مر گیا ہے۔'' آپ ﷺ نے کہا:'' تجھے کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے کہا:''میں نے اسے دیکھا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ نہیں مرا۔'' وہ آدمی واپس لوٹا تو اس آدمی پر چیخ پکار کی جا رہی تھی، اس نے آ کر آپ ﷺ کو بتایا:'' وہ مر گیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:''وہ نہیں مرا۔'' وہ پھر واپس لوٹا تو اس پر چیخ پکار کی جا رہی تھی۔ اس آدمی کی بیوی نے کہا:'' تو رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر انھیں خبر دے۔'' تو اس آدمی نے کہا:'' اے اللہ! اس پر لعنت کر۔'' پھر وہ آدمی اندر آ گیا۔ اس نے جا کر دیکھا کہ اس نے اپنے نیزے کے پھل کے ساتھ اپنا گلا کاٹ لیا ہے۔'' پھر وہ نبی ﷺ کے پاس گیا اور آپ ﷺ کو خبر دی کہ وہ اب مر گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:'' تجھے کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے کہا:'' میں نے اسے دیکھا ہے کہ اس نے اپنے نیزے کے پھل سے اپنا گلا کاٹ لیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِذًا لَا اُصَلِّیْ عَلَیْهِ)) '' میں اس پر جنازہ نہیں پڑھوں گا۔'' [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب الإمام لایصلی علی من قتل نفسه (٣١٨٥)، ترمذی (١٦١/٢)، ابن ماجه (١٥٢٦)، حاکم (٣٦٤/١)، بیهقی (١٩/٤)، مسند طیالسی(٧٧٩)، مسند احمد(٨٧/٥)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خودکشی کرنے والے پر آپ ﷺ نے نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے مذکورہ روایت اور اس سے پہلے ایک خائن آدمی کی نماز جنازہ پڑھنے کی روایت نقل کر کے لکھا ہے:

''اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق بدکار مسلمان کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ یہی مذہب حضرت عمر بن عبدالعزیز اور امام اوزاعی رحمہما اللہ وغیرہ کا ہے۔ مگر امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ فاسق کے جنازے کی نماز پڑھنی چاہیے۔ وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:'' رسول اللہ ﷺ نے خود بذاتہ لوگوں کی عبرت وتنبیہ کے لیے نماز نہیں پڑھی تھی، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے پڑھی تھی۔'' اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ نسائی کی روایت میں ہے:''لیکن میں اس کے جنازے کی نماز نہیں پڑھوں گا۔''

[کتاب الجنائز:(ص/٦١،٦٢)]

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بہر کیف مسلم معاشرے کے ممتاز صاحب علم و بصیرت افراد ایسے لوگوں کی نماز جنازہ نہ پڑھائیں۔ البتہ عوام الناس پڑھ لیں کیونکہ مرنے والا مسلمان آدمی ہے۔ جب قوم کے ممتاز افراد ایسے لوگوں کی نماز جنازہ نہیں پڑھائیں گے تو اس طرح ایسے فاسق اور بے عمل افراد کو تنبیہ ہوگی اور برائی کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

شہید کی نماز جنازہ کا حکم

(سوال) کیا شہید کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟ دلائل کی رو سے صراحت فرما ممنون فرمائیں۔

(جواب) شہید کی نماز جنازہ پڑھنا ضروری نہیں البتہ اگر کوئی پڑھ لے تو جائز ہے۔ جو لوگ شہید معرکہ کے جنازے کو ناجائز قرار دیتے ہیں ان کے پیش نظر یہ حدیث ہے:

« عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلٰى أُحُدٍ فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ ثُمَّ يَقُوْلُ أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ فَإِذَا أُشِيْرَ لَهُ إِلٰى أَحَدِهِمَا قَدَّمَهُ فِي اللَّحْدِ وَ قَالَ أَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ أَمَرَ بِدَفْنِهِمْ فِيْ دِمَائِهِمْ وَ لَمْ يُغَسَّلُوْا وَ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِمْ » [بخاری، كتاب الجنائز : باب الصلاة على الشهيد(١٣٤٣)]

”جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم احد کے مقتولین میں سے دو دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے پھر فرماتے: ”ان میں سے کسے زیادہ قرآن یاد تھا؟“ جب ان میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کرکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے لحد میں آگے کر دیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں ان پر قیامت کے دن گواہ ہوں گا۔“ آپ نے ان کے خونوں ہی میں انھیں دفن کر دینے کا حکم دیا، نہ تو انھیں غسل دیا گیا اور نہ ان کا جنازہ پڑھا گیا۔“

ان علماء کا کہنا ہے کہ صحیح بخاری کی یہ حدیث اس بات پر صریح دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے شہداء کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ یہ حضرات ان احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے موقع پر شہداء کی نماز جنازہ ادا کی۔ کیونکہ وہ صحیح بخاری کی حدیث کے خلاف ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شہداء کی نماز جنازہ پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ یہ احادیث تین مختلف اوقات سے تعلق رکھتی ہیں، جن میں سے دو موقعوں کی احادیث کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور اگر کسی نے اختلاف کیا ہے تو محض وہم کی بنا پر کیا ہے۔

① پہلا موقع غزوہ احد کے علاوہ دوسرے موقع پر شہید ہونے والوں کی نماز جنازہ ہے۔ شداد بن الہاد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”ایک دیہاتی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا اور آپ کا تابع ہوگیا، پھر کہنے لگا: ”میں آپ کے ساتھ ہجرت کرتا ہوں۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق اپنے بعض صحابہ کو تاکید فرمائی۔ جب ایک جنگ ہوئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ غنیمت حاصل ہوئی۔ آپ نے اسے تقسیم کر دیا، اس کا حصہ بھی نکالا اور اس کا حصہ اس کے ساتھیوں کو دے دیا۔ وہ ساتھیوں کی سواریاں چرایا کرتا تھا۔ جب آیا تو انھوں نے اسے وہ حصہ دے دیا۔ کہنے لگا: ”یہ کیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”تمھارا حصہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھارے لیے نکالا ہے۔“ اس نے وہ لے لیا اور لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گیا، کہنے لگا: ”یہ کیا ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں نے یہ تمھارا حصہ نکالا ہے۔“ کہنے لگا: ”میں اس کے لیے آپ کے پیچھے نہیں چلا بلکہ میں تو اس (مقصد) کے لیے آپ کے پیچھے چلا ہوں کہ مجھے (حلق کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا کہ) یہاں تیر لگے اور میں فوت ہو کر جنت میں داخل ہو جاؤں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم اللہ سے سچ کہو گے تو اللہ بھی تم سے سچ کا سلوک کرے گا۔'' تھوڑی دیر گزری تھی کہ وہ دشمن سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر اسے اٹھا کر نبی ﷺ کے پاس لایا گیا اور اسے وہیں تیر لگا تھا جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ وہی ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ''ہاں!'' آپ ﷺ نے فرمایا:

« صَدَقَ اللّٰهُ فَصَدَّقَهُ ثُمَّ كَفَّنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِيْ جُبَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ثُمَّ قَدَّمَهُ فَصَلّٰى عَلَيْهِ فَكَانَ مِمَّا ظَهَرَ مِنْ صَلَاتِهِ اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَبْدُكَ خَرَجَ مُهَاجِرًا فِيْ سَبِيْلِكَ فَقُتِلَ شَهِيْدًا اَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى ذٰلِكَ »[نسائی، کتاب الجنائز: باب الصلاۃ علی الشهداء (۱۹۵۵)]

''اس نے اللہ تعالیٰ سے سچ کہا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے سچ کا سلوک کیا۔'' نبی ﷺ نے اسے خود اپنے جبے میں کفن دیا، اسے آگے رکھ کر اس پر جنازہ پڑھی۔ جنازے میں سے آپ ﷺ کے جو الفاظ ظاہر ہوئے ان میں سے چند یہ تھے:'' اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے، ہجرت کر کے تیری راہ میں نکلا پس شہید ہو کر قتل ہوا میں اس بات پر گواہ ہوں۔''

اس صحیح اور صریح حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے شہید معرکہ کا جنازہ خود پڑھایا ہے، اگر احد کے شہداء کا جنازہ آپ ﷺ نے نہ بھی پڑھا ہو تو یہ حدیث ہی شہید کے جنازہ کے سنت ہونے کے لیے کافی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص اعتراض برائے اعتراض کرنا چاہے تو کہہ سکتا ہے: « فَصَلّٰى عَلَيْهِ » کا معنی یہ ہے کہ اس کے لیے دعا کی۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو نماز جنازہ سرے سے ختم ہو جاتی ہے کیونکہ میت سامنے رکھ کر صرف دعا نہیں کی جاتی بلکہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے اور اس کے لیے ''فَصَلّٰى عَلَيْهِ'' کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

② دوسرا موقع آٹھ سال بعد شہدائے احد کی نماز جنازہ ہے۔ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا فَصَلّٰى عَلٰى اَهْلِ اُحُدٍ صَلَاتَهُ عَلَى الْمَيِّتِ ثُمَّ انْصَرَفَ اِلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ اِنِّيْ فَرَطٌ لَكُمْ وَ اَنَا شَهِيْدٌ عَلَيْكُمْ وَ اِنِّيْ وَ اللّٰهِ لَاَنْظُرُ اِلٰى حَوْضِيَ الْاٰنَ وَ اِنِّيْ اُعْطِيْتُ مَفَاتِيْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ اَوْ مَفَاتِيْحَ الْاَرْضِ وَ اِنِّيْ وَ اللّٰهِ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ اَنْ تُشْرِكُوْا بَعْدِيْ وَ لٰكِنْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنَافَسُوْا فِيْهَا »[بخاری، کتاب الجنائز : باب الصلوٰۃ علی الشهداء (۱۳۴٤)]

''نبی ﷺ ایک دن نکلے اور آپ نے احد والوں پر اس طرح نماز جنازہ پڑھی جس طرح آپ میت پر پڑھتے تھے، پھر واپس منبر کی طرف آئے اور فرمایا: ''میں پہلے جا کر تمھاری ضروریات کا انتظام کرنے والا ہوں اور اللہ کی قسم! اس وقت میں اپنا حوض دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئی ہیں اور اللہ کی قسم! میں تمھارے متعلق اس بات سے نہیں ڈرتا کہ تم میرے بعد شرک کرو گے لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم ایک دوسرے کے مقابلے پر دنیا

میں رغبت کرو گے۔"

دیگر کتب احادیث کی روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے یہ جنازہ آٹھ سال بعد پڑھا۔

اس حدیث سے شہید کی نماز جنازہ ثابت ہوتی ہے ۔ بعض لوگ ،جنھوں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ شہید کی نماز جنازہ کو تسلیم ہی نہیں کرنا، اس حدیث کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبرستان میں جا کر شہدائے احد کے لیے دعا کی، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے شہداء کی نماز جنازہ پڑھی کیوں کہ صلاۃ کا معنی دعا بھی ہے مگر گزشتہ حدیث کے الفاظ میں اس تاویل کی گنجائش ہی نہیں۔ الفاظ یہ ہیں: « فَصَلّٰى عَلٰى اَهْلِ اُحُدٍ صَلَاتَهُ عَلَى الْمَيِّتِ » یعنی" آپ نے احد والوں پر اس طرح صلاۃ پڑھی جس طرح میت پر پڑھتے تھے۔" اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے باقاعدہ ان کی نماز جنازہ پڑھی تھی۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا: "صَلَاتَهُ عَلَى الْمَيِّتِ" کے الفاظ اس تاویل کی تردید کرتے ہیں کہ صلوٰۃ سے مراد دعا ہے۔" [نيل الأوطار (٤/٤٤)]

علاوہ ازیں آپ کا یہ عمل صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ آپ میت کے دفن ہونے سے پہلے کسی وجہ سے نماز جنازہ نہ پڑھ سکتے تو قبر پر جا کر صفیں بنا کر نماز جنازہ پڑھتے۔امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اَخْبَرَنِىْ مَنْ مَرَّ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَلٰى قَبْرٍمَنْبُوْذٍ فَاَمَّهُمْ وَ صَلَّوْا خَلْفَهُ قُلْتُ مَنْ حَدَّثَكَ هٰذَا يَا اَبَا عَمْرٍو؟ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا " [بخاری، كتاب الجنائز: باب الصلاة على القبر بعد ما يدفن (١٣٣٦)]

" مجھے اس شخص نے خبر دی جو نبی ﷺ کے ساتھ ایک الگ تھلگ قبر کے پاس سے گزرا تو نبی ﷺ نے ان کی امامت کروائی اور انھوں نے آپ ﷺ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی۔ سلیمان فرماتے ہیں: "میں نے شعبی سے کہا کہ اے ابو عمرو! آپ کو یہ حدیث کس نے بیان کی؟" تو انھوں نے فرمایا: "ابن عباس رضی اللہ عنہما نے۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« اَنَّ اَسْوَدَ رَجُلًا اَوِ امْرَاَةً كَانَ يَقُمُّ الْمَسْجِدَ فَمَاتَ وَ لَمْ يَعْلَمِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِمَوْتِهِ فَذَكَرَهُ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ مَا فَعَلَ ذٰلِكَ الْاِنْسَانُ ؟ قَالُوْا مَاتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَالَ اَفَلَا آذَنْتُمُوْنِيْ ؟ فَقَالُوْا اِنَّهُ كَانَ كَذَا وَ كَذَا قِصَّتُهُ فَقَالَ فَحَقَرُوْا شَاْنَهُ قَالَ فَدُلُّوْنِيْ عَلٰى قَبْرِهِ قَالَ فَاَتٰى قَبْرَهُ فَصَلّٰى عَلَيْهِ »[بخاری، كتاب الجنائز: باب الصلاة على القبر بعد ما يدفن (١٣٣٧)]

" ایک سیاہ مرد یا عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا تو وہ فوت ہو گیا اور نبی ﷺ کو اس کی وفات کا علم نہ ہو سکا۔ آپ ﷺ نے ایک دن اسے یاد کیا اور فرمایا: "اس آدمی کا کیا ہوا؟" لوگوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! وہ فوت ہو گیا ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا:" تو تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟" انھوں نے کہا: "اس کا واقعہ اس طرح

ہوا۔'' گویا انھوں نے اس کے معاملے کو معمولی قرار دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس کی قبر بتاؤ؟'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''آپ اس کی قبر پر گئے اور اس کی نماز جنازہ پڑھی۔''

صحیح بخاری میں شہدائے احد کی آٹھ سال بعد نماز جنازہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر پہلے فرصت نہ مل سکے تو کئی سال بعد بھی میت کی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے جس میں شہید بھی شامل ہیں اور اگر وہ احادیث ثابت ہوں جن میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کے موقع پر بھی شہداء کی نماز جنازہ پڑھی تو آٹھ سال بعد کی نماز جنازہ سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے نماز جنازہ پڑھی ہو تو کئی سال بعد دوبارہ قبر پر پڑھنا جائز ہے۔

(۳) تیسرا موقع جنگ احد کے موقع پر شہدائے احد کی نماز جنازہ ہے، اس میں شبہ نہیں کہ صحیح بخاری میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شہدائے احد کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی اس مفہوم کی روایت مروی ہے مگر جب دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح سند سے ثابت ہو جائے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر شہداء کی نماز جنازہ پڑھی ہے تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ اصول ہے کہ ایک واقعہ کے متعلق جب ایک آدمی یہ بیان کرے کہ یہ واقعہ نہیں ہوا اور دوسرا یہ بیان کرے کہ یہ واقعہ ہوا ہے اور دونوں سچے ہوں تو اس شخص کی بات تسلیم کی جائے گی جو واقعہ ثابت ہونے کا راوی ہے اور پہلے کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ اسے علم نہیں ہو سکا۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ اَيْضًا اَحَادِيْثُ الصَّلَاةِ قَدْ شَدَّ مَنْ عَضَدَهَا كَوْنُهَا مُثْبِتَةً وَ الْإِثْبَاتُ مُقَدَّمٌ عَلَى النَّفْيِ وَ هٰذَا مُرَجِّحٌ مُعْتَبَرٌ '' [نيل الأوطار(٤/٤٤)]

''شہدائے احد پر نماز جنازہ پڑھنے کی احادیث کو قوی قرار دینے والوں کو اس بات سے مزید قوت حاصل ہوتی ہے کہ یہ احادیث جنازے کا اثبات کرتی ہیں اور اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے اور ترجیح کی یہ وجہ ایسی ہے کہ ماننی پڑتی ہے۔''

رہا یہ سوال کہ سیدنا جابر اور انس رضی اللہ عنہما جلیل القدر صحابی ہیں، ان سے یہ بات کیسے مخفی رہ سکتی ہے تو یہ کوئی بعید بات نہیں۔ جنگ احد میں مسلمانوں کو لاحق ہونے والی پریشانی کی حالت میں تمام لوگ اگر جنازے پر نہ پہنچ سکے ہوں اور نہ انھیں اس بات کا علم ہوا ہو تو یہ ممکن ہے۔ خصوصا سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ ہونا اور جنازے پر نہ پہنچ سکنا تو عین ممکن ہے کیونکہ وہ احد کے معرکے میں شریک ہی نہیں ہو سکے جیسا کہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

'' وَ كَانَ جَابِرٌ قَدْ اَطَاعَ اَبَاهُ يَوْمَ اُحُدٍ وَ قَعَدَ لِاَجْلِ اَخَوَاتِهِ ثُمَّ شَهِدَ الْخَنْدَقَ وَ بَيْعَةَ الشَّجَرَةِ ''
[سير اعلام النبلا(١٩٠/٣)]

''اور جابر رضی اللہ عنہ نے احد کے دن اپنے والد کی اطاعت کی تھی اور اپنی بہنوں کی وجہ سے گھر میں رہ گئے تھے، پھر جنگ خندق میں اور بیعت رضوان میں حاضر ہوئے تھے۔''

خود ان کا بیان ہے: ''میں والد صاحب کے منع کرنے کی وجہ سے بدر اور احد میں شریک نہیں ہوا، جب وہ شہید ہو گئے تو میں کسی غزوے سے پیچھے نہیں رہا۔'' [مسلم، كتاب الجهاد : باب عدد غزوات النبي(١٨١٣)]

نیز سیدنا انس رضی اللہ عنہ بھی اس وقت چھوٹی عمر کے بچے تھے۔ جن احادیث میں احد کے موقع پر شہداء کی نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:

① سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَمَرَ يَوْمَ اُحُدٍ بِحَمْزَةَ فَسُجِّيَ بِبُرْدَةٍ ثُمَّ صَلّٰى عَلَيْهِ فَكَبَّرَ تِسْعَ تَكْبِيْرَاتٍ ثُمَّ اُتِيَ بِالْقَتْلٰى يَصِفُّوْنَ وَ يُصَلِّيْ عَلَيْهِمْ وَ عَلَيْهِ مَعَهُمْ» [شرح معانی الآثار للطحاوی (۱/۲۹۰)]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے دن حمزہ رضی اللہ عنہ کے متعلق حکم دیا تو انھیں ایک چادر کے ساتھ ڈھانپ دیا گیا پھر آپ نے ان پر نماز جنازہ پڑھی اور ان پر نو تکبیریں کہیں۔ پھر دوسرے مقتول لائے گئے، وہ صفوں میں رکھے جاتے تھے اور آپ ان کی نماز جنازہ پڑھتے تھے اور ان کے ساتھ حمزہ کی بھی نماز جنازہ پڑھتے تھے۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کی سند حسن ہے، اسکے تمام راوی معروف ثقہ ہیں۔'' [احکام الجنائز و بدعها (ص/۸۲)]

② عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

''لَمَّا وَقَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حَمْزَةَ اَمَرَ بِهِ فَهُيِّئَ اِلَى الْقِبْلَةِ ثُمَّ كَبَّرَ عَلَيْهِ تِسْعًا ثُمَّ جَمَعَ اِلَيْهِ الشُّهَدَاءَ كُلَّمَا اُتِيَ بِشَهِيْدٍ وُضِعَ اِلٰى حَمْزَةَ فَصَلّٰى عَلَيْهِ وَ عَلَى الشُّهَدَاءِ مَعَهُ حَتّٰى صَلّٰى عَلَيْهِ وَ عَلَى الشُّهَدَاءِ اثْنَيْنِ وَ سَبْعِيْنَ صَلَاةً» [طبرانی کبیر (۳/۱۰۷)]

'' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر (نماز جنازہ کے لیے) کھڑے ہوئے اور ان کے متعلق حکم دیا تو ان کی تیاری کر کے انھیں قبلہ کی طرف لٹا دیا گیا۔ پھر آپ نے ان پر نو تکبیریں کہیں، پھر دوسرے شہداء کو ان کے ساتھ اکٹھا کیا، جب کوئی شہید لایا جاتا تو حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ لٹا دیا جاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اور اس کے ساتھ دوسرے شہید پر نماز جنازہ پڑھتے حتیٰ کہ آپ نے اس پر اور دوسرے شہداء پر بہتر (۷۲) دفعہ نماز جنازہ پڑھی۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید کہا ہے۔ [أحکام الجنائز و بدعها (ص/۱۰٤)]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شہید معرکہ کی نماز جنازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی احادیث سے ثابت ہے۔ اگر جنگ احد کے موقع پر شہداء کی نماز جنازہ والی احادیث کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو کوئی اشکال ہی نہیں رہتا اور اگر ان کی صحت پر اطمینان نہ بھی ہو تو گلے میں تیر لگنے سے شہید ہونے والے صحابی کی نماز جنازہ اور شہدائے احد پر آٹھ سال بعد جنازہ والی احادیث کے بعد شہدائے معرکہ کی نماز جنازہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

غائبانہ نماز جنازہ

(سوال) غائبانہ نمازِ جنازہ کی شرعی حیثیت کے متعلق بتا کر عنداللہ ماجور ہوں؟

(جواب) غائبانہ نماز جنازہ درست ہے۔اس کی دلیل یہ حدیث ہے :

« عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ نَعَی النَّجَاشِیَّ فِی الْیَوْمِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْهِ وَ خَرَجَ بِهِمْ اِلَی الْمُصَلّٰی فَصَفَّ بِهِمْ وَ کَبَّرَ عَلَیْهِ اَرْبَعَ تَکْبِیْرَاتٍ »[بخاری، کتاب الجنائز: باب التکبیر علی الجنائز اربعا(۱۳۳۳)]

’’ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کی موت کی اطلاع اس دن دی جس دن وہ فوت ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر جنازگاہ کی طرف نکلے، ان کی صفیں بنائیں اور اس پر چار تکبیریں کہیں۔‘‘

اس حدیث سے غائبانہ نماز جنازہ کا ثبوت ملتا ہے اور جس شخص کی نماز جنازہ میت حاضر ہونے کی صورت میں ہوسکتی ہے، غائب ہونے کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے۔شہید کی نماز جنازہ کے مسنون ہونے کے دلائل اوپر گزر چکے ہیں۔بعض لوگ غائبانہ نماز جنازہ کے سرے ہی سے منکر ہیں ۔ان کا کہنا ہے کہ یہ صرف نجاشی ہی کے ساتھ خاص تھا کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زمین کے تمام پردے ہٹا دیے گئے اور نجاشی کی میت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھ رہے تھے۔مگر یہ بات درست نہیں۔امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:’’ یہ روایت اوہام و خیالات میں سے ہے (یعنی اس کی کچھ حقیقت نہیں)۔‘‘[المجموع(۲۵۳/۵)]

رہا نجاشی کے ساتھ خاص ہونا تو یہ بات اس لیے درست نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل امت کے لیے نمونہ ہے۔ہاں اگر کسی عمل کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود وضاحت فرما دی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہے تو الگ بات ہے اور یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی صراحت نہیں فرمائی۔بعض حضرات فرماتے ہیں کہ صرف اس شخص کی غائبانہ نماز جنازہ درست ہے جس کی اس علاقے میں نہ پڑھی گئی ہو جہاں وہ فوت ہوا۔ان کا استدلال ان الفاظ سے ہے جو اس حدیث کی بعض روایات میں آتے ہیں :« اِنَّ اَخًا لَّکُمْ قَدْ مَاتَ بِغَیْرِ اَرْضِکُمْ » ’’تمھارا بھائی تمھارے علاقے سے باہر فوت ہوگیا ہے۔‘‘

ان حضرات کا کہنا ہے کہ نجاشی کی نماز جنازہ وہاں نہیں پڑھی گئی تھی۔ہمارے علم کے مطابق حدیث کے ان الفاظ میں یہ کہیں موجود نہیں کہ نجاشی کی نماز جنازہ وہاں کسی نے نہیں پڑھی تھی۔علاقہ غیر میں فوت ہونے سے یہ بات ضروری نہیں کہ وہاں کوئی بھی مسلمان موجود نہ ہو اور کسی نے بھی نجاشی کی نماز جنازہ نہ پڑھی ہو۔علاقے سے باہر فوت ہونے کی وجہ سے غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کی یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ ہمارے لیے وہاں پہنچنا مشکل ہے۔

میت کی بار بار نماز جنازہ پڑھنا

(سوال) کیا ایک میت کی ایک سے زائد مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے؟

(جواب) ایک میت کی بار بار نماز جنازہ پڑھنا درست ہے۔

① عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے :

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَرَّ بِقَبَرٍ قَدْ دُفِنَ لَيْلًا فَقَالَ مَتٰى دُفِنَ هٰذَا ؟ فَقَالُوْا الْبَارِحَةَ قَالَ اَ فَلَا آذَنْتُمُوْنِيْ ؟ قَالُوْا دَفَنَّاهُ فِيْ ظُلْمَةِ اللَّيْلِ فَكَرِهْنَا اَنْ نُوْقِظَكَ فَقَامَ فَصَفَفْنَا خَلْفَهُ فَصَلّٰى عَلَيْهِ » [بخاری، كتاب الجنائز: باب صفوف الصبيان مع الرجال في الجنائز (١٣٢١)]

’’بلاشبہ رسول اللہ ﷺ ایسی قبر کے پاس سے گزرے جس میں میت کو رات کے وقت دفن کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’یہ کب دفن کیا گیا؟‘‘ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ’’کل رات۔‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی ؟‘‘ انھوں نے کہا: ’’ہم نے اسے رات کی تاریکی میں دفن کیا ہے اور آپ کو بیدار کرنا ہم نے مناسب نہیں جانا۔‘‘ آپ ﷺ کھڑے ہوئے، ہم نے آپ ﷺ کے پیچھے صف باندھی اور آپ ﷺ نے اس پر نماز جنازہ ادا کی۔‘‘

(۲) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ امْرَاَةً سَوْدَاءَ كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ اَوْ شَابًّا فَفَقَدَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَسَأَلَ عَنْهَا اَوْعَنْهُ فَقَالُوْا مَاتَ قَالَ أَ فَلَا كُنْتُمْ اٰذَنْتُمُوْنِيْ؟ قَالَ فَكَاَنَّهُمْ صَغَّرُوْا اَمْرَهَا اَوْ اَمْرَهُ فَقَالَ دُلُّوْنِيْ عَلٰى قَبْرِهٖ فَدَلُّوْهُ فَصَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ قَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰى اَهْلِهَا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِيْ عَلَيْهِمْ » [مسلم، كتاب الجنائز: باب الصلاة على القبر (٩٥٦)]

’’ایک سیاہ فام عورت یا مرد مسجد میں جھاڑو دیتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے گم پایا تو اس کے بارے میں پوچھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بتایا: ’’وہ فوت ہو گیا ہے۔‘‘ آپ ﷺ نے کہا: ’’تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟‘‘ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گویا اس معاملے کو چھوٹا سمجھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’مجھے اس کی قبر کے متعلق خبر دو۔‘‘ انھوں نے رہنمائی کی۔ آپ ﷺ نے اس پر نماز جنازہ ادا کی پھر فرمایا: ’’یہ قبریں اپنے اہل پر تاریکی سے بھری ہوتی ہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ ان پر میری نماز کی وجہ سے روشنی کر دیتا ہے۔‘‘

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک بار نمازِ جنازہ ادا کرنے کے بعد نبی ﷺ نے اپنے صحابہ سمیت دوبارہ بھی اسی میت کی نماز جنازہ پڑھی۔ لہٰذا بار بار نماز جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن الملک فرماتے ہیں:

” وَ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ...... ذَهَبَ الشَّافِعِيُّ اِلٰى جَوَازِ تَكْرَارِ الصَّلَاةِ عَلَى الْمَيِّتِ “ [مرقاة المفاتيح (١٤٧/٤)]

’’اس حدیث کی بنا پر امام شافعی رحمہ اللہ میت پر نماز جنازہ کے تکرار کے جواز کی طرف گئے ہیں۔‘‘

امام ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’ہم نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے قرظہ بن کعب کو ایک جنازہ پڑھانے کا حکم دیا جس پر ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھی جا چکی تھی۔‘‘ [الأوسط لا بن المنذر (٤١٢/٥)، ابن ابی شیبة

(۲۳۹/۳)، عبدالرزاق(۶۵۴۳)]

حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب قبر پر نماز جنازہ ثابت ہوگئی تو جب میت قبر سے باہر ہو تو اس وقت بطریق اولیٰ ثابت ہوگی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ ہے اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ''میرے نماز پڑھنے سے اللہ ان کی قبریں روشن کر دیتا ہے۔'' مگر ان لوگوں کی دوہری غلطی ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''جس مسلمان کی نماز جنازہ میں چالیس آدمی توحید والے شریک ہو جائیں اللہ تعالیٰ اس کے حق میں ان کے سفارش قبول کرے گا۔'' تو کیا اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ چالیس سے کم افراد نماز جنازہ نہ پڑھیں۔ نیز زکوٰۃ کے بارے میں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''ان کے مالوں سے صدقہ لو۔ تاکہ اس صدقے کے ذریعے تو ان کا ظاہر و باطن پاک کرے اور ان کے لیے دعا کرو، بلاشبہ تیری دعا ان کے لیے تسلی ہے۔''

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ لینا آپ ﷺ ہی کا خاصہ ہے کیونکہ آپ ﷺ کی دعا ان کے لیے تسلی ہے کسی اور کی نہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جو لوگ زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تھے انھوں نے بھی یہی آیت پیش کر کے کہا تھا کہ زکوٰۃ کا حکم رسول اللہ ﷺ کی حیات تک تھا اب نہیں۔ اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تلوار اٹھائی۔ لہٰذا اس قسم کے دلائل سے خاصہ ثابت نہیں ہوا کرتا بلکہ کوئی واضح دلیل ہونی چاہیے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پیچھے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی نماز جنازہ پڑھی، اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ نہیں بلکہ عام ہے۔''[فتاویٰ اہل حدیث (۴۶۱/۲، ۴۶۲)]

لہٰذا اگر نماز جنازہ دوبارہ پڑھ لی جائے تو کوئی حرج نہیں بار بار نماز جنازہ پڑھنا درست ہے۔

نماز جنازہ میں قہقہہ ناقض وضو نہیں؟

سوال کیا نمازِ جنازہ میں قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ قرآن و حدیث سے کی رو سے مسئلہ بتا دیں۔

جواب احناف کے نزدیک نواقض وضو میں سے قہقہہ بھی ہے اور یہ صرف رکوع و سجود والی نماز کے ساتھ خاص ہے، نماز جنازہ میں چونکہ رکوع و سجود نہیں اس لیے اگرچہ اس سے گریز کرنا چاہیے تاہم جنازے میں اگر کوئی شخص زور زور سے ہنسے تو شریعت کی نظر میں اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا۔ فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب قدوری (ص/۲۰) میں ہے:

'' وَ الْقَهْقَهَةُ فِي كُلِّ صَلَاةٍ ذَاتِ رُكُوعٍ وَ سُجُودٍ ''

''ہر رکوع اور سجدے والی نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔''

قدوری میں بین السطور لکھا ہے:

'' اُحْتُرِزَ بِهِ عَنْ صَلَاةِ الْجَنَازَةِ وَ سَجْدَةِ التِّلَاوَةِ ''

”رکوع اور سجدے کی قید لگا کر نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت سے احتراز کیا گیا ہے۔“

اگر کہا جاتا کہ قہقہہ سے نماز ٹوٹ جاتی ہے تو درست تھا مگر کہا یہ گیا کہ نماز میں قہقہہ سے نماز کے ساتھ ساتھ وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے، بالکل غلط اور بے دلیل بات ہے۔ احناف جو روایات پیش کرتے ہیں وہ ضعیف ہیں اور حاشیہ قدوری میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ یہ روایتیں مرسل ہیں اور مرسل محدثین کے ہاں ضعیف کی اقسام سے ہے۔

غروب کے وقت نماز جنازہ ادا کرنا

سوال کیا سورج غروب ہوتے وقت نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« ثَلَاثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَنْهَانَا اَنْ نُصَلِّيَ فِيْهِنَّ اَوْ اَنْ نَقْبُرَ فِيْهِنَّ مَوْتَانَا حِيْنَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَازِغَةً حَتّٰى تَرْتَفِعَ وَ حِيْنَ يَقُوْمُ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ حَتّٰى تَمِيْلَ الشَّمْسُ وَحِيْنَ تَضَيَّفُ الشَّمْسُ لِلْغُرُوْبِ حَتّٰى تَغْرُبَ » [مسلم، كتاب صلاة المسافرين و قصرها باب الأوقات التي نهى عن الصلاة فيها(٨٣١)، ابوداؤد(٣١٩٢)، نسائي(٥٦١)، ترمذي(١٠٣٠)، ابن ماجه(١٥١٩)، ابو عوانة(٣٨٦/١)، بيهقي(٣٢/٤)، مسند طيالسي(١٠٠١)، مسند احمد(١٥٢/٤)]

”تین اوقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھنے اور مردے دفن کرنے سے منع فرمایا ہے، جب سورج واضح طور پر طلوع ہو رہا ہو، یہاں تک کہ بلند ہو جائے، جب دوپہر کے وقت عین سر پر ہو حتیٰ کہ ڈھل جائے اور جس وقت غروب ہونے کے لیے مائل ہو رہا ہو حتیٰ کہ غروب ہو جائے۔“

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” وَ لَا تَجُوْزُ الصَّلَاةُ عَلَى الْجَنَازَةِ فِي الْاَوْقَاتِ الثَّلَاثَةِ الَّتِيْ تَحْرُمُ الصَّلَاةُ فِيْهَا اِلَّا لِضُرُوْرَةٍ لِحَدِيْثِ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ “ [احكام الجنائز و بدعها(ص/١٦٥)]

”جن تین اوقات میں نماز ادا کرنا حرام ہے ان میں نماز جنازہ ادا کرنا جائز نہیں سوائے ضرورت کے، عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے۔“

محمد بن ابی حرملہ کہتے ہیں:

”زینب بنت ابی سلمہ فوت ہو گئیں اور اس زمانے میں مدینہ کے حاکم طارق تھے۔ نماز صبح کے بعد ان کا جنازہ لایا گیا اور بقیع میں رکھا گیا اور طارق صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھاتے تھے۔ ابن ابی حرملہ کہتے ہیں میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سنا وہ زینب کے گھر والوں سے کہتے تھے: ”یا تو تم نماز جنازہ اب پڑھ لو یا اسے لیٹ کر دو، یہاں تک کہ سورج بلند ہو جائے۔“ [بيهقي، كتاب الجنائز : باب من كره الصلاة والقبر في الساعات الثلاث(٣٢/٤)، مؤطا مترجم (ص/١٨٨)]

نماز جنازہ عصر کے بعد اور صبح کے بعد پڑھی جائے ،جب یہ دونوں نمازیں اپنے وقت میں پڑھی جائیں یعنی صبح اندھیرے میں پڑھی جائے اور عصر آفتاب زرد ہونے سے پہلے پڑھی جائے۔زیاد کو علی رضی اللہ عنہ نے خبر دی:

" اَنَّ جَنَازَةً وُضِعَتْ فِیْ مَقْبَرَةِ اَهْلِ الْبَصْرَةِ حِيْنَ اصْفَرَّتِ الشَّمْسُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهَا حَتّٰى غَرُبَتِ الشَّمْسُ فَاَمَرَ اَبُوْ بَرْزَةَ الْمُنَادِیَ فَنَادٰی بِالصَّلَاةِ ثُمَّ اَقَامَهَا فَتَقَدَّمَ اَبُوْ بَرْزَةَ فَصَلّٰی بِهِمُ الْمَغْرِبَ وَ فِی النَّاسِ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ وَ اَبُوْ بَرْزَةَ مِنَ الْاَنْصَارِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ صَلُّوْا عَلَی الْجَنَازَةِ " [بیہقی(٤/٣٢)]

''اہل بصرہ کے قبرستان میں سورج کے زرد ہونے کے وقت ایک جنازہ رکھا گیا، اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے مؤذن کو حکم دیا کہ وہ نماز کے لیے اذان کہے۔ اس نے اذان کہی پھر اقامت کہی، ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر انھیں مغرب کی نماز پڑھائی اور لوگوں میں انس بن مالک اور ابو برزہ رضی اللہ عنہما انصاری موجود تھے پھر انھوں نے نماز جنازہ پڑھی۔''

عبدالرحمٰن بن حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف فرماتے ہیں:

" وَ اُتِیَ بِجَنَازَةِ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ بَعْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ فَسَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِكُمُ الْآنَ وَ اِلَّا فَاَخِّرُوْا حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ " [الأوسط لابن المنذر(٥/٣٩٦)]

''رافع بن خدیج کا جنازہ نماز فجر کے بعد لایا گیا، میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کہتے ہوئے سنا:''اپنے ساتھی پر اب نماز جنازہ پڑھ لو وگرنہ اسے لیٹ کر دو حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جائے۔''

مذکورہ بالا احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج جب نکل رہا ہو یا عین سر پر ہو یا غروب ہونے کے قریب ہو تو نماز جنازہ وغیرہ ادا نہیں کرنا چاہیے۔ امام احمد، امام اسحاق، امام مالک، امام اوزاعی، امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ وغیرہم ائمہ کا یہی نقطہ نظر ہے۔[دیکھیے : تحفة الأحوذی(٤/١٠٢)]

جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''جن اوقات میں نماز مکروہ ہے ان میں نماز جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔'' [تحفة الأحوذی(٤/١٠٢)]

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کہا جائے کہ نماز جنازہ بھی تو نماز ہے اور ان اوقات میں ہر نماز منع ہے تو امام شافعی رحمہ اللہ نے کیسے کہہ دیا ہے کہ ان اوقات میں نماز جنازہ ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ان اوقات میں ہر نماز منع نہیں بلکہ صرف وہ نمازیں منع ہیں جن کے لیے کوئی سبب نہیں اور جو اسباب والی نمازیں ہیں وہ ان اوقات میں جائز ہیں اور نماز جنازہ اسباب والی نمازوں میں سے ہے۔''[تحفة الأحوذی (٤/١٠٣)]

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان تین اوقات میں لوگوں نے نماز جنازہ ادا کرنے اور میت کو دفن کرنے کے جواز میں اختلاف کیا ہے۔ اکثر اہل علم اس طرف گئے ہیں کہ ان اوقات میں نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ یہی قول عطا، نخعی، اوزاعی، ثوری، اہل الرائے، احمد اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک دن یا رات کے کسی بھی وقت میں نماز اور میت کی تدفین درست ومباح ہے اور جماعت کا قول حدیث کی موافقت کی وجہ سے اولیٰ ہے۔'' [معالم السنن (٤/٣٢٧)]

امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے بھی اسی بات کو قبول کیا ہے۔[الأوسط لابن المنذر(٥/٣٩٦)]

اور راقم کے نزدیک بھی یہی بات زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ اس کی تائید عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم)

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بعد نماز عصر اور بعد نماز فجر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ ہاں آفتاب طلوع ہونے کے وقت اور غروب ہونے کے وقت اور ٹھیک دوپہر کو آفتاب کے کھڑے ہونے کے وقت نماز جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے۔'' [کتاب الجنائز: ٤٨]

WWW. KITABOSUNNAT. COM

تدفین کا بیان

WWW. KITABOSUNNAT.COM

میت کو قبر میں اتارنا

(سوال) میت کو قبر میں اتارنے کے مسنون طریقہ سے آگاہ فرما دیں؟

(جواب) میت کو قبر میں اتارنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ میت کو پاؤں کی جانب سے قبر میں اتارا جائے۔ ابو اسحاق روایت کرتے ہیں:

« اَوصَی الْحَارِثُ اَنْ یُصَلِّیَ عَلَیْهِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ یَزِیْدَ فَصَلّٰی عَلَیْهِ ثُمَّ اَدْخَلَهُ الْقَبْرَ مِنْ قِبَلِ رِجْلَیِ الْقَبْرِ وَ قَالَ هٰذَا مِنَ السُّنَّةِ » [ابو داؤد، کتاب الجنائز: باب فی المیت یدخل من قبل رجلیه (۳۲۱۱) بیهقی(۵٤/٤)، ابن ابی شیبة(۳۲۸/۳)]

”حارث نے وصیت کی کہ ان کی نماز جنازہ عبد اللہ بن یزید رضی اللہ عنہ پڑھائیں۔ انھوں نے اس کی نماز جنازہ پڑھی، پھر ان کو قبر میں پاؤں کی طرف سے داخل کیا اور فرمایا: ”یہ سنت میں سے ہے۔“

اس حدیث کے بارے میں امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ” یہ سند صحیح ہے اور یہ سنت میں سے ہے اور مسند حدیث کی طرح ہے۔“

صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی امر کے بارے میں یوں کہنا کہ یہ سنت میں سے ہے، اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” وَ اَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ لَا یَقُوْلُوْنَ السُّنَّةُ اِلَّا لِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی “[کتاب الأم(۲٤۰/۱)]

” نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت کا لفظ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر بولتے ہیں، ان شاء اللہ۔“

امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے روایت ہے:

” کُنْتُ مَعَ اَنَسٍ فِیْ جَنَازَةٍ فَاَمَرَ بِالْمَیِّتِ فَاُدْخِلَ مِنْ قِبَلِ رِجْلَیْهِ “ [ابن ابی شیبة(۳۲۷/۳)، مسند احمد(٤۲۹/۱)]

’ میں ایک جنازے میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، انھوں نے میت کے متعلق حکم دیا تو وہ پاؤں کی جانب سے قبر میں داخل کی گئی۔“

عمرو بن مہاجر سے روایت ہے: ''عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا بیٹا جب فوت ہوا تو انھوں نے بھی پاؤں کی طرف سے قبر میں داخل کرنے کا حکم دیا۔'' [ابن ابی شیبة(٣٢٨/٣)]

سنن ابن ماجہ میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو قبلہ کی طرف سے قبر مبارک میں رکھا گیا لیکن یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس میں عطیہ عوفی راوی ضعیف ہے۔[ابن ماجه، كتاب الجنائز: باب ما جآء في إدخال الميت القبر(١٥٥٢)]

مندرجہ بالا صحیح آثار سے معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں پاؤں کی جانب سے اتارنا مسنون ہے۔

میت کو قبر میں اتارنے والا کیا کہے؟

سوال میت کو قبر میں اتارنے والے شخص اگر کوئی مسنون دعائیں پڑھنا چاہیں تو وہ کیا ہیں؟

جواب سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جب تم اپنے مردوں کو قبر میں اتارو تو کہو:« بِسْمِ اللّٰهِ وَ عَلٰى سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ » اور ایک روایت میں ہے: «بِسْمِ اللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ » [ابوداؤد، كتاب الجنائز: باب في الدعاء للميت إذا وضع في قبره (٣٢١٣)، ابن ماجه (١٥٥٠)، ترمذی (١٠٤٦)، صحيح ابن حبان (٧٧٣)، حاكم (٣٦٦/١)، بيهقی (٥٥/٤)، احمد (٢٧/٢۔٤٠)]

ایک اور روایت میں ہے:

« اَلْمَيِّتُ اِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهِ فَلْيَقُلِ الَّذِيْنَ يَضَعُوْنَهُ حِيْنَ يُوْضَعُ فِي اللَّحْدِ : بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ » [حاكم (٣٦٦/١)]

''جب میت کو قبر میں رکھا جائے تو اسے لحد میں رکھتے وقت قبر میں اتارنے والے لوگ کہیں:« بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ »۔''

ان روایات سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں اتارنے والے حضرات یہ دعا پڑھیں کیونکہ یہی مسنون ہے۔

تدفین کے بعد میت کو کلمہ پڑھنے کی تلقین کرنا

سوال کیا مرنے کے بعد میت کو کلمہ پڑھنے کی تلقین کرنا ثابت ہے؟ وضاحت سے جواب عنایت فرمادیں؟

جواب جب کوئی موحد مسلمان فوت ہو جائے تو اسے قبر میں دفن کرنے کے بعد اس کے حق میں حساب کی آسانی اور ثابت قدمی کیلئے دعا کرنا مسنون ہے۔ رسول کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی معمول تھا۔ جیسا کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو کہتے: ''اپنے بھائی کے لیے بخشش کی دعا

کرو اور اس کیلئے ثابت قدمی کا سوال کرو کیونکہ اب اس سے سوال کیا جا رہا ہے۔" [ابو داؤد، کتاب الجنائز: باب الاستغفار عند القبر للمیت فی وقت الانصراف (۳۲۲۱)، مستدرك حاكم (۱/۳۷۰)، بیهقی (۵٦/٤)]

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مولانا شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فِي الْحَدِيْثِ مَشْرُوْعِيَّةُ الْإِسْتِغْفَارِ لِلْمَيِّتِ عِنْدَ الْفَرَاغِ مِنْ دَفْنِهِ وَ سُؤَالُ التَّثْبِيْتِ لَهُ لِأَنَّهُ يُسْئَلُ فِيْ تِلْكَ الْحَالِ " [عون المعبود (۲۰۹/۳)]

"اس حدیث سے میت کے لیے اس کے دفن سے فارغ ہوتے وقت بخشش کی دعا کرنے کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے اور اس کے لیے ثابت قدمی کا سوال کرنا بھی۔ اس لیے کہ اس سے اسی حالت میں سوال کیا جاتا ہے۔"

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ میت کو کلمہ شہادت اور سوال و جواب کی تلقین کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ اسی حدیث کی شرح میں مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس حدیث میں میت کے دفن سے فارغ ہونے کے وقت دعا کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے اور اس کے لیے ثابت قدمی کا سوال کرنا اور بلا شبہ زندوں کی دعا مردوں کو نفع دیتی ہے۔ اس حدیث میں دفن کے وقت تلقین کے بارے میں کوئی دلیل موجود نہیں جیسا کہ شافعیہ کے ہاں تلقین کی عادت ہے اور نہ کوئی مرفوع صحیح حدیث تلقین کے بارے میں موجود ہے اور ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں جو روایت بیان کی گئی ہے وہ ضعیف اور ناقابل حجت ہے۔"
[مرعاة المفاتيح (۱/۲۳۰)]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"آپ ﷺ قبر کے پاس قراءت کے لیے نہیں بیٹھتے تھے اور نہ میت کو تلقین کرتے تھے جیسا کہ لوگ آج کرتے ہیں۔" [زاد المعاد (۱/۵۲۳)]

اس ضمن میں ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے جو مروی روایت پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سعید بن عبد اللہ الاودی نے کہا: "میں ابوامامہ کے پاس حاضر ہوا، وہ حالت نزع میں تھے، انھوں نے فرمایا: "جب میں مر جاؤں تو میرے ساتھ ایسا معاملہ کرنا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب تمھارا کوئی بھائی مر جائے تو تم اس کی قبر پر مٹی برابر کر چکو تو تم میں سے کوئی ایک اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہو جائے، پھر کہے: "اے فلاں ابن فلانی!" وہ سن رہا ہوتا ہے لیکن جواب نہیں دیتا پھر کہے: "اے فلاں ابن فلانی!" تو وہ اٹھ کر برابر بیٹھ جاتا ہے پھر کہے: "اے فلاں ابن فلانی! تو وہ کہتا ہے: "ہماری رہنمائی کرو، اللہ تیرے اوپر رحم کرے" لیکن تم سمجھتے نہیں پھر کہے: "وہ بات یاد کر جس پر تو دنیا سے گیا تھا یعنی "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی شہادت۔" اور اسے کہا جائے: "بے شک تو اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر، محمد ﷺ کے نبی ہونے پر اور قرآن کے امام ہونے پر راضی تھا۔" اس لیے کہ منکر و نکیر میں سے ہر ایک اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے: "آ میرے ساتھ چل، ہم اس کے پاس نہیں بیٹھیں گے۔ جسے اس کی دلیل و حجت و تلقین کی گئی تو پھر ان دونوں کے ماوراء اللہ تعالیٰ اس کا

جج بن جاتا ہے۔'' ایک آدمی نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اگر اس کی ماں کو نہ جانتا ہو تو پھر؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو حوا کی طرف منسوب کر کے کہے: ''اے فلاں ابن حوا۔''

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''اسے طبرانی نے ''المعجم الکبیر'' میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں راویوں کی ایک جماعت ہے جنھیں میں نہیں پہچانتا۔'' [مجمع الزوائد (٤٨/٣)]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث مرفوعا ثابت نہیں۔'' [زاد المعاد (٥٢٣/١٠)]

امام صنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ائمہ محققین کے کلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اس پر عمل بدعت ہے۔ آپ ان لوگوں کی کثرت سے دھوکا مت کھائیں جو یہ کرتے ہیں۔'' [سبل السلام(٧٧٣/٢)]

امام نووی رحمہ اللہ نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ [المجموع(٣٠٤/٥)]

حافظ عراقی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [إحياء العلوم(٤٢٠/٤)]

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے منکر قرار دیا ہے۔ [سلسلة الاحاديث الضعيفة(٦٤/٢)، (٥٩٩)]

اسی طرح قبر پر تلقین کے لیے مندرجہ ذیل روایت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ »[مسلم، كتاب الجنائز: باب تلقين الموتٰى لا اله الا الله(٩١٦)]

''اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو۔''

یہ روایت مفصل طور پر صحیح ابن حبان میں موجود ہے، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس سے مراد قریب الموت شخص کو ''لا الہ الا اللہ'' کی تلقین کرنا ہے تاکہ اس کی موت کلمہ توحید پر آئے۔ سیدنا ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عِنْدَ الْمَوْتِ دَخَلَ الْجَنَّةَ يَوْمًا مِّنَ الدَّهْرِ وَ اِنْ اَصَابَهُ قَبْلَ ذٰلِكَ مَا اَصَابَهُ »[صحيح ابن حبان(٧١٩)، الموارد)]

''اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو، جس کا آخری کلام موت کے وقت لا الہ الا اللہ ہوا وہ کبھی نہ کبھی جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اس کو اس سے قبل جو مصیبت پہنچنی ہوگی پہنچے گی۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ « لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ » والی حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے مرنے کے بعد اسے دفن کر کے لا الہ الا اللہ کی تلقین کی جائے بلکہ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب انسان قریب المرگ ہو تو اسے لا الہ الا اللہ پڑھنے کو کہا جائے تاکہ اس کے جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ بن جائے۔

رسول کریم ﷺ کے عمل سے بھی قریب المرگ آدمی کو لا الہ الا اللہ کہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنی النجار کے ایک آدمی کی عیادت کے لیے گئے تو آپ ﷺ نے اسے کہا: ''لا الہ الا اللہ کہو۔'' اس نے کہا: ''کیا لا الہ الا اللہ کہنا میرے لیے بہتر ہے؟'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!'' [مسند احمد (١٥٢/٣، ١٥٤)،یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔]

مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ اَمَّا قَوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَالْمُرَادُ عِنْدَ الْمَوْتِ لَا عِنْدَ دَفْنِ الْمَيِّتِ " [مرعاة المفاتيح(۱/۲۳۰)]

" نبی کریم ﷺ کے فرمان " اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو" کا مطلب موت کے وقت ہے نہ کہ میت کو دفن کرنے کے وقت۔"

اس لیے کہ لا الہ الا اللہ کو جانتے ہوئے دنیا سے گیا تو جنت میں داخل ہوگیا، مرنے کے بعد لا الہ الا اللہ کی تلقین مفید نہیں ہوگی۔ مندرجہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد میت کو دفن کر کے قبر پر تلقین کا ثبوت کسی بھی صحیح حدیث سے نہیں ملتا۔ شوافع کے ہاں جو اس کو مستحب کہا گیا ہے اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں۔ ہمارے ہاں جو لوگ یہ تلقین کرتے ہیں وہ حنفی ہیں اور حنفی مذہب میں بھی اس کا کوئی جواز نہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

" تلقین کی صورت یہ ہے کہ حالت نزع کے وقت موت کے غرغرے سے پہلے اونچی آواز میں اس کے پاس کہا جائے، جسے وہ سن لے " اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ " یہ نہ کہا جائے کہ کلمہ پڑھ (بلکہ صرف پڑھا جائے) اور یہ جو تلقین موت کے بعد ہوتی ہے ہمارے نزدیک ظاہر الروایۃ وہ نہ کی جائے جیسا کہ عینی شرح الهدایۃ اور معراج الدرایۃ میں ہے۔" [فتاوىٰ عالمگيرى(۱/۱۵۷)]

علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" اس تلقین سے مقصود " میت کا آخری کلام کلمہ شہادت ہو" یہ قبر کے اوپر تلقین کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: " جس شخص کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوا وہ جنت میں داخل ہوگیا۔" یہ تلقین جو مرنے کے بعد ہوتی ہے وہ ہمارے نزدیک ظاہر الروایۃ میں جائز نہیں۔" [البناية فى شرح الهداية(۳/۲۰۷)]

علامہ علاء الدین الکاسانی الحنفی لکھتے ہیں:

" قریب المرگ کو کلمہ شہادت کی تلقین نبی ﷺ کے فرمان کی وجہ سے کی جائے کہ اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو۔ میت سے مراد یہاں وہ شخص ہے جس پر جان کنی کا وقت ہو اس لیے کہ اس کی موت قریب ہے۔ اسے میت قریب الموت ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے۔" [بدائع الصنائع(۱/۴۴۳)]

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ یہ عمل کتاب وسنت کے علاوہ فقہ حنفیہ کی ظاہر الروایۃ کے اعتبار سے بھی ثابت نہیں لہٰذا جو بھی اس پر عمل کرتے ہیں وہ قرآن وسنت کی مخالفت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی بھی مخالفت کر رہے ہیں۔

قبروں کے مسائل کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

قبر پر قرآن پڑھنا

سوال قبروں پر قرآن مجید پڑھنا کیا کسی حدیث سے ثابت ہے؟

جواب میت کی تدفین کے بعد قبر پر جا کر قرآن خوانی کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ مثلاً سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب قبرستان والوں کے لیے کچھ کہنے کا سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک دعا سکھائی، قرآن پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس بات کی مزید تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے:

« لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ مَقَابِرَ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِیْ تُقْرَأُ فِيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ »

[مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا: باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیته و جوازھا فی المسجد(۷۸۰)]

''اپنے گھروں کو قبریں مت بناؤ، بے شک شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان سورۂ بقرہ پڑھنے کی جگہ نہیں۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے:

« صَلُّوْا فِیْ بُيُوْتِكُمْ وَ لَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا »[مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا: باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیته و جوازھا فی المسجد (۷۷۷)]

''اپنے گھروں میں نماز پڑھو اور انھیں قبریں نہ بناؤ۔''

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قبرستان میں نماز نہیں پڑھی جا سکتی اسی طرح قرآن بھی نہیں پڑھا جائے گا۔ لہٰذا یہ عمل جو آج کل عوام میں رائج ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

میت کے لیے دعا کا حکم

سوال کیا میت کے لیے دعا کی غرض سے قبر پر کھڑا ہونا یا بیٹھنا درست ہے؟

جواب زیارت قبور شرعاً جائز ہے اور اس کا مقصود فکر آخرت ہے تاکہ آدمی قبرستان میں حاضر ہو کر عبرت پکڑے کہ دنیا کی یہ چند روزہ زندگی ختم ہو جانی ہے اور میں اس حیات مستعار میں اپنی اخروی زندگی کے لیے ایسے اعمال صالحہ سرانجام دے لوں کہ وہاں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ جب بھی کوئی آدمی قبرستان میں جائے تو اسے چاہیے کہ آخرت یاد کرے اور مرنے والوں کے لیے بخشش کی دعا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« قَدْ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ قَدْ أُذِنَ لِمُحَمَّدٍ فِي زِيَارَةِ قَبْرِ أُمِّهِ فَزُورُوهَا فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ »[ترمذى ، كتاب الجنائز : باب ما جآء فى الرخصة فى زيارة القبور (١٠٥٤)، مسلم (٩٧٧)]

''میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ اب محمد (ﷺ) کو اپنی ماں کی قبر پر جانے کی اجازت مل گئی، لہٰذا تم اب قبروں کی زیارت کرو، یہ آخرت یاد دلاتی ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے قبرستان جا کر یہ دعا پڑھنے کے لیے بتلائی:

« اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَلَاحِقُوْنَ أَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ »[مسلم ، كتاب الجائز: باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها(٩٧٥)]

''اس بستی کے رہنے والے مومنو! اور مسلمانو! تم پر سلامتی ہو اور بے شک ہم اگر اللہ نے چاہا تو تمھارے ساتھ ملنے والے ہیں، ہم اللہ سے اپنے لیے اور تمھارے لیے عافیت طلب کرتے ہیں۔''

عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو قبر پر کھڑے ہو کر کہتے: «إِسْتَغْفِرُوْا لِأَخِيْكُمْ وَ اسْأَلُوْا لَهُ بِالتَّثْبِيْتِ فَإِنَّهُ يُسْأَلُ» ''اپنے بھائی کے لیے بخشش کی دعا کرو اور اس کے لیے ثابت قدمی مانگو، اس سے اب سوال کیا جا رہا ہے۔'' (ابوداؤد ، كتاب الجنائز : باب الاستغفار عند القبر للميت فى وقت الانصراف (٣٢٢١)، حاكم (٣٧٠/١)]

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان جا کر ان کے لیے بخشش کی دعا کرے اور اللہ تعالیٰ سے عافیت وتثبیت کا سوال کرے۔ یاد رہے کہ مردوں کے لیے بخشش کی دعا کا تو جواز ہے لیکن مردوں سے حاجتیں مانگنا، مرادیں پوری کروانا، نفع و نقصان کے حصول کے لیے فریاد کرنا، ان کے نام پر قبروں کے نزدیک جانور ذبح کرنا' نذرونیاز دینا اور چڑھاوے چڑھانا ناجائز وحرام ہیں، ان کے جواز کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔

جو لوگ قبرستان میں جا کر ان سے حاجات طلب کرتے ہیں اور انھیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پکارتے ہیں، ان سے اولادیں طلب کرتے اور رزق مانگتے ہیں، انھیں اپنی آفات وبلیات میں غائبانہ پکارتے ہیں، وہ صریح شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جو زیارت قبور کو جاتی ہیں ان کا کثرت کے ساتھ قبروں کی زیارت کرنا اللہ کی لعنت کا حق دار ٹھہرنا ہے۔ پھر وہاں جا کر جو خلاف شرع امور سرانجام دیتی ہیں اور جعلی پیروں کے سامنے بے حجاب آتی جاتی ہیں، یہ بھی بالکل حرام اور ناجائز ہے۔ لہٰذا قبرستان جا کر مسنون عمل کے سوا کوئی کام نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ تمام اہل توحید زندہ ومردہ، مرد وزن، چھوٹے بڑوں کو معاف فرمائے اور درجات کی بلندی کرے اور جنت الفردوس میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں جگہ دے۔ (آمین!)

میت کے سرہانے سورۂ بقرہ پڑھنا

سوال ہمارے ہاں کسی مردہ کو دفن کرنے کے بعد قبر کے سرہانے سورۂ بقرہ کا پہلا رکوع اور قبر کی پائنی کی جانب سورۂ بقرہ کا

آخری رکوع پڑھنا رائج ہے، قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ یہ کام جائز ہے یا نہیں؟

جواب میت کو دفن کرنے کے بعد قبر کے سرہانے سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات اور پاؤں کی جانب آخری آیات جو تلاوت کی جاتی ہیں اس کی بنیاد ایک ضعیف روایت پر ہے جو صاحب مشکوٰۃ نے "كتاب الجنائز، باب دفن الميت (۱۷۱۷)" میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: «اِذَا مَاتَ اَحَدُكُمْ فَلَا تَحْبِسُوْهُ وَاَسْرِعُوْا بِهٖ اِلٰى قَبْرِهٖ وَلْيُقْرَأْ عِنْدَ رَاْسِهٖ فَاتِحَةَ الْبَقَرَةِ وَعِنْدَ رِجْلَيْهِ بِخَاتِمَةِ الْبَقَرَةِ» [رواه البيهقي في شعب الايمان وقال: والصحيح انه موقوف عليه]

"جب تم میں سے کوئی آدمی وفات پا جائے تو اس کو روک کر نہ رکھو بلکہ اسے اس کی قبر کی طرف جلدی لے چلو اور اس کے سر کی جانب سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات اور پاؤں کی جانب سورۂ بقرہ کی آخری آیات پڑھی جائیں۔"

اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے اور کہا ہے: "صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔"

صاحب مشکوٰۃ نے امام بیہقی کی شعب الایمان سے روایت نقل کر کے آگے امام بیہقی کا اس پر جو حکم نقل کیا ہے، یہ ہمیں شعب الایمان میں نہیں ملا۔ کیونکہ یہ روایت شعب الایمان میں "باب في الصلوة على من مات من أهل القبلة، فصل في زيارة القبور (۹۲۹۴) (۱۶/۷)" میں موجود ہے، اس پر امام بیہقی نے لکھا ہے: " وَلَمْ يُكْتَبْ اِلَّا بِهٰذَا الْاِسْنَادِ فِيْمَا اَعْلَمُ وَقَدْ رُوِيْنَا الْقِرَاءَةَ الْمَذْكُوْرَةَ فِيْهِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ مَوْقُوْفًا عَلَيْهِ " "میرے علم کے مطابق یہ روایت اسی سند کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اس میں مذکورہ قراءت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت کی گئی ہے۔" اور یہ السنن الکبری بیہقی "باب ماورد في قراءة القرآن عند القبر (۵۶/٤)" میں بھی موجود نہیں ہے۔ یاد رہے کہ یہ مرفوع روایت شعب الایمان کے علاوہ "طبراني كبير (۲/۲۰۸/۲) اور امام خلال کی "كتاب القراءة عند القبور (ق ۲/۲۵)" میں مروی ہے جیسا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے مشکوٰۃ کی تحقیق ثانی (۲/۲۲۳) میں ذکر کیا ہے، اس کی سند میں یحییٰ بن عبداللہ بن الضحاک البابلی ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں "واہٍ" کمزور راوی ہے۔ ازدی کہتے ہیں: "اَلضُّعْفُ عَلٰى حَدِيْثِهٖ بَيِّنٌ" اس کی روایت میں کمزوری واضح ہے۔ ابوحاتم فرماتے ہیں: "لَا يُعْتَدُّ بِهٖ" اسے شمار نہ کیا جائے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں یہ ثقہ راویوں سے مفصل روایت بیان کرتا ہے اور ان میں وہم کا شکار ہو جاتا ہے اور جس روایت میں یہ متفرد ہو اس میں ساقط الاحتجاج ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں اس کی روایت میں ضعف نمایاں ہے۔ [تهذيب التهذيب (۱۵۳/٦)، المغني في الضعفاء (۵۲۱/۲) ميزان الاعتدال (۳۹۰/٤)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ضعیف ہے۔" (تقريب مع تحرير (۹۱/٤) اسی طرح اس کا استاذ ایوب بن نہیک الحلبی مولیٰ آل سعد بن ابی وقاص بھی انتہائی ضعیف ہے۔ اسے ابوحاتم وغیرہ نے ضعیف اور ازدی نے متروک قرار دیا ہے۔ (ميزان الاعتدال (۲۹٤/۱)

امام ذہبی "المغنی فی الضعفاء (۱/۱۵۱) میں لکھتے ہیں: "ترکوہ" محدثین نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ ابن ابی حاتم رازی فرماتے ہیں: "سَمِعْتُ اَبَا زُرْعَةَ يَقُوْلُ : لَا اُحَدِّثُ عَنْ اَيُّوْبَ بْنِ نَهِيْكٍ لَمْ يُقْرَاْ عَلَيْنَا حَدِيْثُهٗ وَقَالَ هُوَ مُنْكَرُ

اُلْحَدِیْثِ " (الجرح والتعدیل (۲/ ۲۵۹) ''میں نے ابوزرعہ رازی سے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ میں ایوب بن نہیک سے روایت بیان نہیں کرتا اس کی روایت انھوں نے ہم پر نہیں پڑھی اور فرمایا وہ منکر الحدیث ہے۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ روایت نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں۔ اب رہا اس کا موقوف ہونا تو یہ موقوفاً بھی صحیح ثابت نہیں۔ امام بیہقی سے صاحب مشکوۃ نے جو اس کا موقوفاً صحیح ہونا نقل کیا ہے، تو امام صاحب نے یہ فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث بجائے مرفوع کے موقوف ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے اس کی موقوف سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ روایت السنن الکبری بیہقی (۴/ ۵۶) میں ''عبدالرحمن بن العلاء بن اللجلاج عن ابیه'' کے طریق سے مروی ہے کہ العلاء بن اللجلاج نے اپنے بیٹوں سے کہا جب تم مجھے میری قبر میں داخل کرنے لگو تو مجھے لحد میں رکھو اور کہو " بِاسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ " اور میرے اوپر مٹی ڈالو اور میرے سر کے نزدیک سورۂ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھو، میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا وہ اسے مستحب سمجھتے تھے۔'' علامہ زیلعی نے نصب الرایہ (۲/ ۳۰۲) میں اور علامہ ہیثمی نے ''مجمع الزوائد (۳/ ۴۴) (۴۲۴۳)'' میں طبرانی کبیر (۲۹/ ۲۲۰) کے حوالے سے یہ روایت درج کی ہے اور اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: ''فَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ذٰلِكَ'' ''میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنی'' اس پر علامہ زیلعی نے سکوت اختیار کیا ہے اور علامہ ہیثمی نے کہا ہے: ''رِجَالُهُ مُوَثَّقُوْنَ'' اس کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے۔

لیکن یہ روایت بھی سند کے اعتبار سے صحیح نہیں کیونکہ اس میں عبدالرحمٰن بن العلاء بن اللجلاج شامی مجہول ہے، اس سے مبشر بن اسماعیل الحلبی کے سوا کسی نے روایت نہیں کی۔ (میزان الاعتدال (۲/ ۵۷۹) حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے تقریب (۳۹۷۵) میں اسے مقبول لکھا ہے اور شعیب ارناؤط نے تحریر تقریب التھذیب (۷/ ۳۴۲) میں کہا ہے کہ یہ مجہول ہے اور اسے روایت کرنے میں مبشر بن اسماعیل الحلبی متفرد ہے۔ شیخ البانی مشکوۃ (۲/ ۲۲۳) تحقیق ثانی میں رقمطراز ہیں: ''والموقوف لایصح اسناده فیه عبد الرحمن بن العلاء بن الجلاج وهو مجهول'' ''موقوف کی سند صحیح نہیں، اس میں عبدالرحمٰن بن العلاء بن الجلاج مجہول ہے۔'' مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ جس روایت کی بنیاد پر سورۂ بقرہ کے پہلے اور آخری رکوع کا پڑھنا رواج ہوا ہے وہ نہ تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کی کوئی صحیح سند موجود ہے اور صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ مَقَابِرَ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي تُقْرَأُ فِيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ »

[مسلم، کتاب صلوة المسافرین : باب استحباب صلوة النافلة فی بیته وجوازها فی المسجد(۷۸۰)]

''اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ یقیناً شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھروں میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے نہ کہ قبرستان میں۔ یہ حدیث بالکل اسی طرح ہے جیسے دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«صَلُّوا فِي بُيُوتِكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوهَا قُبُورًا» (صحيح مسلم، كتاب صلوة المسافرين: باب استحباب صلوة النافلة في بيته (٧٧٧)

''اپنے گھروں میں نماز پڑھو اورانھیں قبریں نہ بناؤ۔''

معلوم ہوا جیسے قبرستان میں نماز نہیں پڑھی جاتی اسی طرح قرآن بھی نہیں پڑھا جائے گا، لہٰذا مذکورہ رواج پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

قبر سے سورۃ الملک پڑھنے کی آواز آنا

(سوال) ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک صحابی نے لاعلمی میں ایک قبر پر خیمہ گاڑ لیا، اندر سے سورۂ ملک پڑھنے کی آواز آئی، صاحب قبر نے اول سے آخر تک اس سورت کی تلاوت کی، آپ رضی اللہ عنہ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر یہ واقعہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ سورت عذاب قبر روکنے والی اور اس سے نجات دینے والی ہے۔'' (ترمذی) کیا یہ حدیث صحیح ہے؟

(جواب) یہ روایت ترمذی شریف ابواب فضائل القرآن: باب ما جاء في فضل سورة الملك (٢٨٩٠) اور مشکوٰۃ (٢١٥٤) اور اثبات عذاب القبر للبيهقي (١٤٦) میں موجود ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: ''تَفَرَّدَ بِهِ يَحْيَى بْنُ عَمْرِو بْنِ مَالِكٍ وَهُوَ ضَعِيفٌ '' ''اس کے بیان کرنے میں یحییٰ بن عمرو بن مالک متفرد ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔''

علامہ سیوطی نے اپنی تفسیر الدر المنثور (٦/٢٦٦)، میں، حاکم، ترمذی، ابن مردویہ، ابن نصر اور دلائل النبوۃ از بیہقی کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے۔) نیز دیکھیں: كتاب الروح (ص/ ١٢٨)، جامع الاصول (٩/٣٦٥)، تحفة الذاكرين از شوكانی (ص/ ٢٧٢)]

اس روایت کے راوی یحییٰ بن عمرو بن مالک النکری البصری کو امام یحییٰ بن معین، امام ابوزرعہ امام ابوداؤد، امام نسائی اور دولابی نے ضعیف کہا ہے اور حماد بن زید نے کذب کی تہمت دی ہے۔ امام عقیلی فرماتے ہیں: ''اس کی روایت کی متابعت نہیں کی جاتی۔'' امام احمد فرماتے ہیں: ''یہ کوئی چیز نہیں ہے۔'' امام ساجی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ منکر الحدیث ہے۔''

[تهذيب التهذيب (٦/١٦٥)، المغني في الضعفاء (٢/٥٢٥)، الحرح والتعديل (٩/٧٣٢)، ميزان الاعتدال (٤/٣٩٩)، الضعفاء الكبير (٤/٤٢)]

لہٰذا یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

پکی قبریں بنانا

(سوال) آج کل پکی قبریں بنانے کا خوب رواج ہے کیا ایسا کرنا شرعی اعتبار سے درست ہے؟

(جواب) پکی قبریں بنانا اسلام میں قطعاً ناجائز ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

« نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَ اَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ وَ اَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ »

[مسلم، کتاب الجنائز: باب النهی عن تجصیص القبر(۹۷۰)، ابو داؤد(۳۲۲۵)]

''رسول اللہ ﷺ نے پختہ قبریں بنانے اور ان پر بیٹھنے اور عمارت تعمیر کرنے سے منع فرمایا ہے۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ پکی قبریں بنانا اور ان پر عمارت تعمیر کرنا ناجائز وممنوع ہے۔

قبروں پر مسجدیں بنانا

(سوال) قبر پر مسجد بنالینا کیسا ہے؟

(جواب) قبروں پر مسجدیں بنانا حرام ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَ النَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ » [بخاری، کتاب الجنائز: باب مایکره من اتخاذ المساجد علی القبور(۱۳۳۰)]

''اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت کرے انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عیسائیوں کے متعلق فرمایا:

''ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہوتا ہے تو یہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے ہیں، یہ اللہ کے نزدیک مخلوق میں سے بدترین لوگ ہیں۔'' [بخاری، کتاب الجنائز: باب بناء المسجد علی القبر(۱۳۴۱)]

امام ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے قبروں کو مسجدیں بنالینا کبیرہ گناہ قرار دیا ہے۔[الزواجر(۱/ ۱۲۰، ۱۲۱)]

قبر کی اونچائی

(سوال) قبر کی اونچائی صحیح حدیث کے مطابق کتنی ہونی چاہیے؟

(جواب) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے لحد (قبر کے ایک طرف جو خلا ہوتا ہے) بنائی گئی، اس پر کچھ اینٹیں نصب کی گئیں اور آپ ﷺ کی قبر زمین سے تقریباً ایک بالشت بلند کی گئی۔ [صحیح ابن حبان(۲۱۶۰)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ قبر سے نکلنے والی مٹی ہی اوپر ڈالی جائے، اسے کوہان نما بنایا جائے اور مزید مٹی ڈال کر اسے اونچا نہ کیا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

عورتوں کا قبرستان جانا

(سوال) عورتوں کا قبرستان جانا کیسا ہے؟

(جواب) نبی کریم ﷺ نے کثرت کے ساتھ قبرستان جانے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔

ابن ماجہ (۱۵۷۴، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶) میں ابو ہریرہ، ابن عباس اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں۔ البتہ اگر صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں، جزع وفزوع اور واویلا نہ کریں، رونے دھونے سے باز رہیں اور شرعی آداب کا لحاظ رکھیں تو پھر کبھی کبھار جانے کی رخصت معلوم ہوتی ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بقیع میں جانا صحیح مسلم (۹۷۴/۱۰۳) اور نسائی (۲۰۳۹) وغیرھما میں موجود ہے، اس سے بھی ائمہ حدیث نے عورت کے لیے زیارت قبر کے جواز کی دلیل لی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو قبرستان میں جا کر دعا کرنا سکھلایا ہے۔ قصہ مختصر عورت کبھی کبھار زیارت قبور کو جا سکتی ہے اگر وہ شرعی پابندیاں ملحوظ خاطر رکھے وگرنہ نہیں اور عصر حاضر میں عورتیں اکثر بن سنور کر قبروں پر جاتی ہیں اور وہاں رونا دھونا اور واویلا بھی کرتی ہیں، اس لیے ان کا زیارت قبور کو جانا درست نہیں، پھر یہ کثرت سے حاضری دیتی ہیں جو لعنت کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب کرے۔ (آمین!)

جنازہ کے متفرق مسائل کا بیان

WWW. KITABOSUNNAT. COM

میت کو دیکھ کر کھڑے ہونا

(سوال) کیا میت کو دیکھ کر کھڑے ہونا جائز ہے؟

(جواب) نبی ﷺ نے مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست کی جب بنیاد رکھی تو اس کے مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ کئی احکام نازل ہوئے۔ کئی ایسے تھے جن پر پہلے عمل تھا لیکن بعد میں ان میں تغیر وتبدل ہوا۔ مثال کے طور پر پہلے آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، پھر آپ ﷺ کی دلی خواہش پر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اسی طرح شروع میں شراب کی کلی ممانعت نہ تھی لیکن بعد میں اس کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔ اسی طرح پہلے جب آپ ﷺ کے پاس سے کوئی جنازہ گزرتا تو آپ ﷺ اسے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ یہودی اور یہودیہ کی میت کے لیے بھی کھڑے ہوئے۔ جب سے کہا گیا کہ آپ ﷺ یہودی کے جنازہ کے لیے کھڑے ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا اس میں جان نہ تھی۔'' [بخاری، کتاب الجنائز : باب من قام لجنازة یهودی (۱۳۱۱) مسلم (۹۶۱)]

آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی فرمایا:

''جب تم جنازہ دیکھو تو اس کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور جو ساتھ چل رہا ہو، وہ اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک اسے زمین پر نہ رکھ دیا جائے۔'' [بخاری، کتاب الجنائز: باب من تبع جنازة فلا يقعد حتى توضع (۱۳۱)، مسلم (۹۵۹)]

لیکن اس کے بعد نبی ﷺ کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ جیسا کہ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لِجَنَازَةٍ فَقُمْنَا ثُمَّ جَلَسَ فَجَلَسْنَا »[مسلم، کتاب الجنائز: باب نسخ القيام للجنازة (۹۶۲) مسند احمد (۸۳،۸۲/۱) ، ابو داؤد (۳۱۷۵)]

''رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے لیکن پھر بیٹھ گئے تو ہم بھی بیٹھ گئے۔''

اور موطا مالک میں یہ الفاظ ہیں:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يَقُوْمُ فِي الْجَنَائِزِ ثُمَّ جَلَسَ بَعْدُ »[موطا (۲۳۲/۱)]

''رسول اللہ ﷺ (پہلے) جنازے کے لیے کھڑے ہوا کرتے تھے لیکن بعد میں چھوڑ دیا۔''

واقد بن عمرو بن سعد بن معاذ نے کہا: ''میں بنو سلمہ کے ایک جنازہ میں حاضر ہوا، میں کھڑا ہوا تو نافع بن جبیر نے کہا: ''بیٹھ جایے، میں تمھیں عنقریب اس کے متعلق ایک حدیث بتاؤں گا۔'' پھر بیان کیا: ''مجھے مسعود بن الحکم الزرقی نے بتایا کہ

انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں کہتے ہوئے سنا، وہ فرما رہے تھے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَمَرَنَا بِالْقِيَامِ فِي الْجِنَازَةِ ثُمَّ جَلَسَ بَعْدَ ذٰلِكَ وَ اَمَرَنَا بِالْجُلُوْسِ » [احمد (۱/۸۲)، (۶۲۳)، بیهقی (۴/۲۷)، کتاب الاعتبار للحازی (۹۱)]

''آپ ﷺ نے ہمیں جنازہ کے لیے کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا، اس کے بعد آپ ﷺ بیٹھے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔''

ان احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری ''کتاب الجنائز (۴۶)'' اور علامہ البانی رحمہ اللہ ''احکام الجنائز (۷۷)'' میں لکھتے ہیں کہ قیام پہلے مشروع تھا بعد میں منسوخ ہو گیا۔ اور علامہ شوکانی نے امام مالک ، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ کا مذہب نسخ کا نقل کیا ہے جب کہ امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ کا عدم نسخ کا۔ یعنی یہ لوگ نسخ کے قائل نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جواز کے طور پر ہے۔

سوگ کا مسنون طریقہ

سوال یہ جو ہمارے ہاں رائج ہے کہ مردہ کی تدفین کے بعد وارثین مردہ کے گھر کے باہر چٹائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور تعزیت کے لیے آنے والے فاتحہ خوانی کے لیے کہتے ہیں اور تمام حاضرین ہاتھ اٹھا کر فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور اسی طرح تین دن ایسے ہی چٹائیاں بچھا کر بیٹھے رہتے ہیں اور لوگ تعزیت کے لیے آتے رہتے ہیں اور وارثین مردہ تمام کاروبار چھوڑ کر بیٹھ رہتے ہیں، اس کی کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں، نیز کتاب وسنت کی روشنی میں تعزیت اور سوگ کا صحیح طریقہ بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب کسی آدمی کے دنیا سے چلے جانے کے بعد تعزیت کے لیے کسی خاص جگہ، گھر، مسجد اور دارہ (ڈیرا، چوپال، بیٹھک اور مقبرہ) وغیرہ کا تعین کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا:

« كُنَّا نَعُدُّ الْاِجْتِمَاعَ إِلٰى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَ صَنِيْعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهِ مِنَ النِّيَاحَةِ » (مسند احمد (۶۹۰۵) ، ابن ماجه (۱۶۱۲)، المسند الجامع (۴/۴۹۷)

''ہم میت کے دفن کے بعد اہل میت کی طرف اکٹھا ہونا اور کھانا پکانا نوحہ میں سے شمار کرتے تھے۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کے گھر مرگ ہو جائے وہاں اکٹھا ہونا اور کھانا پکانا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نوحہ میں شمار کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کھانا اگرچہ کسی اور نے بھیجا ہو میت والے گھر بیٹھ کر کھانا حرام ہے، دور سے آنے والے مہمان بھلے کھالیں لیکن قریبی محلہ دار گریز کریں اور دیر تک نہ بیٹھا جائے، بلکہ تعزیت کر کے جلدی اٹھ جائے تاکہ اجتماع کی شکل پر اس حدیث کی زد میں نہ آ جائے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ اہل میت کے ہاں بعض امور سے اجتناب کے بارے لکھتے ہوئے کہتے ہیں: '' اَلْاِجْتِمَاعُ لِلتَّعْزِيَةِ فِيْ مَكَانٍ خَاصٍّ كَالدَّارِ اَوِ الْمَقْبَرَةِ، وَالْمَسْجِدِ'' (احکام الجنائز (ص: ۲۰۱)

”کسی خاص مکان جیسے گھر، مقبرہ یا مسجد میں تعزیت کے لیے اجتماع کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔“

پھر اس کے بعد جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ والی مذکورہ حدیث بیان کرتے ہیں اور اس حدیث کی وجہ سے امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ” وَاَكْرَهُ الْمَاتَمَ وَهِيَ الْجَمَاعَةُ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ بُكَاءٌ فَإِنَّ ذٰلِكَ يُجَدِّدُ الْحُزْنَ وَيُكَلِّفُ الْمُؤْنَةَ مَعَ مَا مَضٰى فِيْهِ مِنَ الْاَثَرِ “ (كتاب الام، باب القيام للجنازة (١/٣١٨)

”میں ماتمی اجتماع کو مکروہ سمجھتا ہوں اگرچہ ان کے لیے آہ وبکا نہ ہو کیونکہ یہ چیز غم کو تازہ کرتی ہے اور تکلیف کو بڑھاتی ہے، اس لیے کہ اس بارے حدیث گزر چکی ہے۔“

امام اسحاق بن ابراہیم بن ہانی جو امام احمد ابن حنبل کے اجل تلامذہ میں سے تھے، کہتے ہیں: ”سُئِلَ الْإِمَامُ اَحْمَدُ رَحِمَهُ اللّٰهُ عَنِ الْبَيْتُوْتَةِ عِنْدَ اَهْلِ الْمَيِّتِ قَالَ : اَكْرَهُهُ “(مسائل ابن هانى (٩٦١)

امام احمد سے اہل میت کے ہاں رات بسر کرنے کے بارے سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا: ”میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں۔“

امام رافعی ”شرح الوجیز“ میں تعزیت کے بارے لکھتے ہیں:

”هِيَ سُنَّةٌ وَ يُكْرَهُ الْجُلُوْسُ لَهَا“

”تعزیت کرنا سنت ہے اور اس کے لیے بیٹھنا مکروہ ہے۔“ (روضة الطالبين ٢/ ١٤٤)

امام نووی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

”اَمَّا الْجُلُوْسُ لِلتَّعْزِيَةِ فَنَصَّ الشَّافِعِيُّ وَالْمُصَنِّفُ وَسَائِرُ الْاَصْحَابِ عَلٰى كَرَاهَتِهِ وَنَقَلَهُ الشَّيْخُ اَبُوْحَامِدٍ فِي التَّعْلِيْقِ وَآخَرُوْنَ عَنْ نَصِّ الشَّافِعِيِّ قَالُوْا يَعْنِى بِالْجُلُوْسِ لَهَا اَنْ يُّجْتَمَعَ اَهْلُ الْمَيِّتِ فَيَقْصِدُ هُمْ مَنْ اَرَادَ التَّعْزِيَةَ قَالُوْا بَلْ يَنْبَغِيْ اَنْ يَّنْصَرِفُوْا فِيْ حَوَائِجِهِمْ فَمَنْ صَادَفَهُمْ عَزَّا بِهِمْ وَلَا فَرْقَ بَيْنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ فِيْ كَرَاهَةِ الْجُلُوْسِ لَهَا“(المجموع (٥/٣٠٦)

خلاصہ کلام اس عبارت کا یہ ہے کہ امام شافعی اور صاحب کتاب اور دیگر اصحاب شوافع تعزیت کے لیے بیٹھنا مکروہ سمجھتے تھے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اہل میت اپنی ضروریات اور کاموں میں لگے رہیں اور جو آدمی انھیں ملے ان سے تعزیت کرلیں، مردوں اور عورتوں کے لیے تعزیت کے لیے بیٹھنے کی کراہت میں مجموعی فرق نہیں یعنی تعزیت کی خاطر عورتیں اکٹھی ہوکر بیٹھیں یا مرد دونوں کے لیے مکروہ ہے۔ امام ابوالمظفر ابن ہبیرۃ لکھتے ہیں:

”فَاَمَّا الْجُلُوْسُ لِلتَّعْزِيَةِ فَقَالَ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَاَحْمَدُ هُوَ مَكْرُوْهٌ وَلَمْ نَجِدْ عَنْ اَبِيْ حَنِيْفَةَ نَصًّا فِيْ هٰذَا“ (الافصاح عن معانى الصحاح (١/١٥١)

”تعزیت کے لیے بیٹھنے کو امام مالک، امام شافعی اور امام احمد نے مکروہ قرار دیا ہے اور امام ابوحنیفہ سے اس کے متعلق ہمیں کوئی نص نہیں ملی۔“

مذکورہ توضیح سے معلوم ہوا کہ تعزیت کے لیے جو رواجی طریقہ موجود ہے اس کے بارے کوئی صحیح حدیث، اثر صحابی اور ائمہ

اربعہ وغیرہ سے جواز کہیں بھی مروی نہیں بلکہ ائمہ محدثین کے ہاں یہ مکروہ ہے اور جب مطلق طور پر مکروہ کا لفظ بولا جائے تو حرام ہی مراد ہوتا ہے جیسا کہ کتب فقہ میں مرقوم ہے اور تعزیت کے لیے تین دنوں کا تعین بھی نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں، عوام میں جو یہ روایت متداول ہے: "لَا عَزَاءَ فَوْقَ ثَلَاثٍ" "تین دنوں سے اوپر تعزیت نہیں" اس کی کوئی اصل نہیں اور یہ صحیح حدیث کے بھی خلاف ہے کیونکہ صحیح حدیث میں تین دنوں کے بعد تعزیت ثابت ہے۔ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اَمْهَلَ آلَ جَعْفَرَ ثَلَاثًا اَنْ يَّاتِيَهُمْ ثُمَّ اَتَاهُمْ »[ابوداؤد ، کتاب الترجل: باب فی حلق الرأس (٤١٩٢)، مسند احمد (٢٧٩/٣) (١٧٥٠) طبقات ابن سعد (٣٦/٤، ٣٧)، نسائی کبری (٨٦٠٤)، الآحاد والمثانی (٤٣٤)، سنن النسائی (٥٢٤٢)]

"بے شک نبی ﷺ آل جعفر کے ہاں آنے سے تین دن تک رکے رہے پھر اس کے بعد ان کے ہاں آئے۔"

معلوم ہوا کہ تعزیت کے لیے تین دن خاص نہیں ہیں بلکہ تین دنوں کے بعد بھی جب مناسب خیال کرے تعزیت کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے گھر والوں کے ہاں آنے سے تین دن تک رکے رہے پھر تشریف لائے۔ تعزیت ایسے الفاظ سے کرے جو اہل میت کے لیے تسلی کا باعث ہوں اور ان کے غم و دکھ کو ہلکا کریں اور انھیں صبر و تحمل پر ابھارے۔ نبی اکرم ﷺ جب کسی کیلئے تعزیت کرتے تو اسے صبر و تحمل اور نیکی کے کاموں کی تلقین کرتے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی طرف ان کی بیٹی نے پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا وفات کے قریب ہے آپ ہمارے ہاں تشریف لائیں تو آپ نے سلام بھیجا اور کہا:

« إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهٗ مَا أَعْطَى وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِأَجَلٍ مُسَمًّى »(بخاری ، کتاب الجنائز : باب قول النبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعذب المیت ببعض بکاء اهله علیه (١٢٨٤) مسند طیالسی (٦٣٦)، مسلم (٩٢٣)، ابوداؤد (٣١٢٥)، ابن ماجه (١٥٨٨)، نسائی (١٨٦٧)، ابن حبان (٤٦١)، شرح السنة (١٥٢٧) (٤٢٦/٥)]

"یقیناً اللہ کے لیے ہے جو اس نے لیا اور اسی کا ہے جو اس نے عطا کیا اور ہر چیز کا اس کے ہاں وقت مقرر ہے (اس لیے تم صبر کرو اور اللہ سے ثواب کی امید رکھو)۔"

یہ تعزیت کے الفاظ اگرچہ قریب المرگ کے بارے وارد ہوئے ہیں لیکن مرنے والے کے حق میں زیادہ اولیٰ ہیں، اس لیے امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے " وأحسن ما یعزی به" یہ حدیث زیادہ بہتر ہے ان کلمات کے بارے جن سے تعزیت کی جاتی ہے۔ (کتاب الاذکار (٤٦٧)

اس لیے بہتر تو یہ ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ تعزیت کرلے اور اگر یہ الفاظ یاد نہ ہوں تو جو الفاظ تسلی و صبر کے لیے مناسب سمجھے کہہ دے۔ سلف صالحین سے مختلف حسب حال الفاظ منقول ہیں جن کی تفصیل کے لیے امام نووی کی کتاب الاذکار (۱۹۹ تا ۲۰۱) ملاحظہ ہو: وہ لکھتے ہیں:

"اَمَّا لَفْظَةُ التَّعْزِيَةِ فَلَا حَجْرَ فِيْهِ فَبِاَيِّ لَفْظٍ عَزَّاهُ حَصَلَ"

''تعزیت کے لیے الفاظ میں کوئی تنگی نہیں جس بھی لفظ سے تعزیت کرلے مقصد حاصل ہو جائے گا۔'' نیز دیکھیں احکام الجنائزللشیخ البانی (ص/۲۰۶)

لہٰذا اہل میت تین دن تک چٹائیاں بچھا کر اس غرض سے نہ بیٹھے رہیں کہ تعزیت کیلئے لوگ آئیں گے بلکہ وہ اپنے کام کریں، جو شخص بھی تعزیت کیلئے ملے اس سے ہم کلام ہو اور تعزیت کرنے والے مناسب حال الفاظ سے صبر و تحمل وغیرہ کی تلقین کریں۔ یہ بھی یاد رہے کہ میت کے لیے فاتحہ پڑھ کر اس کا ثواب ہبہ کرنا بھی نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں۔

جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے بآواز بلند ذکر کرنا

سوال جیسا کہ عموماً جنازوں میں دیکھا جاتا ہے کہ میت کے ساتھ بہ آواز بلند کلمہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کیا قرآن وحدیث سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟

جواب نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسی بھی صحیح حدیث میں جنازے کے ساتھ ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا ثابت نہیں بلکہ اس کی کراہت منقول ہے۔ سیدنا قیس بن عباد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« كَانَ اَصۡحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ سَلَّمَ يَكۡرَهُوۡنَ رَفۡعَ الصَّوۡتِ عِنۡدَ الۡجَنَائِزِ »

[بیهقی(٤/٧٤)]

''نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنازوں کے پاس آواز بلند کرنا ناپسند کرتے تھے۔''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جان لیجیے! صحیح اور مختار بات اور جس پر سلف صالحین تھے وہ یہ ہے کہ جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے خاموشی ہو۔ جنازے کیساتھ آواز نہ قراءت کے ذریعے بلند کی جائے اور نہ ذکر وغیرہ ہی کیساتھ۔'' [کتاب الأذکار (ص/۲۰۳)]

اس صراحت سے بھی معلوم ہوا کہ جنازے کے ساتھ ذکر و اذکار یا قراءت وغیرہ کی آواز بلند کرنے کا ثبوت کتاب و سنت سے نہیں ملتا۔ جو کام نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں کیا اس سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

میت کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرنا

سوال آج کل اہل میت کے ہاں مہمانوں کی طرح کھانا پیش کیا جاتا ہے کیا یہ درست ہے یا خود میت والوں کے لیے کھانا تیار کرنا چاہیے؟

جواب قریبی رشتہ داروں یا پڑوسیوں کو چاہیے کہ جن کا کوئی عزیز فوت ہو جائے تو ان کے کھانے کا بندوبست کریں۔ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« لَمَّا جَاءَ نَعۡيُ جَعۡفَرٍ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ اِصۡنَعُوۡا لِاٰلِ جَعۡفَرَ طَعَامًا فَقَدۡ اَتَاهُمۡ مَا

یَشْغَلُهُمْ »[مستدرك حاكم(۱/ ۳۷۲)]

''جب حضرت جعفر طیار کی وفات کی خبر آئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو، ان کے پاس ایسی چیز آئی ہے جو ان کو مشغول رکھے گی۔''

اس حدیث کو امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔ایک اور روایت میں ہے کہ سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كُنَّا نَرَى الْاِجْتِمَاعَ اِلٰى اَهْلِ الْمَيِّتِ وَ صُنْعَةَ الطَّعَامِ مِنَ النِّيَاحَةِ »[مسند احمد(۶۹۰۵)]

''ہم اہل میت کے ہاں جمع ہونا اور وہاں کھانا تیار کرنے کو نوحہ شمار کرتے تھے۔''

شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ مسند احمد کے حاشیہ پر رقمطراز ہیں:

''صنعة الطعام'' کا مطلب یہ ہے کہ اہل میت ان لوگوں کے لیے جو ان کے ہاں تعزیت کے لیے آتے ہیں کھانا تیار کریں...... حالانکہ سنت یہ ہے کہ لوگ اہل میت کے لیے کھانا تیار کریں نہ کہ اہل میت لوگوں کے لیے۔اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو کہا تھا: ''آل جعفر کے لیے کھانا تیار کرو۔''

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ ایسے کھانے کے متعلق فرماتے ہیں:

'' هِيَ بِدْعَةٌ قَبِيحَةٌ '' (یہ قبیح بدعت ہے)[فتح القدير(۱/ ۴۷۳)]

البتہ جو مہمان دور دراز سے سفر کر کے آئیں ان کے لیے کھانے کا بندوبست کرنا درست ہے کیونکہ وہ اہل میت کے طعام کے ضمن ہی میں آتے ہیں۔

اجنبی عورت کے جنازے کو کندھا دینا

سوال کیا کوئی شخص اجنبی عورت کے جنازے کو کندھا دے سکتا ہے؟

جواب جب کوئی مسلمان مرد یا عورت فوت ہو جائے تو حقوق العباد میں سے ایک حق یہ ہے کہ اس کے جنازے میں جائیں اور جنازے کو اٹھائیں۔جنازہ اٹھانے والے اور پیچھے جانے والے مرد ہی ہوتے ہیں عورت کیلئے یہ کام مکروہ ہے۔ نبی ﷺ نے عورت کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے محرم اور غیر محرم میں فرق نہیں کیا۔کوئی بھی مسلمان میت کو کندھا دے سکتا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

« حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْسٌ : رَدُّ السَّلَامِ وَ عِيَادَةُ الْمَرِيضِ وَ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَ إِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَ تَشْمِيتُ الْعَاطِسِ» [بخاری ، كتاب الجنائز: باب الأمر باتباع الجنائز (۱۲۴۰)، مسلم (۲۱۶۲)، عمل اليوم والليلة للنسائی(۲۲۱)، ابو داؤد (۵۰۳۰)، بیهقی(۳/ ۳۸۶)]

''مسلمان کے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں، سلام کا جواب دینا، بیمار کی عیادت کرنا، جنازوں کے پیچھے چلنا، دعوت قبول

کرنا اور چھینک مارنے والے کو جواب دینا۔"

اسی طرح ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« عُوْدُوْا الْمَرْضٰی وَ اتَّبِعُوْا الْجَنَائِزَ تُذَكِّرُكُمُ الْآخِرَةَ »[مسند ابی یعلی(۱۱۱۹)، موارد الظمآن (۷۰۹)، مسند احمد(۳/۳۱)، مسند بزار(۵۲۲)، ابن ابی شیبة(۳/۲۳۵)، شرح السنة(۵/۳۸۷)، الأدب المفرد (۵۱۸)، السنن الکبریٰ للبیهقی(۳/۳۷۹)]

"بیماروں کی عیادت کرو، جنازوں کے پیچھے چلو، یہ تمھیں آخرت یاد دلائیں گے۔"

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ مردوں کو جنازوں کے پیچھے جانے کا حکم ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے جنازہ میں محرم و غیر محرم کی تخصیص نہیں کی، نیز عورتوں کو جنازوں کے پیچھے آنے سے منع کیا گیا ہے۔سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« نُهِيْنَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَ لَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا »[بخاری، کتاب الجنائز: باب اتباع النساء الجنازة (۱۲۷۸)، مسلم (۹۳۸)، ابوداؤد (۳۱۶۷)، ابن ماجه (۱۵۷۷)، مسند احمد (۶/۴۰۸)، عبد الرزاق (۳/۴۵۴)، السنن الکبریٰ للبیهقی(۴/۷۷)]

"ہمیں جنازوں کے پیچھے جانے سے روک دیا گیا اور ہمیں منع میں تاکید نہیں کی گئی۔"

اس سے ثابت ہوا کہ جنازوں کے ساتھ جانے کا حکم مردوں کو ہے عورتوں کو نہیں لہٰذا مرد ہی جنازے کو کندھا دیں گے۔ میت کو اٹھانے اور قبر میں اتارنے کے لیے محرم کی شرط کا کوئی ثبوت نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح البخاری میں "باب حمل الرجال الجنازة دون النساء" میں بھی یہ سمجھایا ہے کہ جنازہ اٹھانا مردوں کا کام ہے عورتوں کا نہیں، بلکہ ایک صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر محرم آدمی عورت کی میت کو قبر میں اتار سکتا ہے جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« شَهِدْنَا بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ جَالِسٌ عَلَى الْقَبْرِ فَرَاَيْتُ عَيْنَيْهِ تَدْمَعَانِ فَقَالَ هَلْ فِيْكُمْ مِنْ اَحَدٍ لَمْ يُقَارِفِ اللَّيْلَةَ ؟ فَقَالَ اَبُوْ طَلْحَةَ اَنَا قَالَ فَانْزِلْ فِيْ قَبْرِهَا فَنَزَلَ فِيْ قَبْرِهَا فَقَبَرَهَا »[بخاری، کتاب الجنائز: باب من یدخل قبر المرأة (۱۳۴۲)]

"ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کے جنازے میں موجود تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر پر بیٹھے ہوئے تھے، میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم میں سے کوئی ایسا آدمی ہے جس نے آج رات صحبت نہیں کی۔" ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "میں نے (نہیں کی)۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اس کی قبر میں اترو۔" تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ قبر میں اترے اور انھیں قبر میں دفنایا۔"

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کو قبر میں اتارنا اس بات کی دلیل ہے کہ غیر محرم مرد عورت کو جب قبر میں اتار سکتا ہے تو اسے جنازے میں کندھا دینے سے کون سی چیز مانع ہے۔

تین دن کے بعد تعزیت کا حکم

(سوال) کیا تعزیت صرف تین دن تک محدود ہے یا اس کے بعد بھی اہل میت کے پاس جا کر تعزیت کی جاسکتی ہے؟

(جواب) تعزیت تین دن کے بعد بھی ہوسکتی ہے، آدمی جب بھی مفید محسوس کرے تعزیت کر سکتا ہے۔ جیسا کہ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا، اس کا سپہ سالار زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور کہا:

''اگر زید شہید کر دیے گئے تو تمہارے امیر جعفر (رضی اللہ عنہ) ہوں گے اور اگر جعفر (رضی اللہ عنہ) شہید ہوگئے تو تمہارے امیر عبداللہ بن رواحہ (رضی اللہ عنہ) ہوں گے۔'' اس لشکر کی جب دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی تو زید رضی اللہ عنہ جھنڈا پکڑے ہوئے لڑے اور شہید ہو گئے پھر جعفر رضی اللہ عنہ لڑتے ہوئے شہید ہوگئے، پھر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا پکڑا اور وہ بھی لڑے اور شہید ہو گئے، پھر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جھنڈا پکڑا تو اللہ نے ان کے ہاتھ پر فتح دے دی۔ ان کی خبر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی طرف نکلے، اللہ کی حمد و ثنا کی اور فرمایا: ''بلاشبہ تمہارے بھائیوں نے دشمن کا سامنا کیا، زید نے جھنڈا پکڑا اور شہید ہو گئے...... پھر خالد بن ولید "سیف من سیوف اللّٰہ" نے جھنڈا پکڑا تو اللہ نے ان کے ہاتھ پر فتح دی۔'' پھر آپ تین دن تک آل جعفر کے ہاں جانے سے رکے رہے پھر اس کے بعد ان کے ہاں تشریف لے گئے تو آپ نے فرمایا: ''آج کے بعد میرے بھائی پر مت رونا، میرے بھائی کے دونوں بیٹوں کو بلاؤ'' ہمیں لایا گیا۔ ہم ایسے لگتے تھے جیسے چوزے ہوتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''سر مونڈنے والے کو بلاؤ'' سر مونڈنے والا لایا گیا، اس نے ہمارے سر مونڈ دیے پھر آپ نے فرمایا: ''محمد بن جعفر ہمارے چچا ابو طالب کا ہم شکل ہے اور عبداللہ شکل اور اخلاق میں میرے مشابہ ہے۔'' پھر آپ نے میرا ہاتھ بلند کر کے دعا کی: ''اے اللہ! جعفر کے پیچھے اس کے اہل کا والی بن جا اور عبداللہ کے ہاتھ میں برکت دے۔'' یہ بات آپ نے تین مرتبہ کہی۔ کہتے ہیں پھر ہماری والدہ آئیں، انہوں نے ہماری یتیمی کا ذکر کیا اور آپ کو اپنا غم بتانے لگیں، آپ نے فرمایا: ''تمہیں ان کی تنگ دستی کا فکر کیوں ہے، میں دنیا اور آخرت میں ان کا سرپرست ہوں۔'' [مسند احمد (۲۰۴/۱) (۱۷۵۰) تحقیق احمد شاکر]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین دن کے بعد بھی تعزیت ہوسکتی ہے۔

جمعہ کے روز فوت ہونا

(سوال) کیا جمعہ کے دن فوت ہونے کی کوئی فضیلت ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو شخص جمعہ کے دن فوت ہو وہ جنتی ہوتا ہے، قرآن و سنت سے اس کی وضاحت کریں۔

(جواب) جمعہ کے دن فوت ہونے والے کے بارے میں ذکر کردہ فضیلت کا مجھے علم نہیں، البتہ یہ بات یاد رکھیں کہ جنت میں داخلے کے لیے صحیح اعمال صالحہ اور خاتمہ بالخیر کی ضرورت ہے، جس شخص کا عقیدہ بالکل صحیح ہو اور وہ کسی کفر و شرک کے ارتکاب

کے بغیر اس دنیا سے چلا گیا تو اللہ اسے ضرور اپنی جنت میں داخل کرے گا۔ نبی ﷺ کی کئی ایک احادیث صحیحہ میں یہ بات موجود ہے کہ جس شخص کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہو وہ جنت میں داخل ہوگا اور اگر اللہ کے ساتھ شرک کیا ہو یا کسی صریح کفر کا ارتکاب کیا ہو اور اس پر توبہ نہیں کی اور موت آگئی تو ایسے شخص کا جنت میں داخلہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اعمال اور عقیدہ صحیحہ پر قائم رکھے اور کفر وشرک سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

قریب المرگ شخص کو کلمہ توحید کی تلقین کرنا

سوال کیا قریب المرگ شخص کو کلمہ توحید کی تلقین کرتے ہوئے پڑھنے کے لیے کہنا چاہیے یا اس کے پاس یاد دہانی کے لیے کلمہ پڑھا جائے؟ صحیح رہنمائی فرمائیں۔

جواب قریب المرگ شخص کو کلمہ توحید کی تلقین کا حکم ہے اور تلقین سے مراد صرف کلمہ توحید پڑھ کر سنانا نہیں بلکہ اسے کہا جائے کہ وہ بھی پڑھے۔ اس کے کئی ایک دلائل موجود ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک انصاری کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، آپ نے فرمایا:

''ماموں جان! لا الہ الا اللہ کہو۔'' اس انصاری نے کہا: ''ماموں یا چچا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ ماموں۔'' اس نے پوچھا: ''کیا لا الہ الا اللہ کہنا میرے حق میں بہتر ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' [مسند احمد (۱۵٤/۳)، یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے]

اس حدیث سے پتا چلا کہ قریب المرگ کو کلمہ پڑھنے کے لیے کہہ سکتے ہیں۔

تجارت کے احکام

WWW. KITABOSUNNAT.COM

سودی مال کا کیا کیا جائے؟

(سوال) ایک شخص سودی لین دین کرتا رہا پھر اللہ نے اسے ہدایت دے دی اور اس نے اسے چھوڑ دیا اب جو سودی رقم ہے اس کا کیا کرے؟

(جواب) اس مسئلہ میں لازماً دو صورتیں ہوں گی۔ ایک صورت یہ ہے کہ توبہ کے بعد بہت زیادہ سودی رقم ابھی لوگوں کے ذمے ہے، جو ان سے وصول کرنی ہے تو اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴾ [البقرة:٢٧٩]

''اگر تم نے توبہ کر لی تو تمھارے لیے تمھارے اصل اموال ہیں، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ظلم کرے۔''

حضرت سلیمان بن عمرؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم سے سنا، آپ ﷺ فرما رہے تھے:

« اَلَا اِنَّ كُلَّ رِبًا مِنۡ رِبَا الۡجَاهِلِيَّةِ مَوۡضُوۡعٌ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ »[ابوداؤد، كتاب البيوع: باب في وضع الربا (٣٣٣٤)]

''خبردار! آج سے جاہلیت کا سود ختم کر دیا گیا ہے، اگر تم توبہ کرلو تو تمھارے لیے تمھارے اصل اموال ہیں، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ جو سود ابھی تک نہیں لیا گیا اسے لینا حرام ہے۔ صرف اپنا اصل مال واپس لے اور اگر واپس کرنے والا تنگ دست ہے تو اسے خوش حالی تک مہلت دے دینی چاہیے یا ویسے ہی اسے معاف کر دیا جائے تو بہت بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ اِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ وَ اَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ [البقرة:٢٨٠]

''اور اگر وہ تنگ دست ہو تو آسانی تک مہلت دو اور اگر تم صدقہ کردو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

اور دینے والے کو بھی چاہیے کہ وہ اس کا اصل مال ہی واپس کرے، زیادہ مت دے۔ نہ اسلام میں سود لینا جائز ہے اور نہ دینا۔ افسوس ہے کہ ہمارے مسلمان حکمران سود دینے کے لیے لوگوں سے دولت جمع کر رہے ہیں۔ باقی یہ بات ہے کہ طرفین

کی رضا مندی حرام کام کو حلال نہیں کر سکتی جیسا کہ زنا اور قومِ لوط کا فعل ہے، بالکل سود بھی ایسے ہی ہے۔

اس مسئلہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ سائل نے بہت سا سودی مال اپنے پاس جمع کیا ہوا ہے اب توبہ کے بعد وہ اس کا کیا کرے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ایک قاعدے کے تحت اس کا حل پیش کیا ہے، ان کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ چیز جو کسی فاسد سودے سے حاصل کی جائے اسے دو لحاظ سے دیکھا جائے گا۔ اگر تو بیع کرنے والا اس بیع کے باطل ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے اور وہ بیع کی وجہ سے یا طرفین کی رضا مندی کی وجہ سے جس چیز پر قابض ہوتا ہے تو وہ اس کا غاصب شمار ہوگا کیونکہ اس نے ایسی چیز حاصل کی ہے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ غلط ہے، اس لیے وہ اس کا مالک نہیں بن سکتا اور اگر عقد کرنے والا اس کو صحیح سمجھتا ہے جیسا کہ ذمی لوگ خنزیر، سود، شراب وغیرہ کی آپس میں بیع کرتے ہیں۔ جو اس نے مسلمان ہونے سے پہلے خرید وفروخت سے رقم حاصل کی ہے وہ اس کا اصل مال شمار ہوگا۔ اسی طرح اگر مسلمان اجتہاد یا کسی کی تقلید کی بنا پر اس کو صحیح سمجھتے ہوئے بیع کرتا رہا ہے اور مال اس کے ہاتھ میں ہے تو وہ اس کا اصل مال ہی شمار ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [البقرة:۲۷۸]

''اور جو سود سے باقی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے باقی کو چھوڑنے کا حکم دیا ہے، یہ حکم نہیں دیا کہ جو پہلے بھی لیا ہوا ہے اسے واپس کرو۔

[مجموع الفتاویٰ لابن تیمیة(۲۹/۴۱۱)، تفسير المنار لرشید رضا(۳/۹۷)]

پہلی صورت میں جب کہ ایک مسلمان جان بوجھ کر، حرام کو حرام جانتے ہوئے سودی کاروبار کرتا رہا، بعد میں توبہ کر لی، اب اس کے پاس اس حرام سودی کمائی کا مال موجود ہے اور وہ اس سے جان چھڑانا جاتا ہے تو اس کا حل یہی ہے کہ وہ مال جس سے لیا ہے اسے واپس کردے کیونکہ لیتے وقت وہ جانتا تھا کہ میں ظلم و زیادتی سے یہ مال حاصل کر رہا ہوں۔ اب اگر وہ مال واپس کرنا ممکن ہی نہیں ہے تو﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ پر عمل ہوگا۔ اگر چاہے تو صدقہ کر دے اور سچے دل سے توبہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ سودی کاروبار کرتا رہے اور کہے بعد میں صدقہ کر دوں گا۔ یہ تو توبہ کے بعد اس کے لیے حلال اور جائز نہیں۔ اس صدقہ سے نیت یہ ہو کہ میں اس مال سے بچ جاؤں۔ اس صدقہ سے نیکی، ثواب اور تقرب الی اللہ کی نیت نہ ہو کیونکہ حرام چیز سے ثواب اور تقرب الی اللہ حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاکیزہ چیز ہی کو پسند کرتا ہے۔''

بینک میں رقم رکھنا

سوال کیا بینک میں رقم رکھی جا سکتی ہے جبکہ بندہ اس پر سود بھی نہ لے؟

جواب بینک میں رقم رکھنا درست نہیں خواہ آپ سود لیتے ہوں یا نہ لیتے ہوں کیونکہ بینک اس رقم کو سودی کاروبار میں استعمال

کرتا ہے اور یہ گناہ کے کام میں تعاون کی وجہ سے حرام ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [المائدة:۲]

"نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو، گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔"

اگر کسی شخص کو بینک کے علاوہ امانت رکھنے کے لیے کوئی اور جگہ میسر نہ آئے تو اس مجبوری کی وجہ سے اتنی دیر تک بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ میں اپنی رقم رکھ لے جب تک اس کا صحیح انتظام نہیں ہو جاتا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ﴾ [الانعام:۱۱۹]

"اور اللہ تعالیٰ نے جو تمھارے اوپر حرام کیا ہے اس کی تفصیل تمھارے لیے بیان کر دی ہے الا کہ تم کسی بات پر مجبور ہو جاؤ۔"

اور جب اس کے لیے آپ کو کوئی صحیح جگہ مل جائے تو آپ اپنی رقم بینک سے نکلوا لیں اور اس کو صحیح مقام پر منتقل کر دیں تاکہ گناہ پر تعاون سے بچ جائیں۔

بینک میں ملازمت کرنا

سوال بینک کی ملازمت کرنا شریعت کی نگاہ میں کیسا ہے؟

جواب بینک کی ملازمت اختیار کرنا حرام ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ آكِلَ الرِّبٰوا وَ مُوْكِلَهُ وَ كَاتِبَهُ وَ شَاهِدَيْهِ وَ قَالَ هُمْ سَوَاءٌ » [مسلم، كتاب المساقاة: باب لعن آكل الربا و مؤكله(۱۵۹۸)]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اسے لکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ یہ سب لوگ گناہ میں برابر ہیں۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سود لکھنے والا بھی لعنت کا مستحق ہے اور سود کھانے اور کھلانے والے کے ساتھ گناہ میں برابر کا شریک ہے۔ اس لیے بینک کی نوکری کرنا، کلرک و منیجر بننا حرام ہے اور سود خور کے ساتھ مل کر جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرتا ہے، وہ گناہ میں شریک ہے، لہٰذا یہ سروس چھوڑ کر کوئی جائز اور حلال کام اختیار کر لینا چاہیے۔

انعامی بانڈز کی شرعی حیثیت

سوال کیا انعامی بانڈز خریدنا اور ان پر انعام حاصل کرنا جائز ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں مطلع فرمائیں؟

(جواب) حکومت کی طرف سے جاری کیے جانے والے انعامی بانڈز سود ہی کی ایک صورت ہے جس کے ساتھ جوئے کی آمیزش کی گئی ہے۔ حکومت انعامی بانڈز فروخت کر کے بہت سے لوگوں سے رقم جمع کرتی ہے اور ان کو گارنٹی دیتی ہے کہ آپ کی اصل رقم محفوظ ہے۔ اگر آپ کا نمبر نکل آیا تو انعام دیا جائے گا۔ یہ انعام اس ساری جمع شدہ رقم کا سود ہے جو حرام ہے اور اگر جائز بھی ہو تو ان تمام لوگوں کا حق ہے جنھوں نے رقم جمع کرائی ہے۔ مگر وہ ان سب کا حق صرف اتفاق سے نکل آنے والے نمبروں کو دیتے ہیں جس کی بنیاد کسی استحقاق یا قاعدے پر نہیں، صرف بخت و اتفاق پر ہے اور اس کا نام جوا ہے۔ اس لیے انعامی بانڈز خریدنا حرام ہے۔ انعامی بانڈز کی دوسری صورت جس میں انعام نہ نکلنے کی صورت میں خریدنے والے کے پیسے ضائع ہو جاتے ہیں صاف جوا اور حرام ہے، جس طرح قسمت کی پڑیا، لاٹری کی تمام صورتیں، اخبارات کے پزل (معمے) مختلف قسم کے ریفل ٹکٹ سب جوئے کی صورتیں ہیں اور حرام ہیں۔ ایسے انعامات سے تیار ہونے والے کھانے اور منعقد کی جانے والی تقریبات بھی حرام ہیں اور اس میں شرکت بالکل ناجائز ہے۔

قسطوں پر اشیاء خریدنے کا حکم

(سوال) کیا قسطوں پر اشیاء حاصل کرنا ناجائز ہے؟

(جواب) قسطوں پر خریدنے کی صورت میں بھی اگر اشیاء کی قیمتیں وہی ہوں جو نقد کی صورت میں ہیں تو ان کی بیع جائز ہے بصورت دیگر ناجائز ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ »[مسند احمد(٤٣٢/٢)، بيهقى (٣٤٣/٥)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چیز کی دو قیمتیں (مقرر کرنے سے) منع فرمایا ہے۔“

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ بَاعَ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ فَلَهٗ اَوْكَسُهُمَا اَوِ الرِّبَا »[ابن حبان(٢٢٦/٨)،(٤٩٥٣)، مستدرك حاكم (٤٥/٢)، بيهقى(٣٤٣/٥)، امام حاكم رحمہ اللہ نے اس حديث كو مسلم كى شرط پر صحيح كها هے اور امام ذهبى رحمہ اللہ نے ان كى موافقت كى هے۔]

”جو شخص کسی چیز کی دو قیمتیں مقرر کرے گا یا تو وہ کم قیمت لے گا یا پھر وہ سود ہوگا۔“

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« لَا تَحِلُّ صَفْقَتَانِ فِيْ صَفْقَةٍ »[الإحسان بترتيب صحيح ابن حبان(٢٤٢/٨)]

”ایک عقد میں دو معاملے کرنا حلال نہیں۔“

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب تو یہ کہے کہ میں یہ چیز تمھارے ہاتھ نقد اتنے میں اور ادھار اتنے کی بیچتا ہوں تو یہی "بیعتان فی بیعة" ہے اور یہ مردود ہے اور یہی وہ تجارت ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔'' [عبد الرزاق(١٤٦٣٢)، شرح السنة(١٤٣/٨)]

امام سماک بن حرب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کوئی شخص کوئی چیز بیچتے وقت کہے یہ چیز ادھار اتنے پر اور نقد اتنے پر بیچتا ہوں تو یہ "بیعتین فی بیعة" ہے۔''

[مسند احمد(٣٩٨/١)]

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ ادھار کی صورت میں رقم بڑھانا سود ہے، لہٰذا ایسا کاروبار کرنا درست نہیں، یہ سود لینا اور دینا ہے اور لعنت کا حق دار بننے کے مترادف ہے لہٰذا دکاندار اور گاہک کو ایسے معاملات سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔

بیمہ کی شرعی حیثیت

سوال بیمہ کی شرعی حیثیت کیا ہے جبکہ بعض علماء نے اس کے جواز کے فتوے بھی دیے ہیں؟

جواب بیمہ مطلقاً ناجائز اور حرام ہے خواہ زندگی کا ہو یا مکان اور گاڑیوں وغیرہ کا کیونکہ یہ اپنی اصل وضع میں جوئے اور سود کا مرکب ہے اور اسلام میں سود اور جوا دونوں حرام ہیں۔ اگر مدت مقررہ سے پہلے بیمہ دار کی موت یا املاک کا نقصان ہو جائے تو کمپنی کو نقصان ہوتا ہے اور اگر وہ پوری قسطیں جمع کرا دے تو کمپنی کو فائدہ ہوتا ہے اور یہ کسی کو معلوم نہیں کہ قسطیں پوری ادا ہو سکیں گی یا نہیں؟ اور سود اس لیے ہے کہ بیمہ دار اگر پوری قسطیں جمع کروائے تو اس کو اس رقم کے ساتھ سود دیا جاتا ہے۔

بیمہ سے وراثت کا شرعی نظام ختم ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ بیمہ کی رقم بیمہ دار کے مرنے کے بعد اس کے نامزد کردہ شخص کو دی جاتی ہے جب کہ ہر شرعی وارث ترکہ کا مستحق ہوتا ہے۔ جو چیز قرآن وسنت کے نظام کو درہم برہم کرنے والی ہو، وہ کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

عقیدہ تقدیر پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جائز اور شرعی اسباب بروئے کار لانے کے بعد مستقبل میں پیش آنے والے حوادث اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیے جائیں۔ بیمہ اس سے فرار ہے کیونکہ اس میں حوادث کی پیش بندیاں ناجائز طریقوں سے پہلے ہی ہو رہی ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ بھی تو دنیا میں رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بھی آل اولاد چھوڑی تھی۔ جب انھوں نے ایسے ناجائز تحفظات کا انتظام نہیں کیا تو آج کے مسلمانوں کو کیوں اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے؟

باقی جس حدیث میں ہے کہ جو آدمی اپنے ورثاء کو مرتے وقت غنی چھوڑ جائے وہ بہتر ہے، اس فرمان کو غور سے پڑھیں تو بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمان مستقبل کی احتیاطی تدبیر کے متعلق نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جائز موجود جائداد کو بلا وجہ خرچ کر ڈالنا مناسب نہیں، بعد میں وہ وارثوں کے کام آئے گی۔ باقی اسٹیٹ لائف والوں کا یہ کہنا کہ ہمارا شراکت دار نفع ونقصان میں شریک ہوتا ہے، جھوٹ اور دروغ گوئی ہے اور سادہ لوح انسانوں کو اپنے شکنجے میں پھنسانے کا ایک حیلہ ہے۔ کیونکہ بیمہ کمپنی اگرچہ اس رقم سے تجارت بھی کرتی ہو لیکن اس کے منافع

میں سے ایک معین اور طے شدہ حصہ بیمہ وار کے کھاتے میں جمع کرتی ہے اور بلاشبہ یہ سود ہے کیونکہ اصل رقم کے علاوہ معین اور طے شدہ منافع کے ادا کرنے کا نام ہی سود ہے۔ اگر یہ نفع اور نقصان ہی کی بنیاد پر قائم ہو تو پھر بھی بیمہ کرانے والوں کو حسب معاہدہ معینہ رقم نہیں ملنی چاہیے بلکہ کمی بیشی کے ساتھ نفع اور نقصان دونوں میں شریک رہنا چاہیے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے بلکہ بیمہ کمپنیاں عام طور پر اصل رقم سے جو کچھ زائد دیتی ہیں اس کی شرح اور مقدار پہلے ہی سے متعین کر دیتی ہیں۔ اگر کوئی کمپنی اس کو معین نہ بھی کرتی ہو بلکہ زائد رقم کو سالانہ نفع اور نقصان کا لحاظ کر کے فیصد پر رکھتی ہو، تب بھی یہ طریقہ بیمہ کے جائز ہونے کی وجہ نہیں بن سکتا، کیونکہ اس کاروبار میں نقصان کا سوال ہی نہیں۔ پھر یہ بات بالکل واضح ہے کہ بیمہ کمپنیاں تمام حاصل شدہ سرمایہ سود پر آگے دے دیتی ہیں اور سودی معاملے میں واقع نقصان کی ذمہ داری قبول نہیں کی جاتی۔ پھر ان کمپنیوں کے متفقہ اصولوں میں سے بعض ایسے اصول بھی ہیں جن کی وجہ سے یہ سارا کاروبار اور ڈھانچہ ہی شرعاً ناجائز بن جاتا ہے۔ یہ نظام یہودیوں کا ایجاد کردہ ہے۔ جن کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ تاکہ مسلمانوں کو اسلام نے جو سرمایہ کے محفوظ رکھنے اور مال میں اضافہ کرنے، حوادث کی صورت میں مالی معاونت اور پسماندگان کی مالی امداد کے بارے میں جو ربانی ہدایات دی ہیں ان سب چیزوں سے محروم کر کے اسلام سے دور کر دیا جائے۔ وہ پڑھے لکھے اور نام نہاد علماء جنھوں نے یہودیوں کے غزوۂ فکری سے شکست خوردہ ہو کر یورپ کے موجودہ اقتصادی نظام کی چند خوبیاں اور خوشنما پہلوؤں کو دیکھ کر بیمہ جو سراسر جوا اور سود ہے، کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، ایسے لوگوں کا کردار انتہائی قابل مذمت ہے اور بعض تو اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ یورپ کی ذہنی غلامی نے ان کے دماغوں پر یہ عقیدہ مسلط کر دیا ہے کہ سود کے بغیر معاشی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ ایسے علماء کو ایسا فتویٰ دینے سے پہلے اس آیت کریمہ کو اچھی طرح پڑھ لینا چاہیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھو۔ یقیناً اللہ پر جھوٹ باندھنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔'' [النحل: ۱۱٦]

حرام کھانے کا انجام

سوال کیا حرام کھانے والا جنت میں داخل نہ ہوگا؟

جواب نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَ كُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتِ النَّارُ أَوْلٰى بِهِ»

[احمد(۳۲۱/۳)، مستدرک حاکم(٤۲۲/٤)، امام حاکم اور امام ذهبی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا هے ۔ اسی طرح امام ابن حبان رحمہ اللہ نے بھی اسے صحیح کہا هے۔ [موارد الظمآن(ص/۳۷۸)]

''وہ گوشت جس نے حرام سے پرورش پائی ہو جنت میں داخل نہیں ہوگا اور جس گوشت نے حرام سے نشوونما پائی ہو اس کے لیے جہنم کی آگ ہی اولیٰ ہے۔''

اشیاء کی قیمتیں مقرر کرنا

(سوال) کیا حکومت یا کوئی اور ذمہ دار اشیاء کی قیمتیں مقرر کر سکتا ہے؟ شریعت کی رو سے مطلع فرمائیں۔

(جواب) عہد رسالت میں ایک مرتبہ مدینہ میں اشیاء کے نرخ بڑھ گئے جس پر لوگوں نے آپ ﷺ سے آ کر شکایت کی جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« غَلَا السِّعْرُ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَدْ غَلَا السِّعْرُ فَسَعِّرْ لَنَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ وَ اِنِّیْ لَأَرْجُوْ اَنْ اَلْقَی رَبِّیْ وَ لَيْسَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ يَطْلُبُنِیْ بِمَظْلِمَةٍ فِیْ دَمٍ وَ لَا مَالٍ » [ابن ماجه ، كتاب التجارات، باب في كره ان يسعر (۲۲۰۰)، ابوداؤد (۳٤٥۱)، احمد (۱٥٦/۳)، مسند ابی يعلی (۱٦۰/٥)، بيهقی(۲۹/٦)، دارمی (۲٤۹/۲)، طبرانی كبير(۷٦۱)]

''نبی کریم ﷺ کے زمانے میں (مدینہ میں) چیزوں کے نرخ بڑھ گئے، لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! نرخ بہت بڑھنے لگے ہیں، آپ ہمارے لیے قیمتیں مقرر فرما دیں۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہی نرخ مقرر کرنے والا ہے، وہی مہنگا کرنے والا ہے، وہی سستا کرنے والا ہے اور وہی رزق دینے والا ہے، میں اس بات کا امیدوار ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو اس حال میں ملوں کہ کوئی شخص مجھ سے خون یا مال میں ظلم کی بنا پر مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔''

اس حدیث کے آخری الفاظ قابل توجہ ہیں ''میں اس بات کا امیدوار ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ مجھ پر کسی کا خونی یا مالی حق نہ ہو'' اس سے معلوم ہوا کہ قیمتوں کو کنٹرول کرنا گاہک یا دکاندار کسی ایک پر ظلم ہے، جس کی ذمہ داری قبول کرنے پر آپ ﷺ آمادہ نہ تھے۔

حکومت جو اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول حاصل کرتی ہے اس کی ایک صورت یہ ہے کہ حکومت اعلان کر دیتی ہے کہ فلاں فلاں اشیاء کی قیمتیں یہ ہیں، اس سے زیادہ قیمت پر یہ اشیاء فروخت نہیں کی جا سکتیں۔ اسی طرح حکومت کی جانب سے اشیاء کی قیمتیں مقرر کر کے باقاعدہ لسٹ دکانوں پر آویزاں کر دی جاتی ہے تاکہ دکاندار اس سے زیادہ قیمت وصول نہ کر سکے اور اس کی چیکنگ کے لیے گاہے گاہے حکومت چھاپے بھی مارتی ہے لیکن اس کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ دکاندار اس ریٹ پر ردی اور ناکارہ اشیاء فروخت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اگر کوئی خریدار خالص اور عمدہ چیز کا طلب گار ہو تو اس سے علیحدہ ریٹ طے کرتے ہیں، البتہ اگر کوئی حکومتی آدمی آ کر دکاندار سے اس مقرر ریٹ پر چیز طلب کرے تو دکاندار اسے خالص چیز مہیا کرتا ہے تاکہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے اور جرمانہ یا سزا سے بچ جائے۔

اس کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ دکاندار اپنی کمیٹی کے افراد کے ذریعے یا کسی اور واسطے سے حکومتی عملہ کو رشوت دے کر بددیانتی پر مبنی حرکات کا مرتکب ہوتے ہیں اور گاہک کو ناخالص، ردی، بے کار اور گھٹیا اشیاء فروخت کرتے ہیں۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت جس چیز پر کنٹرول کرتی ہے، ملک کے مختلف حصوں میں اس کے ڈپو مقرر کر دیتی ہے تا کہ ان ڈپوؤں سے وہ چیز مقررہ ریٹ پر حاصل کی جا سکے۔ اس سے بھی بد دیانتی کی متعدد راہیں کھلتی ہیں۔ ڈپو ہولڈرز اپنے واقف کار، عزیز و اقارب وغیرہ کو تو اشیاء فراہم کرتے ہیں جب کہ دیگر بہت سے افراد محروم رکھتے ہیں، بلکہ بہت سے افراد اس طرح ڈپوؤں پر ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ عورتیں اور بچے سارا دن لائنوں میں لگے ذلیل ہو رہے ہوتے ہیں اور اکثر ڈپو ہولڈرز ایسے افراد سے رشوت وصول کر کے اشیاء کو بچا کر بازار میں مختلف دکانداروں کو بلیک میں فروخت کرتے ہیں۔ اس طرح چور بازاری کا نیا دروازہ کھل جاتا ہے۔ بہر کیف اس طرح کی کئی خرابیاں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جن سے خریدار اور دکاندار کے درمیان کئی جرائم جنم لیتے ہیں۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: تجارت اور لین دین کے مسائل واحکام]

مذکورہ حدیث کی شرح میں قاضی شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس حدیث اور اس معنی کی جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان سے قیمتوں کے کنٹرول کی حرمت میں استدلال کیا گیا ہے اور قیمتوں پر کنٹرول کرنا ظلم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے مالوں کے تصرف کا اختیار دیا گیا ہے اور قیمتوں پر کنٹرول ان پر مالی تصرف میں رکاوٹ ہے جب کہ حاکم وقت مسلمانوں کی خیر خواہی پر مامور ہے۔ اس کے لیے گاہک کو سستے داموں اشیاء کی خریداری میں نظر کرنا دکاندار کے لیے قیمت بڑھانے کی مصلحت میں نظر کرنے سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ جب یہ دونوں معاملے آمنے سامنے ہوں تو اس وقت لازم ہے کہ فریقین (دکاندار اور گاہک) کو اپنے معاملے میں اجتہاد کا اختیار دیا جائے۔ سودا بیچنے والے کو اس کی مرضی کے خلاف بیچنے پر پابند کرنا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے خلاف ہے: ''اے ایمان والو! اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ سوائے اس صورت کے کہ تمھاری تجارت باہمی رضا مندی سے ہو۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔'' [نيل الأوطار(٢٤٨/٥)]

اسلامی معاشرے میں چونکہ تجارت بالکل آزاد ہے، اس لیے ہر چیز کھلے عام فروخت ہونی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں تاجر برادری کے لوگ متقی، پرہیز گار اور صالح ہوتے تھے اور وہ مناسب ریٹ پر اشیاء فروخت کرتے تھے۔ قیمتوں کا اتار چڑھاؤ تاجروں کی بد نیتی پر نہیں ہوتا تھا بلکہ سامانِ فروخت کی کمی اور اس کی کثرت طلب کی بنا پر قیمتیں چڑھ گئی تھیں۔ [دیکھیے: مجلة البحوث الاسلامیه(٢٠٨/١)]

لیکن جب اشیائے خورنی میں گرانی اور ریٹ کا اضافہ خود تاجروں کا پیدا کردہ ہو اور وہ عامۃ الناس کے پاس اشیائے خورونوش آسانی سے نہ پہنچنے دیتے ہوں تو یہ تاجر برادری کا ظلم ہے اور عوام الناس کی بھلائی کی خاطر ان کا ظلم روکنا عین انصاف اور حکومت کا حق ہے، تو اس ایک صورت میں اگر کنٹرول ہو جائے تو کوئی شرعی قباحت نہیں کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے جب کنٹرول کرنے سے انکار کیا تھا تو اس کے اسباب قدرتی تھے، تاجر برادری کے پیدا کردہ نہیں تھے، باہر سے غلہ نہیں پہنچ رہا تھا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کنٹرول ریٹ بعض صورتوں میں ناجائز اور ظلم ہے اور بعض صورتوں میں عدل و انصاف اور جائز ہے۔''

جب کنٹرول ریٹ ایسی صورت پر مشتمل ہو کہ لوگوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو ناحق کسی چیز کو ایسی قیمت پر فروخت کرنے پر

مجبور کیا جائے جسے وہ ناپسند کرتے ہوں یا جو چیز اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مباح رکھی ہے، اس سے انھیں روکا جائے تو یہ حرام ہے۔ جب کنٹرول ریٹ عدل و انصاف پر مبنی ہو جیسا کہ انھیں کسی چیز کا جتنا معاوضہ مناسب ہو اس کے لیے انھیں مجبور کیا جائے اور جو کام ان پر حرام ہے اس کے کرنے سے روکا جائے جیسے مناسب معاوضے سے زیادہ قیمت لینا تو یہ کنٹرول جائز ہے بلکہ واجب ہے۔ پہلی صورت کی مثال سیدنا انس رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے ۔ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"جب لوگ اپنے سودے کو معروف طریقے پر ظلم کیے بغیر فروخت کریں اور قیمت یا تو اشیاء کی کمی کی وجہ سے بڑھ جائے یا لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تو یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ایسی صورت میں مخلوق کو مقررہ قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور کرنا ناحق ہے۔

اور دوسری صورت کی مثال یہ ہے کہ سودا بیچنے والے افراد لوگوں کی ضرورت کے باوجود زیادہ قیمت کی وصولی کے بغیر بیچنا روک دیں تو ان پر واجب ہے کہ وہ سودے کو مناسب قیمت پر بیچیں۔ ایسی صورت میں (جب وہ زیادہ قیمتیں وصول کریں) انھیں مناسب قیمت کا پابند کردینا چاہیے، ان پر لازم ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے لازم ٹھہرائی ہے اسے لازم پکڑیں۔" [الحسبة للإمام ابن تيمية (ص/ ٢٠)]

تقریباً یہی بات امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے۔ [الطرق الحكمية (ص/ ٢٤٤، ٢٤٥)]

لہٰذا اگر تاجر برادری کی جانب سے ظلم ہو اور عوام الناس کی ضرورت کے باوجود بلاوجہ اشیاء کی فراہمی مناسب ریٹ پر نہ ہو تو انھیں مقررہ قیمت پر فروخت کا پابند کیا جا سکتا ہے اور اگر منڈیاں آزاد ہوں، گرانی تاجر برادری کی طرف سے پیدا نہ کی گئی ہو بلکہ قدرتی طور پر اشیاء کی قلت و کثرت کی بنا پر ہو تو اس صورت میں کنٹرول ریٹ درست نہیں۔

گروی رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا

سوال کیا گروی رکھی ہوئی ہر چیز سے فائدہ حاصل کرنا ٹھیک ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ ﴾ [النساء: ٢٩]

"اے ایمان والو! اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔"

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَ أَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ » [مسلم، كتاب الحج: باب حجة النبي (١٢١٨)]

بلاشبہ تمھارے خون اور اموال تم پر حرام ہیں۔"

ان واضح دلائل سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا مال مسلمان پر اصلاً حرام ہے۔ جوازِ تصرف کے لیے کسی شرعی دلیل کی ضرورت

ہے جو یہاں مفقود ہے۔ گروی رکھنے والا شخص اپنی گروی شدہ چیز کا مالک ہے اور اس کا اپنی چیز سے فائدہ اٹھانا تو معقول ہے جب کہ جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے اس کی حیثیت امین کی ہے اور اس کے پاس پڑی ہوئی چیز امانت ہے جو رقم کے تحفظ کے لیے ہے، تو کسی کی امانت میں تصرف کرنا خیانت اور ناجائز ہے۔

اور حدیث میں جو خرچ کے عوض جانور کا دودھ دوہنے اور اس پر سواری کرنے کی اجازت ہے اس سے استدلال کرنا درست نہیں کیونکہ یہ حدیث عمومی شرعی اصول کے منافی ہے، یہ صرف سواری کے ساتھ خاص ہے، اس پر عام قیاس کرنا درست نہیں۔ صحیح بخاری میں امام بخاری کا فہم بھی یہی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ایک گروہ نے کہا ہے کہ جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے وہ خرچ کے عوض گروی جانور پر سواری کر سکتا ہے اور دودھ دوہ سکتا ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے دو فائدوں کے علاوہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔'' [فتح الباري(١٤٤/٥)]

پھر فرماتے ہیں کہ جمہور اہل علم کا یہی مسلک ہے کہ جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے وہ گروی اشیاء سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ سلف صالحین سے کچھ ایسے صریح آثار بھی مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مقروض آدمی کے مال سے فائدہ اٹھانا درست نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ طیبہ آیا تو میری ملاقات عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ہوئی، انھوں نے کہا: ''آپ میرے گھر آئیں تو میں آپ کو ستو اور کھجور کھلاؤں گا اور آپ ایک عظیم گھر میں آئیں گے۔'' پھر فرمایا: ''تم ایک ایسی زمین پر ہو جس میں سود عام ہے، جب تمہارا کسی شخص پر حق ہو اور وہ تمھیں بھس، جو اور چارے کا گٹھا بطور تحفہ دے تو اسے قبول نہ کرنا کیونکہ یہ سود ہے۔'' [بخاري، كتاب مناقب الانصار: باب مناقب عبد الله بن سلام(٣٨١٤)]

سالم بن ابی الجعد فرماتے ہیں: ''ہمارا ایک پڑوسی مچھلی فروش تھا، اس کے ذمے کسی آدمی کے پچاس درہم تھے۔ وہ قرض دینے والے کو مچھلی ہدیہ بھیجتا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما آئے تو اس نے ان سے اس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ''جو وہ تجھے تحفے میں دے رہا ہے اسے حساب میں شمار کرو۔'' [بيهقي(٣٥٠/٥)]

ان صحیح اور صریح آثار سے معلوم ہوا کہ قرض لینے والے شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مقروض کی کسی چیز سے فائدہ اٹھائے، لہٰذا اگر کسی شخص کے پاس کوئی چیز گروی رکھی گئی ہو تو وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اگر وہ فائدہ اٹھائے تو اصل رقم سے حساب کر کے اتنی رقم کم کر دی جائے گی اور اگر حق سے زائد فائدہ اٹھایا ہو تو یہ واپس کرنا ہو گا وگرنہ سود ہو گا۔ (واللہ اعلم)

ناجائز کاروبار کے لیے دکان کرائے پر دینا

سوال کیا کوئی مالک مکان اپنی دکان یا مکان کسی ایسے شخص کو دے سکتا ہے جو اس میں غیر شرعی امور کا مرتکب ٹھہرے جبکہ وہ خود اس کام میں ملوث نہ ہو؟

جواب اللہ تعالیٰ نے فحاشی و بے حیائی پھیلانے سے منع فرمایا ہے اور جو لوگ ایسا کام کرتے ہیں انھیں دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ [النور:١٩]

”یقیناً جو لوگ اہل ایمان میں برائی پھیلانے کے آرزومند رہتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں درد ناک عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔“

ویڈیو فلمیں اور گانوں کی کیسٹیں صراحتاً احکامِ خداوندی کی نافرمانی پر مشتمل ہیں جو شرعاً حرام ہیں۔سورۂ لقمان میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡتَرِیۡ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَ یَتَّخِذَہَا ہُزُوًا اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ﴾ [لقمان:٦]

”اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو گانے بجانے کے آلات خریدتے ہیں تاکہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکائیں اور اسے ہنسی و مذاق بنائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔“

اس آیت سے قبل اللہ تعالیٰ نے اہل سعادت جو کتاب الٰہی کے سماع سے فیض یاب ہوتے ہیں، کا ذکر کرنے کے بعد اہل شقاوت کا ذکر کیا ہے جو کلام اللہ کی تلاوت کے سماع سے اعراض کرتے ہیں لیکن ساز و موسیقی، نغمہ و سرود اور گانے وغیرہ خوب شوق سے سنتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔صحابیٔ رسول اور فقیہ امت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”لہوالحدیث سے مراد اللہ کی قسم! گانا بجانا ہے۔“[حاکم(٤١١/٢)، ابن جریر(٦٢/٢١)]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مفسر قرآن بھی یہی فرماتے ہیں اور یہی تفسیر عکرمہ، حسن بصری، سعید ابن جبیر، قتادہ اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ سے مروی ہے۔[ابن جریر(١١/٢١)]

لہٰذا جب گانا بجانا، آلات طرب، رقص و سرود شرعاً حرام ہیں اور ویڈیو فلمیں اور گانے کی کیسٹیں فروخت کرنا بھی حرام ہیں تو ایسے کاموں کے لیے دکان کرایہ پر دینا فعل حرام میں تعاون ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡبِرِّ وَ التَّقۡوٰی وَ لَا تَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ ﴾ [المائدة:٢]

”نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو، گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔“

معلوم ہوا کہ گناہ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا حرام ہے، لہٰذا فعل حرام کی تجارت کے لیے دکان کرائے پر دینا حرام ہے۔ اس سے اجتناب کیا جائے۔ اسی طرح وہ مساجد جن کی دکانیں شیو، ویڈیو کیسٹیں اور اس طرح کے دیگر امور کے لیے کرائے پر دی گئی ہیں ان کے متولیوں کو چاہیے کہ وہ فی الفور خالی کرا لیں اور کسی جائز کام کرنے والے تاجر کو دے دیں تاکہ غضب الٰہی سے بچا جاسکے۔

شیو کی کمائی

(سوال) کیا داڑھی مونڈنے والا (حجام) بھی گناہ گار ہوگا؟ اور اس کی کمائی کا کیا حکم ہے؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل وصورت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے اور مرد وزن کے درمیان جو امتیازات رکھے ہیں ان میں سے ایک امتیاز اور فرق داڑھی ہے۔ داڑھی مرد کی زینت ہے اور یہ ایسی زینت ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیاء ورسل کو مزین فرمایا۔ اگر یہ بدصورتی اور قباحت کا باعث ہوتی تو یہ کسی نبی اور رسول کو اللہ تعالیٰ عطا نہ کرتا۔ داڑھی فطرتِ اسلام میں داخل ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ وَ اِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ » [مسلم، كتاب الطهارة ، باب خصال الفطرة (٢٦١)]

''دس خصلتیں فطرت سے ہیں، ان میں سے مونچھیں تراشنا اور داڑھی بڑھانا بھی ہے۔''

"إعفاء اللحية" کا معنی یہ ہے کہ داڑھی کو اس کے حال پر چھوڑ دے، اس میں کاٹ چھانٹ نہ کرے۔

امام نووی رحمہ اللہ ''اَعْفُوْا ، اَوْفُوْا ، اَرْخُوْا ، اَرْجُوْا اور وَفِّرُوْا پانچ طرح کے الفاظ نقل کر کے فرماتے ہیں: ''ان سب کا معنی ہے داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔'' [شرح مسلم(١٢٩/١)]

قاضی شوکانی رحمہ اللہ ایک مقام پر رقمطراز ہیں:

" اِنَّ هٰذِهِ الْاَشْيَاءَ اِذَا فُعِلَتْ اُتُّصِفَ فَاعِلُهَا بِالْفِطْرَةِ الَّتِىْ فَطَرَهُ اللّٰهُ الْعِبَادَ عَلَيْهَا وَ حَثَّهُمْ عَلَيْهَا وَ اسْتَحَبَّهَا لَهُمْ لِيَكُوْنُوْا عَلٰى اَكْمَلِ الصِّفَاتِ وَ اَشْرَفِهَا صُوْرَةً"[نيل الاوطار(١٣٠/١)]

''ان اشیاء پر عمل کیا گیا تو ان کا عامل اس فطرت سے موصوف ہوا جس پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو پیدا کیا اور ان کو اس پر رغبت دلائی اور ان کے لیے پسند فرمایا تاکہ وہ صورت کے لحاظ سے کامل ترین اور اعلیٰ صفات کے مالک بن جائیں۔''

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

" هِىَ السُّنَّةُ الْقَدِيْمَةُ الَّتِىْ اِخْتَارَهَا الْاَنْبِيَاءُ وَ اتَّفَقَتْ عَلَيْهَا الشَّرَائِعُ فَكَاَنَّمَا اَمْرٌ جِبِلِّىٌّ يَنْطُوُوْنَ عَلَيْهَا " [نيل الاوطار(١٣٠/١)]

''یہ سنت قدیمہ ہے جس کو تمام انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا اور تمام شریعتیں اس پر متفق ہیں کیونکہ یہ پیدائشی اور طبعی چیز ہے جس پر سب اکٹھے ہیں۔''

صحیح مسلم کی اس حدیث سے واضح ہوا کہ داڑھی بڑھانا فطری اور جبلی امر ہے، اس کو منڈوانا یا کتروانا فطرت کو بدلنا ہے اور شیطانی عمل ہے۔ علاوہ ازیں دیگر متعدد صحیح احادیث میں داڑھی رکھنے کا حکم موجود ہے اور یہ بات اصول میں ثابت ہے کہ

حکم وجوب پر دلالت کرتا ہے اور وجوب پر عمل نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور جو شخص کسی دوسرے شخص کی داڑھی مونڈتا ہے وہ اس کے ساتھ گناہ پر تعاون کرتا ہے جو شرعاً بالکل منع ہے۔ جب داڑھی مونڈنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے تو اس پر تعاون کرنا گناہ پر تعاون ہے اور شرعاً حرام ہے۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ جس کام کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اس کی اجرت اور کمائی بھی حرام ہے لہٰذا داڑھی مونڈنا پھر اس پر اجرت لینا حرام ہے۔ اسی طرح داڑھی مونڈنے والے کو دکان کرائے پر دینا اس کے ساتھ فعل حرام پر تعاون ہے، یہ بھی حرام ہے۔

فوٹو گرافی کا پیشہ

سوال کیا فوٹو گرافی کا پیشہ اختیار کرنا اسلام کی رو سے جائز ہے؟

جواب تصویریں بنانا کتاب وسنت کی رو سے قطعاً ناجائز اور کبیرہ گناہ ہے۔ آج کل تو یہ فعل اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اسمبلی سے لے کر ایک کچی جھونپڑی تک ہمارے ملک کے در و دیوار تصاویر سے مزین نظر آتے ہیں۔ جا بجا تصاویر آویزاں کر کے اللہ کی رحمت سے دوری اور لعنت کو حاصل کیا جا رہا ہے اور یہ وبا اس قدر پھیل چکی ہے کہ اس نے اپنی لپیٹ میں ہر خاص و عام کو لے لیا ہے۔ کوئی گناہ پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے تو اس گناہ کو گناہ کہنا ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بہر صورت کوئی گناہ کتنا ہی عام ہو جائے اس سے شرعی حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زبان نبوت سے صادر ہونے والا ایک ایک حکم اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔ سابقہ اقوامِ عالم میں کفر و شرک کی گمراہی انہی تصاویر کی بنا پر آئی تھی۔ شیطان نے انھیں ورغلا کر تصویر سازی کی لعنت میں گرفتار کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أُولَئِكَ إِذَا مَاتَ مِنْهُمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا ثُمَّ صَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّورَةَ أُولَئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ » [بخاری ، کتاب الجنائز: باب بناء المسجد على القبر(۱۳۴۱)]

''ان اہل کتاب میں کوئی نیک آدمی مر جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے پھر اس میں تصویریں رکھتے، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین لوگ ہیں۔''

نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ لَمْ يَشِعِ الشِّرْكُ فِي الْأُمَمِ وَ لَمْ يَدْخُلْ فِيهِمْ إِلَّا مِنْ بَابِ التَّصْوِيرِ '' [تنقیح (۲۰۲/۳)]

''امتوں میں شرک کا پھیلاؤ اور داخلہ تصویر کی جانب سے ہوا۔''

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ كَانَ غَالِبُ كُفْرِ الْأُمَمِ مِنْ جِهَةِ الصُّوَرِ '' [فتح الباری(۱۷/۸)]

''اکثر امتوں میں کفر کی بیماری تصویروں کے ذریعے داخل ہوئی۔''

موجودہ دور میں جب کہ فحاشی، عریانی، بے حیائی و بے پردگی کا سیل رواں تمام حدود پھلانگ چکا ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ

یہ سارا فتنہ تصاویر کا شاخسانہ ہے اور یہ پورا سیلاب وی سی آر، ٹی وی، گندے اخبارات و رسائل کے ذریعے عروج پکڑ رہا ہے۔
تصویر کی حرمت پر دلائل بے شمار ہیں، چند ایک درج کیے جاتے ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَّوْمَ الْقِیَامَةِ الَّذِیْنَ یُضَاهِئُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰهِ »[بخاری، کتاب اللباس: باب ماوطئ من التصاویر(٥٩٥٤)]

''قیامت والے دن سخت ترین عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق میں نقل اتارتے ہیں۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

« وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ یَخْلُقُ کَخَلْقِیْ فَلْیَخْلُقُوْا ذَرَّةً اَوْ لِیَخْلُقُوْا حَبَّةً اَوْ شَعِیْرَةً »[بخاری، کتاب التوحید: باب قول الله تعالیٰ ......الخ (٧٥٥٩)]

''اس سے بڑا ظالم کون ہے جو عمل تخلیق میں میرا مقابلہ کرے؟ انھیں چاہیے کہ ایک چیونٹی یا گندم یا جو کا ایک دانہ پیدا کرکے دکھائیں۔''

صاحب تنقیح الرواۃ رقمطراز ہیں:

"وَ فِیْهِ حُرْمَةُ التَّصْوِیْرِ وَ اِنَّهٗ مِنْ اَعْظَمِ الْمَعَاصِیْ وَ الْمَنَاهِیْ لِاَنَّهٗ تَشَبُّهٌ بِالْخَالِقِ"

[تنقیح الرواۃ(٢٥٣/٣)]

''اس حدیث میں تصویر کی حرمت پر دلیل ہے اور یقیناً یہ سب سے بڑے گناہوں اور منع کردہ اشیاء میں سے ہے، اس لیے کہ اس میں خالق کے ساتھ مشابہت ہے۔''

نواب صدیق حسن رحمہ اللہ کی کتاب میں ہے:

''اس حدیث میں تصویر کو استعمال کرنے والے کے لیے وعید ہے، جس نے تصویر بنائی، اس نے خالق کے ساتھ اس کام میں مشابہت کی جو اس کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں اور جس شخص نے (مصور کی بنائی ہوئی) تصویر کو استعمال کیا گویا کہ وہ مصور کے فعل سے راضی ہے اور حدیث اگرچہ تکیہ کے متعلق وارد ہوئی ہے لیکن یہ ہر اس چیز کو شامل ہے جس میں تصویر ہے خواہ وہ کپڑا، گاؤ تکیے، کہنی کے نیچے سہارا دینے والی اشیاء سے ہو یا برتن، اسلحہ یا کتابوں کی جنس سے ہو۔ خواہ اس نے تصویر کو ہاتھ سے بنایا ہو یا کسی آلہ سے۔ اس لیے کہ آلات کے عمل کے ذریعے حاصل ہونے والی شکل پر بھی تصویر کا اطلاق درست بیٹھتا ہے۔ اس کا حکم تصویر کا حکم ہوگا اور اس کا استعمال تصویر کے استعمال ہی کی طرح ہوگا۔'' [الدین الخالص بحواله تنقیح الرواۃ(٢٥٣/٣)]

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ تصویر بنانے والے، خواہ وہ تصویر ہاتھ سے بنائیں یا آلے کے ذریعے، اس کو استعمال کرنے والے دونوں قسم کے افراد اس وعید کے مستحق ہیں جو حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« وَ مَنْ صَوَّرَ صُوْرَةً عُذِّبَ وَ کُلِّفَ اَنْ یَّنْفُخَ فِیْهَا وَ لَیْسَ بِنَافِخٍ »[بخاری، کتاب التعبیر: باب

من كذب في حلمه (٧٠٤٢)]

''جس شخص نے کوئی تصویر بنائی، اسے عذاب دیا جائے گا اور اس بات کا مکلف ٹھہرایا جائے گا کہ وہ اس تصویر میں روح پھونکے اور وہ پھونکنے والا نہیں ہوگا۔''

سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَ لَا تَصَاوِيرُ »[بخاری، كتاب اللباس: باب التصاوير (٥٩٤٩)]

''جس گھر میں کتا اور تصویریں ہوں اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔''

مذکورہ بالا احادیث سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ تصویر بنانے والے افراد قیامت کے روز سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے اور ان تصویروں میں روح پھونکنے کے لیے انھیں کہا جائے گا لیکن وہ ان میں روح نہیں پھونک سکیں گے۔ تصویر بنانا اللہ تعالیٰ کے ساتھ صفت خلق میں مشابہت ہے اور اس فعل پر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے جس بنا پر یہ کبیرہ گناہ ہے۔ یہ وعید ہر قسم کی تصویر کے متعلق ہے خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، کپڑا، کاغذ، در و دیوار یا نوٹوں اور کتابوں پر چھاپی جائے، خواہ ہاتھ سے بنائی جائے یا آلات کے ذریعے۔ ہمیں ان سے اجتناب کرنا چاہیے اور اسی طرح وہ آدمی جو تصاویر بنواتا ہے وہ چونکہ اس فعل پر راضی ہے، اس کی رضامندی کی بنا پر وہ بھی ان وعیدوں کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ تصاویر کا کاروبار اور خرید و فروخت کرنا بھی حرام ہے جیسا کہ اسلام میں شراب حرام ہے تو اس شراب کو بیچ کر قیمت لینا بھی حرام ہے۔

آج کل چونکہ ہماری حکومت اسلام سے بالکل عاری ہے اور ملک میں رہنے والے افراد پر یہ پابندی عائد ہے کہ وہ اپنا شناختی کارڈ بنوائیں اور تمام اداروں میں کام کرنے کے لیے شناختی کارڈ کے بغیر حکومت کوئی بات نہیں سنتی تو ایسے عالم میں اتنی تصویر بنانا جس کی ضرورت ہے اسی طرح جائز ہے جیسے موت کی کشمکش میں مبتلا انسان کو مردار وغیرہ کھانے کی اجازت ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَ لَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ [البقرة:١٧٣]

''جو شخص مجبور کر دیا جائے اور وہ بغاوت کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر (جان بچانے کے لیے حرام کھانے میں) کوئی گناہ نہیں۔''

ذخیرہ اندوزی

سوال ذخیرہ اندوزی کو اسلام کس نظر سے دیکھتا ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں۔

جواب ذخیرہ اندوزی کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَحْتَكِرُ اِلَّا خَاطِئٌ» [مسلم ، كتاب البيوع: باب تحريم الاحتكار في الأقوات (١٦٠٥)]

''ذخیرہ اندوزی صرف نافرمان ہی کرتا ہے۔''

ذخیرہ اندوزی کا مطلب مہنگا کرنے کے لیے کسی چیز کا ذخیرہ کرنا ہے۔جس طرح آج کل کئی لوگ بازار سے کوئی جنس خرید کر اس کی قلت پیدا کر دیتے ہیں اور جب وہ چیز لوگوں کو نہیں ملتی تو قیمت بڑھا کر بازار میں لے آتے ہیں۔ اگر کوئی چیز بازار میں نایاب ہو یا کم ملتی ہو تو اسے ذخیرہ کرنا حرام ہے ۔ اگر کوئی جنس بازار میں وافر مقدار میں موجود ہے اور ذخیرہ کرنے سے لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں تو ذخیرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ بنونضیر کی کھجوروں میں سے اپنے اہل وعیال کے لیے ایک سال کا خرچ رکھ لیتے اور باقی فروخت کر دیتے تھے۔

بیع سلم کا حکم

(سوال) کیا بیع سلم جائز ہے؟ نیز بیع سلم کی وضاحت کر دیں۔

(جواب) بیع سلم کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ بیع سلم یہ ہے کہ کوئی صاحب ضرورت کی بنا پر اپنی جنس تیار ہونے سے پہلے ہی اس کی بیع کر لیتا ہے کہ مجھے اتنی قیمت ابھی ادا کر دو تو جنس کے تیار ہونے پر میں اتنی جنس آپ کو دے دوں گا۔اس کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ لوگ ایک ایک ، دو دو اور تین تین سالوں تک بیع سلم کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنۡ اَسۡلَفَ فِیۡ شَیۡءٍ فَلۡیُسۡلِفۡ فِیۡ کَیۡلٍ مَّعۡلُوۡمٍ وَ وَزۡنٍ مَعۡلُوۡمٍ اِلٰی اَجَلٍ مَعۡلُوۡمٍ »[بخاری، کتاب السلم: باب السلم فی وزن معلوم(۲۲٤۰)]

’’جو شخص بیع سلم کرتا ہے وہ ماپی جانے اور تولی جانے والی معلوم اشیاء میں معلوم مدت تک بیع کرے۔‘‘

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس بیع پر برقرار رکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے بعد بھی یہ بیع کرتے رہے جیسا کہ بخاری شریف کی کئی احادیث سے ثابت ہے۔

زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والے کی سزا

(سوال) کیا کسی کی جائداد پر ناجائز قبضہ کر لینا جرم ہے؟ اور اس کی سزا کیا ہے؟

(جواب) یہ عمل ناجائز اور حرام ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا:

« فَاِنَّ دِمَاءَ کُمۡ وَ اَمۡوَالَکُمۡ وَ اَعۡرَاضَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ حَرَامٌ کَحُرۡمَةِ یَوۡمِکُمۡ هٰذَا فِیۡ شَهۡرِکُمۡ هٰذَا فِیۡ بَلَدِکُمۡ هٰذَا » [بخاری، کتاب العلم : باب قول النبی رب مبلغ أوعی من سامع(٦۷)، مسلم(۱٦۷۹)، مسند احمد (٤۰/٥)، إرواء الغلیل (۲۷۸/٥)]

’’بے شک تمھارے خون اور تمھارے اموال اور تمھاری عزتیں تم پر اسی طرح حرام ہیں جیسے تمھارا یہ آج کا دن حرمت والا ہے، جو تمھارے اس مہینے اور تمھارے اس شہر میں واقع ہوا ہے۔‘‘

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس ساری گفتگو سے مراد مالوں، جانوں اور عزتوں کی حرمت کی شدت کے ساتھ تاکید ہے اور ان کی پامالی سے ڈرانا ہے۔'' [شرح مسلم للنووی(١١/١٤١)]

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَأْخُذَنَّ اَحَدُكُمْ مَتَاعَ اَخِيهِ لَاعِبًا وَ لَا جَادًّا وَ مَنْ اَخَذَ عَصَا اَخِيهِ فَلْيَرُدَّهَا » [ابوداؤد، كتاب الأدب : باب من ياخذ الشئ على المزاح(٥٠٠٣)،ترمذی(٢١٦٠)]

''تم میں سے کوئی شخص بھی ہرگز اپنے بھائی کا سامان نہ لے، نہ ہنسی و مذاق کرتے ہوئے اور نہ سنجیدگی کے ساتھ اور جس نے اپنے بھائی کی لاٹھی پکڑ لی اسے چاہیے کہ وہ واپس کر دے۔''

سیدنا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَأْخُذَ عَصَا اَخِيهِ بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ قَالَ ذٰلِكَ لِشِدَّةِ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ مِنْ مَالِ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ » [ابن حبان، كتاب الجنايات: باب ذكر الخبر الدال على ان...... الخ (٥٩٧٨)، الموارد، مسند احمد(٥/٤٢٥)، بیهقی(٦/١٠٠)، مجمع الزوائد (٤/١٧١)، غاية المرام (ص/٢٦٢)]

''مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کی لاٹھی اس کی رضا مندی کے بغیر لے۔'' (راوی حدیث نے) کہا: ''اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا مال مسلمان پر حرام کرنے میں جو شدت اختیار کی ہے اس وجہ سے آپ ﷺ نے یہ فرمایا۔''

اس مفہوم کی کئی ایک صحیح روایات اور بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ نے بڑی شدت اور سختی کے ساتھ مسلمان کے مال کو مسلمان پر حرام قرار دیا ہے حتیٰ کہ ایک لکڑی بھی مسلمان کی اجازت کے بغیر لینے سے منع کر دیا ہے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا، آپ کے پاس دو آدمی زمین کے جھگڑے میں آئے۔ ایک نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اس نے میری زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرے گواہ کہاں ہیں؟'' اس نے کہا: ''میرے پاس گواہ نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر اس کی قسم ہوگی۔'' امراء القیس نے کہا: ''پھر تو قسم کھا کر یہ زمین لے جائے گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرے لیے اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' جب وہ قسم کھانے کے لیے کھڑا ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ظلم سے زمین چھین لی وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر ناراض ہوگا۔''

[احمد (٤/٣١٧)، شرح معانی الآثار(٤/٢٤٨)]

سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

« مَنْ ظَلَمَ مِنَ الْاَرْضِ شَيْئًا طُوِّقَهُ مِنْ سَبْعِ اَرَضِينَ » [بخاری، كتاب المظالم: باب إثم من ظلم شيئا من الأرض(٢٤٥٢)، مسلم، كتاب المساقاة: باب تحريم الظلم و غصب الأرض وغيره(١٦١٠)]

''جس نے زمین (کے معاملہ) میں سے ذرا بھی ظلم کیا اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں کا طوق پہنا دے گا۔''

ابو سلمہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا لوگوں کے درمیان جھگڑا تھا انھوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا تو عائشہ نے کہا: ''اے ابو سلمہ! زمین کے جھگڑوں سے اجتناب کرو۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ایک بالشت برابر زمین ظلم سے حاصل کی تو زمین کا وہ حصہ سات زمینوں تک اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔'' [بخاری، کتاب المظالم: باب إذا أذن له أو أحله و لم يبين كم هو(٢٤٥٣)]

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰى سَبْعِ اَرَضِيْنَ »[بخاری، کتاب المظالم : باب إذا أذن له أو أحله (٢٤٥٤)]

''جس شخص نے زمین میں سے کچھ بھی ناحق لیا تو اسے قیامت والے دن اس کے بدلے سات زمینوں تک دھنسا دیا جائے گا۔''

یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

« اَيُّمَا رَجُلٍ ظَلَمَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰى سَبْعِ اَرَضِيْنَ ثُمَّ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ » [ابن حبان(١١٦٧)، الموارد،طبرانی کبیر(٢٧٠/٢٢)، مسند احمد(١٧٣/٤)، مجمع الزوائد (١٧٠/٤)]

''جس شخص نے بھی زمین میں سے ایک بالشت برابر ظلم کیا اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں تک دھنسا دے گا پھر قیامت والے دن وہ اسے لوگوں کے درمیان فیصلہ ہونے تک طوق پہنائے گا۔''

ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَعْظَمُ الْغُلُوْلِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذِرَاعُ اَرْضٍ يَسْرِقُهٗ رَجُلٌ فَيُطَوَّقُهٗ مِنْ سَبْعِ اَرَضِيْنَ »

[فتح الباری(١٠٥/٥)]

''اللہ کے ہاں قیامت والے دن سب سے بڑی خیانت ایک ہاتھ زمین ہو گی جسے آدمی چوری کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ساتھ زمینوں تک طوق پہنائے گا۔''

قاضی شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''غصب کرنے والا گناہ گار ہے اور وہ چیز جو اس نے غصب کی ہے اسے واپس کرنا اس پر واجب ہے، کسی مسلمان کا مال اس کی رضا مندی کے بغیر حلال نہیں۔'' [الدرر البهية(ص/٨٨)]

نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''غاصب اس لیے گناہ گار ہے کہ اس نے اپنے غیر کا مال باطل طریقے سے کھایا ہے یا اس پر زیادتی کرتے ہوئے غالب ہو گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اپنے مالوں کو آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ۔'' [الروضة الندية(١٤٩/٢)]

مذکورہ بالا صحیح دلائل سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان کی زمین، اس کے مال و متاع پر ناجائز تصرف و قبضہ کرنا حرام ہے اور کبیرہ گناہ ہے، اگر کوئی شخص کسی کی زمین پر قبضہ کر کے کاشتکاری کرے یا مکان تعمیر کرے تو اس سے زمین واپس لی جائے گی اور اسے صرف اس کے اخراجات ادا کر دیے جائیں گے۔

خورد ونوش کی اشیاء ادھار لینا

سوال کیا عام کھانے پینے کی چیزیں ادھار لینا اسلام میں جائز ہے؟

جواب ایسی اشیاء کے ادھار لینے کا شریعت میں جواز موجود ہے۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے ادھار اناج خریدا اور اپنی زرہ بطور رہن اس کے پاس رکھی۔''[بخاری، کتاب الرھن: باب من رھن درعه(۲۵۰۹)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کی اشیاء ادھار لی جا سکتی ہیں۔

قرآن کی تعلیم پر معاوضہ لینا

سوال کیا قرآن مجید کی تعلیم خطبۂ جمعہ اور امامت وغیرہ پر اجرت لینا جائز ہے؟

جواب قرآن مجید کی تعلیم، خطبہ جمعہ، امامت وغیرہ پر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کی ممانعت کے بارے میں قرآن و سنت کے اندر کوئی صریح نص موجود نہیں ہے جب کہ اس کے جواز کے دلائل موجود ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔فرماتے ہیں:

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا ایک بستی سے گزر ہوا،بستی والوں نے طلب کرنے پر بھی ان کی مہمان نوازی نہ کی۔ اچانک ان کے سردار کو کسی زہریلی چیز نے کاٹ لیا۔ان کے افراد صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور پوچھا:''تم میں کوئی دم کرنے والا ہے؟'' صحابہ میں سے ایک نے اجرت لے کر دم کرنے کی ہامی بھرلی۔تو انھوں نے بکریوں کے ایک ریوڑ کا وعدہ کر لیا۔صحابیِ رسول نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر اس پر دم کیا اور متاثرہ جگہ اپنا لعاب لگایا تو وہ آدمی بالکل تندرست ہو گیا۔وہ صحابی بکریاں لے کر واپس آیا تو دوسرے ساتھیوں نے کہا:''تو نے کتاب اللہ پر اجرت لی ہے۔'' گویا انھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا، پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہا:''اے اللہ کے رسول! اس نے اللہ کی کتاب پر اجرت لی ہے۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ »[بخاری، کتاب الطب:باب الشروط فی الرقیة (۵۷۳۷)]

''سب سے زیادہ جس چیز پر تم اجرت لینے کا حق رکھتے ہو وہ اللہ کی کتاب ہے۔''

صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن پر اجرت لی جا سکتی ہے۔اس میں قرآن کی تعلیم، امامت اور خطبہ جمعہ

بھی داخل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ عام ہیں اور ان میں وہ شامل ہیں۔ اگر اجرت درست نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ یہ نہ کہتے کہ میرا حصہ بھی نکالو جیسا کہ صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ تو ہمیشہ حلال اور پاکیزہ چیز ہی استعمال کرتے تھے۔

دوسری دلیل نکاح میں خاوند پر بیوی کے لیے حق مہر دینا ضروری ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا نکاح قرآن مجید کی تعلیم کو حق مہر ٹھہرا کر کر دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِذْهَبْ فَقَدْ اَنْكَحْتُهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ » [بخاری، کتاب النکاح: باب التزویج علی القرآن (٥١٤٩)]

''جا، میں نے اس قرآن کے بدلے جو تیرے پاس ہے تیرا اس کے ساتھ نکاح کر دیا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے خود قرآن مجید کی تعلیم کی اجرت دلوائی ہے۔ اگر اجرت درست نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کبھی قرآن کی تعلیم کو حق مہر مقرر نہ کرتے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے:

''اس سے قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہوا۔'' [فتح الباری (١٢١/٩)]

لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآن کی تعلیم پر اجرت لی جا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

جی پی فنڈ کی شرعی حیثیت

(سوال) ہم سرکاری ملازمین کا واسطہ جی پی فنڈ سے پڑتا ہے کیا شریعت اسلامیہ کی رو سے یہ جائز ہے؟

(جواب) جی پی فنڈ سے مراد وہ رقم ہے جو سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے حکومت ہر ماہ کاٹتی ہے پھر ان کی ریٹائرمنٹ پر مع اضافہ انھیں دے دیتی ہے۔ قرآن وسنت کی رو سے زائد وصول شدہ رقم سود ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ٢٧٨، ٢٧٩]

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ اور جو کچھ سود سے باقی رہ گیا ہے، چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو بس اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اگر تم نے توبہ کر لی تو تمھارے لیے تمھارا اصل مال ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اصل مال لینے کا حکم فرمایا ہے اور زائد رقم کی وصولی سے روک دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ سودی رقم لینا ایمان کے منافی ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کے مترادف ہے۔ اسی طرح احادیث میں سود لینے والوں پر لعنت مذکور ہے۔ لہٰذا ملازم آدمی صرف اپنی اصل رقم جو اس کی کاٹی جاتی ہے وہی وصول کر سکتا

ہے۔ زائد رقم اگر لیتا ہے تو وہ اس کا مالک نہیں۔ وہ یقیناً سود کھا کر لعنت کا مستحق بنتا ہے اور یہ بات حکومتی طبقہ جانتا ہے کہ جی پی فنڈ میں جو زائد رقم دی جاتی ہے وہ سود ہے جیسا کہ گورنمنٹ اکاؤنٹ میں جو فارم ملتا ہے اس کے خانہ نمبر۱۴ میں یہ بات درج ہے کہ ''کیا ملازم اپنی جمع شدہ رقم پر سود کا خواہش مند ہے یا نہیں؟'' اگر ملازم چک دے کہ میں سود وصول نہیں کروں گا تو اس کی جمع شدہ رقم کو سود کی آلائش و آمیزش سے پاک رکھا جاتا ہے۔ اس لیے تمام ملازمین کو اس رقم کی وصولی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

نکاح کے احکام

WWW. KITABOSUNNAT.COM

نکاح کے لیے ذات برادری ایک ہونا

(سوال) کیا نکاح کے لیے میاں بیوی کی ذات کا ایک ہونا ضروری ہے؟ کیا کوئی سید غیر سید سے شادی کر سکتا ہے؟

(جواب) لڑکی سیدہ ہاشمیہ ہو یا کوئی اور اس کا نکاح کسی بھی مسلمان لڑکے سے بلاتردد درست ہے۔ کیونکہ ترجیح اور برتری کی بنیاد نسلی امتیازات اور خاندانی حسب نسب، جاہ وجلال، مال وزر، ذات و برادری وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ یہ تقویٰ، پرہیزگاری، اللہ کے خوف وغیرہ جیسی صفات عالیہ پر موقوف ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اس کی وضاحت اچھی طرح فرما دی تھی کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر، سفید کو سیاہ پر کوئی برتری نہیں۔ ہر مسلمان کی حرمت برابر مقدس ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ [الحجرات:١٣]

''اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تم سب کو مختلف قومیں اور قبیلے اس لیے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان لیا کرو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا خبردار ہے۔''

یعنی ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی بنا پر تم سب برابر ہو لہٰذا کسی بھی فرد کا اپنے حسب نسب پر فخر کرنا اور دوسرے کو حقیر و ذلیل سمجھنا جہالت و بے وقوفی ہے۔ اگرچہ باعتبار اصلی تم سب ایک اور یکساں ہو لیکن تمھارا مختلف خاندانوں، قبیلوں اور قوموں میں منقسم ہونا ایک فطری امر تھا۔ اس لیے ہم نے تمھاری تقسیم کر دی مگر اس تقسیم کا مقصد برتری اور کمتری نہیں، عزت اور ذلت کا معیار قائم کرنا نہیں بلکہ ایک دوسرے کی پہچان اور معرفت ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی ایک کو دوسرے پر خاندانی حسب نسب اور نسلی امتیازات کی وجہ سے کوئی ترجیح نہیں، ترجیح تو تقویٰ و پرہیزگاری پر موقوف ہے، لہٰذا سید اور غیر سید یکساں ہیں اور اولاد آدم ہی سے ہیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات:١٠]

''بے شک مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور مسلم معاشرے کے یکساں فرد اور معزز ارکان ہیں۔ یعنی

سیدہ لڑکی کا نکاح غیر سید مسلمان کے ساتھ جائز ہے۔ اس کی متعدد مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں:

① رسول اللہ ﷺ نے اپنی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیا تھا حالانکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ غلام تھے اور بی بی زینب رضی اللہ عنہا قریشی خاتون تھیں۔

② اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا نکاح فاطمہ بنت قیس القرشیہ رضی اللہ عنہا سے ہوا۔

③ سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی بہن سے ہوا۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ حبشی غلام تھے جن کو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آزاد کیا تھا اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ قبیلہ قریش کے سربرآوردہ اور معروف تاجر تھے۔

④ ابو حذیفہ بن عتبہ بدری رضی اللہ عنہ نے اپنی بھتیجی ہند بنت ولید بن عتبہ کا نکاح سیدنا سالم رضی اللہ عنہ، جو ایک انصاری عورت کے آزاد کردہ غلام تھے، کے ساتھ کر دیا۔

⑤ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی ام کلثوم بنت فاطمہ کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا تھا۔

⑥ نبی کریم ﷺ نے اپنی دونوں بیٹیوں سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہما کا نکاح یکے بعد دیگرے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا تھا جب کہ آپ ہاشمی اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اموی تھے۔

⑦ سیدنا علی بن حسین جو زین العابدین کے نام سے معروف ہیں، کا نکاح شہر بانو بنت یزدجرد بن شہریار سے ہوا۔

لہٰذا کتاب و سنت کی رو سے نکاح میں کفو کے لیے صرف دین کی شرط ہے اور دین کے علاوہ باقی چیزوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ ہمارے ملک میں جو یہ بات رائج اور معروف ہے کہ اپنی برادری کے علاوہ کسی دوسری برادری میں رشتہ نہیں کرنا چاہیے، سراسر غلط اور جہالت پر مبنی ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ ساری باتیں قرآن و سنت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔

اسلام میں جہیز کی حیثیت

سوال جہیز نہ ہونے کی وجہ سے کتنے ہی گھرانوں کی بچیاں سنتِ نکاح سے محروم ہیں جہیز کی شرعی حیثیت پر آشکار فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؟

جواب شادی سے پہلے رشتے کی بات چیت کے وقت لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کے سرپرستوں سے کسی بھی چیز کا مطالبہ کرنا خواہ وہ جائداد منقولہ یا غیر منقولہ کی صورت میں ہو یا نقدی اور مختلف سامان کی صورت میں ہو اور رشتے کی منظوری کو اس پر معلق و موقوف کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ اسی طرح لڑکی والوں کی طرف سے پیش قدمی کرتے ہوئے لڑکے والوں سے یہ کہنا کہ اگر آپ یہ رشتہ منظور کر لیں تو ہم جہیز میں نقد اور فلاں فلاں اشیاء دیں گے، سراسر غلط اور شریعت کے خلاف ہے۔ اس لین دین کی رسم کا نام چاہے جو بھی رکھا جائے یہ شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:

① ہر مسلمان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے مطابق عمل کرنا اور زندگی کے تمام معاملات میں آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾ [الأحزاب:٢١]

''تم میں سے جو کوئی اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔''

پھر آپ ﷺ کے بعد آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسوۂ حسنہ عملی نمونہ ہے جس کی پیروی اور اتباع و اقتدا سب کے لیے ضروری ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک زندگی کے تمام افعال ختنہ، عقیقہ، منگنی اور شادی وغیرہ کی تقریبات کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے انجام دیا ہے لیکن ان کے ایام ہائے زندگی میں یہ رسومات اور مطالبات ہمیں نہیں ملتے۔ الغرض شرع میں اس کا وجود تک نہیں ہے۔

② ہر مسلمان کے لیے شریعت مطہرہ میں شادی کے موقع پر یا رشتہ طے کرتے وقت یا شادی کے بعد لڑکی والوں پر کسی قسم کا خرچ اور بوجھ نہیں رکھا گیا۔ بلکہ یہ سارا بوجھ لڑکی کا لڑکے پر رکھا گیا ہے کہ یہ اس کو ضروریات زندگی کے اسباب مہیا کرے۔ اس لیے شوہر کو قرآن میں قوام کہا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّ بِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ [النساء:٣٤]

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس واسطے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نان و نفقہ اور مہر وغیرہ تمام اخراجات مرد کے ذمے ہیں۔ تو لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کے سرپرستوں سے کسی مال و متاع کا مطالبہ شریعت کی منشا کے خلاف ہے۔

③ ہندو مذہب میں لڑکی کو والدین سے وراثت نہیں ملتی، اس لیے لڑکے والے چاہتے ہیں کہ جیسے بھی ہو اور جس شکل میں بھی ہو لڑکی والوں سے زیادہ سے زیادہ مال و متاع حاصل کر لیا جائے، اس لیے وہ شادی کے موقع پر مذکورہ مطالبہ کرتے ہیں اور لڑکی والے ان کے مطالبے کو پورا کرتے ہیں۔ انھی کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی اپنی بیٹیوں کو وراثت سے محروم کرتے ہیں، حالانکہ وراثت کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور قرآن نے انھیں حدود اللہ کہا ہے اور اس کے ادا کرنے پر عظیم کامیابی کی خوشخبری سنائی ہے اور وراثت سے محروم کرنے پر ہمیشہ جہنم میں رہنے کی وعید فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ [النساء:١٣،١٤]

''یہ اللہ کی حدیں ہیں، جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اس کو وہ جنت میں داخل کرے گا، جس کے

نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ اس کو جہنم میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہوگا۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ وراثت کو ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ہے اور جو لوگ اس کی ادائیگی نہیں کرتے وہ اللہ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے ابدی جہنم کی وعید ہے اور جہیز درحقیقت وراثت کی نفی ہے۔

④ ان وجوہات کے علاوہ جہیز کے نقصانات اس قدر ہیں کہ عام طور پر غریب لوگوں کی بیٹیوں کا نکاح جہیز نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتا اور نوجوان لڑکیاں اسی طرح گھر میں بیٹھ کر اپنی عمر برباد کر دیتی ہیں اور کئی لڑکیاں نکاح نہ ہونے کے باعث مختلف جرائم کا شکار ہو جاتی ہیں جس کے معاشرے پر بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خلاف شرع کاموں سے محفوظ فرمائے اور جہیز جیسی لعنت سے بچنے کی توفیق دے۔ (آمین!)

اگر شادی کے لیے خرچہ محدود ہو تو؟

سوال کیا شادی کے لیے فراوانی کا ہونا ضروری ہے اگر تنگدست شخص شادی کرلے تو کوئی شرعی قباحت تو نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب دنیا کے رسوم و رواج سے دور رہ کر اگر آپ اسلامی نقطہ نظر سے سوچیں تو آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، آپ کا فقر اور تنگدستی ممکن ہے کہ اللہ نکاح کے ذریعے دور کر دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [النور: ٣٢]

''تم میں سے جو مرد عورت بے نکاح ہوں ان کا نکاح کر دو اور اپنے نیک غلام اور باندیوں کا بھی اور وہ مفلس ہوں تو اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ تعالیٰ وسعت والا، علم والا ہے۔''

یعنی محض غربت اور تنگ دستی نکاح میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے، ممکن ہے نکاح کے بعد اللہ تعالیٰ تنگ دستی، فقر اور محتاجی کو اپنے خاص فضل و کرم سے وسعت اور فراخی میں بدل دے۔

نبی کریم ﷺ کی صحیح حدیث ہے: '' تین شخص ایسے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ ضرور مدد کرتا ہے، ایک نکاح کرنے والا جو پاکدامنی کی نیت سے نکاح کرتا ہے، دوسرا مکاتب غلام جو ادائیگی کی نیت رکھتا ہے اور تیسرا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا۔''

[ترمذی، ابواب فضائل جهاد: باب ما جآء فی المجاهد والمكاتب والنكاح (١٦٥٥)، عبد الرزاق (٩٥٤٢)، مستدرك حاكم (٢/٢١٧)، نسائی، كتاب الجهاد: باب فضل الروحة فی سبيل الله (٣١٢٢)، ابن ماجه، كتاب العتق، باب المكاتب (٢٥١٨)، صحيح ابن حبان (١٦٥٣)، الموارد، مسند ابی يعلی (١١/٤١٠)، شرح السنة (٧١٩)]

سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: '' ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، اس نے کہا: '' اے اللہ کے رسول!

میں اس لیے آئی ہوں کہ آپ کے لیے اپنے نفس کو ہبہ کروں۔" رسول اللہ ﷺ نے اس پر اوپر سے نیچے تک نظر دوڑائی پھر اپنا سر نیچے کر لیا۔ جب اس عورت نے دیکھا کہ آپ نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا تو بیٹھ گئی۔ آپ کے صحابہ میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا، اس نے کہا: "اے اللہ کے رسول! اگر آپ کو اس کی حاجت نہیں تو اس کو میرے ساتھ بیاہ دیجیے۔"

آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تیرے پاس کوئی چیز ہے؟" اس نے کہا: "اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! (میرے پاس کچھ) نہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنے گھر جا کر دیکھ کہ تیرے پاس کچھ ہے کہ نہیں۔" وہ چلا گیا پھر واپس آیا اور اس نے کہا: "اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! میں نے کچھ نہیں پایا۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تلاش کر اگرچہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔" وہ واپس گیا اور پھر آیا اور کہنے لگا: "اے اللہ کے رسول! لوہے کی انگوٹھی بھی نہیں ملی لیکن میرا یہ تہ بند ہے، اس کا آدھا حصہ اسے دے دوں گا۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو اپنے تہ بند کے ساتھ کیا کرے گا؟ اگر تو پہنے گا تو اس عورت پر اس میں سے کچھ نہ ہوگا اور اگر یہ عورت پہن لے گی تو تیرے اوپر کچھ نہ ہوگا۔" وہ آدمی بیٹھ گیا، یہاں تک کہ اس کی مجلس لمبی ہوگئی، وہ پھر کھڑا ہوا اور چل دیا، رسول اللہ ﷺ نے اسے منہ پھیر کر جاتے ہوئے دیکھا تو اسے بلایا۔ جب وہ آیا تو آپ نے کہا: "تیرے پاس قرآن کریم میں سے کیا ہے؟" اس نے کہا: "فلاں فلاں سورتیں۔" آپ ﷺ نے کہا: "تو انھیں اچھی طرح یاد رکھتا ہے۔" اس نے کہا: "ہاں!" آپ ﷺ نے فرمایا: "جا، میں نے ان سورتوں کے عوض اس عورت سے تیرا نکاح کر دیا۔" [بخاری، كتاب النكاح: باب تزويج المعسر (٥٠٨٧)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح کیلئے شریعت میں لمبے چوڑے اخراجات نہیں ہیں، جس صحابی کا نکاح رسول اللہ ﷺ نے کیا اس کے پاس تو سوائے تہ بند کے کچھ نہ تھا۔ آج کون سا ایسا شخص ہے جس کے پاس کم از کم ایک جوڑا کپڑوں کا نہ ہو۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے پاس لباس وافر ہیں، رہائش کے لیے گھر موجود ہے۔ صحابی سے بڑھ کر معاشی حالت درست ہے۔ لہٰذا آپ رسومات اور رواجوں سے ہٹ کر سنت نبوی کے مطابق نکاح کروالیں۔ حق مہر کی بھی شرع میں کوئی مقدار کم یا زیادہ متعین نہیں، حسب استطاعت مہر ادا کر دیں۔ بدکاری و فحاشی کے اس سیل رواں میں پاکدامنی اختیار کرنا انتہائی ضروری ہے اور نکاح بدکاری سے بچنے کا بہترین راستہ ہے۔ اس لیے گھر والوں کی بات تسلیم کر کے نکاح کے بندھن میں بندھ جائیں، اللہ تعالیٰ مالی مشکلات کو اپنے فضل و کرم سے درست کر دے گا۔

بے نماز شخص کو لڑکی کا رشتہ دینا

سوال کیا کوئی شخص اپنی بیٹی کا رشتہ بے نمازی سے کر سکتا ہے؟

جواب بے نماز کو لڑکی کا رشتہ نہیں دیا جا سکتا بشرطیکہ لڑکی خود صوم و صلاۃ کی پابند ہو۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُوْنَ ﴾ [السجدة:١٨]

''کیا ایک مومن کسی فاسق کی طرح ہوسکتا ہے؟ یہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔''

چونکہ بے نماز فاسق ہے اور فاسق مرد صوم و صلاۃ کی پابند عورت کا کفو نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ایسے لڑکے کو رشتہ نہیں دینا چاہیے البتہ اگر لڑکی بھی بے نماز ہے تو الگ بات ہے۔

ولی کی اجازت کے بغیر نکاح

سوال ولی کے بغیر نکاح کی کیا شرعی حیثیت ہے اگر کوئی عورت خود اپنا نکاح کر لے تو کیا وہ نکاح ہو جائے گا؟

جواب اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو بدکاری، فحاشی، عریانی اور بے حیائی سے محفوظ رکھنے کے لیے نکاح کا حکم دیا ہے۔ شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے، وہ اسے راہ راست سے ہٹانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ موجودہ معاشرے میں بھی امت مسلمہ میں بدکاری و فحاشی کو عروج دینے کے لیے مختلف یہودی ادارے، ان کے متبعین اور آزادی نسواں کے نام پر کئی انجمنیں اور ادارے بنا کر مسلمان ممالک میں فحاشی اور بے حیائی کے فروغ میں منہمک ہیں۔ یہ لوگ یورپ کی طرح مسلمان معاشرے کو بھی آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس جرم سے بچانے کے لیے اور آنکھ اور شرمگاہ کی حفاظت کے لیے مسلم مرد و زن کے لیے نکاح کی بڑی اہمیت بیان کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [النور:٣٢]

''تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمھارے لونڈی غلاموں میں جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو، اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا۔ اللہ بڑی وسعت والا اور علم والا ہے۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ [النور:٣٣]

''اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انھیں چاہیے کہ عفت مآبی اختیار کریں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انھیں غنی کر دے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کا حکم بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ جنھیں نکاح کی استطاعت نہ ہو وہ اپنے آپ کو پاک و صاف رکھیں اور بدکاری و زنا سے بچے رہیں۔ اس کی مزید تشریح اس حدیث سے ہوتی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهُ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَ اَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ » [بخاری، کتاب النکاح: باب قول النبی من استطاع منکم الباءة (٥٠٦٥)،(١٩٠٥)]

''اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شخص اسباب نکاح کی طاقت رکھتا ہو، وہ نکاح کر لے کیونکہ یہ نگاہ کو نیچا اور شرمگاہ کو محفوظ رکھتا ہے اور جو اس کی استطاعت نہ رکھے وہ روزے رکھے کیونکہ روزے بندے کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ فَمَنْ لَّمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ » [ابن ماجه، كتاب النكاح: باب ما جآء في فضل النكاح(١٨٤٦)]

''نکاح کرنا میری سنت ہے، جس نے میری سنت پر عمل نہ کیا وہ مجھ سے نہیں۔''

اسی طرح قرآن مجید میں نکاح کو سکون اور محبت و رحمت کا باعث قرار دیا گیا ہے اور کہیں ''محصنین غیر مسافحین'' کہہ کر بدکاری سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا بدکاری اور زنا کاری سے بچنے کے لیے ہمیں نکاح جیسے اہم کام کو سرانجام دینا چاہیے اور اس کے لیے طریقہ کار رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ احکامات سے لینا چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے جو اصول وضوابط ذکر فرمائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ لڑکی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے۔ اگر لڑکی اپنی مرضی سے گھر سے فرار اختیار کر کے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیتی ہے تو اس کا نکاح باطل قرار پاتا ہے۔ عورت کے لیے اولیاء کی اجازت کے مسئلے میں کتاب وسنت سے دلائل درج ذیل ہیں:

① ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ﴾ [البقرة:٢٢١]

''اور (اپنی بیٹیاں) مشرکین کے نکاح میں نہ دو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور البتہ مومن غلام مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ اچھا لگے۔''

اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ دَلِيْلٌ بِالنَّصِّ عَلٰى اَنْ لَّا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ " [تفسير قرطبي(٣/٤٩)]

''یہ آیت اس بارے میں نص ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں۔''

② ایک اور آیت میں ہے:

﴿ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [البقرة:٢٣٢]

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں ان کے خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں۔''

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنی بہن کا نکاح ایک آدمی سے کیا تو اس نے اسے طلاق دے دی یہاں تک کہ ان کی عدت پوری ہوگئی پھر وہ دوبارہ رشتے کے لیے آیا تو بھائی نے دوبارہ نکاح میں دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔[فتح الباری(۹/ ۸۹)، تفسیر ابن کثیر(۱/ ۳۰۲)، شرح السنة(۹/ ٤٤)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَ هِيَ اَصْرَحُ دَلِيْلٍ عَلٰى اِعْتِبَارِ الْوَلِيِّ وَ اِلَّا لَمَا كَانَ لِعَضْلِهٖ مَعْنًى وَ لِاَنَّهَا لَوْ كَانَ لَهَا اَنْ تُزَوِّجَ نَفْسَهَا لَمْ تَحْتَجْ اِلٰى اَخِيْهَا وَ مَنْ كَانَ اَمْرُهٗ اِلَيْهِ لَا يُقَالُ اَنَّ غَيْرَهٗ مَنَعَهٗ مِنْهُ " [فتح الباری (۹/ ۹٤)]

''یہ آیت ولی کے معتبر ہونے پر سب سے زیادہ واضح دلیل ہے اور اگر ولی کا اعتبار نہ ہوتا تو اس کو روکنے کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا۔ اگر معقل کی بہن کے لیے اپنا نکاح خود کرنا جائز ہوتا تو وہ اپنے بھائی کی محتاج نہ ہوتی اور اختیار جس کے ہاتھ میں ہو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاتا کہ کسی نے اس کو روک دیا ہے۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"فَفِي الْاٰيَةِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّهٗ لَا يَجُوْزُ النِّكَاحُ بِغَيْرِ وَلِيٍّ......" [فتح الباری(۹/ ۹٤) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: معالم التنزیل للبغوی(۲/ ۲۱۱)، المغنی لابن قدامة (۷/ ۳۳۸)، تفسیر ابن کثیر(۱/ ۳۰۲)]

''یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ولی کے بغیر نکاح جائز نہیں، اس لیے کہ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن مطلقہ تھی اگر نکاح کا معاملہ ولی کی بجائے اس کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ اپنا نکاح خود کر لیتی اور اپنے ولی معقل کی محتاج نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾ میں خطاب عورت کے اولیاء کو ہے۔''

علاوہ ازیں مندرجہ ذیل آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے عورت کے اولیاء ہی کو خطاب کیا ہے:

﴿ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ [النور:۳۲]

﴿ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ ﴾ [النساء:۲۵]

اس مسئلے کی مزید وضاحت کئی ایک صحیح احادیث سے ہوتی ہے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

① دور جاہلیت میں ولی کی اجازت سے نکاح کے علاوہ بھی نکاح کی کئی صورتیں رائج تھیں جن کی تفصیل ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی ہے، وہ فرماتی ہیں:

« فَنِكَاحٌ مِنْهَا نِكَاحُ النَّاسِ الْيَوْمَ يَخْطُبُ الرَّجُلُ اِلَى الرَّجُلِ وَلِيَّتَهٗ اَوِ ابْنَتَهٗ فَيَتَصَدَّقُهَا ثُمَّ يَنْكِحُهَا »

''ان میں سے ایک نکاح جو آج کل لوگوں میں رائج ہے کہ آدمی دوسرے آدمی کے پاس اس کی زیر ولایت لڑکی یا اس کی بیٹی کے لیے نکاح کا پیغام بھیجتا، اسے مہر دیتا پھر اس سے نکاح کر لیتا۔''

پھر انھوں نے نکاح کی کچھ دوسری صورتیں ذکر کیں جو ولی کی اجازت کے بغیر رائج تھیں۔ آخر میں فرمایا:

« فَلَمَّا بُعِثَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ هَدَمَ نِكَاحَ الْجَاهِلِيَّةِ كُلَّهُ إِلَّا نِكَاحَ النَّاسِ الْيَوْمَ » [بخاری، کتاب النکاح: باب من قال "لا نکاح الا بولی" (٥١٢٧)]

''جب محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا گیا تو آپ ﷺ نے جاہلیت کے تمام نکاح منہدم کر دیے سوائے اس نکاح کے جو آج کل رائج ہے۔''

② سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ »
[ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی الولی (٢٠٨٣)]

''جس عورت نے بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے۔''

③ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ » [مسند احمد (٣٩٤/٤)، دارمی (١٣٧/٢)، حاکم (١٢٩/٢)، ابوداؤد (٢٠٨٥)، ترمذی (١١٠٢)، طبرانی کبیر (٣٥١/٨) دارقطنی (٢١٩/٣)]

''ولی کے بغیر نکاح نہیں۔''

شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَالْحَقُّ أَنَّ النِّكَاحَ بِغَيْرِ الْوَلِيِّ بَاطِلٌ كَمَا يَدُلُّ عَلَيْهِ أَحَادِيثُ الْبَابِ " [عون المعبود (١٩١/٢)]

''حق یہی ہے کہ ولی کے بغیر نکاح باطل ہے جیسا کہ اس پر باب کی احادیث دلالت کرتی ہیں۔''

امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے اور یہ روایت نکاح کی صحت میں شرط ہے یعنی اگر ولایت مفقود ہوئی تو نکاح درست نہیں ہوگا۔ [بدایۃ المجتہد (٧/٢)]

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یقیناً ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں اور عورت اپنے اور اپنے علاوہ کسی دوسرے کے نکاح کی مختار نہیں اور نہ ہی اپنا نکاح کرانے کے لیے اپنے ولی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو ولی بنانے کی مختار ہے، اگر اس نے ایسا کیا تو نکاح صحیح نہیں ہوگا۔'' [المغنی (٣٤٥/٩)]

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" إِنَّ الْعَقْدَ بِغَيْرِ وَلِيٍّ بَاطِلٌ " [کتاب الأم مختصر للإمام مزنی (ص/١٦٣)]

''ولی کے بغیر نکاح باطل ہے۔''

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ وَ عَلٰى هٰذَا......" [موسوعة فقه سفيان ثوری(ص/۷۹۳)]

'' ولی کے بغیر نکاح نہیں اور اسی بنا پر عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنا نکاح خود کرے اور نہ یہ جائز ہے کہ اپنے نکاح کے لیے اپنے ولی کے علاوہ کسی اور کو متعین کرے اور جب اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنا نکاح خود کر سکے تو اس کے لیے کسی دوسری عورت کا نکاح کروانا بالاولیٰ جائز نہیں۔''

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ " [موسوعة فقه الحسن بصری(۸۹۷)]

'' ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے۔''

امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے استاد الاستاد ہیں، فرماتے ہیں:

" لَيْسَ الْعَقْدُ بِيَدِ النِّسَاءِ اِنَّمَا الْعَقْدُ بِيَدِ الرِّجَالِ " [ابن ابی شيبة(۲۰۸/۱)، موسوعة فقه ابراهيم النخعی(۶۷۷/۱)]

'' عقد قائم کرنا عورتوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ مردوں کے ہاتھ میں ہے۔''

ان تمام دلائل و حوالہ جات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کتاب و سنت اور جمہور ائمہ محدثین کے نزدیک عورت کا نکاح ولی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ جو عورت اپنا نکاح خود کر لیتی ہے ایسا نکاح باطل ہے اور ان کے درمیان جدائی کرا دی جائے گی تا کہ وہ ناجائز فعل کے مرتکب نہ ہوں۔

کورٹ میرج کی شرعی حیثیت

سوال میرج کورٹ کے متعلق شرعی احکام سے آگاہ فرما دیں؟

جواب موجودہ معاشرے میں امت مسلمہ کے اندر فحاشی، عریانی اور بے حیائی کو عام کرنے کے لیے مختلف یہودی ادارے آزادی نسواں کے نام سے اٹھنے والی تحریکیں اور یہود و نصاریٰ کے تحت اسلامیات کی ڈگریاں لینے والے پروفیسرز اور وکلاء اپنا اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ اگر کوئی لڑکا اور لڑکی عشق معاشقے کے مارے گھر سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں تو انھیں پولیس اور نام نہاد عدالتوں کا سہارا مل جاتا ہے۔ وہ اپنی اس غلط روش کو ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کے بندھن کا روپ دے لیتے ہیں۔ آج کل نوجوان لڑکیوں کی خودسری اور گھروں سے فرار کی وبا عام ہے۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ بعض نام نہاد علماء بھی انھیں سند جواز فراہم کرتے ہیں۔ ان بدقماش اور آوارہ لڑکیوں کی تائید کر کے معزز اور شریف والدین کی بے عزتی اور بے بسی کو نظر انداز کر دیتے ہیں، لیکن اس تاریک دور میں بعض جج ایسے بھی ہیں جو عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر اس بے راہ روی پر قابو پانے کے لیے ایسی لڑکیوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں اور کتاب و سنت کے دلائل کو مد نظر رکھ کر صحیح فیصلہ بھی کر جاتے ہیں لیکن ایسے لوگ

آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اکثر جج یہی فیصلے کیے جا رہے ہیں کہ اگر لڑکا اور لڑکی گھر سے فرار ہو کر کے عدالت کے سامنے یا پولیس ہی کے سامنے ازدواجی زندگی کا اقرار کر لیں تو یہ نکاح صحیح شمار ہو گا حالانکہ کتاب وسنت کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نکاح باطل ہے۔اس نکاح کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس نکاح میں لڑکی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرتی ہے اور یہ بات پچھلے مسئلے میں ثابت کی جا چکی ہے کہ شریعت اسلامیہ میں ولی کی اجازت کے بغیر کیا گیا نکاح باطل و ناجائز ہے۔

والد کی موجودگی میں چچا کی ولایت

(سوال) کیا والد کی موجودگی میں چچا ولی بن سکتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

(جواب) یہ جائز نہیں۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اِنْ زَوَّجَ الْمَرْاَةَ الْوَلِیُّ الْاَبْعَدُ مَعَ حُضُوْرِ الْوَلِیِّ الْاَقْرَبِ بِغَیْرِ اِذْنِهِ فَاَجَابَتْهُ اِلٰی زَوْجِهَا فَالْعَقْدُ فَاسِدٌ“ [المغنی(٧/٣٦٤)]

”اگر عورت کا دور کا ولی قریبی ولی کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر عورت کا نکاح کر دیتا ہے تو یہ نکاح فاسد ہے خواہ عورت اس کو قبول ہی کر لے۔“

کیونکہ ولی ہونا تعصیب سے ہے، جس طرح قریبی عصبہ کے ہوتے ہوئے دور والے عصبات محروم ہوتے ہیں اسی طرح قریبی ولی کی موجودگی میں دور والے کو اس کا اختیار نہیں ہے اور میراث میں یہ ترتیب صحیح حدیث سے ثابت ہے اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ قریبی ولی دوسرے اولیاء سے عورت کی مصلحت پر زیادہ حریص ہوتا ہے اور اس پر شفقت اور رحم کے لحاظ سے بھی دوسروں سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے یہ حق صرف اسی کو ہونا چاہیے۔ ہاں اگر یہ خود کسی دوسرے کو اجازت دے دیتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (واللہ اعلم)

بیوی کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح

(سوال) کیا کوئی شخص اپنی بیوی کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح کر سکتا ہے؟ قرآن وسنت کی رو سے راہ نمائی کریں۔

(جواب) اللہ تبارک وتعالیٰ نے رشتوں کی حلت وحرمت کا ذکر بڑی ہی صراحت سے کیا ہے، اسی طرح رسول کریم ﷺ نے بھی مکمل توضیح فرمائی ہے۔ سائل کی مراد اگر یہ ہے کہ بیوی کو طلاق دینے یا اس کے فوت ہو جانے کے بعد اس کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح کرنا تو یہ بالکل جائز و درست ہے، اگر مراد بیوی کی موجودگی میں اس کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح کرنا تو یہ حرام ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ کسی عورت سے اس کی پھوپھی کی موجودگی میں یا پھوپھی سے اس کی بھتیجی کی موجودگی میں نکاح کیا جائے، اسی طرح اس بات سے بھی منع کیا کہ کسی عورت سے اس کی خالہ کی موجودگی میں یا خالہ سے اس کی

بھانجی کی موجودگی میں نکاح کیا جائے اور نہ چھوٹی بہن کی موجودگی میں اس کی بڑی بہن سے اور بڑی کی موجودگی میں چھوٹی سے نکاح کیا جائے۔'' [ترمذی، کتاب النکاح : باب ماجاء لا تنکح المرأۃ علی عمتھا (۱۱۲۶)]

امام ترمذی رحمہ اللہ اس باب میں فرماتے ہیں: ''عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور عام اہل علم کا اس پر عمل ہے۔'' آدمی کے لیے کسی عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کو ایک نکاح میں جمع کرنا حلال نہیں۔ اس پر ہمارے علم میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کسی عورت سے اس کی پھوپھی یا خالہ کی موجودگی میں یا پھوپھی سے بھتیجی کی موجودگی میں نکاح کر لیا تو دوسری سے کیا ہوا نکاح فسخ کیا جائے گا، عام اہل علم کی یہی رائے ہے۔

لہٰذا کسی بھی عورت سے اس کی پھوپھی یا خالہ کی موجودگی میں نکاح کرنا درست نہیں۔ اسی طرح بیوی کی پھوپھی یا خالہ سے بھانجی یا بھتیجی کی موجودگی میں بھی نکاح درست نہیں۔ اگر اس طرح کیا گیا ہے تو اسے ختم کیا جائے۔

نکاح سے پہلے مباشرت

سوال اگر نکاح سے پہلے لڑکا اور لڑکی مباشرت کر بیٹھیں تو کیا بعد میں ان کا نکاح ہو سکتا ہے؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ زنا کبیرہ گناہ ہے۔ کسی انسان سے اگر یہ گناہ سرزد ہو جائے تو وہ اس پر شرمندہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لیتا ہے تو قرآن میں اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿ وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ○ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ ﴾ [الفرقان:۶۸۔۷۰]

''اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ ایسی جان کو قتل کرتے ہیں جس کے قتل سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی یہ کام کرتا ہے وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔ قیامت کے دن اس کے لیے عذاب دوگنا کیا جائے گا اور وہ اس میں ذلیل ہو کر رہے گا، مگر جن لوگوں نے ایسے گناہوں سے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کیے اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر زنا سے توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتے ہیں اور جب اس نے توبہ کر لی اور اس کا معاملہ حاکم تک نہ پہنچا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تو پھر اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، دنیا میں اس پر حد لازم نہیں ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث ہے کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ سے بعض محرمات سے اجتناب کے لیے بیعت لی۔ ان میں ایک زنا بھی تھا آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ وَ مَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ وَ مَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَ اِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ »
[بخاری، كتاب الايمان :باب علامة الإيمان حب الأنصار(١٨)]

’’جس نے بیعت پوری کی اس کا اجر اللہ پر ہے اور جو ان میں سے کسی چیز میں مبتلا ہو گیا اور اسے دنیا ہی میں اس کی سزا دی گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ بن جائے گی اور اگر وہ کسی گناہ کو پہنچا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو وہ اللہ کی طرف ہے، اگر چاہے تو وہ اسے بخش دے اور اگر چاہے تو عذاب دے۔‘‘

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر آدمی سے زنا وغیرہ سرزد ہو گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اس کے اقرار اور اصرار کے بغیر دنیا میں اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ اس سے بڑھ کر اگر کسی کو کسی دوسرے مسلمان کے بارے میں کوئی ایسی چیز معلوم ہوتی ہے جس سے اس پر حد لازم آتی ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس کو آپس میں معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« تَعَافَوُا الْحُدُوْدَ فِيمَا بَيْنَكُمْ فَمَا بَلَغَنِيْ مِنْ حَدٍّ فَقَدْ وَجَبَ » [ابوداؤد، كتاب الحدود: باب يعفى عن الحدود(٤٣٧٦)]

’’آپس میں حدود معاف کرو، جو مجھ تک پہنچ گئی وہ واجب ہو گئی۔‘‘

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر امام، حاکم یا قاضی تک نہیں پہنچی تو حد واجب نہیں ہوئی۔ مذکورہ صورت میں زانی کا حد لگنے کے بغیر زانیہ سے نکاح ہو سکتا ہے جب دونوں سچی توبہ کر لیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ ان سے کسی نے سوال کیا:

« اِنِّيْ كُنْتُ اُلِمُّ بِامْرَاَةٍ آتِيْ مِنْهَا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيَّ فَرَزَقَ اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ تَوْبَةً فَاَرَدْتُّ اَنْ اَتَزَوَّجَهَا فَقَالَ النَّاسُ اِنَّ الزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا لَيْسَ هٰذَا فِيْ هٰذَا اِنْكِحْهَا فَمَا كَانَ هُنَا فِيْ هُنَا مِنْ اِثْمٍ فَعَلَيَّ »[تفسير ابن كثير(٢٦٤/٣)]

’’میں ایک عورت سے حرام کا ارتکاب کرتا رہا ہوں، مجھے اللہ نے اس فعل سے توبہ کی توفیق دی، میں نے توبہ کر لی۔ میں نے اس عورت سے شادی کا ارادہ کر لیا تو لوگوں نے کہا: ’’زانی مرد صرف زانیہ عورت اور مشرکہ عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔‘‘ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ’’یہ اس بارے میں نہیں ہے، تو اس سے نکاح کر لے، اگر اس کا گناہ ہوا تو وہ مجھ پر ہے۔‘‘

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد اور عورت جنھوں نے بدکاری کا فعل کیا ہے اگر توبہ کر لیتے ہیں تو بغیر شرعی حد کے ان کا نکاح ہو سکتا ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نہیں کہا کہ پہلے حد لگواؤ پھر نکاح کرو۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ حمل کے وقت جو ان

دونوں کا نکاح ہوا تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوگا کیونکہ اس نے عدت میں نکاح کیا اور عدت میں نکاح صحیح نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق:٤]

''حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ اَجَلَهُ ﴾ [البقرة:٢٣٥]

''اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک عدت ختم نہیں ہو جاتی۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" قَدْ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلٰى اَنَّهُ لَا يَصِحُّ الْعَقْدُ فِيْ مُدَّةِ الْعِدَّةِ" [تفسیر ابن کثیر(١/٥٧٤)]

''اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ عدت کے اندر نکاح صحیح نہیں۔''

اس لیے اگر نکاح سے پہلے کیے گئے جماع سے اگر لڑکی حاملہ ہو چکی ہے تو ان کا نکاح درست نہیں بلکہ وضع حمل کے بعد انھیں نکاح کرنا چاہیے تھا لہٰذا وہ دوبارہ نکاح کریں اور اگر نکاح کے وقت لڑکی حاملہ نہیں تھی تو ان کا باہمی نکاح بالکل درست ہے، اس پر کسی قسم کا عیب لگانا جائز نہیں۔

بالغ اولاد کا نکاح

سوال میں نے ایک دینی مجلہ میں پڑھا ہے کہ اگر اولاد بالغ ہو جائے تو والدین کو چاہیے کہ جلد از جلد اولاد کی شادی کر دیں تا کہ فحاشی نہ پھیلے، اگر والدین ایسا نہیں کریں گے تو اس قسم کی فحاشی کا گناہ ماں باپ کے ذمہ ہوگا۔ براہ کرم اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

جواب یہ بات صحیح اور درست ہے کہ جب اولاد بالغ ہو جائے تو والدین کو ان کی شادی کا جلد بند و بست کرنا چاہیے تا کہ وہ کسی قسم کے گناہ میں ملوث نہ ہوں۔ ابو سعید خدری اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس کے ہاں بچہ پیدا ہو وہ اس کا اچھا سا نام رکھے اور اسے ادب سکھائے اور جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کر دے، اگر وہ بالغ ہو گیا، اس نے اس کی شادی نہ کی اور اس نے گناہ کر لیا تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہو گا۔'' [شعب الایمان للبیھقی (٨٦٦٦)]

عمر بن خطاب اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جس کی بیٹی بارہ برس کی ہوگئی اور اس نے اس کی شادی نہ کی اور لڑکی نے گناہ کا ارتکاب کر لیا تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا۔'' [شعب الایمان (٨٦٨٠)]

پہلی روایت کو علامہ البانی نے "سلسلة الاحاديث الضعيفة (٦٣/٢) میں ضعیف قرار دیا ہے اور عمر رضی اللہ عنہ والی روایت کی سند میں ابوبکر بن ابی مریم راوی ضعیف ہے اور انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے متن کو امام حاکم نے شاذ قرار دیا ہے۔ [شعب الایمان : (٤٠٣/٦)]

بہر کیف باپ اگر نکاح کر دینے پر قادر ہو اور نکاح نہ کرے تو قصور وار ہے اور گناہ کا سبب بن جاتا ہے، اس لیے زجر و تہدید کرتے ہوئے اس بات سے ڈرایا گیا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی بالغ اولاد کا مناسب رشتہ ملتے ہی نکاح کر دینا چاہیے تاکہ وہ کسی گناہ کا ارتکاب نہ کر لیں۔

بالغ لڑکی کا نکاح

سوال بسا اوقات والدین لڑکی کی شادی میں اس کی تعلیم کی غرض سے دیر کرتے ہیں جبکہ لڑکے کی طرف سے شادی کا مطالبہ بھی ہوتا ہے یا ابھی لڑکی کا رشتہ طے نہیں ہوا لیکن والدین اس کے بالغ ہونے کے بعد صرف دنیاوی تعلیم کی غرض سے شادی میں تاخیر کرتے ہیں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب جس کسی کے ہاں لڑکی بالغ ہو جائے اور اس کا مناسب رشتہ مل رہا ہو تو اس کی شادی میں تاخیر کرنا شرعی احکامات کی صریح خلاف ورزی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب تمہارے پاس ایسا آدمی پیغام نکاح لے کر آئے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس کو رشتہ دے دو۔'' [ابن ماجه، كتاب النكاح: باب الأكفاء (١٩٦٧)]

نکاح کی تاکید میں آپ نے ایک اور موقع پر فرمایا:

''اے نوجوانوں کی جماعت! جو تم میں سے نکاح کی طاقت رکھے وہ شادی کرے، اس لیے کہ شادی نگاہ کو پست کرنے والی اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی ہے۔'' [بخاری، كتاب النكاح: باب قول النبی ﷺ من استطاع منكم الباءة فليتزوج (٥٠٦٥)]

مسلمان والدین کو چاہیے کہ وہ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کا بہانہ بنا کر شادی سے انکار نہ کریں۔ یونیورسٹی کی سطح پر اعلیٰ تعلیم کا حصول عورت کے لیے ضروری نہیں۔ عورت کے لیے اتنا ہی مناسب ہے کہ وہ ابتدائی تعلیم لکھنا پڑھنا، قرآن مجید، تفسیر و حدیث سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جائے اور اگر مزید تعلیم کی ضرورت ہو تو وہ اپنے شوہر سے اجازت لے کر تعلیم حاصل کر سکتی ہے یا شادی سے قبل حصول تعلیم کی شرط لگا سکتی ہے۔ ہمارے ماحول میں سکول، کالج اور یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کے حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ عشق معاشقے کی داستانیں تو عام ہیں اولادیں والدین کی نگرانی سے نکل کر معاشرتی بگاڑ کا باعث بن چکی ہیں۔ پہلے اس سے کہ لڑکیاں اور لڑکے فعل حرام کا ارتکاب کریں ان کا شرعی طریقے سے نکاح کر دینا ہی مناسب اور شریعت کا تقاضا ہے۔ لہٰذا تعلیم کا بہانہ بنا کر شادی سے تاخیر کرنا درست نہیں ہے۔

کم سن بچی کا نکاح

سوال کیا کم سن بچی کی شادی کرنا جائز ہے اور کیا بلوغت کے بعد بچی کو انکار کرنے کا اختیار حاصل ہوگا؟

جواب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تُنْكَحُ الثَّيِّبُ حَتّٰى تُسْتَأْمَرَ وَ لَا الْبِكْرُ اِلَّا بِاِذْنِهَا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَ مَا اِذْنُهَا ؟ قَالَ اَنْ تَسْكُتَ » [ابو داؤد، کتاب النکاح: باب فی الاستیمار(۲۰۹۲)]

''بیوہ کا نکاح اس کی اجازت حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح اس کی اجازت حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے۔'' لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اس کی اجازت کیا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کا خاموش رہنا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بالغہ لڑکی سے اس کے نکاح کی اجازت لی جاتی ہے اور جب وہ نابالغہ ہوتی ہے تو بچپن میں اس سے اجازت نہیں لی جاتی۔ اس کا ولی نکاح کر سکتا ہے بعد از بلوغت اس لڑکی کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا نکاح اگر منسوخ کرانا چاہے تو کرا سکتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اِنَّ جَارِيَةً بِكْرًا اَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَذَكَرَتْ اَنَّ اَبَاهَا زَوَّجَهَا وَ هِيَ كَارِهَةٌ فَخَيَّرَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ » [ابوداؤد، کتاب النکاح: باب فی البکر یزوجها أبوها و لا یستامرھا(۲۰۹۶)]

''ایک کنواری لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور بیان کیا کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح کیا ہے اور وہ ناپسند کرتی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اختیار دے دیا۔''

علامہ احمد حسن دہلوی رقم طراز ہیں:

" اَلْحَدِيْثُ يَدُلُّ عَلٰى تَحْرِيْمِ اِجْبَارِ الْاَبِ لِابْنَتِهِ الْبِكْرِ عَلَى النِّكَاحِ وَ غَيْرِهِ مِنَ الْاَوْلِيَاءِ بِالْاَوْلٰى " [تنقیح الرواۃ(۱۰/۳)]

''یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ باپ کے لیے حرام ہے کہ وہ اپنی کنواری بیٹی کو نکاح پر مجبور کرے، تو باپ کے علاوہ لڑکی کے اولیاء کے لیے بالاولیٰ جبر کی ممانعت ہے۔''

مذکورہ بالا صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ لڑکی کو بالغ ہو جانے کے بعد اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنا بچپن کا کیا ہوا نکاح فسخ کروا سکتی ہے۔ فسخ کے لیے چاہیں تو ثالثی شرعی عدالت کی طرف رجوع کر لیں تاکہ مزاحمت وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو۔

شہید کی اہلیہ سے نکاح

سوال کیا شہید کی اہلیہ سے نکاح کیا جا سکتا ہے؟ کیا اسلام میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے کہ شہداء کی ازواج نے دوسری

شادی کی ہو؟

(جواب) شہید کی اہلیہ عدت گزار کر اگر عقد ثانی کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، چند ایک ذکر کی جاتی ہیں۔

عشرہ مبشرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ عاتکہ بنت زید رضی اللہ عنہا کی شادی عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما سے طے پائی تھی، بہت خوبصورت تھیں، ان کا خاوند ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہم نے اپنے والد کے کہنے پر انھیں طلاق دے دی تھی۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کی جدائی میں کچھ شعر کہے جوان کے والد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سن لیے پھر انہوں نے رجوع کی اجازت دے دی، اس کے بعد طائف کے حصار میں انھیں تیر لگا اور شدید زخمی ہوئے اور مدینہ جا کر فوت ہو گئے۔

ان کی وفات کے بعد عاتکہ بنت زید سے زید بن الخطاب نے شادی کر لی، وہ جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے، ان کی شہادت کے بعد عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے شادی کی، ان کی شہادت کے بعد ان سے زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے شادی کی۔ [تفصیل کے لیے الاصابة: (٣٥٨/٤)،(٣٥٦)]

اسی طرح اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے جعفر بن ابی طالب المعروف جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے شادی کی، ان کی شہادت کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کیا، پھر ان سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد علی رضی اللہ عنہ نے شادی کی۔ [تفصیل کے لیے الاصابه: (٢٣١/٤)]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا نے علی رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا، ان کی شہادت کے بعد امامہ رضی اللہ عنہا نے مغیرہ بن نوفل سے شادی کر لی۔ دیکھیں۔ [طبقات ابن سعد (١٢٧/٨)، اسد الغابة (١٤٠٠/٥)، استیعاب (٧٢٨/٢)]

ام حرام رضی اللہ عنہا کا نکاح عمرو بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ احد کے میدان میں ان کی شہادت ہوئی، اس کے بعد ام حرام رضی اللہ عنہا نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا اور قبرص میں اپنے خاوند کے ساتھ شریک ہو کر شہید ہو گئیں۔ [الاصابة (٤٤١/٤)]

ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا مہاجرات صحابیات میں سے ہیں، ان کا نکاح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ زید رضی اللہ عنہ جب غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے تو زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے نکاح ہو گیا پھر ان سے طلاق ہو گئی تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں، ان کی وفات کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کر لیا۔ [الاصابة (٤٩١/٤)]

الغرض تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ شہداء کی ازواج نے اپنے خاوندوں کی شہادت کے بعد شادیاں کی ہیں، اسلام میں ایسی شادی میں کوئی قباحت نہیں جاہل لوگ بیوہ عورت سے شادی کرنا اچھا نہیں سمجھتے، اسلام نے اس رسم بد کو بھی ختم کیا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ باقی شادیاں بیوہ خواتین سے کیں اور امت مسلمہ کو بتا دیا کہ بیوہ عورت سے شادی کرنا معیوب نہیں ہے۔

اولاد کی تمنا میں شادی کرنا

(سوال) کیا اولاد کی آرزو کے لیے شادی کرنا ناجائز ہے؟ کتاب وسنت سے وضاحت کریں۔

(جواب) شادی کے بعد خاوند اور بیوی کی بڑی آرزو اور تمنا نیک اولاد کا حصول ہے اور یہ ایک فطری امر ہے۔ انسان اس بات

کا خواہش مند ہے کہ اللہ اسے ایک ایسا وارث عطا کرے جو اس کے بعد اس کی املاک، مال و متاع اور جائداد کا صحیح تصرف کرے اور اس کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مدد و معاون اور صحیح جانشین بن سکے۔ اولاد نسل انسانی کی بقا کا سبب و ذریعہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا بلکہ انسان کو اس کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''اب تم اپنی بیویوں سے شب باشی کیا کرو اور اللہ نے جو تمہارے لیے لکھ دیا ہے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔''

(البقرہ : ۱۸۷)

کئی ایک ائمہ مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ ''اللہ نے تمھارے لیے جو لکھ دیا ہے'' سے مراد اولاد ہے۔ (تفسیر ابن کثیر وغیرہ) اس دنیا میں سب سے برگزیدہ ہستیاں انبیاء و رسل کی گزری ہیں، ان ہستیوں نے نیک اولاد کو حاصل کرنے کی نہ صرف تمنا کی ہے بلکہ اللہ سے دعائیں مانگی ہیں۔ جد الانبیاء ابراہیم علیہ السلام کی دعا یہ ہے:

﴿ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴾ [صافات : ۱۰۰]

''اے اللہ! میرے پروردگار! مجھے نیکوکار اولاد عطا کر۔''

زکریا علیہ السلام نے بڑھاپے کے عالم میں یوں دعا کی:

''اے میرے پرودگار! میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا کر جو میری اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو اور اے میرے پروردگار! اس کو پسندیدہ انسان بنا۔'' [مریم : ٥/٦]

رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شادی کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

''زیادہ محبت کرنے اور زیادہ بچے جننے والی عورت سے شادی کرو میں تمہاری وجہ سے دیگر امتوں پر فخر کروں گا۔''

[ابوداؤد، کتاب النکاح: باب فی تزویج الأبکار (۲۰۵۰)]

ان آیات و احادیث کا واضح مطلب یہ ہے کہ اولاد کا حصول شادی کے مقاصد میں سے ہے، اس لیے اولاد کے لیے شادی کرنا بالکل جائز و درست ہے۔

عورت کسی کا نکاح کرواسکتی ہے

سوال کیا عورت اپنا نکاح خود کر سکتی ہے یا وہ کسی اور کی ولیہ بن سکتی ہے؟

جواب صحیح دلائل سے ثابت ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا اور نکاح کے قیام کے لیے عورت کے ولی کا ہونا از حد ضروری ہے۔ اسلامی شریعت میں عورت کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ اپنا نکاح خود کرے یا کسی دوسری عورت کا نکاح کرے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تُزَوِّجُ الْمَرْاَةُ الْمَرْاَةَ وَ لَا تُزَوِّجُ الْمَرْاَةُ نَفْسَهَا فَاِنَّ الزَّانِیَةَ هِیَ الَّتِیْ تُزَوِّجُ نَفْسَهَا » [السنن

الکبری للبیہقی(۱۱۰/۷)، دارقطنی(۲۲۷/۳)]

’’عورت عورت کی شادی نہ کروائے اور نہ عورت اپنی شادی خود کرے، جو عورت اپنی شادی خود کرتی ہے وہ زانیہ ہے۔‘‘

علامہ محمد بن اسماعیل الصنعانی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

” فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى اَنَّ الْمَرْأَةَ لَيْسَ لَهَا وَلَايَةٌ فِي الْإِنْكَاحِ لِنَفْسِهَا وَ لَا لِغَيْرِهَا فَلَا عِبَارَةَ لَهَا فِي النِّكَاحِ اِيْجَابًا وَ لَا قُبُوْلًا فَلَا تُزَوِّجُ نَفْسَهَا بِإِذْنِ الْوَلِيِّ وَ لَا غَيْرِهِ وَ لَا تُزَوِّجُ غَيْرَهَا بِوِلَايَةٍ وَ لَا بِوِكَالَةٍ وَ لَا تُقْبَلُ النِّكَاحُ بِوِلَايَةٍ وَ لَا وِكَالَةٍ وَ هُوَ قَوْلُ الْجَمْهُوْرِ“[سبل السلام(۱۳۲۱/۳)]

’’اس حدیث میں دلیل ہے کہ عورت کو اپنا یا کسی دوسری عورت کا نکاح کروانے کا اختیار نہیں ہے، لہٰذا نکاح کے سلسلے میں ایجاب وقبول کے بارے میں عورت معتبر نہیں۔ ولی وغیرہ کی اجازت کے ساتھ اپنی شادی خود نہ کرے اور نہ کسی دوسری عورت کی شادی ولایت و وکالت کے ساتھ کرے۔ عورت کی ولایت و وکالت کے ساتھ نکاح قبول نہیں کیا جائے گا اور یہی جمہور علماء کا قول ہے۔‘‘

علامہ صنعانی رحمہ اللہ کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ عورت ایجاب وقبول کے بارے میں معتبر نہیں ہے اور نہ نکاح میں عورت کی ولایت اور وکالت ہی کو قبول کیا گیا ہے۔نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

” تزویج نکند زن زن را یعنی زن را ولایت نمی باشد در انکاح نفسی خود و انکاح غیر خود پس نیست او را عبارت در نکاح نه ایجابا و نه قبولا“ [مسك الختام شرح بلوغ المرام (۳٤۲/۳)]

’’عورت عورت کی شادی نہ کرے یعنی عوت کو اپنا یا کسی دوسری عورت کا نکاح کروانے میں ولایت حاصل نہیں ہے لہٰذا نکاح کے سلسلے میں ایجاب وقبول کے متعلق عورت معتبر نہیں ہے۔‘‘

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” وَ قَدْ صَحَّ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّهَا اَنْكَحَتْ رَجُلًا مِنْ بَنِيْ اَخِيْهَا فَضَرَبَتْ بَيْنَهُمْ بِسِتْرٍ ثُمَّ تَكَلَّمَتْ حَتّٰى اِذَا لَمْ يَبْقَ اِلَّا الْعَقْدُ اَمَرَتْ رَجُلًا فَاَنْكَحَ ثُمَّ قَالَتْ لَيْسَ اِلَى النِّسَاءِ نِكَاحٌ “ [فتح الباری(۱۸٦/۹)، ابن بی شیبة(٤٥۸/۳)، عبد الرزاق(۲۰۱/٦)]

’’سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ انھوں نے اپنے بھائی کے بیٹوں میں سے ایک کے نکاح کا بندوبست کیا۔انھوں نے ان کے درمیان پردہ لگا دیا پھر بات کی، یہاں تک کہ جب عقد کے علاوہ کوئی معاملہ باقی نہ رہا تو انھوں نے ایک مرد کو حکم دیا اس نے نکاح کر دیا پھر فرمایا:’’ نکاح کا قائم کرنا عورتوں کا کام نہیں۔‘‘

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ نکاح کے انتظامات وغیرہ میں عورت اپنا کردار پردے کے اندر رہ کر ادا کر سکتی ہے لیکن نکاح پڑھانے کی اسے اجازت نہیں۔ اس لیے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی پاکباز عورت یہ کام نہیں کر سکتیں تو آج

کی کوئی عورت کیسے کرسکتی ہے؟اس مسئلے کی مزید تائید سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

« لَا تَشْهَدُ الْمَرْأَةُ يَعْنِي الْخُطْبَةَ وَ لَا تُنْكِحُ » [ابن ابی شیبة(٤٥٨/٣)، (١٥٩٦٣)]

''عورت خطبہ نہ دے اور نہ نکاح کروائے۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے استاد الاستاد امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' لَيْسَ الْعَقْدُ بِيَدِ النِّسَاءِ وَ إِنَّمَا الْعَقْدُ بِيَدِ الرِّجَالِ '' [ابن ابی شیبة (٤٥٨/٣)، (١٥٩٥٨)، موسوعة فقه إبراهيم النخعي(٦٧٧/١)]

''عقد نکاح عورت کے ہاتھ میں نہیں، عقد نکاح صرف مرد کے ہاتھ میں ہے۔''

مندرجہ بالا صحیح احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ عقد نکاح مرد کے اختیار میں ہے اور نکاح کا خطبہ پڑھنا جو مسنون ہے اور ایجاب و قبول کروانا یہ سب مرد کا حق ہے، عورت اس معاملے میں معتبر نہیں ہے۔

دلہن کے لیے بیوٹی بکس کا استعمال

سوال کیا ایک لڑکی یا نئی دلہن اپنے خاوند کے لیے سرخی وغیرہ یعنی بیوٹی بکس استعمال کرسکتی ہے؟ دلیل سے واضح کریں۔

جواب صحیح حدیث سے عورت کا خوشبو لگانا ثابت ہے اور عورتوں کی خوشبو ایسی ہوتی ہے جس کا رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے سرخی و پاؤڈر وغیرہ اور بو مخفی ہوتی ہے۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک مردوں کی بہترین خوشبو وہ ہے جس کی بو ظاہر ہو اور رنگ پوشیدہ ہو اور عورتوں کی بہترین خوشبو وہ ہے جس کا رنگ ظاہر ہو اور اس کی بو مخفی ہو۔'' [ترمذی، کتاب الادب: باب ما جاء فی طیب الرجال والنساء (٢٧٨٨)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت رنگ والی خوشبو لگا سکتی ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں انس رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے وہ بیان کرتے ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ پر زردی کا نشان دیکھا تو پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''میں نے ایک عورت سے ایک نواۃ سونے کے عوض نکاح کیا ہے۔'' آپ نے فرمایا: ''اللہ تیرے لیے برکت نازل کرے ولیمہ کرو اگرچہ ایک بکری ہو۔'' [مسلم، کتاب النکاح: باب الصداق و جواز کونه تعلیم قرآن و خاتم حدید (١٤٢٧)]

عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ پر زعفران کی زردی کا نشان لگا تھا، ظاہر ہے شادی کے موقع پر ان کی دلہن سے یہ لگا تھا جس سے معلوم ہوا کہ دلہن کی تیاری میں اسے میک اپ کرانا درست ہے۔

اسی طرح عائشہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے موقع پر اسماء بنت عمیس نے انھیں زیب و زینت کی تھی جیسا کہ مسند احمد (٤٣٨/٦) وغیرہ میں موجود ہے۔ لہٰذا دلہن کی زیب و زینت، بیوٹی پارلر یا عام خواتین کا رنگ والی خوشبو استعمال کرنا جیسے زعفران اور سرخی وغیرہ، بالکل جائز و درست ہے۔

شادی کی تقریب میں بینڈ باجے

(سوال) کیا شادی کی تقریبات میں بینڈ باجوں کا اہتمام کرنا مسلمان کے لیے جائز ہے؟ مہربانی فرما کر کتاب و سنت سے جواب دیں۔

(جواب) گانا بجانا اور موسیقی وغیرہ شرعی طور پر حرام ہے اور اس کو بطور پیشہ اختیار کر لینا بھی حرام ہے۔ اس کی حرمت اور شیطانی فعل ہونے پر درج ذیل نصوص دلالت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ [لقمان:٦]

''اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو غافل کرنے والے آلات خریدتے ہیں تاکہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی راہ سے گمراہ کریں اور اسے ہنسی مذاق بنائیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہے۔''

اس آیت کریمہ میں کلمہ ''لہوالحدیث'' سے مراد گانا بجانا اور آلات موسیقی ہیں جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
''اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں! لہوالحدیث سے مراد گانا بجانا اور آلات موسیقی ہیں۔'' [مستدرك حاكم (١٨٢/٣)، (٣٥٩٥)]

سورۂ نجم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ○ وَ تَضْحَكُوْنَ وَ لَا تَبْكُوْنَ ○ وَ اَنْتُمْ سَامِدُوْنَ ﴾ [النجم:٥٩، ٦١]

''کیا تم اس (قرآن) سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو، روتے نہیں، بلکہ تم کھیل رہے ہو۔''

اس آیت میں لفظ ﴿ سَامِدُوْنَ ﴾ کی تفسیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں نقل کی گئی ہے ''قبیلہ بنو حمید کی لغت میں ''سَمَد'' سے مراد گانا ہے، جب کوئی شخص گانا گائے تو کہا جاتا ہے ''اَسْمَدَ لَنَا۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ بعض نسخوں میں حمید کی بجائے یمن کا ذکر ہے۔ [تفسير مجاهد مع حاشية (ص/٦٣٣)، المصباح المنير (ص/١٣٣٥)]

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ ﴾ [بنی اسرائیل:٦٤]

''اور ان میں سے تو جس کسی کو بھی اپنی آواز سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا اور ان کے مال و اولاد میں شریک ہو جا۔''

اس آیت کریمہ میں ﴿ بِصَوْتِكَ ﴾ (اپنی شیطانی آواز) سے مراد موسیقی، آلات طرب، راگ رنگ، رقص و سرود، گانے

بجانے اور ہر فحش آواز ہے جو اللہ کی معصیت کی طرف لے جاتی ہے۔
ان آیات مقدسہ سے واضح ہوتا ہے کہ گانا بجانا، بینڈ باجا اور دوسرے آلات موسیقی اور شیطانی آوازیں حرام اور گمراہی کے آلے ہیں، ان کی خرید وفروخت کرنے پر ذلیل ورسوا کرنے والا عذاب ہے، لہٰذا اسے ذریعہ معاش بنانا حرام ہے اور اس کے ذریعے کمائی گئی روزی ہرگز پاک نہیں ہوسکتی۔ ایسے امور سے فی الفور باز آ جانا چاہیے اور ایسے کسی بھی کام میں تعاون کرنا یا اپنی خوشی کے مواقع میں ان شیطانی کاموں کو رائج کرنا قطعاً ناجائز وحرام ہے۔

ناجائز امور پر مشتمل شادی میں شرکت

(سوال) بدقسمتی سے آج کل شادیوں میں اللہ اور رسول کے احکامات کی دھجیاں بکھیری جاتی ہیں اور دوسری طرف دعوت قبول کرنے کا حکم نبوی ہے تو ایسی شادیوں میں شرکت شرعی طور پر ضروری ہے؟

(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللّٰهِ يُكَفَّرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهِ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِيْنَ وَ الْكَافِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴾ [النساء: ١٤٠]

''اور اللہ تعالیٰ تمھارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم اتار چکا ہے کہ تم جب کسی مجلس والوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے سنو تو اس مجمع میں ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک کہ اس کے علاوہ اور باتیں نہ کرنے لگیں۔ ورنہ تم بھی اس وقت انہی جیسے ہو یقیناً اللہ تعالیٰ تمام کافروں اور سب منافقوں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا کہ اگر تم ایسی مجالس ومحافل اور پروگراموں میں شرکت کرو گے جہاں احکاماتِ الٰہیہ کا مذاق اڑایا جا رہا ہو اور تم اس پر نکیر نہیں کرو گے تو تم بھی گناہ میں ان کے برابر کے شریک رہو گے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْ اٰيَاتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهِ وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الانعام:٦٨]

'اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جائیں یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر آپ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھیں۔''

تفسیر احسن البیان میں ہے: ''آیت میں خطاب اگرچہ نبی ﷺ کو ہے لیکن مخاطب امت مسلمہ کا ہر فرد ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک تاکیدی حکم ہے جسے قرآن مجید میں متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ہر وہ مجلس مراد ہے جہاں اللہ اور رسول ﷺ

کے احکام کا مذاق اڑایا جا رہا ہے یا عملاً ان کا استخفاف کیا جا رہا ہو یا اہل بدعت و اہل زیغ اپنی تاویلات رکیکہ اور توجیہات خفیفہ کے ذریعے آیات الٰہی کو توڑ مڑور رہے ہوں۔ ایسی مجالس میں غلط باتوں پر تنقید کرنے اور کلمہ حق بلند کرنے کی نیت سے تو شرکت جائز ہے، بصورت دیگر سخت گناہ اور غضب الٰہی کا باعث ہے۔'' [تفسیر احسن البیان (ص/۱۷۷)]

ایسی مجالس جہاں منکرات ومنہیات ہوں یا ایسی دعوتیں جہاں احکام خداوندی کی قولاً یا فعلاً خلاف ورزی ہو رہی ہو ان میں شرکت کرنا رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں ناپسندیدہ اور قابل نفرت تھا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

« عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ صَنَعْتُ طَعَامًا فَدَعَوْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَجَاءَ فَدَخَلَ فَرَاَى سِتْرًا فِيْهِ تَصَاوِيْرُ فَخَرَجَ وَ قَالَ : اِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَا تَدْخُلُ بَيْتًا فِيْهِ تَصَاوِيْرُ »

[نسائی، کتاب الزینة: باب التصاویر (۵۳۵۳)]

'' سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے کھانا تیار کیا تو نبی ﷺ کو دعوت دی، آپ ﷺ آئے، گھر میں داخل ہوئے تو ایک تصویروں والا پردہ دیکھا۔ آپ ﷺ گھر سے نکل گئے اور فرمایا: '' فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے، جہاں تصویریں ہوں۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جس دعوت میں آپ کو شریک ہونے کے لیے کہا جائے، اگر آپ کے علم میں ہو کہ وہاں منکرات ومنہیات ہیں تو ایسی دعوت پر نہ جائیں اور اگر وہاں پہنچنے پر علم ہو تو وہاں سے واپس آ جائیں کیونکہ اس مجلس میں حاضر وشریک رہنا جائز نہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''میں نے ایک چھوٹا گدا خریدا، اس میں تصاویر تھیں (نبی ﷺ جب باہر سے تشریف لائے) تو آپ دروازے پر کھڑے ہوگئے، اندر داخل نہ ہوئے۔ میں نے کہا: '' میں اپنے جرم کی اللہ کی طرف توبہ کرتی ہوں۔'' آپ ﷺ نے کہا: '' یہ گدا کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''میں نے یہ اس لیے بنایا ہے کہ آپ اس پر بیٹھیں، اس کو اپنے نیچے رکھیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: '' ان تصویروں کو بنانے والے قیامت کے دن عذاب دیے جائیں گے۔ انھیں کہا جائے گا جو تم نے پیدا کیا ہے اس میں روح ڈالو اور یقیناً فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں تصویریں ہوں۔'' [بخاری، کتاب اللباس: باب من کره القعود علی الصور (۵۹۵۷)، مسلم (۲۱۰۷)، مسند احمد (۴۶/۶)، مؤطا (۷۴۶)]

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جہاں احکامات شرعیہ کی خلاف ورزی ہو، آپ وہاں شرکت نہ کریں، اگر جائیں تو ان منکرات سے لوگوں کو روکیں اور انھیں دعوت دے کر سمجھائیں۔ ایک اور حدیث میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

« مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَقْعُدَنَّ عَلٰى مَائِدَةٍ يُدَارُ عَلَيْهَا الْخَمْرُ » [مسند احمد (۱۲۶/۱)، مسند ابی یعلی (۱۹۲۵)، مستدرك حاکم (۲۸۸/۴)، ترمذی (۲۸۰۱)]

''جو آدمی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ ایسے دستر خوان پر ہرگز نہ بیٹھے جہاں شراب پیش کی جا رہی ہو۔''

امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اسے صحیح کہا ہے، علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل (۱۹۴۹)]

ملک شام کے ایک عیسائی چودھری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعوت کی تو انھوں نے کہا:

«اِنَّا لَا نَدْخُلُ كَنَائِسَكُمْ مِنْ اَجْلِ الصُّوَرِ الَّتِيْ فِيْهَا» [بیهقی(۲٦٨/٧)، فتح الباری (١/٥٣١)، الأدب المفرد(١٢٤٨)]

''ہم تمھارے معبد خانوں میں تصویروں کی وجہ سے داخل نہیں ہوتے۔''

ابو مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک شخص نے دعوت کی تو انھوں نے دریافت کیا: '' اَفِي الْبَيْتِ صُوْرَةٌ ؟'' کیا گھر میں تصویر ہے؟'' اس نے کہا: '' ہاں!'' تو انھوں نے داخل ہونے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ اس نے تصویر کو توڑا پھر آپ داخل ہوئے۔ [بیهقی(۲٦٨/٧)، فتح الباری(٢٤٩/٩)]

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

'' لَا نَدْخُلُ وَلِيْمَةً فِيْهَا طِبْلٌ وَ لَا مِعْزَافٌ '' [آداب الزفاف للألبانی(ص/١٦٦)]

''ہم ایسے ولیمے میں داخل نہیں ہوتے جس میں طبلے سارنگیاں ہوں۔''

مکلاوہ کی رسم بد

سوال کیا مکلاوہ جائز ہے؟ یعنی شادی کے دوسرے دن ولیمہ کے بعد لڑکی والوں کا لڑکی اور لڑکے کو چند دن کے لیے اپنے گھر لے جانا جائز ہے؟ قرآن وحدیث سے وضاحت کریں۔

جواب ایک مسلمان کے لیے زندگی گزارنے کا نمونہ واسوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ کی سیرت ہمارے لیے ہر مسئلہ میں راہنمائی کا کام دیتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی شادیاں بھی کیں اور اپنی بیٹیوں کی بھی۔ مکلاوے کا جو رواج ہمارے معاشرے میں پایا جاتا ہے قرآن وسنت میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، لڑکی اور لڑکا شادی کے بعد اپنی مرضی سے جب چاہیں اپنے سسرال یا عزیز واقارب کو ملنے جائیں، دنوں کی کوئی قید قرآن وحدیث میں نہیں۔ سلف صالحین سے بھی اس طرح شادی کے دوسرے دن ہی لڑکی کو لے جانا ثابت نہیں۔ یہاں صرف ایک واقعہ باعث نصیحت درج کرتے ہیں کہ امام سعید بن المسیب رحمہ اللہ جو اہل مدینہ میں سے بڑے عالم اور سید التابعین میں شمار ہوتے ہیں، ان کی بیٹی کا رشتہ خلیفہ عبدالملک نے اپنے بیٹے ولید کے لیے طلب کیا جو انہوں نے دینے سے انکار کر دیا اور انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی اپنے ایک شاگرد کثیر بن المطلب بن ابی وداعہ سے کی۔ ابن ابی وداعہ کا بیان ہے کہ میں سعید بن المسیب رحمہ اللہ کے پاس جایا کرتا تھا کہ کچھ دن میں ان کی مجلس میں حاضر نہ ہوا جب دوبارہ ان کی مجلس میں گیا تو انہوں نے پوچھا: ''تم کہاں تھے؟'' میں نے کہا: ''میری اہلیہ فوت ہوگئی تھی اس وجہ میں سے کچھ مصروف ہوگیا۔'' امام سعید بن المسیب رحمہ اللہ فرمانے لگے: ''تم نے ہمیں خبر کیوں نہ دی، ہم اس کے جنازے میں شرکت کرتے۔'' پھر فرمانے لگے: ''کیا تم نے کسی نئی عورت سے شادی کی ہے؟'' میں نے کہا: ''اللہ آپ پر رحم کرے مجھے کون رشتہ دے گا، میں تو صرف دو یا تین درہموں کا مالک ہوں۔'' امام سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے کہا: ''میں تمہیں رشتہ دوں گا۔'' میں نے کہا: ''آپ ایسا کریں گے؟'' انہوں نے کہا: ''ہاں!'' پھر انہوں نے اللہ کی حمد وثنا اور

نبی ﷺ پر درود شریف پڑھا اور مجھ سے دو یا تین درہم حق مہر کے عوض اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا، میں اٹھا اور فرط مسرت کی وجہ سے مجھے کوئی کام نہ سوجھا، میں اپنے گھر گیا اور سوچنے لگا کہ کس سے قرض لوں۔ میں نے مغرب کی نماز ادا کی اور گھر لوٹا اور اکیلا ہی روزے کی حالت میں تھا، میں نے اپنا روزہ روٹی اور زیتون سے افطار کیا تو میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا: ''کون؟'' اس نے کہا: ''سعید'' میں ہر اس شخص کے بارے سوچنے لگا جس کا نام سعید تھا، سوائے سعید بن المسیب رحمہ اللہ کے، اس لیے کہ سعید بن المسیب رحمہ اللہ چالیس سال سے اپنے گھر اور مسجد کے درمیان ہی دیکھے گئے تھے۔ میں باہر نکلا تو سعید بن المسیب رحمہ اللہ کھڑے تھے، میں نے کہا: ''اے ابو محمد! (سعید بن المسیب رحمہ اللہ کی کنیت) آپ مجھے پیغام بھیج دیتے، میں خود حاضر ہو جاتا، تو انہوں نے کہا: ''نہیں تم زیادہ حق رکھتے ہو کہ تمہارے پاس آیا جائے، تم اکیلے آدمی تھے، میں نے تمہارے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کی ہے اور میں نے ناپسند کیا کہ تم اکیلے رات بسر کرو، یہ تمہاری بیوی ہے۔'' وہ ان کے پیچھے کھڑی تھی۔ پھر انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے اندر کر دیا، اور دروازہ بند کر دیا عورت شرم و حیا کا پتلا تھی، میں نے دروازہ بند کیا پھر پیالہ چراغ کے سائے تلے رکھ دیا تا کہ وہ اسے نہ دیکھ سکے، پھر میں گھر کی چھت پر چڑھ گیا، پڑوسیوں کو بلایا، وہ آ گئے، کہنے لگے: ''تمہاری کیا حالت ہے؟'' میں نے انھیں بتایا تو وہ اس کے پاس آئے اور میری ماں کو بھی خبر پہنچ گئی وہ آئیں، کہنے لگیں: ''میرا چہرہ تیرے چہرے پر حرام ہو اگر تم اس کے قریب جاؤ تا وقتیکہ میں تین دن اس کا امتحان نہ لے لوں۔'' میں تین دن رکا رہا پھر اس کے پاس گیا۔ وہ تمام لوگوں سے زیادہ حسینہ و جمیلہ اور سب سے زیادہ قرآن کی حافظہ اور سنت رسول ﷺ کی عالمہ اور سب سے زیادہ خاوند کے حق کو پہچاننے والی تھی، پھر میں ایک ماہ تک سعید بن المسیب رحمہ اللہ کے ہاں نہ گیا، ایک ماہ بعد جب ان کے پاس گیا تو وہ اپنے حلقہ درس میں تھے، میں نے سلام کیا انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور اختتام مجلس تک کوئی بات نہ کی۔ جب میرے علاوہ سب چلے گئے تو انہوں نے کہا: ''اس انسان کا کیا حال ہے؟'' میں نے کہا: ''بہت اچھا، اے ابو محمد! جسے دوست پسند کرتا ہے اور دشمن ناپسند کرتا ہے۔'' کہنے لگے: ''اگر تمہیں کوئی چیز ناپسند لگے تو لاٹھی سے کام لو۔'' میں اپنے گھر واپس آ گیا، انہوں نے میرے پیچھے ۲۰ ہزار درہم بھیجے۔ [حلية الاولياء: (١٦٧/٢)، (١٦٧)، سير اعلام النبلاء (٢٣٣/٤)،(٢٣٤)]

امام سعید بن المسیب رحمہ اللہ کے اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر رسم و رواج کا سلف صالحین کے ہاں کوئی تصور نہ تھا۔ بارات، جہیز، مکلاوہ، سہرے گانے اور ڈھول وغیرہ سب ہندوانہ رواج ہیں، جو برصغیر پاک و ہند میں مسلم و ہندو اختلاط کی وجہ سے پھیل چکے ہیں۔ ہمیں ہر قسم کے رسم و رواج اور بدعات و خرافات سے اپنے ماحول کو پاک وصاف کرنا چاہیے۔ امام سعید بن المسیب رحمہ اللہ کی بیٹی کی شادی ایک بادشاہ کے بیٹے کے بجائے ایک دیندار شخص سے ہوئی اور شادی کے دوسرے دن بیٹی کو لینے نہیں چلے گئے تھے بلکہ ان کا داماد ایک ماہ بعد اکیلا حاضر خدمت ہو رہا ہے۔ بہر کیف شادی کے بعد لڑکی اور لڑکا باہمی رضامندی سے جب چاہیں آ جا سکتے ہیں، دوسرے دن جانا رسم ہے اس کو توڑنا چاہیے۔

بارات کی شرعی حیثیت اور مسنون شادی کے لوازمات

(سوال) کیا شادی کے موقع پر دولہا کے ساتھ بارات کا جانا کسی حدیث سے ثابت ہے؟

(جواب) شادی بیاہ کے موقع پر مروجہ بارات لے جانا شرعاً بالکل ثابت نہیں، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ عہد رسالت مآب اور خلفائے راشدین کے ایام ہائے خلافت میں کہیں بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نکاح کے لیے دولہا، دو گواہ اور لڑکی کے ولی و سرپرست کا ہونا کافی ہے۔ رسول کریم ﷺ کی مبارک زندگی میں آپ کے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شادیاں ہوئیں، کسی نے بھی بارات کا اہتمام نہیں کیا۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ پر زردی کا نشان دیکھا تو فرمایا: ''یہ کیا ہے؟'' انہوں نے کہا: ''میں نے ایک عورت سے سونے کی ایک ڈلی کے برابر مہر کے ذریعے نکاح کیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تیرے لیے برکت ڈالے، ولیمہ کرو، اگرچہ ایک بکری ہی ہو۔'' [مسلم، كتاب النكاح: باب الصداق و جواز كونه تعليم قرآن و خاتم حديد (١٤٢٧)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی شادی کا علم رسول اللہ ﷺ کو اس وقت ہوا جب آپ نے عبدالرحمن پر زعفران کا زرد رنگ دیکھا۔ اگر اسلام میں بارات کا کوئی تصور ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کو سب سے پہلے بلایا جاتا۔ لیکن اسلام میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ نبی ﷺ یا کسی بھی صحابی کی شادی پر بارات ساتھ گئی ہو۔

نبی کریم ﷺ سے آپ کی پیاری بیٹی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا رشتہ مانگنے کے لیے علی رضی اللہ عنہ اکیلے ہی آپ کے پاس تشریف لے گئے تھے لیکن آپ ﷺ کے جلال و ہیبت کی وجہ سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''تمھیں کون سی چیز لائی ہے، کیا تجھے کوئی حاجت ہے؟'' علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں خاموش ہو گیا۔'' پھر آپ نے ایسے ہی کہا میں پھر خاموش ہو گیا۔ بالآخر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَعَلَّكَ جِئْتَ تَخْطُبُ فَاطِمَةَ؟)) ''شاید تم فاطمہ رضی اللہ عنہا سے منگنی کے لیے آئے ہو۔''

تو علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں!'' آپ نے پوچھا: ''کیا تمہارے پاس مہر دینے کے لیے کچھ ہے۔'' علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ! نہیں اللہ کی قسم!'' آپ نے فرمایا: ''تیری لوہے کی زرہ کہاں ہے جو میں نے تجھے پہنائی تھی؟ کہنے لگے: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں علی کی جان! وہ تو حطمیہ ہے، اس کی قیمت چار درہم بھی نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تیرے نکاح میں دیا، تو اس زرہ کو بھیج دے جس کے ساتھ تو فاطمہ کو حلال کرے گا۔'' یعنی بطور مہر دے کر اسے اپنے لیے حلال بنا لو۔ فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کا یہی حق مہر تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں ۔ [دلائل النبوة للبيهقى (١٦٠/٣) ، البداية والنهاية (٣٠٢/٣)۔ اسد الغابة (٢١٦/٨)، (٢١٥)]

اس واقعہ سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ کائنات کے افضل ترین بندوں میں سے علی المرتضیٰ اور فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہما کی شادی پر نہ بارات کا میلا اور نہ رسم و رواج کو کوئی دخل۔ علی رضی اللہ عنہ اکیلے ہی منگنی کے لیے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حق مہر پوچھ

کرا اپنی پیاری لخت جگر فاطمہ بتول ﷞ کا نکاح کر دیا۔ صحیح اسلامی طریقہ یہی ہے کہ جس گھر میں نکاح کا ارادہ ہو وہاں لڑکا پیغام نکاح دے، وہ گھر والے اگر منظور کر لیں تو جلد نکاح کر دیں، رسم و رواج کا قطعاً انتظار نہ کریں، اسی میں خیر و فلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ صحیح سنت رسول پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بخشے اور ہر قسم کے ہندوانہ رسم و رواج سے بچائے۔ (آمین!)

شادی کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلانا

سوال آپ کا مضمون ''شادی کے کھانے کی شرعی حیثیت'' غزوہ میں نظروں سے گزرا، آپ نے ولیمہ پر مدلل بحث کی ہے مگر اصل مسئلہ شادی ہال میں لڑکی والوں کی طرف سے دی جانے والی دعوت ہے، جس پر آج کل اخبارات میں بھی بحث جاری ہے۔ براہ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں اس پر بھی تفصیلاً روشنی فرمایے تاکہ لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوں؟

جواب اگر آپ اس مضمون کو غور سے پڑھتے تو اس سوال کا جواب آپ کو اس مضمون میں مل جاتا۔ قرآن وسنت کی رو سے شادی کے موقع پر جو دعوت ثابت ہے وہ ولیمہ ہے، جس کے میں نے کئی ایک دلائل ذکر کیے اور محدثین نے جو دعوت کی اقسام بیان کی ہیں ان کا بھی اجمال سے تذکرہ کیا ہے۔ جس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ لڑکی والوں کے گھر لڑکے والے جو بارات لے کر جاتے ہیں اور لڑکی والے اپنے دوست احباب کو بلا لیتے ہیں اور پھر ان سب کے لیے ضیافت کا بندوبست کیا جاتا ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں۔ بارات کے بارے میں راقم نے غزوہ میں پہلے بحث کر دی ہے کہ موجودہ بارات کا تصور اسلام میں نہیں ہے اور ہمیں خیر القرون میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ شادی کے موقع پر جو دعوت ہوتی ہے وہ ولیمہ ہی ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی شادی کے موقع پر بھی ہوا اور صحابہ کرام ﷡ کو بھی آپ نے ولیمہ کرنے کے لیے کہا۔ لہٰذا شادی پر یہی دعوت ہونی چاہیے خواہ شادی ہال میں ہو یا کسی حویلی اور گھر میں، یہی شرعاً ثابت ہے۔

دعوت ولیمہ پر سلامی

سوال کیا دعوت ولیمہ پر سلامی دینا قرآن وحدیث سے ثابت ہے؟

جواب مسلمانوں نے جب سے اسلام کے احکامات کو پس پشت ڈالا ہے اس وقت سے ان کے اندر بے شمار خرابیاں داخل ہو گئیں، کئی ایک ایسے اعمال سرانجام دیے جاتے ہیں جن کی اسلام میں کوئی دلیل موجود نہیں ہوتی۔ منجملہ ان امور میں سے شادی بیاہ کے مسائل بھی ہیں۔ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر اکثر و بیشتر ہندوانہ رسم و رواج کی پابندی کی جاتی ہے، شادی کے موقع پر دعوت ولیمہ کر کے مہمانوں کو بلا کر ان سے نیوتا وصول کرنا بھی ہندوانہ رسم ہے اور برصغیر پاک و ہند میں ہندوؤں کے اختلاط سے یہ رسم بھی اہل اسلام میں داخل ہو چکی ہے اور پھر یہ نیوتا ایک قرض ہے، اگر آج کسی کی شادی پر ایک سو روپیہ دیا جاتا ہے تو کل یہ امید ہوتی ہے کہ دو سو ملے گا اور اگر کوئی شخص ادا نہ کرے تو اس سے ناراضی ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ کم از کم ہماری گھر پہنچ تو دے دیں اور اگر کوئی شخص صرف لیا ہوا پیسا واپس کرے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی بھاجی ختم کر دی

ہے۔ ہندوستان میں کنبوہ برادری ایسی اشیاء کو پسند نہیں کرتی تھی۔ ڈاکٹر محمد عمر لکھتے ہیں:

''کنبوہ برادری کے مسلمان جہیز نہیں دیتے تھے اور عروس کے گھر رسم (مہندی) بھی نہیں بھیجتے تھے اور نکاح میں یا شب عروسی کو یا حنا بندی کے موقع پر شربت پلانے کے بعد براتیوں سے نیوتا یا نیگ بھی نہیں لیتے تھے، کیوں کہ یہ لوگ فرط غیرت سے ان کاموں کو مکروہ سمجھتے تھے۔'' [هندوستاني تهذيب كا مسلمانوں پر اثر (ص ١٥٣/ ١٥٤)]

اگر کوئی فرد کسی دوسرے پر احسان و نیکی یا تنگی میں اس کا تعاون کرنا چاہے تو اسے اپنے اس احسان کا بدلہ زیادہ مال لینے کی توقع سے نہیں کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور احسان کر کے زیادہ لینے کی خواہش نہ کر۔'' [المدثر : ٦]

ہمارے ہاں ولیموں کی دعوت میں یہی خواہش کارفرما ہوتی ہے کہ آج اگر اتنے پیسے دیں گے تو کل ہماری شادی پر زیادہ ملیں گے۔ لہٰذا اس ہندوانہ رسم کا خاتمہ کرنا چاہیے۔ اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ صرف شادی کے بعد حسب استطاعت دعوت ولیمہ ہے۔ کھانا کھانے والوں سے گھر بلا کر پیسے وصول کرنا ایک انتہائی مضحکہ خیز حرکت ہے، اللہ تعالیٰ اجتناب کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

نکاح کے بعد چھوہارے تقسیم کرنا

سوال ہمارے ہاں رسم ہے کہ نکاح کے بعد چھوہارے تقسیم کیے جاتے ہیں کیا یہ سنت طریقہ ہے؟

جواب اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں اپنی زندگی کے تمام معاملات میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ زندگی کے معاملات میں سے ایک اہم معاملہ نکاح کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں کئی صحابہ اور صحابیات کے نکاح پڑھائے لیکن کسی بھی صحیح حدیث سے ہمیں یہ ثبوت نہیں ملتا کہ آپ نے کسی نکاح میں نکاح کے بعد چھوہارے تقسیم کیے ہوں اور یہ تو ایک ہندوانہ رسم ہے۔ تاہم مسلمانوں میں اس فعل کا رواج چند ضعیف اور موضوع روایات کی بنا پر ہے۔ ان کا مختصر تجزیہ درج ذیل ہے:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ تَزَوَّجَ بَعْضَ نِسَائِهِ فَنُثِرَ عَلَيْهِ التَّمْرُ» [بيهقى(٧/ ٢٨٧)، الكامل في ضعفاء الرجال(٢/ ٧٤١)]

''رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی عورت سے شادی کی تو آپ ﷺ پر خشک کھجوریں بکھیری گئیں۔''

اس روایت کی سند میں الحسن بن عمرو سیف العبدی راوی ہے۔ امام علی بن مدینی اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے کذاب کہا ہے اور امام ابو حاتم رازی رحمہ اللہ نے اسے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔[المعنى فى ضعفاء الرجال (١/ ٢٥٤)، كتاب الضعفاء والمتروكين(١/ ٢٠٨)]

امام ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''یہ راوی متروک ہونے کا مستحق ہے۔'' [کتاب المجروحین(۲/۲۱۳)]
اس کی متابعت ابن ابی داؤد نے کی ہے لیکن اس کی سند میں سعید بن سلام راوی کذاب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اسے کذاب، امام بخاری نے روایات گھڑنے والا وضاع اور امام دارقطنی رحمہ اللہ نے متروک اور باطل روایات بیان کرنے والا قرار دیا ہے۔'' [کتاب الموضوعات(۲/۲٦٤)]
ثابت ہوا کہ یہ روایت باطل و موضوع ہے۔

② سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِذَا زَوَّجَ اَوْ تَزَوَّجَ نَثَرَ تَمْرًا » [بیهقی(۷/۲۸۸)]
''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کی شادی کرتے یا خود شادی کرتے تو خشک کھجوریں بکھیرتے۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کی سند میں عاصم بن سلیمان البصری راوی ہے جسے عمرو بن علی نے جھوٹ اور وضع حدیث کی طرف منسوب کیا ہے۔'' امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
''اسے بہت سارے محدثین نے کذاب قرار دیا ہے۔'' [المغنی فی ضعفاء الرجال(۱/۵۰٦)]
ثابت ہوا یہ روایت بھی جھوٹی ہے۔

③ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''مجھے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک انصاری آدمی کی شادی میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا اور انصاری کا نکاح کر دیا اور فرمایا: ''الفت، خیر اور اچھے کاموں کو لازم پکڑو، اپنے ساتھی کے سر پر دف بجاؤ۔'' تو اس کے سر پر دف بجائی گئی اور میوے اور شکر کے پیکٹ لائے گئے، آپ نے وہ صحابہ پر بکھیر دیے، لیکن قوم رک گئی اور انھوں نے اسے لوٹا نہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''کس قدر عمدہ بردباری ہے، لوٹتے کیوں نہیں؟'' انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ نے اس اور اس دن ہمیں لوٹنے سے منع کیا تھا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے تمھیں لشکروں کی لوٹ مار سے روکا تھا، ولیموں کی لوٹ سے نہیں روکا، لہٰذا تم لوٹو۔''
معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''اللہ کی قسم! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ہم سے چھین رہے تھے۔''
[الکامل(۱/۳۱۲)، الموضوعات لابن الجوزی(۲/۲٦۰)]

یہ روایت بھی جھوٹ پر مبنی ہے۔ اس کی سند میں بشیر بن ابراہیم انصاری راوی ہے۔ امام عقیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''وہ میرے نزدیک روایات گھڑنے والوں میں سے ہے۔'' امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وہ ثقہ راویوں پر روایتیں گھڑتا ہے۔'' [میزان الاعتدال(۱/۳۱۱)]
یہ روایت ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے لیکن اس میں بھی حازم اور لمازہ دونوں راوی مجہول ہیں۔ [الموضوعات لابن الجوزی(۲/۲٦٦)]

④ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری مرد اور عورت کی شادی میں شریک ہوئے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارا شاہد کہاں ہے؟'' انھوں نے کہا: ''ہمارا شاہد کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''دف۔'' تو وہ دف لائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے ساتھی کے سر پر بجاؤ'' پھر وہ اپنے برتن چھوہاروں وغیرہ سے بھر کر لائے اور انھوں نے چھوہارے وغیرہ بکھیرے تو لوگ اسے حاصل کرنے سے ڈرے۔ جب آپ نے وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا: ''آپ ﷺ نے لوٹ سے منع کیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے لشکروں میں لوٹ سے منع کیا تھا، شادی اور اس قسم کے مواقع سے منع نہیں کیا۔'' [الموضوعات (۲/ ۲٦٦)]

اس کی سند میں خالد بن اسماعیل راوی ہے جو ثقہ راویوں پر روایات گھڑتا ہے جیسا کہ امام ابن عدی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اس سے کسی صورت بھی حجت پکڑنا جائز نہیں۔'' امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس مسئلے میں کچھ بھی ثابت نہیں۔'' [بیہقی (۷/ ۲۸۸)]

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ نکاح کے موقع پر چھوہارے بانٹنے اور بکھیرنے کے متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں اور یہ صرف ایک رواج ہے جو مسلمانوں میں رائج ہو چکا ہے، اس لیے اس سے بچنے ہی میں خیر ہے۔

لونڈیوں سے مباشرت

سوال کیا لونڈیوں سے مباشرت کے لیے نکاح ضروری ہے؟ نیز اسلام اس ضمن میں کیا احکامات دیتا ہے؟ وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے درج ذیل آیات پر غور کیجیے:

① ﴿ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴾ [النساء: ۳]

''اور اگر تمھیں خطرہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں ان سے انصاف نہ کر سکو گے تو پھر دوسری عورتوں سے جو تمھیں پسند آئیں دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ ان میں انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی کافی ہے یا پھر وہ کنیزیں اور باندیاں ہیں جو تمھارے قبضے میں ہوں۔ بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ بات زیادہ درست ہے۔''

② ﴿ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ [النساء: ۲٤]

''نیز تمام شوہروں والی عورتیں بھی تم پر حرام ہیں مگر وہ باندیاں جو تمھارے قبضے میں آئیں۔''

③ ﴿ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ ﴾
[النساء: ۲۵]

''جو شخص کسی آزاد مومنہ عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ کسی مومنہ باندی سے نکاح کرلے جو تمھارے قبضے میں ہوں اور اللہ تعالیٰ تمھارے ایمان کا حال خوب جانتا ہے۔ (کوئی عورت آزاد یا لونڈی) سب ایک ہی جنس سے ہیں لہٰذا ان کے مالکوں کی اجازت سے تم ان سے نکاح کرسکتے ہو۔''

④ ﴿ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ ﴾ [المومنون:۵۔۷]

''وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے اپنی بیویوں یا لونڈیوں کے وہ قابل ملامت نہیں ہیں البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔''

ان آیات میں موجود شرمگاہوں کی حفاظت کے عمومی حکم سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے دو قسم کی عورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، ایک ''ازواج'' اور دوسری '' مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ''۔ لفظ ازواج کا اطلاق عرب زبان کے معروف استعمال اور قرآن حکیم کی تصریحات کے مطابق صرف ان عورتوں پر ہوتا ہے جو باقاعدہ نکاح میں لائی گئی ہوں اور معروف طریقے کے مطابق ان سے عقد قائم کیا گیا ہو۔ اس کے لیے اردو میں بیوی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جب کہ '' مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ '' عربی محاورہ اور قرآنی لغت کے اعتبار سے لونڈی و باندی پر بولا جاتا ہے، یعنی وہ عورت جو آدمی کی ملک اور قبضے میں ہو۔ اس طرح یہ آیات وضاحت کرتی ہیں کہ مملوکہ لونڈی سے بھی مالک کو جنسی تعلقات قائم کرنے کی اجازت ہے اور اس کے جواز کی بنیاد نکاح نہیں بلکہ صرف ملکیت ہے۔ اگر اس کے لیے نکاح شرط ہوتا تو اسے ازواج سے علیحدہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ منکوحہ ہونے کی صورت میں وہ بھی ازواج میں داخل ہوتیں۔

حاملہ عورت سے صحبت کرنا

سوال کیا حاملہ عورت سے اس کا شوہر صحبت کرسکتا ہے، کتاب و سنت میں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب آدمی کے لیے اپنی حاملہ عورت سے جماع کرنا جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ﴾ [البقرہ: ۲۲۳]

''تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتی ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

''مومن لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں البتہ اپنی بیویوں اور باندیوں سے نہیں۔'' [المومنون: ۶/۵]

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مطلقاً بیوی کے ساتھ صحبت کو جائز رکھا ہے، منع وہاں ہوگا جہاں کوئی دلیل ہوگی۔ لہٰذا حالت حمل میں منع نہیں کیا گیا، اس لیے آدمی صحبت کرسکتا ہے۔ دوران حیض صحبت منع ہے، اسی طرح پچھلے حصے میں صحبت بھی منع ہے۔ حدیث میں ایسے شخص پر لعنت وارد ہے کیونکہ وہ گندگی اور نجاست کا محل ہے۔ نفاس کی حالت میں بھی ممانعت کا ہی حکم ہے۔

ولادت سے کتنی مدت بعد مرد عورت کے پاس جائے

(سوال) بچہ کی پیدائش کے کتنے دن بعد آدمی عورت کے پاس جائے گا؟ پوری وضاحت فرمائیں۔

(جواب) ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

''نفاس والی عورتیں نبی ﷺ کے دور میں نفاس کے بعد چالیس دن تک بیٹھی رہتی تھیں۔'' [مسند احمد: (٦/٣٠٠) ، ابوداؤد، کتاب الطهارة: باب ما جاء في وقت النفساء (١/٣)]

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ نفاس والی عورتیں چالیس دن تک نماز چھوڑیں گی سوائے اس کے جو اس سے پہلے نفاس کے خون سے پاک ہوجائے، تو وہ غسل کرے اور نماز پڑھے۔''

معلوم ہوا کہ بچے کی ولادت کے بعد چالیس دن تک عورت نماز نہیں پڑھے گی اور نہ شوہر اس کے ساتھ صحبت کرے گا۔ اگر چالیس دن سے پہلے خون بند ہوجائے اور عورت طہر کی حالت میں آجائے تو غسل کرے۔ خون رک جانے کے بعد مرد اپنی اہلیہ کے ساتھ صحبت کرسکتا ہے۔ نفاس کا وہی حکم ہے جو حیض کا حکم ہے۔

عورت کے حقوق

(سوال) عام طور پر مجلات و رسائل میں عورت کے ذمہ جو واجبات ہیں انھیں ہی بیان کیا جاتا ہے کیا مردوں پر ان کی بیویوں کے کوئی حقوق نہیں؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس طرح مردوں کے حقوق رکھے ہیں اسی طرح خواتین کے بھی حقوق بیان کیے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں عورت پر قسما قسم کے مظالم روا رکھے جاتے تھے، عورت کا زندہ دفن کیا جانا، وراثت سے محرومی، نا انصافی وغیرہ بیماریاں عام تھیں۔ اللہ نے عورت کو قعر مذلت سے نکال کر انصاف پر مبنی حقوق سے نوازا اور مرد کو حسن معاشرت کا حکم صادر کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [النساء: ١٩]

''بیویوں کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کرو۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾ [البقرہ: ٢٢٨]

''اور عورتوں کا (مردوں پر) ویسا ہی حق ہے جیسا دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے، البتہ مردوں کو

عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔''

ان آیات بینات سے واضح ہوا کہ خواتین کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جیسے مردوں کے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''ایمان والوں میں سے کامل ترین مومن وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو اور تم میں سے اچھے وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لیے اچھے ہیں اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب میں سے اچھا ہوں۔'' [ترمذی ، کتاب الرضاع : باب ما جاء فی حق المرأة علی زوجها (١١٦٢)]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مومن مرد مومنہ عورت سے بغض نہ رکھے، اگر اس کی ایک عادت کو ناپسند کرے گا تو دوسری عادت سے راضی ہو جائے گا۔'' [مسلم ، کتاب الرضاع : باب الوصیة بالنساء (٧١٥)]

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے کہا:

''یا رسول اللہ! ہماری بیوی کا ہم پر کیا حق ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''جب تم کھانا کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ اور جب تم لباس پہنو تو اسے بھی پہناؤ، چہرے پر نہ مارو اور برے طریقے سے پیش نہ آؤ اور تم اسے سوائے گھر کے نہ چھوڑو۔'' [ابوداؤد ، کتاب النکاح باب فی حق المرأة علی زوجها (٢١٤٢)]

مذکورہ بالا نصوص صحیحہ صریحہ سے معلوم ہوا کہ خواتین کے بھی مردوں پر حقوق ہیں، جو مرد اپنی خواتین سے ناروا سلوک کرتے ہیں، ان کے لباس، خوراک اور گھر کا خیال نہیں رکھتے، ان سے حسن معاشرت کی بجائے گالی گلوچ سے پیش آتے ہیں انھیں عذاب الٰہی سے ڈر جانا چاہیے۔ اگر ایک عورت اپنے شوہر کی وفا دار ہے اور اپنے بستر پر اس کی غیر موجودگی میں کسی غیر کو داخل نہیں ہونے دیتی اور اس کے بچوں اور گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے تو مرد کا بھی حق ہے کہ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ وقت گزارے، اس کے دکھ درد میں شریک ہو، اچھے لوگ وہی ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھ کر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے مرد ایسے ہیں جو حقوق الناس سے یکسر غافل ہیں، قیامت والے دن جہاں حقوق اللہ کا سوال ہوگا وہاں حقوق الناس کے بارے بھی پوچھ گچھ ہوگی، اللہ تعالیٰ صحیح عمل کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

خاندانی منصوبہ بندی

سوال کیا کسی مجبوری کی بنا پر نسل منقطع کرنے کا آپریشن کروایا جا سکتا ہے بالخصوص جب زچہ کی جان کو خطرہ لاحق ہو؟

جواب قطع نسل کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر و بیوی میں سے کسی ایک کے توالد و تناسل والے اعضاء میں داخلی یا خارجی ایسی تبدیلی کر دی جائے جس کی وجہ سے وہ ابدی طور پر اولاد کی نعمت سے محروم ہو جائیں اور بچہ جنم دینے کے بالکل قابل نہ رہیں۔ جیسا کہ گزشتہ دور میں مردوں کو خصی کر دیا جاتا تھا اور آج کے ترقی یافتہ دور میں نس بندی اور اپریشن وغیرہ کیا جاتا ہے۔ یہ صورت ناجائز و حرام ہے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« رَدَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ التَّبَتُّلَ وَ لَوْ اَذِنَ لَهٗ لَاخْتَصَيْنَا »
[بخاری، کتاب النکاح: باب ما یکرہ من التبتل والخصاء (۵۰۷۳)، مسلم (۱۴۰۲)، ترمذی (۱۰۸۳)، نسائی (۳۲۱۴)، ابن ماجه (۱۸۴۸/۲)، مسند احمد (۱۷۵/۱)، دارمی (۲۱۶۷)]

''رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو نکاح کے بغیر رہنے سے منع کر دیا۔ اگر آپ انھیں اجازت دے دیتے تو ہم خصی ہو جاتے۔''

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

« كُنَّا نَغْزُوْا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ لَيْسَ لَنَا شَيْءٌ فَقُلْنَا اَلَا نَسْتَخْصِيْ؟ فَنَهَانَا عَنْ ذٰلِكَ ثُمَّ رَخَّصَ لَنَا اَنْ نَّنْكِحَ الْمَرْاَةَ بِالثَّوْبِ ثُمَّ قَرَاَ عَلَيْنَا:﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾» [بخاری، کتاب النکاح: باب ما یکرہ من التبتل والخصاء (۵۰۷۵)]

''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے تھے اور ہمارے پاس ہماری کوئی بیوی نہیں ہوتی تھی۔ ہم نے کہا: ''کیا ہم خصی نہ ہو جائیں؟'' آپ ﷺ نے ہمیں اس سے منع کیا پھر ہمیں رخصت دی کہ ہم ایک کپڑے کے عوض عورتوں سے نکاح کر لیں پھر آپ ﷺ نے ہم پر قرآن کی یہ آیت پڑھی: ''اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ نس بندی یا بذریعہ اپریشن آلات توالد و تناسل میں ایسا تغیر و تبدل کرنا جس سے نسل کا سلسلہ منقطع ہو جائے بالکل ناجائز و حرام ہے۔ البتہ بعض اوقات ایسی صورت کچھ خواتین کے ساتھ پیش آ جاتی ہے کہ ان کے اعضائے تولید اس قابل نہیں ہوتے کہ جن سے فطری اور طبعی طریقے سے ولادت ہو سکے۔ مجبوراً غیر فطری طریقے سے بذریعہ اپریشن بچہ پیدا ہوتا ہے اور ماہر ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق بذریعہ اپریشن دو یا تین مرتبہ ولادت کے بعد عورت میں بچہ جنم دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی بلکہ جان کے ضیاع کا قوی اندیشہ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں عورت کا حاملہ ہونا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اضطراری اور مجبوری کی حالت میں جب ماہر مسلمان ڈاکٹرز فیصلہ دے دیں کہ یہ عورت اب ولادت کے قابل نہیں رہی تو ایسی صورت اختیار کرنے کی گنجائش ہے کہ ولادت کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے۔ کیونکہ اسلام کا اصول ہے:

''اَلضُّرُوْرَاتُ تُبِيْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ'' (شدید مجبوری حرام اشیاء کو جائز بنا دیتی ہے۔)

لہٰذا شدید مجبوری کی صورت میں ماہر مسلمان ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق اپریشن کروایا جا سکتا ہے۔

شادی کے دو ماہ بعد بچے کی پیدائش

سوال اگر شادی کے دو ماہ بعد کسی کے ہاں بچہ کی پیدائش ہو جائے تو کیا اسے جائز اولاد تصور کیا جا سکتا ہے؟

(جواب) شادی کے دو ماہ بعد پیدا ہونے والا بچہ کس طرح حلال کا ہوسکتا ہے جب کہ روح چار ماہ بعد پھونکی جاتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ فِي بَطْنِ اُمِّهِ اَرْبَعِينَ يَوْمًا ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ ...... الرُّوْحَ » [بخاری، کتاب القدر: باب (٦٥٩٤)، مسلم (٢٦٤٣)]

"بلاشبہ تم میں سے ایک کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک (نطفے کی صورت میں) جمع کیا جاتا ہے، پھر اس کے مثل جما ہوا خون، پھر اس کے مثل گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے، اسے چار چیزوں کا حکم دیا جاتا ہے، اس کے رزق، نیک بخت یا بد بخت ہونے کا، پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔"

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ چار ماہ کے بعد بچے میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ اس کے بعد کم از کم دو ماہ اور ولادت تک لگتے ہیں ۔یعنی کم از کم شادی کے چھ ماہ بعد اگر بچہ پیدا ہو تو اسے اہل علم نے حلال شمار کیا ہے اور اس کے باپ کی طرف منسوب کرنا درست قرار دیا ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهُ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا وَ حَمْلُهُ وَ فِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ [الأحقاف:١٥]

"اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے تکلیف جھیل کر اسے اٹھائے رکھا اور تکلیف برداشت کر کے اسے جنم دیا اور اس کا حمل اور دودھ چھڑائی کا زمانہ تیس مہینے ہے۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے یعنی اڑھائی سال بیان کی ہے جس میں چوبیس ماہ یعنی دو سال مدت رضاعت ہے اور باقی جو چھ ماہ بچتے ہیں وہ مدت حمل ہے کیونکہ مدت رضاعت کی قرآن کریم نے خود وضاحت کر دی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ [البقرة:٢٣٣]

"مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت پوری کرنے کا ہو۔"

اس آیت کریمہ میں ﴿ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ کہہ کر یہ بات بتا دی ہے کہ مدت رضاعت دو برس ہی ہے۔اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهُ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَ فِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴾ [لقمان:١٤]

"اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں احسان کا حکم دیا ہے، اس کی ماں نے اسے تکلیف در تکلیف کی صورت میں اٹھائے رکھا اور اس کی دودھ چھڑائی دو برس میں ہے تا کہ تو میرا شکریہ ادا کرے اور اپنے والدین کا بھی ،میری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ ﴿ وَ فِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ کہہ کر دودھ چھڑانے کی مدت دو برس ہی بتائی ہے۔ لہٰذا شادی کے چھ ماہ بعد پیدا ہونے والا بچہ تو حلالی شمار ہوگا، اس سے کم مدت والا بچہ حلال نہیں ہوگا۔امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ قَدِ اسْتَدَلَّ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ مَعَ الَّتِيْ فِيْ لُقْمَانَ : ﴿ وَ فِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ وَ قَوْلِهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى : ﴿ وَ الْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ عَلٰى اِنَّ اَقَلَّ مُدَّةِ الْحَمْلِ سِتَّةُ اَشْهُرٍ وَ هُوَ اِسْتِنْبَاطٌ قَوِيٌّ وَ صَحِيْحٌ وَ وَافَقَهُ عَلَيْهِ عُثْمَانُ وَ جَمَاعَةٌ مِّنَ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ " [تفسير ابن كثير(٧/٢٥٧)]

''سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سورۂ احقاف کی اس آیت کو سورۂ لقمان کی آیت (١٤) اور سورۂ بقرہ کی آیت (٢٣٣) کے ساتھ ملا کر استدلال کیا ہے کہ مدت حمل کم از کم چھ ماہ ہے، یہ استنباط قوی اور صحیح ہے اور اس پر ان کی موافقت عثمان رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کی ہے۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَالرِّضَاعُ اَرْبَعَةٌ وَّ عِشْرُوْنَ شَهْرًا وَ الْحَمْلُ سِتَّـةُ اَشْهُرٍ "

''مدت رضاعت چوبیس ماہ اور مدت حمل چھ ماہ ہے۔''

علامہ شنقیطی رحمہ اللہ سورۂ لقمان اور سورۂ بقرہ کی مدت رضاعت والی آیات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

" بَيَّنَ اَنَّ اَمَدَ الْفِصَالِ عَامَانِ وَ هُمَا اَرْبَعَةٌ وَّ عِشْرُوْنَ شَهْرًا فَاِذَا طَرَحْتَهَا مِنَ الثَّلَاثِيْنَ بَقِيَتْ سِتَّةُ اَشْهُرٍ فَتَعَيَّنَ كَوْنُهَا اَمَدُ الْحَمْلِ وَ هِيَ اَقَلُّهُ وَ لَا خِلَافَ فِيْ ذٰلِكَ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ " [تفسير أضواء البيان(٥/٣٨)]

''سورۂ لقمان اور سورۂ بقرہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بیان کی ہے جو چوبیس مہینے ہے، جب چوبیس ماہ کو آپ تیس ماہ میں سے نفی کر دیں تو باقی چھ ماہ رہ جائیں گے جس سے حمل کی مدت متعین ہو جائے گی اور یہ کم از کم مدت ہے اور اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔''

امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ فِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ اَقَلَّ مُدَّةِ الْحَمْلِ سِتَّةُ اَشْهُرٍ لِاَنَّهُ اِذَا حُطَّ مِنْهُ الْفِصَالُ حَوْلَانِ لِقَوْلِهِ تَعَالٰى : ﴿ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ بَقِيَ ذٰلِكَ " [تفسير بيضاوى(٢/٣٩٤)]

''اس آیت کریمہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ کی رو سے جب دو سال دودھ چھڑانے کی مدت کو تیس ماہ سے نکال دیا جائے تو چھ ماہ باقی رہ جاتے ہیں۔''

تفسیر جلالین میں ہے:

" سِتَّةُ اَشْهُرٍ اَقَلُّ مُدَّةِ الْحَمْلِ وَ الْبَاقِيْ اَكْثَرُ مُدَّةِ الرَّضَاعِ " [تفسير جلالين(ص/٦٦٨)]
" چھ ماہ کم از کم مدت حمل ہے اور باقی دو سال زیادہ سے زیادہ مدت رضاعت ہے۔"

علامہ زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَهٰذَا دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ اَقَلَّ الْحَمْلِ سِتَّةُ اَشْهُرٍ لِاَنَّ مُدَّةَ الرَّضَاعِ اِذَا كَانَتْ حَوْلَيْنِ لِقَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ : ﴿ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ بَقِيَتْ لِلْحَمْلِ سِتَّةُ اَشْهُرٍ " [تفسير الكشاف(٣٠٢/٤)]

" یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہے، اس لیے کہ اللہ کے فرمان: ﴿ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ کی رو سے مدت رضاعت دو سال ہے تو پھر (تیس ماہ میں سے چوبیس ماہ نفی کر دیں تو) مدت حمل چھ ماہ رہ جاتی ہے۔"

علامہ محمد آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" اس آیت کریمہ سے علی اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور علماء کی ایک جماعت نے استدلال کیا ہے کہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہے، اس لیے کہ جب تیس ماہ میں سے دو سال دودھ چھڑانے کے نکال لیں، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ " مائیں اپنی اولاد کو دو سال مکمل دودھ پلائیں جن کا ارادہ مدت رضاعت کو پورا کرنے کا ہو" تو حمل کے لیے یہی چھ ماہ باقی رہ جاتے ہیں اور یہی بات اطباء نے بھی کہی ہے۔ جالینوس نے کہا ہے: " زمانہ حمل کی مقدار کے متعلق میں بڑا سخت متلاشی تھا تو میں نے دیکھا ایک عورت نے ۱۸۴ راتوں میں بچے کو جنم دیا۔" (یعنی چھ ماہ اور چار پانچ راتیں) ابن سینا نے اس مشاہدے کا دعویٰ کیا ہے۔" [تفسير روح المعاني(١٨/٢٦)]

اس آیت کریمہ کی مزید تفسیر دیکھنے کے لیے ملاحظہ ہو:

- تفسير فتح القدير للشوكاني(١٨/٥)
- تفسير أيسر التفاسير(٢٣١/٤)
- تفسير المراغي(١٨/٢٧)
- تفسير معالم التنزيل (١٦٧/٤)
- أحكام القرآن لأبي بكر ابن العربي(١٦٩٧/٤)
- تفسير مدارك(٥٥٣/٢)
- تفسير قاسمي(٤٤٥/٨)
- تفسير فتح البيان(٣٠٠/٦)

بعجہ بن عبد اللہ جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" ہمارے قبیلے کے ایک شخص نے جہینہ کی ایک عورت سے نکاح کیا، چھ ماہ پورے ہوتے ہی اسے بچہ پیدا ہو گیا۔ اس کے شوہر نے اس بات کا ذکر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس عورت کی جانب ایک آدمی بھیجا۔ وہ تیار ہو کر آنے لگی تو اس کی بہن نے آہ و بکا شروع کر دی۔ اس عورت نے اپنی بہن سے کہا: " تم کیوں روتی ہو، اللہ کی قسم! میں نے اللہ کی مخلوق میں سے اس آدمی کے علاوہ کسی سے اختلاط نہیں کیا، اللہ جو چاہے گا میرے متعلق فیصلہ کرے گا۔" جب وہ شخص اس عورت کو لے کر عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس کو رجم کرنے کا حکم دیا تو یہ بات علی رضی اللہ عنہ کو پہنچی ۔ وہ تشریف لائے اور خلیفۃ المسلمین عثمان رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: " آپ کیا کرنے لگے ہیں؟" تو

خلیفہ نے جواب دیا: ''اس عورت نے چھ ماہ پورے ہوتے ہی بچہ کو جنم دیا ہے، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' تو علی رضی اللہ عنہ نے انھیں کہا: ''کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟'' تو انھوں نے کہا: ''کیوں نہیں۔'' علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''کیا آپ نے یہ آیت نہیں سنی: ﴿ وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ ''اس کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ ہے'' اور اللہ نے فرمایا ہے: ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ ''مدت رضاعت دو سال ہے'' جب تیس ماہ سے چوبیس ماہ نکال دیں تو باقی چھ ماہ رہ جاتے ہیں۔'' تو عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم ! میرا خیال ہی اس طرف نہیں گیا، جاؤ اس عورت کو میرے پاس لے آؤ۔'' پس لوگوں نے اس عورت کو اس حال میں پایا کہ وہ اس حمل سے فراغت حاصل کر چکی تھی۔ بعجہ بن عبد اللہ جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اللہ کی قسم! ایک کوا دوسرے کوے سے اور ایک انڈا دوسرے انڈے سے اتنا مشابہ نہیں ہوتا جتنا اس عورت کا یہ بچہ اپنے باپ کے مشابہ تھا۔'' پھر جب لڑکے کے والد نے اسے دیکھا تو کہا: ''اللہ کی قسم! یہ میرا بیٹا ہے، مجھے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔'' [تفسیر ابن کثیر (٢٥٨/٧)، تفسیر ابن ابی حاتم (٣٢٩٣/١٠)، تفسیر الدر المنثور (٩/٦)]

مذکورہ بالا توضیح سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ شادی کے چھ ماہ بعد جو بچہ پیدا ہو اسے حلال کا شمار کیا جاتا ہے اور اس کے باپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جو بچہ شادی کے دو ماہ بعد پیدا ہو وہ کسی طرح بھی حلال کا نہیں ہوگا۔ اس میں بدکاری کو یقینی طور پر دخل ہے۔ والدین کو اپنی اولاد کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ بچوں کو بالغ ہونے کے بعد جتنا جلدی ممکن ہو مناسب رشتہ تلاش کر کے شادی کے بندھن میں باندھ دیں تا کہ وہ حرام کاری سے بچ سکیں، جو والدین بلاوجہ اپنے بچوں کی شادیاں لیٹ کر دیتے ہیں ان میں سے اکثریت ایسوں کی ہے جو مختلف گلی محلوں، سڑکوں، پارکوں، چوکوں، چوراہوں، ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں اپنی جوانی برباد کر دیتے ہیں اور جنسی بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمیں ہندوانہ رسومات کو بالائے طاق رکھ کر کتاب وسنت کے مطابق اپنی اولاد کو بہت جلد رشتہ ازدواج میں منسلک کر دینا چاہیے تا کہ وہ اپنی نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت کر کے پاکباز، متقی اور صالح انسان بن سکیں۔

طویل عرصہ بیرون ملک رہنے والے کے نکاح کا حکم

سوال کیا شادی شدہ آدمی کا نکاح دو سال بیرون ملک رہنے کے بعد باقی رہتا ہے یا نہیں یا دوبارہ نکاح کرنا چاہیے؟

جواب شادی شدہ آدمی کا نکاح اس وقت ٹوٹتا ہے یا رشتہ ازدواج ختم ہوتا ہے جب وہ اپنی اہلیہ کو طلاق دے ڈالے اور رجوع نہ کرے حتیٰ کہ عدت گزر جائے یا عورت خلع لے لے یا دونوں میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے اور دین اسلام سے خارج ہو جائے، بصورت دیگر نکاح قائم رہتا ہے، شوہر بیوی سے خواہ کتنا عرصہ دور رہے اور اگر مرد عورت کے نزدیک نہ جانے کی قسم کھالے جسے شریعت میں ایلاء کہتے ہیں تو اگر یہ قسم چار ماہ سے کم مدت کی ہے تو اس کی حیثیت عام قسم کی ہے اگر مدت پوری ہونے سے پہلے ہم بستری کر لیتا ہے تو قسم کا کفارہ دینا ہوگا، اگر مدت پوری کرے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں، لیکن اگر اس نے ہمیشہ کے لیے قسم کھائی ہو یا چار ماہ سے زیادہ کی قسم کھائی ہے تو اسے بیوی کے مطالبہ پر صرف چار ماہ کی مدت دی جائے گی،

اگر یہ مدت پوری کرنے کے بعد اپنی بیوی سے ہم بستری کر لیتا ہے تو اس پر صرف کفارہ واجب ہوگا اور اگر ہم بستری نہیں کرتا تو اسے طلاق پر مجبور کیا جائے گا۔ اگر طلاق نہیں دیتا تو عورت سے دفع ضرر کے لیے حاکم وقت شوہر کی طرف سے طلاق کو نافذ کردے گا۔ (ملاحظه هو تیسیر الرحمن لبیان القرآن از دکتور لقمان سلفی (۱۲۶)]

لہٰذا مرد کا بیوی سے صرف دور رہنے سے طلاق واقع نہیں ہو جائے گی تاوقتیکہ وہ طلاق نہ دے ڈالے، یا عورت خلع نہ لے لے۔ عام طور پر جو لوگ اپنے ملک سے کسی کاروبار' نوکری وغیرہ کی غرض سے باہر جاتے ہیں تو شوہر اور بیوی باہمی رضامندی ہی سے یہ کام کرتے ہیں اور مرد کئی کئی سال باہر رہتے ہیں اور عورتیں اس پر اعتراض نہیں کرتیں بلکہ اس بات پر خوشی محسوس کرتی ہیں۔ سلف صالحین کے دور میں مرد حضرات جہاد فی سبیل اللہ میں کئی کئی سال اپنے گھر سے دور رہتے یا حصول علم کے لیے لمبے لمبے سفر کرتے تھے۔ کہیں سے بھی یہ بات نہیں ملتی کہ اس بُعد اور دوری کی بنا پر دونوں کا نکاح ختم ہونے کا کسی نے فتویٰ صادر کیا ہو۔ (واللہ اعلم!)

ایک سے زیادہ بیویوں کے مابین عدل کا حکم

سوال جیسا کہ قرآن وحدیث کے احکامات ہیں کہ جو شخص ایک سے زیادہ بیویاں رکھے وہ ان میں عدل کرتے ہیں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ عدل کن امور میں ہے اور کیسے ممکن ہے؟

جواب جس آدمی کی دو یا دو سے زیادہ بیویاں ہوں تو اس پر ان کے درمیان نان ونفقہ، رہائش اور رات بسر کرنے میں عدل کرنا واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾[النساء:۳]

''اگر تمھیں ڈر ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی کافی ہے۔''

معلوم ہوا کہ عورتوں کے درمیان عدل کرنا واجب ہے اور جو شخص اپنی بیویوں کے درمیان عدل سے کام نہیں لیتا اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ يَمِيلُ لِإِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَجُرُّ أَحَدَ شِقَّيْهِ مَائِلًا »

[مسند احمد (۲/ ۲۹۵) ، ابوداؤد، كتاب النكاح: باب فى القسم بين النساء(۲۱۳۳)]

''جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے ایک کی طرف مائل ہو تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی ایک جانب مفلوج ہوگی۔''

البتہ اگر دل میں کسی کی محبت زیادہ ہے تو یہ ایک فطری عمل ہے، اس پر مواخذہ نہیں۔ (واللہ اعلم)

بیوی یا شوہر کا راز افشا کرنے کا شرعی حکم

سوال اگر کوئی عورت یا مرد آپس کی راز کی باتیں دوسروں کو بتائے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(جواب) عورت ہو یا مرد دونوں میں سے کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی جنسی گفتگو اور دیگر پوشیدہ اسرار و رموز کی باتیں کسی دوسرے کے آگے ظاہر کریں، اس لیے کہ ایسے لوگ شریعت کی نظر میں بہت برے ہیں اور اللہ کے ہاں ان کا بہت برا ٹھکانا ہو گا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بے شک اللہ کے نزدیک قیامت والے دن سب لوگوں سے برا ٹھکانا اس آدمی کا ہوگا جو اپنی اہلیہ کے پاس جاتا ہے اور اس کی اہلیہ اس کے پاس آتی ہے پھر وہ اس کے راز پھیلا دیتا ہے۔'' [صحیح مسلم، کتاب النکاح: باب تحریم افشاء سرا المرأة (١٤٣٧)]

دوسری حدیث میں ہے:

''امانت کی سب سے زیادہ خیانت کرنے والا وہ آدمی ہے جو اپنی اہلیہ کے ہاں رات بسر کرتا ہے وہ اس کے ہاں رات گزارتی ہے پھر وہ اس کے راز افشا کرتا ہے۔'' [مسلم، کتاب النکاح : باب تحریم إفشاء سراالمرأة : (١٤٣١)]

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

''اس حدیث سے آدمی کے لیے اس کی اہلیہ کے درمیان جاری رہنے والے امور اور ان کی تفصیل بیان کرنے اور پھیلانے کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔'' [شرح نووی (٨/١٠)]

لہٰذا مرد وزن کو اس بات میں محتاط رہنا چاہیے کہ وہ اپنے اندرونی معاملات یعنی ایک دوسرے کے جسمانی راز اور اپنی جنسی گفتگو کسی دوسرے فرد سے بیان نہ کریں۔ ہمارے معاشرے میں یہ بیماری عام ہے کہ مرد جنسی معلومات ذکر کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے، اسی طرح خواتین اپنی سہیلیوں سے اپنے شوہروں کے ساتھ گزرنے والے مخصوص حالات بلا جھجک بیان کرتی اور پوچھتی ہیں۔ ایسے معاملات سے مکمل گریز کرنا چاہیے۔

حرمت رضاعت

(سوال) کیا حرمتِ رضاعت دودھ پینے والے کے بہن بھائیوں پر بھی لاگو ہوگی یا یہ صرف اسی تک محدود رہے گی؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حرام رشتوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ﴾ [النساء:٢٣]

''اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا اور تمھاری دودھ شریک بہنیں تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

« اَلرَّضَاعَةُ تُحَرِّمُ مَا تُحَرِّمُ الْوَلَادَةُ » [احمد (١٧٨/٦)، بیهقی (١٥٩/٧)، عبد الرزاق(١٣٩٥٤)، ابوداؤد(٢٠٥٥)، ترمذی(١١٤٧)، سنن سعید بن منصور(٩٥٣)، ابن حبان(٤٢٠٩)]

''رضاعت وہ رشتے حرام کر دیتی ہے جو رشتے ولادت حرام کرتی ہے۔''

مراد یہ ہے کہ جس طرح آدمی کے لیے نسباً ماں، بہن، بیٹی، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی حرام ہیں اسی طرح رضاعی ماں بہن وغیرہ بھی حرام ہیں۔ رضاعی ماں اور بہن تو قرآن کی نص کے ساتھ حرام ہیں اور باقی رشتے حدیث کی نص کے ساتھ حرام ہیں۔ رضاعت کا حکم صرف اس آدمی کے لیے ہے جس نے دودھ پیا ہے، اس کے بھائی بہنوں کے لیے نہیں۔ کیونکہ رضاعت متعدی نہیں ہوتی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَ لَا يَتَعَدَّى التَّحْرِيْمُ إِلَى اَحَدٍ مِنْ قَرَابَةِ الرَّضِيْعِ فَلَيْسَتْ أُخْتُهُ مِنَ الرَّضَاعَةِ أُخْتًا وَ لَا بِنْتًا لِأَبِيْهِ إِذْ لَا رَضَاعَ بَيْنَهُمْ وَ الْحِكْمَةُ فِيْ ذٰلِكَ اَنْ سَبَبَ التَّحْرِيْمِ مَا يَنْفَصِلُ مِنْ اَجْزَاءِ الْمَرْأَةِ وَ زَوْجِهَا وَ هُوَ اللَّبَنُ فَإِذَا اغْتَذَى بِهِ الرَّضِيْعُ صَارَ جُزْءً ا مِنْ اَجْزَائِهِمَا فَانْتَشَرَ التَّحْرِيْمُ بَيْنَهُمْ بِخِلَافِ قَرَابَاتِ الرَّضِيْعِ لِأَنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْمُرْضِعَةِ وَ لَا زَوْجِهَا نَسَبٌ وَ لَا سَبَبٌ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ " [فتح الباری(١٤١/٨)]

"دودھ پینے والے بچے کے قریبی رشتہ داروں کی طرف حرمت متعدی نہیں ہوتی۔ اس دودھ پینے والے بچے کی رضاعی بہن اس کے بھائی کی رضاعی بہن نہیں ہے اور نہ اس کے باپ کی بیٹی ہے اس لیے کہ ان کے درمیان رضاعت نہیں ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ حرمت کا سبب وہ دودھ ہے جو عورت اور اس کے خاوند کے اجزا سے جدا ہوتا ہے اور جب دودھ پینے والا بچہ اس دودھ کے ذریعے غذا حاصل کرتا ہے تو وہ ان دونوں کے اجزا میں سے ایک جزو ہوتا ہے تو ان کے درمیان حرمت منتشر ہو جاتی ہے۔ دودھ پینے والے بچے کے قریبی رشتہ داروں میں یہ بات نہیں ہوتی، اس لیے کہ ان کے درمیان اور دودھ پلانے والی اور اس کے خاوند کے درمیان نہ نسبی رشتہ ہے اور نہ حرمت کا سبب ہے۔"

امام ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ لَا بَأْسَ اَنْ يَّتَزَوَّجَ الرَّجُلُ الْمَرْأَةَ الَّتِيْ اَرْضَعَتِ ابْنَهُ وَ كَذٰلِكَ يَتَزَوَّجُ ابْنَةَ هٰذِهِ الْمَرْأَةِ الَّتِيْ هِيَ رَضِيْعُ ابْنِهِ وَ لِأَخِيْ هٰذَا الْغُلَامِ الْمُرْضِعِ اَنْ يَّتَزَوَّجَ الْمَرْأَةَ الَّتِيْ اَرْضَعَتْ اَخَاهُ وَ يَتَزَوَّجُ ابْنَهَا الَّتِيْ هِيَ رَضِيْعُ اَخِيْهِ " [الإقناع(٣٠٨/١)]

"اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ آدمی اپنے بیٹے کی رضاعی ماں اور رضاعی بہن سے نکاح کرے، اسی طرح اس کا بھائی بھی اس کی رضاعی ماں اور رضاعی بہن سے نکاح کر سکتا ہے۔"

امام ابن قدامہ مقدسی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" فَأَمَّا الْوَلَدُ الْمُرْتَضِعُ فَإِنَّ الْحُرْمَةَ تَنْتَشِرُ إِلَيْهِ وَ إِلَى اَوْلَادِهِ وَ إِنْ نَزَلُوْا وَ لَا تَنْتَشِرُ إِلَى مَنْ فِيْ دَرَجَتِهِ مِنْ إِخْوَانِهِ وَ اَخَوَاتِهِ وَ لَا إِلَى اَعْلَى مِنْهُ كَأَبِيْهِ وَ أُمِّهِ وَ اَعْمَامِهِ وَ عَمَّاتِهِ وَ اَخْوَالِهِ وَ

خَالَاتِهِ وَ اَجْدَادِهِ وَجَدَّاتِهِ فَلَا يَحْرُمُ عَلَى الْمُرْضِعَةِ نِكَاحَ اَبِي الطِّفْلِ الْمُرْتَضِعِ وَ لِاَخِيهِ وَ لَا عَمِّهِ وَ لَا خَالِهِ وَ لَا يَحْرُمُ عَلىٰ زَوْجِهَا نِكَاحُ اُمِّ الطِّفْلِ الْمُرْتَضِعِ وَ لَا اُخْتِهِ وَ لَا عَمَّتِهِ وَ لَا خَالَتِهِ وَ لَا بَاْسَ اَنْ يَّتَزَوَّجَ اَوْلَادَ الْمُرْضِعَةِ وَ اَوْلَادَ زَوْجِهَا اِخْوَةُ الطِّفْلِ الْمُرْتَضِعِ وَ اَخَوَاتِهِ "

[المغنی لابن قدامة(۱۱/۳۱۸،۳۱۹)]

" رضاعت کی بنا پر حرمت دودھ پینے والے لڑکے اور اس کی اولاد کی طرف منتشر ہوتی ہے اور اگر چہ نیچے تک ہوں (یعنی اس کے پوتے اور پڑپوتے وغیرہ) یہ حرمت اس کے بھائیوں اور بہنوں کی طرف اور اس سے اوپر رشتوں کی طرف منتشر نہیں ہوتی، جیسے دودھ پینے والے کا باپ، ماں، چچا، پھوپھیاں، ماموں، خالائیں، دادے، نانے، دادیاں، نانیاں۔ دودھ پلانے والی کا دودھ پینے والے کے باپ، بھائی، چچا اور ماموں کے ساتھ نکاح حرام نہیں اور نہ اس کے خاوند پر دودھ پینے والے کی ماں، بہن، پھوپھی اور خالہ حرام ہیں اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ دودھ پلانے والی کی اولاد اور اس کے خاوند کی اولاد دودھ پینے والے کے بھائیوں اور بہنوں سے نکاح کریں۔"

یہی بات نواب صدیق حسن خان قنوجی رحمہ اللہ نے نقل فرمائی ہے۔[الروضة الندية(۲/۲۵)]

لہٰذا وہ اولاد جن کا آپس میں رضاعت کا تعلق ہے، ان کے دیگر بہن بھائیوں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم ہوسکتا ہے، شرعاً کوئی مانع موجود نہیں۔

رضاعت کا مسئلہ

سوال ندیم جب پیدا ہوا تو اس کے گیارہ دن بعد اس کی والدہ فوت ہوگئی، پونے دو سال تک ندیم کو اس کی ایک پھوپھی نے دودھ پلایا، پھر ایک سانحہ ہوا جس میں ندیم کی دادی کا بیٹا فوت ہوگیا۔ ندیم دودھ پینے کے لیے چیخ رہا تھا تو اس کی دادی نے ایک دفعہ یا دو دفعہ دودھ پلایا، آیا قرآن و حدیث کی روشنی میں ندیم اپنی پھوپھی جس کا اس نے دودھ پیا ہے، کے علاوہ باقی پھوپھیوں کی کسی بیٹی سے نکاح کرسکتا ہے؟

جواب شرع کی رو سے جو رشتے نسب سے حرام ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہیں مدت رضاعت دو سال ہے، اگر بچہ اس مدت کے اندر دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے اور دودھ کی مقدار اتنی ہو جو بچے کے لیے غذا کا کام دے اور بچے کی آنتیں بھر دے۔ جیسا کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے:

" وہی دودھ پلانا حرمت ثابت کرتا ہے جو چھاتی سے نکل کر آنتوں کو پھاڑے اور یہ دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہو۔" [ترمذی، کتاب الرضاع: باب ما جاء أن الرضعة لا تحریم إلا فی الصغر دون الحولین (۱۱۵۲)]

اور جمہور ائمہ محدثین کے نزدیک یہ دودھ پینا پانچ بار ہے۔ اس کی دلیل وہ مشہور حدیث ہے جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ قرآن کریم میں دس بار دودھ پینے کے بعد حرمت رضاعت کا حکم نازل ہوا تھا پھر

پانچ بار کے ذریعے حکم سابق منسوخ کر دیا گیا اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت یہی پانچ بار دودھ پینے کا حکم موجود تھا۔ احادیث میں ''رضعات'' کا لفظ آیا ہے جو ''رضعۃ'' کی جمع ہے، جس کے معنی خوب سیر ہو کر دودھ پینے کے ہیں کہ آنتیں بھر جائیں یا بچہ جب ایک بار چھاتی کو منہ لگاتا ہے پھر اپنی مرضی سے چھوڑ دیتا ہے تو یہ ایک بار ہے، اس طرح پانچ بار دودھ پیے تو حرمت ثابت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ایک یا دو بار دودھ پلانا حرمت ثابت نہیں کرتا۔'' [صحیح مسلم، کتاب الرضاع: باب فی المصة والمصتان (۱۴۵۰)]

ام الفضل رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

''ایک دیہاتی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ میرے گھر تشریف فرما تھے، اس نے کہا: ''اے اللہ کے نبی! میری ایک بیوی ہے، میں نے اس پر دوسری عورت سے شادی کی ہے اور میری پہلی بیوی کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس عورت کو ایک یا دو بار دودھ پلایا ہے جس سے میں نے دوسری شادی کی ہے تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''ایک یا دو بار دودھ پینا حرام نہیں کرتا۔'' [مسلم، کتاب الرضاع: باب فی المصة و المصتان: (۱۴۵۱)]

مندرجہ بالا احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ ایک یا دو بار دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، لہٰذا سائل مذکور نے جو صورت بیان کی ہے اس میں ندیم اپنی اس پھوپھی کی بیٹیوں سے نکاح نہیں کر سکتا جس کا پونے دو سال تک دودھ پیا ہے البتہ باقی پھوپھیوں کی بیٹیوں سے کر سکتا ہے کیونکہ دادی کا دودھ اس نے ایک یا دو بار پیا ہے جس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

ایک دفعہ دودھ پینے سے رضاعت

سوال ایک لڑکے نے اپنی خالہ کا ایک مرتبہ دودھ پیا تو کیا اس لڑکے کا اپنی خالہ کی لڑکی سے نکاح ہو سکتا ہے؟

جواب اگر بچے کو اس کی حالت شیر خوارگی میں اس طرح دودھ پلایا گیا ہو کہ وہ اس کے بدن کی غذا بن جائے خواہ کسی طرح بھی پلایا جائے تو اس سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«اِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ» [صحیح مسلم، کتاب الرضاع: باب إنما الرضاعة من المجاعة (۱۴۵۵)]

''رضاعت بھوک سے ثابت ہوگی۔''

یعنی جس رضاعت سے بچے کی بھوک دور ہو جائے وہ باعث حرمت ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس رضاعت سے حرمت ثابت ہوگی جو آنتوں کو پھاڑ دے اور یہ دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہو۔'' [ترمذی، کتاب الرضاع: باب ما جاء أن الرضاعة لاتحرم الا فی الصغر دون الحولین: (۱۱۵۲)]

یعنی جس رضاعت سے دودھ سے آنتیں بھر کر ایک دوسری سے جدا ہو جائیں۔ محدثین کی اکثریت اس بات کی طرف گئی ہے کہ ایسے دودھ کی تعداد پانچ مرتبہ دودھ پینا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں اس کی تائید میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے اور قرآن حکیم نے جو مطلق طور پر رضاعت ذکر کی ہے، ان احادیث نے اس اطلاق کو مقید کر دیا ہے اور عام کی تخصیص ہو گئی ہے،

ایک مرتبہ یا دو مرتبہ دودھ چوس لینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ایک مرتبہ چوسنا یا دو مرتبہ چوسنا حرام نہیں کرتا، حرام کرنے کی مقدار پانچ رضعات ہیں۔''[مسلم، كتاب الرضاع: باب في المصة والمصتان (١٤٥٠)]

یعنی بچہ ایک مرتبہ پستان منہ میں لے کر دودھ چوستا ہے پھر اپنی مرضی سے بغیر کسی عارضے کے چھوڑ دے تو یہ ایک مرتبہ ہے، اس طرح پانچ دفعہ اگر کسی بچے کے بارے ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں ہوگی اور اس عورت کی بیٹی اس کی رضاعی بہن ہوگی۔ اس کے ساتھ نکاح حرام ہوگا کیونکہ جو رشتے نسب سے حرام ہیں وہی رضاعت سے بھی حرام ہیں۔

صورت مسئولہ میں ایک مرتبہ دودھ پینے کا ذکر کیا گیا ہے اگر یہ بات ٹھیک ہے تو اس لڑکے کا اس لڑکی سے نکاح بالکل درست ہے۔ حرمت رضاعت کی مقدار مکمل نہیں ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب!

بڑی عمر میں رضاعت ثابت نہیں ہوتی

سوال اگر کوئی شخص غلطی سے اپنی اہلیہ کا دودھ پی لے تو کیا میاں بیوی والا رشتہ قائم ہے یا کہ ختم ہو جاتا ہے؟

جواب یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ایک آدمی نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ ''میں نے اپنی اہلیہ کا دودھ چوس لیا ہے اور وہ میرے پیٹ میں چلا گیا ہے۔'' تو ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں سمجھتا ہوں وہ تجھ پر حرام ہو چکی ہے۔'' تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم اس آدمی کو جو فتویٰ دے رہے ہو اس پر غور کرو؟'' ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ کیا کہتے ہیں؟'' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''رضاعت صرف وہی ہے جو دو سال میں ہو۔'' ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب تک یہ عالم تم میں موجود ہے تم مجھ سے کسی چیز کے بارے سوال نہ کرو۔'' [الموطا للمالك، كتاب الرضاع(١٤)، مسند احمد (٤٣٢/١)، ارواء الغليل (٢٢٣/٧)، (٢٢٤)]

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ حرمت رضاعت جس مدت میں ہوتی ہے وہ دو سال تک ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے بھی تین مقامات پر اس کی وضاحت کی ہے کہ مدت رضاعت دو سال ہے، لہٰذا بڑی عمر میں رضاعت ثابت نہیں ہوتی اور نہ مرد پر عورت حرام ہوتی ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فقیہ امت کا فتویٰ قرآن حکیم کے بالکل مطابق ہے اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی تائید کر دی ہے۔ یاد رہے کہ عورت کا دودھ مرد کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت کے بچوں کے لیے ہے، کتاب و سنت کی نصوص سے ماں کا دودھ بچوں ہی کے لیے ثابت ہوتا ہے۔

بہن کا دودھ پینے والے کی اولاد

سوال اگر کسی شخص نے اپنی بہن کا دودھ پیا ہو تو کیا اس شخص اور اس کی بہن جس کا اس نے دودھ پیا ہے ان دونوں کی

اولادوں کا آپس میں نکاح ہوسکتا ہے؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے رضاعت کی بنا پر بھی وہ رشتے حرام کیے ہیں جو نسبی طور پر حرام ہیں۔ یعنی جس طرح سگی ماں، بہن، بیٹی، بھتیجی، بھانجی، پھوپھی اور خالہ حرام ہیں اسی طرح یہ رضائی رشتے بھی حرام ہیں۔ لہٰذا جس شخص نے اپنی بہن کا دودھ پیا ہے، بہن کی اولاد اس شخص کے بھائی بہن ہوں گے اور اس شخص کی اولاد کے چچا اور پھوپھیاں ہوں گے جن کا باہمی نکاح حرام ہے۔

مذکورہ صورت میں تو سگے باپ کا رضائی بھائی مذکورہ شخص کی اولاد کا چچا لگتا ہے۔ خیر القرون میں ایسی مثال ملتی ہے کہ رضائی باپ کا بھائی جو دودھ پینے والی لڑکی کا چچا لگتا ہے اس کے ساتھ مذکورہ لڑکی کا نکاح حرام ٹھہرا جیسا کہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''ابوالقعیس کے بھائی افلح نے نزول حجاب کے بعد میرے پاس آنے کی اجازت طلب کی، میں نے کہا: میں اسے اتنی دیر تک اجازت نہیں دوں گی جب تک اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب نہ کر لوں۔ اس لیے کہ اس کے بھائی ابوالقعیس نے مجھے دودھ نہیں پلایا بلکہ مجھے ابوالقعیس کی بیوی نے دودھ پلایا ہے۔ میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ابوالقعیس کے بھائی افلح نے میرے پاس آنے کی اجازت مانگی، میں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ میں آپ سے اس کے بارے میں اجازت طلب کرلوں۔'' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تجھے اجازت دینے سے کیا چیز مانع ہوئی؟ وہ تیرا چچا ہے۔'' میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! یقیناً مرد نے مجھے دودھ نہیں پلایا بلکہ ابوالقعیس کی بیوی نے مجھے دودھ پلایا ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس کو اجازت دے دے، اس لیے کہ وہ تیرا چچا لگتا ہے۔'' عروہ راوی حدیث بیان کرتا ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا اسی لیے فرماتی تھیں:

«حَرِّمُوا مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا تُحَرِّمُونَ مِنَ النَّسَبِ» [مسلم، كتاب الرضاع: باب تحريم الرضاعة من ماء الفحل(١٤٤٥)، مسند احمد(٦/٤٤)، ابن كثير(٦/٣٧٨)]

''جو رشتے نسب سے حرام سمجھتے ہو وہی رشتے رضاعت سے حرام سمجھو۔''

مذکورہ بالا مفصل حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح نسب سے رشتے حرام ہوتے ہیں اسی طرح رضاعت سے بھی حرام ہوتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے اس سے پچھلا مسئلہ دیکھیے۔

وٹہ سٹہ کا نکاح

(سوال) وٹہ سٹہ کیا ہے؟ اور وٹہ سٹہ کی شادی کا کیا حکم ہے؟

(جواب) شرعی طور پر اس نکاح کو شغار کہا جاتا ہے اور شغار کی ممانعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ایک صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا شِغَارَ فِي الْإِسْلَامِ » [مسلم، كتاب النكاح: باب تحريم نكاح الشغار و بطلانه (١٤١٥)، مسند احمد (٢/٩١-٣٥)]

''اسلام میں شغار (یعنی وٹہ سٹہ کا نکاح) نہیں ہے۔''

یہ روایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں بھی مروی ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَهٰى عَنِ الشِّغَارِ » [مسلم، كتاب النكاح: باب تحريم نكاح الشغار وبطلانه (١٤١٥)، مؤطا(٢٤)، كتاب الأم للشافعى(٧٦/٥)، بخارى، كتاب النكاح:باب الشغار (٥١١٢)، ابو داؤد، كتاب النكاح: باب الشغار(٢٠٧٤)، ابن ماجه(١٨٨٣)، مسند احمد (٧/٦)]

''بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شغار (وٹہ سٹہ کا نکاح) سے منع فرمایا ہے۔''

نیز یہی حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں بھی مروی ہے اور انس رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ، ابن حبان اور مسند احمد میں موجود ہے۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن حبان، ابن ابی شیبہ، مسند طیالسی اور مسند احمد میں موجود ہے ۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مسلم، بیہقی اور مسند احمد وغیرہ میں موجود ہے۔

اس صحیح ترین حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وٹہ سٹہ کی شادی شرعی طور پر ناجائز وحرام ہے اور شغار کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا بہن یا کسی بھی عورت کو جو اس کی زیر ولایت ہو اس شرط پر کسی سے بیاہ دے کہ وہ اپنی بیٹی یا بہن یا کسی بھی عورت کو جو اس کی زیر ولایت ہو، اس کے خاندان کے کسی مرد سے بیاہ دے۔ یہ شرط شرعاً ناجائز ہے کیونکہ ایسی کوئی شرط کتاب وسنت میں موجود نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

« كُلُّ شَرْطٍ لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَهُوَ بَاطِلٌ » [مسند احمد(٢١٣/٢)، بخارى، كتاب البيوع: باب إذا اشترط فى البيع شرطا لا تحل (٢١٦٨) ، مسلم (١٥٠٤)]

''ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔''

صحیح بخاری وغیرہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« مَا بَالُ رِجَالٍ يَشْتَرِطُوْنَ شُرُوْطًا لَيْسَتْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ ؟ مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَهُوَ بَاطِلٌ وَ اِنْ كَانَ مِائَةُ شَرْطٍ »

''ایسے لوگوں کا کیا حال ہے جو ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں موجود نہیں ہیں، ایسی شرط جو کتاب اللہ میں موجود نہیں وہ باطل ہے خواہ وہ سو شرطیں ہی کیوں نہ ہوں؟''

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ لَا يَحِلُّ نِكَاحُ الشِّغَارِ وَ هُوَ اَنْ يَّتَزَوَّجَ هٰذَا وَلِيَّةَ هٰذَا عَلَيْهِ اَنْ يُّزَوِّجَهُ الْآخَرُ وَلِيَّتَهُ اَيْضًا سَوَاءٌ ذَكَرَ فِيْ كُلِّ ذٰلِكَ صَدَاقًا لِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا اَوْ لِاِحْدَاهُمَا دُوْنَ الْاُخْرٰى اَوْ لَمْ يَذْكُرَا فِيْ شَيْءٍ مِّنْ ذٰلِكَ صَدَاقًا كُلُّ ذٰلِكَ سَوَاءٌ " [المحلى لابن حزم(١١٨/٩)]

''وٹہ سٹہ کا نکاح حلال نہیں اور وٹہ سٹہ کا نکاح یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کی زیر ولایت لڑکی سے اس شرط پر

نکاح کرے کہ دوسرا آدمی بھی اپنی زیر ولایت لڑکی کو اس طرح اس کے ساتھ بیاہ دے گا۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ انھوں نے ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے مہر ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو یا ایک کا مہر ذکر کیا ہو اور دوسری کا نہ کیا ہو یا دونوں میں سے کسی کا بھی حق مہر ذکر نہ کیا ہو، یہ تمام صورتیں برابر ہیں۔''

اور شغار کی جو تفسیر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں آئی ہے کہ ایک آدمی اپنی بیٹی اس شرط پر دوسرے کو بیاہ دے کہ وہ اپنی بیٹی اسے بیاہ دے گا تو ان دونوں کا مہر نہ ہوگا، تو یہ نافع رحمہ اللہ کا قول ہے جیسا کہ صحیح روایت میں موجود ہے کہ عبید اللہ فرماتے ہیں:

« قُلْتُ لِنَافِعٍ مَا الشِّغَارُ ؟ قَالَ يُنْكِحُ ابْنَةَ الرَّجُلِ وَ يُنْكِحُهُ ابْنَتَهُ بِغَيْرِ صَدَاقٍ وَ يُنْكِحُ أُخْتَ الرَّجُلِ وَ يُنْكِحُهُ أُخْتَهُ بِغَيْرِ صَدَاقٍ » [بخاری، کتاب الحیل، باب الحیلة فی النکاح (٦٩٦٠)]

''میں نے نافع رحمہ اللہ سے کہا: ''شغار کیا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''شغار یہ ہے کہ کوئی شخص کسی آدمی کی بیٹی سے اس طرح نکاح کرے کہ دوسرا اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دے اور دونوں کے درمیان مہر نہ ہو اور آدمی کی بہن سے اس طرح نکاح کرے کہ وہ اسے اپنی بہن نکاح میں دے دے اور دونوں کے درمیان حق مہر نہ ہو۔''

اگرچہ شغار کی اس تعریف میں یہ اختلاف کیا گیا ہے کہ یہ امام مالک رحمہ اللہ یا نافع رحمہ اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح ہے لیکن صحیح تر قول یہ ہے کہ یہ نافع کی تشریح ہے اور اس میں مہر کی قید اتفاقی ہے۔ شغار میں اصل نکاح کا مشروط کرنا ہے کہ دوسرا بھی اپنی زیر ولایت لڑکی کا نکاح اس سے کر دے اور یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث کے ساتھ ثابت ہے۔ عبد الرحمن بن ہرمز الاعرج رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

" اِنَّ الْعَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْعَبَّاسِ اَنْكَحَ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ الْحَكَمِ ابْنَتَهُ وَ اَنْكَحَهُ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بِنْتَهُ وَ كَانَا جَعَلَا صَدَاقًا فَكَتَبَ مُعَاوِيَةُ اِلٰى مَرْوَانَ يَأْمُرُهُ بِالتَّفْرِيْقِ بَيْنَهُمَا وَ قَالَ فِيْ كِتَابِهٖ : هٰذَا الشِّغَارُ الَّذِیْ نَهٰى عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ "[ابوداود، کتاب النکاح: باب فی الشغار (٢٠٧٥)، مسند احمد (٩٤/٤)، ابن حبان (١٢٦٨)]

''عباس بن عبد اللہ بن عباس نے عبد الرحمن بن حکم کو اپنی بیٹی نکاح میں دی اور عبد الرحمن بن حکم نے عباس کو اپنی بیٹی نکاح میں دے دی اور ان دونوں نے مہر بھی مقرر کیا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو خط لکھ کر حکم دیا کہ دونوں نکاحوں میں جدائی کر دی جائے اور اپنے خط میں لکھا: ''یہی وہ شغار ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔''

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَهٰذَا مُعَاوِيَةُ بِحَضْرَةِ الصَّحَابَةِ لَا يُعْرَفُ لَهُ مِنْهُمْ مُخَالِفٌ ...... يَفْسَخُ هٰذَا النِّكَاحَ وَ اِنْ ذَكَرَا فِيْهِ الصَّدَاقَ وَ يَقُوْلُ اِنَّهُ الَّذِیْ نَهٰى عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَارْتَفَعَ الْاِشْكَالُ جُمْلَةً " [المحلی لابن حزم (١٢٢/٩)]

”یہ معاویہ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں اس نکاح شغار کو فسخ کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ان کی مخالفت کرنے والا نہیں۔ اگرچہ اس میں دونوں نے مہر کا ذکر بھی کیا ہے اور فرماتے ہیں:” یہ وہ نکاح ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے۔“ اس سے تمام اشکال رفع ہو جاتے ہیں۔“

کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جسے شغار قرار دیا تھا، معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے مطابق ان دونوں نکاحوں میں تفریق کروا دیتے ہیں، اگرچہ انھوں نے مہر کا ذکر کیا تھا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ نکاح شغار میں اصل چیز شرط ہے اور مہر ایک اتفاقی قید ہے۔ یہ قید لگائی جائے یا نہ لگائی جائے، نفس مسئلہ پر اثر انداز نہیں ہوگی اور اس شرط کی بنیاد پر یہ نکاح حرام ہے۔ ایسے مشروط نکاح میں تفریق کروا دینی چاہیے۔

ہاں اگر کسی آدمی نے اپنی زیر ولایت لڑکی کا نکاح کسی دوسرے آدمی سے کر دیا اور کوئی رشتہ کی شرط نہیں لگائی اور پھر بعد میں دوسرے آدمی کا پروگرام بن گیا کہ وہ پہلے کو رشتہ دے دے تو اسے شغار یعنی وٹہ سٹہ نہیں کہا جاتا اور نہ اس کی ممانعت حدیث میں کہیں موجود ہے۔

نکاح پر نکاح

س: اگر کوئی امام مسجد بغیر جانچ پڑتال کے کسی عورت کا نکاح پر نکاح پڑھا دے تو کیا اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اور کیا اس کا اپنا نکاح قائم ہے یا ٹوٹ گیا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

ج: بشرط صحت سوال نکاح پر نکاح پڑھانا حرام ہے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حرام رشتے بیان کرتے ہوئے خاوند والی عورتوں کا بھی ذکر فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ ﴾ [النساء: ٢٤]

یعنی جب عورت کسی کے نکاح میں ہو تو اس کے ساتھ نکاح کرنا حلال نہیں۔

اسلام میں نکاح پر نکاح تو درکنار منگنی پر منگنی کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَخْطُبُ الرَّجُلُ عَلٰى خِطْبَةِ أَخِيهِ حَتّٰى يَنْكِحَ أَوْ يَتْرُكَ))

[بخاري، كتاب النكاح: باب لا يخطب على خطبة اخيه حتىٰ ينكم أويد ع (٥١٤٤)]

”کوئی آدمی اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی نہ کرے یہاں تک کہ وہ نکاح کرے یا چھوڑ دے۔“

جب کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کا پیغام دیا ہو تو اس پر پیغام دینا منع ہے تو نکاح پر نکاح کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس دوسرے نکاح میں فوراً جدائی کرا دینی چاہیے اور اتنی دیر تک انھیں جدا رکھنا چاہیے جب تک پہلا خاوند طلاق نہ دے دے یا اس سے خلع لے لیا جائے پھر عدت گزرنے پر ان کا نکاح کیا جائے۔ نکاح خوان کے علم میں اگر یہ بات تھی تو

انتہائی غلط حرکت ہے اور اگر معلوم نہ تھا، بے خبری میں نکاح پڑھا دیا، بعد میں علم ہوا تو اپنے کیے پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں، اگر اس امام کے عقیدے میں صریح کفر و شرک نہیں تو اس کے پیچھے نماز درست ہے اور اس کے اس غلط فعل کی بنا پر اس کے اپنے نکاح پر کوئی اثر نہیں۔

شادی سے پہلے کوئی شرط عائد کرنا

سوال شادی کے وقت اگر کوئی ایسی پابندی عائد کی جائے جو خلاف شرع نہ ہو، جیسے عورت شرط لگائے کہ مجھے میرا خاوند شادی کے بعد دینی تعلیم حاصل کرنے سے نہیں روکے گا تو کیا ایسی شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے؟

جواب نکاح منعقد کرتے وقت شرع کے مطابق اگر کوئی پابندی ہو تو اس کو پورا کرنا چاہیے کیونکہ مسلمان اپنی شرائط و عہود کو پورا کرتے ہیں۔ نبی ﷺ نے بھی فرمایا ہے:

''جن شروط کے ذریعے تم شرم گاہوں کو حلال کرتے ہو ان کو پورا کرنا زیادہ لائق و مناسب ہے۔'' [بخاري، كتاب النكاح: باب الشروط في النكاح (٥١٥١)]

لہٰذا اگر عورت کی طرف سے نکاح کے وقت یہ پابندی لگائی گئی کہ وہ شادی کے بعد دینی تعلیم حاصل کرے گی اور خاوند نے اس شرط کو قبول کیا تو نکاح کے بعد مرد کو چاہیے کہ وہ عورت کی اس شرط کو پورا کرے اور دینی تعلیم کے حصول میں اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے۔ اگر خاوند غفلت کرے یا مانع ہو تو عورت اس کو اس بات کی طرف توجہ دلائے اور خیر خواہی کے جذبے سے اسے سمجھائے اور اپنا حق اور شرط حاصل کر لے۔

زبردستی کا نکاح درست نہیں

سوال اگر لڑکی نے قرآن مجید [illegible] کیا ہو اور کتب ستہ پڑھی ہوں اور لڑکا ان پڑھ اور جاہل ہو، لڑکی رشتہ پر راضی نہ ہو اور والدین زبردستی نکاح کرنا چاہیں تو کیا زبردستی کرنا شرعاً درست ہے؟

جواب جس طرح شریعت میں نکاح کے لیے ولی کا ہونا از حد ضروری ہے اسی طرح لڑکی کی رضا مندی حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بیوہ عورت کا نکاح اس کا امر حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح اس کا اذن حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے۔'' آپ ﷺ سے کہا گیا اس کا اذن کیا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''خاموش رہنا اس کا اذن اور اجازت ہے۔''

[كتاب النكاح: باب استيذان الثيب في النكاح بالنطق رقم الحديث (٣٤٧٣)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ کنواری بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت حاصل کر کے کیا جائے اور بیوہ و مطلقہ کا نکاح اس کے امر سے کیا جائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک کنواری لڑکی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہا کہ اس کے باپ نے اس

کا نکاح کر دیا ہے اور وہ اسے نا پسند کرتی ہے تو نبی ﷺ نے اسے اختیار دے دیا۔" [ابوداود ، كتاب النكاح: باب في البكر يزوجها آبوها ولا يستأمرها (٢٠٩٦)، صحيح ابن ماجه (١٢٧/٢)]

اس حدیث کی شرح میں علامہ احمد حسن دہلوی فرماتے ہیں:

"یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ باپ کے لیے حرام ہے کہ وہ اپنی کنواری بیٹی کو نکاح پر مجبور کرے تو باپ کے علاوہ لڑکی کے اولیاء اور دیگر رشتہ داروں کے جبر اور سختی کرنے کی بالاولیٰ ممانعت ثابت ہوتی ہے۔" [تنقيح الرواة : (١٠/٣)]

لہٰذا والدین کو چاہیے کہ اپنی دیندار بچیوں کے لیے دیندار رشتوں کا انتخاب کریں اور اپنی بالغ اولاد سے نکاح پر اجازت بھی حاصل کریں، زبردستی نکاح کرنے سے گریز کریں، زبردستی کا کیا ہوا نکاح بعد میں اکثر و بیشتر والدین کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتا ہے۔

حلالہ کی شرعی حیثیت

سوال مہربانی فرما کر حلالہ کی وضاحت فرما دیں اور یہ بھی بتا دیں کہ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب شوہر جب اپنی بیوی کو تیسری طلاق دے دے تو وہ عورت اس پر حرام ہو جاتی ہے جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے ہم بستری نہ کرے۔ وہ خاوند اسے خود بخود طلاق دے تو پھر یہ عورت اگر پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے:

﴿ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّا اَنْ يُّقِيمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٢٣٠]

"اب اگر تیسری بار اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت اس پر حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔ اگر دوسرا خاوند اس کو طلاق دے دے تو پہلا خاوند اور یہ بیوی آپس میں ملاپ کر سکتے ہیں (یعنی نیا نکاح پڑھا کر) اگر دونوں یہ سمجھیں کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔"

اس کے برعکس لوگوں نے جو یہ طریقہ ایجاد کر رکھا ہے کہ دوسرے خاوند سے اس غرض سے نکاح کیا جائے کہ وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے اور یہ دوسرا خاوند اس کے ساتھ ایک رات یا اس سے کم و بیش حصہ گزار کر طلاق دے دے تو یہ حلالہ ہے۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت فرمائی ہے جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: لُعِنَ الْمُحِلُّ وَ الْمُحَلَّلُ لَهُ » [ابوداود، كتاب النكاح: باب في التحليل(٢٠٧٦)]

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "حلالہ کرنے اور کروانے والے پر لعنت کی گئی ہے۔"

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تو یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلَا اُخۡبِرُکُمۡ بِالتَّیۡسِ الۡمُسۡتَعَارِ ؟ قَالُوۡا بَلٰی یَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ ! قَالَ الۡمُحَلِّلُ لَعَنَ اللّٰهُ الۡمُحَلِّلَ وَ الۡمُحَلَّلَ لَهٗ » [ابن ماجه، كتاب النكاح: باب المحلل والمحلل له (١٩٣٦)]

'' کیا میں تمھیں ادھار کے سانڈ کی خبر نہ دوں؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: '' اے اللہ کے رسول! کیوں نہیں؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' حلالہ کرنے والا ادھار مانگے ہوئے سانڈ کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ حلالہ کرنے اور کروانے والے پر لعنت کرے۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ حلالہ کرنا اور کرانا حرام ہے اور دونوں فریق لعنتی ہیں اور جو لوگ اس عمل کو جائز سمجھتے ہیں ان کا موقف صحیح احادیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

متعہ کا شرعی حکم

سوال متعہ کی تعریف اور اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ شیعہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا ثبوت لاتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟

جواب لغوی اعتبار سے متعہ کا معنی ہے فائدہ حاصل کرنا جیسا کہ امام ابوبکر جصاص نے لکھا ہے۔[احکام القرآن (١٤٦/٢)]

اور اصطلاحی اعتبار سے متعہ کا معنی ہے :''خاص مدت کے لیے کسی قدر معاوضہ پر نکاح کیا جائے۔'' لیکن فقہ جعفریہ کی اصطلاح میں جب کوئی مرد کسی عورت کو وقت مقررہ اور اجرت مقررہ کے عوض مجامعت کی خاطر ٹھیکا پر حاصل کرے تو اس فعل کو متعہ کہتے ہیں، جیسا کہ شیعہ کی کتاب میں لکھا ہے:

" اِنَّمَا هِیَ مُسۡتَاجِرَةٌ " [فروع كافی(١٩١/٢)]

''ممتوعہ عورت ٹھیکا کی چیز ہوتی ہے۔''

ابتدائے اسلام میں متعہ حلال تھا جسے بعد میں قطعی طور پر حرام قرار دے دیا گیا۔ شروع اسلام میں جتنی مرتبہ بھی متعہ حلال ہوا وہ صرف شدید ضرورت اور غزوات وغیرہ میں حالت سفر میں ہوا ہے۔ کسی موقع پر بھی اس کی حلت حضر میں نہیں ہوتی۔

امام ابوبکر محمد بن موسیٰ حازمی رقمطراز ہیں:

" اِنَّمَا کَانَ ذٰلِكَ یَکُوۡنُ فِیۡ اَسۡفَارِهِمۡ وَ لَمۡ یَبۡلُغۡنَا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَ سَلَّمَ اَبَاحَهٗ لَهُمۡ وَ هُمۡ فِیۡ بُیُوۡتِهِمۡ " [الاعتبار للحازمی(ص/٣٣١)]

'' متعہ کی حلت سفروں میں ہوئی اور ہمیں کوئی ایسی حدیث نہیں ملی جس میں یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے حالت حضر میں متعہ کی اجازت دی ہو۔''

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«اِنَّمَا كَانَتِ الْمُتْعَةُ لِخَوْفِنَا وَ لِحَرْبِنَا» [السنن الکبری(۷/۲۰۷)]

''حالت خوف اور غزوات کی وجہ سے متعہ حلال ہوا تھا۔''

ان حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ متعہ صرف اضطرار اور ضرورت شدیدہ کے وقت ہی مباح تھا، عام حالات میں نہیں جیسا کہ شیعہ حضرات سمجھتے ہیں۔ قرآنی نصوص اور صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ متعہ قطعی طور پر حرام ہو چکا ہے اور اسلام نے نفسانی خواہش کی تکمیل کے دو ہی طریقے روا رکھے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ [المومنون:۵۔۷]

وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی لونڈیاں ہوں، وہ قابل ملامت نہیں۔ البتہ جو ان کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ قرآن نے حلت جماع کو دو چیزوں یعنی شادی اور لونڈی ہی میں منحصر کیا ہے اور متعہ کی عورت ان دونوں صورتوں میں سے کسی میں بھی داخل نہیں۔ زوجہ اس لیے نہیں کہ لوازم زوجیت، میراث، طلاق، عدت، نفقہ، ایلاء وظہار اور لعان وغیرہ کی مستحق نہیں اور ظاہر ہے کہ لونڈی بھی نہیں ہے کیونکہ اس کی بیع، ہبہ اور اعتاق وغیرہ بھی جائز نہیں۔

علمائے شیعہ بھی اس بات کے معترف ہیں کہ متعہ کے لیے حاصل کی ہوئی عورت زوجیت میں داخل نہیں۔ چنانچہ ان کی کتاب اعتقادات ابن بابویہ میں تصریح ہے:

" اَسْبَابُ حِلِّ الْمَرْأَةِ عِنْدَنَا اَرْبَعَةٌ النِّكَاحُ وَ مِلْكُ الْيَمِيْنِ وَ الْمُتْعَةُ وَ التَّحْلِيْلُ وَ قَدْ رَوَى اَبُوْ بَصِيْرٍ فِى الصَّحِيْحِ عَنْ اَبِىْ عَبْدِ اللّٰهِ الصَّادِقِ اَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْمُتْعَةِ اَهِىَ مِنَ الْاَرْبَعَةِ قَالَ لَا "

'' ہمارے ہاں عورت کی حلت کے چار اسباب ہیں، پہلا نکاح، دوسرا ملک یمین یعنی لونڈی ہونا، تیسرا متعہ اور چوتھا حلالہ اور ابوبصیر نے صحیح میں امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ کیا متعہ چار سے ہے؟'' تو فرمایا: ''نہیں!''

امام قرطبی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" هٰذَا يَقْتَضِىْ تَحْرِيْمَ نِكَاحِ الْمُتْعَةِ لِاَنَّ الْمُتَمَتِّعَ بِهَا لَا تَجْرِىْ مَجْرَى الزَّوْجَاتِ لَا تَرِثُ وَ لَا تُوْرَثُ وَ لَا يَلْحَقُ بِهِ وَلَدُهَا وَ لَا يَخْرُجُ مِنْ نِكَاحِهَا بِطَلَاقٍ يَسْتَاْنِفُ لَهَا وَ اِنَّمَا يَخْرُجُ بِانْقِضَاءِ الَّتِىْ عُقِدَتْ عَلَيْهَا وَ صَارَتْ كَالْمُسْتَاجِرَةِ " [تفسیر قرطبی(۱۲/۷۲)]

'' یہ آیت متعہ کی حرمت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ ممتوعہ عورت زوجات یعنی بیویوں کے حکم میں نہیں ہے۔ ممتوعہ عورت نہ خود کسی کی وارث ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی وارث ہوتا ہے اور نہ بچے کا الحاق متعہ کرنے والے کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ طلاق ہی کے ساتھ اس سے جدا ہوتی ہے بلکہ طے شدہ مدت کے ختم ہوتے ہی خود بخود اس سے علیحدہ ہو جاتی

ہے۔لہٰذا یہ بیوی کے حکم میں نہیں بلکہ یہ اجرت پر حاصل شدہ چیز ہے۔“

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ [النساء:٣]

”جو عورتیں تمھیں پسند ہوں ان میں سے دو دو، تین تین اور چار چار سے نکاح کرو لیکن اگر تمھیں ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو پھر ایک بیوی ہی رکھو یا وہ عورتیں جو تمھارے قبضہ میں ہیں۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نکاح چار تک محدود ہے اور متعہ میں کوئی عدد مقرر نہیں ہوتا جیسا کہ شیعہ کی معتبر کتاب ”تہذیب الأحکام، کتاب النکاح“ میں ہے: ” تَزَوَّجْ مِنْهُنَّ اَلْفًا فَاِنَّهُنَّ مُسْتَاجِرَاتٌ “ ”چاہے ہزار عورتوں سے متعہ کرو کیونکہ وہ تو ٹھیکے کی چیز ہے۔“

اس آیت سے دوسرا مقصود ایسی صورتوں کا بیان کرنا ہے جس میں حق تلفی کا خوف نہ ہو اور یہ معنی متعہ و حلالہ میں بہ نسبت منکوحہ و مملوکہ کے زیادہ ہے کیونکہ مملوکہ کے کچھ ایسے حقوق ہیں جن کو ادا نہ کرنا ظلم ہے متعہ کی عورت کے خلاف، اس کے لیے مقرر اجرت کے سوا کوئی حق نہیں اور حلالہ میں تو یہ بھی نہیں ہے، مفت کا سودا ہے۔ پس اگر متعہ و حلالہ جیسے کام حلال ہوتے تو اس موقع پر ان کا ذکر ضرور ہوتا کیونکہ ان میں حق تلفی کا کوئی خوف نہیں۔حرمت متعہ کے متعلق دو قرآنی آیات کے بعد اب چند ایک صحیح احادیث ملاحظہ ہوں۔

سیدنا سبرہ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« يَآ اَيُّهَا النَّاسُ ! اِنِّيْ قَدْ كُنْتُ اَذِنْتُ لَكُمْ فِي الْاِسْتِمْتَاعِ مِنَ النِّسَاءِ وَ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ ذٰلِكَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَمَنْ كَانَ عِنْدَهٗ مِنْهُنَّ شَيْءٌ فَلْيُخَلِّ سَبِيْلَهَا وَ لَا تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا »

[مسلم، كتاب النكاح: باب نكاح المتعة و بيان انه ابيح ثم نسخ...... الخ (١٤٠٦)]

”اے لوگو! میں نے تمھیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور اب اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت کے دن تک کے لیے حرام کر دیا ہے سو جن کے پاس ان میں سے کوئی ہو تو اسے چاہیے کہ اسے چھوڑ دے اور جو چیز تم ان کو دے چکے ہو وہ واپس نہ لو۔“

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَهٰى عَنْ نِكَاحِ الْمُتْعَةِ يَوْمَ خَيْبَرَ وَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ »

[مسلم، كتاب النكاح: باب نكاح المتعة و بيان...... الخ (١٤٠٧)].

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے روز نکاح متعہ اور گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرما دیا۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« حَرَّمَ الْمُتْعَةَ الطَّلَاقُ وَ الْعِدَّةُ وَ الْمِيْرَاثُ » [دارقطنی(۲۵۸/۳)]

”طلاق، عدت اور میراث نے متعہ کو حرام کر دیا ہے۔“

امامیہ شیعہ کی معتبر کتاب فروع کافی اور تہذیب الأحکام میں بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَوْمَ خَيْبَرَ لُحُوْمَ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ وَ نِكَاحَ الْمُتْعَةِ »

[تهذيب الأحكام (۱۸٦/۲)، استبصار(۱٤۲/۳)، فروع كافی(۱۹۲/۲)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے روز گھریلو گدھوں کا گوشت اور متعہ حرام کر دیا۔“

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق جو کہا جاتا ہے کہ وہ متعہ کو حلال سمجھتے تھے اس کی حقیقت یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کچھ عرصہ تک متعہ کو شدید ضرورت میں جائز سمجھتے رہے پھر بعد میں انھیں اس کے نسخ و حرمت کے بارے میں پتا چلا تو انھوں نے اس سے بھی رجوع کر لیا تھا اور اس کے بعد وہ ہمیشہ متعہ کو حرام ہی سمجھتے رہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں ہے، وہ فرماتے ہیں:

« اِنَّمَا كَانَتِ الْمُتْعَةُ فِيْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ ...... حَتّٰى اِذَا نَزَلَتِ الْآيَةُ : ﴿ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ﴾ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا فَكُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا فَهُوَ حَرَامٌ » [ترمذی، كتاب النكاح: باب ما جاء فی تحريم نكاح المتعة (۱۱۲۲)]

”متعہ ابتدائے اسلام میں جائز تھا...... حتیٰ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ﴾ تو وہ منسوخ ہو گیا۔ اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”زوجہ اور مملوکہ کے علاوہ ہر طرح کی شرمگاہ سے فائدہ حاصل کرنا حرام ہے۔“

امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے رجوع کے متعلق فرماتے ہیں:

” وَ لَا نَعْلَمُ اَحَدًا مِّنَ الصَّحَابَةِ رُوِيَ عَنْهُ تَجْرِيْدُ الْقَوْلِ فِيْ اِبَاحَةِ الْمُتْعَةِ غَيْرَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ قَدْ رَجَعَ عَنْهُ حِيْنَ اسْتَقَرَّ عِنْدَهُ تَحْرِيْمُهَا بِتَوَاتُرِ الْاَخْبَارِ مِنْ جِهَةِ الصَّحَابَةِ “[احكام القرآن (۱۵۲/۲)]

”تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں سوائے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کوئی بھی حلت متعہ کا قائل نہیں اور انھوں نے بھی متعہ کے جواز سے اس وقت رجوع کر لیا تھا جب تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعہ کی حرمت ان کے ہاں تواتر کے ساتھ ثابت ہو گئی۔“

مندرجہ بالا تمام دلائل اس بات کے متقاضی ہیں کہ متعہ قیامت تک کے لیے حرام ہے اس کی کوئی صورت بھی جائز و مباح نہیں۔

WWW. KITABOSUNNAT. COM

طلاق کے احکام

WWW. KITABOSUNNAT.COM

طلاق کا مسنون طریقہ

سوال براہِ کرم طلاق کے مسنون طریقہ سے آگاہ فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؟

جواب اسلام کے طریقہ طلاق میں مسلمان مرد کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ تین طلاقیں تین مرتبہ اس طریقے سے دے کہ حالت طہر جس میں اس نے مجامعت نہیں کی، میں ایک طلاق دے اور بیوی کو اسی حالت میں چھوڑ دے یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے۔ اگر خاوند دورانِ عدت اسے رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے لیکن اگر وہ رجوع نہ کرے اور عدت ختم ہو جائے تو پھر وہ نئے نکاح کے ساتھ اس کو واپس لا سکتا ہے اور اگر شوہر ضرورت نہ سمجھے تو عورت کسی اور مرد کے ساتھ نکاح کرنے کی مجاز ہے اور اگر پہلی طلاق کے بعد شوہر نے اسے دوبارہ اپنی زوجیت میں لے لیا، پھر دوبارہ دونوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے اور صلح صفائی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو وہ دوسری مرتبہ طلاق دے سکتا ہے اور اس دوسری طلاق کے بعد عدت کے اندر شوہر کو رجوع کا حق ہے۔ عدت گزر جانے کے بعد اگر وہ رکھنا چاہے تو تجدید نکاح ہو گی۔ لیکن اگر تیسری طلاق بھی دے دی تو پھر یہ عورت قطعی طور پر اس خاوند کے لیے حرام ہو جائے گی۔ اب رجوع کا حق ختم ہے۔ عورت عدت گزار کر کسی اور مرد سے نکاح کر سکتی ہے اور یہ نکاح صحیح شرعی طریقے کے مطابق مستقل بسنے کی نیت سے ہو گا نہ کہ شوہر اول کے لیے حلال ہونے کی غرض سے۔ اب اگر اس کا یہ خاوند بھی فوت ہو گیا یا اس نے گھریلو ناچاقی کی بنا پر اسے طلاق دے دی تو یہ عورت اگر دوبارہ پہلے شوہر کی طرف لوٹنا چاہے تو عدت کے بعد اس کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے اور ایسا واقعہ ہزاروں میں سے شاید کوئی ایک آدھ ہوا ہو۔ اس طریقہ طلاق کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمۡسَاكٌ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ﴾ [البقرة:٢٢٩]

''طلاق دو مرتبہ ہے، پھر دو طلاقوں کے بعد یا تو دستور کے مطابق اپنی بیوی کو رہنے دے یا اچھی طرح سے رخصت کر دے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات کے مطابق ابتدائے ہجرت میں جاہلی دستور کے مطابق مرد عورتوں کو کئی بار طلاق دیتے اور عدت کے اندر رجوع کرتے رہتے۔ مقصد بیوی کو تنگ کرنا ہوتا تھا۔ اس صورتحال کو روکنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ رجعی طلاق جس میں رجوع کی گنجائش ہو، زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ ہے، اس کے بعد یا تو عدت کے اندر رجوع کرنا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ تیسری طلاق دینا ہے۔

طلاق رجعی کے بعد

(سوال) طلاق رجعی کے بعد اگر میاں بیوی اکٹھے رہنا چاہیں تو کیا نئے نکاح کے بعد ایسا کیا جا سکتا ہے؟ براہِ کرم قرآن و حدیث کی رو سے مسئلہ کی وضاحت فرما دیں۔

(جواب) ایسی صورت میں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوبارہ نکاح کر لیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [البقرة:۲۳۲]

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو، پھر ان کی عدت پوری ہو جائے تو انھیں (پہلے) خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو اگر دستور کے موافق آپس میں رضا مند ہو جائیں۔''

اس آیت کریمہ سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ طلاق رجعی جو دو مرتبہ ہے، اس مدت میں اگر عورت کی عدت مکمل ہو چکی ہو اور وہ دونوں رضا مندی کے ساتھ بسنا چاہیں تو انھیں دوبارہ نکاح کرنا پڑے گا اور عورت کے اولیاء کو بھی چاہیے کہ اسے مت روکیں۔ سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے:

'' اَنَّ مَعْقِلَ بْنَ يَسَارٍ زَوَّجَ اُخْتَهُ رَجُلًا فَطَلَّقَهَا تَطْلِيْقَةً فَبَانَتْ مِنْهُ ثُمَّ جَآءَ يَخْطُبُهَا فَاَبٰى عَلَيْهِ وَ قَالَ اَفْرَشْتُكَ كَرِيْمَتِيْ ثُمَّ طَلَّقْتَهَا ثُمَّ جِئْتَ تَخْطُبُهَا لَا وَ اللّٰهِ لَا اُزَوِّجُكَهَا قَالَ وَ كَانَتِ الْمَرْاَةُ قَدْ هَوِيَتْ اَنْ تُرَاجِعَهُ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ : ﴿ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾ [البقرة:۲۳۲] فَقَالَ نَعَمْ اُزَوِّجُكَهَا ''[بيهقى(۱۳۸/۷)، المعجم الكبير للطبرانى (۴۶۷/۲۰)]

''معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کا نکاح ایک آدمی کے ساتھ کیا۔ اس نے اسے ایک طلاق دے دی۔ (عدت گزر گئی) تو معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن اس سے علیحدہ ہوگئی، پھر وہ پیغام نکاح لے کر آیا تو معقل رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا اور کہا: ''میں نے اپنی معزز بہن کا نکاح تجھ سے کیا تھا تو نے اسے طلاق دے دی، اب تو پھر پیغام نکاح لے کر آ گیا ہے، اللہ کی قسم! اب میں تیرے نکاح میں نہیں دوں گا۔'' معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن بھی لوٹنا چاہتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی یہ آیت نازل فرما دی: '' جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو ان کو اپنے (پہلے) خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو۔'' اس کے بعد معقل رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں! تجھ سے نکاح کر دیتا ہوں۔''

مذکورہ بالا صحیح حدیث میں مذکور واقعہ سے معلوم ہوا کہ جب عورت کو اس کا شوہر ایک طلاق دیتا ہے اور خاوند عدت کے اندر رجوع نہیں کرتا تو عدت ختم ہونے کے بعد اگر وہ مرد اور عورت باہم رضا مندی کے ساتھ اکٹھے رہنا چاہتے ہوں تو تجدید نکاح

سے دوبارہ اپنا گھر آباد کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری مرتبہ بھی زندگی میں تعلقات میں کشیدگی ہو گئی اور مرد نے اپنی منکوحہ کو طلاق دے دی تو بھی عدت کے اندر رجوع کا حق ہے اور عدت ختم ہونے کے بعد دونوں نئے نکاح سے جمع ہو سکتے ہیں۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا شرعی حکم

(سوال) کیا یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیتا ہے تو اس سے تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی؟ یا صرف ایک؟ قرآن وسنت کی رو سے وضاحت فرما دیں۔

(جواب) دورِ جاہلیت میں لوگ اپنی بیویوں کو کئی کئی بار طلاق دیتے اور عدت کے اندر رجوع کرتے رہتے تھے، نہ عورت کو صحیح بساتے اور نہ آزاد ہی کرتے۔ اس سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ بیوی کو تنگ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے اس دستور کو ختم کرنے کے لیے دوبار رجوع کا حق دے دیا اور تیسری بار بالکل ان کا رشتہ ختم کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ﴾ [البقرۃ:۲۲۹]

”طلاق (جس کے بعد خاوند رجوع کر سکتا ہے) دو بار ہے، پھر دو طلاقوں کے بعد یا تو دستور کے مطابق اپنی بیوی کو رہنے دے یا پھر اچھی طرح سے رخصت کر دے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ﴾ فرمایا ہے اور لفظ مرتان مرّۃ کا تثنیہ ہے جس کا مطلب واضح ہے کہ طلاق دو مرتبہ ہے، وقفہ بعد وقفہ ہے نہ کہ اکٹھی دو طلاقیں اور اس کی کئی ایک مثالیں بھی قرآن مجید میں موجود ہیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لِيَسۡتَاۡذِنۡكُمُ الَّذِيۡنَ مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ وَ الَّذِيۡنَ لَمۡ يَبۡلُغُوا الۡحُلُمَ مِنۡكُمۡ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوةِ الۡفَجۡرِ وَ حِيۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِيَابَكُمۡ مِّنَ الظَّهِيۡرَةِ وَ مِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوةِ الۡعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوۡرٰتٍ لَّكُمۡ ﴾ [النور:۵۸]

”اے ایمان والو! تم سے تین مرتبہ تمھارے غلام اور نابالغ بچے بھی اجازت طلب کریں، نماز فجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد اور یہ تین اوقات تمھارے لیے پردے کے ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ﴿ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ﴾ کا لفظ استعمال کیا ہے جو ”مرۃ“ کی جمع ہے اور ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی فرما دی کہ یہ تین اوقات وقفہ بعد وقفہ ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ مرۃ میں دفعہ کا مفہوم شامل ہے، لہٰذا ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ﴾ کا معنی یہ ہوا کہ دو مرتبہ وقفہ بعد وقفہ طلاق ہے جس میں مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے۔ اگر بیک وقت ان طلاقوں کو نافذ کر دیا جائے تو مرد کو اللہ تعالیٰ نے جو سوچ بچار کا وقفہ فراہم کیا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے شریعت اسلامیہ میں بیک وقت اکٹھی تین طلاقیں دینے کو شرع سے مذاق قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے:

”ایک آدمی نے عہد رسالت میں اکٹھی تین طلاقیں دے دیں تو اللہ کے نبی ﷺ اس پر ناراض ہوئے اور فرمایا:

« اَیُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰہِ وَ اَنَا بَیْنَ اَظْھُرِکُمْ » ''کیا میری موجودگی میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔''[نسائی، کتاب الطلاق : باب الثلاث المجموعة و ما فیه من التغلیظ (۳۴۳۰)]

اس روایت سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اکٹھی تین طلاقیں دے دینا شریعت کے ساتھ مذاق ہے اورحرام و ناجائز ہے۔اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ﴾ کے بعد فرمایا:

﴿ فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَآ اَنْ یَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ﴾ [البقرة: ۲۳۰]

''پھر اگر وہ اس کو طلاق دے دے (یعنی تیسری طلاق) تو اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں حتیٰ کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے پھر اگر وہ (یعنی دوسرا شوہر) اسے طلاق دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں رجوع کر لیں اگر انھیں یقین ہے کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔''

مراد یہ ہے کہ اس طرح وقفہ بعد وقفہ تیسری طلاق واقع ہوجائے تو عورت مرد کے لیے قطعی طور پر حرام ہو جائے گی، تاوقتیکہ عورت کا گھر آباد کرنے کی غرض سے کسی دوسرے مرد سے نکاح ہو اور وہ حسب دستور زندگی گزاریں اور کبھی ناچاقی ہو اور دوسرا شوہر طلاق دے دے یا فوت ہو جائے تو پھر پہلے شوہر کی طرف بیوی لوٹ سکتی ہے۔ بیک وقت اکٹھی تین طلاقیں دے دینے سے صرف ایک رجعی طلاق ہی واقع ہوتی ہے، شریعت اسلامیہ کا یہی فتویٰ ہے اور عہد رسالت میں بھی یہی طریقہ کار تھا جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« كَانَ الطَّلَاقُ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ وَ اَبِیْ بَكْرٍ وَ سَنَتَیْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِیْ اَمْرٍ كَانَتْ لَھُمْ فِیْهِ اَنَاةٌ فَلَوْ اَمْضَیْنَاهُ عَلَیْھِمْ فَاَمْضَاهُ عَلَیْھِمْ » [احمد(۳۱۴/۱)]

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو سالوں میں اکٹھی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:'' جس کام میں لوگوں کے لیے سوچ بچار کی مہلت دی گئی تھی اس میں انھوں نے جلدی کی، اگر ہم ان پر تینوں طلاقیں لازم کر دیں...... تو پھر انھوں نے اس فیصلے کو ان پر لازم کر دیا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عہد رسالت اور عہد ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں اکٹھی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں اور عہد رسالت کا فیصلہ شرعی فیصلہ تھا کیونکہ دین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوا۔ آپ کے بعد کسی شخص پر وحی نازل نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جو فیصلہ کیا وہ تہدیداً اور سزا کے طور پر تھا نہ کہ شرعاً اس طرح درست تھا اور اگر یہ فیصلہ شرعی تھا تو عہد رسالت، عہد ابی بکر اور خود ان کے ابتدائی دو سالوں میں جو فیصلہ تھا پھر اس کی کیا حیثیت ہے؟ لٰہذا یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک مجلس کی اکٹھی تین طلاقیں تین نہیں بلکہ ایک رجعی طلاق ہی شمار ہو گی۔

حالت حیض میں دی گئی طلاق

(سوال) حالتِ حیض میں دی گئی طلاق واقع ہو جائے گی یا اسے شمار نہیں کیا جائے گا؟ کتاب وسنت کی روشنی میں مسئلہ بتا دیں۔
(جواب) برحق مسلک یہی ہے کہ حالت حیض میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ جمہور ائمہ محدثین رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ دلائل درج ذیل ہیں:

① سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور وہ حالت حیض میں تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا...... » ''اسے حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کرے، پھر اسے اس حالت میں رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے، پھر حائضہ ہو پھر پاک ہو جائے، پھر اگر چاہے تو اس کے بعد روک لے اور اگر چاہے تو چھونے سے پہلے طلاق دے دے۔ یہ وہ عدت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔''

[بخاری، کتاب الطلاق: باب و قول الله تعالیٰ: ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ...... ﴾ (٥٢٥١)، ابوداؤد (٢١٧٩)، ابن ماجه (٢٠١٩)، ابن الجارود(٧٣٤) مسند شافعي(١٦٣٠)، بيهقي (٣٢٣/٧)، مسند طيالسي(١٨٥٣)، مسند احمد(٥٤٦/٢)]

جمہور محدثین وفقہاء کے ہاں اس حدیث میں محل استدلال « فَلْيُرَاجِعْهَا » کے الفاظ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجوع کا حکم دیا۔ اگر طلاق واقع نہ ہوتی تو رجوع نہ ہوتا۔ بعض لوگوں نے یہاں رجوع کا لغوی معنی مراد لیا ہے کہ اسے پہلی حالت میں لوٹائے نہ کہ اس کی طلاق شمار کی جائے۔ یہ بات دو لحاظ سے غلط ہے:

① لفظ کو شرعی حقیقت پر محمول کرنا اسے لغوی حقیقت پر محمول کرنے پر مقدم ہے جیسا کہ اصول فقہ کی کتب میں یہ اصول موجود ہے۔

② عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جنھوں نے طلاق دی تھی، انھوں نے خود اس کی تصریح کی ہے کہ یہ طلاق شمار کی گئی ہے، لہٰذا اسے بلا دلیل لغوی معنی پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔

② سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّهُ طَلَّقَ امْرَاَتَهُ وَ هِيَ حَائِضٌ فَاَتَىٰ عُمَرُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَجَعَلَهَا وَاحِدَةً » [مسند طيالسي(٦٨)، دارقطني (٣٨٦٧)، بيهقي(٣٢٦/٧)]

''ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی اہلیہ کو طلاق دی اور وہ حائضہ تھی تو عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے یہ سارا معاملہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک طلاق قرار دیا۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' هٰذَا نَصٌّ فِيْ مَوْضِعِ الْخِلَافِ فَيَجِبُ الْمَصِيْرُ اِلَيْهِ '' [فتح الباری(٣٥٣/٩)]

''یہ حدیث حائضہ عورت کی طلاق کے وقوع میں اختلاف پر نص ہے، لہٰذا اس کی طرف لوٹنا واجب ہے۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جب عورت کو حالت حیض میں طلاق دی جائے تو وہ ایک طلاق شمار ہوتی ہے اور یہ صحیح حدیث اس طلاق کے وقوع پر نص کی حیثیت رکھتی ہے۔

③ امام زہری رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ عورت کو طلاق کس طرح دی جاتی ہے؟ انھوں نے کہا مجھے سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے خبر دی کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

« طَلَّقْتُ امْرَاَتِیْ فِیْ حَیَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ وَ هِیَ حَائِضٌ فَذَكَرَ ذٰلِكَ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ فَتَغَیَّظَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ فِیْ ذٰلِكَ فَقَالَ لِیُرَاجِعْهَا ثُمَّ یُمْسِكْهَا حَتّٰی تَحِیْضَ حَیْضَةً وَ تَطْهُرَ فَاِنْ بَدَا لَهُ اَنْ یُّطَلِّقَهَا طَاهِرًا قَبْلَ اَنْ یَّمَسَّهَا فَذَاكَ الطَّلَاقُ لِلْعِدَّةِ كَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ عُمَرَ فَرَاجَعْتُهَا وَحَسِبْتُ لَهَا التَّطْلِیْقَةَ الَّتِیْ طَلَّقْتُهَا » [نسائي، كتاب الطلاق: باب وقت الطلاق للعدة التي أمر الله عز وجل أن يطلق لها النساء (٣٤٢٠)]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور وہ حالت حیض میں تھی تو عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے بیان کی، اس پر رسول اللہ ﷺ غصے میں آ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اس سے رجوع کرے، پھر اس کو روکے رکھے حتیٰ کہ اسے ایک ماہواری آ جائے اور وہ پاک صاف ہو جائے پھر اگر اس کے لیے ظاہر ہو کہ وہ اسے طلاق دینا چاہتا ہے تو طہارت کی حالت میں جماع سے پہلے طلاق دے، یہ وہ طلاق ہے جو عدت کے لیے ہے جیسے اللہ عزوجل نے وحی نازل کی ہے۔'' عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ''میں نے اس سے رجوع کر لیا اور جو طلاق میں نے اسے دی تھی وہ شمار کی۔''

اس حدیث کے دیگر طرق میں یہ الفاظ بھی ہیں:

« وَ كَانَ عَبْدُ اللّٰهِ طَلَّقَهَا تَطْلِیْقَةً فَحُسِبَتْ مِنْ طَلَاقِهَا وَ رَاجَعَهَا عَبْدُ اللّٰهِ كَمَا اَمَرَهُ »

[مسند احمد(٢٨٩/١٠)، بیهقی(٣٢٤/٧)، دارقطنی(٣٨٥١)، المسند المستخرج لأبی نعیم (١٤٩/٤)]

''عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دی، اس کی وہ طلاق شمار کی گئی پھر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس سے رجوع کر لیا جیسا کہ آپ ﷺ نے اسے حکم دیا تھا۔''

اس حدیث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی وہ طلاق جو انھوں نے حالت حیض میں دی تھی، شمار کی گئی تھی۔

④ یونس بن جبیر رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

''میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: ''ایک آدمی نے اپنی بیوی کو اس وقت طلاق دی جب وہ حائضہ تھی تو (اس کا کیا حکم ہے؟)'' اس پر انھوں نے کہا: ''تم ابن عمر (رضی اللہ عنہما) کو پہچانتے ہو؟ ابن عمر (رضی اللہ عنہما) نے اپنی بیوی کو اس وقت

طلاق دی جب وہ حالت حیض میں تھی تو عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ اس سے رجوع کرے، پھر جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تو اس وقت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) طلاق دینا چاہے تو اسے طلاق دے دے۔'' میں نے کہا: ''کیا اسے اللہ کے رسول ﷺ نے طلاق شمار کیا؟'' تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ''آپ مجھے بتائیں اگر کوئی عاجز ہو اور حماقت کا ثبوت دے تو اس کی عاجزی اور حماقت کی وجہ سے وہ فرض ساقط ہوگا؟ (ہرگز نہیں۔ مطلب کہ یہ طلاق شمار ہوگی)۔'' [بخاري، كتاب الطلاق: باب مراجعة الحائض (٥٣٣٣)، مسلم (١٤٧١)، مسند احمد (٦٧/٩)، سنن سعيد بن منصور(١٥٤٩)، ابو داؤد(٢١٨٤)، ترمذی (١١٧٥)، نسائی (٣٤٢٩)،ابن ماجه (٢٠٢٢)، طحاوی (٥٢/٣)،دارقطنی (٣٨٦١)، بیهقی (٣٢٥/٧)]

یونس بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا:

« اَفَتَحْتَسِبُ بِهَا؟ فَقَالَ مَا يَمْنَعُهُ » [بيهقی(٣٢٦/٧)]

''کیا آپ نے اسے طلاق شمار کیا؟'' تو انھوں نے کہا: ''اس سے کون سی چیز مانع ہے؟''

⑤ انس بن سیرین رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا انھوں نے کہا: ''ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو طلاق دی ،وہ حالت حیض میں تھی ،عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اس سے رجوع کرے۔'' میں نے کہا: ''کیا یہ طلاق سمجھی جائے گی؟'' تو انھوں نے کہا: ''چپ رہ، اور کیا سمجھی جائے گی؟'' [بخاری، كتاب الطلاق: باب إذا طلقت الحائض تعتد بذلك الطلاق(٥٢٥٢)، مسلم(١٤٧١)، ابن الجارود(٧٣٥)، طحاوی (٥٢/٣)، دارقطنی(٣٨٤٨)، بیهقی(٣٢٦/٧)، مسند احمد (٣١٧/٩)]

درج بالا تمام دلائل اس بات کا ثبوت ہیں کہ حالت حیض میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ یہی جمہور ائمہ محدثین کا مذہب ہے اور یہی کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہے۔

دوران حمل دی گئی طلاق

سوال مہربانی فرما کر مجھے اس مسئلہ کے بارے میں بتا دیں کہ دوران حمل اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب دوران حمل دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں ہے:

''انھوں نے اپنی عورت کو طلاق دے دی اور وہ حالت حیض میں تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات نبی ﷺ سے ذکر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا ثُمَّ لِيُطَلِّقْهَا طَاهِرًا اَوْ حَامِلًا » [مسلم، كتاب النكاح: باب تحريم طلاق الحائض بغير رضاها...... الخ (١٤٧١)]

''عبداللہ کو حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کرے، پھر اسے (حیض کے بعد) طہر میں طلاق دے یا دوران حمل طلاق دے۔''
قاضی شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
''اس روایت کو بخاری کے علاوہ ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔'' [نيل الأوطار (٦/ ٢٢١)]
عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''طلاق کی چار صورتیں ہیں، دو حلال ہیں اور دو حرام۔ جو حلال ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے اس طہر میں طلاق دے جس میں جماع نہ کیا ہو، دوسری یہ کہ اس وقت طلاق دے جب حمل ظاہر ہو جائے اور جو حرام ہیں ان میں سے ایک یہ کہ حیض کی حالت میں بیوی کو طلاق دے، دوسری یہ کہ جماع کے بعد طلاق دے اور حمل کا کچھ علم نہ ہو۔'' [دار قطني (٣٨٤٥)، بيهقي (٧/ ٣٢٥)]
عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی موقوف روایت سے معلوم ہوا کہ حاملہ عورت کو بھی طلاق دی جا سکتی ہے اور یہ طلاق بدعی نہیں بلکہ سنی ہے اور اس طلاق کی عدت وضع حمل ہے جیسا کہ سورۂ طلاق میں اس کی وضاحت موجود ہے:
﴿ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق:٤]
''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضع حمل ہے۔''
اس آیت کریمہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر حاملہ کی عدت بچہ جنم دینے تک ہے، عورت خواہ مطلقہ ہو یا بیوہ۔
امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:
''حاملہ عورت مطلقہ ہو یا بیوہ، دونوں کی عدت بچے کی پیدائش ہے خواہ یہ عمل طلاق یا خاوند کی موت کے بعد فوراً وقوع پذیر ہو جائے۔ جمہور علمائے سلف وخلف کا یہی قول ہے۔'' [تفسير ابن كثير (٤/ ٣٨١)]
قرآن مجید کی نص اور صریح سنت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کے بچہ پیدا ہوتے ہی نکاح ختم ہو چکا ہے اور اب رجوع نہیں، اگر آدمی کی طلاق پہلی یا دوسری ہے تو از سر نو نکاح ہو سکتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [البقرة:٢٣٢]
''جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انھیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں۔''
اس آیت کریمہ میں دو رجعی طلاقوں کی عدت گزر جانے کے بعد دوبارہ نکاح کا حکم ذکر کیا گیا ہے یعنی اگر شوہر نے پہلی یا دوسری طلاق دی ہو اور عدت گزر چکی ہو تو دوبارہ اگر باہمی رضا مندی سے اکٹھے ہونا چاہیں تو نکاح کر کے اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

زبردستی دلوائی جانے والی طلاق

(سوال) اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو زبردستی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کرتا ہے اور وہ اس پر عمل کر گزرتا ہے تو کیا یہ طلاق

شمار ہوگی؟

(جواب) زبردستی طلاق شرعاً کالعدم ہے، اس کا وقوع نہیں ہوتا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِاُمَّتِیْ عَمَّا تُوَسْوِسُ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ اَوْ تَتَكَلَّمْ بِهٖ وَ مَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ » [ابن ماجه، كتاب الطلاق: باب طلاق المكره والناسی(٢٠٤٤)]

"یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری امت کے سینوں کے خیالات و وساوس کو معاف کر دیا ہے، جب تک وہ ان خیالات کو عملی جامہ نہیں پہنا لیتے یا بات نہیں کر لیتے اور اس بات کو بھی معاف کر دیا ہے جس پر انھیں مجبور کر دیا گیا ہو۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جبراً طلاق دلوانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا طَلَاقَ وَ لَا عِتَاقَ فِیْ اِغْلَاقٍ » [ابن ماجه، كتاب الطلاق: باب طلاق المكره والناسی(٢٠٤٦)]

"طلاق اور آزادی زبردستی نہیں ہوتی۔"

امام ابو عبید اور امام قتیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اغلاق کا معنی اکراہ ہے۔" اسی طرح ابن درید اور ابو طاہر نحویین کے نزدیک بھی اس کا معنی اکراہ ہے۔ [المغنی لابن قدامه(٣٥١/١٠)، شرح السنة(٢٢٢/٩)]

صحیح بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« طَلَاقُ السَّكْرَانِ وَ الْمُسْتَكْرَهِ لَيْسَ بِجَائِزٍ » [بخاری، كتاب النكاح: باب الطلاق فی الاغلاق والكره والسكران ...... الخ]

"نشے والے آدمی اور مجبور کی طلاق جائز نہیں۔"

امام ابن قدامہ مقدسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اَنَّ طَلَاقَ الْمُكْرَهِ لَا يَقَعُ وَ رُوِیَ ذٰلِكَ عَنْ عُمَرَ وَ عَلِيٍّ وَ ابْنِ عُمَرَ وَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ ابْنِ الزُّبَيْرِ وَ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ وَ بِهٖ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَيْرٍ وَ عِكْرِمَةُ وَ الْحَسَنُ وَ جَابِرُ بْنُ زَيْدٍ وَ شُرَيْحٌ وَ عَطَاءٌ وَ طَاؤُسٌ وَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ وَ ابْنُ عَوْنٍ وَ اَيُّوْبُ السَّخْتِيَانِیُّ وَ مَالِكٌ وَ الْاَوْزَاعِیُّ وَ الشَّافِعِیُّ وَ اِسْحَاقُ وَ اَبُوْ ثَوْرٍ وَ اَبُوْ عُبَيْدٍ" [المغنی لابن قدامة(٣٥٠/١٠)]

"جبراً طلاق واقع نہیں ہوتی۔ یہ مذہب سیدنا عمر، سیدنا علی، سیدنا عبداللہ بن عمر، سیدنا عبداللہ بن عباس، سیدنا عبداللہ بن زبیر اور سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی بات امام عبداللہ بن عمیر، امام عکرمہ، امام حسن بصری، امام جابر بن زید، امام شریح، امام عطاء، امام طاؤس، امام عمر بن عبدالعزیز، امام ابن عون، امام ابو ثور اور امام ابو عبید رحمہم اللہ نے کہی ہے۔"

کتاب و سنت کی نصوص اور مذکورہ ائمہ کرام کی تصریحات کے مطابق جبراً طلاق واقع نہیں ہوتی۔

بیوی سے ہم بستر ہوئے بغیر طلاق دینا

(سوال) ایک شخص کا نکاح ہوا مگر اس نے بیوی سے ہم بستری نہیں کی، کیا وہ اسے طلاق دے سکتا ہے؟ نیز بیوی کی عدت کیا ہوگی؟

(جواب) بیوی سے ہم بستر ہوئے بغیر طلاق دینا شرعاً جائز و مباح ہے اور ایسی عورت پر کوئی عدت نہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا فَمَتِّعُوهُنَّ وَ سَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴾ [الأحزاب:٤٩]

''اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انھیں چھونے سے پہلے طلاق دے ڈالو تو تمھاری طرف سے ان پر کوئی عدت نہیں جس کے پورا ہونے کا تم مطالبہ کرسکو۔انھیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کرو۔''

اس آیت کریمہ میں عدت کے ساتھ ساقط ہونے کا یہ مطلب ہے کہ مرد کا حق رجوع ختم ہوجاتا ہے اور عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ طلاق کے فوراً بعد جس سے چاہے نکاح کروالے۔امام ابن کثیر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

'' هٰذَا أَمْرٌ مُجْمَعٌ عَلَيْهِ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ أَنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا طُلِّقَتْ قَبْلَ الدُّخُولِ بِهَا لَا عِدَّةَ عَلَيْهَا فَتَذْهَبُ فَتَزَوَّجُ فِي فَوْرِهَا مَا شَاءَتْ '' [تفسير ابن كثير(٥٤٨/٣)]

''اس مسئلہ پر علماء کے درمیان اجماع ہے کہ جب عورت کو دخول سے قبل طلاق دے دی جائے تو اس پر کوئی عدت نہیں،طلاق کے فوراً بعد وہ جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے۔''

گزشتہ آیت میں موجود الفاظ ﴿ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ ﴾ کے مفہوم میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد جماع ہے یا صرف خلوت ہے یعنی عورت کو خلوت کے بعد جماع سے پہلے چھوڑ دے تو کیا عورت پر عدت ہے؟ امام احمد ابن حنبل، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ کا قدیم قول یہ ہے کہ عورت کے ساتھ خلوت اختیار کی مگر جماع نہیں کیا اور طلاق دے دی تو عورت پر عدت واجب ہے۔[الهداية مع الشرح فتح القدير(١٣٥/٤)، حاشية ابن عابدين (٥٠٤/٣)، المهذب مع المجموع (٤١٤/١٦)، المغني(٩٩/٨)، الإنصاف للمرداوي(٢٧٠/٩)]

اور یہی بات خلفائے راشدین اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور عروہ، علی بن حسن، عطاء، زہری، ثوری، اوزاعی، اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے جیسا کہ المغنی لابن قدامہ میں موجود ہے۔امام بیہقی رحمہ اللہ نے زرارہ بن اوفی سے نقل کیا ہے:

'' خلفائے راشدین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جس آدمی نے پردہ لٹکا لیا یا دروازہ بند کرلیا تو مہر واجب ہوگیا اور عدت ضروری ہوگئی۔'' [السنن الكبرىٰ للبيهقي(٢٥٥/٧)]

یہ فیصلے مشہور ہوئے اور کسی صحابی نے اس پر نکیر نہیں کی تو ان فقہاء و محدثین کے ہاں اجماع کی شکل اختیار کر گئے۔

شیخ عبدالرحمٰن سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''دخول ومس سے مراد وطی ہے جیسا کہ اس پر اتفاق کیا گیا ہے یا کہ اس طرح خلوت ہے اگرچہ اس خلوت میں وطی نہیں ہوئی جیسا کہ اس پر خلفائے راشدین نے فتویٰ صادر کیا ہے اور یہ صحیح ہے جو عورت پر داخل ہوا اس کے ساتھ وطی کی یا نہیں کی جب اسے خلوت حاصل ہوگئی تو عورت پر عدت واجب ہوگئی۔'' [تفسیر الکریم الرحمان فی تفسیر کلام المنان (٤٧٨/٢)]

دوسرا قول یہ ہے کہ عورت کے ساتھ جب تک دخول نہ ہو عدت واجب نہیں، صرف خلوت کے ساتھ عدت واجب نہیں ہوتی۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا جدید قول ہے۔ [المهذب (٤١٤/١٦)]

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ کے حکم میں واضح ہے کہ مطلقہ پر چھونے سے پہلے عدت نہیں ہے اور مس سے مراد صحیح طریقے سے آنا ہے۔ اس بارے میں میں کسی کا اختلاف نہیں جانتا۔ پھر بعض مفتیوں نے ایسی عورت کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس کے ساتھ شوہر خلوت اختیار کر کے دروازہ بند کرے اور پردے گرا دے اور وہ احرام والی یا روزہ دار نہ ہو۔'' [معرفة السنن والآثار (٤٠/٦)]

مذکورہ بالا دلائل پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ زیادہ محتاط جمہور کا موقف ہے، اس لیے کہ اس میں عقد زوجیت کا احترام بھی ہے اور خلوت استمتاع کی نوع سے خالی بھی نہیں ہے۔ لہٰذا بیوی سے ہم بستری کے بغیر اگر طلاق دے ڈالے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

غصہ میں طلاق

سوال ایک آدمی نے اپنی اہلیہ کو طلاق دے دی، جب شوہر سے کہا گیا کہ تم نے اپنی اہلیہ کو طلاق دے دی ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے غصہ کی وجہ سے کچھ یاد نہیں ہے اور بیوی بھی کہتی ہے کہ میں اس وقت بے ہوش تھی مجھے نہیں پتا اس نے کیا کہا۔ شوہر حلفیہ بیان دینے کو تیار ہے کہ اس کے ہوش و حواس ٹھیک نہیں تھے اور غصہ میں پتا نہیں کیا کہا ہے، کیا ایسے وقت میں طلاق ہو جاتی ہے؟

جواب اگر شوہر کا یہ بیان درست ہے اور وہ حلف دیتا ہے کہ اس نے غصہ میں پتا نہیں کیا کہا ہے تو ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی، اسے اصطلاح فقہاء میں ''طلاق الغضبان'' کہتے ہیں، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« لَا طَلَاقَ وَلَا عِتَاقَ فِيْ إِغْلَاقٍ »[مسند احمد: (٢٧٦/٦)۔ ابوداؤد (٢١٩٣)، ابن ماجه: (٢٠٤٦)، ابن ابی شیبة، (٤٩١٥)]

''اغلاق کی حالت میں نہ طلاق ہے اور نہ غلام و لونڈی کا آزاد کرنا۔''

امام ابوداؤد اغلاق کے متعلق فرماتے ہیں: ''میں سمجھتا ہوں اس سے مراد غصہ ہے۔'' اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ''اغلاق کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا دل اس طرح معلق ہو جائے کہ وہ کلام کا علم و ارادہ نہ کر سکے، اس میں مکرہ، مجنون اور جس کی عقل نشہ یا غصے کی وجہ سے زائل ہو چکی ہو سب کی طلاق داخل ہے، جو مقصد و ارادہ کھو بیٹھیں اور ہوش نہ ہو اور یہ نہ سمجھ سکیں کہ ان کی زبان سے کیا نکلا ہے۔'' اور امام ابن القیم نے فرمایا: ''غصہ کی تین قسمیں ہیں ایک وہ غصہ جو عقل کو زائل کر دے اور غصے والے کو یہ شعور نہ ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے، ایسے شخص کی طلاق بلا اختلاف واقع نہیں ہوگی۔'' (زاد المعاد: ٥/٢١٤)

لہٰذا اگر بات واقعی اسی طرح ہے جیسے شوہر حلفاً کہتا ہے تو طلاق واقع نہیں ہوئی۔

غیر مدخولہ کی عدت

سوال اگر کسی عورت کو رخصتی سے قبل طلاق دے دی جائے تو کیا اس پر عدت ہے؟

جواب ایسی عورت جسے خاوند نے جماع سے پہلے طلاق دے دی ہو اس پر کوئی عدت نہیں، وہ عدت گزارے بغیر عقد ثانی کر سکتی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! جب تم مومنہ عورتوں سے نکاح کرو پھر انھیں چھونے سے پہلے طلاق دے دو تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں جسے تم شمار کرو۔'' (الاحزاب: ۴۹)

لہٰذا جب غیر مدخولہ عورت کو طلاق دی جائے تو عدت گزارے بغیر وہ نکاح ثانی کر سکتی ہے اور اگر پہلے خاوند کے پاس آنے کا ارادہ ہو تو دوبارہ نکاح کر کے اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

بیوہ کی عدت اور احکام

سوال مہربانی فرما کر ہمیں بیوہ کی عدت کے احکام سے اور اس بات سے آگاہ فرما دیں کہ دوران عدت اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ﴾ [البقرة: ٢٣٤]

''اور تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ عورتیں اپنے آپ کو چار ماہ اور دس دن عدت میں رکھیں۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے عدت وفات چار ماہ دس دن بیان فرمائی ہے۔ یہ آیت کریمہ ہر طرح کی عورت خواہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ اور جوان ہو یا بوڑھی، اس کی عدت وفات کو شامل ہے۔ صرف حاملہ عورت اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ سورۂ طلاق میں اس کی عدت وضع حمل بتائی گئی ہے۔ تو جب عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو وہ اس گھر میں عدت گزارے گی جہاں

اس کا خاوند فوت ہوا یا جہاں اس کے خاوند کی وفات کی خبر اس کے پاس پہنچی۔

فریعہ بنت مالک بن سنان جو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ اس کا خاوند اپنے بھگوڑے غلاموں کی طلب میں نکلا تو اس نے انھیں پالیا۔ انھوں نے اس کو قتل کر دیا۔ اس کی وفات کی خبر آ چکی ہے۔ پھر اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''کیا میں اپنے گھر بنو خدرہ میں واپس چلی جاؤں؟ جہاں میرے والدین رہتے ہیں کیونکہ میرے خاوند نے میرے لیے کوئی ذاتی گھر نہیں چھوڑا۔'' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً اسے رخصت دے دی پھر بلا کر فرمایا:

« اُمْكُثِيْ فِيْ بَيْتِكِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ اَجَلَهُ » [ابوداود، كتاب الطلاق: باب في المتوفى عنها تنتقل (٢٣٠٠)، مؤطا(٤٦٢)، مسند احمد (٣٧٠/٦)، ترمذى (١٢٠٤)، ابن ماجه(٢٠٣١)، دارمى(١٦٨/٢)، ارواء الغليل(١٢٣١)]

''تو اپنے اسی گھر میں ٹھہری رہ یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے۔''

تو انھوں نے وہاں چار ماہ دس دن عدت گزاری۔ فرماتی ہیں: ''جب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا تو انھوں نے یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے مجھے پیغام بھیجا۔ میں نے انھیں اس بات کی اطلاع دی تو انھوں نے بھی یہی فیصلہ صادر فرمایا۔''

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت کو اسی گھر میں عدت گزارنی چاہیے جس گھر میں اس کا خاوند فوت ہو جائے یا جس گھر میں اسے خاوند کے فوت ہونے کی اطلاع آئے اور دوران عدت عورت کو زیب و زینت کرنا منع ہے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« اِنَّ امْرَاَةً تُوُفِّيَ زَوْجُهَا فَخَشُوْا عَلٰى عَيْنَيْهَا فَاَتَوْا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَاسْتَاْذَنُوْهُ فِي الْكُحْلِ فَقَالَ لَا تَكْتَحِلُ قَدْ كَانَتْ اِحْدَاكُنَّ تَمْكُثُ فِيْ شَرِّ اَحْلَاسِهَا اَوْ شَرِّ بَيْتِهَا فَاِذَا كَانَ حَوْلٌ فَمَرَّ كَلْبٌ رَمَتْ بِبَعْرَةٍ فَلَا حَتّٰى تَمْضِيَ اَرْبَعَةُ اَشْهُرٍ وَ عَشْرٌ »

[بخارى، كتاب الطلاق: باب الكحل للحادة(٥٣٣٨)، مسلم(١٤٨٨)]

''ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا تو انھیں اس کی آنکھیں خراب ہونے کا ڈر لاحق ہوا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرمہ کی اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سرمہ نہ لگائے، (کیا وہ دور اچھا تھا جب جاہلیت کے زمانے میں) عورت ایک سال کے لیے خراب کپڑے یا برے سے جھونپڑے میں پڑی رہتی تھی۔ جب سال پورا ہوتا تو وہ اونٹ کی مینگنی اس وقت پھینکتی جب کتا سامنے سے گزرتا (اگر کتا نہ گزرتا تو وہ اسی طرح پڑی رہتی) دیکھو وہ چار ماہ تک سرمہ نہ لگائے۔''

حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« دَخَلْتُ عَلٰى اُمِّ حَبِيْبَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ حِيْنَ تُوُفِّيَ اَبُوْهَا اَبُوْ سُفْيَانَ بْنُ

حَرْبٍ فَدَعَتْ أُمُّ حَبِيبَةَ بِطِيبٍ فِيهِ صُفْرَةُ خَلُوقٍ أَوْ غَيْرُهُ فَدَهَنَتْ مِنْهُ جَارِيَةً ثُمَّ مَسَّتْ بِعَارِضَيْهَا ثُمَّ قَالَتْ وَ اللّٰهِ مَا لِيْ بِالطِّيبِ مِنْ حَاجَةٍ غَيْرَ أَنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تُحِدَّ عَلٰى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ إِلَّا عَلٰى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَ عَشْرًا ﴾ [بخاری، کتاب الطلاق: باب تحد المتوفی عنها أربعة أشهر وعشرا (٥٣٣٤)، مسلم (١٤٨٦)، ابوداؤد (٢٢٩٩)، ترمذی (٣/٥٠٠)، نسائی (٦/٢٠١)، مسند احمد (٦/٢٣٥)]

''میں ام حبیبہ نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ کے پاس اس وقت آئی جب ان کے باپ ابوسفیان فوت ہوئے تو ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے زرد رنگ کی خوشبو وغیرہ منگوائی اور اس میں سے تھوڑی سی ایک چھوٹی بچی کو لگائی، پھر اپنے رخساروں پر لگالی، پھر فرمایا: ''اللہ کی قسم! مجھے خوشبو کی ضرورت نہیں (کیونکہ وہ بیمار تھیں) مگر میں نے اس لیے لگائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے، آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان رکھنے والی عورت کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے، سوائے بیوی کے کہ وہ اپنے شوہر پر چار ماہ دس دن سوگ کرے۔''

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ ایسی عورتیں جن کے خاوند وفات پا جائیں وہ دوران عدت زیب و زینت مثلاً خوشبو لگانا، سرمہ ڈالنا، نیا لباس پہننا، زیورات زیب تن کرنا وغیرہ جیسے امور سے اجتناب کریں اور جس گھر میں خاوند فوت ہوا ہو اس گھر میں چار ماہ دس دن عدت گزارے یا وہاں جہاں اسے خاوند کی وفات کی اطلاع ملے۔ اس کے بعد وہ اپنے والدین کے گھر جا سکتی ہے یا نئی شادی کرنا ہو تو کروا سکتی ہے۔ دوران عدت ان امور سے اجتناب لازم ہے۔

کیا عورت کی طرف سے بھی ظہار ہوتا ہے؟

سوال اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے کہہ دے کہ تو مجھ پر ایسے ہے جیسے میرا باپ تو کیا عورت کی طرف سے بھی ظہار ہوگا اور اس پر کفارہ ہوگا؟ کتاب وسنت کی رو سے واضح فرمائیں۔

جواب کتاب وسنت کی رو سے ظہار اسی صورت ہوتا ہے جب شوہر اپنی اہلیہ کو اپنی ماں سے تشبیہ دے ڈالے، اللہ پاک نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ الَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِنْ نِسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ إِنْ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا الّٰٓئِيْ وَلَدْنَهُمْ ﴾
(المجادلة : ٢)

''جو لوگ تم میں سے اپنی بیویوں سے ظہار کریں وہ ان کی مائیں نہیں۔ ان کی مائیں صرف وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنم دیا ہے۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ظہار مرد کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس لیے اگر عورت مرد کو باپ کہہ دے تو یہ ظہار نہیں

سمجھا جائے گا۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وغیرہم کا یہی مذہب ہے۔ [بداية (المجتهد ٢/ ٩٣)، المبسوط للسرخسي (٢/ ٢٢٧)، حاشيه ابن عابدين (٣/ ٤٦٧)، المهذب (١٦/ ١١٩)، الانصاف للمرداوی (٩/ ٢٠٠)]

اور عورت پر راجح قول کی رو سے کفارہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن حکیم نے کفارہ بھی مرد کے لیے بتایا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴾ [المجادلة: ٣'٤]

”وہ لوگ جو اپنی عورتوں سے ظہار کر لیتے ہیں پھر اپنے قول کی طرف لوٹ آتے ہیں تو چھونے سے پہلے گردن آزاد کرنا ہے۔ یہ تمھیں نصیحت کی جاتی ہے اللہ تمھارے اعمال سے باخبر ہے۔ جو گردن آزاد کرنے کی ہمت نہ پائے تو وہ دو ماہ متواتر چھونے سے قبل روزے رکھے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، یہ اس لیے ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

سنن ابی داؤد میں خولہ بنت مالک رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اوس بن صامت نے مجھ سے ظہار کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کرنے حاضر ہوئی اور اللہ کے رسول مجھ سے مجادلہ کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے ”اللہ سے ڈرو وہ تو تیرے چچا کا بیٹا ہے۔“ یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا:

﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا ﴾ (المجادلة: ١)

”تحقیق اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑ رہی تھی۔“

آپ نے فرمایا: ”اوس ایک گردن آزاد کرے۔ میں نے کہا: ”وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا۔“ آپ نے فرمایا: ”دو ماہ کے لگاتار روزے رکھ لے۔“ میں نے کہا: ”اللہ کے رسول! وہ بوڑھا آدمی ہے روزے نہیں رکھ سکتا۔“ آپ نے فرمایا: ”وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔“ میں نے کہا: ”اس کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہیں۔“ ”آپ کے پاس اس وقت ایک بڑی زنبیل کھجوروں کی لائی گئی (تو آپ نے وہ اسے دے دی)۔ میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں ایک دوسری زنبیل سے اس کی مدد کروں گی۔“ آپ نے فرمایا: ”تم نے احسان کیا، جاؤ اس کی جانب سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلادو اور اپنے چچا زاد کی طرف لوٹ جا۔“ [ابو داؤد، كتاب الطلاق: باب في الظهار (٢٢١٤)]

اس حدیث سے بھی واضح ہوگیا کہ کفارہ مرد کے ذمہ ہے لہٰذا قرآن وحدیث کی رو سے ظہار اور کفارہ مرد ہی پر ہوگا، عورت کے اس فعل شنیع کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

خلع طلاق یا فسخِ نکاح

سوال بیوی کا اپنے خاوند سے خلع لے لینا آیا طلاق شمار ہوگا یا اسے فسخ نکاح کہیں گے نیز اسکے احکامات کیا ہیں؟

جواب کتاب وسنت کی واضح نصوص کی رو سے خلع فسخ نکاح شمار ہوتا ہے اور عورت ایک ماہواری کی عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کرانے کی مجاز ٹھہرتی ہے کیونکہ خلع طلاق نہیں فسخ نکاح ہے۔ اس کی عدت ایک حیض ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص نے سوال کیا: ''ایک شخص نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دے دیں اور پھر عورت نے اس سے خلع لے لیا کیا اب وہ اس عورت سے شادی کر سکتا ہے؟'' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''ہاں! خلع طلاق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کے شروع اور آخر میں طلاق کا ذکر کیا ہے اور خلع اس کے درمیان ہے۔ خلع کوئی چیز نہیں۔'' پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت کی ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ﴾ [البقرة:۲۲۹] ''طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے، پھر اچھے طریقے سے روک لینا ہے یا شائستگی سے چھوڑ دینا ہے۔'' پھر انھوں نے پڑھا: ﴿ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ﴾ [البقرة:۲۳۰] ''اگر (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد عورت اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔'' [تفسیر ابن کثیر بتحقیق عبدالرزاق مهدی(۱/۵۵۳)]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی بات کا مطلب یہ ہے کہ طلاق والی آیت کریمہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے دو طلاقوں کا ذکر کیا ہے پھر آگے تیسری طلاق کا ذکر ہے۔ خلع ان کے درمیان میں بیان کیا ہے اگر خلع کو طلاق شمار کیا جائے تو تین کی بجائے چار طلاقیں بن جاتی ہیں جس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ خلع طلاق نہیں بلکہ فسخ نکاح ہے اور اگر کوئی آدمی اپنی منکوحہ کو دو طلاقیں دے چکا ہے پھر اس کے بعد عورت خلع حاصل کر لیتی ہے اس کے بعد ان کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے کیونکہ خلع کو تیسری طلاق نہیں بلکہ اسے فسخ نکاح قرار دیا جائے گا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس کے بعد فرماتے ہیں:

''یہی وہ بات ہے کہ جس کی طرف عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما گئے ہیں کہ خلع طلاق نہیں بلکہ فسخ نکاح ہے اور یہی روایت امیر المومنین عثمان بن عفان اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے ہے۔

امام طاؤس اور عکرمہ کا بھی یہی قول ہے اور یہی بات امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ، امام ابوثور، امام داؤد ظاہری رحمہم اللہ کہتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قدیم مذہب بھی یہی ہے اور یہی بات آیت کریمہ سے ظاہر ہے۔'' [تفسیر ابن کثیر (۱/۵۵۳)]

بعض ائمہ کے نزدیک خلع طلاق بائنہ ہے لیکن اس کی کوئی پختہ دلیل نہیں۔ قرآنی آیت کے ظاہر سے یہی معنی متبادر ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خلع والی عورت کی عدت ایک حیض ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ امۡرَاَةَ ثَابِتِ بۡنِ قَيۡسٍ اخۡتَلَعَتۡ مِنۡهُ فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ سَلَّمَ عِدَّتَهَا حَيۡضَةً »

[ابو داؤد، کتاب الطلاق :باب فی الخلع(۲۲۲۹)، ترمذی، کتاب الطلاق :باب ما جآء فی الخلع (۱۱۸۵)، المستدرك علی الصحیحین(۲/ ۲۰۶)، اس حدیث کو امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ھے اور امام ذھبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ھے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ھے۔]

"بلاشبہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ان سے خلع لیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ایک حیض قرار دی۔"

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ سب سے بڑی دلیل ہے اس بات پر کہ خلع فسخ نکاح ہے، طلاق نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:" طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں۔" اگر خلع لینے والی عورت مطلقہ شمار ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے ایک حیض عدت گزارنے پر اکتفانہ کرتے۔"[معالم السنن(۳/ ٦٥٦)]

مذکورہ روایت کو بعض راویوں نے مرسل بھی بیان کیا ہے لیکن جب کوئی روایت ایک طریق سے مرسل اور دوسرے طریق سے موصول مروی ہو تو روایت موصول ہی سمجھی جاتی ہے اور یہ کوئی علت قادحہ نہیں ہوتی جیسا کہ اصول حدیث کی کتب میں واضح ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ اس مسئلے میں اہل علم صحابہ کا اختلاف نقل کرنے کے بعد امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کا قول کہ خلع یافتہ عورت کی عدت ایک حیض ہے، کے بارے میں نقل کرتے ہیں:

"اگر کوئی شخص اس پر عمل کرے تو یہ مذہب قوی ہے۔"[ترمذی مع تحفة الأحوذی(٤/ ٤٠٨)]

مذکورہ بالا صحیح دلائل سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ جس عورت نے اپنے شوہر سے خلع لے لیا ہو اس کی عدت ایک حیض ہے تین نہیں اور وہ ایک حیض عدت گزارنے کے بعد اگر کسی دوسرے آدمی سے شادی کرنے کی خواہش مند ہو تو کرواسکتی ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ دلائل کی رو سے یہی موقف قوی و درست ہے۔ جو لوگ خلع کو طلاق شمار کرتے ہیں ان کے پاس کوئی واضح اور پختہ دلیل نہیں ہے۔ ان کے نزدیک تین حیض عدت گزار کر اس کا عقد ثانی ہوسکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

طلاق اور خلع میں فرق

سوال طلاق سے بھی میاں بیوی میں جدائی ہو جاتی ہے اور خلع سے بھی۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟

جواب طلاق اور خلع میں یہ فرق ہے:

① مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے جب کہ خلع یافتہ عورت کی عدت ایک حیض ہے۔

② صحیح شرعی طلاق ایسے طہر میں ہوتی ہے جس میں شوہر نے بیوی سے ہم بستری نہ کی ہو، جب کہ خلع کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں۔

③ طلاق کے بعد عورت اپنے شوہر کے گھر ہی میں عدت گزارتی ہے جب کہ خلع کے بعد عورت فوراً اپنے شوہر سے جدا ہو جاتی ہے اور اپنے والدین وغیرہ سے جا ملتی ہے۔

④ طلاق کی صورت میں خاوند بیوی سے اپنا دیا ہوا حق مہر نہیں لے سکتا جب کہ خلع کی صورت میں لے سکتا ہے۔

شوہر کی خبر نہ ملنے پر عورت کے لیے حکم

(سوال) اگر کسی عورت کا شوہر گم ہو جائے اور اس کی کہیں سے کوئی خبر نہ ملے تو شریعت ایسی عورت کے نئے نکاح کے بارے میں کیا کہتی ہے؟

(جواب) ایسے آدمی کو اصطلاحی طور پر مفقود الخبر کہا جاتا ہے اور جب عورت کو اپنے شوہر کے لاپتا ہونے کی یقینی خبر مل جائے تو اس وقت سے چار سال گزرنے پر اس کے مرنے کا حکم لگا دیا جائے گا اور اس کے بعد چار ماہ دس دن بیوہ کی عدت گزار کر عورت دوسری جگہ اگر نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ اس مسئلے کے متعلق کوئی مرفوع روایت تو موجود نہیں البتہ آثار صحابہ موجود ہیں۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں:

« تَرَبَّصُ امْرَاَةُ الْمَفْقُوْدِ اَرْبَعَ سِنِيْنَ ثُمَّ تَعْتَدُّ عِدَّةَ الْمُتَوَفّٰى عَنْهَا زَوْجُهَا وَ تَزَوَّجُ اِنْ شَاءَتْ »
[سنن سعيد بن منصور(١٧٥٢)، مؤطا(ص/٣٣٢)، السنن الكبرىٰ للبيهقي(٤٤٥/٧)، مصنف عبد الرزاق (٨٨/٧)]

”مفقود آدمی کی بیوی چار سال انتظار کرے پھر شوہر کے فوت ہونے والی عدت گزارے یعنی چار ماہ دس دن اور اس کے بعد اگر چاہے تو شادی کرے۔“

حضرت سعید بن مسیب سے روایت ہے:

« اِنَّ عُمَرَ وَ عُثْمَانَ قَضَيَا فِي الْمَفْقُوْدِ اَنَّ الْمَرْاَةَ تَتَرَبَّصُ اَرْبَعَ سِنِيْنَ وَ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَ عَشْرًا بَعْدَ ذٰلِكَ ثُمَّ تَزَوَّجُ اِلٰى آخِرِهِ »[بيهقي(٤٤٥/٧)، مصنف عبد الرزاق(٨٥/٧)]

”بے شک عمر بن خطاب اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما دونوں خلفاء نے مفقود شوہر کے بارے میں فیصلہ دیا کہ اس کی بیوی چار سال تک انتظار کرے اور اس کے چار ماہ دس دن بعد یعنی بیوہ عورت کی عدت گزار کر شادی کرے۔“

جابر بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« تَنْتَظِرُ الْمَرْاَةُ الْمَفْقُوْدِ اَرْبَعَ سِنِيْنَ »[سنن سعيد بن منصور(١٧٥٦)، بيهقي(٤٤٥/٧)]

”بے پتا شوہر کی بیوی چار سال انتظار کرے۔“

سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” اِذَا فُقِدَ فِي الصَّفِّ تَرَبَّصَتْ سَنَةً اِذَا فُقِدَ فِيْ غَيْرِ الصَّفِّ فَاَرْبَعَ سِنِيْنَ “ [مصنف عبد الرزاق(٨٩/٧)]

”جب آدمی صف قتال میں بے پتا ہو جائے تو عورت ایک سال انتظار کرے اور جب لڑائی کی صف کے علاوہ گم ہو جائے تو چار سال انتظار کرے۔“

امام قتادہ بن دعامہ السدوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جب ایسی عورت کا معاملہ حاکم تک پہنچایا جائے اور چار سال گزر جائیں تو ایسے آدمی کا مال اس کے ورثا میں تقسیم کر دیا جائے یعنی چار سال کے بعد اس کی موت کا حکم لگا دیا جائے گا پھر اس کی جائداد وغیرہ وارثوں میں تقسیم ہو جائے گی۔" [مصنف عبد الرزاق(٩٠/٧)]

امام محمد بن مسلم المعروف ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔[فتح الباری(٤٣١/٩)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ ثَبَتَ اَيضًا عَنْ عُثْمَانَ وَ ابنِ مَسعُودٍ فِي رِوَايَةٍ وَ عَنْ جَمعٍ مِّنَ التَّابِعِينَ كَالنَّخعِيِّ وَ عَطَاءٍ وَ الزُّهرِيِّ وَ مَكحُولٍ وَ الشَّعبِيِّ وَاتَّفَقَ اَكثَرُهُم عَلٰى اَنَّ التَّاجِيلَ مِنَ اليَومِ تُرفَعُ اَمرُهَا لِلحَاكِمِ وَ عَلٰى اَنَّهَا تَعتَدُّ عِدَّةَ الوَفَاةِ بَعدَ مَضيِ الاَربَعِ سِنِينَ " [فتح الباری(٤٣١/٩)]

"یہ بات عثمان رضی اللہ عنہ، ایک روایت کے مطابق عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایک جماعت جیسے نخعی، عطا، زہری، مکحول اور شعبی رحمہم اللہ سے ثابت ہے اور اکثر کا ان میں سے اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ مقررہ مدت اس دن سے شروع ہوگی جب عورت کا معاملہ حاکم کی طرف پہنچا دیا جائے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ چار سال گزرنے کے بعد وہ شوہر کی وفات کی عدت گزارے گی۔"

اس کے برعکس فقہ حنفی میں ہے کہ جس کا شوہر بے پتا ہو جائے تو اس کی عورت اتنا انتظار کرے کہ شوہر کی عمر نوے برس کی ہو جائے تو پھر اس کے مرنے کا حکم لگایا جائے گا۔ اشرف علی تھانوی دیوبندی لکھتے ہیں:

"اس (عورت) کا شوہر بالکل بے پتا ہو گیا، معلوم نہیں مر گیا یا زندہ ہے تو وہ عورت اپنا دوسرا نکاح نہیں کر سکتی بلکہ انتظار کرتی رہے کہ شاید آ جائے۔ جب انتظار کرتے کرتے اتنی مدت گزر جائے کہ شوہر کی عمر نوے برس کی ہو جائے تو اب حکم لگا دیں کہ وہ مر گیا ہوگا۔ وہ عورت ابھی جوان ہو اور نکاح کرنا چاہے تو شوہر کی عمر نوے برس کی ہونے کے بعد عدت پوری کر کے نکاح کر سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس بے پتا مرد کے مرنے کا حکم کسی شرعی حاکم نے لگایا ہو۔"
[بہشتی زیور(ص/٣٠)]

اسی بہشتی زیور کے نیچے حاشیہ میں اس مسئلے کا حوالہ فتاویٰ عالمگیری (٩١٥/٢) اور ہدایہ (٦٠٢/٢) سے دیا گیا ہے لیکن حنفی حضرات کا اپنے اس مسئلے پر فتویٰ نہیں ہے، یہ اس مسئلہ میں امام مالک کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں۔ اصل بہشتی زیور کے مذکورہ صفحہ کے حاشیہ پر لکھا ہے:

"لیکن آج کل شدت ضرورت کی وجہ سے علماء نے امام مالک کے مذہب پر فتویٰ دے دیا ہے، ان کے نزدیک اتنی مدت شرط نہیں، اگر کسی کو ضرورت ہو تو علماء سے مفصل طور پر معلوم کر کے اس پر عمل کر سکتا ہے۔"

امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب وہی ہے جو اوپر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر علماء کا بیان کیا گیا ہے۔ اشرف علی تھانوی کی وضاحت

سے معلوم ہوا کہ حنفی علماء نے اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے موقف کو ترک کر دیا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے موقف کو اختیار کیا ہے۔اس بات پر ان کے دیو بند سہارنپور اور تھانہ بھون کے جید علماء کے دستخط ثبت ہیں۔ان علماء کی تفصیل " الحیلة الناجزة" جو جدید طرز پر" احکام طلاق و نظام شرعی عدالت" کے نام سے شائع ہوا ہے (مطبوعہ الفیصل ناشران و تاجران کتب غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور) اس کے صفحہ ۲۲ تا ۲۵ میں موجود ہے۔

مذکورہ بالا آثار صحابہ کرام اور ائمہ دین، محدثین اور حنفی علماء کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ جس عورت کا شوہر لا پتا ہو جائے تو اس کے یقینی طور پر لا پتا ہو جانے کے بعد یا جب معاملہ عدالت کی طرف لایا جائے ، حاکم وقت تک پہنچانے کے بعد عورت چار سال تک انتظار کرے پھر چار ماہ دس دن کی عدت گزار کر اگر نیا نکاح کرانا چاہے تو کروا سکتی ہے اور یہی راجح ترین موقف ہے جس کی پانچ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تصدیق ہوتی ہے۔

WWW. KITABOSUNNAT. COM

❀❀❀

قربانی کے احکام

WWW. KITABOSUNNAT.COM

گیارھویں کی نیت سنت یا بدعت؟

(سوال) بعض لوگ قربانی میں بھی گیارھویں کی نیت کر لیتے ہیں کیا ایسا کرنا درست ہے؟

(جواب) یقیناً قربانی کے جانور کو صرف رضائے الٰہی ہی کے لیے ذبح کرنا چاہیے کیونکہ جانوروں کو غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کرنا، غیر اللہ کے نام پر چھوڑ دینا، ایسی جگہ ذبح کرنا جہاں غیر اللہ کی عبادت اور شرک ہوتا ہو، سب حرام ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَهُ وَ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ آوٰى مُحْدِثًا وَ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ غَيَّرَ مَنَارَ الْاَرْضِ» [مسلم، كتاب الأضاحى: باب تحريم الذبح لغير الله تعالٰى و لعن فاعله (١٩٧٨)]

"اللہ تعالیٰ اس آدمی پر لعنت کرے جو اپنے والد پر لعنت کرے، اللہ تعالیٰ اس آدمی پر لعنت کرے جو غیر اللہ کے لیے ذبح کرے۔ اللہ تعالیٰ اس آدمی پر لعنت کرے جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اللہ تعالیٰ اس آدمی پر لعنت کرے جو زمین کی علامات کو بدلے۔"

بعض ناسمجھ لوگ قربانی جیسی عظیم عبادت میں گیارھویں کی نیت کر لیتے ہیں اور اپنے عمل کو ضائع کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اور بزرگوں کی محبت میں آ کر اپنے رب کی ناراضی مول نہیں لینا چاہیے اور اس کی عظمت و بڑائی اور کبریائی کو نہیں بھولنا چاہیے۔

جن جانوروں کی قربانی جائز نہیں

(سوال) براہِ کرم قرآن اور حدیث کی روشنی میں آگاہ فرما دیں کہ کن جانوروں کی قربانی کرنا جائز نہیں؟

(جواب) ① سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَنْ نَسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَ الْاُذُنَ» [ابوداود، كتاب الضحايا: باب ما يكره من الضحايا (٢٨٠٤)]

"رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم آنکھ اور کان اچھی طرح دیکھیں۔"

② سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ سُئِلَ عَنْهُ مَا ذَا يُتَّقَى مِنَ الضَّحَايَا فَاَشَارَ بِيَدِهِ فَقَالَ اَرْبَعًا اَلْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ظُلْعُهَا وَ الْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوَرُهَا وَ الْمَرِيْضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا وَ الْعَجْفَاءُ الَّتِيْ لَا تُنْقِيْ» [مسند احمد (۳۰۱/٤)]

''رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ''کس جانور کی قربانی سے بچنا چاہیے؟'' آپ ﷺ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا: ''چار قسم کے جانوروں سے بچنا چاہیے، لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو، بھینگا جس کا بھینگا پن ظاہر ہو، بیمار جس کی بیماری واضح ہو اور کمزور و لاغر جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔''

حاملہ جانور کی قربانی

سوال کیا حاملہ جانور کی قربانی درست ہے؟ اور اس کے پیٹ کے بچے کا کیا حکم ہے، اسے کھانا درست ہے یا نہیں؟

جواب حاملہ جانور کی قربانی کرنا درست ہے اور اس کے پیٹ کا بچہ حلال ہے، ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا:

« نَنْحَرُ النَّاقَةَ وَ نَذْبَحُ الْبَقَرَةَ وَالشَّاةَ فَنَجِدُ فِيْ بَطْنِهَا الْجَنِيْنَ اَنُلْقِيْهِ اَمْ نَاْكُلُهُ؟ قَالَ: كُلُوْهُ اِنْ شِئْتُمْ فَاِنَّ ذَكَاتَهُ ذَكَاةُ اُمِّهِ » [ابوداؤد ، كتاب الضحايا : باب ما جاء في ذكاة الجنين (۲۸۷۲)]

''اے اللہ کے رسول! ہم اونٹنی، گائے اور بکری کو ذبح کرتے ہیں تو اس کے پیٹ میں بچہ پاتے ہیں، کیا ہم اسے پھینک دیں یا کھالیں؟'' آپ نے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو اسے کھالو بے شک اس کا ذبح کرنا اس کی ماں کا ذبح کرنا ہے۔

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ حاملہ اونٹنی بکری یا گائے کی قربانی درست ہے اور اس کے پیٹ کا بچہ بھی حلال ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ماں کو ذبح کرنے کے بعد اس کے پیٹ کا بچہ ذبح کیے بغیر کھانے کا جواز ہے، بعض لوگوں نے اس حدیث کی تاویل کی ہے جو پیٹ کے بچے کو کھانا جائز نہیں سمجھتے، تاویل یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بچے کو اسی طرح ذبح کیا جائے جیسا کہ اس کی ماں کو ذبح کیا جاتا ہے لیکن یہ واقعہ اس تاویل کا مکمل طور پر ابطال کرتا ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اپنے ارشاد میں فرمایا ہے: ''پس یقیناً اس کا ذبح کرنا اس کی ماں کا ذبح کرنا ہے۔'' آپ نے ذبح کیے بغیر بچے کے حلال ہونے کی علت ذکر کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کیسا جانور قربان کرتے تھے؟

سوال رسول اللہ ﷺ کیسا جانور قربان کرتے تھے کیا حدیث سے اس کی رہنمائی میسر آ سکتی ہے؟

جواب ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُضَحِّي بِكَبْشٍ اَقْرَنَ فَحِيْلٍ يَّنْظُرُ فِيْ سَوَادٍ وَ يَاْكُلُ فِيْ سَوَادٍ وَ يَمْشِيْ فِيْ سَوَادٍ » [ابوداود، كتاب الضحايا: باب ما يستحب من الضحايا(٢٧٩٦)]

''رسول اللہ ﷺ ایسا مینڈھا ذبح کرتے جو موٹا تازہ سینگوں والا ہوتا تھا، جس کی آنکھیں، منہ اور ٹانگیں سیاہ ہوتیں۔''

بھینس کی قربانی

سوال کیا بھینس کی قربانی قرآن وحدیث سے ثابت ہے؟

جواب قربانی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ...... ﴾ [الحج: ٣٤]

''اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کی جگہ مقرر کی تھی تاکہ جو جانور اللہ تعالیٰ نے ان کو مویشی چوپایوں میں سے دیے تھے ان پر اللہ کا نام ذکر کریں۔''

اس آیت کریمہ میں قربانی کے جانوروں کے لیے ﴿ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ ﴾ کے الفاظ ذکر کیے ہیں اور ''انعام'' سے مراد یہاں اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہیں جن کی تشریح قرآن پاک کی دوسری آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ﴾ [الانعام: ١٤٢-١٤٤]

''اور اس نے چوپایوں میں سے بار برداری والے (یعنی بڑے بڑے) پیدا کیے اور زمین سے لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے) چوپائے بھی پیدا کیے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمھیں عطا کیا اس میں سے کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ یہ چوپائے آٹھ قسم کے ہیں، بھیڑ میں سے دو اور بکری میں سے دو۔ کہہ دیجیے کیا اللہ تعالیٰ نے دونوں نر حرام کیے یا دونوں مادہ کو یا اس کو جس کو دونوں مادہ پیٹ میں لیے ہوئے ہیں؟ تم مجھے کسی دلیل سے بتاؤ اگر تم سچے ہو اور اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ انعام کا اطلاق اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری پر ہوتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ ﴿ مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

'' وَ الْاَنْعَامُ هِنَا الْاِبِلُ وَ الْبَقَرُ وَ الْغَنَمُ وَ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ هِيَ الْاَنْعَامُ فَهُوَ كَقَوْلِكَ صَلَاةُ الْاُوْلٰى

وَ مَسْجِدُ الْجَامِعِ " [تفسیر قرطبی(۳۰/۱۲)]

''اَلْاَنْعَامُ سے مراد یہاں اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہے اور " بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ" سے مراد انعام ہی ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے آپ کہتے ہیں صلاۃ الاولیٰ اور مسجد الجامع۔''

نواب صدیق حسن خان رقم طراز ہیں:

''انعام'' کی قید اس لیے لگائی گئی کہ قربانی انعام کے سوا اور کسی جانور کی درست نہیں اگرچہ اس کا کھانا حلال ہی ہو۔'' [ترجمان القرآن:(۷٤۱)]

مزید فرماتے ہیں:

''﴿ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ سے اونٹ اور گائے اور بکری مراد ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام میں مفصل بیان فرمایا۔'' [ترجمان القرآن(۷۲۷)]

مذکورہ آیت کی تفسیر میں قاضی شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ فِيْهِ اِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّ الْقُرْبَانَ لَا يَكُوْنُ اِلَّا مِنَ الْاَنْعَامِ دُوْنَ غَيْرِهَا" [فتح القدير(٤٥٢/٣)]

''اس میں اشارہ ہے کہ انعام کے علاوہ دوسرے جانوروں کی قربانی نہیں ہوتی۔''

اور پھر انعام کی تشریح میں فرماتے ہیں:

" وَ هِيَ الْاِبِلُ وَ الْبَقَرُ وَ الْغَنَمُ " [فتح القدير(٤٥١/٣)]

''اور وہ اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہیں۔''

مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ ﴿ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ سے مراد اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہیں اور انھیں کی قربانی کرنی چاہیے۔ بھینس ان چار قسم کے چوپایوں میں سے نہیں۔ علامہ سید سابق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ لَا تَكُوْنُ اِلَّا مِنَ الْاِبِلِ وَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ وَ لَا يُجْزِئُ مِنْ غَيْرِ هٰذِهِ الثَّلَاثَةِ يَقُوْلُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ ﴿ لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾" [فقه السنة (٢٦٤/٣)]

''قربانی اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری کے علاوہ جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وہ یاد کریں اللہ تعالیٰ کا نام اس جانور پر جو اللہ تعالیٰ نے انھیں مویشی چوپایوں میں سے عطا کیا۔''

یہی موقف حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے فتاویٰ اہل حدیث (۴۲۶/۲) میں اختیار کیا ہے، فرماتے ہیں: ''بعض نے جو یہ لکھا ہے: " اَلْجَامُوْسُ نَوْعٌ مِنَ الْبَقَرِ " کہ بھینس گائے کی قسم سے ہے'' یہ بھی اسی زکاۃ کے لحاظ سے صحیح ہو سکتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ بھینس دوسری جنس ہے۔'' احناف کے ہاں بھینس کی قربانی کی جا سکتی ہے اور یہ بقر میں داخل ہے۔ ہدایہ میں ہے:

" وَ يَدْخُلُ فِي الْبَقَرِ الْجَامُوْسُ لِاَنَّهٗ مِنْ جِنْسِهٖ " [الهداية، كتاب الاضحية (٣٥٩/٤)، طبع بيروت]

'' گائے میں بھینس داخل ہے اس لیے کہ یہ گائے کی جنس سے ہے۔''

فتاویٰ ثنائیہ میں لکھا ہے:

''حجاز میں بھینس کا وجود ہی نہ تھا پس اس کی قربانی نہ سنت رسول ﷺ سے ثابت ہوتی ہے نہ تعامل صحابہ ﷢ سے، ہاں اگر اس کو جنس بقر سے مانا جائے جیسا کہ حنفیہ کا قیاس ہے یا عموم ''بَهِيمَةِ الْاَنْعَامِ'' پر نظر ڈالی جائے تو حکم جواز قربانی کے لیے یہ علت کافی ہے۔ (از مولانا ابو العلاء نظر احمد کسوانی۔)'' [فتاویٰ ثنائیہ (۱/ ۸۱۰)]

ائمہ اسلام کے ہاں جاموس (بھینس) کا جنس بقر سے ہونا مختلف فیہ ہے۔ مبنی بر احتیاط اور راجح یہی موقف ہے کہ بھینس کی قربانی نہ کی جائے بلکہ مسنون قربانی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری سے کی جائے، جب یہ جانور موجود ہیں تو ان کے ہوتے ہوئے مشتبہ امور سے اجتناب ہی کرنا چاہیے اور دیگر بحث و مباحثے سے بچنا ہی اولیٰ و بہتر ہے۔

دو دانتے سے کمتر کی قربانی

سوال کیا دو دانتے جانور سے کم عمر کی قربانی کرنا جائز نہیں، جبکہ نبی ﷺ نے ایک صحابی کو بکرا کا بچہ ذبح کرنے کی اجازت دی تھی؟

جواب قربانی کے جانور کے لیے جو شرائط شریعت مطہرہ نے بیان کی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ قربانی والا جانور دو دانتا ہو اور اگر یہ ملنا مشکل ہو یا اسے خریدنے کی ہمت نہ ہو تو بھیڑ کا کھیرا قربان کرنا جائز و درست ہے۔ جابر بن عبد اللہ ﷠ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَذْبَحُوا اِلَّا مُسِنَّةً اِلَّا اَنْ يَّعْسُرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوا جَذْعَةً مِّنَ الضَّانِ »[مسلم، كتاب الأضاحى باب سن الأضحية (١٩٦٣)، ابوداؤد (٢٧٩٧)، ابن ماجه (٣١٤١)، نسائى (٤٣٨٣)، ابن خزيمة (٢٩١٨)، مسند ابى يعلى(٢٣٢٣)، بيهقى(٩/ ٢٦٩)، مسند احمد (٣/ ٣١٢)، مسند ابى عوانة (٥/ ٢٢٨)، ابن الجارود(٩٠٤)]

''تم دو دانتے کے سوا ذبح نہ کرو، لیکن اگر تمھارے اوپر تنگی ہو تو بھیڑ کا کھیرا ذبح کر لو۔''

بعض لوگ دو دانتے کی جگہ مطلقاً بھیڑ کے کھیرے کی قربانی درست قرار دیتے ہیں اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ کلیب بیان کرتے ہیں:

« كُنَّا فِى سَفَرٍ فَحَضَرَ الْاَضْحٰى فَجَعَلَ الرَّجُلُ مِنَّا يَشْتَرِى الْمُسِنَّةَ بِالْجَذْعَتَيْنِ وَ الثَّلَاثَةِ فَقَالَ لَنَا رَجُلٌ مِنْ مُزَيْنَةَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِى سَفَرٍ فَحَضَرَ هٰذَا الْيَوْمَ فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَطْلُبُ الْمُسِنَّةَ بِالْجَذْعَتَيْنِ وَ الثَّلَاثَةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: اِنَّ الْجَذَعَ يُوَفِّى مِمَّا يُوَفِّى مِنْهُ الثَّنِىُّ »[مسند احمد (٣/ ٢٠٤)، مستدرك حاكم (٤/ ٢٢٦)، بيهقى(٩/ ٢٧١)،ابن ابى شيبة (١٤ / ٢١٠)]

’’ہم سفر میں تھے کہ قربانی والی عید کا وقت آ گیا، ہم میں سے ہر کوئی دو یا تین کم عمر جانوروں کے بدلے دو دانتا خریدنے لگا۔ مزینہ قبیلے کے ایک آدمی نے ہم سے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے کہ یہ دن آ گیا تو ہر شخص دو یا تین کم عمر جانوروں کے بدلے دو دانتا طلب کرنے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بلاشبہ کھیرا اس کام پر پورا اترتا ہے جس کام میں دو دانتا پورا ہے۔‘‘

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« كُنَّا مَعَ رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُقَالُ لَهُ مُجَاشِعٌ مِنْ بَنِيْ سُلَيْمٍ فَعَزَّتِ الْغَنَمُ فَأَمَرَ مُنَادِيًا فَنَادٰى أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ أَنَّ الْجَذَعَ يُوَفِّيْ مِمَّا تُوَفِّيْ مِنْهُ الثَّنِيَّةُ »[ابو داؤد، كتاب الضحايا: باب ما يجوز في الضحايا من السن(٢٧٩٩)، ابن ماجه (٣١٤٠)، طبراني كبير(٢٠/٧٦٤١)، مستدرك حاكم(٤/٢٢٦)،بيهقي(٩/٢٧٠)]

’’ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے ایک آدمی کے ساتھ تھے جسے مجاشع کہا جاتا ہے، وہ بنو سلیم میں سے تھا، بکریاں کم پڑ گئیں تو آپ ﷺ نے ایک منادی کرنے والے کو حکم دیا، اس نے منادی کی کہ اللہ کے رسول ﷺ فرما رہے ہیں: ’’بلاشبہ بھیڑ کا کم عمر بچہ اس چیز سے پورا پورا کفایت کرتا ہے جس سے دو دانتا کام آتا ہے۔‘‘

اس حدیث نے اس بات کی توضیح کر دی کہ یہ حکم دو دانتا جانور کم ہونے کی صورت میں تھا۔ اس میں اور جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں کوئی تعارض نہیں۔ وہ بھی عسرت و تنگی اور دو دانتے کی قلت کی صورت میں بھیڑ کا کم عمر بچہ قربانی کرنے پر دلالت کرتی ہے اور اس روایت کا سیاق بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح ابو کباش کی ایک روایت پیش کی جاتی ہے کہ وہ کہتے ہیں: ’’میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے سوال کیا تو انھوں نے کہا: ’’میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا ہے:

« نِعْمَ أَوْ نِعْمَتِ الْأُضْحِيَةُ الْجَذَعُ مِنَ الضَّأْنِ »[مسند احمد(١٥/٤٦١)،مسنداسحاق بن راهوية (٤٠٧)، بيهقي(٩/٢٧١)، ترمذي (١٤٩٩)]

’’بہترین قربانی بھیڑ کا کھیرا ہے۔‘‘

اس کی سند کدام بن عبدالرحمٰن السلمی اور ابو کباش کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ بھی مروی ہے:

« اَلْجَذَعُ مِنَ الضَّأْنِ خَيْرٌ مِّنَ السَّيِّدِ مِنَ الْمَعْزِ »[مسند احمد(٢/٤٠٢)، مستدرك حاكم (٤/٢٢٧)]

’’بھیڑ کا کم عمر بچہ بکری کے دو دانتے سے بہتر ہے۔‘‘

اس کی سند میں ابو ثفال المری ثمامہ بن وائل ضعیف ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق ایک روایت ہلال رحمہ اللہ سے مروی ہے:

« يَجُوْزُ الْجَذَعُ مِنَ الضَّأْنِ أُضْحِيَّةً »[ابن ماجه، كتاب الأضاحي:باب ما تجزي من الأضاحي

(۳۱۳۹)، مسند احمد (۳۶۸/۶)، بیہقی(۲۷۱/۹)، شرح مشکل الآثار(۵۷۲۳)]
''بھیڑ کا کم عمر بچہ قربانی کے لیے جائز ہے۔''

یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ام محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی مجہولہ ہے اور ام بلال بنت ہلال بھی اس روایت کے سوا کہیں معروف نہیں۔

اب رہی عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بکریاں دیں اور انھوں نے اپنے ساتھیوں پر تقسیم کر دیں تو بکری کا ایک سالہ بچہ باقی رہ گیا، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« ضَحِّ بِهِ اَنْتَ »[ابن ماجه، كتاب الأضاحي: باب ما تجزى من الأضاحي،(۳۱۳۸)، بخاری(۵۵۵۵)، مسلم (۱۹۶۵)، مسند طيالسي(۱۰۰۲)، مسند احمد(۵۳۸/۲۸)، سنن نسائي (۲۱۸/۷)، ابن حبان (۵۸۹۸)، بیهقی(۲۶۹/۹)، شرح السنة(۱۱۱۶)، مسند ابی عوانة(۲۱۱/۵)، ابن خزيمة (۲۹۱۶)]
''تو اس کی قربانی کر۔''

یہ حدیث عام نہیں ہے کہ ہر کسی کو اجازت ہو کہ وہ بکری کا ایک سالہ بچہ ذبح کر لے بلکہ یہ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی تخصیص کی دلیل یہ ہے کہ سنن بیہقی کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں:

« ضَحِّ بِهَا اَنْتَ وَ لَا اُرَخِّصُهُ لِاَحَدٍ فِيْهَا بَعْدُ » [السنن الكبرىٰ للبيهقي(۲۶۹/۹)]
''تو اسے قربان کر لے، اس میں کسی اور کے لیے میں رخصت نہیں دیتا۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ نے سنن بیہقی میں یوں باب قائم کیا ہے:

"بَابُ لَا يُجْزِئُ الْجَذَعُ اِلَّا مِنَ الضَّانِ وَحْدَهَا وَ يُجْزِئُ الثَّنِيُّ مِنَ الْمَعْزِ وَ الْاِبِلِ وَ الْبَقَرِ"
''کم عمر (کھیرا) صرف بھیڑ کا کفایت کرتا ہے بکری، اونٹ اور گائے میں (صرف) دو دانتا کفایت کرتا ہے۔''

لہٰذا بکری کا کھیرا صرف چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے خاص تھا، جن میں سے عقبہ بن عامر اور ابو بردہ رضی اللہ عنہما ہیں اور زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کا کھیرا قربانی کرنے کیلئے دیا تھا۔[مسند احمد (۲۰/۳۶)، ابن حبان (۵۸۹۹) مسند بزار(۳۷۷۶)، ابو داؤد(۲۷۹۸)، طبرانی کبیر(۲۴۲/۵)، بیہقی(۲۷۰/۹)]

یہ معاملات ابتدائی معلوم ہوتے ہیں، بعد میں شرع میں اس بات کا تقرر ہو گیا کہ بکری کا کھیرا قربانی کے لیے کفایت نہیں کرتا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ابو بردہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:

"وَ فِي الْحَدِيْثِ اَنَّ الْجَذَعَ مِنَ الْمَعْزِ لَا يُجْزِئُ وَ هُوَ قَوْلُ الْجُمْهُوْرِ" [فتح الباری(۱۵/۱۰)]
''اس حدیث میں دلیل ہے کہ بکری کا کھیرا قربانی کے لیے کفایت نہیں کرتا اور یہی جمہور علماء کا قول ہے۔''

قربانی کا جانور کیسا ہو؟

سوال قربانی کا جانور کیسا ہونا چاہیے؟

(جواب) نبی کریم ﷺ جب مینڈھا قربانی کرتے تو وہ خوبصورت موٹا تازہ ہوتا تھا جیسا کہ ابھی حدیث میں ہے کہ آپ نے دو سینگوں والے چتکبرے خصی مینڈھے ذبح کیے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا مینڈھا خرید کر لانے کا حکم دیا جو سینگوں والا ہو، جس کی ٹانگیں، پیٹ اور آنکھیں سیاہ ہوں۔[ابوداؤد ، کتاب الضحایا : باب ما یستحب من الضحایا (۲۷۹۲)، مسند احمد (۷۸/۶)]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ ایسا مینڈھا قربانی کیا کرتے تھے جو موٹا تازہ ہوتا، جس کی آنکھیں، ٹانگیں اور منہ سیاہ ہوتا۔[ابوداؤد ، کتاب الضحایا : باب ما یستحب من الضحایا (۲۷۹۶)]

جانور خریدتے وقت اس کے کان اور آنکھیں اچھی طرح دیکھ لینی چاہییں، علی رضی اللہ عنہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم (قربانی کا جانور خریدتے وقت) اس کی آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیں۔[ابن خزیمة (۲۹۱۴،۲۹۱۵)۔ مستدرك حاكم:(۴۶۷/۱، ۲۲۰/۴)، مسند ابی یعلی (۳۳۳)، مسند بزار (۱۲۰۳) ، مجمع الزوائد (۲۲/۴)]

براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ قربانی والے جانوروں میں کن عیوب سے بچنا ضروری ہے؟ تو آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا، چار عیوب ہیں:

① لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔

② جس کا بھینگا پن ظاہر ہو۔

③ بیمار جس کی بیماری عیاں ہو۔

④ لاغر و کمزور جس کے جسم میں چربی اور ہڈی میں گودا نہ ہو۔[ابوداؤد، کتاب الضحایا:باب مایکره من الضحایا (۲۸۰۲)]

علی رضی اللہ عنہ کی اوپر ذکر کردہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ ایسا جانور نہ لیا جائے جس کا کان سامنے یا پیچھے کی جانب سے کٹا ہوا ہو اور نہ ایسا جانور ہو جس کے کان لمبائی میں چیرے ہوئے ہوں یا جس کے کان میں گول سوراخ ہو۔ لہٰذا قربانی کا جانور موٹا تازہ ہونا چاہیے اور مذکورہ عیوب سے مبرا اور پاک ہونا چاہیے۔

اونٹ کی قربانی میں کتنے آدمی شریک ہوں؟

(سوال) کیا اونٹ کی قربانی میں دس آدمی شریک ہو سکتے ہیں؟

(جواب) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، عید الاضحیٰ آئی تو ہم گائے میں سات افراد اور اونٹ میں دس اشخاص شریک ہوئے۔[ترمذی، کتاب الاضاحی:باب فی الاشتراك فی الاضحية (۱۵۰۱)]

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے حدیبیہ کے سال سات سات آدمیوں کی طرف سے اونٹ اور گائے کو ذبح کیا۔
[ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب البقر والجزور عن كم تجزئ (۲۸۰۹)]

ان دونوں صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ میں سات حصے بھی ہو سکتے ہیں اور دس بھی، یہ شرعی سہولت ہے، اس پر

عمل کیا جا سکتا ہے۔

قربانی کا وقت

(سوال) قربانی کا صحیح وقت کونسا ہے؟ نماز عید سے پہلے قربانی کرنا کیسا ہے اور قربانی کتنے دن کی جا سکتی ہے؟ قرآن وسنت کی رو سے آگاہ فرمادیں۔

(جواب) قربانی کا وقت نماز عید کے بعد ہے۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَإِنَّمَا يَذْبَحُ لِنَفْسِهِ وَ مَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصَّلَاةِ فَقَدْ تَمَّ نُسُكُهُ وَ اَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ » [بخاری، کتاب الأضاحی: باب قول النبی لأبی بردة(٥٥٥٦)]

''جس نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کیا وہ اسے اپنے لیے ذبح کرتا ہے اور جس نے نماز کے بعد ذبح کیا اس کی قربانی پوری ہوگئی اور اس نے مسلمانوں کے طریقے کو اپنایا۔''

اور یہ وقت تیرہ ذوالحجہ کو غروب آفتاب تک رہتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ گیارہ، بارہ اور تیرہ ذوالحجہ کو ایام تشریق کہتے ہیں اور حدیث میں آتا ہے کہ ایام تشریق قربانی کے دن ہیں۔ سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« كُلُّ اَيَّامِ التَّشْرِيْقِ ذَبْحٌ »[فتح الباری (١٠/١١) نيل الاوطار(٥/١٢٥)، زاد المعاد(٢/٣١٨)]

''سارے ایام تشریق ذبح کے دن ہیں۔''

قربانی کے گوشت اور کھالوں کا مصرف

(سوال) قربانی کے گوشت اور کھالوں کا صحیح مصرف کیا ہے اور کیا کھال مجاہدین کو دینا درست ہے؟

(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ [الحج:٣٦]

''اور قربانی کے اونٹ ہم نے تمھارے لیے اللہ کی نشانیوں سے مقرر کیے ہیں، تمھارے لیے اس میں بھلائی ہے۔ تم ان پر اللہ کا نام لو۔ ایک پاؤں سے بندھے اور تین پاؤں سے کھڑے ہوں، پھر جب ان کے پہلو گر پڑیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور انھیں بھی کھلاؤ جو مانگتے نہیں اور جو مانگتے ہیں، ہم نے انھیں تمھارے لیے مطیع کردیا ہے تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کا ذکر کیا ہے جو حج وعمرہ کے موقع پر حرم میں کی جاتی ہے اور دوسری قربانی وہ ہے جو عید الاضحیٰ کے موقع پر تمام مسلمان اپنے گھروں میں کرتے ہیں۔ اس کے متعلق نبی کریم ﷺ کی حدیث ملاحظہ ہو:

سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ ضَحّٰى مِنْكُمْ فَلَا يُصْبِحَنَّ بَعْدَ ثَالِثَةٍ وَ بَقِيَ فِيْ بَيْتِهِ مِنْهُ شَيْءٌ فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! نَفْعَلُ كَمَا فَعَلْنَا الْعَامَ الْمَاضِيَ ؟ قَالَ كُلُوْا وَ اَطْعِمُوْا وَ ادَّخِرُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ الْعَامَ كَانَ بِالنَّاسِ جَهْدٌ فَاَرَدْتُ اَنْ تُعِيْنُوْا فِيْهَا » [بخاری، كتاب الأضاحی: باب ما يؤكل من تعليق لحوم الأضاحی و ما يتزود منها(٥٥٦٩)]

”جس نے تم میں سے قربانی کی ہے وہ تیسرے دن کے بعد اس حال میں صبح نہ کرے کہ اس کے گھر میں قربانی کے گوشت سے کوئی چیز باقی ہو۔“ آئندہ سال صحابہ نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! جس طرح ہم نے پچھلے سال کیا تھا کیا (اب بھی) اسی طرح کریں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم کھاؤ اور کھلاؤ اور ذخیرہ کرو۔ اس سال لوگوں کو مشقت تھی تو میں نے ارادہ کیا کہ تم اس میں سے ان کی مدد کرو۔“

مذکورہ بالا آیت کریمہ اور صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ قربانی کا گوشت آدمی خود بھی کھا سکتا ہے اور عزیز واقارب اور فقراء ومساکین کو بھی دے سکتا ہے اور جو مصرف قربانی کے گوشت کا ہے وہی مصرف قربانی کی کھال کا ہے یعنی قربانی کی کھال خود بھی استعمال کر سکتا ہے، عزیز واقارب کو بھی دے سکتا ہے اور صدقہ بھی کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

”عہد رسالت میں قربانی کے موقع پر اہل بادیہ کے کچھ گھر مدینہ آکر آباد ہو گئے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”تین دن کے لیے قربانی کا گوشت رکھ کر باقی صدقہ کر دو۔“ پھر اس کے بعد والے سال میں لوگوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! لوگ اپنی قربانیوں سے مشکیزے بناتے ہیں اور چربی پگھلاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بات کیا ہے؟“ تو انھوں نے کہا: ”آپ نے تین دن کے بعد قربانی کا گوشت کھانے سے منع کیا ہے۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے تمھیں صرف ان لوگوں کی خاطر منع کیا تھا جو باہر سے آکر یہاں رہنے لگے تھے، اب کھاؤ اور ذخیرہ کرو اور صدقہ کرو۔“ [مسلم ، كتاب الأضاحی :باب النهی عن أكل لحوم الأضاحی بعد ثلاث و نسخه(١٩٧١)]

اس صحیح حدیث سے واضح ہو گیا کہ جس طرح آدمی قربانی کا گوشت خود کھا سکتا ہے اسی طرح کھال بھی استعمال کر سکتا ہے، عزیز واقارب، دوست احباب کو دے سکتا ہے اور کھال کو صدقہ بھی کر سکتا ہے اور قرآن حکیم میں مصارف صدقات میں ”فی سبیل اللہ“ کی اصطلاح صحیح تفاسیر کی روشنی میں جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ لہٰذا کھال مجاہدین کو دینا بالکل جائز اور درست ہے۔

البتہ کھال یا گوشت بیچ کر خود اس کی رقم نہیں کھا سکتا اور اگر کھال صدقہ کر دے اور گوشت کا بھی زیادہ حصہ تقسیم کر دے تو یہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حج کے موقع پر اسی طرح کیا تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ اَمَرَہٗ اَنْ یَّقُوْمَ عَلٰی بُدْنِہٖ وَ اَنْ یَّقْسِمَ بُدْنَہٗ کُلَّھَا لُحُوْمَھَا وَ جُلُوْدَھَا وَ جِلَالَھَا» [بخاری، کتاب الحج: باب یتصدق بجلود الهدی (١٧١٧)]

''رسول اللہ ﷺ نے انھیں حکم دیا کہ وہ آپ کی قربانیوں کی نگرانی کریں اور تمام قربانیوں کے گوشت، چمڑے اور ان کے جھول تقسیم کر دیں۔''

جو لوگ کہتے ہیں کہ کھالیں صرف فقراء اور مساکین کا حق ہے انھیں چاہیے کہ وہ مذکورہ بالا احادیث کے مقابلے میں ایسی حدیث پیش کریں کہ جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو کہ کھالیں صرف فقراء اور مساکین کا حق ہیں، دوسرے کسی کا نہیں۔ وہ ایسی حدیث کبھی پیش نہیں کر سکتے۔

عورت کا قربانی کا جانور ذبح کرنا

سوال کیا عورت اپنا قربانی کا جانور خود ذبح کر سکتی ہے؟

جواب مسلمان عورت اگر جانور ذبح کرنے کا سلیقہ رکھتی ہو تو اپنی قربانی خود ذبح کر سکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ صحیح بخاری (قبل الحدیث: ٥٥٥٩) میں روایت لائے ہیں کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی قربانیاں خود ذبح کریں۔ یہ روایت مصنف عبدالرزاق، کتاب المناسک (٤/٣٨٩)، (٨١٦٩) میں بھی موجود ہے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث میں دلیل ہے کہ عورتیں جب اچھی طرح ذبح کر سکتی ہوں تو وہ اپنی قربانیاں خود ذبح کر سکتی ہیں۔'' [عمدۃ القاری (٢١/١٥٥)]

اسی طرح صحیح بخاری (٥٥٠٥) میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی عورتوں کے لیے جانور کا ذبح کرنا جائز معلوم ہوتا ہے۔ کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''ایک عورت نے پتھر کے ساتھ ایک بکری ذبح کر دی تو نبی ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اس کو کھانے کا حکم دیا۔'' اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ عورت کا ذبیحہ جائز و درست ہے۔

جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ لٹانا

سوال کیا جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ کرنا کسی حدیث سے ثابت ہے؟

جواب جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ کرنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ذبیحہ والے دن دو سینگوں والے چتکبرے خصی مینڈھے ذبح کیے، جب انھیں قبلہ رخ کیا تو آپ نے یہ دعا پڑھی:

((اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ عَلٰی مِلَّةِ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ

أُمِرْتُ وَ أَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَاُمَّتِهٖ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ))
پھر آپ نے انھیں ذبح کر دیا۔[سنن ابی داود، کتاب الضحایا : باب ما یستحب من الضحایا (۲۷۹۵)، ابن ماجه ، کتاب الاضاحی: (۳۱۲۱)، ابن خزیمة (۲۸۹۹)، مسند احمد (۳/ ۳۷۰)]
اس حسن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ کر لیا جائے۔

قربانی کا جانور خود ذبح کرنا

(سوال) کیا قربانی اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے؟
(جواب) قربانی کا جانور خود ذبح کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ خود اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کیا کرتے تھے۔
سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:
« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَحَرَ سَبْعَ بَدَنَاتٍ بِيَدِهٖ قِيَامًا وَ ضَحّٰى بِالْمَدِيْنَةِ بِكَبْشَيْنِ اَقْرَنَيْنِ اَمْلَحَيْنِ »[ابوداود، کتاب الضحایا: باب ما یستحب من الضحایا (۲۷۹۳)]
”نبی کریم ﷺ نے کھڑے سات اونٹ اپنے ہاتھ سے نحر کیے اور مدینہ میں دو سینگوں والے چتکبرے مینڈھے ذبح کیے۔“

سب اہل خانہ کی طرف سے ایک قربانی

(سوال) کیا تمام گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی جائز ہے؟
(جواب) ایک قربانی پورے گھر والوں کی طرف سے کفایت کر جاتی ہے۔
عطاء بن یسار رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قربانی کیسے ہوتی تھی؟ تو انھوں نے فرمایا:
”نبی کریم ﷺ کے زمانے میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک ایک قربانی کرتا تھا۔“
[ترمذی، کتاب الأضاحی: باب ما جاء ان الشاة الواحدة تجزئ عن اهل بیت (۱۵۰۵)]

میت کی طرف سے قربانی کرنا

(سوال) کیا میت کی طرف سے قربانی کی جا سکتی ہے؟
(جواب) میت کی طرف سے مستقل قربانی کرنے کی کوئی خاص دلیل موجود نہیں، البتہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت ہے کہ

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسا مینڈھا لانے کا حکم دیا جس کے ہاتھ، پاؤں، پیٹ اور آنکھیں سیاہ ہوں وہ آپ کے پاس قربانی کے لیے لایا گیا پھر آپ نے کہا اے عائشہ چھری لاؤ پھر آپ نے کہا اس کو تیز کرو، میں نے ایسا کیا پھر آپ نے چھری پکڑ لی اور مینڈھے کو ذبح کرنے کے لیے لٹا دیا پھر فرمایا: «بِاسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَمِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ» ''اللہ کے نام کے ساتھ اے اللہ! محمد، آل محمد اور امت محمد (ﷺ) کی طرف سے قبول فرما۔'' پھر اسے ذبح کردیا۔[صحیح مسلم ، کتاب الاضاحیٰ : باب استحباب استحسان الضحية وذبحها مباشرة بلا توكيل (١٩٦٧)]

یہ قربانی رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں کی، اس سے دلیل لی جاتی ہے کہ آپ نے یہ قربانی اپنی امت کی طرف سے بھی کی جب کہ آپ کے کئی امتی اس سے پہلے فوت ہو چکے تھے، اسی طرح جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کے پاس دو موٹے تازے، سینگوں والے چتکبرے خصی مینڈھے لائے گئے، آپ نے ان دونوں میں سے ایک کو لٹایا اور کہا: ''اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے، محمد (ﷺ) کی طرف سے اور محمد (ﷺ) کی امت میں سے جس نے تیری توحید کی گواہی دی اور میرے لیے پیغام پہنچانے کی شہادت دی اس کی طرف سے۔'' [مجمع الزوائد (٢٧/٤)، ارواء الغليل (٢٥١/٤)]

ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ قربانی کا ارادہ کرتے تو دو موٹے تازے سینگوں والے چتکبرے مینڈھے خریدتے، جب آپ نماز اور خطبہ سے فارغ ہو جاتے تو عیدگاہ ہی میں ان دو میں سے ایک مینڈھے کو لایا جاتا، آپ اسے ذبح کرتے اور کہتے: ''اے اللہ! یہ میری امت کے ان سب لوگوں کی طرف سے ہے جنھوں نے تیری توحید کی گواہی دی اور میرے پیغام پہنچانے کی شہادت دی۔'' پھر دوسرا مینڈھا لایا جاتا، آپ اسے ذبح کرتے اور فرماتے: ''اے اللہ! یہ محمد (ﷺ) اور آل محمد (ﷺ) کی طرف سے ہے۔'' آپ ان دونوں کے گوشت کو مسکینوں کو کھلاتے، خود بھی کھاتے اور اپنے گھر والوں کو بھی کھلاتے۔[مسند احمد (٣٩١/٦)، (٣٩٢) ، مسند بزار (١٢٠٨) ، مجمع الزوائد (٢١/٤، ٢٢)]

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے ان تمام لوگوں کی طرف سے قربانی کرتے تھے جو اللہ کی توحید اور آپ کے پیغام الٰہی پہنچانے کی شہادت دیتے تھے اور آپ کی امت میں آپ کی زندگی میں موجود اور فوت ہونے والے سب ہی شامل ہیں۔

نحر کرنے کا طریقہ

سوال نحر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب جانوروں کو ذبح کرنے کے رسول اللہ ﷺ نے دو طریقے بتائے ہیں، ان میں سے ایک تو وہ طریقہ ہے جو معروف ہے کہ جانور کو لٹا کر تکبیر کہہ کے اس کے گلے پر چھری پھیر دی جاتی ہے اور دوسرا طریقہ نحر کرنا ہے، یہ اونٹ کے ساتھ خاص ہے اگر کسی شخص نے اونٹ کی قربانی کرنی ہو تو اس کا سنت طریقہ نحر کرنے کا یہ ہے کہ اسے اس طرح کھڑا کریں کہ اس کی اگلی

بائیں ٹانگ کو ران کے ساتھ ملا کر باندھ دیں اور تین ٹانگوں پر کھڑا کر دیں پھر تکبیر پڑھ کر اس کے سینے اور گردن کی جڑ کے درمیان والے گڑھے میں نیزہ، خنجر یا تیز دھار والا کوئی آلہ ماریں جس سے اس کی شاہ رگ کٹ جائے۔[ملاحظہ ہو، مرعاۃ (۲۷۱۷-۱) لفتح الربانی (۱۳/ ۵۵، ۵۷)]

کیا پاکستانی قوم کو قربانی معاف ہے؟

سوال کیا پاکستانی قوم کو مقروض ہونے کی وجہ سے قربانی معاف ہے؟

جواب دین اسلام کے خلاف یہودی، عیسائی اور بے دین قومیں مختلف اوقات میں مختلف سازشوں کے جال بنتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے کہ ''قرض اتارو، ملک سنوارو'' سکیم میں بھرپور حصہ لینا چاہیے، اس کے بعد قربانی کرنی چاہیے۔ قربانی جیسی اہم سنت کو ایک سودی قرضے کے ذریعے ختم کرنا جرم عظیم ہے۔ یہ بات درست ہے کہ انسان اپنی ضروریات زندگی کے تحت قرض لے سکتا ہے۔ قرآن و سنت میں اس کی کئی ایک واضح نصوص موجود ہیں اور اس قرض کی ادائیگی کا بھی شریعت ہمیں حکم کرتی ہے لیکن سود پر قرض لینا یعنی قرض کے ساتھ زائد رقم کی ادائیگی حرام ہے۔

زمانہ جاہلیت میں قرض کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں سود در سود کی بنا پر اصل رقم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا حتیٰ کہ تھوڑی سی رقم بھی پہاڑ بن جاتی جس کی ادائیگی انتہائی گراں ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے اس نظام کے خاتمے کے لیے کئی ایک آیات نازل کیں جن میں اسے بالکل حرام قرار دے دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: ''اگر کوئی شخص تنگ دست و ضرورت مند ہے اور وہ قرض لیتا ہے تو اسے آسانی تک مہلت دے دو'' اگر قرض معاف کر دیا جائے تو اسے بہتر قرار دیا گیا۔ اس کی فضیلت میں بھی کئی ایک احادیث صحیحہ صریحہ موجود ہیں۔ سودی نظام اور اسلامی نظام میں بہت زیادہ فرق ہے، سودی نظام سراسر ظلم و زیادتی، سنگ دلی اور خود غرضی پر مبنی ہے کیونکہ سود لینے والا یہ نہیں دیکھتا کہ جسے رقم بطور قرض دی ہے، اس کی پوزیشن کیا ہے۔ اس کو تو اپنے متعین نفع سے غرض ہوتی ہے جبکہ دین اسلام دوستی، ہمدردی، تعاون اور ایک دوسرے کو سہارا دینے کا نظام ہے۔ مسلمان اس پر رحمت نظام کو نہ اپنائیں تو اس میں اسلام کا کیا قصور ہے؟

نواز شریف کی ''قرض اتارو، ملک سنوارو'' سکیم خالصاً اسی سودی نظام پر مشتمل ہے کیونکہ اصل رقم جس کی ادائیگی کرنی ہے، بہت تھوڑی ہے جب کہ اس پر سود در سود کی شکل میں کئی گنا زیادتی ہو چکی ہے۔ لہٰذا نواز شریف صاحب کو بحیثیت مسلم یہ اعلان کرنا چاہیے کہ ہم صرف اصل رقم واپس کریں گے۔ باقی سودی رقم ہم ادا نہیں کریں گے کیونکہ سود کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اور سود خور کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے والا قرار دیا ہے۔ سود کی حرمت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾

[آل عمران: ۱۳۰]

"اے ایمان والو! دگنا چوگنا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ امید ہے کہ فلاح پا جاؤ گے۔"

نبی مکرم ﷺ نے سود کی مذمت کرتے ہوئے اس پر لعنت کی ہے۔ جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اٰكِلَ الرِّبَا وَ مُوْكِلَهٗ وَ كَاتِبَهٗ وَ شَاهِدَيْهِ وَ قَالَ هُمْ سَوَاءٌ » [مسلم ، كتاب المساقاة، باب لعن آكل الربا و مؤكله (١٥٩٨)، مسند احمد (٣٠٤/٣)، ابو يعلى (١٨٤٩)، بيهقي(٢٧٥/٥)، شرح السنة (٥٤/٨)]

"رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت کی اور فرمایا یہ گناہ میں برابر ہیں۔"

سیدنا ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« رَاَيْتُ اَبِيْ اشْتَرٰى عَبْدًا حَجَّامًا فَاَمَرَ بِمَحَاجِمِهٖ فَكُسِرَتْ فَسَاَلْتُهٗ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الدَّمِ وَ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَكَسْبِ الْاَمَةِ وَ لَعَنَ الْوَاشِمَةَ الْمُسْتَوْشِمَةَ وَ اٰكِلَ الرِّبَا وَ مُوْكِلَهٗ وَ لَعَنَ الْمُصَوِّرَ » [بخاری ، كتاب البيوع: باب ثمن الكلب (٢٢٣٨)، مسند احمد (٣٠٨/٤، ٣٠٩)، مسند طيالسي (١٠٤٣) طبراني كبير (٢٩٥/٢٢،٢٩٦)، بيهقي (٦/٦)]

"میں نے اپنے باپ کو دیکھا انھوں نے ایک غلام خریدا جو حجام تھا۔ انھوں نے اس کے حجامت کے ہتھیار توڑ ڈالنے کا حکم دیا تو وہ توڑ دیے گئے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا: "نبی ﷺ نے خون کی قیمت، کتے کی قیمت، باندی کی (ناجائز) کمائی سے منع فرمایا ہے اور گودنے والی، گدوانے والی، سود کھانے اور کھلانے والوں پر لعنت کی اور تصویر بنانے والے پر بھی لعنت کی۔"

اسی طرح یہی حدیث سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سنن ابی داؤد (۳۳۳۳)، ترمذی (۱۲۰۶)، مسلم (۲۲۷۷)، مسند احمد (۳۹۳/۱، ۳۹۴، ۴۵۳، ۴۰۳)، مسند طیالسی (۳۴۳)، ابن حبان (۱۱۱۲) اور بیہقی (۲۷۵/۵) میں مروی ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ [البقرة:٢٧٥]

"جو لوگ سود کھاتے ہیں، ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہوتا ہے اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔"

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾
[البقرة: ٢٧٨، ٢٧٩]

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر واقعی ایمان لائے ہو، لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے تمھارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کرلو (اور سود چھوڑ دو) تو تم اپنا اصل سرمایہ لینے کے حق دار ہو، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

اس آیت کریمہ میں ایسی سخت وعید ہے جو کسی اور معصیت و نافرمانی کے ارتکاب پر وارد نہیں ہوئی۔ اسی لیے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''جو شخص اسلامی مملکت میں سود چھوڑنے پر تیار نہ ہو تو خلیفہ وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سے توبہ کرائے اور باز نہ آنے کی صورت میں اس کی گردن اڑا دے۔'' [تفسير ابن كثير (٤٤٢/١)، دارالسلام، الطبری (٢٥١٦)]

لیکن ہمارے ملک کی حالت اس سے بھی ابتر ہے، یہاں ایک فرد ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے حکمران خود سودی نظام کو برقرار رکھنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس سودی نظام میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ نکلنے کا نام بھی نہیں لیتے۔ حالانکہ نبی مکرم ﷺ جو ایک حکمران بھی تھے، انھوں نے سود کی حرمت کے ساتھ ہی سارا سودی نظام جو زمانہ جاہلیت سے تھا، یکسر ختم کر ڈالا۔ جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث جو آپ ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کے متعلق ہے، اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے اس آخری خطبے میں ارشاد فرمایا:

« إِنَّ كُلَّ رِبًا مِنْ رِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ وَ اَوَّلُ رِبًا أَضَعُهُ اَبَانَا رِبَا الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ »
[صحیح مسلم، کتاب الحج: باب حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم (١٢١٨)، مسند احمد (٧٣/٥)، المنتقى لابن الجارود (٤٦٨)، مؤطا، کتاب البيوع (٨٣)، ابن ماجه، (٣٠٧٤)، ابو داؤد (٢١٤٥)]

''یقیناً جاہلیت کا تمام سود چھوڑ دیا گیا ہے۔ پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں، وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے۔''

بلکہ مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے ساتھ فرمایا:

« لَكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ » [مسند احمد (٧٣/٥)، (٢٠٦٩٥)]

''تمھارے لیے اصل سرمایہ ہے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

یعنی اگر اصل زر سے زیادہ وصول کرو گے تو یہ تمھاری طرف سے ظلم ہوگا اور اگر تمھیں اصل زر بھی نہ دیا جائے تو یہ تم پر ظلم ہوگا۔

مذکورہ بالا صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی آدمی نے سود پر لین دین کیا ہو تو اسے سود کی حرمت معلوم ہونے پر سارا معاملہ ختم کر دینا چاہیے، صرف اپنا اصل سرمایہ لینا چاہیے۔

لہٰذا ہماری حکومت کو جہاد کا علم تھامتے ہوئے ان یہودی بینکوں کو صرف اصل رقم جو قرض لی ہے، اسے واپس کرنا چاہیے نہ کہ اس پر سود در سود کیونکہ کسی مسلم حکمران کو ایسے سودی نظام کی حمایت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اسے ختم کرنے کے لیے جہاد کرنا چاہیے۔ پوری قوم کو جو اسی سودی نظام میں جکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ انتہائی افسوس ناک ہے اور قوم کا بھی اتنی خطیر

رقم سود اتارنے کے لیے جمع کروانا سود پر تعاون ہے جو شرعاً حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [المائدة : ٢]

''نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں آپس میں تعاون کرو، گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔''

معلوم ہوا کہ اس سودی کام میں تعاون کرنا گناہ ہے اور اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ علاوہ ازیں یہودی بینکوں سے قرض جن سرمایہ داروں اور وڈیروں نے لیا ہے، حکومت کو چاہیے کہ ان خاندانوں کو پکڑے اور ان سے اصل رقم وصول کرے، غریب عوام کو اس کام میں ملوث کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

لہٰذا پوری قوم کو خواہ مخواہ مقروض قرار دے کر قربانی جیسی سنت جلیلہ سے محروم کرنا بھی دین اسلام کے خلاف سازش اور یہودیت کی حمایت ہے۔ ہر مسلم کو جو قربانی کرنا چاہتا ہے، اس سازش سے بچنا چاہیے اور سنت ابراہیمی کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔

عقیقہ کے مسائل

WWW. KITABOSUNNAT.COM

عقیقہ کی شرعی حیثیت

(سوال) کیا عقیقہ کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے؟ بعض لوگ اسے غیر مشروع کہتے ہیں۔

(جواب) مسلمانوں کے ہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسلام نے اس کے متعلق کچھ احکامات دیے ہیں جن میں سے ایک اہم مسئلہ عقیقہ کا بھی ہے۔ عقیقہ کے متعلق صحیح احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« كُلُّ غُلَامٍ رَهِينَةٌ بِعَقِيقَتِهِ تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ وَ يُحْلَقُ رَأْسُهُ » [ابوداود، كتاب الضحايا: باب في العقيقة (٢٨٣٧)، ترمذی (١٥٢٢)، بخاری (٥٤٧٢)، نسائی (٤٢١٩)، ابن ماجه (٣١٦٥)، مسند احمد (١٢،٧/٥)، دارمی (٨١/٢)]

"ہر لڑکا اپنے عقیقے کے ساتھ گروی ہے، اس کی طرف سے ساتویں دن ذبح کیا جائے اور اس کا سر منڈایا جائے۔"

گروی کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کی طرف سے عقیقہ نہ کیا جائے تو وہ قیامت والے دن سفارش نہیں کرے گا۔ [تحفة الأحوذی (٩٧/٥)]

② سیدنا سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَعَ الْغُلَامِ عَقِيقَةٌ فَأَهْرِيقُوا عَنْهُ دَمًا وَ أَمِيطُوا عَنْهُ الْأَذٰى » [بخاری، كتاب العقيقة: باب إماطة الأذى عن الصبي في العقيقة (٥٤٧٢)، مسند احمد (١٨/٤)، بيهقی (٢٩٨/٩)، ابو داود (٢٨٣٩)، ابن ماجه (٣١٦٤)، ابن خزيمة (٢٠٦٧)، مسند حميدی (٨٢٣)، دارمی (٨١/٢)]

"ہر لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے پس اس کی طرف سے خون بہاؤ یعنی عقیقہ کرو اور اس سے گندگی دور کرو۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کسی کے ہاں بچہ پیدا ہو تو اس کا عقیقہ کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے اور گندگی دور کرنے کا مطلب ہے کہ اس کا سر منڈایا جائے۔

③ ام کرز کعبیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافَئَتَانِ وَ عَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ » [ابوداود، كتاب الضحايا: باب في العقيقة (٢٨٣٤)، نسائی (٤٢٢١)، ترمذی (١٥١٤)، ابن ماجه (٣١٦٢)، ابن حبان (١٠٦٠)، دارمی (٨١/٢)، مسند حميدی (٣٤٥)، مسند احمد (٤٢٢/٦)]

''لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ذبح کی جائیں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔''

④ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَمَرَهُمْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ وَ عَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ »
[ترمذی، کتاب الضحایا: باب ما جآء فی العقیقة(١٥١٣)، ابن ماجه(٣١٦٣)، مسند احمد (٣١/٦)]

''یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں برابر ایک جیسی ذبح کی جائیں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔''

⑤ حضرت ابو بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« كُنَّا فِي الْجَاهِلِيَّةِ اِذَا وُلِدَ لِاَحَدِنَا غُلَامٌ ذَبَحَ شَاةً وَ لَطَخَ رَاْسَهُ بِدَمِهَا فَلَمَّا جَاءَ اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ كُنَّا نَذْبَحُ شَاةً وَ نَحْلِقُ رَاْسَهُ وَ نَلْطَخُهُ بِزَعْفَرَانٍ »[ابوداود، کتاب الضحایا: باب فی العقیقة (٢٨٤٣)، بیهقی(٣٠٢/٩)]

''زمانہ جاہلیت میں جب ہمارے ہاں کسی کے گھر لڑکا پیدا ہوتا تو وہ ایک بکری ذبح کرتا اور اس کے خون سے بچے کا سر رنگتا، جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت دی تو ہم بکری ذبح کرتے اور اس کا سر مونڈتے اور اسے زعفران مل دیتے۔''

⑥ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّ الْيَهُوْدَ تَعُقُّ عَنِ الْغُلَامِ كَبْشًا وَ لَا تَعُقُّ عَنِ الْجَارِيَةِ فَعُقُّوْا وَ اذْبَحُوْا عَنِ الْغُلَامِ كَبْشَيْنِ عَنِ الْجَارِيَةِ كَبْشًا » [بیهقی(٣٠٢/٩)،مسند بزار(١٢٣٣)، کشف الأستار]

''بیشک یہودی لڑکے کی طرف سے ایک مینڈھا ذبح کرتے اور لڑکی کا عقیقہ نہیں کرتے، لیکن تم عقیقہ کرو اور لڑکے کی طرف سے دو مینڈھے اور لڑکی کی طرف سے ایک مینڈھا ذبح کرو۔''

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ابو حفص الشاعر اور اس کے باپ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔ [مجمع الزوائد(٥٨/٣)] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے عقیقہ کے متعلق ایک صحیح حدیث بھی مروی ہے جس کے راویوں کو علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے صحیح کے راوی کہا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَعَ الْغُلَامِ عَقِيْقَةٌ فَاَهْرِيْقُوْا عَنْهُ دَمًا وَ اَمِيْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰى »[مسند بزار(١٢٣٦)، کشف الأستار]

''ہر لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے، اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس سے اذیت دور کرو۔''

⑦ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیقہ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ عقوق پسند نہیں کرتا۔'' گویا کہ آپ نے یہ نام ناپسند کیا اور فرمایا:

« مَنْ وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ فَاَحَبَّ اَنْ يَّنْسُكَ عَنْهُ فَلْيَنْسُكْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ وَ عَنِ الْجَارِيَةِ

شَاۃٌ » [ابو داود، کتاب الضحایا: باب فی العقیقۃ(۲۸۴۲)، نسائی(۴۲۲۳)، بیھقی(۹/۳۰۰)]
''جس کے ہاں بچہ پیدا ہو وہ اس کی طرف سے پسند کرے تو قربانی کرے، لڑکے کی طرف سے دو برابر عمر کی بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔''
امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
'' لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْعُقُوْقَ ''(اللہ عقوق پسند نہیں کرتا) حدیث کے اس جملے میں عقیقے کی توہین نہیں ہے اور نہ اس کے وجوب کو گرانا مقصود ہے صرف آپ نے نام کو ناپسند کیا ہے اور یہ پسند کیا ہے کہ اس کا اس سے بہتر کوئی نام ہو جیسے نسیکہ یا ذبیحہ وغیرہ۔''

⑧ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:
« اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ عَقَّ عَنْ نَفْسِہٖ بَعْدَ مَا بُعِثَ نَبِیًّا » [مسند بزار(۱۲۳۷)، کشف الأستار، عبد الرزاق(۷۹۶۰)، طبرانی أوسط (۱/۵۲۹)،(۹۹۸)]
''بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مبعوث ہونے کے بعد اپنی طرف سے عقیقہ کیا۔''
مسند بزار کی سند میں عبد اللہ بن المحرر ہے، جس کے متعلق امام بزار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ انتہائی کمزور ہے، اس کی وہ روایت لکھی جاتی ہے جو اس کے علاوہ کسی کے پاس نہ پائی جائے۔''
مجمع الزوائد میں علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: '' اسے امام بزار اور امام طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور طبرانی کے راوی صحیح کے راوی ہیں سوائے ہیثم بن جمیل اور وہ ثقہ ہے اور طبرانی کے شیخ احمد بن مسعود الخیاط المقدسی کا ترجمہ میزان میں نہیں ہے۔''
مجمع الزوائد کے محقق علامہ عبد اللہ محمد الدرویش فرماتے ہیں: '' احمد بن مسعود کا ترجمہ مختصر طور پر ابن عساکر کی تاریخ دمشق میں موجود ہے۔'' [دیکھیے: سیر أعلام النبلاء(۱۳/۲۴۴)، بغیۃ الرائد فی تحقیق مجمع الزوائد(۴/۹۴)]

⑨ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:
« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَ الْحُسَیْنِ کَبْشًا کَبْشًا » [ابوداود، کتاب الضحایا: باب فی العقیقۃ (۲۸۴۱)، ابن الجارود(۹۱۱)، نسائی(۴۲۲۴)، عبد الرزاق (۴/۳۳۰)، مشکل الآثار (۱/۴۵۷)، طبرانی کبیر(۱۱۸۳۸)، بیھقی(۲/۲۹۹)، حلیۃ الأولیاء(۷/۱۱۶)]
'' بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے عقیقے میں ایک ایک مینڈھا ذبح کیا۔''
سنن نسائی کی روایت میں ہے: '' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے دو دو مینڈھے ذبح کیے۔''
علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [صحیح نسائی(۳۹۳۵)، إرواء الغلیل(۴/۳۷۹)]

⑩ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَ الْحُسَیْنِ بِکَبْشَیْنِ » [مجمع الزوائد (٦١٨٨)، مسند بزار(١٢٣٥)، کشف الأستار، مسند ابی یعلی(٢٩٤٥)، بیهقی (٢٩٩/٩)، المطالب العالیة (٢٢٦١)، ابن حبان(١٠٦١)، طبرانی الأوسط (١٨٩٩)، إرواء الغلیل (٣٨١/٤) اس کی سند میں قتادہ مدلس ھے۔]

''بے شک رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے دو مینڈھے عقیقہ کیے۔''

⑪ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَ الْحُسَیْنِ » [مسند ابی یعلی(١٩٣٣)، مجمع الزوائد(٦١٨٧)]

''بے شک رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے عقیقہ کیا۔''

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس کے راوی ثقہ ہیں لیکن اس کی سند میں ابو الزبیر مدلس ہے۔''

⑫ سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

« اَلْعَقِیْقَۃُ حَقٌّ عَلَی الْغُلَامِ شَاتَانِ مُکَافَئَتَانِ وَ عَنِ الْجَارِیَۃِ شَاۃٌ » [مجمع الزوائد(٦١٨٦)، مسند احمد (٤٥٦/٦)، طبرانی کبیر(١٨٣/٢٤)، علامہ ھیثمی رحمہ اللہ فرماتے ھیں کہ اس کے راوی قابل حجت ھیں۔]

''عقیقہ حق ہے لڑکے کی طرف سے دو برابر بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔''

مندرجہ بالا احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ بچے کی ولادت پر عقیقہ کرنا اسلامی احکامات کا حصہ ہے اور اس کے متعلق نبی ﷺ نے حکم فرمایا ہے۔ عقیقے کی مشروعیت پر ائمہ محدثین کا اتفاق ہے، صرف اس کے مسنون یا واجب ہونے میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔

لہٰذا بعض جدید مفکرین اور نام نہاد دانش وروں نے جو اس کی مشروعیت کا انکار کیا ہے یہ اسلامی احکامات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے یا پھر تجاہل عارفانہ۔ بہر کیف احادیث رسول اس کی مشروعیت پر بالکل واضح ہیں اور اس پر امت مسلمہ کا مسلسل عمل چلا آ رہا ہے۔

عقیقہ کے لیے اونٹ اور گائے ذبح کرنا

سوال کیا عقیقہ کے لیے بکرے اور چھترے ذبح کرنا ضروری ہے، گائے یا اونٹ سے عقیقہ نہیں کیا جا سکتا؟

جواب عقیقہ کے بارے میں مسنون یہ ہے کہ بکرے، چھترے ذبح کیے جائیں، اونٹ یا گائے ذبح نہ کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں گائے اور اونٹ کثیر تعداد میں موجود تھے۔ نبی ﷺ نے نہ اونٹ اور گائے کا عقیقہ کیا اور نہ اس

میں عقیقہ کے لیے حصہ ڈالا۔ اگر یہ چیز مشروع ہوتی تو نبی ﷺ سے اس کی ضرور رخصت مل جاتی۔ آپ ﷺ نے عقیقہ میں مینڈھے ذبح کیے۔ جیسا کہ گزشتہ مسئلہ میں مذکور صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔

علاوہ ازیں معجم طبرانی کی جس روایت میں مذکور ہے کہ اونٹ اور گائے کے ساتھ بھی عقیقہ کیا جا سکتا ہے، وہ من گھڑت اور موضوع ہے۔ اس کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ وُلِدَ لَهُ غُلَامٌ فَلْيَعُقَّ مِنَ الْإِبِلِ أَوِ الْبَقَرِ أَوِ الْغَنَمِ »[طبرانی صغیر(٢٢٩)، مجمع الزوائد(٦١٩٥)]

''جس کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہو تو وہ اونٹ یا گائے یا بکری سے عقیقہ کرے۔''

اس روایت کی سند میں درج ذیل علل ہیں:

① امام طبرانی کے استاد ابراہیم بن احمد بن مروان الواسطی کے بارے میں امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ راوی قوی نہیں ہے۔'' [لسان المیزان(٤١/١)، میزان الاعتدال(١٣٣/١)، المغنی فی الضعفاء (١٥/١)، تاریخ بغداد (٥/٦)، تاریخ اسلام للذهبی(رقم الترجمة/١٠٨)]

② عبدالملک بن معروف الخیاط الواسطی غیر معروف ہے اور کتب رجال میں اس کا ترجمہ موجود نہیں۔ شیخ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ غیر معروف ہے اور کتب رجال میں اس کا ترجمہ بھی موجود نہیں۔'' [إرواء الغليل (٣٩٤/٤)]

③ مسعدہ بن الیسع الباہلی کذاب راوی ہے۔ علامہ ہیثمی مجمع الزوائد میں اس روایت کے بعد فرماتے ہیں: ''اس کی سند میں مسعدہ بن الیسع ہے اور وہ کذاب ہے۔'' علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ ہلاک کرنے والا ہے۔'' امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس کی تکذیب کی ہے۔ امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہم نے لمبے عرصے سے اس کی روایت کو پھاڑ دیا ہے۔'' [میزان الاعتدال(٩٨/٤)، لسان المیزان(٦٩١/٦)]

④ حریث بن سائب التمیمی الہلالی البصری راوی مختلف فیہ ہے۔ امام ابو حاتم رازی نے اسے ضعیف الحدیث کہا ہے۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں: ''یہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔'' اور ساجی نے کہا: ''یہ ضعیف ہے۔'' جب کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صدوق يخطىء۔'' یحییٰ نے ثقہ کہا ہے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اسے کتاب الثقات میں درج کیا ہے۔ [تحریر تقریب التهذیب(٢٦٢/١)]

⑤ حسن بصری مدلس ہیں اور ان کی روایت معنعن ہے اور مدلس راوی کے بارے میں یہ قاعدہ اصول حدیث میں موجود ہے کہ جب تک وہ اپنے استاد سے حدیث سننے کی وضاحت نہ کرے تب تک اس کی روایت صحیح نہیں ہوتی۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: '' ہم مدلس راوی سے حدیث قبول نہیں کرتے حتیٰ کہ وہ اپنی حدیث میں "حدثنی" یا "سمعت" کہے۔''

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ سند ساقط ہے اور اول سے آخر تک اس میں علل قادحہ ہیں اور سب سے قوی علت مسعدہ بن الیسع کا کذاب ہونا ہے۔ کذاب راوی کی حدیث موضوع قرار دی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ روایت جعلی اور من گھڑت ہے اس

سے استدلال کرنا درست نہیں اور اس روایت کا غلط ہونا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے جس میں مذکور ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا:

« عَقِّي عَنْهُ جَزُوْرًا فَقَالَتْ مَعَاذَ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ مَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ » [بيهقى(٩/٣٠١)]

''اس کی طرف سے ایک اونٹ عقیقہ کرو۔'' انھوں نے کہا: ''معاذ اللہ لیکن جو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''دو بکریاں ایک جیسی۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ [إرواء الغليل(٤/٣٩٠)]

مذکورہ بالا دلائل سے واضح ہو گیا کہ گائے اور اونٹ عقیقہ میں ذبح نہیں کیے جائیں گے۔ عقیقہ میں مسنون بھیڑ بکریاں ذبح کرنا ہی ہیں اور ان کی قلت بھی نہیں ہے۔

عقیقہ کے موقع پر رسم مہندی

سوال کیا عقیقہ کے موقع پر مہندی لگانا احادیث سے ثابت ہے؟

جواب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عبادات و معاملات میں رسول اکرم ﷺ کا اسوہ اپنانے کا پابند بنایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا عقیقہ کیا لیکن اس موقع پر آپ ﷺ کی خواتین اور دیگر صحابیات کے بارے میں کہیں بھی یہ بات ثابت نہیں کہ انھوں نے مہندی، گانا بجانا، طبلے سارنگیاں وغیرہ جیسی محرمات کا ارتکاب کیا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک رسم ہے اور اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ عقیقہ کا صحیح ثواب تب ملے گا جب اسے سنت رسول کے مطابق کیا جائے۔ حدیث نبوی ہے:

« مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ » [مسلم، كتاب الأقضية: باب نقض الأحكام الباطلة و رد محدثات الأمور(١٧١٨)]

''جس نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں تو وہ مردود ہے۔''

لہٰذا ایسا عمل کبھی اللہ کے ہاں درجہ قبولیت تک نہیں پہنچتا جو شرع کے خلاف ہو اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے بعید ہو۔

کھانے پینے کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

مسلمان کا اہل کتاب کے ساتھ کھانا

(سوال) کیا مسلمان اہل کتاب سے لے کر یا ان کے ساتھ بیٹھ کر کوئی چیز کھا سکتا ہے؟

(جواب) اہل کتاب عیسائیوں اور یہودیوں سے کوئی چیز لے کر کھانا اور ان کیساتھ بیٹھ کر کھانا جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ﴾ [المائدة:٥]

''اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا: ''اہل کتاب کی پاک دامن عورتوں سے نکاح تمھارے لیے حلال ہے۔'' اور ظاہر ہے کہ بیوی کھانا بھی پکائے گی اور اس کے ساتھ مل کر کھانا کھایا بھی جائے گا۔ البتہ ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: ''ہم اہل کتاب کی ہمسائیگی میں رہتے ہیں، وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر پکاتے ہیں اور اپنے برتنوں میں شراب پیتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''اگر تمھیں ان کے علاوہ برتن مل جائیں تو ان میں کھاؤ اور اگر ان کے علاوہ نہ ملیں تو ان کو پانی سے دھولو اور ان میں کھالو۔'' [ابو داود، كتاب الأطعمة: باب في استعمال آنية أهل الكتاب(٣٨٣٩)، إرواء الغليل(١/٧٥)]

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرکہ عورت کا مشکیزہ لے کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرمایا: ''خود بھی پیو اور جانوروں کو بھی پلاؤ۔'' [بخاری، كتاب التيمم: باب الصعيد الطيب وضوء المسلم(٣٤٤)]

اس حدیث پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ مشرکین کے برتنوں میں اگر نجاست نہ ہو اور اس کا یقین ہو تو ان کا استعمال جائز ہے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ کسی بھی غیر مسلم سے کھانے کی چیز لے کر کھانا (جس میں نجاست نہ ہونے کا یقین ہو) جائز ہے۔ البتہ ذبیحہ صرف اہل کتاب کا جائز ہے، مشرکین کا ذبیحہ جائز نہیں۔ کفار سے لی ہوئی عام اشیاء اگر ان کے پاک ہونے کا یقین نہ ہو تو انھیں کھانا جائز نہیں۔ وہ برتن ضرورت کے وقت دھونے کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں۔

لہسن کھایا جا سکتا ہے

(سوال) نبی ﷺ نے لہسن کھا کر مسجد جانے سے منع فرمایا ہے تو کیا یہ حرام ہے جبکہ بعض علماء اسے حرام قرار دیتے ہیں؟

(جواب) حدیث نبوی ﷺ ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَهٰى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ اَكْلِ الثُّوْمِ وَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ » [بخاری، کتاب المغازی: باب غزوة خيبر(٤٢١٥)]

''نبی کریم ﷺ نے خیبر کے دن پالتو گدھوں کے گوشت اور لہسن کھانے سے منع فرمادیا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے لہسن کھانے سے روکا ہے لیکن نبی کریم ﷺ کا یہ روکنا اس کے حرام ہونے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ جبریل علیہ السلام سے ملاقات کرتے تھے اور فرشتوں کو اس کی بو سے تکلیف ہوتی تھی تو نبی کریم ﷺ نے یہ پسند نہ کیا کہ میں ان کو تکلیف دوں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

''رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاں مہمان بنے تو آپ اپنا بچا ہوا کھانا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو بھیج دیتے۔ ایک مرتبہ آپ نے سارا کھانا واپس کر دیا اور اس میں سے کچھ بھی نہ کھایا...... ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس میں لہسن ہے۔'' تو ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا یہ حرام ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَا وَ لٰكِنِّیْ اَكْرَهُهُ مِنْ اَجْلِ رِيْحِهِ » [ترمذی، ابواب الأطعمة: باب ما جاء فی کراهية أكل الثوم والبصل (١٨٠٧)]

''نہیں، حرام نہیں بلکہ میں اس کی بو کی وجہ سے اسے ناپسند کرتا ہوں۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا:

« كُلُوْهُ فَاِنِّیْ لَسْتُ كَاَحَدِكُمْ اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ اُوْذِیَ صَاحِبِیْ » [ترمذی، ابواب الأطعمة: باب ماجاء فی الرخصة فی أكل الثوم مطبوخا(١٨١٠)]

''تم اسے کھالو، میں تم جیسا نہیں ہوں (یعنی میرے پاس جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے ہیں) مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے ساتھی (یعنی جبرائیل علیہ السلام) کو تکلیف نہ پہنچا دوں۔''

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے حرام نہیں کیا بلکہ صحابہ کو کھانے کے لیے بھی کہا اور اپنے لیے صرف اس لیے ناپسند کیا کہ اس میں بو ہے اور امت کو بھی روک دیا کہ کچا لہسن کھا کر مسجد میں نہ آئیں کیونکہ فرشتے بھی با جماعت نماز کے لیے حاضر ہوتے ہیں تو انھیں ان کی بو سے تکلیف ہوتی ہے یا نماز کے وقت سے اتنی دیر پہلے کھالے کہ نماز کے وقت تک اس کی بو جاتی رہے۔ جیسا کہ سنن ابی داؤد کی حدیث میں ہے:

« مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا يَقْرَبْنَا حَتّٰى يَذْهَبَ رِيْحُهَا اَوْ رِيْحُهُ »[ابوداود، کتاب الأطعمة باب فی اکل الثوم(٣٨٢٦)]

''جو اس (لہسن کے) درخت سے کھائے وہ اس وقت تک ہمارے پاس نہ آئے جب تک اس کی بو ختم نہیں ہو جاتی۔''

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« مَنْ اَكَلَهُمَا فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا وَ قَالَ اِنْ كُنْتُمْ لَا بُدَّ آكِلِيهِمَا فَاَمِيْتُوْهَا طَبْخًا »[ابو داود، كتاب الأطعمة: باب في أكل الثوم(٣٨٢٧)]

''جو شخص ان دونوں (یعنی لہسن اور پیاز) کو کھالے وہ ہماری مسجد کے قریب تک نہ آئے'' اور فرمایا:'' اگر تم اس کو ضرور کھانا چاہتے ہو تو پکا کر ان کی بو ختم کرلو۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہے:

« نُهِيَ عَنْ اَكْلِ الثُّوْمِ اِلَّا مَطْبُوْخًا » [ابوداؤد، كتاب الأطعمة : باب في كراهية ذم الطعام(٣٧٦٣)]

''لہسن کھانے سے منع کیا گیا ہے سوائے پکے ہوئے کے۔''

ان تمام احادیث سے پتا چلتا ہے کہ صحیح بخاری کی حدیث میں جو ممانعت ہے وہ اس کے حرام ہونے کی وجہ سے نہیں، صرف بو کی وجہ سے ہے اور اگر پکا کر بو ختم ہوجائے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں اور عام آدمی ایسے وقت میں استعمال کرسکتا ہے جب نماز کا وقت ابھی دور ہو اور نماز کے وقت تک اس کی بو ختم ہوسکتی ہو۔

برائلر مرغی کا گوشت حلال ہے یا حرام

سوال کیا برائلر مرغی کا گوشت حلال ہے یا حرام؟

جواب برائلر مرغی کے گوشت کو اس وجہ سے حرام نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی خوراک خون اور مردار وغیرہ سے تیار ہوتی ہے۔ اسے سمجھنے سے پہلے دو باتیں سمجھنا بہت ضروری ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حلت اور حرمت ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ جن کا تعلق انسان کے ذوق اور مزاج کے ساتھ ہو۔ جسے انسانی ذوق چاہے اس کو حلال اور جسے چاہے حرام سمجھ لے بلکہ یہ آسمانی شریعت ہے جس کا خالق کائنات نے اپنے بندوں کو مکلف بنایا ہے۔ اس لیے حلال وہی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر حلال کردیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴾[النحل:١١٦]

''اور اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے یہ مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تا کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھو یقیناً وہ کامیاب نہیں ہوں گے جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔''

دوسری بات یہ ہے کہ حلال اور حرام عقل کے تابع نہیں اور نہ قیاسات اور مادی وسائل ہی سے ان کا اثبات کیا جا سکتا ہے اور جو لوگ اسے مادی وسائل اور عقل کے تابع بناتے ہیں وہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے کے گوشت کو حلال قرار دیا ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے اور خچر کو

حرام قرار دیا ہے۔ یہ دونوں جانور شکل وصورت میں، کھانے پینے اور پیدائش میں ایک دوسرے کی مشابہت رکھتے ہیں البتہ شکل میں تھوڑا فرق پایا جاتا ہے۔ اسی طرح گھریلو گدھا اور جنگلی گدھا دونوں کو شریعت میں حمار(گدھا) کہا گیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مشابہت بھی رکھتے ہیں، اس کے باوجود گھریلو گدھے کا گوشت حرام ہے اور جنگلی گدھے کا گوشت حلال ہے۔ اگر اہل علم اور ان اشیاء کے سپیشلسٹ گھوڑے اور جنگلی گدھے کے حلال ہونے میں اور خچر اور گھریلو گدھے کے حرام ہونے میں فرق معلوم کرنے کی کوشش کریں تو ہرگز شرعی علت تک نہ پہنچ سکیں گے حالانکہ یہ اشیاء مادی اور حسی وسائل کے لحاظ سے ایک ہی چیز شمار ہوتی ہیں۔ کون ہے جو مادی لحاظ سے ان کی حلت اور حرمت کی علت بیان کر سکے؟ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حلال اور حرام آسمانی شریعت ہے، مادی، حسی اور عقلی وسائل کے تابع نہیں۔ یہ دونوں باتیں ذہن نشین کرنے کے بعد اب جواب کی طرف آیئے۔ قرآن مجید اور سنت نبوی (ﷺ) میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے برائکر مرغی کا حرام ہونا ثابت ہو سکے بلکہ حدیث سے مرغی کا حلال ہونا ثابت ہے، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَأْكُلُ دَجَاجًا» [صحيح بخارى، كتاب الذبائح و الصيد: باب لحم الدجاج (٥٥١٧)]

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو مرغی کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا۔''

یہ حدیث صحیح مسلم، دارمی، بیہقی اور مسند احمد میں بھی ہے۔ امام بخاری نے اس پر باب باندھا ہے: '' باب لحم الدجاج'' اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی ایسا ہی باب باندھا ہے: ''باب ما جاء في اكل الدجاج''

نبی مکرم ﷺ تو پاکیزہ کھانا ہی کھاتے تھے اور ایسے کھانے کے قریب تک نہیں جاتے تھے جس میں کراہت ہو۔ نبی مکرم ﷺ کا مرغی کا گوشت کھانا اس کے حلال ہونے کی واضح دلیل ہے، اس کے بعد کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ مرغی کے گوشت کو حرام قرار دے، صرف اس شبہ سے کہ اس کی خوراک میں حرام چیزیں استعمال ہوتی ہیں، کیونکہ حلت اور حرمت میں جانور کی غذا کا اعتبار نہیں، بلکہ شریعت کا اعتبار ہے۔ کیونکہ بعض جانور ایسے ہیں کہ جن کی خوراک پھل، سبزیاں اور حلال اشیاء ہیں اس کے باوجود وہ حرام ہیں مثلاً گیدڑ، بندر وغیرہ، ایسے جانوروں کو کھانا ہرگز حلال نہیں حالانکہ ان کی خوراک پاکیزہ ہوتی ہے مگر شریعت نے انھیں حرام قرار دیا ہے۔

اگر حرام اور حلال ہونے کی علت جانور کے کھانے (خوراک) کو تسلیم کرلیں کہ جس کی خوراک پاک اور حلال ہوگی اس کا گوشت حلال اور جس کی خوراک نجس اور حرام ہوگی اس کا گوشت حرام ہوگا تو فرض کریں کہ کوئی شخص خنزیر کے بچے کو پیدائش ہی سے گھر میں پالتا ہے اسے حلال اور پاک غذا مہیا کرتا ہے تو کیا وہ حلال ہو جائے گا؟ اگر اس بارے میں کوئی شخص اپنی عقل کو فیصل مانے گا تو اس کے مطابق تو حلال ہوگا کیونکہ اس نے کبھی حرام اور نجس چیز کھائی ہی نہیں اور اپنا فیصلہ اگر شریعت کی طرف لے جائے گا تو پھر یہ حرام ہوگا۔

ان تمام دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ حلت و حرمت میں جانور کی خوراک کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ شریعت کا اعتبار ہوگا۔

شبہ کا رد:

جولوگ برائلر مرغی کو حرام قرار دیتے ہیں وہ اسے جلالہ پر قیاس کرتے ہیں جسے نبی مکرم ﷺ نے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

« نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَنْ اَكْلِ الْجَلَّالَةِ وَ اَلْبَانِهَا »[ابو داؤد ، كتاب الأطعمة: باب النهى عن أكل الجلالة (٣٧٨٥)، ترمذى(١٨٢٤) ، ابن ماجه(٣١٨٩)]

"نبی کریم ﷺ نے جلالہ کے کھانے سے اور ان کے دودھ سے منع کیا ہے۔"

اس حدیث سے جلالہ کی قطعی حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے استعمال سے اس وقت تک روکا گیا ہے جب تک کہ اس گندی خوراک کی بد بو زائل نہ ہو جیسا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صحیح اثر سے ثابت ہے:

« اِنَّهٗ كَانَ يَحْبِسُ الدَّجَاجَةَ الْجَلَّالَةَ ثَلَاثًا »[ابن ابى شيبة ، كتاب الأطعمة: باب فى لحوم الجلالة (٢٤٥٩٨)]

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جلالہ مرغی کو تین دن بند رکھتے تھے (پھر استعمال کر لیتے تھے)۔"

علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔[ارواء الغليل (١٥١/٨، ٢٥٠٥)]

یہ صرف اس لیے کرتے تھے تاکہ اس کا پیٹ صاف ہو جائے اور گندگی کی بو اس کے گوشت سے جاتی رہے۔

اگر جلالہ کی حرمت گوشت کی نجاست کی وجہ سے ہوتی تو وہ گوشت جس نے حرام پر نشوونما پائی ہے کسی بھی حال میں پاک نہ ہوتا۔ جیسا کہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے کہا ہے:

" وَ لَوْ نَجِسَتِ الْجَلَّالَةُ لَمَا طَهُرَتْ بِالْحَبْسِ " [المغنى (٤١/٩)]

"اگر جلالہ نجس ہوتی تو وہ تین دن بند کرنے سے بھی پاک نہ ہوتی۔"

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس صحیح اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ جلالہ کی حرمت اس کے گوشت کا نجس اور پلید ہونا نہیں بلکہ علت اس کے گوشت سے گندگی کی بدبو وغیرہ کا آنا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ الْمُعْتَبَرُ فِيْ جَوَازِ اَكْلِ الْجَلَّالَةِ زَوَالُ رَائِحَةِ النَّجَاسَةِ اِنْ تُعْلَفُ بِالشَّيْءِ الطَّاهِرِ عَلَى الصَّحِيْحِ " [فتح البارى(٥٦٥/٩)]

"جلالہ کا کھانے کے لائق ہونے میں معتبر چیز نجاست وغیرہ کی بدبو کا زائل ہونا ہے۔ یعنی جب بدبو زائل ہو جائے تو اس کا کھانا درست ہے۔"

علامہ صنعانی رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں:

" قِيْلَ بَلِ الْاِعْتِبَارُ بِالرَّائِحَةِ وَالنَّتْنِ "

"جلالہ کے حلال ہونے میں بدبو کے زائل ہونے کا اعتبار کیا جاتا ہے۔" [سبل السلام(٧٧/٣)]

جلالہ کے بارے میں اہل لغت کے اقوال جان لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اکثر اہل لغت نے لکھا ہے:

" اَلْجَلَّالَةُ هِيَ الْبَقَرَةُ الَّتِي تَتَّبِعُ النَّجَاسَاتِ "

" جلالہ وہ گائے ہے جو نجاسات کو تلاش کرتی ہے۔" [لسان العرب(۳۳۶/۲)، الصحاح للجوهری (۱۶۵۸/٤)، القاموس المحيط(۱/ ۵۹۱)]

ابن منظور الافریقی لکھتے ہیں:

" وَ الْجَلَّالَةُ مِنَ الْحَيَوَانِ الَّتِي تَأْكُلُ الْجُلَّةَ الْعَذِرَةَ " [لسان العرب(۳۳۶/۲)]

" جلالہ وہ حیوان ہے جو انسان کا پاخانہ وغیرہ کھاتا ہے۔"

اس قول کے مطابق برائلر مرغی جس کو لوگ حرام قرار دیتے ہیں، جلالہ بنتی ہی نہیں ہے کیونکہ وہ انسان کا پاخانہ نہیں کھاتی۔ لہٰذا اسے جلالہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس میں جلالہ کی علت نہیں پائی جاتی اور جب علت نہ رہی تو جلالہ والا حکم بھی اس پر نہیں لگ سکتا۔ لہٰذا برائلر مرغی جس کی غذا حلال اور حرام چیزوں کے مرکبات سے تیار ہوتی ہے وہ حلال ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کی غذا کا اعتبار نہیں بلکہ شریعت کا اعتبار ہے۔ آخر میں یہ بات بھی اچھی طرح یاد رہے کہ مرغی کی خوراک میں جو خون، مردار اور دوسری حرام اشیاء ڈالی جاتی ہیں اگرچہ یہ انسانوں کے لیے حرام ہیں لیکن جانوروں کے لیے حرام نہیں کیونکہ وہ تو مکلف ہی نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے انسانوں کے لیے جن اشیاء کا کھانا حرام قرار دیا ہے ان کی خرید وفروخت بھی (چند ایک جانور چھوڑ کر) حرام قرار دی ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

« لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ - ثَلَاثًا - اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْهِمُ الشُّحُوْمَ فَبَاعُوْهَا وَ اَكَلُوْا اَثْمَانَهَا وَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِذَا حَرَّمَ عَلٰى قَوْمٍ اَكْلَ شَيْءٍ حَرَّمَ عَلَيْهِمْ ثَمَنَهُ »

" اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت کرے۔" آپ ﷺ نے یہ کلمات تین مرتبہ دہرائے پھر کہا: "اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی کا کھانا حرام کر دیا تو انھوں نے اسے فروخت کر کے اس کی قیمت استعمال کرنا شروع کر دی اور یقیناً اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر کسی چیز کا کھانا حرام کر دیتا ہے تو اس کی قیمت (خرید وفروخت) بھی ان پر حرام کر دیتا ہے۔" [سنن ابی داؤد، کتاب البیوع : باب فی ثمن الخمر والمیتة (۳٤۸۸) ، مسند احمد(۱/ ۲٤۷)]

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ الْخَمْرَ وَ ثَمَنَهَا وَ حَرَّمَ الْمَيْتَةَ وَ ثَمَنَهَا وَ حَرَّمَ الْخِنْزِيْرَ وَ ثَمَنَهُ » [ابو داؤد، کتاب البیوع: باب فی ثمن الخمر والمیتة (۳٤۸۵)]

" بے شک اللہ نے شراب، مردار اور خنزیر کو حرام قرار دیا ہے اور ان کی قیمتیں بھی حرام کی ہیں۔"

رسول کریم ﷺ کے ان فرامین سے معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کا کھانا انسان کے لیے حرام ہے، ان کی خرید وفروخت کرنا بھی حرام ہے (سوائے چند جانوروں کے جیسے کہ گھریلو گدھا ہے)۔ ایسا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب ہے اور حرام کمائی کھانے اور جمع کرنے میں مصروف ہے۔

ہمارے ان بھائیوں کو چاہیے کہ وہ مرغی کی خوراک تیار کرنے میں حرام اشیاء کی خرید وفروخت سے اجتناب کریں، خوراک میں مردار اور خون ڈالنے کی بجائے مچھلی کا چورا ڈال لیں۔ جب حلال چیز کی خرید وفروخت میں کفایہ ہے تو پھر حرام کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو قرآن وسنت پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

کیا گھوڑا اور جنگلی گدھا حلال ہے؟

(سوال) کیا گھوڑا اور جنگلی گدھا حلال ہے؟

(جواب) گھوڑا حلال ہے، اس کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ نَہٰی یَوْمَ خَیْبَرَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَھْلِیَّۃِ وَ اَذِنَ فِیْ لُحُوْمِ الْخَیْلِ » [مسلم ، کتاب الصید والذبائح: باب إباحة اکل لحم الخیل (۱۹٤۱)، بخاری ، کتاب المغازی: باب غزوۃ خیبر(٤۲۱۹)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن گدھوں کے گوشت کے بارے میں منع کیا اور گھوڑے کے گوشت کی اجازت دی۔“

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« اَکَلْنَا لَحْمَ فَرَسٍ عَلٰی عَھْدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ » [مسند احمد(۳٤٦/٦)، (۲٦۹۳۰)، مسلم(۱۹٤۲)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم نے گھوڑے کا گوشت کھایا۔“

مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند سے مروی ہے کہ عطاء بن ابی رباح سے ابن جریج نے گھوڑے کے گوشت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا:

” لَمْ یَزَلْ سَلَفُکَ یَاْکُلُوْنَہٗ قُلْتُ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ ؟ قَالَ: نَعَمْ “

” آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگ ہمیشہ اس کو کھاتے رہے ہیں۔ میں نے کہا: ” کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام؟“ تو انھوں نے کہا: ”ہاں۔“ [مصنف ابن ابی شیبة(۲۵۰/۸)]

امام صلاح الدین خلیل بن کیکلدی العلائی نے اپنی کتاب ”توفیة الکیل لمن حرم لحوم الخیل“ میں لکھا ہے:

”جمہور سلف و خلف ائمہ محدثین سوید بن غفلہ، علقمہ بن اسود، اصحاب عبداللہ بن مسعود، ابراہیم نخعی، شریح، سعید بن جبیر، حسن بصری، ابن شہاب زہری، حماد بن ابی سلیمان ، امام شافعی، احمد بن حنبل، قاضی ابو یوسف، محمد بن حسن الشیبانی ، اسحاق بن راہویہ، داؤد ظاہری ،عبداللہ بن مبارک اور جمہور اہل حدیث کے نزدیک گھوڑا حلال ہے۔ اس کی حلت میں کوئی شک وشبہ نہیں صرف امام ابوحنیفہ اور بعض مالکیوں نے اسے حرام یا مکروہ کہا تھا۔“

ہمارے ملک میں چونکہ ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو امام ابو حنیفہ کے مقلد ہیں اور ان کے ہاں گھوڑا حرام سمجھا جاتا

ہے۔ اس لیے جب اس کی حلت کی بات کی جاتی ہے تو اسے بڑا عجیب سمجھا جاتا ہے اور لوگ مختلف انداز سے اس کے متعلق سوال کرتے ہیں حالانکہ موجودہ دور میں کئی حرام اشیاء مثلاً سود، شراب، جوا اور غیر اللہ کے نام پر دی ہوئی اشیاء وغیرہ لوگ سرعام استعمال کرتے ہیں اور ان پر کبھی اتنے سوال نہیں اٹھائے جاتے صرف اس لیے کہ یہ چیزیں لوگوں کی ہڈیوں میں رچ چکی ہیں اور جونہی کسی ایسی چیز کی حلت کے متعلق سوال ہو جو ان کے ہاں غیر معروف ہو تو بلاسوچے سمجھے اس پر حرمت کا فتویٰ جڑ کر تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سے ابو یوسف اور امام محمد اس کی حلت کے قائل ہیں۔ جیسا کہ امام طحاوی حنفی کا قول ہے۔ ''فتح الباری (۹/۵۶۰)'' اور فقہ حنفی کی معروف کتاب ''منیۃ المصلی (اردو)'' میں جوٹھے پانی کے بیان میں لکھا ہے: ''امام ابوحنیفہ کی گھوڑے کے جھوٹے پانی میں چار روایات ہیں:'' ایک میں نجس، ایک میں مشکوک، ایک میں مکروہ اور ایک میں پاک ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک پاک ہے اس واسطے کہ اس کا گوشت حلال ہے۔'' کنز الدقائق (فارسی)، مترجم ملانصیر الدین کرمانی'' میں ہے کہ اسی طرح ایک حدیث میں ہے:

«نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ وَ الْخَيْلِ وَ الْبِغَالِ»

''نبی کریم ﷺ نے گدھے، گھوڑے اور خچر کے گوشت سے منع کیا۔''

لیکن یہ حدیث ضعیف ہے، اس میں عکرمہ بن عمار یحییٰ بن ابی کثیر سے بیان کرتا ہے، جب عکرمہ بن عمار یحییٰ سے بیان کرے تو حدیث ضعیف ہوتی ہے۔

❁ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں:

"اَحَادِيْثُهٗ عَنْ يَحْيَى بْنِ اَبِیْ كَثِيْرٍ ضَعِيْفٌ"

''اس کی حدیثیں یحییٰ بن ابی کثیر سے ضعیف ہیں۔''

❁ امام بخاری کہتے ہیں:

"حَدِيْثُهٗ عَنْ يَحْيٰى مُضْطَرِبٌ"

''یحییٰ سے اس کی حدیث مضطرب ہے۔''

❁ امام نسائی کہتے ہیں:

"لَيْسَ بِهٖ بَاْسٌ اِلَّا فِیْ يَحْيٰى"

''سوائے یحییٰ کے اس میں کوئی حرج نہیں۔''

اسی طرح گھوڑے کے گوشت کی حرمت میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی بھی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، لیکن وہ حدیث بھی شاذ اور منکر ہے۔ پھر اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ خیبر میں شریک ہوئے حالانکہ وہ خیبر کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔

جنگلی گدھے کے بارے میں بھی صحیح بخاری شریف میں حدیث ہے۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ہم نبی کریم ﷺ کے

ساتھ سفر میں تھے۔ کچھ ہم میں احرام پہنے ہوئے اور کچھ بغیر احرام کے تھے...... میں نے ایک جنگلی گدھا شکار کیا اور اپنے ساتھیوں کے پاس لے آیا:

« فَقَالَ بَعْضُهُمْ كُلُوْا وَ قَالَ بَعْضُهُمْ لَا تَأْكُلُوْا فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ هُوَ اَمَامَنَا فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ كُلُوْهُ حَلَالٌ » [بخاری، کتاب جزاء الصید:باب لا یعین المحرم الحلال فی قتل الصید(۱۸۲۳)]

''تو بعض نے کہا کھالو اور بعض نے کہا نہ کھاؤ۔ میں نبی کریم (ﷺ) کے پاس آیا جو ہم سے آگے تھے اور پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو کھالو، یہ حلال ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام طحاوی حنفی کا قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

'' قَالَ الطَّحَاوِيُّ وَ قَدْ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلٰى حِلِّ الْحِمَارِ الْوَحْشِيِّ '' [فتح الباری(۱/۶۵۶)]

''علماء کا جنگلی گدھے کے حلال ہونے پر اجماع ہے۔''

یہ بھی یاد رہے کہ جنگلی گدھا ایک اور جانور ہے، نام میں اشتراک کی وجہ سے اسے گھریلو گدھا نہ سمجھا جائے۔ ابو یوسف، محمد اور امام شافعی کے نزدیک گھوڑے کے گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

مولوی ثناء اللہ امرتسری پانی پتی حنفی نے اپنی کتاب ''مَا لَا بُدَّ مِنْهُ (۱۱۰)'' میں لکھا ہے: ''اسپ حلال است'' یعنی گھوڑا حلال ہے۔ مولوی اشرف علی تھانوی بھی دبی زبان میں گھوڑے کی حلت کا اقرار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''گھوڑی کا کھانا جائز ہے لیکن بہتر نہیں۔'' [بهشتی زیور (۳/۵۶)]

بلکہ خود امام ابوحنیفہ نے اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا اور گھوڑے کی حلت کے قائل ہو گئے تھے۔ علامہ آلوسی حنفی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں نقل کیا ہے:

'' اِنَّهٗ رَجَعَ عَنْ حُرْمَتِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِثَلَاثَةِ اَيَّامٍ وَ عَلَيْهِ الْفَتْوٰى ''

''امام ابوحنیفہ نے اپنی وفات سے تین دن قبل گھوڑے کی حرمت سے رجوع کر لیا تھا اور اسی قول پر فتویٰ ہے۔''

اسی طرح جامع الرموز میں ہے:

'' اِنَّهٗ رَجَعَ عَنْ حُرْمَتِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِثَلَاثَةِ اَيَّامٍ عَنْ حُرْمَةِ لَحْمِهٖ وَ عَلَيْهِ الْفَتْوٰى '' [جامع الرموز، کتاب الذبائح (۳/۳۶۰)]

''امام ابوحنیفہ نے اپنی وفات سے تین دن پہلے گھوڑے کی حرمت سے یعنی اس کے گوشت کی حرمت سے رجوع کر لیا تھا اور اس پر فتویٰ ہے۔''

آخر میں چند شبہات کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ قرآن مجید کی آیت: ﴿ وَ الْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً ﴾ کہ ''گھوڑے خچر اور گدھوں کو سواری کے لیے زینت بنایا ہے'' اس سے گھوڑے کی حرمت پر استدلال

کرتے ہیں، لیکن یہ درست نہیں کیونکہ یہ آیت بالاتفاق مکی ہے اور گھوڑے کی حلت کا حکم مدنی ہے، ہجرت سے تقریباً ٦ سال بعد۔ اگر نبی کریم اس آیت سے گھوڑے کی حرمت سمجھتے تو اس کی اجازت کبھی نہ دیتے۔ پھر یہ آیت گھوڑے کی حرمت میں نص بھی نہیں اور حدیث میں اس کی حلت کی صراحت موجود ہے۔

نوٹ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اپنے سابقہ موقف سے رجوع ردالمختار، کتاب الذبائح (۹/۴۴۲)، طبع بیروت میں بھی موجود ہے۔

کھانے میں مکھی کا گرنا

سوال اگر کھانے میں مکھی گر جائے تو کیا کیا جائے؟

جواب اگر کسی آدمی کے کھانے میں مکھی گر کر مر جائے یا ابھی زندہ ہی ہو تو وہ اسے ایک دفعہ ڈبو کر نکال دے اور کھانا کھالے، اس کے کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے، اور اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِيْ شَرَابِ اَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ ثُمَّ لِيَنْزِعْهُ فَإِنَّ فِيْ اِحْدٰى جَنَاحَيْهِ دَاءً وَ فِي الْاُخْرٰى شِفَاءً » [بخاری ، کتاب بدء الخلق : باب اذا وقع الذباب فی شراب احدکم...... الخ(۳۳۲۰)]

”جب کسی آدمی کے مشروب میں مکھی گر جائے تو وہ اسے ڈبو کر نکال دے کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہوتی ہے اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے۔“

لہٰذا اگر کسی آدمی کے کھانے یا پینے والی اشیاء میں مکھی گر جائے یا اس کی مثل کوئی اور چیز گرے تو اس کو نکال کر استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

❀❀❀

جہاد کے احکام

WWW. KITABOSUNNAT.COM

جہاد کے لیے والدین کی اجازت

سوال جہاد میں شریک ہونے کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟ کتاب وسنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب جہاد میں شرکت کے لیے والدین کی اجازت کے متعلق دو طرح کی احادیث موجود ہیں۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں:

''ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ آپ سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟'' اس نے کہا: ''ہاں!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر انھیں میں جہاد کرو۔''

[صحیح بخاری، کتاب الجهاد: باب الجهاد باذن الأبوین (٣٠٠٤)]

اس طرح عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ہی سے ایک روایت میں ہے کہتے ہیں:

''ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس نے پوچھا: ''سب سے افضل عمل کون سا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نماز ادا کرنا۔'' اس نے کہا: ''پھر کون سا؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جہاد کرنا۔'' تو اس نے کہا: ''میرے والدین ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تجھے والدین کے ساتھ خیر کا حکم دیتا ہوں۔'' اس نے کہا:

« وَالَّذِیْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَأُجَاهِدَنَّ وَلَأَتْرُكَنَّهُمَا قَالَ فَأَنْتَ أَعْلَمُ »[ابن حبان: (٤/ ١١)]

''اس ہستی کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا! میں ضرور جہاد کروں گا اور انھیں ضرور چھوڑ کر جاؤں گا۔'' آپ نے فرمایا: ''پھر تو بہتر جانتا ہے۔''

اہل علم نے ان دونوں احادیث کے متعلق دو قسم کی توجیہات بیان کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''دونوں احادیث میں موافقت کرتے ہوئے یہ صورت نکلتی ہے کہ یہ فرض عین جہاد پر محمول ہے۔ یعنی جب جہاد فرض عین ہو تو والدین کی اجازت ضروری نہیں۔'' [فتح الباری: (٦/ ١٤١)]

دوسری توجیہ یہ ہے کہ والدین کی اجازت والے مسئلہ کو امام یا شرع کے مکلف آدمی کے سپرد کر دیا جائے، اب دونوں صورتوں میں مصلحت جس کا تقاضا کرے اسے مقدم کرنا واجب ہے۔ انصار و مہاجرین جہاد کرتے تھے اور ہم نے ذخیرۂ احادیث میں سے کسی بھی حدیث میں نہیں دیکھا کہ وہ ہر غزوے میں والدین کی اجازت کا التزام کرتے ہوں۔ [کتاب الروضة الندية: (٢/ ٣٣٣)، جديد محقق: (٢/ ٧١٩)]

ہمارے نزدیک یہ دوسری توجیہ زیادہ وزنی ہے، اس لیے کہ دونوں احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ کرام نے اپنے آپ کو جہاد کے لیے اپنے امام اور قائد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے ان کا فیصلہ کیا اور ابن حبان کی صحیح حدیث کے مطابق بات یہ ہے کہ جب مجاہد صحابی نے والدین کو چھوڑ کر جہاد میں جانے کا عزم کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ڈانٹا یا منع نہیں کیا بلکہ معاملہ اس کے سپرد کر دیا اور فرمایا: ''تو اپنی حالت کو بہتر جانتا ہے۔'' اس لیے اگر کوئی شرع کا مکلف آدمی اپنے گھریلو حالات کو دیکھ کر خود فیصلہ کر لے کہ وہ جہاد پر جانا چاہتا ہے تو والدین کی اجازت کے بغیر بھی جا سکتا ہے۔

قرآن و حدیث میں فی سبیل اللہ سے مراد

سوال قرآن میں یا حدیث میں جہاں فی سبیل اللہ آیا ہے، کیا اس سے مراد صرف جہاد ہے یا کوئی اور عمل بھی ہے؟

جواب قرآن وسنت میں فی سبیل اللہ کا لفظ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اکثر مقامات پر جہاد مراد ہے اور مسلمان کا ہر نیک عمل بھی فی سبیل اللہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مصارف زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَ الْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِيْ الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [التوبه ٦٠]

''صدقات صرف فقراء، مساکین، عاملین زکوٰۃ اور جن کی تالیف قلب مطلوب ہو اور غلام آزاد کرنے، مقروض اور فی سبیل اللہ اور مسافروں کے لیے ہیں، اللہ کی طرف سے فریضہ ہے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں آٹھ مصارف میں سے ایک مصرف ''فی سبیل اللہ'' ہے، اس سے مراد جہاد ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَاَمَّا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْهُمُ الْغُزَاةُ الَّذِيْنَ لَا حَقَّ لَهُمْ فِي الدِّيْوَانِ " (المصباح المنير فى تهذيب تفسير ابن كثير (ص ٥٧٦)) ''فی سبیل اللہ سے مراد وہ مجاہدین ہیں جن کا وظیفہ خواروں کے رجسٹر میں کوئی حق نہیں۔''

اسی طرح قرآن حکیم میں بیشتر مقامات پر فی سبیل اللہ سے مراد جہاد لیا گیا ہے۔ اب ایک حدیث ذکر کرتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن آدمی کا ہر نیک عمل فی سبیل اللہ شمار ہوتا ہے۔ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«اَنَّ رَجُلاً مَرَّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَأَى اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ مِنْ جِلْدِهِ وَنَشَاطِهِ مَا اَعْجَبَهُمْ فَقَالُوْا : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! لَوْ كَانَ هٰذَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى عَلٰى وَلَدِهِ صِغَارًا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى عَلٰى اَبَوَيْنِ شَيْخَيْنِ كَبِيْرَيْنِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اِنْ كَانَ يَسْعٰى عَلٰى نَفْسِهِ لِيُعِفَّهَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، وَاِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى عَلٰى اَهْلِهِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى رِيَاءً

وَمُفَاخَرَةً فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ الشَّيْطَانِ ﴾[طبرانی کبیر (۱۹/۱۲۹)، طبرانی صغیر (۲/۶۰)، اس حدیث کو شیخ البانی نے شواهد کی بنا پر صحیح قرار دیا هے۔ صحیح الترغیب والترهیب (۲/۳۰۶) (۱۶۹۲)، (۲/۴۲۴) (۱۹۵۹)]

''ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرا، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی قوت اور چستی دیکھی جس نے انھیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! کاش کہ یہ اللہ کی راہ میں ہوتا۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر یہ اپنے چھوٹے بچوں کے لیے دوڑ دھوپ کرنے نکلا ہے تو یہ فی سبیل اللہ ہے اور اگر یہ اپنے بوڑھے عمر رسیدہ والدین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کی غرض سے نکلا ہے تو پھر بھی فی سبیل اللہ ہے اور اگر یہ اپنے نفس کی خاطر دوڑ رہا ہے کہ اسے پاک صاف رکھے تو پھر بھی فی سبیل اللہ ہے اور اگر اپنے اہل کے لیے دوڑ رہا ہے تو پھر بھی فی سبیل اللہ ہے اور اگر ریا کاری اور مفاخرت کے لیے دوڑ رہا ہے تو پھر شیطان کی راہ میں ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین، اولاد، اہل و عیال اور اپنے نفس کو سنوارنے کی خاطر دوڑ دھوپ کرنا بھی فی سبیل اللہ ہے۔ لہٰذا فی سبیل اللہ میں جہاد بھی ہے اور یہ امور خیر بھی لیکن یاد رہے کہ کتاب وسنت کی نصوص کثیرہ میں فی سبیل اللہ جہاد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ابوعبس عبدالرحمان بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

﴿ مَنِ اغْبَرَّتْ قَدَمَاهُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ ﴾[بخاری، کتاب الجمعة: باب المشی إلی الجمعة (۹۰۷، ۲۸۱۰)]

''جس کے قدم فی سبیل اللہ غبار آلود ہوئے اس کو اللہ نے آگ پر حرام کر دیا۔''

یہ حدیث امام بخاری کتاب الجمعة: باب المشی الی الجمعة اور کتاب الجهاد میں باب من اغبرت قدماه فی سبیل الله میں لائے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف چل کر جانا اور جہاد کے لیے نکلنا دونوں عمل فی سبیل اللہ ہیں۔ (واللہ اعلم!)

جہاد کشمیر کی شرعی حیثیت

سوال کیا کشمیر کا جہاد شرعی جہاد ہے یا محض ایک علاقائی اور خطہ کے حصول کی لڑائی؟ مہربانی فرما کر واضح کر دیں؟

جواب اسلام غلبہ چاہتا ہے اور غلبہ اسلام کا طریقہ کار اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ بتایا ہے۔ جب تک مسلمان جہاد کرتے رہے ہمیشہ غالب و حکمران رہے، عزت و شرف ان کے قدم چومتے رہے اور جب مسلمانوں نے جہاد چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کے جو مقاصد بیان کیے ہیں ان میں سے اہم ترین مقصد یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ چہار دانگ عالم بلند ہو جائے، باطل ادیان مٹ جائیں، مشرکین کی بالا دستی کا خاتمہ ہو جائے اور اس وقت تک یہ جہاد جاری رہے جب تک لوگ کلمہ پڑھ کر نماز و زکوٰۃ کو نہ اپنا لیں یا پھر ذلیل ہو کر جزیہ ادا کرنا نہ شروع کر دیں۔

ہندوستان کا ہندو دنیا کا بدترین مشرک ہے۔ یہ بت پرست مشرک مشرکین مکہ سے بھی آگے ہے۔ کروڑوں ان کے معبود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہندوستان سے جہاد کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ جہاد کا ایک اہم مقصد شرک کو ختم کرنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ [الانفال:۳۹]

''ان (کافروں) سے لڑو حتیٰ کہ فتنہ باقی نہ رہے اور پورے کا پورا دین اللہ کے لیے ہو جائے۔''

نیز جہاد مظلوموں کی مدد کرنے اور کافروں سے مقبوضہ علاقوں کو چھڑانے کے لیے بھی ضروری ہے۔ کافروں کے حملہ کی صورت میں مدافعانہ قتال، معاہدہ کر کے توڑنے والوں کو سزا دینا، اپنے مقتولین کا بدلا لینا، یہ سب اسباب جہاد کو فرض کر دیتے ہیں۔ یہ سب صورتیں مقبوضہ کشمیر اور ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوؤں سے جہاد کیا جائے۔ مسلمانوں کے علاقوں پر ان کا قبضہ ہے۔ شرعی لحاظ سے انھیں کافروں کے قبضہ سے چھڑانے کے لیے جہاد کرنا فرض ہے۔ مقبوضہ کشمیر، حیدر آباد دکن، جونا گڑھ وغیرہ مسلمان ریاستوں پر ہندوؤں نے جبراً قبضہ کیا ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ ﴾ [البقرة:۱۹۱]

''انھیں قتل کرو جہاں بھی تم انھیں پاؤ اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے۔''

اپنے علاقے واپس لینے کے لیے لڑنے والے طالوت کے ساتھیوں نے کہا تھا:

﴿ وَ مَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا ﴾ [البقرة:۲۴۶]

''اور ہم اللہ کے راستے میں کیوں نہ لڑائی کریں اور بلاشبہ ہمیں اپنے ملک اور بچوں سے نکال دیا گیا ہے۔''

مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ہو رہا ہے، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کا قتل، عورتوں کی عصمت دری، املاک، کھیتوں، دکانوں کا جلایا جانا اور ہزاروں افراد کا ہجرت پر مجبور کر دیا جانا، یہ سب حالات بھی جہاد کو فرض کر دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴾ [النساء:۷۵]

''اور تم اللہ کے راستے میں کیوں لڑائی نہیں کرتے حالانکہ ضعیف مرد، عورتیں اور بچے کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور تو اپنی طرف سے ہمارے لیے کوئی دوست اور مددگار بنا۔''

ہندوؤں نے کشمیر میں استصواب رائے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی جان و مال اور مساجد کی حفاظت کے معاہدے کیے تھے اور اب تمام معاہدے توڑ دیے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہندوؤں سے جہاد کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ

لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَنتَهُونَ ﴾ [التوبة:١٢]

''اور اگر وہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمھارے دین پر طعن کریں تو تم کفر کے اماموں سے لڑو۔ بے شک ان کا کوئی عہد نہیں تا کہ وہ باز آ جائیں۔''

سات آٹھ لاکھ ہندو فوج مسلمانوں سے لڑنے کے لیے کشمیر آئی ہے، ان سے لڑنا مسلمانوں پر فرض ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمۡ﴾ [البقرة:١٩٠]

''اور اللہ کے راستے میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔''

قرآن مجید اور صحیح احادیث کی نصوص سے کشمیر کے موجودہ جہاد کی شرعی حیثیت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان حالات میں کشمیر بلکہ ہندوستان کے اندر بھی ہندو سے جہاد کرنا فرض ہے اور یہ شریعت کا تقاضا ہے۔ جہاد کے فرض عین اور فرض کفایہ کی بحث ہمارے نزدیک اتنی اہم نہیں ہے کہ اس پر ساری توانائیاں صرف کر دی جائیں اور نہ ان میں تعارض ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عملاً قتال میں حصہ لینا ہر فرد کے لیے ممکن نہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں جہاد کے لیے جسمانی، عسکری اور دینی تربیت ضروری ہے اور پھر ہر فرد کا مقبوضہ کشمیر پہنچنا بھی مشکل ہے۔ اس لحاظ سے جہاد کو نماز روزہ کی طرح فرض عین قرار دینا صحیح نہ ہوگا لیکن جہاد ایک وسیع عمل ہے ۔ جہاد کی ترغیب اس کے لیے مالی وسائل مہیا کرنا، مجاہدین کی ٹریننگ ، اسلحہ کی فراہمی، مجاہدین کے پیچھے ان کے گھر کی دیکھ بھال کرنا، احادیث میں اسے بھی جہاد قرار دیا گیا ہے پھر کم از کم جہاد کے لیے دلی ارادہ اور عزم بھی جہاد کا حصہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنۡ مَاتَ وَ لَمۡ يَغۡزُ وَ لَمۡ يُحَدِّثۡ بِهِ نَفۡسَهُ مَاتَ عَلَىٰ شُعۡبَةٍ مِّنۡ نِفَاقٍ» [مسلم ، كتاب الامارة باب ذم من مات و لم يغز و لم يحدث نفسه بالغزو(١٩١٠)]

''جو مر گیا نہ اس نے جہاد کیا اور نہ اس نے جہاد کا ارادہ ہی کیا تو وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرا۔''

اس حدیث کے تحت مشکوٰۃ کے حاشیہ میں لکھا ہے: ''ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ جہاد کو مضبوط کرے اور اس میں فرض عین کی دلیل ہے۔'' [حاشية مشكوٰة (ص/٣٣١)]

فرض عین اور فرض کفایہ کے بارے میں ہمارے پیش نظر مزید اصولی مباحث ہیں تاہم انھیں قصداً ترک کر دیا گیا ہے۔

اس وقت مسلمان حکمرانوں پر کافروں کا تسلط ہے ۔ وہ کھل کر نہ جہاد میں حصہ لے سکتے ہیں اور نہ اس کی ترغیب اور تائید کر سکتے ہیں۔ اس لیے معروضی حالات کا تقاضا ہے کہ جہاد میں ہر مسلمان اپنی اپنی استطاعت کے مطابق حصہ لے۔ علمائے کرام جہاد کی ترغیب و تحریض اور اس پر شکوک و شبہات کے ازالے میں اپنا حصہ ڈالیں، تاجر حضرات مالی تعاون کریں، دانشور اور صحافی کافروں کے پروپیگنڈے کا جواب دیں۔ وہ جہاد کو دہشت گردی کے نام سے بد نام کرتے ہیں۔ زندگی کے تمام طبقات میں جہاد کے لیے بیداری اور تائید ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ جہاد کی مخالفت اور اس میں شکوک و شبہات سے جہاد

کمزور یا ختم ہو جائے۔ اگر اللہ نہ کرے ایسا ہوا تو مسلمان موجودہ ذلت سے بھی بدتر ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گریں گے۔ (أعاذنا الله منه)

ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ جہاد شروع ہوا ہے تو اس کو آگے بڑھنا چاہیے۔ مسلمان حکمرانوں کو محکومی سے نکالنے کے لیے بھی جہاد کا قوت پکڑنا ضروری ہے۔ اسی راستے سے آزادیاں نصیب ہوں گی اور ایک اللہ کی غلامی کا اعزاز میسر آئے گا۔ ان شاء اللہ (حافظ احمد اللہ رحمہ اللہ)

ہندوستان کے خلاف جہاد کی فضیلت

سوال ہندوستان کے خلاف جہاد کی فضیلت میں جو حدیث وارد ہوئی ہے کیا وہ صحیح ہے؟

جواب یہ حدیث سند سمیت مندرجہ ذیل ہے:

«اَخْبَرَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحِيْمِ قَالَ حَدَّثَنَا اَسَدُ بْنُ مُوْسٰی قَالَ حَدَّثَنَا بَقِيَّةُ قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبُوْ بَكْرٍ الزُّبَيْدِيُّ عَنْ اَخِيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ الْوَلِيْدِ عَنْ لُقْمَانَ بْنِ عَامِرٍ عَنْ عَبْدِ الْاَعْلٰی بْنِ عَدِيِّ الْبَهْرَانِيِّ عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مَوْلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : عِصَابَتَانِ مِنْ اُمَّتِیْ حَرَّرَهُمَا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ وَ عِصَابَةٌ تَكُوْنُ مَعَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ» [نسائی، كتاب الجهاد: باب غزوة الهند (٣١٧٧)]

"حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے (جہنم کی) آگ سے آزاد کر دیا ہے۔ ایک گروہ جو ہندوستان کے خلاف جہاد کرے گا اور دوسرا گروہ جو عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر دجال کے خلاف لڑے گا۔"

اس حدیث کی سند کے تمام راوی ثقہ وصدوق ہیں سوائے ابو بکر الزبیدی کے۔ اسے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے مجہول الحال قرار دیا ہے۔ [تقريب التهذيب (ص/٣٩٧)]

یعنی اس کے حالات معلوم نہیں لیکن محمد بن ولید اس کا استاد، اس سے اس کے علاوہ عبد اللہ بن سالم بھی یہ حدیث بیان کرتے ہیں جیسا کہ مسند احمد (٢٧٨/٥) میں موجود ہے۔ عبد اللہ بن سالم کو امام ذہبی رحمہ اللہ نے الکاشف (٥٥٥/١) میں صدوق قرار دیا ہے اور اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب التھذیب میں نقل کیا ہے۔ لہٰذا اس سند میں ابو بکر الزبیدی کا مجہول الحال ہونا مضر نہیں کیونکہ عبد اللہ نے اس کی متابعت کی ہے۔ اس لیے یہ روایت صحیح ہے۔

علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ [صحيح الجامع الصغير (٢/٧٤٢)، السلسلة الصحيحة (١٩٣٤)]

لہٰذا ثابت ہوا کہ معترضین کا اس حدیث کی سند پر اعتراض درست نہیں ہے۔

کیا طالبان کسی غیر مسلم ملک سے مدد لیتے ہیں؟

(سوال) کیا میدان جہاد میں کفار ومشرکین سے مدد لینا جائز ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنگ بدر میں ایک مشرک آپ کی مدد کے لیے آیا تو آپ نے فرمایا:« اِرْجِعْ فَلَنْ اَسْتَعِیْنَ بِمُشْرِكٍ »''لوٹ جاؤ میں مشرک سے ہرگز مدد نہیں لوں گا۔'' تو کیا واقعی یہ درست ہے کہ کفار ومشرکین سے تعاون لینا درست نہیں؟ کتاب وسنت کی رو سے واضح کریں۔

(جواب) کبار محدثین رحمہم اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مسلمان جب کفار کی طرف سے مطمئن نہ ہوں اور یہ ڈر لاحق ہو کہ یہ لوگ ہمارے دشمنوں کے لیے ہمارے راز فاش کر دیں گے اور ہماری قوت کو کمزور کر دیں گے تو ایسی صورت میں کفار ومشرکین سے مدد نہیں لی جائے گی۔ کیونکہ ایسی حالت میں استعانت مقصود ومطلوب کی نقیض ہو گی۔ ایسے کفار جن پر اعتماد نہ ہو انھیں بالخصوص لشکروں کی تیاری میں، خندقیں اور سرنگیں کھودنے میں، قلعے اور بنکرز تعمیر کرنے میں، راستوں کی ہمواری اور اصلاح آلات وحرب میں ساتھ ملانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ البتہ اگر کسی کافر ومشرک پر اعتماد ہو اور وہ جنگ میں ہمارا حلیف ہو اور دوسرے کفار کے خلاف اور نصرت اسلام کے لیے اس کی مدد کی حاجت ہو تو اس وقت اس سے تعاون لینا راجح موقف کی رو سے درست ہے۔ یہ تعاون خواہ آلات حرب کی صورت میں ہو یا مال ومتاع کی شکل میں، افرادی قوت ہو یا راستے کے لیے گائیڈز ہوں اس میں کوئی قباحت نہیں۔ رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے والوں پر مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد بہت سے مواقع پر کفار سے کروائی ہے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں سے بعض واقعات درج ذیل ہے جن میں کفار سے حسب ضرورت تعاون لیا گیا ہے:

① جب قریش نے رسول اللہ ﷺ کا معاملہ بڑھتا ہوا دیکھا اور محسوس کیا کہ لوگ روز بروز محمد (ﷺ) کے حلقہ بگوش ہو رہے ہیں تو انہوں نے آپ کا بائیکاٹ کیا اور آپ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ اس وقت بنو ہاشم اور بنو المطلب نے آپ کا ساتھ دیا اور آپ کی حمایت ونصرت میں وہ بھی شعب ابی طالب میں آپ کے ساتھ تھے۔ [زاد المعاد: (۳۰/۳)، سیرة ابن هشام (۱۷۵/۱)، السیرة لابن کثیر (۳٤/۲)]

نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر یہ نہیں فرمایا کہ بنو ہاشم اور بنو المطلب تم چلے جاؤ مجھے تمہاری حمایت ونصرت کی کوئی حاجت نہیں۔

② پھر جب شعب ابی طالب کا حصار ختم ہوا، ابو طالب اور آپ ﷺ کی اہلیہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا فوت ہو گئیں تو رسول اللہ ﷺ پر اپنی قوم کے بے وقوف لوگوں کی جانب سے آفات وبلیات کی شدت ہوئی اور انہوں نے آپ کو تکالیف ومصائب سے دوچار کیا تو آپ طائف کے کافروں کی طرف نکل گئے تاکہ وہ آپ کی نصرت کے لیے آپ کی حمایت کریں اور آپ کو جگہ دیں۔ [زادالمعاد: (۳۱/۳)]

③ پھر جب وہاں سے امداد نہ ملی تو مکہ کی جانب آپ مقہور ومحزون ہو کر واپس پلٹے اور نخلہ میں چند دن قیام کیا تو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا: ''آپ کفار مکہ کے ہاں کیسے داخل ہوں گے، انہوں نے تو آپ کو نکال دیا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے زید! جو حالات تم دیکھ رہے ہو اللہ تعالیٰ ان سے نکلنے کے لیے کوئی راستہ بنا دے گا اور اپنے دین کی مدد کرے گا اور اپنے نبی کو غلبہ دے گا۔'' پھر آپ ﷺ مکہ کے قریب ہوئے تو بنو خزاعہ قبیلے کے ایک کافر مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا اور کہا: ''کیا میں تیرے پڑوس میں داخل ہو سکتا ہوں؟'' اس نے کہا: ''ہاں! اس نے اپنے بیٹوں اور قوم کو آواز دی اور کہا: ''اسلحہ پہن لو اور بیت اللہ کے ارکان کے پاس جاؤ اور زبان سے کہہ رہا تھا: ''میں نے محمد ﷺ کو پناہ دی ہے۔'' رسول اللہ ﷺ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ داخل ہوئے یہاں تک کہ جب مسجد حرام کے قریب پہنچے تو مطعم بن عدی اپنی سواری پر کھڑا ہو گیا، اس نے بلند آواز سے کہا: ''اے قریش کے لوگو! میں نے محمد ﷺ کو پناہ دی ہے، تم میں سے کوئی شخص بھی انھیں نقصان نہ پہنچائے۔'' رسول اللہ ﷺ رکن کے قریب ہوئے، اس کا استلام کیا اور دو رکعت نماز ادا کی اور اپنے گھر چلے گئے۔ مطعم اور اس کے بیٹوں کے اسلحے کی چھاؤں میں آپ ﷺ اپنے گھر داخل ہوئے۔

[زادالمعاد: (٣١/٣)،(٣٤)، السيرة النبوية لابن كثير(١٠٣/٢)، (١٠٤)]

اس لیے آپ نے بدر کے قیدیوں کے بارے کہا تھا:

''اگر مطعم زندہ ہوتا پھر ان بدبودار لوگوں کے لیے مجھے کہتا تو میں اس کے لیے انھیں چھوڑ دیتا۔''

[صحيح بخاری، كتاب فرض الخمس: باب ما منّ النبي ﷺ علی الأساری (٣١٣٩)]

④ جب قریش نے اصحاب رسول ﷺ کو سخت ایذا دی تو آپ نے انھیں حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا تا کہ انھیں اس کافر حکومت کی جانب سے حمایت نصیب ہو جائے، اس وقت نجاشی مسلمان نہیں ہوا تھا۔

⑤ اسی طرح آپ کا مشرک چچا ابو طالب جس نے مرتے دم تک کلمہ طیبہ نہیں پڑھا تھا، اس کی حمایت ونصرت آپ کو حاصل رہی۔

⑥ ہجرت مدینہ سے پہلے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایام ہائے مصائب میں ابن الدغنہ کافر کی پناہ لی۔ [صحيح بخاری، كتاب مناقب الانصار (٣٩٠٥)]

⑦ جب آپ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو عبداللہ بن اریقط الدیلی جو مشرک تھا اور راستوں کا بڑا ماہر تھا، اسے راستہ بتانے کے لیے اجرت پر رکھ لیا۔ [صحيح بخاری، كتاب مناقب الانصار (٣٩٠٥)]

اس میں بھی اس بات کی دلیل ہے کہ جب کسی مشرک پر اعتماد ہو کہ وہ دھوکا نہیں دے گا تو اس سے تعاون لیا جا سکتا ہے۔ اسے راستے کا گائیڈ بنایا جا سکتا ہے۔ کفار نے رسول اللہ ﷺ کے قتل کا منصوبہ تیار کر رکھا تھا، اگر کفار سے راستے میں آمنا سامنا ہو جاتا اور وہ آپ کی مدد کرتا تو کیا رسول اللہ ﷺ اسے کہتے کہ تم مشرک ہو ہماری مدد نہ کرو۔

⑧ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ہجرت مدینہ کے وقت سراقہ بن مالک سے بھی مدد لی، سراقہ اس وقت مشرک تھا، وہ فتح مکہ کے دن اسلام لایا تھا۔ [الاصابة (٣٥/٣)، اسد الغابة (١٩٠٠)]

آپ ﷺ نے سراقہ کو امان لکھ کر دی، وہ جسے بھی راستہ میں ملتا کہتا تم کفایت کیے گئے ہو، وہ ادھر نہیں ہیں اور جسے بھی ملتا

اسے واپس لوٹا دیتا۔[صحیح بخاری: (٣٩٠٥)،(٣٩٠٦)]

یہ تو چند ایک واقعات تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مکی زندگی میں کفار سے حسب ضرورت تعاون لیا اور صحیح مسلم، مسند احمد اور الدارمی میں موجود عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے میدان میں لڑنے کے لیے کرنے والے مشرک سے آپ نے کہا تھا: ''واپس پلٹ جاؤ، ہم مشرک سے ہرگز مدد نہیں لیں گے'' اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ مدینہ میں مشرک سے مدد لینا ناجائز ہو گیا تھا، اس لیے ہم وہ دلائل ذکر کرتے ہیں جن میں مدنی زندگی میں مشرکین و کفار سے حسب ضرورت تعاون لینے پر راہنمائی ملتی ہے۔

① غزوۂ حنین میں جانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے صفوان بن امیہ سے زرہیں عاریتاً لی تھیں۔[مسند احمد (٤٠٠/٣)، (٤٠١)، ابوداؤد (٣٥٦٢)، نسائی کبریٰ (٥٧٧٩) مستدرك حاكم: (٤٧/٢)]
غزوۂ حنین فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں ہوا اور صفوان اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

② نبی کریم ﷺ نے کفار کے ساتھ جو صلح حدیبیہ کی اس معاہدے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو شخص محمد (ﷺ) کا حلیف بننا چاہے وہ ان کا حلیف بن جائے اور جو قریش کا حلیف بننا چاہے اسے بھی اجازت ہے، تو بنوخزاعہ مسلمانوں کے اور بنوبکر کے لوگ قریش کے حلیف بن گئے۔[السيرة لابن هشام (٣١٨/٣)، السيرة لابن كثير: (٣٢١/٣)]
یہ صلح نبی کریم ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان تھی، بنوخزاعہ کے مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کا حلیف بننا پسند کیا جس کا تقاضا تھا کہ وہ لڑائی میں مسلمانوں کے مددگار رہوں گے اور جب بنوخزاعہ پر ان کے دشمن حملہ کریں گے تو مسلمان ان کی مدد کریں گے۔ پھر ہوا یہ کہ بنوخزاعہ پر بنوبکر نے حملہ کر دیا اور قریشیوں نے ان کا ساتھ دیا تو نبی ﷺ نے بدلہ لینے کے لیے ان پر چڑھائی کر دی اور یہ فتح مکہ کا سبب بن گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں الرحیق المختوم میں غزوہ فتح مکہ۔ اس واقعہ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسب ضرورت کفار سے معاہدہ کر کے اپنے دشمنوں کے ساتھ لڑا جا سکتا ہے۔

③ مولانا صفی الرحمن مبارکپوری لکھتے ہیں: ''(احد کے) مقتولین میں بنوثعلبہ کا ایک یہودی تھا، اس نے اس وقت جب جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے اپنی قوم سے کہا: ''اے جماعت یہود! خدا کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمد (ﷺ) کی مدد تم پر فرض ہے۔'' یہود نے کہا: ''مگر آج سبت (ہفتہ) کا دن ہے۔'' اس نے کہا: ''تمہارے لیے کوئی سبت نہیں۔'' پھر اس نے اپنی تلوار لی، سازوسامان اٹھایا اور بولا: ''اگر میں مارا جاؤں تو میرا مال محمد (ﷺ) کے لیے ہے وہ اس میں جو چاہیں گے کریں گے۔'' اس کے بعد میدان جنگ میں گیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مخیریق بہترین یہودی تھا۔'' (الرحيق المختوم)

اس کی موت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس کے اموال کو قبضے میں لے لیا اور عام صدقات مدینہ اسی مال سے ہوتے تھے۔ [مزيد ديكهيں سيرة ابن هشام: (٢٦/٢)، سيرة ابن هشام مع روض الانف: (٣٧٥/٢)،مطبوعه بيروت البدايه والنهاية: (٣٢/٤)، سيرة النبى اردو لابن كثير: (٥٩/٢)، طبقات ابن سعد (٥١/١)، تاريخ مدينه دمشق لابن عساكر (٢٢٩/١٠)]

اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی کافر مسلمان کے حق میں بہتر ہو تو اسے لڑائی میں حسب ضرورت شریک کیا جا سکتا ہے اور اس کے مال و متاع کو اسلام کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

④ ذی مخمر صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''تم رومیوں کے ساتھ امن والی صلح کرو گے پھر تم اور وہ ایک دشمن سے لڑائی کرو گے، تم مدد کیے جاؤ گے اور صحیح سلامت رہو گے، غنیمت کا مال پاؤ گے پھر تم واپس پلٹو گے یہاں تک کہ ٹیلے والی چراگاہ کے پاس اترو گے تو عیسائیوں میں سے ایک آدمی صلیب اٹھا کر کہے گا: ''صلیب غالب آگئی۔'' اس پر مسلمانوں میں سے ایک آدمی غضبناک ہو کر اسے توڑ ڈالے گا تو اس وقت روم کے عیسائی غدر کریں گے یعنی صلح والا معاہدہ توڑ ڈالیں گے اور جنگ کے لیے جمع ہو جائیں گے اور اسی (۸۰) جھنڈوں تلے آئیں گے، ہر جھنڈے کے ساتھ دس ہزار آدمی ہوں گے اور اللہ مسلمانوں کی جماعت کو شہادت کے ساتھ عزت عطا کرے گا۔'' [مسند احمد (۹۱/٤)، (۳۷۲/٥)، (٤۰۹)، ابو داؤد (٤۲۹۲)]

اور اس معنی کی ایک حدیث صحیح بخاری (۳۱۷٦) میں بھی موجود ہے۔

اس صحیح حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفار و مشرکین سے صلح کر کے مشترکہ دشمن کے ساتھ لڑا جا سکتا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ جب چاہے اپنے دین کی مدد کسی فاسق و فاجر عیسائی کافر سے لے لے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے بارے کہا: ''یہ جہنمی ہے۔'' پھر جنگ کے وقت وہ بڑی شدت سے لڑا اور زخمی ہو گیا۔ آپ سے کہا گیا: ''یا رسول اللہ! جس کے بارے میں آپ نے جہنمی ہونے کا کہا تھا آج وہ بڑی شدت سے لڑا ہے۔'' بالآخر رات کے وقت وہ زخموں پر صبر نہ کر سکا اور اپنے آپ کو قتل کر بیٹھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا:

« اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَشْهَدُ اَنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهُ »

''اللہ سب سے بڑا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں۔''

پھر آپ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا انھوں نے لوگوں میں اعلان کیا کہ مسلمان کے سوا کوئی بھی جنت میں داخل نہیں ہو گا اور بلاشبہ اللہ اس دین کی مدد فاجر آدمی سے بھی لے لیتا ہے۔ [بخاری، کتاب الجهاد: باب ان الله ليؤيد الدين بالرجل الفاجر (۳۰٦۲)]

اس مفہوم کی کئی ایک احادیث مجمع الزوائد (کتاب الجهاد، باب فی من يؤيدهم الاسلام (٥٤٨/٥) تا (٥٥۰)) میں موجود ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ: ''بے شک اللہ اس دین کی مدد فرات کے کنارے ربیعہ قبیلے کے نصاریٰ سے لے لے گا، تو میں کوئی اعرابی نہ چھوڑتا مگر اسے قتل کر دیتا یا وہ مسلمان ہو جاتا۔''

[مسند بزار (۱۷۳۳)، مجمع الزوائد (۹٥٦٥)، ابويعلىٰ (۲۳٦)]

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ بوقت ضرورت اگر کافر سے مسلمان کو مدد حاصل کرنا پڑے تو مدد لی جاسکتی ہے۔ امام شافعی نے کتاب الام (٢٧٦/٤) میں بھی تقریباً یہی موقف اختیار کیا ہے اور علامہ البانی نے "التعلیقات الرضیة علی الروضة لندیة (٤٤٣/٣) " میں اسے جید قرار دیا ہے۔ اسی طرح دیکھیں الروضة الندیة (٥٤٢/٣، ٥٤٣) مع التعلیقات الرضیه، السیل الجرار (٧١٧/٣) بیهقی (٣٧/٩)۔ حنفی فقہاء کا موقف ملاحظہ ہو ردالمحتار لابن عابدین شامی (١٤٧/٤،١٤٨)، شرح السیر الکبیر للسرخسی (١٥١٦/٤)، حنبلی مذہب کے لیے المغنی لابن قدامه (٢٥٦/٩) اور اس مسئلہ کی مفصل بحث کے لیے کتاب "صد عدون الملحدین" للشیخ ربیع بن هادی المدخلی کا مطالعہ مفید رہے گا۔ واللہ اعلم! امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَقَالَ الشَّافِعِيُّ وَآخَرُوْنَ: اِنْ كَانَ الْكَافِرُ حُسْنَ الرَّأْيِ فِي الْمُسْلِمِيْنَ وَدَعَتِ الْحَاجَةُ اِلَى الْاِسْتِعَانَةِ اُسْتُعِيْنَ بِهِ وَاِلَّا فَيُكْرَهُ وَحُمِلَ الْحَدِيْثَيْنِ عَلٰى هٰذَيْنِ الْحَالَيْنِ وَاِذَا حَضَرَتِ الْكَافِرُ بِالْاِذْنِ رُضِخَ لَهُ مِنَ الْغَنَائِمِ وَلَا يُسْهَمُ لَهُ هٰذَا مَذْهَبُ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَاَبِي الْحَنِيْفَةِ وَالْجَمْهُوْرِ» [شرح صحیح مسلم للنووی (١٧٧/١٢)، دارالکتب العلمیة بیروت]

"امام شافعی اور دیگر فقہاء و محدثین نے کہا ہے کہ اگر کافر مسلمانوں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہوں اور ان کی مدد کی حاجت ہو تو ان سے مدد لی جائے گی ورنہ مکروہ ہوگی اور دونوں قسم کی احادیث کو ان حالتوں پر محمول کیا ہے اور جب کافر اجازت کے ساتھ میدان جنگ میں حاضر ہو تو اسے غنیمت کے مال سے کچھ عطیہ دیا جائے گا، با قاعدہ اس کا حصہ نہیں نکالا جائے گا۔ یہ مذہب امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور جمہور محدثین کا ہے۔"

کافروں کی گردنیں کاٹنا

سوال پچھلے دنوں دلجوت کی کارروائی میں میں کافر مسلمانوں کی گردنیں کاٹ کر ساتھ لے گئے، اس کے جواب میں ہمارے ساتھیوں نے بھی انڈین آرمی کی گردنیں کاٹیں، تو پاکستانی آرمی کے کرنل نے کہا یہ شرعی طور پر ٹھیک نہیں ہے، آپ قرآن و حدیث سے اس کی وضاحت کریں؟

جواب کفار کے ساتھ میدان قتال میں سختی کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾ [الانفال: ١٢]

"تم ان کفار کی گردنوں اور جوڑ جوڑ پر مارو۔"

اس آیت کریمہ میں مجاہدین کو شجاعت اور پا مردی سے لڑنے کو کہا جا رہا ہے اور حکم دیا جا رہا ہے کہ میدان کارزار میں جب کفار سے سامنا ہو تو ان کی گردنوں پر مارو اور ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے جوڑ جوڑ پر مارو تا کہ وہ لڑنے کے قابل نہ رہیں۔ تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کی گردنیں کاٹنا بالکل درست اور جائز ہے اور کتب احادیث و تواریخ میں بے شمار

واقعات کفار کی گردنیں کاٹنے کے موجود ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی باب قصة عكل و عرينة) میں موجود ہے کہ قبیلہ عکل اور عرینہ کے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے چرواہے کو قتل کر دیا تو نبی کریم ﷺ نے ان کی آنکھوں میں گرم لوہے کی سلائیاں پھیر دینے اور ہاتھ پیر کاٹنے کا حکم دیا۔ اسی طرح اسلامی تعلیمات میں قصاص کے اندر قتل کرنا، نفس کے بدلے نفس، آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان وغیرہ کاٹنے کا حکم ہے۔ جب کفار مسلمانوں کیمقابلے میں میدان میں اتر آئیں تو ان کو قتل کرنا، گردنیں مارنا، ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالنا، جوڑ جوڑ پر ضربیں لگانا درست و جائز ہے،اس کی تفصیل کتب احادیث وتوریخ میں موجود ہے۔

مسلمانوں سے لڑائی نہ کرنے والے کافروں سے سلوک

سوال کیا جو کفار مسلمانوں سے لڑائی نہیں کرتے ان سے بھلائی اور حسن سلوک کر سکتے ہیں؟

جواب جو لوگ مسلمانوں سے ان کے دین کے متعلق جنگ نہیں کرتے اور نہ انھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالا ہو ان کے ساتھ بھلائی اور حسن سلوک کرنے سے شریعت مانع نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں قتال نہیں کیا اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان سے بھلائی اور حسن سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔'' [الممتحنه : ۸]

البتہ جو کفار مسلمانوں کے خلاف دین اسلام کے بارے میں جنگ چھیڑیں، انھیں ایذا پہنچائیں، ان کے بچوں، اہل و عیال، بوڑھوں اور جوانوں کا قتل عام کریں اور انھیں ان کے گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیں بلکہ انہوں نے کئی ایک اسلامی حکومتیں ختم کر دی ہوں اور دن رات ان کی کوشش امت مسلمہ کے خاتمہ کی ہو تو ان سے لڑائی کرنا فرض ہے تا کہ دین اسلام کا غلبہ جو مقصود و مطلوب ہے، حاصل کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ ممتحنہ کی اگلی آیت (۹) میں فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑائی کرتے ہیں اور انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی تو جو لوگ ایسے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔''

اس آیت کریمہ سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ جو کفار مسلمانوں سے ان کے دین کے بارے میں جنگ کریں، انھیں گھروں سے نکالیں یا نکالنے پر کسی دوسری قوم کی مدد کریں، ان کی طرف دوستی و تعاون کا ہاتھ بڑھانے والا ظالم ہے، لہٰذا امریکہ و برطانیہ وغیرہ جیسے جلاد، کفار جنھوں نے صلیبی جنگیں چھیڑ رکھی ہیں اور لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور انھیں ان کے گھروں سے نکالا، ان پر آتش و آہن کی بارش کر دی، ان سے لڑنا فرض عین ہے اور ان سے دوستی کرنا ظلم ہے، جو ایسے کفار سے دوستی کرتا ہے اور ان کا تعاون کرتا ہے وہ انھیں جیسا ہے۔

کیا ”فی سبیل اللہ“ سے مراد جہاد ہے؟

(سوال) سورۂ توبہ میں ”فی سبیل اللہ“ سے کیا مراد ہے؟ کیا اس میں کسی دینی ادارے کا قیام اور نظم ونسق شامل ہے یا نہیں؟ یعنی یہ اصطلاح عام ہے یا خاص؟

(جواب) سورۂ توبہ کی اس آیت میں مصارف صدقات بیان کرتے ہوئے ایک مصرف ”فی سبیل اللہ“ ذکر کیا ہے، یہاں ”فی سبیل اللہ“ خاص اصطلاح ہے جو باقی سات کے مقابلے میں استعمال کی گئی ہے۔ اگر اسے عام سمجھا جائے تو فقراء و مساکین وغیرہ کو علیحدہ ذکر کرنے کی حاجت نہ تھی، وہ سب بھی ”فی سبیل اللہ“ ہیں۔ کتاب وسنت میں ”فی سبیل اللہ“ عام معنی میں بھی آیا ہے جس سے مراد اسلام اور اللہ کی رضا والا راستہ ہے یا پھر خاص اصطلاح ”فی سبیل اللہ“ ہے جو جہاد کے لیے ہے۔ مذکورہ آیت میں یہاں اس سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے جیسے کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”صدقات ان فقراء کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں روکے گئے۔“ (البقرة:٥٤)

اسی طرح ایک جگہ اور فرمایا:

﴿ وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ [البقرة: ١٩٥]

”اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“

اس میں انفاق فی سبیل اللہ جہاد کے لیے ہے جیسا کہ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے وضاحت کی ہے۔ [ابوداؤد، کتاب الجهاد: باب في قوله عزوجل "ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة" (٢٥١٢)، ترمذی (٢٩٧٢)]

اور کئی ایک مفسرین نے بھی یہاں سے جہاد وقتال ہی مراد لیا ہے۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر ”الجامع لاحکام القرآن“ میں فرمایا ہے: ”اس سے مراد لڑنے والے غازی ہیں“ اور اکثر علماء کا یہی قول ہے اور امام مالک کے مذہب کا حاصل بھی یہی ہے۔ مشہور درسی کتاب "بداية المجتهد" میں ”فی سبیل اللہ“ سے مراد جہاد اور رباط کو امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا مذہب بتایا گیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں ”احکام زکوٰۃ وعشر“ از حافظ عبدالسلام بھٹوی صاحب اور ”مسائل عشر پر تحقیقی نظر“ از مفتی عبدالرحمٰن الرحمانی صاحب۔ حافظ عبدالسلام فرماتے ہیں: ”خلاصہ یہ ہے کہ ”فی سبیل اللہ“ سے مراد دین کی سربلندی کے لیے جہاد وقتال کرنے والے لوگ ہیں، اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو کسی طرح بھی دنیا میں اسلام کو غالب اور کفر کو مغلوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، خواہ وہ دلیل و برہان کے ساتھ ہو یا ہاتھ اور زبان کے ساتھ، البتہ اس مد کا اولین مصداق وہی لوگ ہیں جو کفار سے لڑائی میں مصروف ہیں یا کفار کے خلاف لڑائی کے کسی بھی شعبہ میں شریک ہیں۔“

[احکام زکوٰۃ وعشر: (ص/٤٣)]

البتہ یاد رہے کہ مدارس ومساجد یا دیگر جو بھی ادارے اسلام کی سربلندی کے لیے کام کر رہے ہیں ان پر بھی اپنے اموال میں سے ضرور خرچ کرنا چاہیے تاکہ یہاں سے حفاظ وعلماء وغیرہ تیار ہو کر نکلیں اور دین اسلام کی سربلندی کے لیے کام کریں۔

مجاہدین کے کمانڈرز اور اساتذہ کی کثیر تعداد انھیں مدارس ہی سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے ان کے حقوق کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ صدقات کے جو مصارف اللہ نے بیان کیے ہیں ان سب میں بقدر ضرورت حصہ ڈالنا چاہیے مگر حالات کے مطابق جس مد میں زیادہ ضرورت ہو اس کا زیادہ خیال رکھیں، اللہ تعالیٰ ہمیں امور خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

کفار دوست مسلمان حکمرانوں کے خلاف جہاد کی شرعی حیثیت

(سوال) ایسے حکمران جو کفار کے ساتھ محبت رکھتے اور ان کا ساتھ دیتے ہیں کیا ان کے خلاف لڑائی کرنا درست ہے اور کیا یہ کوشش جہاد تصور ہوگی؟

(جواب) اس وقت عالم کفر مسلمانوں کے خلاف ہر محاذ پر متحد ہو چکا ہے اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے لیے مسلسل سازشوں میں مصروف ہے۔ افغانستان، عراق، فلسطین، کشمیر، چیچنیا وغیرہ میں آتش و آہن کا بارودی سلسلہ زوروں پر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کفر کی سازش یہ بھی ہے کہ امت مسلمہ کو متحد و متفق نہ ہونے دیا جائے اور ان کی قوتوں کو پارہ پارہ کر کے ختم کیا جائے۔ ان حالات کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کی صفوں میں باہمی اتفاق و اتحاد ہونا چاہیے تاکہ سب مسلمان ایک مضبوط دیوار بن کر اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف نبرد آزما ہو کر اسلام اور اہل اسلام کا دفاع کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یہود کی سازشوں اور پروپیگنڈے کا پردہ چاک کرتے ہوئے امت مسلمہ کو دو کاموں کی طرف توجہ دلائی ہے:

① ...... اللہ کا تقویٰ ② ...... اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھامنا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ﴾ [آل عمران:۱۰۲، ۱۰۳]

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور آپس کی تفرقہ بازی میں نہ پڑو۔''

جب مسلمان سب آپس میں مل کر اللہ کے اوامر و نواہی کی پابندی کریں اور کتاب و سنت کے احکام پر سختی سے عمل پیرا ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں گے تو اس بات کا امکان نہیں رہتا کہ ان کے درمیان افتراق و انتشار یا بغض و عداوت پیدا ہو۔ جب مسلمان باہم متفق و متحد ہو جائیں گے تو پھر اہل کفر کی سازشیں کارگر ثابت نہ ہو سکیں گی۔ (ان شاء اللہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جہاد کے احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾

[الأنفال:٤٥، ٤٦]

''اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمھارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بکثرت یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

ان آیات میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجاہدین کو مقابلے کے وقت پوری دلجمعی اور ثابت قدمی کا حکم دیا ہے اور اس دوران اللہ کو بکثرت یاد رکھنے کی تلقین کی ہے کیونکہ مقابلہ کے وقت اللہ کی یاد ثابت قدمی کا باعث بن جاتی ہے اور کامیابی کا زینہ ثابت ہوتی ہے پھر اس کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور باہمی اختلافات اور جھگڑوں سے منع کر دیا ہے کیونکہ امت مسلمہ کا باہمی افتراق و انتشار اسلام اور اہل اسلام کے لیے زہر قاتل ہے۔ اگر مسلمان آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی اندرونی لڑائی کی بنا پر ہمتیں پست ہو جاتی ہیں اور اسلام کی ساکھ کو سخت دھچکا لگتا ہے جو بالآخر شکست کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دوران پیش آنے والے مصائب پر صبر و تحمل اور ان پر قابو پانے کی تلقین کر دی اور ساتھ اپنی مدد کا سہارا بھی دے دیا۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کا اندرونی اتحاد کتنا ضروری ہے۔ اہل کفر اور ان کے ہمنوا آج بھی یہی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق ختم کر کے انھیں آپس میں لڑا کر کم ہمت کیا جائے اور ان کی شان و شوکت کو توڑ دیا جائے، جس کے لیے ان کی پوری کوشش ہے کہ امت مسلمہ کے افراد ہی کا چناؤ کر کے یہ کام ان سے لیا جائے اور جو لوگ عالم کفر کے خلاف برسر پیکار ہیں انھیں ان کی حکومتوں اور عوام کے ساتھ لڑا کر ان کی جمعیت کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ ان نامساعد حالات میں انھوں نے یہ کام بعض مخلص مسلمانوں سے لینے کے لیے اپنی تگ و دو شروع کر رکھی ہے اور بعض لوگ دیدہ و دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کام میں لگ چکے ہیں۔ وہ دراصل اسلام کی خدمت نہیں کر رہے بلکہ اہل کفر کی در پردہ حمایت کر رہے ہیں اور جو کام کفر چاہتا ہے اسے پایہ تکمیل تک پہنچا رہے ہیں۔ اس دنیا میں جتنے بھی مسلم ممالک ہیں ان کے حکمرانوں میں اگرچہ عملی کوتاہیاں اور خامیاں موجود ہیں لیکن ان کے خلاف قتال کے لیے اٹھنا سلف صالحین کا منہج نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ان کی ہر ممکنہ طریقے سے اصلاح کریں اور انھیں اسلام اور اہل اسلام کی اہمیت سمجھائیں اور دوسری بات یہ ہے کہ جن حکمرانوں کے خلاف لڑنے کے لیے نکلنا چاہیے اس کے لیے چند امور پر توجہ دینا ضروری ہے۔

پہلے یہ اچھی طرح معلوم کر لینا چاہیے کہ ایسے شخص کا کفر ثابت ہو چکا ہے، وہ صریح اور واضح طور پر کافر ہو چکا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ کسی تاویل کی بنا پر یا کسی مجبوری کی بنا پر بظاہر کفار کا ساتھی ہو یا کسی معاملے میں جاہل و ناواقف ہو تو ایسے افراد پر جب تک اسلام کی حقیقت واضح نہ کر دی جائے اور اس پر دلائل کے ساتھ اتمام حجت نہ کر دی جائے اتنی دیر تک اس کی تکفیر نہیں ہو سکتی اور عامۃ الناس کو ایسے فتووں سے دور رہنا چاہیے۔ یہ اکابر علماء کا کام ہے۔ فتویٰ صادر کرنے والے شخص کو چاہیے کہ یہ معلوم کرے کہ اسلام کا وہ مسئلہ اس تک کما حقہ پہنچایا جا چکا ہے یا نہیں؟ اس بات پر بھی کہ وہ مسئلہ کس حد تک واضح ہے اس میں کوئی پیچیدگی تو نہیں پائی جاتی اور اس شخص میں مسئلہ سمجھنے کی استعداد کتنی ہے؟ ایسے لوگوں پر پہلے مسئلہ کی حقیقت

دلائل و براہین کے ساتھ کھول کھول کر واضح کرنی چاہیے اور اتمام حجت کرنی چاہیے، پھر اس کے بعد اگر وہ کفر پر اصرار کرتا ہے تو اس کے ساتھ غیر مسلموں والا رویہ اختیار کیا جائے گا۔ اللہ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے:

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾ [النساء:١٦٥]

''ہم نے خوشخبری دینے اور ڈرانے کے لیے رسول بھیجے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس (حق کو قبول نہ کرنے کی) کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بنی اسرائیل:١٥]

''اور ہم اتنی دیر تک عذاب نہیں دیتے حتیٰ کہ رسول بھیج لیں۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب و سزا دینے سے پہلے اتمام حجت ضروری ہے۔ ہمیں اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے خلاف جنگ کرنے سے پہلے یہ بات اچھی طرح سوچ لینی چاہیے کہ کیا ہم نے ان کے پاس جا کر ان پر اسلام اور اہل اسلام کا معاملہ اچھی طرح روشن اور واضح کر دیا ہے اور ان پر شرعی احکام میں کوئی ابہام اور پیچیدگی تو نہیں چھوڑی یا کہ بغیر اتمام حجت ہی کے ہم لڑائی کے لیے تلے ہوئے ہیں اور اگر یہ حکمران کافر ثابت ہو بھی جائیں تو پھر جنگی حکمت عملی کو سمجھتے ہوئے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت سے یہ بات عیاں اور واضح ہے کہ مدینہ طیبہ میں یہود کے قبائل موجود تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ معاہدے کیے اور مدینہ کے اندر قتال نہیں کیا بلکہ یہود سے معاہدے کر کے منافقین کو ساتھ ملا کر باہر کے دشمن سے لڑائی کی ہے۔ پہلے باہر کے دشمن کا صفایا کیا، اس کے بعد یہود مدینہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہمیں صحیح احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ منافقین جن کے صریح کفر کا قرآن نے ذکر کیا ہے لیکن وہ زبان سے کلمہ پڑھتے تھے، نبی کریم ﷺ نے انھیں بھی قتل کرنے سے منع کیا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

« كُنَّا فِيْ غَزَاةٍ فَكَسَعَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُهَاجِرِيْنَ رَجُلًا مِّنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ الْأَنْصَارِيُّ يَا لَلْأَنْصَارِ ! وَقَالَ الْمُهَاجِرِيُّ يَا لَلْمُهَاجِرِيْنَ ! فَسَمِعَ ذٰلِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ مَا بَالُ دَعْوَى جَاهِلِيَّةٍ ؟ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! كَسَعَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُهَاجِرِيْنَ رَجُلًا مِّنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ دَعُوْهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ فَسَمِعَ بِذٰلِكَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أُبَيٍّ فَقَالَ فَعَلُوْهَا ؟ أَمَا وَاللّٰهِ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَامَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! دَعْنِيْ أَضْرِبْ عُنُقَ هٰذَا الْمُنَافِقِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ دَعْهُ لَا يَتَحَدَّثُ النَّاسُ أَنَّ

مُحَمَّدًا یَقْتُلُ اَصْحَابَهُ »[بخاری، کتاب التفسیر: باب قوله ﴿ سواء علیهم أستغفرت لهم ﴾ (٤٩٠٥)]

'' ہم ایک غزوہ میں تھے کہ ایک مہاجر صحابی نے ایک انصاری کی پشت کو ہاتھ یا پاؤں کے ساتھ ضرب لگائی تو انصاری نے مدد کے لیے انصار کو اور مہاجر نے مدد کے لیے مہاجرین کو پکارا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ بات سنی تو فرمایا: ''یہ جاہلیت کی پکار کیسی ہے؟'' صحابہ نے کہا: '' اے اللہ کے رسول! ایک مہاجر شخص نے ایک انصاری شخص کی پشت پر ضرب لگائی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: '' اس کو چھوڑ دو یہ تو ایک قبیح اور خبیث کلمہ ہے۔'' عبد اللہ بن ابی نے جب یہ بات سنی تو اس نے کہا: ''اچھا اب بات یہاں تک پہنچ گئی ہے، اللہ کی قسم! اگر ہم مدینہ کی طرف واپس لوٹے تو جو سب سے زیادہ عزت والا ہے وہ ذلیل آدمی کو مدینہ سے نکال دے گا۔'' یہ بات نبی ﷺ کو پہنچی تو عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے، میں اس منافق کی گردن اتار دوں۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''اس کو چھوڑ دو، کہیں لوگ باتیں نہ کرنے لگیں کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جب مسلمانوں کی باہمی لڑائی اور جھگڑا شروع ہو جائے تو نبی ﷺ نے کلمہ پڑھنے والے کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ اسی طرح ایک اور روایت میں ہے:

« اَنَّ رَجُلًا مِّنَ الْاَنْصَارِ حَدَّثَهُ اَتیٰ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ هُوَ فِیْ مَجْلِسٍ فَسَارَّهُ يَسْتَاْذِنُهُ فِیْ قَتْلِ رَجُلٍ مِّنَ الْمُنَافِقِيْنَ فَجَهَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلَيْسَ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ؟ قَالَ الْاَنْصَارِیُّ بَلٰی يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ لَا شَهَادَةَ لَهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَلَيْسَ يَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ ؟ قَالَ بَلٰی يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ لَا شَهَادَةَ لَهُ قَالَ اَلَيْسَ يُصَلِّیْ ؟ قَالَ بَلٰی يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَ لَا صَلَاةَ لَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ نَهَانِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ »[مسند احمد(٤٣٣/٥) (٢٣٦٧٠)]

'' ایک انصاری صحابی نے بیان کیا کہ وہ نبی ﷺ کے پاس آیا اور آپ اپنی مجلس میں تھے، اس نے آپ سے چپکے سے بات کی تاکہ وہ آپ سے ایک منافق آدمی کے قتل کی اجازت حاصل کر سکے۔ آپ نے بلند آواز سے فرمایا: '' کیا وہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کی گواہی نہیں دیتا؟'' انصاری نے کہا: ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! لیکن اس کی شہادت کا کوئی اعتبار نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا وہ اس بات کی شہادت نہیں دیتا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟'' انصاری نے کہا: ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! لیکن اس کی شہادت کا کوئی اعتبار نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا وہ نماز نہیں پڑھتا۔'' اس نے کہا: ''کیوں نہیں لیکن اس کی نماز کا کوئی اعتبار نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہی وہ لوگ ہیں جن کے قتل سے اللہ نے مجھے منع کیا ہے۔''

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ اسلام کا اظہار کرتے ہوں ان کا قتل درست نہیں۔

ہمارے ممالک خصوصاً پاکستان مسلمانوں کا گھر ہے، یہاں رہ کر ہمیں آپس میں لڑائی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اس وقت امت

مسلمہ کا جو مشترکہ دشمن ہے، اس کے خلاف آپس میں متحد ہو کر جہاد وقتال میں مصروف ہو جانا چاہیے۔ جنگی حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ اپنے ملک میں افراتفری اور انتشار وافتراق نہ ہو۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ ایسے حکمرانوں سے لڑنے سے پہلے یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ کیا ہمارے پاس اتنی ہمت و طاقت اور وسائل ہیں کہ ہم انھیں ہٹا کر صحیح اسلامی نظام کا قیام کر سکیں؟ یا اپنی اندرونی طاقت کمزور کر کے اسلام کی رہی سہی کسر بھی نکال دیں گے اور الٹے نقصان کا سبب بن جائیں گے۔ مصر، شام، الجزائر جیسے کتنے ہی ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، وہاں جہادی قوتوں کو حکمرانوں سے ٹکرا کر پاش پاش کر دیا گیا اور دعوت وتبلیغ کے مراکز سیل کر دیے گئے۔ اسلام کا نام لینے والے بعض افراد پس دیوار زنداں دھکیل دیے گئے اور بعض قتل کر دیے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ممالک میں اپنے حکمرانوں سے ٹکرا کر قوت اسلامی کو ختم کرنا کوئی دانشمندی نہیں اور نہ اسے صحیح اسلامی جہاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جہاد کے لیے صریح کفار اور دشمن کی سرزمین کا انتخاب کیا جاتا ہے اور وہاں حسب موقع کارروائی کی جاتی ہے اور امت مسلمہ کو متفق ومتحد ہو کر لڑنا پڑتا ہے۔

اس لیے جو لوگ ممالک اسلامیہ میں حکمرانوں کے خلاف لڑنے کو جہاد سے تعبیر کر رہے ہیں وہ بہت بڑی غلطی پر ہیں اور شریعت کے اس قاعدے سے بے خبر ہیں کہ ''مفاسد کا ختم کرنا منافع کے حصول سے بہتر ہے۔'' اسی باہمی جنگ و جدل میں اسلام اور اہل اسلام ہی کا نقصان ہے اور نفع برائے نام ہے، حقیقت کچھ بھی نہیں، لہٰذا ہمیں اس لڑائی کے مفاسد اور نقصانات پر غور کرتے ہوئے ایسے فتنہ وفساد سے باز رہنا چاہیے اور عقل و دانش سے کام لیتے ہوئے سلف صالحین کے منہج پر قائم رہنا چاہیے۔

اسلامی آداب واحکام

WWW. KITABOSUNNAT.COM

''السلام علیکم'' کی بجائے دیگر فقرے

سوال کچھ لوگ ملاقات کے وقت ''السلام علیکم'' کی بجائے کچھ دوسرے جملے بولتے ہیں کیا ایسا کرنا درست ہے؟

جواب اسلام اخوت ومحبت کا دین ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:'' تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔'' ان کی باہمی محبت کو قائم رکھنے کے لیے اسلام نے بہت سارے احکام وآداب بیان کیے ہیں جن میں سے ایک ادب یہ ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو '' السلام علیکم'' کہیں۔ یہ مسلمانوں کے ذمے دوسرے مسلمانوں کا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

« حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ ...... اِذَا لَقِيْتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَ اِذَا دَعَاكَ فَاَجِبْهُ وَ اِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْهُ وَ اِذَا عَطِسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ فَشَمِّتْهُ وَ اِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ وَ اِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ »

[مسلم، کتاب السلام: باب من حق المسلم للمسلم رد السلام(٢١٦٢)]

'' مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں...... جب تو اس سے ملے تو سلام کہہ اور جب وہ تجھے دعوت دے تو قبول کر اور جب تجھ سے خیر خواہی طلب کرے تو اس کی خیر خواہی کر اور جب اسے چھینک آئے وہ اللہ کی حمد کرے تو اسے « يَرْحَمُكَ اللّٰهُ » کہہ اور جب وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کر اور جب وہ مرجائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جا۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ہمیں مسلمانوں کے ساتھ ملاقات کے وقت سلام کہنے کا حکم ہے، اگر دوسرا بھائی سلام میں پہل کر جائے تو اس کا جواب کم از کم '' وَ عَلَيْكُمُ السَّلَامُ '' کے الفاظ کے ساتھ دینا چاہیے اور کوشش یہ کرنی چاہیے کہ جب کوئی سلام کہے تو اس سے بہتر جواب دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴾

[النساء:٨٦]

'' اور جب تمھیں سلام کہا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا انھیں الفاظ کو لوٹا دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔''

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا تو اس نے کہا:« اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ » تو آپ ﷺ نے فرمایا:« وَ عَلَيْكَ السَّلَامُ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ » پھر ایک اور آیا اس نے کہا:« اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَ رَحْمَتُهُ » آپ ﷺ نے اسے جواب میں کہا:« وَ عَلَيْكَ السَّلَامُ وَ

رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ » پھر ایک اور آیا اس نے کہا:« اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ » آپ ﷺ نے اسے کہا:« وَ عَلَيْكَ » اس آدمی نے آپ ﷺ سے کہا: ''اے اللہ کے نبی! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ کے پاس فلاں فلاں آیا، انھوں نے سلام کہا آپ نے ان کے جواب میں زیادہ کلمات کہے اس کی نسبت جو آپ نے مجھے جواب دیا ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے ہمارے لیے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا ﴾ [النساء:٨٦]

''اور جب تمھیں سلام کہا جائے تو اس سے اچھا جواب دو یا انھیں الفاظ کو لوٹا دو۔''

ہم نے تجھ پر اسے لوٹا دیا ہے۔''

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ فِيْ هٰذَا الْحَدِيْثِ دَلَالَةٌ عَلٰى اَنَّهُ لَا زِيَادَةَ فِي السَّلَامِ عَلٰى هٰذِهِ الصِّفَةِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ اِذَا لَوْ شَرَعَ اَكْثَرَ مِنْ تِلْكَ لَزَادَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ"

[تفسیر ابن کثیر(۵۸۳/۱)]

''اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ سلام کہنے میں ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' سے زیادہ کلمات نہیں کہنے چاہییں اگر اس سے زائد کلمات مشروع ہوتے تو رسول اللہ ﷺ زیادہ کر دیتے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ہمیں ملاقات کے وقت زبان کے ساتھ سلام کے کلمات کہنے چاہییں، سلام کی جگہ'' کی حال اے'' یا "Good Morning" وغیرہ کہنا درست نہیں۔ سلام کے کلمات کے بعد'' کی حال اے'' یا دوسرے کلمات سے حال وغیرہ معلوم کرلیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

سلام کا جواب محض ہاتھ کے اشارے سے دینا بھی درست نہیں۔ سلام کا جواب دینے کے لیے کلمات ہی کہنے چاہییں جیسا کہ مذکورہ احادیث سے واضح ہے۔ البتہ اگر کوئی دور ہو تو سلام کے ساتھ اگر اشارہ بھی کیا جائے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ مجھے سلام کہا جا رہا ہے تو اس کی گنجائش موجود ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب'' الادب المفرد'' میں اس معنی کے کئی آثار نقل فرمائے ہیں۔ البتہ حالت نماز میں کوئی سلام کہہ دے تو اس کا جواب زبان سے نہیں بلکہ ہاتھ کے اشارے سے دیا جائے۔

ہاتھ کے اشارے سے سلام

سوال صرف ہاتھ کے اشارے سے سلام کہنے کا کیا حکم ہے، کیا اس سے کوئی ممانعت وارد ہوئی ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں۔

جواب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوا وَ لَا تُؤْمِنُوا حَتّٰى تَحَابُّوا اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَا تَحَابُّوْنَ بِهٖ؟ قَالُوا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! قَالَ اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ »[الأدب المفرد(۱۰۰۹)]

''تم اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو گے جب تک ایمان نہیں لاؤ گے اور تم ایمان نہیں لاؤ گے حتیٰ کہ آپس میں محبت نہ کرنے لگو۔ کیا میں ایسے کام پر تمھاری رہنمائی نہ کروں کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو؟'' انھوں نے کہا: ''کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''آپس میں سلام کو پھیلا دو۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اُعْبُدُوا الرَّحْمٰنَ وَ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَ اَفْشُوا السَّلَامَ تَدْخُلُوا الْجِنَانَ »[الادب المفرد(۱۰۱۰)]

''رحمان کی عبادت کرو، (مساکین کو) کھانا کھلاؤ اور سلام کو عام کر دو تم جنتوں میں داخل ہو جاؤ گے۔''

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ ہمیں آپس میں سلام کو عام کرنے کا حکم ہے اور یہ ہماری محبت کا ذریعہ ہے لیکن صرف ہاتھ کے اشارہ کے ساتھ سلام کرنا درست نہیں کیونکہ یہ یہود و نصاریٰ کا فعل ہے جس سے ہمیں روکا گیا ہے اور مختلف محکموں میں جو سلیوٹ کا طریقہ رائج ہے یہ بھی انہی کی تقلید کا نتیجہ ہے، مسلمان حکمرانوں اور عامۃ الناس کے لیے درست نہیں۔

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُسَلِّمُوا تَسْلِيْمَ الْيَهُوْدِ وَ النَّصَارٰى فَاِنَّ تَسْلِيْمَهُمْ بِالْاَكُفِّ وَ الرُّؤُوْسِ وَ الْاِشَارَةِ »

[السنن الکبریٰ للنسائی(۹۲/۲)، (۱۰۱۷۲)، عمل الیوم و اللیلة(۳٤۰)،السلسلة الصحیحة (۱۷۸۳)]

''یہود و نصاریٰ کے سلام کی طرح سلام نہ کرو، بلاشبہ ان کا سلام ہاتھوں، سروں اور اشارے سے ہوتا ہے۔''

اس کا ایک شاہد بھی موجود ہے۔[المعجم الأوسط للطبرانی(۱۸٤/۸)،(۷۳۷٦)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔[فتح الباری(۱۹/۱۱)]

یہ حدیث مختلف شواہد کی وجہ سے حسن ہے اور جامع ترمذی میں بھی موجود ہے۔[ترمذی، کتاب الاستئذان :باب ما جاء فی کراھیة إشارة الید بالسلام(۲٦۹۵)]

عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' كَانُوْا يَكْرَهُوْنَ التَّسْلِيْمَ بِالْيَدِ '' [الأدب المفرد(۱۰۳۵)]

''سلف صالحین ہاتھ کے ساتھ سلام کرنا ناپسند کرتے تھے۔''

لہٰذا معلوم ہوا کہ ہمیں سلام کے مسنون کلمات ادا کرنے چاہییں صرف ہاتھ کے ساتھ اشارہ کرنا، سر ہلانا یا ہتھیلی کے ساتھ سلام نہیں کرنا چاہیے۔ یہ یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے، سلف صالحین اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ البتہ حالت نماز میں کوئی سلام کہہ دے یا دور سے کوئی سلام کہے جو سنا نہ جا سکتا ہو تو سلام کے الفاظ کے ساتھ ہاتھ کا اشارہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ہاتھ کے اشارے سے نماز کی حالت میں سلام مستثنیٰ ہے اس لیے کہ جید اور عمدہ حدیثیں مروی ہیں کہ آپ ﷺ نے حالت نماز میں اشارے کے ساتھ سلام کا جواب دیا ہے۔ ان میں سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ کو حالت نماز میں ایک آدمی نے سلام کہا، آپ ﷺ نے اسے اشارے کے ساتھ جواب دیا اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ایسے ہی ہے۔ اسی طرح جو شخص دور ہو، سلام کی آواز نہ سنتا ہو، اس کو بھی اشارے کے ساتھ سلام کہنا جائز ہے اور اس کے ساتھ سلام کے الفاظ بھی ادا کرے۔" [فتح الباری (۱۱/۱۹)]

جھک کر یا کھڑے ہو کر سلام کرنا

(سوال) کیا سلام کے ساتھ جھکنا اور کھڑے ہونا جائز ہے؟

(جواب) سلام کرتے وقت جھکنا درست نہیں کیونکہ اس کی مشابہت رکوع کے ساتھ ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو سلام کرتے وقت جھکتے ہوں۔ اسی طرح کسی شخص کے احترام یا تعظیم کے لیے کھڑا ہونا جائز نہیں۔ جیسا کہ آج کل استاد، جج یا کسی بڑے آدمی کی آمد پر سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جس شخص کو پسند ہو کہ لوگ اس کے لیے تصویر بن کر کھڑے ہو جائیں وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔"

[ابوداؤد، کتاب الأدب: باب الرجل یقوم للرجل یعظمه بذلك (٥٢٢٩)]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہیں تھا اور وہ جب آپ کو دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ اس بات کو ناپسند فرماتے ہیں۔ [ترمذی، کتاب الأدب: باب ما جاء فی کراهیة قیام الرجل للرجل (٢٧٥٤)]

البتہ آگے بڑھ کر استقبال کرنا یا اٹھ کر ملنا اور بٹھانا درست ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بنو قریظہ کا فیصلہ کرنے کے لیے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو بلوایا، جب وہ قریب پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے انصار سے فرمایا: « قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ » "اپنے سردار کی طرف اٹھو۔" [بخاری، کتاب المغازی: باب مرجع النبی ﷺ من الأحزاب و مخرجه الی بنی قریظة و محاصرته إیاهم (٤١٢١)]

تعظیماً کھڑے ہونا

(سوال) کیا کسی آدمی کے لیے تعظیماً کھڑا ہونا ٹھیک ہے؟ کھڑا نہ ہونے پر قرآن و حدیث کا کیا حکم ہے؟

(جواب) کسی بھی شخص کے لیے اپنی جگہ تعظیماً کھڑا ہونا درست نہیں ہے۔ ہاں آگے بڑھ کر اگر استقبال کریں تو اس کی اجازت ہے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»

''جس آدمی کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔'' [ابو داؤد، کتاب الادب: باب الرجل يقوم للرجل يعظمة بذلك (٥٢٢٩)، ترمذى كتاب الاداب: باب ما جاء فى كراهية قيام الرجل للرجل (٢٧٥٤)]

ابومجلز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک گھر میں داخل ہوئے، اس گھر میں ابن عامر اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے تو ابن عامر کھڑے ہوگئے اور ابن الزبیر بیٹھے رہے۔ ابن عامر کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

''بیٹھ جاؤ! بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ بندے اس کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے ہو جائیں تو وہ اپنا گھر آگ میں بنالے۔'' [مسند احمد (٩١/٤)، الادب المفرد (٩٧٧)، تهذيب الآثار (٨٤٢)، شرح السنة(٣٣٣٠)]

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص محبوب و پیارا نہیں تھا اور جب صحابہ آپ کو دیکھ لیتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قیام کو برا سمجھتے ہیں۔'' [ترمذى، كتاب الادب: باب ما جاء فى كراهية قيام الرجل للرجل(٢٧٥٤)، شرح السنة (٢٩٤/١٢)]

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ کسی آدمی کے لیے قیام کرنا درست نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ساری کائنات سے زیادہ محبوب تھے ان کے لیے بھی قیام نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو ناپسند کرتے تھے اور آپ نے اس کے لیے وعید بھی بیان کی ہے تو پھر کوئی ٹیچر، پروفیسر، وکیل، جج یا وزیر و بریگیڈیئر اور جرنیل کس طرح اس قیام کے مستحق ہوسکتے ہیں، جو لوگ کسی کے لیے قیام نہ کرنے والے کو برا کہتے ہیں انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات پر غور و خوض کرنا چاہیے اور شرع کی مخالفت سے باز رہنا چاہیے۔

دونوں ہاتھوں سے سلام کرنا

سوال کیا دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

جواب مصافحہ کرنا سنت سے ثابت ہے اور اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں۔

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ اِلَّا غَفَرَ اللّٰهُ لَهُمَا قَبْلَ اَنْ يَّتَفَرَّقَا» [ترمذى، كتاب الاستئذان باب ما جآء فى المصافحة(٢٧٢٧)، ابن ماجه (٣٧٠٣)، ابو داؤد (٥٢١٢)، مسند احمد(٢٨٩/٤)]

''جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں، مصافحہ کرتے ہیں تو جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔''

واضح رہے کہ جس عمل کی اس قدر فضیلت ہو اس کا اجر تب ہی حاصل ہوسکتا ہے جب اسے صحیح سنت کے مطابق کیا جائے۔ مصافحہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملے تو اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ مصافحہ کرے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی معمول تھا۔ اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« لَقِيَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ اَنَا جُنُبٌ فَأَخَذَ بِيَدِيْ فَمَشَيْتُ مَعَهُ حَتّٰى قَعَدَ فَانْسَلَلْتُ » [بخاری، کتاب الغسل: باب الجنب یخرج و یمشی فی السوق وغیرہ(۲۸۵)]

''رسول اللہ ﷺ مجھے ملے اور میں جنبی تھا، آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا پھر میں آپ کے ساتھ چلا یہاں تک کہ آپ ﷺ بیٹھ گئے پس میں کھسک گیا۔''

② ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« لَقِيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ اَنَا جُنُبٌ فَمَدَّ يَدَهُ اِلَيَّ فَقَبَضْتُ يَدِيْ عَنْهُ وَ قُلْتُ اِنِّيْ جُنُبٌ فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّ الْمُسْلِمَ لَا يَنْجُسُ » [شرح معانی الآثار للطحاوی(۱/۱۶)]

''میں نے نبی اکرم ﷺ سے حالت جنابت میں ملاقات کی، آپ ﷺ نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا اور کہا: ''میں جنبی ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! مسلمان نجس نہیں ہوتا۔''

یہ حدیث ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے پر نص قطعی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ملاقات کے وقت مصافحہ کے لیے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور صحابی رسول سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اپنا ایک ہاتھ جو مصافحہ کے لیے بڑھانا تھا پیچھے کھینچ لیا اور عذر پیش کیا کہ میں جنبی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان تو نجس نہیں ہوتا۔

③ سیدنا عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« تَرَوْنَ كَفِّيْ هٰذَا فَاَشْهَدُ اَنِّيْ وَضَعْتُهَا عَلٰى كَفِّ مُحَمَّدٍ ﷺ » [مسند احمد (۴/۸۹)، موارد الظمآن (۹۴۰)]

''تم لوگ میری اس ہتھیلی کو دیکھتے ہو، میں نے اس ہتھیلی کو محمد ﷺ کی ہتھیلی پر رکھا ہے۔''

④ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! الرَّجُلُ مِنَّا يَلْقٰى اَخَاهُ اَوْ صَدِيْقَهُ اَيَنْحَنِيْ لَهُ ؟ قَالَ لَا قَالَ اَ فَيَلْتَزِمُهُ وَ يُقَبِّلُهُ ؟ قَالَ لَا قَالَ فَيَأْخُذُ بِيَدِهِ وَ يُصَافِحُهُ ؟ قَالَ نَعَمْ » [ترمذی، کتاب الاستئذان: باب ما جاء فی المصافحة(۲۷۲۸)]

''ایک آدمی نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کوئی آدمی اپنے بھائی یا دوست سے ملاقات کرے تو کیا اس کے لیے جھکے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔'' اس نے کہا: ''کیا اس سے چمٹ جائے اور اس کو بوسہ دے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔'' پھر اس نے کہا: ''کیا اس کا ہاتھ پکڑے اور مصافحہ کرے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے متعدد طرق کی وجہ سے اس حدیث کو سلسلہ صحیحہ میں نقل فرمایا ہے۔ [سلسلة الأحاديث الصحيحة(۸۸/۱)]

تاہم اس حدیث سے معانقے کی ممانعت نہیں نکلتی جو چمٹ کر ملنے سے مختلف ہے۔

⑤ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَا مِنْ مُّسْلِمَيْنِ الْتَقَيَا فَاَخَذَ اَحَدُهُمَا بِيَدِ صَاحِبِهِ اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يَّحْضُرَ دُعَائَهُمَا وَ لَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اَيْدِيْهِمَا حَتّٰى يَغْفِرَ لَهُمَا » [مسند احمد(۱٤۲/۳)، بزار فی کشف الأستار (ص/٤۱۹)]

''جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ ان کی دعاؤں میں موجود رہے اور ان کے ہاتھ علیحدہ ہونے سے پہلے انھیں بخش دے۔''

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ مصافحہ ایک ہاتھ کے ساتھ کرنا سنت ہے، رسول اللہ ﷺ اسی کی تعلیم دیتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی سنت پر عمل کرتے رہے۔ ویسے مصافحہ کے معنی میں بھی یہ بات شامل ہے کہ ہتھیلی کو ہتھیلی کے ساتھ ملایا جائے جیسا کہ امام ابن اثیر جزری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

'' وَ مِنْهُ حَدِيْثُ الْمُصَافَحَةِ عِنْدَ اللِّقَاءِ وَ هِيَ مُفَاعَلَةٌ مِنْ اِلْصَاقِ الْكَفِّ بِالْكَفِّ '' [النهاية فی غريب الحديث والأثر(۴۳/۳)]

''صفح لفظ سے ملاقات کے وقت مصافحہ کی حدیث بھی ہے، مصافحہ باب مفاعلہ سے ہتھیلی کی اندرونی جانب کو ہتھیلی کی اندرونی جانب سے ملانا ہے۔''

مصافحہ کا یہی معنی لغت کی کتاب قاموس اور تاج العروس وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ لہٰذا مصافحہ کی جو تعریف ہے وہ بھی اہل حدیث کے مصافحہ پر پوری طرح صادق آتی ہے اور جو مصافحہ احناف کے ہاں رائج ہے اس پر یہ تعریف صادق نہیں آتی۔ بعض لوگ دونوں ہاتھوں کے ساتھ مصافحہ کرنے کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« عَلَّمَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ كَفِّيْ بَيْنَ كَفَّيْهِ التَّشَهُّدَ » [بخاری، کتاب الاستئذان: باب الأخذ باليدين(٦۲٦٥)]

''رسول اللہ ﷺ نے مجھے تشہد سکھایا اور میرا ہاتھ آپ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا۔''

یاد رہے کہ اس حدیث کا ملاقات کے وقت مصافحہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس حدیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تشہد سکھا رہے تھے اور تعلیم کے وقت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا۔ اگر اسے ملاقات کے مصافحہ پر محمول کریں تو اس کی صورت یہ بنے گی کہ نبی ﷺ کے دو ہاتھوں میں

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک ہاتھ تھا یعنی تین ہاتھ کا مصافحہ۔ جس طرح کسی اہل حدیث کا حنفی حضرت سے مصافحہ ہو تو حنفی کے دو ہاتھ ہوتے ہیں اور اہل حدیث کا ایک ہاتھ اور حنفی بھائی اس مصافحہ کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان مقلدین بھائیوں پر سخت تعجب ہے کہ جو مصافحہ صحیح احادیث سے ثابت ہے وہ انھیں پسند نہیں اور جو مصافحہ ثابت نہیں (یعنی چار ہاتھوں کا) اس پر یہ اصرار کرتے ہیں۔ اس حدیث سے قطعاً یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے دو ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ہاتھوں سے ملے ہوئے تھے۔

اگر بفرض محال اس حدیث کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ دونوں طرف سے دونوں ہاتھوں کا مصافحہ ہے اور ابن مسعود کے قول "کَفِّیْ" اسم جنس سے ان کی دونوں ہتھیلیاں مراد لی جائیں تو اس صورت میں "کَفِّیْ بَیْنَ کَفَّیْهِ" کا مطلب یہ ہوگا کہ میری دونوں ہتھیلیاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان میں تھیں اور جو لوگ دو ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں ان کی یہ صورت نہیں ہوتی لہٰذا اس حدیث سے ان کا استدلال باطل ہے۔

مذہب حنفی کے جید علماء بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہتھیلی کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں پکڑنا مزید اہتمام اور تعلیم کی تاکید کے لیے تھا۔ مذہب حنفی کی فقہ کی معروف کتاب ہدایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے:

"اَخَذَ لِیَکُوْنَ حَاضِرًا فَلَا یَفُوْتُهُ شَیْءٌ" [الهداية: (١/ ٩٣)]

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اس لیے پکڑا تھا تاکہ ان کا دماغ حاضر رہے اور کوئی چیز ان سے فوت نہ ہو جائے۔"

علامہ زیلعی حنفی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"وَ مِنْهَا اَنَّهُ قَالَ فِیْهِ عَلَّمَنِی التَّشَهُّدَ وَ كَفِّیْ بَیْنَ كَفَّیْهِ وَ لَمْ یَقُلْ ذٰلِكَ فِیْ غَیْرِهِ فَدَلَّ عَلٰی مَزِیْدِ الْاِعْتِنَاءِ وَ الْاِهْتِمَامِ" [نصب الراية (١/ ٤٢١)]

"ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی تشہد کا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تشہد پر راجح ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تشہد سکھایا اور میری ہتھیلی آپ کی ہتھیلیوں کے درمیان تھی" اور یہ بات ابن عباس رضی اللہ عنہما کے تشہد میں نہیں۔ اس نے مزید توجہ اور اہتمام پر دلالت کی ہے۔"

یہی بات ابن ہمام حنفی رحمہ اللہ نے ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں لکھی ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑنا مصافحہ کی غرض سے نہیں تھا بلکہ مزید اہتمام و تاکید کے لیے تھے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے وہ مصافحہ جو ملاقات کے وقت کیا جاتا ہے، مراد نہیں ہے بلکہ یہ ہاتھ میں ہاتھ لینا ویسا ہے جیسا کہ بزرگ چھوٹوں کو کوئی چیز تعلیم کرنے کے وقت ہاتھ میں ہاتھ لے لیتے ہیں۔" [مجموعہ فتاویٰ اردو (١/ ١٣٤)]

علاوہ ازیں اور کئی احادیث سے بھی ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر تعلیم دینا ثابت ہے۔ ایک حدیث مندرجہ ذیل ہے۔

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَخَذَ بِيَدِهٖ وَ قَالَ يَا مُعَاذُ! وَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَاُحِبُّكَ قُلْتُ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاُحِبُّكَ فَقَالَ اُوْصِيْكَ يَا مُعَاذُ ! لَا تَدَعَنَّ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ تَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَ شُكْرِكَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِكَ »[ابوداؤد، كتاب الوتر: باب في الاستغفار(١٥٢٢)، نسائي (٥٣/٣)،عمل اليوم والليلة(١٠٩)، الأدب المفرد(٦٩١)، مسند احمد(٢٤٤/٥)، ابن خزيمة(٧٥١)، ابن حبان(٢٤٥)، حاكم (٢٧٣/١)]

''رسول اللہ ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''اے معاذ! اللہ کی قسم! میں تمھیں دوست رکھتا ہوں۔'' میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں بھی آپ ﷺ کو دوست رکھتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے معاذ! میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھنا نہ چھوڑنا: «اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَ شُكْرِكَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِكَ»''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ تعلیم میں یہ بات بھی شامل تھی کہ طالب علم کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھایا جائے تا کہ اس کا دھیان اور توجہ مطلوبہ مسئلے کی طرف ہو۔ حنفی حضرات کی مزید تسلی کے لیے ایک روایت پیش کی جاتی ہے۔

علامہ جلال الدین خوارزمی حنفی ہدایہ کی شرح کفایہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث تعلیم کی تاکید پر محمول ہے، اس لیے کہ محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: ''امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔'' ابو یوسف نے کہا: ''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔'' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا: ''حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔'' امام حماد کہتے ہیں: ''علقمہ رحمہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔'' علقمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔'' ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔'' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''جبرائیل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔'' [الكفاية شرح الهداية(٢٧٣/١)]

اس حنفی روایت سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کا دونوں ہاتھوں کے ساتھ مصافحہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ طریقہ تعلیم پر محمول ہے جو طالب علم کو مزید تاکید اور اہتمام و توجہ دلانے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اب تو حنفی حضرات کو اس حدیث سے مروجہ مصافحہ پر استدلال نہیں کرنا چاہیے بلکہ مذکورہ بالا صحیح احادیث کی رو سے دائیں ہاتھ کے ساتھ مصافحہ کرنا چاہیے کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ کی یہی سنت ہے اور یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے۔ (واللہ اعلم)

یہود و نصاریٰ سے سلام

سوال وہ مسلمان جو دیارِ غیر میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے مقیم ہیں ان کا غیر مسلموں سے میل جول ہوتا ہے تو کیا وہ اہل کتاب

کو سلام کہہ سکتے ہیں؟

جواب سلام کہنے سے ایک دوسرے کی عزت وتکریم ہوتی ہے اور عزت وتکریم کے لائق اہل اسلام ہیں، کفار نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [المنافقون:۸]

''اور عزت اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے لیکن منافقین نہیں جانتے۔''

یہودی اور عیسائی عزت والے نہیں بلکہ ذلیل ہیں، ان کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صَاغِرُوْنَ ﴾

[التوبة:۲۹]

''ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ اشیاء کو حرام نہیں سمجھتے نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے (یعنی یہود ونصاریٰ) یہاں تک کہ وہ ذلیل وخوار ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ یہود ونصاریٰ ذلیل وخوار لوگ ہیں، ان کی عزت وتکریم نہیں کرنی چاہیے۔ اسی ذلت اور خواری کا احساس دلانے کے لیے انھیں سلام میں پہل کرنے سے منع کیا گیا ہے اور انھیں تنگ راستے کی طرف مجبور کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تَبْدَأُوا الْيَهُوْدَ وَ لَا النَّصَارٰى بِالسَّلَامِ وَ اِذَا لَقِيْتُمْ اَحَدَهُمْ فِيْ طَرِيْقٍ فَاضْطَرُّوْهُ اِلٰى اَضْيَقِهٖ »[مسلم، كتاب السلام: باب النهى عن ابتداء اهل الكتاب بالسلام و كيف يرد عليهم (۲۱۶۷)، ابوداؤد ، كتاب الأدب: باب فى السلام على أهل الذمة(۵۲۰۵)، ترمذى، كتاب الاستئذان (۱۶۰۲)، مسند احمد (۲۶۶/۲)، عبد الرزاق(۱۹۴۵۷)، السلسلة الصحيحة(۷۰۴)]

''یہود ونصاریٰ کو سلام کہنے میں پہل نہ کرو اور جب تم ان میں سے کسی کو راستے میں ملو تو اسے تنگ راستے کی طرف مجبور کر دو۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ یہود ونصاریٰ کی تکریم نہیں کرنی چاہیے، انھیں سلام میں پہل نہیں کرنی چاہیے اور اگر وہ راستے میں مل جائیں تو انھیں تنگ راستے کی طرف گزرنے پر مجبور کر دیا جائے تاکہ وہ ذلیل وخوار ہوں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ راستے میں اگر ان سے ملاقات ہو تو پھر سلام میں پہل نہیں کرنی چاہیے اور اگر وہ گھر یا دکان وغیرہ پر ہوں تو پھر ممانعت نہیں ہے۔ یہ تاویل فاسد ہے۔ سہیل بن ابی صالح کہتے ہیں کہ میں اپنے باپ کے ساتھ شام کی طرف نکلا، شام والے گرجا گھروں میں رہنے والوں کے پاس سے گزرتے تو ان پر سلام کہتے۔ میں نے اپنے باپ سے سنا، انھوں نے کہا: ''میں

نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے:

« لَا تَبۡدَءُوۡهُمۡ بِالسَّلَامِ وَ اضۡطَرُّوۡهُمۡ اِلٰى اَضۡيَقِهٖ »[مسند احمد(۳۵۰/۸)، بتحقیق احمد شاکر]

''انھیں سلام کہنے میں پہل نہ کرو اور انھیں تنگ راستے کی طرف مجبور کر دو۔''

اس حدیث کے راوی ابو صالح ذکوان ثقہ تابعی ہیں، انھوں نے اس حدیث کو پیش کر کے واضح کر دیا ہے کہ اس حدیث میں جو ممانعت ہے وہ ہر اہل کتاب کے لیے ہے خواہ وہ اپنے گھر ہی میں کیوں نہ ہو۔

ابو عثمان النہدی کہتے ہیں کہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خط میں ایک راہب کو سلام لکھا تو انھیں کہا گیا: « اَتُسَلِّمُ عَلَيۡهِ وَ هُوَ كَافِرٌ » ''کیا تم اس کافر کو سلام کہتے ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: « اَنَّهٗ كَتَبَ اِلَيَّ فَسَلَّمَ عَلَيَّ وَ رَدَدۡتُ عَلَيۡهِ» ''اس نے مجھے خط لکھا اور سلام کہا میں نے بھی اس کا جواب دے دیا۔''[الأدب المفرد(۱۱۰۱)]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون میں یہ بات معروف تھی کہ اہل کتاب کو سلام کہنے میں پہل نہیں کی جاتی تھی خواہ وہ گھر میں ہوتا یا راستے میں، تبھی ابو موسیٰ پر تعجب کا اظہار کیا گیا اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اسے تسلیم کیا، اس پر انکار نہیں کیا بلکہ عذر پیش کیا کہ اس راہب نے مجھے اپنے خط میں سلام لکھا تھا میں نے اس کا جواب دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جب ہرقل کو خط لکھا تھا تو اس میں اسے سلام کہنے میں پہل نہیں کی بلکہ لکھا:

« بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ مِنۡ مُحَمَّدٍ عَبۡدِ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ اِلٰى هِرَقۡلَ عَظِيۡمِ الرُّوۡمِ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الۡهُدٰى »[بخاری، کتاب بدء الوحی(۷)، مسلم، کتاب الجهاد والسير(۱۳۷۳)، الأدب المفرد (۱۱۰۹)]

''اللہ کے نام کے ساتھ جو رحم کرنے والا اور نہایت مہربان ہے، محمد ﷺ کی طرف سے جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں ہرقل کی طرف جو روم کا حکمران ہے۔ سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔''

اگر آپ ﷺ کی یہود و نصاریٰ کو سلام کی ممانعت صرف راستے کے ساتھ خاص ہوتی تو آپ ﷺ ہرقل کو سلام کہنے میں ابتدا کرتے۔ آپ کے عمل سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ سلام کہنے کی یہ ممانعت یہود و نصاریٰ کو ہر مقام پر شامل ہے۔

اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ نے یہودی لڑکے کی عیادت کی تو اسے کہا: « اَسۡلِمۡ » ''اسلام قبول کر لے۔''

[بخاری، کتاب الجنائز: باب إذا أسلم الصبی فمات هل يصلی عليه؟ وهل يعرض علی الصبی الإسلام (۱۳۵۶)]

تاہم یہود و نصاریٰ کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''کیا حال ہے'' یا ''تم نے صبح کیسے کی'' وغیرہ جیسا کہ علقمہ تابعی فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک بستی کے رئیس کو اشارے سے سلام کہا۔[الأدب المفرد(۶۲۰/۲)]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس اثر پر یہ باب قائم کیا ہے: '' بَابُ مَنۡ سَلَّمَ عَلٰى ذِمِّيٍّ اِشَارَةً '' یعنی اس بات کا بیان کہ جس نے ذمی کو اشارے سے سلام کہا۔

معلوم ہوا کہ زبان سے اسلام علیکم جیسے پیارے الفاظ سے یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل کرنے کی ممانعت ہے البتہ اشارہ

جو مسلمانوں کا خاص سلام نہیں ہے یا حال احوال دریافت کرنے کی ممانعت نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگر آپ کو عیسائی یا یہودی وغیرہ جیسے کفار سلام میں پہل کریں تو آپ انھیں اس کا جواب دے سکتے ہیں۔سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ الْيَهُودَ إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمْ أَحَدُهُمْ فَإِنَّمَا يَقُولُ السَّامُ عَلَيْكُمْ فَقُولُوا وَ عَلَيْكُمْ » [ابوداؤد، كتاب الأدب: باب في السلام على أهل الذمة(٥٢٠٦)]

''بلاشبہ یہود میں سے جب تمھیں کوئی سلام کہتا ہے تو وہ کہتا ہے تم پر موت واقع ہو تو تم کہو اور تم پر بھی۔''

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا تو اس نے کہا: '' اَلسَّامُ عَلَيْكُم'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے اس کو سلام لوٹایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس نے ''السَّامُ عَلَيْكُم'' کہا ہے۔'' وہ یہودی پکڑا گیا تو اس نے اعتراف کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اس نے کہا وہ اس پر لوٹا دو۔'' [الأدب المفرد (١١٠٥)، إرواء الغليل(١٢٧٦)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہودی و عیسائی جو کلمہ کہے وہی اس پر لوٹاتے ہوئے ''وعلیکم'' کہہ دیں۔ اگر اس نے ''السام علیکم'' کہا ہوگا تو خود اس کا مستحق ٹھہرے گا اور اگر دعائیہ کلمہ کہا ہوگا تو پھر اسے بھی دعا مل جائے گی۔ اگر صاف معلوم ہو کہ اس نے ''السلام علیکم'' کہا ہے تو اس کے جواب میں اگر کسی نے ''وعلیکم السلام'' کہہ دیا تو یہ بھی جائز ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے:

﴿ وَ إِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ﴾ [النساء:٨٦]

''جب تمھیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر جواب دو یا وہی الفاظ لوٹا دو۔''

یہ آیت اپنے عموم کی وجہ سے یہود و نصاریٰ کو بھی شامل ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« رُدُّوا السَّلَامَ عَلَىٰ مَنْ كَانَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا أَوْ مَجُوسِيًّا ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ يَقُولُ : ﴿ وَ إِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا﴾ »[الأدب المفرد(١١٠٧)]

''سلام لوٹاؤ خواہ کوئی یہودی ہو، عیسائی یا مجوسی ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جب تمھیں سلام کہا جائے تو اس سے بہتر جواب دو یا وہی الفاظ لوٹا دو۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک اور روایت میں ہے:

« لَوْ قَالَ لِيْ فِرْعَوْنُ بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ قُلْتُ وَ فِيْكَ وَ فِرْعَوْنُ قَدْ مَاتَ »[الادب المفرد(١١١٣)]

''اگر فرعون مجھے کہتا اللہ تجھ میں برکت ڈالے تو میں کہتا اور تجھ میں بھی اور بلاشبہ فرعون مر چکا ہے۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر دعائیہ کلمہ کہنے میں پہل کرے تو اسے جواب دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿ لَا یَنۡهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡكُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ لَمۡ یُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِیَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴾ [الممتحنة:٨]

''جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمھیں جلا وطن نہیں کیا، ان کے ساتھ سلوک و احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمھیں نہیں روکتا بلکہ اللہ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جو کفار مسلمانوں سے لڑائی نہیں کرتے اور ان کے دین میں مداخلت نہیں کرتے تو ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جا سکتا ہے، لہٰذا جب وہ ''السلام علیکم'' کہیں تو انھیں ''وعلیکم السلام'' کہہ دیں تو جائز ہے۔

روز قیامت انسان کو کس نام سے پکارا جائے گا؟

سوال ہم نے سنا ہے کہ قیامت کے دن تمام انسانوں کو ان کی ماں کے نام سے پکارا جائے گا کیا یہ صحیح ہے؟ اور کیا اس کا ثبوت قرآن وحدیث سے ملتا ہے؟

جواب سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّ الْغَادِرَ یُرْفَعُ لَهُ لِوَاءٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یُقَالُ هٰذِهِ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ »[بخاری، کتاب الأدب : باب ما یدعی الناس بآباء هم (٦١٧٧)]

''عہد توڑنے والے کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا اٹھایا جائے گا اور کہا جائے گا: ''یہ فلاں بن فلاں کی دغابازی ہے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں باب قائم کیا ہے:

''بَابُ مَا یُدْعَی النَّاسُ بِآبَائِهِمْ''

''یعنی لوگوں کو (قیامت والے دن) ان کے باپوں کے ناموں سے پکارا جائے گا۔''

اس حدیث کے ان الفاظ ''فلاں بن فلاں کی دغابازی ہے'' سے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ اخذ کیا ہے کہ قیامت والے دن آدمی کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا، ماں کے نام سے نہیں، کیوں کہ یہ نہیں فرمایا کہ یہ فلاں بن فلانی کی دغابازی ہے۔

امام ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں ایسے لوگوں کا رد ہے جو سمجھتے ہیں قیامت والے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے ناموں سے پکارا جائے گا، اس لیے کہ اس میں ان کے باپوں پر پردہ ڈالا جائے گا۔ یہ حدیث ان کے قول کے خلاف ہے۔'' [شرح صحیح البخاری(٣٣٥/٩)]

اور جو روایات ماؤں کے نام سے پکارنے پر دلالت کرتی ہیں وہ انتہائی ضعیف اور منکر ہیں۔

[ملاحظہ ہو:فتح الباری (٥٦٣/١٠)]

والدین کی طرف دیکھنے کے متعلق حدیث کی وضاحت

(سوال) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی طرف نظر رحمت سے دیکھنے سے حج کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ کیا یہ حدیث اور اس میں ذکر کردہ فضیلت صحیح ثابت ہے؟

(جواب) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

''نہیں ہے کوئی نیک اولاد جو اپنے والدین کی طرف نظر رحمت سے دیکھے مگر اللہ ہر نظر کے بدلے اس کے لیے ایک حج مبرور لکھ دیتا ہے۔'' صحابہ کرام نے کہا: ''اگر ہر روز سو مرتبہ دیکھے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!'' اللہ سب سے بڑا اور سب سے پاکیزہ ہے۔''[شعب الایمان: باب فی برالوالدین (۷۸۵۹)، هداية الرواة (٤٨٧٢)]

یہ روایت موضوع و من گھڑت ہے، اس کی سند میں نہشل بن سعید ہے۔ نہشل متروک ہے، امام اسحاق بن راہویہ نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔ [تقریب مع تحریر(٤/٢٥)]

علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ (۲۶۷۳) میں موضوع قرار دیا ہے جیسا کہ ہدایۃ الرواۃ کی تعلیق میں مذکور ہے۔ لہٰذا یہ روایت جعلی اور بناوٹی ہے، حدیث رسول نہیں ہے۔

غسل خانے میں گفتگو

(سوال) کیا کسی ضرورت کے وقت غسل خانے میں گفتگو کی جا سکتی ہے؟ وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

(جواب) بوقت ضرورت غسل خانے میں گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔ سیدہ ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« ذَهَبْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَامَ الْفَتْحِ فَوَجَدْتُّهُ يَغْتَسِلُ وَ فَاطِمَةُ ابْنَتُهُ تَسْتُرُهُ قَالَتْ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَقَالَ مَنْ هٰذِهِ ؟ فَقُلْتُ اَنَا اُمُّ هَانِیءٍ بِنْتُ اَبِیْ طَالِبٍ فَقَالَ مَرْحَبًا بِاُمِّ هَانِیءٍ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ غُسْلِهِ قَامَ فَصَلّٰى ثَمَانِیَ رَكَعَاتٍ مُلْتَحِفًا فِیْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ فَلَمَّا انْصَرَفَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! زَعَمَ ابْنُ اُمِّیْ اَنَّهٗ قَاتِلٌ رَجُلًا قَدْ اَجَرْتُهٗ فُلَانُ بْنُ هُبَيْرَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَدْ اَجَرْنَا مَنْ اَجَرْتِ يَا اُمَّ هَانِیءٍ ! قَالَتْ اُمُّ هَانِیءٍ وَ ذَاكَ ضُحًى »[بخاری، كتاب الصلاة : باب الصلاة فی الثوب الواحد (٣٥٧)]

''میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گئی جس سال مکہ فتح ہوا۔ میں نے آپ ﷺ کو غسل کرتے ہوئے پایا اور آپ کی بیٹی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے لیے پردہ کیا ہوا تھا۔ میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کون

ہے؟'' میں نے کہا: ''میں ام ہانی ابو طالب کی بیٹی ہوں۔'' آپ ﷺ نے مرحبا کہا۔ جب آپ ﷺ غسل سے فارغ ہوئے تو (نماز کے لیے) کھڑے ہو گئے۔ آپ ﷺ نے آٹھ رکعتیں ادا کیں۔ آپ ﷺ نے ایک ہی کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میری ماں کے بیٹے (علی بن ابی طالب) نے کہا ہے کہ وہ ہبیرہ کے فلاں بیٹے کو مار ڈالیں گے حالانکہ میں نے اسے پناہ دے رکھی ہے۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ام ہانی! جسے تو نے پناہ دی ہم نے بھی اسے پناہ دی۔'' ام ہانی نے کہا: ''یہ چاشت کا وقت تھا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غسل کرتے وقت دوسرے فرد سے بات کی جا سکتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ام ہانی رضی اللہ عنہا کے بارے میں پوچھا بھی اور مرحبا بھی کہا۔ لہٰذا اگر کوئی آدمی غسل خانے میں نہا رہا ہو اور کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ طلب کر سکتا ہے، شرعی طور پر اس میں کوئی حرج نہیں۔

برہنہ حالت میں کسی کو دیکھنا

سوال کیا مرد دوسرے مرد کو کپڑے تبدیل کرتے وقت دیکھ سکتا ہے؟ اور عورت بھی عورت کو کپڑے تبدیل کرتے وقت ننگی حالت میں دیکھ سکتی ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب آدمی کا آدمی کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا، اسی طرح عورت کا عورت کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا حرام ہے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مرد مرد کی شرمگاہ نہ دیکھے اور نہ عورت عورت کی شرمگاہ دیکھے اور آدمی آدمی کے ساتھ ایک کپڑے میں برہنہ نہ لیٹے اور نہ عورت عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں برہنہ لیٹے۔'' [صحيح مسلم، كتاب الحيض: باب تحريم النظر الى العورات (٣٣٨)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ مرد و خواتین کے لیے ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھنا حرام ہے۔ امام ابن القطان الفاسی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''مرد کے لیے مرد کی شرم گاہ دیکھنا حلال نہیں، یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔''

اس کے بعد اوپر ذکر کردہ حدیث کو بطور استدلال پیش کیا ہے، اسی طرح انھوں نے ایک اور مقام پر عورت کے لیے عورت کی شرمگاہ کو دیکھنا بھی کو حرام قرار دیا ہے اور یہی حدیث بطور دلیل ذکر کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث سے واضح ہو گیا کہ مرد حضرات مردوں کی شرمگاہ کو نہیں دیکھ سکتے، اسی طرح عورتیں عورتوں کی شرمگاہ کو نہیں دیکھ سکتیں۔

روزانہ کنگھی کرنا

سوال کیا روزانہ کنگھی کرنے سے رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے؟ وضاحت فرما کر ہماری تسلی کر دیں۔

(جواب) سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

« نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَنِ التَّرَجُّلِ اِلَّا غِبًّا »[نسائی ، کتاب الزينة: باب الترجل غبا (٥٠٥٨)]

''رسول اللہ ﷺ نے کنگھی کرنے سے منع فرمایا ہے مگر ناغے سے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بالوں کو روزانہ کنگھی نہیں کرنی چاہیے لیکن سنن نسائی ہی کی ایک روایت سے یہ پتا چلتا ہے کہ اگر بال بہت زیادہ بکھرے ہوئے ہوں تو روزانہ کنگھی کی اجازت ہے۔ سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَتْ لَهُ جُمَّةٌ ضَخْمَةٌ فَسَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَهُ اَنْ يُّحْسِنَ اِلَيْهَا اَنْ يَّتَرَجَّلَ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ »[نسائی، کتاب الزينة: باب تسكين الشعر (٥٢٣٩)]

''ان کے سر پر بھاری بال تھے تو انھوں نے نبی ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے انھیں حکم دیا کہ بالوں سے اچھا سلوک کریں اور روزانہ کنگھی کریں۔''

اس روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض نے یہ تطبیق دی ہے کہ اگر بھاری بال ہوں تو روزانہ کنگھی کرنے کی اجازت ہے ورنہ روزانہ کنگھی کرنا ناجائز ہے۔ لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''ابوقتادہ کی طرف منسوب یہ روایت جس میں انھیں روزانہ کنگھی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ ان احادیث کے خلاف ہے جن میں آپ ﷺ نے روزانہ کنگھی کرنے سے منع فرمایا ہے۔'' [سلسلة الأحاديث الصحيحة (٢٢٥٢)]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ روزانہ کنگھی کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ روزانہ کنگھی کرنے کے جواز کی کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم)

پینٹ شرٹ پہننا

(سوال) کیا کسی مسلمان کے لیے پینٹ شرٹ پہننا جائز ہے؟ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو شخص جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انھیں میں سے ہوگا۔'' اس طرح پینٹ شرٹ اور ٹائی غیر مسلموں کا لباس ہے، براہِ کرم قرآن و حدیث کی روشنی میں درست رہنمائی فرمائیں۔

(جواب) شریعت اسلامیہ میں مرد و عورت کے لیے جو لباس اختیار کیا گیا ہے وہ ایسا ہے جس سے ستر کا مقصود پورا ہو۔ اگر ایسا لباس پہنے جس سے جسم کے چھپانے والے حصے نمایاں ہوں تو وہ ستر کا مقصود پورا نہیں کرتا، اسے اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ پینٹ کی کئی شکلیں ہیں، بعض ایسی ہیں جو تنگ ہوتی ہیں اور اس میں شرم گاہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں محدث العصر شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''پینٹ میں دو مصیبتیں ہیں:

① پینٹ پہننے والا کفار سے مشابہت اختیار کرتا ہے جبکہ مسلمان کشادہ اور کھلے پاجامے پہنتے ہیں۔ شام اور لبنان میں بعض مسلمان ہمیشہ اس طرح کرتے ہیں۔ مسلمان استعماری طاقتوں سے پہلے پینٹ کو نہیں جانتے تھے، استعماریوں کے آنے پر انھوں نے ان کی عادات سیئہ کو اپنی جہالت و بغاوت کی وجہ سے اختیار کر لیا۔

② پینٹ شرم گاہ کو ابھارتی ہے۔ آدمی کی شرم گاہ گھٹنے سے ناف تک ہے اور نمازی آدمی پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی سے اس وقت بہت دور ہو جب وہ اس کو سجدہ کر رہا ہو۔'' [ملخص ازالقول المبین (ص/ ۲۰)]

رسول اللہ ﷺ نے ایسے پاجامے میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے جس کے اوپر چادر نہ پہنی گئی ہو، ملاحظہ ہو:

[ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ: باب إذا کان الثوب ضیقًا یتزر بہ (٦٣٦)]

البتہ اگر پینٹ کشادہ ہو، تنگ نہ ہو، جس میں شرمگاہ نمایاں نہ ہو تو اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں اور افضل و بہتر یہ ہے کہ پینٹ کے اوپر اتنی لمبی قمیص یا شرٹ ہو کہ آدمی کی ناف سے اور گھٹنے کے درمیان والے حصے کو چھپا لے تاکہ ستر کا مقصود پورا ہو جائے اور ٹائی لگانا تو صلیب سے مشابہت ہے، اس سے مکمل اجتناب لازم ہے۔

کس رنگ کی پگڑی پہننا مسنون ہے؟

سوال آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف لوگوں نے مختلف رنگ کی پگڑیوں کو اپنا مخصوص شعار بنا لیا ہے مہربانی فرما کر مطلع کر دیں کہ سبز، سرخ، سفید اور سیاہ میں سے کون سے رنگ کی پگڑی پہننا اللہ کے نبی ﷺ سے ثابت ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے سفید لباس پسند فرمایا ہے اور اسے پہننے کی ترغیب بھی دی ہے جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں

« قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِالْبَيَاضِ مِنَ الثِّيَابِ فَلْيَلْبَسْهَا اَحْيَاءُ كُمْ وَ كَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ فَاِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ »[نسائی، کتاب الزینة: باب الامر بلبس البیض من الثیاب (٥٣٢٥)، مسند احمد (١٢/٥)]

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سفید لباس کو لازم پکڑو، اس کو تمھارے زندہ لوگ پہنیں اور اس میں اپنے مردوں کو کفن دو، یقیناً یہ تمھارے بہترین کپڑوں میں سے ہے۔''

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِلْبَسُوْا الْبَيَاضَ فَاِنَّهَا اَطْهَرُ وَ اَطْيَبُ وَ كَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ »[ترمذی، کتاب الأدب :باب ماجآء فی لبس البیاض(٢٨١٠)، ابن ماجه (٣٥٦٧)، طیالسی (١٨٠٠)]

''سفید لباس پہنو، یقیناً یہ بہت زیادہ پاک اور عمدہ ہے اور اس میں اپنے مردوں کو کفن دو۔''

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ سفید لباس نہایت عمدہ اور پسندیدہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اسے پہننے کی ترغیب دلائی ہے اور آپ ﷺ نے ایک صحابی کو سفید پگڑی بندھوائی اور پگڑی جو اللہ کے رسول ﷺ باندھا کرتے تھے، اس کا رنگ

حدیث میں سیاہ مذکور ہے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

« دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَكَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَ عَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ »[ترمذی، کتاب اللباس: باب ما جآء فی العمامة السوداء (١٧٣٥)،دارمی (٨٤/٢)]

''نبی ﷺ فتح مکہ والے دن مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ پر سیاہ پگڑی تھی۔''

حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ خَطَبَ النَّاسَ وَ عَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ »[مسلم، کتاب الحج باب جواز دخول مکة بغیر احرام (١٣٥٩)]

''رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور آپ کے سر پر سیاہ پگڑی تھی۔''

سنن ابی داؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں، عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَ عَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ قَدْ اَرْخٰى طَرَفَهَا بَيْنَ كَتِفَيْهِ »[ابوداود، کتاب اللباس: باب فی العمائم(٤٠٧٧)]

''میں نے نبی کریم ﷺ کو منبر پر دیکھا، آپ نے خطبہ دیا اور آپ کے سر پر سیاہ پگڑی تھی۔ آپ ﷺ نے اس کے شملہ کو اپنے کندھوں کے درمیان لٹکایا ہوا تھا۔''

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا اعْتَمَّ سَدَلَ عِمَامَتَهُ بَيْنَ كَتِفَيْهِ قَالَ نَافِعٌ وَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ يَسْدِلُ عِمَامَتَهُ بَيْنَ كَتِفَيْهِ قَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ رَاَيْتُ الْقَاسِمَ وَسَالِمًا يَفْعَلَانِ ذٰلِكَ »[ترمذی، کتاب اللباس: باب فی سدل العمامة بین الکتفین(١٧٣٦)]

''نبی کریم ﷺ جب پگڑی باندھتے تو اس کے شملہ کو اپنے کندھوں کے درمیان لٹکا دیتے۔'' نافع رحمہ اللہ نے کہا: ''ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔'' عبید اللہ نے کہا: ''میں نے قاسم بن محمد بن ابی بکر اور سالم بن عبد اللہ بن عمر کو اسی طرح دیکھا۔''

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ سیاہ پگڑی باندھنا سنت نبوی ہے۔ رہا سبز پگڑی کا مسئلہ تو اس کا کسی صحیح حدیث میں ذکر موجود نہیں۔ اگر کسی بھائی کے علم میں سبز پگڑی کی صحیح حدیث ہو تو وہ ہمیں لکھ کر بھیج دے۔ اسی طرح سرخ رنگ کا ذکر بھی ہمیں کسی صحیح حدیث سے نہیں ملا۔

ٹوپی پر پگڑی باندھنا

سوال کیا ٹوپی پہن کر اوپر پگڑی باندھ لینے میں کوئی شرعی قباحت ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما دیں۔

جواب امام ابن قیم رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" كَانَتْ لَهُ عَمَامَةٌ تُسَمَّى السَّحَابُ كَسَاهَا عَلِيًّا وَ كَانَ يَلْبَسُهَا وَ يَلْبَسُ تَحْتَهَا الْقَلَنْسُوَةَ وَ كَانَ يَلْبَسُ الْقَلَنْسُوَةَ بِغَيْرِ عَمَامَةٍ وَ يَلْبَسُ الْعَمَامَةَ بِغَيْرِ قَلَنْسُوَةٍ " [زاد المعاد(۱/ ۱۳۵)]

'' نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک پگڑی تھی جس کا نام سحاب تھا، آپ ﷺ نے وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پہنائی، اسے آپ پہنتے اور کبھی اس کے نیچے ٹوپی ہوتی اور کبھی ٹوپی بغیر پگڑی کے اور پگڑی بغیر ٹوپی کے پہن لیتے۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ کی اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف پگڑی باندھنا یا صرف ٹوپی پہن لینا یا ٹوپی پر پگڑی باندھ لینا، تینوں طرح جائز و درست ہے کسی صحیح حدیث میں اس کی نفی یا ممانعت نہیں ہے۔

لوہے کی انگوٹھی پہننا

سوال کیا لوہے کی انگوٹھی پہننا حرام اور ممنوع ہے اور اس کا ثبوت کیا ہے؟

جواب خالص لوہے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ رَجُلًا اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ فِيْ يَدِهِ خَاتَمٌ مِّنْ ذَهَبٍ فَاَعْرَضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَنْهُ فَلَمَّا رَاَى الرَّجُلُ كَرَاهِيَتَهُ ذَهَبَ فَاَلْقَى الْخَاتَمَ وَ اَخَذَ خَاتَمًا مِّنْ حَدِيْدٍ فَلَبِسَهُ وَ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: هٰذَا شَرٌّ هٰذَا حِلْيَةُ اَهْلِ النَّارِ فَرَجَعَ فَطَرَحَهُ وَ لَبِسَ خَاتَمًا مِّنْ وَرِقٍ فَسَكَتَ عَنْهُ النَّبِيُّ ﷺ »[الأدب المفرد(۱۰۲۱)، مسند احمد(۲/ ۱۶۳)]

'' ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا۔اس کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی تھی، نبی ﷺ نے اس سے منہ موڑ لیا۔ جب اس آدمی نے نبی ﷺ کی ناپسندیدگی دیکھی تو سونے کی انگوٹھی اتار دی اور لوہے کی انگوٹھی لے کر پہن لی اور دوبارہ نبی ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: '' یہ بدترین ہے، یہ جہنمیوں کا زیور ہے۔'' وہ پلٹ گیا اور اسے اتار کر پھینک دیا اور چاندی کی انگوٹھی پہن لی، اس پر رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے اور اس کے مزید شواہد بھی نقل کیے ہیں۔ [غاية المرام(ص/ ٦٨)، آداب الزفاف (ص/ ۲۱۷)]

بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ رَجُلًا جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ عَلَيْهِ خَاتَمٌ مِنْ شَبَهٍ فَقَالَ لَهُ مَا لِيْ اَجِدُ مِنْكَ رِيْحَ الْاَصْنَامِ ؟ فَطَرَحَهُ ثُمَّ جَاءَ وَ عَلَيْهِ خَاتَمٌ مِّنْ حَدِيْدٍ فَقَالَ مَا لِيْ اَرَى عَلَيْكَ حِلْيَةَ

اَهْلِ النَّارِ ؟ فَطَرَحَهُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! مِنْ اَيِّ شَيْءٍ اَتَّخِذُهُ ؟ قَالَ اتَّخِذْهُ مِنْ وَرِقٍ وَ لَا تُتِمَّهُ مِثْقَالًا »[ابوداؤد، كتاب الخاتم: باب ما جآء في خاتم الحديد(٤٢٢٣)،نسائی، كتاب الزينة: باب مقدار ما يجعل في الخاتم من فضة (٥١٩٨)، ترمذی، كتاب اللباس: باب ما جآء في الخاتم الحديث (١٧٨٥)]

''ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا اس نے پیتل کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: ''کیا بات ہے کہ میں تجھ سے بتوں کی بو محسوس کر رہا ہوں؟'' اس نے اس انگوٹھی کو اتار کر پھینک دیا۔ پھر آیا تو اس نے لوہے کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا بات ہے کہ میں تجھ پر آگ والوں کا زیور دیکھ رہا ہوں؟'' اس نے اسے پھینک دیا، پھر اس نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں کس چیز کی انگوٹھی بناؤں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک مثقال سے کم چاندی کی بنا لے۔''

اس روایت کی سند حسن درجہ سے کم نہیں۔ [نيل المقصود(٤٢٢٣)]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ لوہے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے البتہ اگر لوہے کی انگوٹھی کے ساتھ چاندی کی ملاوٹ کر کے ملمع سازی کی گئی ہو تو اس کی رخصت ہے جیسا کہ معیقیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَ خَاتَمُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنْ حَدِيْدٍ مَلْوِيٍّ عَلَيْهِ فِضَّةٌ قَالَ وَ رُبَّمَا كَانَ فِيْ يَدِيْ فَكَانَ مُعَيْقِيْبُ عَلٰى خَاتَمِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ »[ابوداؤد، كتاب الخاتم: باب ما جاء في خاتم الحديد(٤٢٢٤)،نسائی، كتاب الزينة: باب لبس خاتم حديد ملوى عليه فضة(٥٢٢٠)، بيهقی فی شعب الايمان(٦٣٥٢)]

''رسول اللہ ﷺ کی انگوٹھی لوہے کی بنی ہوئی تھی اور اس پر چاندی کی ملمع سازی کی گئی تھی۔ وہ بعض اوقات میرے ہاتھ میں ہوتی۔ معیقیب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی انگوٹھی کے نگران تھے۔''

ان دونوں احادیث کو جمع کرنے سے معلوم ہوا کہ محض لوہے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے البتہ اگر اس پر چاندی لگی ہوئی ہو تو پھر جائز ہے۔ علاوہ ازیں صحیح بخاری کی جس روایت میں یہ الفاظ ہیں: « اِلْتَمِسْ وَ لَوْ خَاتَمًا مِّنْ حَدِيْدٍ »'' تم تلاش کرو اگرچہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔'' اس کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اُسْتُدِلَّ بِهٖ عَلٰى جَوَازِ لُبْسِ خَاتَمِ الْحَدِيْدِ وَ لَا حُجَّةَ فِيْهِ لِاَنَّهٗ لَا يَلْزَمُ مِنْ جَوَازِ الْاِتِّخَاذِ جَوَازُ اللُّبْسِ فَيَحْتَمِلُ اَنَّهٗ اَرَادَ وَ جُوْدَهٗ لِتَنْتَفِعَ الْمَرْاَةُ بِقِيْمَتِهٖ" [فتح الباری(١٠/٣٢٣)]

''اس حدیث سے لوہے کی انگوٹھی پہننے پر استدلال کیا گیا ہے حالانکہ اس میں اس کے جواز پر کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے کہ انگوٹھی لانا، انگوٹھی پہننے کو لازم نہیں۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے انگوٹھی کے وجود کا ارادہ کیا ہو تا کہ عورت اس کی قیمت سے نفع حاصل کرے۔''

لہٰذا یہ حدیث محض لوہے کی انگوٹھی پہننے پر نص قطعی نہیں ہے، اگر اس سے مراد لوہے کی وہ انگوٹھی لی جائے جو چاندی سے ملمع

ہوتو پھر کوئی حرج نہیں۔ وگرنہ خالص لوہے کی انگوٹھی حرام ہے جیسا کہ اوپر احادیث ذکر کر دی گئی ہیں۔
بعض ائمہ نے یہ بھی کہا ہے کہ مذکورہ حدیث میں اگر اباحت ہے تو دیگر احادیث میں تحریم ہے اور جب مباح وتحریم کا باہم تعارض ہوجائے تو حکم تحریم کا لگایا جاتا ہے۔ [ملاحظہ ہو: آداب الزفاف (ص/۲۱۹)]
امام اسحاق بن منصور المروزی رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا: "اَلْخَاتَمُ مِنْ ذَهَبٍ اَوْ حَدِيْدٍ يُكْرَهُ؟ فَقَالَ اَىْ وَاللّٰهِ" (کیا سونے یا لوہے کی انگوٹھی مکروہ ہے؟ تو انھوں نے کہا: ہاں! اللہ کی قسم!) [مسائل المروزی (۲۲٤)، بحوالہ آداب الزفاف (ص/۲۱۹)]
اور یہ بات اصول کی کتب میں موجود ہے کہ جب مطلق مکروہ کا لفظ بولا جائے تو مکروہ تحریمی مراد ہوتا ہے، یہی بات عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، امام مالک، امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ وغیرہ سے مروی ہے۔ [غاية المرام (ص/٦٩)]

کافر کا دیا ہوا تحفہ قبول کرنا

سوال کیا کسی کافر کا دیا ہوا تحفہ قبول کیا جا سکتا ہے اور انھیں تحفہ دینا کیسا ہے؟

جواب کافر کا دیا ہوا تحفہ، ہدیہ یا عطیہ قبول کرنا جائز و درست ہے۔ ایک بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ وہ چیز اسلام میں استعمال کرنا جائز و درست ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی کفار کی جانب سے بھیجے گئے ہدایا وتحائف قبول کیے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں "باب قبول الهدية من المشركين" قائم کر کے اس کا جواز ثابت کیا ہے اور مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے ہیں۔

① سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زہر آلود بکری کا گوشت لائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے کچھ کھایا پھر جب اس عورت کو لایا گیا تو اس نے زہر ڈالنے کا اقرار کیا تو کہا گیا کیوں نہ ہم اسے قتل کر دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں۔" انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "اس زہر کا اثر میں نے ہمیشہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تالو میں محسوس کیا۔" [بخاری، کتاب الهبة: باب قبول الهدية من المشركين (۲٦۱۷)]

② مکہ سے مصر جاتے ہوئے سمندر کے کنارے ایلہ نامی ایک بندرگاہ تھی، وہاں کے عیسائی حاکم کا نام یوحنا بن ادبہ تھا۔ تو اس حاکم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفید خچر اور ایک چادر ہدیہ کے طور پر بھیجی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لکھا کہ وہ اپنی قوم کے حاکم کی حیثیت سے باقی رہے، کیونکہ اس نے جزیہ کی ادائیگی منظور کر لی ہے۔ [بخاری، کتاب الزكاة: باب خرص التمر (۱٤۸۱)، دارمی (۲٥۳۷)]

③ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ریشم کا جبہ دیا گیا، یہ جبہ دومہ (تبوک کے نزدیک ایک مقام کا نام ہے) کے ایک عیسائی نے آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا تھا۔" [بخاری، کتاب الهبة: باب قبول الهداية من المشركين (۲٦۱٥)]

جو روایت عیاض بن حمار سے مروی ہے کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اونٹنی ہدیہ کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو نے اسلام قبول کیا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں۔" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے مشرکین سے ہدیہ لینے سے منع کیا گیا ہے۔"

[ابوداؤد، کتاب الخراج: باب فی الامام یقبل هدایا المشرکین (۳۰۵۷)، ترمذی(۱۵۷۷)، مسند طیالسی(۱۰۸۳)، المنتقی لابن الجارود(۱۱۱۰)، فتح الباری(۲۳۱/۵)]

یہ روایت قتادہ کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے اور صحیح احادیث کے بھی خلاف ہے۔ اسی طرح موسیٰ بن عقبہ نے کتاب المغازی میں جو روایت بیان کی ہے کہ مشرک عامر بن مالک رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو اس نے آپ کو ہدیہ پیش کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا۔'' یہ روایت مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ بعض نے اسے امام زہری رحمہ اللہ سے موصول بھی بیان کیا ہے لیکن وہ صحیح نہیں ہے۔ [فتح الباری(۲۳۰/۵)، تحفۃ الأحوذی(۱۸۸/۵)]

اب رہا یہ مسئلہ کہ کافر و مشرک کو ہدیہ دینا کیسا ہے؟ تو اس کے جواز کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے سورۃ الممتحنہ کی آیت سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَا يَنۡهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَ لَمۡ يُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ ﴾ [الممتحنۃ :۸]

''جو لوگ تم سے دین کے متعلق لڑتے نہیں اور نہ انھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ احسان کرنے اور ان کے معاملے میں انصاف کرنے سے تمھیں نہیں روکتا۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جن کافروں نے مسلمانوں کے ساتھ قتال نہیں کیا اور نہ انھیں ان کے گھروں سے نکالا ہے تو ان کے ساتھ دنیاوی اخلاق اور حسن سلوک منع نہیں ہے، پھر یہ بھی یاد رہے کہ بر و صلہ اور احسان سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفار کو دلی دوست بنا لیا جائے اور ان کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانی شروع کر دی جائیں کیونکہ کفار کو دلی دوست بنانا منع ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ لَا يَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ وَ مَا تُخۡفِىۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ قَدۡ بَيَّنَّا لَكُمُ الۡاٰيٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴾

[آل عمران:۱۱۸]

''اے ایمان والو! تم اپنے دلی دوست ایمان والوں کے علاوہ کسی کو نہ بناؤ۔ کفار تمھاری تباہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، وہ تو چاہتے ہیں کہ تم مصیبت میں مبتلا رہو۔ ان کی دشمنی تو ان کی زبانوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے بھی بڑی ہے۔ ہم نے تمھارے لیے آیتیں بیان کر دی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے ''باب الھدیۃ للمشرکین(۲۶۱۹)'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو رسول اللہ ﷺ نے جبہ دیا تھا پھر عمر رضی اللہ عنہ نے مکہ میں ایک کافر عثمان بن حکیم کو وہ جبہ ہدیہ دے دیا تھا، ذکر کر کے استدلال کیا ہے کہ مشرک کو ہدیہ دیا بھی جا سکتا ہے۔ [فتح الباری(۲۳۲/۵)]

بہر حال دنیاوی اخلاق و سلوک کے تحت مشرک کو ہدیہ دیا جا سکتا ہے اور اس سے قبول بھی کیا جا سکتا ہے، ممانعت والی روایات

قابل حجت نہیں ہیں۔ البتہ ان ہدایا و تحائف کی وجہ سے ان سے دلی دوستی اور محبت و مودّت قائم نہیں کرنی چاہیے کیونکہ مسلمان کے لیے دوستی و دشمنی کا معیار اسلام ہے۔

وِگ یعنی مصنوعی بال لگانا

(سوال) کیا سر پر مصنوعی بال یعنی وگ لگانا شریعتِ اسلامیہ کی رو سے جائز ہے؟

(جواب) ہیئر ٹرانسپلانٹیشن کے طریقہ علاج کے سوا سر پر وِگ یعنی مصنوعی بال لگانا یا اصلی بالوں کے ساتھ انھیں ملانا شرعی طور پر درست نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے مصنوعی بال لگانے والے افراد پر لعنت کی ہے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

① سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاصِلَةَ وَ الْمُسْتَوْصِلَةَ وَ الْوَاشِمَةَ وَ الْمُسْتَوْشِمَةَ »[بخاری، کتاب اللباس: باب وصل الشعر(٥٩٣٧)، مسلم، کتاب اللباس: باب تحریم فعل الواصلة و المستوصلة(٢١٢٤)، ابو داؤد، کتاب الترجل: باب فی صلة الشعر(٤١٦٨)، ترمذی (٢٧٨٣)، نسائی (٥١٠٨)]

"اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو مصنوعی بال لگانے اور مصنوعی بال لگوانے والی پر، جسم گود کر نیل بھرنے والی اور بھروانے والی پر۔"

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاصِلَةَ وَ الْمُسْتَوْصِلَةَ وَ الْوَاشِمَةَ وَ الْمُسْتَوْشِمَةَ »[بخاری، کتاب اللباس: باب وصل الشعر (٥٩٣٣)، مسند احمد(٣٣٩/٢)]

"نبی کریم ﷺ نے مصنوعی بال لگانے والی اور لگوانے والی، جسم گود کر نیل بھرنے اور بھروانے والی پر لعنت کی ہے۔"

③ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ آكِلَ الرِّبَا وَ مُوْكِلَهُ وَ الْوَاصِلَةَ وَ الْمَوْصُوْلَةَ وَ الْمُحِلَّ وَ الْمُحَلَّلَ لَهُ »[مسند ابی یعلی(٥٣٥٠)، مسند احمد(٤٤٨/١)، بیہقی(٢٠٨/٧)]

"رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، مصنوعی بال لگانے والی اور لگوانے والی، حلالہ کرنے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے، اس پر لعنت کی ہے۔"

④ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَ الْمُسْتَوْشِمَاتِ وَ الْوَاصِلَاتِ وَ الْمُتَنَمِّصَاتِ وَ الْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ قَالَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ امْرَأَةً مِنْ بَنِيْ اَسَدٍ يُقَالُ لَهَا أُمُّ يَعْقُوْبَ فَأَتَتْهُ فَقَالَتْ بَلَغَنِيْ عَنْكَ اَنَّكَ لَعَنْتَ الْوَاشِمَاتِ وَ الْمُسْتَوْشِمَةَ وَ الْوَاصِلَاتِ وَ الْمُتَنَمِّصَاتِ وَ الْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ قَالَ مَا لِيْ لَا اَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ هُوَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى قَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ لَوْحَيِ الْمُصْحَفِ فَمَا وَجَدْتُهُ فَقَالَ وَاللّٰهِ لَئِنْ كُنْتِ قَرَأْتِيْهِ لَقَدْ وَجَدْتِيْهِ ثُمَّ قَرَأَ ﴿وَ مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ » [ابوداود، کتاب الترجل: باب فی صلة الشعر(٤١٦٩)، یہ حدیث مختلف طرق اور الفاظ کے ساتھ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی ابن ماجہ اور مسند احمد وغیرہ میں مروی ہے]

''اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جسم گود کر نیل بھرنے اور بھروانے والیوں پر، مصنوعی بال لگانے والیوں پر، چہرے کے بال اکھیڑنے والیوں پر اور خوبصورتی کے لیے دانتوں میں جھریاں بنانے والیوں پر جو اللہ کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کرنے والیاں ہیں۔''

یہ بات قبیلہ بنو اسد کی ایک عورت کو پہنچی، اسے ام یعقوب کہا جاتا ہے، اس نے کہا: ''(اے ابن مسعود!) مجھے تیرے بارے میں یہ خبر پہنچی ہے کہ تو نے جسم گود کر نیل بھرنے والی اور بھروانے والی، مصنوعی بال لگانے والی، چہرے کے بال اکھیڑنے والی اور خوبصورتی کے لیے دانتوں میں جھریاں بنانے والی عورتوں پر لعنت کی ہے جو اللہ کی تخلیق بدلنے والیاں ہیں؟'' سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے میں ان پر کیوں نہ لعنت کروں؟ جب کہ یہ کتاب اللہ میں موجود ہے۔'' اس عورت نے کہا: ''میں نے دو تختیوں کے درمیان قرآن کا نسخہ پڑھا ہے، میں نے یہ بات نہیں پائی۔'' فرمانے لگے: ''اللہ کی قسم! اگر تو نے اسے (سمجھ کر) پڑھا ہوتا تو ضرور پالیتی، پھر یہ آیت تلاوت کی'' اور جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں دیں اسے لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز آ جاؤ۔''

⑤ حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف رحمہ اللہ سے مروی ہے:

«اَنَّهُ سَمِعَ مُعَاوِيَةَ بْنَ اَبِيْ سُفْيَانَ عَامَ حَجَّ وَ هُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَ تَنَاوَلَ قُصَّةً مِّنْ شَعْرٍ كَانَتْ فِيْ يَدِ حَرَسِيٍّ يَقُوْلُ يَا اَهْلَ الْمَدِيْنَةِ ! اَيْنَ عُلَمَاءُ كُمْ؟ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى عَنْ مِثْلِ هٰذِهِ وَ يَقُوْلُ اِنَّمَا هَلَكَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ حِيْنَ اتَّخَذَ هٰذِهِ نِسَاءُ هُمْ » [موطا، کتاب الشعر: باب السنة فی الشعر(٧٢٢/٢)، بخاری، کتاب اللباس، باب وصل الشعر(٥٩٣٢)، مسلم (٢١٢٧)، ابوداود (٤١٦٧)، نسائی(٥٢٤٧)]

''انھوں نے معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے اس سال سنا جب انھوں نے حج کیا اور معاویہ رضی اللہ عنہ منبر پر تھے۔ وہ غلام کے ہاتھ سے بالوں کا ایک جوڑا (یعنی وگ) لے کر کہہ رہے تھے: ''اے مدینہ والو! تمھارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ ایسے جوڑے سے منع کرتے تھے اور کہتے تھے: ''جب بنی اسرائیل کی عورتوں نے اس طرح بنانا شروع کیا اس وقت بنی اسرائیل ہلاک ہو گئے۔''

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک دن معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

⑥ « اِنَّكُمْ قَدْ اَحْدَثْتُمْ زِيَّ سُوْءٍ وَ اِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الزُّوْرِ قَالَ وَ جَاءَ رَجُلٌ بِعَصًا عَلٰى رَأْسِهَا خِرْقَةٌ قَالَ مُعَاوِيَةُ اَلَا وَ هٰذَا الزُّوْرُ قَالَ قَتَادَةُ يَعْنِيْ مَا تُكَثِّرُ بِهِ النِّسَاءُ

اَشْعَارُ هُنَّ مِنَ الْخِرَقِ » [مسلم، کتاب اللباس و الزینة: باب تحریم فعل الواصلة و المتوصلة و الواشمة......(٢١٢٧)، مسند احمد (٩٣/٤)]

''تم نے بری وضع ایجاد کر لی ہے اور یقیناً نبی ﷺ نے زُور (دھوکا) سے منع کیا ہے۔'' ایک شخص ایک لکڑی لے کر آیا جس کی نوک پر ایک چیتھڑا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''خبردار! یہی زُور (دھوکا) ہے۔'' (راوی حدیث) قتادہ نے فرمایا: ''مراد یہ ہے کہ عورتیں چیتھڑے لگا کر بال بہت کر لیتی ہیں۔''

⑦ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« اِنَّ جَارِيَةً مِّنَ الْاَنْصَارِ تَزَوَّجَتْ وَ اِنَّهَا مَرِضَتْ فَتَمَعَّطَ شَعْرُهَا فَاَرَادُوْا اَنْ يَّصِلُوْهَا فَسَأَلُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاصِلَةَ وَ الْمُسْتَوْصِلَةَ »[بخاری، کتاب اللباس: باب وصل الشعر(٥٩٣٤)، مسلم، کتاب اللباس و الزینة(٢١٢٣)، مسند احمد(١١١/٦)، مسند طیالسی(٣٥٧/١)، تاریخ بغداد(٣٠٩/١١)، مسند ابی یعلی(٤٧٥٣)]

''ایک انصاری لڑکی کی شادی ہوئی لیکن وہ بیمار ہوگئی، اس کے سر کے بال گر گئے۔ انھوں نے چاہا کہ اس کے بالوں میں مصنوعی بال (یعنی وِگ) ملا دیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مصنوعی بال لگانے والی اور لگوانے والی پر لعنت کی ہے۔''

⑧ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« اِنَّ امْرَاَةً جَاءَتْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَتْ اِنِّىْ اَنْكَحْتُ ابْنَتِىْ ثُمَّ اَصَابَهَا شَكْوٰى فَتَمَرَّقَ رَاْسُهَا وَ زَوْجُهَا يَسْتَحِثُّنِىْ بِهَا اَفَاَصِلُ رَاْسَهَا ؟ فَسَبَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْوَاصِلَةَ الْمُسْتَوْصِلَةَ »[بخاری، کتاب اللباس: باب وصل الشعر(٥٩٣٥)، مسلم، کتاب اللباس: باب تحریم فعل الواصلة(٢١٢٢)، شرح السنة(٣١٨٨)، مسند احمد(٣٤٥/٦)]

''نبی کریم ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا: ''میں نے اپنی لڑکی کا نکاح کیا تھا، پھر اسے بیماری لاحق ہوئی اور سر کے بال گر گئے۔ اس کا خاوند خواہش مند ہے کہ میں اس کے بالوں میں مصنوعی بال (یعنی وِگ) جوڑ دو۔ اب کیا میں مصنوعی بال لگا سکتی ہوں؟'' تو رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر مصنوعی بال لگانے اور لگوانے والی پر لعنت کی۔''

مندرجہ بالا صحیح احادیث سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ مصنوعی بال لگوانے ناجائز و ممنوع ہیں حتیٰ کہ آپ ﷺ نے ایک ایسی عورت کو بھی وِگ لگانے کی اجازت نہیں دی جس کے بال بیماری کی وجہ سے گر گئے تھے حالانکہ اس عورت کا خاوند بھی خواہش مند تھا کہ وہ وِگ استعمال کرے لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایسا کام کرنے والے پر لعنت کی۔

ظاہر ہے عورتوں کے لیے سر کے بال زینت ہیں اور محرم کے سامنے اظہار زینت ایک فطری تقاضا ہے اور اسلام محرم افراد کے سامنے اس کی اجازت بھی دیتا ہے لیکن اس کے باوجود جعلی اور مصنوعی بال استعمال کرنے پر سخت وعید ہے۔ جب عورت کو اس کی اجازت نہیں تو مرد کو وِگ استعمال کرنے کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟ اس حرمت کا اطلاق مردوں پر بالاولیٰ ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے یہود کا عمل قرار دیا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

« قَدِمَ مُعَاوِيَةُ الْمَدِيْنَةَ آخِرَ قَدْمَةٍ قَدِمَهَا فَخَطَبَنَا فَأَخْرَجَ كُبَّةً مِنْ شَعْرٍ قَالَ مَا كُنْتُ أُرَى اَحَدًا يَفْعَلُ هٰذَا غَيْرَ الْيَهُوْدِ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ سَمَّاهُ الزُّوْرَ يَعْنِى الْوَاصِلَةَ فِى الشَّعْرِ »[بخاری، كتاب اللباس: باب وصل الشعر(٥٩٣٨)]

''امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آخری مرتبہ مدینہ تشریف لائے تو ہمیں خطبہ دیا اور بالوں کا ایک گچھا نکال کر فرمایا: ''میں نہیں سمجھتا کہ یہودیوں کے علاوہ اور کوئی یہ فیشن کرتا ہو گا، نبی کریم ﷺ نے اسے زُور (جھوٹ) سے تعبیر فرمایا یعنی بال جوڑنا۔''

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ وگ لگانا یہود کا کام تھا اور آج بھی ہے لہٰذا مسلمان مرد ہوں یا عورتیں انھیں وِگ لگانے سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حدیث میں ذکر کردہ خصلتیں حرام ہیں، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے عامل پر لعنت کی اور مباح کام سرانجام دینے والے کو لعنت کرنا جائز نہیں۔'' [المغنی لابن قدامة(١٢٩/١)]

یعنی وِگ وغیرہ لگانا حرام ہے کیونکہ وِگ لگانے پر شرع میں لعنت وارد ہوئی ہے۔امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ هٰذِهِ الْاَحَادِيْثُ صَرِيْحَةٌ فِىْ تَحْرِيْمِ الْوَصْلِ وَ لَعْنِ الْوَاصِلَةِ وَالْمُسْتَوْصِلَةِ مُطْلَقًا وَ هٰذَا هُوَ الظَّاهِرُ الْمُخْتَارُ " [شرح مسلم للنووی(٨٧/١٤)]

''یہ احادیث وِگ کی حرمت اور وِگ لگانے اور لگوانے والی پر لعنت میں مطلق طور پر واضح ہیں اور یہی مذہب ظاہر و مختار ہے۔''

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَقَالَ مَالِكٌ وَ الطَّبَرِيُّ وَ كَثِيْرُوْنَ اَوِ الْاَكْثَرُوْنَ الْوَصْلُ مَمْنُوْعٌ بِكُلِّ شَيْءٍ سَوَاءً وَصَلَتْهُ بِشَعْرٍ اَوْ صُوْفٍ اَوْ خِرَقٍ وَ احْتَجُّوْا بِحَدِيْثِ جَابِرٍ الَّذِىْ ذَكَرَهُ مُسْلِمٌ بَعْدَ هٰذَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَجَرَ اَنْ تَصِلَ الْمَرْاَةُ بِرَاْسِهَا شَيْئًا " [شرح مسلم للنووی (٨٨/١٤)، السراج الوهاج(٣٠٦/٢)]

''امام مالک، امام طبری اور دیگر بہت سے ائمہ دین رحمہم اللہ نے فرمایا: ''بالوں کو کسی بھی چیز کے ساتھ جوڑنا منع ہے خواہ انھیں دیگر بالوں، اون یا کپڑے کے ساتھ جوڑا جائے اور ان ائمہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے اس کے بعد ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عورت کو اس بات سے ڈانٹا ہے کہ وہ اپنے سر کے (بالوں) کے ساتھ کسی اور چیز کو جوڑے۔''

امام نووی رحمہ اللہ اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

''اس حدیث میں یہ بات ہے کہ وِگ لگانا حرام ہے خواہ وہ معذور کے لیے ہو یا دلہن کے لیے یا ان دونوں کے علاوہ کے لیے۔''

نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ اس کے بعد فرماتے ہیں: ''یہی بات برحق ہے۔'' حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ فِیْ هٰذَا الْحَدِیْثِ حُجَّةٌ لِمَنْ قَالَ یَحْرُمُ الْوَصْلُ فِی الشَّعْرِ وَ الْوَشْمِ...... ''[فتح الباری (۱۰/۳۷۷)]

''اس حدیث میں ایسے آدمی کے لیے دلیل ہے جو کہتا ہے کہ بالوں میں وِگ لگانا، جسم گود کر نیل بھرنا اور چہرے کے بال نوچنا فاعل اور مفعول دونوں پر حرام ہے اور یہ ان لوگوں پر حجت ہے جو اس ممانعت کو نہی تنزیہی پر محمول کرتے ہیں، اس لیے کہ لفظ ''لعن'' کی دلالت حرمت پر قوی ترین دلالتوں میں سے ہے بلکہ بعض کے نزدیک کبیرہ گناہوں کی علامت میں سے ہے۔''

مندرجہ بالا صحیح احادیث اور ائمہ محدثین کی تشریحات سے واضح ہوا کہ مصنوعی بال لگانا ممنوع وحرام ہے اور یہود کی عادات میں سے ہے، مرد وزن اس حکم میں برابر ہیں۔ گنجے پن کو ختم کرنے کے لیے صحیح علاج کرایا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کے لیے دوا وعلاج رکھا ہے۔ اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ وَ اَصْحَابُهٗ کَاَنَّمَا عَلٰی رُءُوْسِهِمُ الطَّیْرُ فَسَلَّمْتُ ثُمَّ قَعَدْتُ فَجَاءَ الْاَعْرَابُ مِنْ هٰهُنَا وَ هٰهُنَا فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَنَتَدَاوٰی ؟ فَقَالَ تَدَاوَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ یَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهٗ دَوَاءً غَیْرَ دَاءٍ وَاحِدٍ : اَلْهَرَمُ »[ابوداؤد، کتاب الطب: باب فی الرجل یتداوی (۳۸۵۵)، ترمذی(۲۰۳۸)، ابن ماجه(۳٤۳٦)]

'' میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے (جم کر بیٹھے) تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں۔ میں نے سلام کیا پھر بیٹھ گیا، دیہاتی لوگ ادھر ادھر سے آئے تو انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! کیا ہم علاج کریں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' علاج کرو یقیناً اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی نہیں رکھی مگر اس کے لیے دوا بھی اتاری ہے، سوائے ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپا ہے۔''

معلوم ہوا کہ ہر مرض کا علاج موجود ہے، لہٰذا گنجے پن کا علاج کرایا جا سکتا ہے اور جسم کے کسی جگہ کے بال اتار کر سر پر لگانے سے اگر بال اگ آتے ہیں تو اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

بہن بھائیوں کا ایک بستر میں سونا

سوال کیا اسلام دس سال کی عمر کے بعد بچوں کے بستر الگ کر دینے کی ہدایت کرتا ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے جہاں انسان کو خود گناہ کے کاموں سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے وہاں ان کے بچوں کے لیے احکامات صادر فرمائے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَ اَهۡلِيۡكُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَةُ عَلَيۡهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ وَ يَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ ﴾ [التحریم:٦]

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے، جس کے اوپر انتہائی مضبوط فرشتے مقرر ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو انھیں حکم کرتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو انھیں حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کر گزرتے ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو خطاب کرتے ہوئے جہاں انھیں خود جہنم سے بچنے کا حکم دیا ہے وہاں انھیں اپنے گھر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ لہٰذا والدین پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایسی ہر حرکت سے بچانے کی کوشش کریں جو اسلام کے منافی ہو۔ اسلام نے بچوں کو شر سے بچانے کے لیے کئی ایک اقدامات کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ بچہ جب دس سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اسے الگ بستر دیا جائے تاکہ وہ ابتدا ہی سے شیطانی حرکات سے محفوظ رہے۔ رسول مکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« مُرُوۡا اَوۡلَادَكُمۡ بِالصَّلَاةِ وَ هُمۡ اَبۡنَاءُ سَبۡعِ سِنِيۡنَ وَ اضۡرِبُوۡهُمۡ وَ هُمۡ اَبۡنَاءُ عَشۡرٍ وَ فَرِّقُوۡا بَيۡنَهُمۡ فِي الۡمَضَاجِعِ »[ابوداود، كتاب الصلاة : باب متى يؤمر الغلام بالصلاة(٤٩٥)، ابن ابي شيبة(١/١٣٧)، دارقطني (٨٥)، مستدرك حاكم (١/١٩٧)، بيهقي(٢/٨٤)، مسند احمد (٢/١٨٧)، شرح السنة (٥٠٥)]

''اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہوں اور جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو انھیں نماز کے ترک کرنے پر سزا دو اور ان کے بستر الگ کر دو۔''

علامہ محمود محمد رحمہ اللہ سنن ابی داؤد کی شرح میں رقمطراز ہیں:

'' وَ فَرِّقُوۡا بَيۡنَهُمۡ فِي الۡمَضَاجِعِ اَيِ الۡمَرَاقِدِ لِاَنَّهُمۡ اِذَا بَلَغُوۡا عَشۡرَ سِنِيۡنَ يَقۡرُبُوۡنَ مِنۡ اَدۡنٰى حَدِّ الۡبُلُوۡغِ فَتَكۡثُرُ شَهَوَاتُهُمۡ فَيُخَافُ عَلَيۡهِمُ الۡفَسَادَ وَ فِيۡ هٰذَا دَلَالَةٌ عَلٰى اَنَّهُ يَجِبُ عَلَى الۡوَلِيِّ اَنۡ يُفَرِّقَ بَيۡنَ الصِّبۡيَانِ فِي الۡمَضَاجِعِ وَ لَوۡ كَانُوۡا اِخۡوَةً وَ هُمۡ اَبۡنَاءُ عَشۡرٍ »[المنهل اعذب المورود (٤/١٢٢)]

''ان کے بستر جدا جدا کر دو کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سونے کی جگہیں الگ الگ بناؤ۔ اس لیے کہ جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو بلوغت کی ادنیٰ حد کے قریب ہو جاتے ہیں، ان کی شہوت زیادہ ہو جاتی ہے اور ان پر فساد و خرابی کا ڈر ہوتا ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ولی پر واجب ہے کہ وہ بچوں کے درمیان سونے کی جگہوں میں تفریق ڈال دے اگرچہ وہ بھائی ہی کیوں نہ ہوں جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں۔''

علامہ مناوی جامع الصغیر کی شرح میں فرماتے ہیں:

'' اَيۡ فَرِّقُوۡا بَيۡنَ اَوۡلَادِكُمۡ فِيۡ مَضَاجِعِهِمُ الَّتِيۡ يَنَامُوۡنَ فِيۡهَا اِذَا بَلَغُوۡا عَشۡرًا حَذَرًا مِنۡ غَوَائِلِ

الشَّهْوَةِ وَ اِنْ کُنَّ اَخَوَاتٍ " [فتح القدیر شرح الجامع الصغیر بحوالہ عون المعبود(۱/۱۵۸)]

''بستر جہاں وہ سوتے ہیں جدا جدا کر دو، شہوت کی مصیبتوں سے ڈرتے ہوئے اگرچہ دو بہنیں ہی ہوں۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ نے السنن الکبریٰ میں یہ باب قائم کیا ہے:

" بَابُ مَا عَلَى الْآبَاءِ وَ الْأُمَّهَاتِ مِنْ تَعْلِيْمِ الصِّبْيَانِ اَمْرَ الطَّهَارَةِ وَ الصَّلَاةِ "

''والدین پر بچوں کی تعلیم میں پاکیزگی اور نماز سے جو لازم ہے۔''

اس کے تحت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی قوی سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے:

« حَافِظُوْا عَلٰى اَبْنَاءِكُمْ فِي الصَّلَاةِ ثُمَّ تَعَوَّدُوْا الْخَيْرَ فَاِنَّمَا الْخَيْرُ بِالْعَادَةِ »[بیہقی(۳/۸٤)]

''اپنے بچوں کی نماز کی حفاظت کرو، پھر انھیں خیر کی عادت ڈالو، اس لیے کہ خیر عادت کے ذریعے آتی ہے۔''

مراد یہ ہے کہ جب تم بچوں کو نیکی و بھلائی کی عادت ڈالو گے تو یہ نیکی و بھلائی ان میں مستقل قائم ہو گی کیونکہ جب کسی کام کی عادت پڑ جاتی ہے تو انسان اس کو جلدی ترک نہیں کرتا۔ اس لیے بچوں کو ابتدا ہی سے اچھی باتوں کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ وہ نماز، روزہ، تقویٰ، پرہیز گاری اور اخلاق حسنہ کے ابتدا ہی سے عادی ہو جائیں اور شر سے بچے رہیں۔ اسی کے پیش نظر شریعت اسلامیہ بچوں کو دس سال کی عمر ہی سے الگ الگ بستروں میں سونے کی ہدایت کرتی ہے تاکہ وہ اخلاق رذیلہ اور بری عادات میں ملوث نہ ہوں۔ ہمیں اس بات کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے اور اپنے بچوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

WWW. KITABOSUNNAT. COM

وراثت کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

جائداد کی تقسیم کا شرعی طریقہ

(سوال) جائداد کی اولاد میں شرعی تقسیم کے متعلق وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں؟

(جواب) انسان کی جائداد کی تقسیم دو اقسام پر ہے: اولاً: اپنی زندگی میں۔ ثانیاً: مرنے کے بعد۔

پہلی صورت میں آدمی اپنی اولاد کو جو جائداد تقسیم کرتا ہے اسے وراثت نہیں بلکہ ہبہ کرنا یا عطیہ دینا کہا جاتا ہے اور دوسری صورت میں جو مال چھوڑا جاتا ہے اسے ورثہ یا ترکہ کہتے ہیں۔ اس صورت میں جائداد کی تقسیم کا اللہ تعالیٰ نے اصول و قاعدہ ذکر کر دیا ہے اور وہ یہ ہے:

﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾ [النساء: ۱۱]

''لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے گا۔''

جب کہ پہلی صورت میں اولاد کے درمیان برابری اور مساوات ہو گی:﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾ والا قاعدہ جاری نہیں ہو گا۔امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ إِذَا أَعْطَى بَعْضَ وَلَدِهِ شَيْئًا لَمْ يَجُزْ حَتّٰى يَعْدِلَ بَيْنَهُمْ وَ يُعْطِيَ الْآخَرَ مِثْلَهُ " [بخاری، کتاب الهبة: باب الهبة للولد]

''جب کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو کوئی چیز عطا کرے تو یہ اس کے لیے اتنی دیر تک جائز نہیں جب تک وہ ساری اولاد کے درمیان عدل نہ کرے اور دوسرے کو بھی اس کی مثل دے۔''

اس کی دلیل امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث پیش کی ہے:

« عَنْ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا وَ هُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ أَعْطَانِيْ أَبِيْ عَطِيَّةً فَقَالَتْ عَمْرَةُ بِنْتُ رَوَاحَةَ لَا أَرْضٰى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَأَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ إِنِّيْ أَعْطَيْتُ ابْنِيْ مِنْ عَمْرَةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ عَطِيَّةً فَأَمَرَتْنِيْ أَنْ أُشْهِدَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ أَعْطَيْتَ سَائِرَ وَلَدِكَ مِثْلَ هٰذَا؟ قَالَ لَا قَالَ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ »[بخاری، کتاب الهبة: باب الإشهاد فی الهبة (۲۵۸۷)]

”عامر شعبی نے کہا: ”میں نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو منبر پر کہتے ہوئے سنا:“ میرے باپ نے مجھے عطیہ دیا تو عمرہ بنت رواحہ نے کہا: ”میں اتنی دیر تک راضی نہیں حتیٰ کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنا لے۔“ تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں نے عمرہ بنت رواحہ میں سے اپنے ایک بیٹے کو عطیہ دیا ہے، اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو اس پر گواہ بنالوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تو نے اپنی ساری اولاد کو اسی طرح عطیہ دیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”نہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔“ تو وہ واپس لوٹے اور اپنا عطیہ واپس لے لیا۔“ [شرح نووی(۱۱/۵۳)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” وَ قَدْ تَمَسَّكَ بِهِ مَنْ اَوْجَبَ التَّسْوِيَةَ فِيْ عَطِيَّةِ الْاَوْلَادِ وَ بِهِ صَرَّحَ الْبُخَارِيُّ وَ هُوَ قَوْلُ طَاوُسَ وَ الثَّوْرِيِّ وَ اَحْمَدَ وَ اِسْحَاقَ وَ قَالَ بِهِ بَعْضُ الْمَالِكِيَّةِ “ [فتح الباری(۵/۲۱٤)]

” جن لوگوں نے اولاد کے درمیان عطیہ کی مساوات کو واجب قرار دیا ہے انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس بات کی تصریح کی ہے اور یہی قول طاؤس، سفیان ثوری، احمد، اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ اور بعض مالکیہ کا ہے۔“

عطیہ کی تقسیم کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان محدثین کے موقف کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

” لَا فَرْقَ بَيْنَ الذَّكَرِ وَ الْاُنْثٰى وَ ظَاهِرُ الْاَمْرِ بِالتَّسْوِيَةِ يُشْهِدُ لَهُمْ وَ اسْتَاْنَسُوْا بِحَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَفَعَهُ سَوُّوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ فَلَوْ كُنْتُ مُفَضِّلًا اَحَدًا لَفَضَّلْتُ النِّسَاءَ اَخْرَجَهُ سَعِيْدُ بْنُ مَنْصُوْرٍ وَ الْبَيْهَقِيُّ مِنْ طَرِيْقِهِ وَ اِسْنَادُهُ حَسَنٌ “ [فتح الباری(۵/۲۱٤)]

” عطیہ کی تقسیم میں مذکر و مؤنث کے درمیان کوئی فرق نہیں اور حدیث میں جو مساوات کا حکم ہے اس کا ظاہر بھی اس بات پر شاہد ہے اور انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث سے بھی دلیل پکڑی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”عطیہ کے متعلق اپنی اولاد میں برابری کرو، اگر میں کسی کو ترجیح دینے والا ہوتا تو عورتوں کو دیتا۔“ اسے سعید بن منصور نے نکالا ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کے طریق سے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔“

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ اگر آدمی اپنی اولاد کے درمیان کسی نزاع یا جھگڑے کے خدشے کے پیش نظر یا ویسے ہی اپنی جائداد اپنی زندگی میں تقسیم کرنا چاہے تو اس پر اولاد کے درمیان عدل و انصاف لازم ہے، جتنا حصہ لڑکے کو دے اتنا ہی لڑکی کو دے، اسے شریعت کی اصطلاح میں ہبہ یا عطیہ کہتے ہیں۔ اگر اولاد کے درمیان عدل سے کام نہیں لے گا تو گناہ گار ہوگا اور اگر اس نے اپنی کسی اولاد کو کچھ دیا ہے اور دوسروں کو نہیں دیا تو والد کو ایسا ہبہ یا عطیہ واپس لے لینا چاہیے اور اگر دنیا سے رخصت ہوگیا اور کچھ مال چھوڑ گیا تو اسے ترکہ اور وراثت کہا جاتا ہے، اس کی تقسیم قانون وراثت کے تحت ہوگی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

زندگی میں وراثت کی تقسیم

(سوال) اگر کوئی شخص اپنی زندگی ہی میں اپنی جائداد اپنی اولاد میں بانٹنا چاہے تو کیا ایسا کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے؟

(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ﴾ [النساء: ١١]

''اللہ تعالیٰ تمھاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے۔ اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے دو تہائی حصہ ہے جو میت نے چھوڑا ہے۔''

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُونَ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَ الْاَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴾ [النساء: ٧]

''مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو والدین اور سب سے زیادہ قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کے لیے بھی والدین اور سب سے زیادہ قریبی رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے مال میں سے حصہ ہے، وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ یہ حصہ (اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے) مقرر فرمایا ہے۔''

ان آیات میں الفاظ '' مَا تَرَكَ '' اور '' مِمَّا تَرَكَ '' موجود ہیں جو حقیقت میں موت کے بعد چھوڑے ہوئے مال پر دلالت کرتے ہیں، اسی طرح وراثت اور میراث کے الفاظ بھی اختتام زندگی پر دلالت کرتے ہیں لہٰذا ان دلائل کی رو سے انسان اپنے مال کو اپنی اولاد یا دیگر رشتہ داروں میں وراثت کے طور پر تقسیم نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اس طرح جائداد تقسیم کر دیتا ہے تو وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کرتا ہے۔ ہاں اپنے مال میں سے کچھ حصہ اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو عطیہ یا ہبہ کے طور پر دیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

وراثت میں انصاف کا مسئلہ

(سوال) کیا وراثت میں لڑکی کو لڑکے سے نصف حصہ دینا غیر منصفانہ قانون ہے؟

(جواب) دورِ حاضر میں یہود و نصاریٰ مسلمانانِ عالم کو صراط مستقیم سے ہٹانے کے لیے آئے روز گمراہ کن اور شر انگیز نعرے بلند کر رہے ہیں۔ ان نعروں میں آزادیٔ نسواں، مساوات مرد و زن، منصوبہ بندی، انسانی آبادی کی فلاح و بہبود وغیرہ کی آڑ لے کر شیطانی تہذیب کے دلدادہ ہمہ تن مصروف عمل ہیں تا کہ مسلمانوں کی نئی نسل اور خواتین کو ہدف بنا کر گھر گھر اللہ تعالیٰ اور

رسول اللہ ﷺ کی بغاوت کو عام کر دیا جائے۔ مغربی تہذیب کی آشوب سامانیوں کو عام کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ کو بھرپور استعمال کیا جا رہا ہے اور دانشوران سو، ججز اور وکلا قسم کے لوگ بھی اس کارِ شر میں نمایاں نظر آرہے ہیں۔ ان وکلا اور دانشوران سو نے مستشرقین کے زیرِ تربیت اسلامیات کی ڈگریاں حاصل کی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ بھی یہود و ہنود کی زبان بولتے ہیں اور رب العالمین کے مبنی بر انصاف احکامات پر دشنام طرازیاں اور زبان طعن دراز کرتے ہیں اور اپنے آپ کو احکم الحاکمین کی بہ نسبت مخلوق کا زیادہ خیر خواہ قرار دیتے ہیں۔ اسلام نے عورت کو جس قدر حقوق دیے ہیں اس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں ناممکن ہے۔ اسلام سے قبل عورت کو جس ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا قرآن کریم نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

﴿ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ [النحل:٥٨،٥٩]

"اور ان میں سے جب کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے۔ اس بری خبر کی وجہ سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، سوچتا ہے کیا اس ذلت کو لیے ہوئے ہی رہے یا اسے مٹی میں دبا دے؟ کیا ہی برے فیصلے کرتے ہیں؟"

اس آیت کریمہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام سے قبل عورت قعرِ مذلت میں گری ہوئی تھی۔ اسلام نے اسے عزت و وقار اور عفت و عصمت کا حسین لبادہ پہنایا اور اسے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے اعتبار سے بہت سے حقوق عطا کیے۔ اسے ذلت و نامرادی سے نکال کر احترام و وقار کی وادی میں داخل کر دیا۔ لیکن مغربی اقوام اور مغرب زدہ بے راہ رو افراد کو یہ بات گوارا نہ ہوئی۔ انھوں نے حقوق نسواں کے نام سے اسے حجاب اسلامی سے نکال کر سر بازار عریاں کر دیا۔ سیکولر اور لبرل معاشرے کے افراد نے عورت کے ان حقوق کو جو اسے اسلام نے عطا کیے، ہدف تنقید بنایا۔ معترضین نے عورت کی سربراہی، مردوں کے ساتھ اختلاط، معاشی و معاشرتی زندگی میں آزادانہ ماحول، دیت و شہادت، حجاب و ستر اور وراثت کے احکام کو اچھالا اور فضول و لایعنی قسم کے اعتراضات کیے اور انھیں ظلم و ناانصافی سے تعبیر کیا۔

حالانکہ ایسے افراد نے ہمیشہ عورت کو اس کے اصلی حقوق سے محروم رکھا ہے بالخصوص وراثت کے احکام کو بہت زیادہ پامال کیا ہے، اسلام سے قبل عورت وراثت سے بالکل محروم تھی۔ ان کے ہاں یہ تصور تھا کہ عورت نہ تو جنگ میں حصہ لے سکتی ہے اور نہ اپنے خاندانی افراد کا تحفظ و دفاع کر سکتی ہے لہٰذا وہ خاندان کی دولت کی وارث کیسے بن سکتی ہے؟ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے:

" كَانَ الْمُشْرِكُوْنَ يَجْعَلُوْنَ الْمَالَ لِلرِّجَالِ الْكِبَارِ وَ لَا يُوَرِّثُوْنَ النِّسَاءَ وَ لَا الْاَطْفَالَ شَيْئًا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴾"

"مشرکین مال بڑے مردوں کے لیے مقرر کرتے تھے، عورتوں اور بچوں کو وراثت میں سے کچھ نہیں دیتے تھے تو اللہ

تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: ''مردوں کے لیے اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور زیادہ قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور زیادہ قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ قبل از اسلام عورت وراثت سے محروم تھی تو اسلام نے آ کر عورت کو حق وراثت دلوایا اور مختلف اعتبارات سے اس کے حقوق کو مقرر فرما دیا۔ یہود و نصاریٰ نے بھی عورت کے اس مسئلے میں بے انصافی سے کام لیا ہے، اگرچہ ان کے ہاں عورت کا حق وراثت ہے لیکن عورت کے لیے اپنے ہی خاندان میں شادی کا حکم لگا کر عملاً اس حق کو ختم ہی کر دیا ہے جیسا کہ پرانے عہدنامہ میں کتاب گنتی باب:۳۶ آیت ۶۔۷۔۸ میں ہے:

''سو صافحاد کی بیٹیوں کے حق میں خداوند کا حکم یہ ہے کہ وہ جنھیں پسند کریں انھی سے بیاہ کریں، لیکن اپنے باپ دادا کے قبیلہ ہی کے خاندانوں میں بیاہی جائیں۔ یوں بنی اسرائیل کی میراث ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ میں نہیں جانے پائے گی کیونکہ ہر اسرائیلی کو اپنے باپ دادا کے قبیلے کی میراث کو اپنے قبضے میں رکھنا ہوگا۔''

بائیبل کی اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ عیسائیوں نے عورت کے اوپر اپنے ہی خاندان میں نکاح کی پابندی لگا کر اسے خود آزادی اور وراثت کے اصل قانون سے محروم کر دیا ہے۔ لیکن ان کے پروردہ حضرات جو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے نابلد اور ناآشنا ہیں، وہ اسلام کے عدل و انصاف پر مبنی قوانین و احکام پر معترض ہوتے ہیں۔ حالانکہ ذات باری تعالیٰ عادل و منصف ہے اور عدل و انصاف کرنے والوں کو پسند کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی قانون بھی ظلم و تعدی پر مبنی نہیں ہے۔ اسلام نے وراثت کے بارے میں جتنے قوانین ذکر کیے ہیں تمام عدل و انصاف پر مبنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کا حق ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾ [النساء:۱۱]

''اللہ تعالیٰ تمھیں اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تقسیم وراثت کا ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ جب کوئی آدمی فوت ہو جائے تو اس کے ورثا میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو تقسیم اس طرح ہوگی کہ جتنا حصہ دو لڑکیوں کو ملے گا اتنا حصہ اکیلے ایک لڑکے کا ہوگا۔ یہ تقسیم مبنی بر انصاف ہے، اس میں ظلم و تعدی کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔

اسلام کے خاندانی نظام میں معیشت کی تمام تر ذمہ داری مرد کے کندھوں پر ہے، عورت کو نظام معیشت سے فارغ رکھا ہے اور مرد کو اس کا کفیل بنایا ہے۔ مرد پر عورت کے علاوہ اس کے بچوں، بوڑھے والدین اور دیگر ضروریات کا بھی بوجھ ہے بلکہ حق مہر کی صورت میں بھی عورت کے پاس مال آتا ہے اور اس کی ادائیگی بھی مرد کرتا ہے۔ علاوہ ازیں عورت اپنے باپ، بھائی، خاوند اور بیٹے سے بھی حق وراثت پاتی ہے مگر اس کا اپنا خرچ بھی اس کے ذمہ نہیں۔ اس کو جو مال وراثت میں حاصل ہوتا ہے وہ اس کے پاس محفوظ ہے، چاہے اسے کاروبار میں لگائے یا جمع کر کے رکھ چھوڑے۔ غرض جیسے چاہے اس مال میں تصرف کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے مرد کو عورت کی نسبت دگنا مال دیا ہے اور اگر عورت کا حصہ نصف کی بجائے مرد کے برابر ہوتا تو یہ مرد

پر ظلم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ظلم نہیں کیا کیونکہ وہ عادل و منصف ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم وعلیم بھی ہے، اس کے فیصلے درست ہوتے ہیں، جن میں ذرہ برابر بھی ظلم و ناانصافی کو دخل نہیں ہوتا۔

اگر دونوں کا وراثت میں حصہ برابر ہوتا تو عورت کی بجائے مرد یہ مطالبہ کرتا کہ میرے اوپر معاشی بوجھ اور ذمہ داریاں ہیں عورت کو بھی اس بارگراں میں شریک کیا جائے اور کچھ ذمہ داریاں اس پر ڈال دی جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذمہ داریوں کے تعین کے اعتبار سے اسلام کا نظام وراثت فطری اور منصفانہ ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے یہ وجہ ذکر کی ہے کہ وراثت کا تعلق معاشی ذمہ داری کے ساتھ ہے۔ بیٹا بیٹی کے مقابلے میں باپ کی مالی و معاشی خدمت زیادہ سرانجام دیتا ہے لہٰذا اس کو باپ کے ترکے میں سے بھی زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔ اسلام کے نظام وراثت میں بعض صورتیں ایسی ہیں کہ مرد اور عورت کو برابر حصہ دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لِاَبَوَیْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ...... ﴾ [النساء:۱۱]

’’میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کیلئے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے اگر اس میت کی اولاد ہو۔‘‘

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ میت کی اولاد کی صورت میں ماں باپ کا حصہ برابر ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کا برابر حصہ ذکر کیا ہے اور بعض صورتوں میں عورت کا حصہ مرد کی نسبت زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر میت کے ورثا میں ایک بیٹی اور دو بھائی ہیں تو ایک بیٹی ترکے کا نصف حصہ لے گی اور باقی نصف دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم ہوگا۔ اس طرح یہاں میت کے بھائی کے مقابلے میں بیٹی زیادہ حصہ لے رہی ہے، اس لیے کہ وراثت میں زیادہ قریبی رشتہ داروں کا حق زیادہ ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلام میں وراثت کے معاملے میں عورت سے کہیں بھی ظلم وستم اور ناانصافی سے کام نہیں لیا گیا۔ کہیں مرنے والے کے ساتھ عورت کو زیادہ قربت کی بنا پر اہمیت دی گئی ہے جب کہ دوسری طرف مرد کی معاشی ذمہ داریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس بنیاد پر وراثت میں عورت کا حصہ کہیں کم اور کہیں زیادہ دے کر عدل و مساوات کی مثال قائم کر دی گئی ہے۔

چچا کی موجودگی میں پوتا وارث

سوال کیا چچا کی موجودگی میں پوتا وارث بن سکتا ہے؟ قرآن وسنت کی رو سے جواب دیں۔

جواب چچا کی موجودگی میں پوتا دادا کی وراثت کا حق دار نہیں بن سکتا۔ اس کی دلیل جاننے سے پہلے یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ شریعت اسلامیہ نے جن رشتہ داروں کو اپنے میں سے کسی مرنے والے کا وارث ٹھہرایا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ رشتہ دار ہیں جن کا حصہ قرآن وسنت میں معین کر دیا گیا ہے۔ انھیں علم میراث کی اصطلاح میں اصحاب الفروض کہتے ہیں۔

دوسرے وہ ورثا جن کے حصوں کی تعیین قرآن وسنت میں نہیں یعنی جو اصحاب الفروض کی عدم موجودگی میں سارا مال لے لیتے ہیں۔ وہ اصحاب الفروض کی موجودگی میں ان سے بچا ہوا مال لیتے ہیں، انھیں عصبات کہتے ہیں۔ بھائی اور پوتا بھی میت کے ان ورثا میں سے ہیں جن کا حصہ معین نہیں ہے۔ تو عصبات میں مال کی تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ ان اصحاب الفروض کو ان کا مقرر کردہ حصہ دے دینے کے بعد اگر ترکہ میں کچھ باقی ہے تو وہ عصبات کے ان مردوں کو دیا جائے گا جو میت کے زیادہ قریب ہوں اور دور کے تعلق والے محروم رہیں گے۔ اس کی دلیل صحیحین کی حدیث ہے جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلْحِقُوْا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ » [بخاری، کتاب الفرائض: باب میراث الولد منن ابیه وامه (٦٧٣٢)]

’’مقرر کردہ ان کے مستحقین کو دو اور جو باقی بچ جائے پس وہ اس آدمی کے لیے ہے جو میت کا زیادہ قریبی ہے۔‘‘

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان واضح کرتا ہے کہ اصحاب الفروض کے مقررہ حصے پورے کر دینے کے بعد جو باقی بچے وہ مرد عصبات میں سے سب سے قریبی کے لیے ہے، کوئی دور والا اس کے ساتھ شریک نہیں ہوگا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

” وَ قَدْ اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى اَنَّ مَا بَقِيَ بَعْدَ الْفُرُوْضِ فَهُوَ لِلْعَصَبَاتِ يُقَدَّمُ الْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ فَلَا يَرِثُ عَاصِبٌ بَعِيْدٌ مَعَ وَجُوْدِ قَرِيْبٍ “ [شرح نووی (١١/٥٣)]

’’مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جو اصحاب الفروض کو دینے کے بعد بچ جائے، وہ عصبات کے لیے زیادہ قریبی کو مقدم کیا جائے گا، دور کا عصبہ رشتہ دار قریبی عصبہ کی موجودگی میں وارث نہیں بن سکتا۔‘‘

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں باب قائم کیا ہے:

” بَابُ مِيْرَاثِ ابْنِ الابْنِ اِذَا لَمْ يَكُنِ ابْنٌ آخَرُ “

اس کے تحت فرماتے ہیں:

” وَ لَا يَرِثُ وَلَدُ الابْنِ مَعَ الابْنِ “ [بخاری، کتاب الفرائض (قبل الحدیث/٦٧٣٥)]

’’بیٹے کے ہوتے ہوئے بیٹے کی اولاد وارث نہیں بن سکتی (وہ اولاد میت کے کسی بھی زندہ یا فوت شدہ بیٹے کی ہو)۔‘‘

وارث کے لیے وصیت کرنا

سوال کیا وارث کے لیے وصیت کرنا جائز ہے؟

جواب میت کی جانب سے اگر کوئی وصیت ہو یا قرض ہو تو اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ ﴾ [النساء: ١١]

"(مفروضہ حصص اس وقت نکالے جائیں گے) جب کہ وصیت جو میت نے کی ہو، پوری کر دی جائے اور قرض جو اس پر واجب ہو، ادا کر دیا جائے۔"

یہ بھی یاد رہے کہ وصیت غیر وارث کے حق میں زیادہ سے زیادہ ایک تہائی تک کی جا سکتی ہے۔ وارث کے لیے وصیت کرنا درست نہیں، اس لیے کہ ورثا کے حصص اللہ وحدہ لا شریک لہ نے متعین کر دیے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

« اَلَا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَعْطٰى كُلَّ ذِىْ حَقٍّ حَقَّهٗ وَ لَا يَجُوْزُ وَصِيَّةٌ لِوَارِثٍ » [دارمی، کتاب الوصایا: باب الوصیة للوارث(۳۲۶۲)]

"خبردار! یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا ہے، وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔"

اولاد کو عاق کرنا

سوال کیا نافرمان اولاد کو وراثت سے محروم (عاق) کیا جا سکتا ہے؟

جواب انسان کی جائداد جو وفات کے بعد تقسیم کی جاتی ہے، اسے وراثت یا ترکہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو وہ اپنی زندگی میں تقسیم کرتا ہے، اسے ہبہ کہا جاتا ہے۔ وراثت سے محرومی نافرمانی کی بنا پر نہیں ہو سکتی۔ وراثت سے محرومی یا تو باپ اور بیٹے کے ادیان مختلف ہونے کی وجہ سے ہے جیسا کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَتَوَارَثُ اَهْلُ مِلَّتَيْنِ شَتّٰى » [ابوداؤد، کتاب الفرائض: باب هل یرث المسلم الكافر(۲۹۱۱)، مسند احمد (۱۷۸/۲)، ابن ماجه (۲۷۳۱)، دارقطنی(۷۵/۴)، شیخ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا هے۔ [إرواء الغلیل (۱۶۶۸)]

"دو مختلف دینوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔"

سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَ لَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ » [بخاری، کتاب الفرائض: باب لا یرث المسلم الكافر(۶۷۶۴)، مسلم(۱۶۱۴)، مؤطا مالك (۵۱۹/۲)، مسند طیالسی(۱۴۳۵)، مسند احمد (۲۰۰/۵)، دارمی(۳۷۰/۲)، ابوداؤد(۲۹۰۹)، ترمذی(۲۱۰۷)، ابن ماجه(۲۷۲۹)، دارقطنی (۶۱/۴)، بیهقی(۲۱۷/۶)]

"مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں بنتا۔"

اسی طرح قاتل مقتول کا وارث نہیں بنے گا۔ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا » [ابوداؤد، کتاب الدیات: باب دیات الأعضاء(۴۵۶۴)، نسائی(۴۲/۸)]

"قاتل کسی بھی چیز کا وارث نہیں بنے گا۔"

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو قوی کہا ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [إرواء الغلیل(۱۶۷۱)]

نافرمان اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کی کوئی دلیل راقم کے علم میں نہیں۔ یہ بات بالکل صحیح اور درست ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کی خدمت کا فریضہ سرانجام دینا چاہیے اور نافرمان اولاد کو وعظ ونصیحت اور مختلف مناسب حال احکام سے سمجھانا چاہیے تاکہ اولاد نافرمانی سے باز رہے اور جو مال وہ اپنی اولاد میں خود تقسیم کرے اس میں انصاف لازم ہے۔ اگر ایک یا دو بیٹوں کو کچھ مال دیا ہے تو باقی اولاد کو بھی اسی طرح دے وگرنہ پہلوں سے بھی واپس لے لے۔ جیسا کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے انھیں ایک غلام دیا پھر جب معاملہ رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے اس کی مثل اپنی ساری اولاد کو دیا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو واپس لے لو۔''
[بخاری، کتاب الھبة: باب الھبة للولد(٢٥٨٦)، مسلم(١٦٢٣)]

مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«لَا تُشْهِدْنِی عَلٰی جَوْرٍ اِنَّ لِبَنِيكَ عَلَيْكَ مِنَ الْحَقِّ اَنْ تَعْدِلَ بَيْنَهُمْ»[مسند احمد(٤/٢٦٨)]

''تم مجھے ظلم پر گواہ نہ بناؤ بلاشبہ تیری اولاد کا تیرے اوپر حق ہے کہ تو ان کے درمیان عدل سے کام لے۔''

مذکورہ بالا حدیث سے واضح ہوگیا کہ والد اپنی زندگی میں جو عطیات اپنی اولاد کو دے گا وہ سب میں برابر عدل و انصاف سے تقسیم کرے گا۔ بعض اولاد کو محروم کرنا اور بعض کو دینا ظلم ہے۔ ایسے قضیے اور معاملے پر رسول اللہ ﷺ نے شہادت و گواہی نہیں دی۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہمیں اپنی اولاد کی تربیت ابتدا ہی سے صحیح منہج پر کرنی چاہیے تاکہ وہ بڑے ہو کر والدین کے فرمانبردار بن سکیں اور والدین کو پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

❀❀❀

حدود کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

زنا کی حد

سوال شریعت میں زنا کی حد کیا ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے جرائم کے اختتام کے لیے قرآن مجید میں مختلف جرائم کے اعتبار سے مختلف سزاؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح جب مرد وزن آپس میں برا فعل سرانجام دیتے ہیں اور زنا جیسے فحش و قبیح فعل کا ارتکاب کر لیتے ہیں تو شریعت نے ان کے لیے جو سزا تجویز کی ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

شادی شدہ مرد وزن زنا کرلیں تو ان کو رجم کیا جائے گا اور اگر وہ غیر شادی شدہ ہوں تو انھیں سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [النور:٢]

”زنا کار مرد وزن میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ، ان پر اللہ تعالیٰ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے تمھیں ہرگز ترس نہیں کھانا چاہیے اگر تمھارا اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان ہے اور ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے۔“

تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیت عام مخصوص منہ البعض ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ حکم عام نہیں کہ ہر قسم کے زانی کو سو کوڑے لگائے جائیں بلکہ یہ دیگر شرعی دلائل کی بنا پر خاص ان لوگوں کے متعلق ہے جو کنوارے غیر شادی شدہ ہوں۔ حدیث شریف میں اس کی مزید تفصیل جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے اس میں ایک سال کے لیے جلاوطنی بھی مذکور ہے جیسا کہ عنقریب ذکر کیا جائے گا اور جو شادی شدہ ہوں ان کے لیے رجم ہے۔ اسی طرح اگر غلام یا لونڈی جرمِ زنا کر بیٹھیں تو اس کے لیے پچاس کوڑے ہیں یعنی سو کوڑوں کا نصف جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾ [النساء:٢٥]

”اگر لونڈیاں بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان پر آزاد عورتوں کی نسبت نصف سزا ہے۔“

لہٰذا مذکورہ بالا سورۂ نور کی آیت کا حکم عام نہیں ہے بلکہ دیگر شرعی دلائل کی بنا پر کنوارے کے لیے خاص ہے۔ شادی شدہ کے لیے جو رجم کی سزا ہے وہ یہ ہے کہ دو آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، ایک نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میرا بیٹا اس

کے ہاں ملازم تھا،وہ اس کی بیوی سے زنا کر بیٹھا ہے۔ میں نے اس کے بدلے ایک سو بکریاں اور ایک لونڈی دی ہے پھر میں نے علماء سے دریافت کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے بیٹے پر شرعی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور اس کی بیوی پر رجم ہے، لہٰذا آپ میرے اور اس کے درمیان اللہ تعالیٰ کی کتاب سے فیصلہ فرما دیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

« وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَاَقْضِیَنَّ بَیْنَکُمَا بِکِتَابِ اللّٰهِ الْمِائَةُ شَاةٍ وَ الْخَادِمُ رَدٌّ عَلَیْكَ وَ عَلٰی ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ وَ تَغْرِیْبُ عَامٍ وَ اغْدُ یَا اُنَیْسُ ! عَلٰی امْرَاَةِ هٰذَا فَاِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا فَاعْتَرَفَتْ فَرَجَمَهَا »[بخاری، کتاب الحدود: باب الاعتراف بالزنا(٦٨٢٧)، موطا(٨٢٢/٢)، مسلم (١٦٩٧)، ابوداؤد (٤٤٤٠)، نسائی(٢٤٠/٨)، ترمذی(١٤٣٣)، ابن ماجه(٢٥٤٩)، دارمی(٩٨/٢)، احمد (١١٥/٤)، عبد الرزاق (١٣٣٠٩)، حمیدی(٨١١)، شرح السنة(٢٧١٠)]

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تمھارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔ لونڈی اور سو بکریاں تجھے واپس دلوا دی جائیں گی اور تیرے لڑکے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور اے انیس! تو اس کی بیوی کے پاس جا، اگر وہ اعتراف کرے تو اس کو سنگسار کر دینا۔'' اس نے اعتراف کر لیا تو اسے رجم کر دیا گیا۔''

مذکورہ بالا صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ کنوارا زنا کرے تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور شادی شدہ پر رجم یعنی سنگساری کی سزا ہے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا: ''لوگو! اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ ﷺ پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور اس میں رجم کی آیت بھی تھی، جس کو ہم نے پڑھا اور یاد رکھا اور عمل کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے، کہیں ایسا نہ ہو کہ فریضہ خداوندی کے ترک کے باعث لوگ گمراہ ہو جائیں۔'' مزید فرمایا:

« اَلَا وَ اِنَّ الرَّجْمَ حَقٌّ عَلٰی مَنْ زَنٰی اِذَا اَحْصَنَ وَ قَامَتِ الْبَیِّنَةُ اَوْ کَانَ الْحَمْلُ اَوِ الْاِعْتِرَافُ اَلَا وَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَدْ رَجَمَ وَ رَجَمْنَا مَعَهٗ »[بخاری، کتاب الحدود: باب الاعتراف بالزنی(٦٨٢٩)، مسلم (١٦٩١)، ابوداؤد (٤٤١٨)، ترمذی (١٤٣٢)، ابن ماجه(٢٥٥٣)، دارمی(٩٩/٢)، حمیدی(٢٥)، بیهقی(٢١١/٨)]

''آگاہ ہو جاؤ بے شک رجم اس آدمی پر جو شادی شدہ ہو اور زنا کا مرتکب ہو حق ہے جب اس پر دلیل قائم ہو جائے یا حمل ٹھہر جائے یا مجرم اعتراف کر لے۔ متنبہ رہو کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور ہم نے بھی رجم کیا۔''

اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ رجم کی سزا شادی شدہ پر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی نافذ تھی اور خلفاء کے دور میں یہی سزا نافذ العمل تھی۔

مذکورہ بالا آیت اور صحیح و مرفوع احادیث میں صراحتاً یہ بات موجود ہے کہ کنوارا آدمی سو کوڑوں اور ایک سال کی جلا وطنی اور شادی شدہ رجم کا مستحق ہے۔

عمل قوم لوط کی سزا

(سوال) جو شخص قوم لوط والا عمل کرے اس کی سزا کیا ہے؟ کیا اسے معافی مل سکتی ہے یا نہیں؟
(جواب) اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں قوم لوط کے اس عمل کو فحش قرار دیا ہے۔ ارشاد گرامی ہے:
﴿ وَ لُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَ أَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ﴾ [النمل : ٥٤]
''اور لوط (علیہ السلام) نے جب اپنی قوم سے کہا کہ تم بے حیائی وفحاشی (کے کام) کیوں کرتے ہو اور تم دیکھتے ہو۔''
اسی طرح سورۂ عنکبوت (۲۸) میں بھی موجود ہے۔ اللہ نے زنا کو بھی فحاشی ہی قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً ﴾ [اسراء: ۳۲]
''زنا کے قریب نہ جاؤ یہ فحاشی ہے۔''
معلوم ہوا کہ عمل قوم لوط انتہائی برا اور گندا فعل ہے جسے قرآن حکیم میں فحاشی سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیث میں اس کی سزا قتل ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''جسے تم قوم لوط والا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو کرنے والے اور کروانے والے دونوں کو قتل کر دو۔'' [ابو داؤد، کتاب الحدود باب فیمن عمل عمل قوم لوط (٤٤٦٢)، ابن الجارود (۸۲۰)، حاکم (٣٠٠/٤)]
اس حدیث کو حکم، ذہبی، ابن الجارود، ضیاء مقدسی، سیوطی اور علامہ البانی وغیرھم نے صحیح قرار دیا ہے۔
[ارواء الغلیل: (۲۳۵۰)، الحاوی فی الفتاویٰ (١١٠/٢)،(١١٥)]
عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا:
''عمل قوم لوط کرنے والے کی حد کیا ہے؟'' تو انھوں نے کہا: ''دیہات میں اونچی عمارت دیکھی جائے اور اس کے اوپر سے اوندھا گرا دیا جائے پھر اس پر پتھر برسائے جائیں۔''[ذم اللواط از هيشم بن خلف الدوری (٤٨) ، (٨٢)]
امام ابن القصار اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:
''عمل قوم لوط کرنے والے کے قتل پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے، اختلاف صرف اس کے قتل کی کیفیت میں ہے۔''
[زاد المعاد (٤٠/٥) ، (٤١)]
حدیث رسول کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اسے قتل کیا جائے۔ سید ابو محمد بدیع الدین الراشدی رحمہ اللہ کا اس حدیث پر مفصل مقالہ ''القندیل المشعول لتحقیق حدیث اقتلوا الفاعل والمفعول'' کے نام سے موجود ہے۔ ان دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ باجماع صحابہ ایسا آدمی واجب القتل ہے البتہ عدالت میں مقدمہ پہنچنے سے پہلے اس کے عیب پر اگر پردہ ڈال دیا گیا ہے تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اگر وہ سچے دل سے توبہ کر لیتا ہے تو معافی ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اکثر لوگ ایسا عمل کرنے والے کو لوطی کہہ دیتے ہیں اور اس غلطی میں خواص وعوام گرفتار ہیں۔

اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس کے کام کو عمل قوم لوط کہیں یا پھر اس بستی کی طرف نسبت کریں جس میں یہ فعل واقع ہوتا تھا یعنی اسے سدومی کہہ دیں، لوط علیہ السلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ امید ہے کہ قارئین اس بات کا ضرور لحاظ رکھیں گے۔

غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت نشینی

(سوال) کیا اجنبی عورت کے ساتھ علیحدگی اختیار کرنا قابل سزا جرم ہے؟

(جواب) شریعت اسلامیہ نے امت مسلمہ کو برائی سے بچانے کے لیے بہت سے اقدامات کیے ہیں تاکہ مسلم معاشرہ انتہائی اعلیٰ اقدار پر مرتب ہو اور ہر طرح کے فتنے سے بچا رہے لیکن شیطانی قوتیں امت مسلمہ کو نقصانات سے دو چار کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتی رہتی ہیں۔ ان کی چالوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں مرد و زن کا اختلاط عام کیا جائے اور اسلامی حد بندی ختم کر دی جائے تاکہ برائی پھیلے۔ کیونکہ غیر محرم مردوں کا غیر محرم عورتوں سے کھلے عام ملنا اور خلوت اختیار کرنا اگر عام ہو جائے تو اس معاشرے میں بہت سی برائیاں جنم لے لیتی ہیں۔ کیونکہ عورت کا فتنہ جس قدر نقصان دہ اور ضرر رساں ہے شاید ہی کوئی اور فتنہ اس قدر نقصان دہ ہو۔ بنی اسرائیل میں تباہی و بربادی کے جو اسباب تھے ان میں سے ایک اہم سبب عورت کا فتنہ ہے۔ یہ جب اپنی حدود (چار دیواری وغیرہ) سے نکل کر زیب و زینت سے آراستہ ہو کر کھلے عام نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانکتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں مختلف وساوس پیدا کر کے انھیں اس میں ملوث ہونے پر ابھارتا ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس فتنے سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ صحابی رسول ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَ إِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا فَنَاظِرٌ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَ اتَّقُوا النِّسَاءَ فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِيْ إِسْرَائِيلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ »[مسلم، كتاب الرقاق: باب اكثر أهل الجنة الفقراء وأكثر أهل النار النساء(٢٧٤٢)، مسند احمد (٢٢/٣)، شرح السنة(١٢/٩)، بيهقى(٩١/٧)، مصنف عبد الرزاق(٣٠٥/١١)]

”دنیا میٹھی ہے اور سر سبز ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ تمھیں اس دنیا میں خلیفہ بنانے والا ہے، وہ دیکھنے والا ہے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟ دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو، بے شک بنی اسرائیل کا فتنہ عورتوں سے متعلق تھا۔“

صحابی رسول اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِي النَّاسِ فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ »[بخاری، كتاب النكاح: باب مايتقى من شؤم المراة(٥٠٩٦)، مسلم(٢٧٤٠)، ترمذى (٢٩٤٢)، مسند احمد(٢٠٠/٥)]

”میں نے اپنے بعد لوگوں میں مردوں پر عورتوں سے زیادہ نقصان دہ کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔“

ان دونوں صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں بہت سے فتنے اور آزمائشیں مسلمان پر وارد ہوتی ہیں اور ان آزمائشوں میں سب سے زیادہ آزمائش عورت کے فتنے کی ہے، اگر کوئی مرد عورت کے فتنے سے بچا رہتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ

کے ہاں انتہائی اجر کا مستحق ہوگا بلکہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے تلے ہوگا جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

''سات آدمی ایسے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ اپنے عرش کا سایہ دے گا جس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہو گا ان میں سے ایک آدمی یہ ہوگا: « رَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصَبٍ وَ جَمَالٍ إِلٰى نَفْسِهَا فَقَالَ إِنِّي أَخَافُ اللّٰهَ »[بخاری، كتاب الزكاة: باب الصدقة باليمين(١٤٢٣)، مسلم(١٠٣١)، ترمذی(٢٣٩١)، نسائی (٨/٢٢٢)، مسند احمد(٢/٤٣٩)، ابن خزيمة(٣٥٨)، شرح السنة(٢/٣٥٤)]

''حسن و جمال والی عورت اسے برائی کی دعوت دے تو وہ کہہ دے مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے۔''

لہٰذا مسلمان آدمی کو عورت کے فتنہ سے بچنے کے لیے ہر طرح کوشاں رہنا چاہیے کیونکہ جب عورت زیب و زینت سے آراستہ اور بناؤ سنگھار سے مزین ہو کر گھر سے باہر نکلتی ہے تو انسان کو شیطان پھنسانے کے لیے اس کے دل میں طرح طرح کے برے خیالات اور وساوس ڈالتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس فتنے کی روک تھام کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مختلف اقدامات کیے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾
[الاحزاب:٣٢،٣٣]

''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابقہ دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو اس بات کی ہدایت کر دی ہے کہ کسی آدمی سے نرم اور دبے لہجے میں گفتگو نہ کرو تا کہ کوئی دل کا مریض کسی لالچ میں مبتلا نہ ہو جائے۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ﴾ [الاحزاب:٥٣]

''اور جب تم ان سے کسی فائدے کا سوال کرو تو پردے کے پیچھے رہ کر سوال کرو۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے غیر مرد کو غیر عورت کے ساتھ بغیر حجاب کے گفتگو کرنے سے منع کر دیا۔ یہ حدود اور پابندیاں صرف اسی لیے عائد کی جا رہی ہیں کہ مرد و زن کا اختلاط نہ ہو تا کہ آوارگی اور بے حیائی کا دروازہ نہ کھلے۔

شریعت اسلامیہ میں کسی بھی غیر مرد کو غیر عورت کے ساتھ خلوت کی اجازت نہیں۔ ایک مرتبہ خلیفۃ المسلمین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جابیہ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو فرمایا:

''ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ اس طرح کھڑے ہوئے جیسے میں تمھارے درمیان کھڑا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

« اَكْرِمُوْا اَصْحَابِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ يَظْهَرُ الْكِذْبُ حَتّٰى اَنَّ الرَّجُلَ

لَیَحْلِفُ وَ لَا یُسْتَحْلَفُ وَ یَشْهَدُ وَ لَا یُسْتَشْهَدُ اَلَا فَمَنْ سَرَّهُ بُحْبُحَةُ الْجَنَّةِ فَلْیَلْزَمِ الْجَمَاعَةَ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ الْفَذِّ وَ هُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ وَ لَا یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَاَةٍ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ ثَالِثُهُمْ وَ مَنْ سَرَّتْهُ حَسَنَتُهُ وَ سَاءَتْهُ سَیِّئَتُهُ فَهُوَ مُؤْمِنٌ » [ترمذی، کتاب الفتن: باب لزوم جماعة المسلمین (۲۱۶۵)، شرح السنة (۲۷/۹)، (۲۲۵۳)، حاکم(۱/ ۱۱۳)، مسند احمد(۱/ ۱۸)]

''میرے ساتھیوں کا اکرام کرو پھر ان کے قریب والوں کا، پھر ان کے قریب والوں کا، پھر جھوٹ ظاہر ہو جائے گا یہاں تک کہ آدمی قسم کھائے گا اور (حالانکہ) اس سے قسم طلب نہیں کی جائے گی۔ گواہی دے گا اور اس سے گواہی نہیں مانگی جائے گی۔ خبردار! جسے جنت کا وسط پسند ہو وہ جماعت کو لازم پکڑے، اس لیے کہ اکیلے کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور وہ دو سے بہت دور ہوتا ہے اور کوئی مرد ہرگز کسی عورت کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرے اس لیے کہ ان میں تیسرا شیطان ہوتا ہے، جس شخص کو اس کی نیکی خوش کرے اور برائی بری لگے وہ مومن ہے۔''

اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ غیر عورت کے ساتھ خلوت اختیار کرنا بالکل منع ہے۔امام بغوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« خَلْوَةُ الرَّجُلِ بِالْمَرْاَةِ الْاَجْنَبِیَّةِ وَ الْمُسَافِرَةِ بِهَا حَرَامٌ فَاِنْ کَانَتْ مِنَ الْمَحَارِمِ فَلَا بَاْسَ بِالْمُسَافِرَةِ بِهَا » [شرح السنة(۹/ ۲۸)]

''اجنبی عورت سے مرد کا خلوت اختیار کرنا اور اس کیساتھ سفر کرنا حرام ہے اگر عورت محارم سے ہو تو پھر کوئی گناہ نہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

« لَا یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَاَةٍ اِلَّا وَ مَعَهَا ذُوْ مَحْرَمٍ وَ لَا تُسَافِرُ الْمَرْاَةُ اِلَّا مَعَ ذِیْ مَحْرَمٍ فَقَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ امْرَاَتِیْ خَرَجَتْ حَاجَّةً وَ اِنِّیْ اکْتُتِبْتُ فِیْ غَزْوَةِ کَذَا وَ کَذَا قَالَ انْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَاَتِكَ » [مسلم، کتاب الحج: باب سفر المرأة مع محرم الی حج وغیرہ(۱۳۴۱)، بخاری (۵۲۳۳)، طبرانی کبیر (۱۱/ ۳۳۵) ، مسند احمد(۱۹۳۴، ۳۲۳۱، ۳۲۳۲)]

''کوئی مرد کسی عورت سے ہرگز خلوت اختیار نہ کرے مگر اس کے ساتھ اس کا محرم اور عورت اپنے محرم کے علاوہ سفر نہ کرے۔'' ایک آدمی کھڑا ہوا اس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میری بیوی حج کرنے نکلی ہے اور میرا نام فلاں فلاں غزوہ میں لکھا دیا گیا ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو واپس چلا جا اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کر۔''

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِیَّاکُمْ وَ الدُّخُوْلَ عَلَی النِّسَاءِ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَفَرَاَیْتَ الْحَمْوَ ؟ قَالَ الْحَمْوُ الْمَوْتُ » [بخاری، کتاب النکاح: باب لا یخلون الرجل بامرأة إلا ذو محرم(۵۲۳۲)، مسلم (۲۱۷۲)، مسند احمد (۴/ ۱۴۹)، ترمذی(۱۱۷۱)، شرح السنة(۲۲۵۲)]

''عورت پر داخل ہونے سے بچو۔'' ایک انصاری نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! عورت کے مرد کی جانب سے جو رشتہ

دار ہیں (دیور، جیٹھ وغیرہ) ان کے متعلق بتائیں؟'' آپ نے فرمایا: ''وہ (یعنی حمو) تو موت ہیں۔''

پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ حج جیسی اہم عبادت کے لیے آپ ﷺ نے عورت کو تنہا جانے کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے اس کے شوہر کو کہا کہ تم خود اس کے ساتھ جا کر حج کرو اور دوسری حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے دیور و جیٹھ وغیرہ کو اپنی بھابھی کے ساتھ تنہائی اختیار کرنے کو موت قرار دیا ہے، جب قریبی رشتہ دار مرد جو غیر محرم ہیں ان سے تنہائی اختیار کرنے سے منع کیا ہے تو دیگر افراد جو اس کے رشتہ دار بھی نہیں، ان کے ساتھ علیحدگی میں ملاقات کرنے بلکہ رات گزارنے کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے؟

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلَا لَا يَبِيْتَنَّ رَجُلٌ عِنْدَ امْرَاَةٍ ثَيِّبٍ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ نَاكِحًا اَوْ ذَا مَحْرَمٍ» [مسلم، كتاب السلام: باب تحريم الخلوة بالأجنبية والدخول عليها(٢١٧١)، تاريخ بغداد (١٠٩/٨)، التمهيد (٢٢٧/١)، بيهقى (٩٨/٧)]

''خبردار! کوئی آدمی کسی ثیبہ (شادی شدہ) عورت کے پاس ہرگز رات بسر نہ کرے سوائے خاوند یا محرم کے۔''

امام نووی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" اِنَّمَا خُصَّ الثَّيِّبُ لِكَوْنِهَا الَّتِیْ يُدْخَلُهَا اِلَيْهَا غَالِبًا وَ اَمَّا الْبِكْرُ فَمَصُوْنَةٌ مُتَصَوَّنَةٌ فِی الْعَادَةِ مُجَانَبَةٌ لِلرِّجَالِ اَشَدُّ الْمُجَانَبَةِ فَلَمْ يَحْتَجْ اِلٰی ذِكْرِ مَا وَ لِاَنَّهُ مِنْ بَابِ التَّنْبِيْهِ لِاَنَّهُ اِذَا نُهِیَ عَنِ الثَّيِّبِ الَّتِیْ يَتَسَاهَلُ النَّاسُ فِی الدُّخُوْلِ عَلَيْهَا فِی الْعَادَةِ فَالْبِكْرُ اَوْلٰى" [شرح مسلم للنووى (١٩/١٤)]

''اس حدیث میں ثیبہ (شادی شدہ، مطلقہ، بیوہ) عورت کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ اکثر ان عورتوں کے پاس آنا جانا ہوتا تھا اور کنواری لڑکی عادتاً اس سے محفوظ و مامون ہوتی تھی اور مردوں سے اختلاط سے سختی سے بچائی جاتی تھی، اس لیے اس کے ذکر کی حاجت نہیں۔ اس لیے کہ یہ تنبیہ کے باب سے ہے۔ اجب ثیبہ جس کے پاس آنے سے لوگ تساہل برتتے تھے، کے پاس آنے سے منع کیا گیا تو کنواری لڑکی کے پاس آنا بالاولیٰ منع ہے۔''

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ غیر محرم مرد کو کسی غیر محرم عورت کے ساتھ سفر کرنا، اس کے پاس رات بسر کرنا اور خلوت و تنہائی اختیار کرنا حرام ہے اور ایسے فعل کا مرتکب ہونا واجب التعزیر ہے۔ شریعت اسلامی میں بعض وہ جرائم ہیں جن کی سزا متعین ہے اور بعض وہ ہیں جن کی سزا کا تعین نہیں۔ اول صورت میں حدود کا نفاذ کیا جاتا ہے اور دوسری صورت میں تعزیر لگائی جاتی ہے۔ فعل حرام کا مرتکب واجب التعزیر ہوتا ہے، دنیا میں اسے سزا دی جاتی ہے جیسا کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« بَايِعُوْنِیْ عَلٰی اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَ لَا تَسْرِقُوْا وَ لَا تَزْنُوْا وَ لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ وَ لَا

تَاْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهُ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَ اَرْجُلِكُمْ وَ لَا تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ وَ مَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِي الدُّنْيَا كَفَّارَةٌ لَّهُ وَ مَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَ اِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ »[بخاری ، كتاب الايمان: باب (١٨)، مسلم (١٧٠٩)، نسائی(١٤١/٧)، بيهقی(١٨/٨)، مستدرك حاكم (٣١٨/٢)]

''میری بیعت اس شرط پر کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے۔ جو بہتان تم اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے گھڑتے ہو نہ لاؤ گے اور معروف میں نافرمانی نہ کرو گے۔ جس نے تم میں سے وفا کی اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور جو ان اشیاء کا مرتکب ہوا وہ دنیا میں سزا دیا جائے گا اور وہ اس کے لیے کفارہ بن جائے گا اور جو ان اشیاء کا مرتکب ہوا پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے، اگر چاہے تو اسے معاف کر دے اور اگر چاہے تو اسے سزا دے۔ ہم نے ان شروط پر آپ کی بیعت کر لی۔''

اس حدیث میں آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ « فَعُوْقِبَ بِهِ فِي الدُّنْيَا »عام ہے جو ہر قسم کے جرم کی سزا کو شامل ہے خواہ وہ حدود سے ہو یا تعزیر سے یا قصاص سے متعلقہ۔ لہٰذا شرع میں ہر جرم کی سزا ہے تو جو شخص ایسے قبیح افعال کا مرتکب ٹھہرے تو حاکم وقت کو اس پر اس کی سزا جاری کرنی چاہیے۔ ہمارے ملک کے بعض ججوں نے جو یہ بات کہی ہے کہ غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت کرنا کوئی جرم نہیں، یہ بالکل غلط ہے اور شرعی علوم سے ناواقفیت، لاعلمی اور عدم تفقہ کا ثبوت ہے۔ ایسے افراد کو جو شرعی علوم سے ناواقف ہوں اور ان کی حالت خلاف شرع ہو، عدالت کی کرسی پر بٹھانا اسلامی عہدہ قضا کی توہین ہے۔ عدالت کا قاضی و جج وہ ہونا چاہیے جو شرعی علوم میں مہارت تامہ رکھتا ہو اور اس کی اپنی حالت بھی شریعت اسلامیہ کے مطابق ہو لیکن افسوس کہ ہمارے ملک کا نظام مغربی جمہوریت پر مبنی اور انگریزی قوانین پر مشتمل ہے اور جج حضرات بجائے اس کے کہ قرآن و سنت کے مطابق فیصلے کریں وہ انگریزی قوانین کو ترجیح دیتے ہوئے ایسے فیصلے سناتے ہیں۔

مرتد کسے کہتے ہیں؟

سوال مرتد کسے کہتے ہیں اور اس کی شرعی سزا کیا ہے؟ قرآن و حدیث سے وضاحت فرما دیں۔

جواب مرتد اسم فاعل ہے باب'' اِرْتَدَّ يَرْتَدُّ اِرْتِدَادًا '' سے جس کا لغوی معنی ہے پھرنے والا، پلٹنے والا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰى اَدْبَارِهِمْ ﴾ [محمد:٢٥]

''بے شک جو لوگ اپنی پیٹھ کے بل الٹے پھر گئے۔''

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰىٓ آثَارِهِمَا قَصَصًا ﴾ [الكهف:٦٤]

'' (موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا: ''یہی تھا جس کی تلاش میں ہم تھے۔'' چنانچہ وہ دونوں وہیں سے اپنے قدموں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے واپس پلٹے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ ﴾ [المائدة: ٥٤]

'' اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ کی محبوب ہوگی اور وہ بھی اللہ سے محبت رکھتی ہوگی۔''

مذکورہ بالا تینوں آیات میں '' اِرْتَدَّ ، فَارْتَدَّ اور يَرْتَدُّ '' ایک ہی باب کے مختلف صیغے ہیں، جس کا مادہ رَدٌّ ہے اور اس کا معنی پھرنا، واپس کرنا وغیرہ ہے اور اصطلاحی طور پر اس کی تعریف یہ ہے:

'' ایسا شخص جو اسلام کو اختیار کرنے والا ہو، پھر اس کا کسی قول، فعل، کفریہ عقیدہ یا ضروریات دینیہ میں سے کسی سے شک کی بنیاد پر دین اسلام سے پھر جانا، مرتد ہونا ہے۔'' [عقوبة الاعدام(ص:٣٤٩)]

بعض ائمہ نے مرتد کی تعریف یوں کی ہے:

'' اَلرَّاجِعُ عَنْ دِيْنِ الْاِسْلَامِ اِلَى الْكُفْرِ '' [القاموس الفقهى(ص:١٤٧)]

'' دین اسلام سے کفر کی طرف پلٹنے والا۔''

گویا مرتد ایسا شخص ہے جو اسلام لانے کے بعد واپس کفر کی طرف پلٹ گیا۔ یہ ارتداد اس کے اندر خواہ عقیدہ کی بنا پر پیدا ہوا ہو یا کسی قول، فعل اور شک وشبہ کی بنا پر خواہ سنجیدگی سے واقع ہوا ہو یا مذاق اور ٹھٹھا سے، کیونکہ ارتداد جیسے سنجیدگی سے واقع ہوتا ہے ایسے ہی استہزاء و ہذل، ٹھٹھا و مذاق سے بھی واقع ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ أَبِاللّٰهِ وَ آيَاتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ○ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ...... ﴾ [التوبة:٦٥،٦٦]

'' کہہ دیجیے کیا اللہ تعالیٰ، اس کی آیات اور اس کا رسول ہی تمھارے مذاق کے لیے رہ گئے ہیں؟ تم بہانے نہ بناؤ، یقیناً تم اپنے ایمان کے بعد کفر کر چکے ہو۔''

مرتد آدمی پکا جہنمی ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ وَ اُولٰٓئِكَ

اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴾ [البقرة: ۲۱۷]
''یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑائی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تمھیں تمھارے دین سے مرتد کر دیں گے اور تم میں سے جو اپنے دین سے مرتد ہو گیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گیا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں غارت ہو جائیں گے۔ یہ لوگ جہنمی ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔''

مرتد کی دنیوی سزا

(سوال) مرتد شخص آخرت میں جو عذاب جھیلے گا وہ تو ہے ہی مہربانی فرما کر دنیا میں شریعت نے جو اس کے لیے سزا رکھی ہے اس کی وضاحت فرما دیں؟

(جواب) دنیا میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدنا عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ حَرَّقَ قَوۡمًا فَبَلَغَ ابۡنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا فَقَالَ لَوۡ كُنۡتُ اَنَا لَمۡ اُحَرِّقۡهُمۡ لِاَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: لَا تُعَذِّبُوۡا بِعَذَابِ اللّٰهِ وَ لَقَتَلۡتُهُمۡ كَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ سَلَّمَ مَنۡ بَدَّلَ دِيۡنَهٗ فَاقۡتُلُوۡهُ » [بخاری، كتاب استتابة المرتدين و المعاندين و قتالهم :باب حكم المرتد والمرتدة و استتابتهم (۶۹۲۲) (۳۰۱۷) مسند حمیدی(۵۳۳) ، بیهقی (۱۹۵/۸)، ابن ماجه، كتاب الحدود: باب المرتد عن دينه (۲۵۳۵)، مسند احمد(۲۸۲/۱)، دارقطنی (۱۱۳/۳)، ابو داؤد، كتاب الحدود: باب الحكم فيمن ارتد (۴۳۵۱)، نسائی(۱۰۴/۷)، ترمذی (۱۴۵۸)، شرح السنة(۲۵۶۰)، مسند ابی یعلی(۲۵۳۲)]

''علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایک قوم کو آگ میں جلایا۔ یہ بات عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو پہنچی تو انھوں نے فرمایا: ''اگر میں ہوتا تو انھیں آگ میں نہ جلاتا۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے عذاب کے ساتھ عذاب نہ دو۔'' البتہ انھیں قتل کر دیتا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنا دین بدل دیا اسے قتل کر دو۔''

② سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« لَا يَحِلُّ دَمُ امۡرِئٍ مُسۡلِمٍ يَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنِّيۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَّا بِاِحۡدٰى ثَلَاثٍ: اَلنَّفۡسُ بِالنَّفۡسِ وَ الثَّيِّبُ الزَّانِيۡ وَ الۡمُفَارِقُ لِدِيۡنِهِ التَّارِكُ لِلۡجَمَاعَةِ » [بخاری، كتاب الديات: باب قول الله تعالىٰ : أن النفس بالنفس والعين بالعين(۶۸۷۸)، مسلم، كتاب القسامة: باب ما يباح به دم المسلم (۱۶۷۶)، مسند احمد(۳۸۲/۱)، ابوداؤد، كتاب الحدود(۴۳۵۲)، ترمذی، كتاب الديات: (۱۴۰۲)، ابن حبان(۴۴۰۴)، نسائی، كتاب القسامة(۱۳/۸)، مسند حمیدی(۱۱۹)، دارقطنی(۸۲/۳)، بیهقی (۱۹/۸)]

"جو مسلمان لا الٰہ الا اللہ اور میرے رسول ہونے کی گواہی دے، اس کا خون حلال نہیں مگر تین کاموں میں سے کسی ایک کی بنا پر (۱) نفس کے بدلے نفس (۲) شادی شدہ زانی (یعنی رجم کر کے مار دیا جائے) (۳) اپنے دین کو چھوڑنے والا، جماعت کو ترک کرنے والا (یعنی مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہو کر کافروں کی جماعت میں شامل ہو جائے اور دین اسلام ترک کر بیٹھے، مرتد ہو جائے)۔"

④ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« كُلُّ مُرْتَدٍّ عَنِ الْإِسْلَامِ مَقْتُولٌ إِذَا لَمْ يَرْجِعْ ذَكَرًا أَوْ أُنْثَى »[دارقطنی(۹۳/۳)، (۳۱۹۵)]

"اسلام سے مرتد ہونے والا ہر شخص قتل کیا جائے گا اگر وہ واپس نہ پلٹے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔"

اس اثر کی سند حسن ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا موقف بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔
[المحلّٰی لابن حزم(۱۲۲/۱۳)]

امام ابوالمظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَاتَّفَقُوْا عَلٰى اَنَّ الْمُرْتَدَّ عَنِ الْإِسْلَامِ يَجِبُ عَلَيْهِ الْقَتْلُ" [الافصاح عن معانی الصحاح (۱۸۷/۲)]

"اس بات پر ائمہ دین کا اتفاق ہے کہ اسلام سے مرتد ہونے والا واجب القتل ہے۔"

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ اَجْمَعَ اَهْلُ الْعِلْمِ عَلٰى وُجُوْبِ قَتْلِ الْمُرْتَدِّ وَ رُوِيَ ذٰلِكَ عَنْ اَبِيْ بَكْرٍ وَ عُمَرَ وَ عُثْمَانَ وَ عَلِيٍّ وَ مُعَاذٍ وَ اَبِيْ مُوْسٰى وَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ خَالِدٍ وَ غَيْرِهِمْ وَ لَمْ يُنْكَرْ ذٰلِكَ فَكَانَ اِجْمَاعًا "
[المغنی لابن قدامة(۱۲۳/۸)]

"اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ مرتد واجب القتل ہوتا ہے اور یہ بات ابوبکر، عمر، معاذ، ابو موسیٰ، عبداللہ بن عباس، خالد وغیرھم رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اس پر انکار نہیں کیا گیا، لہٰذا اس پر اجماع ہو گیا۔"

اور یہی اجماع علامہ صنعانی، ابن دقیق العید اور کاسانی حنفی رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے۔ [سبل السلام(۲۶۳/۳)، احکام الاحکام(۸٤/۳)، بدائع الصنائع(۱۳٤/۷)، بحوالہ عقوبۃ الاعدام (ص/۳٦۸)]

پس معلوم ہوا کہ قرآن و سنت، اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اجماع اہل علم، فقہاء و محدثین کی رو سے مرتد واجب القتل ہے۔

کافر کے بدلے مسلمان کا قتل

سوال کیا کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل کرنا جائز ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل کرنا جائز نہیں۔ امام شافعی، امام احمد، امام سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ اور اہل ظواہر اسی بات کی طرف گئے ہیں۔ ان کے دلائل یہ ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴾ [سورة الدخان: ٣٠]

''کیا ہم مسلمانوں کو مجرمین (کفار) کی طرح بنا دیں، تمھیں کیا ہو گیا ہے کیسے فیصلے کرتے ہو۔''

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴾ [نساء: ١٤١]

''اور اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مومنوں پر ہرگز کوئی راہ نہیں بنائے گا۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُوْنَ ﴾ [سجدة: ١٨]

''کیا مومن فاسق کی طرح ہو سکتا ہے؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔''

یہ آیات بینات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کافر مسلمان کے مساوی نہیں ہو سکتا اور جب ان دونوں میں برابری نہیں تو مسلمان سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی اس بات کی مزید توضیح کرتا ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَائُهُمْ يَسْعَى بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ وَ يُجِيْرُ عَلَيْهِمْ أَقْصَاهُمْ وَ هُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ يَرُدُّ مُشِدُّهُمْ عَلٰى مُضْعِفِهِمْ وَ مُتَسَرِّيْهِمْ عَلٰى قَاعِدِهِمْ لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ وَ لَا ذُوْعَهْدٍ فِيْ عَهْدِهٖ » [ابو داؤد، كتاب الجهاد: باب في السرية ترد على أهل العسكر (٢٧٥١)]

''مسلمانوں کے خون برابر ہیں، ان کا ادنیٰ سا آدمی ذمہ و امن دے سکتا ہے اور دور رہنے والا مسلمان پناہ دے سکتا ہے اور یہ اپنے مخالفین کے مقابلے میں یکمشت ہوتے ہیں۔ طاقتور اور تیز رفتار سواریوں والا کمزور سواریوں والے کے قریب رہے اور جب لشکر میں سے کوئی ٹکڑے نکال کر مال کمائے تو باقی لوگوں کو اس میں شریک کرے اور مسلمان کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور نہ ذمی جس سے عہد لیا گیا ہو۔''

مسند احمد میں علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''مسلمان کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔'' [مسند احمد، (١٢٢/١)]

لہٰذا کسی مسلمان آدمی کو کافر کے بدلے قتل کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ جو لوگ عصر حاضر میں یہ واویلا کیے جا رہے ہیں کہ اسامہ بن لادن یا اس کے دیگر مجاہد ساتھیوں کو امریکہ کے حوالے کر دینا چاہیے انھیں ان قرآنی اور حدیثی نصوص پر غور کرنا چاہیے اور اپنے ناجائز مطالبات سے باز آ جانا چاہیے اور اہل کفر کی سازشوں کو سمجھنا چاہیے۔

بیٹے کے قصاص میں باپ کا قتل

سوال اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کو قتل کر بیٹھے تو کیا اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا یا اس کا کوئی شرعی حکم ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرما دیں۔

(جواب) اگر کسی وجہ سے باپ اپنے بیٹے کو قتل کر دے تو قصاص میں باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا، یہی بات جمہور فقہائے شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ نے کہی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل فقہ کی کتب میں مذکور ہے۔[الشرح الكبير على متن المقنع(١٧٥/٥)، المهذب (١٧٤/٢)، بداية المحتهد (٤٠٢/٢)، بدائع الصنائع (٢٣٥/٧)]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَ لَا تَنْهَرْ هُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا ﴾ [الإسراء:٢٣،٢٤]

''اور تیرا پروردگار حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔ اگر تیرے ہاں ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اف تک نہ کہو اور نہ انھیں ڈانٹ ڈپٹ ہی کرو اور ان کے ساتھ ادب و احترام سے بات کرو اور عاجزی و محبت کے ساتھ ان کے سامنے تواضع کے بازو پست رکھو اور کہو اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ ان دونوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور ان کے سامنے عاجزی اور تواضع کے بازو پست کرنے کا حکم دیا ہے اور انھیں جھڑکنے اور ایسی بات کہنے سے منع کیا ہے جس سے انھیں تکلیف ہو خواہ وہ چھوٹی سی بات ہی کیوں نہ ہو۔

جب انھیں جھڑکنا اور اف تک کہنا منع ہے تو یہ کس طرح جائز ہوسکتا ہے کہ انھیں قصاص میں قتل کر دیا جائے۔ اس طرح دیگر حسن سلوک والی آیات سے یہی بات اخذ کی گئی ہے۔

عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنو مدلج کے ایک شخص کے پاس ایک باندی تھی اور اس سے اس شخص کا ایک بیٹا تھا۔ وہ اس سے خدمت لیتا تھا۔ جب لڑکا جوان ہوگیا تو ایک دن اس شخص نے اس باندی کو بلایا اور کہا: ''اس طرح کام کرو۔'' لڑکے نے کہا: ''وہ میرے پاس نہیں آئے گی جب تک تو اسے غلام بنائے رکھے گا۔'' لڑکے کے باپ نے غصے میں آ کر تلوار اس کی طرف پھینکی جس سے اس کی ٹانگ کٹ گئی، اس لڑکے کا خون بہ گیا اور وہ فوت ہوگیا تو وہ شخص اپنی قوم کے ایک گروہ کے ہمراہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے اسے کہا:

« يَا عُدُوَّ نَفْسِهِ اَنْتَ الَّذِيْ قَتَلْتَ ابْنَكَ ؟ لَوْ لَا اَنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يُقَادُ الْاَبُ بِابْنِهِ لَقَتَلْتُكَ هَلُمَّ دِيَتَهُ قَالَ فَاَتَاهُ بِعِشْرِيْنَ اَوْ ثَلَاثِيْنَ وَ مِائَةِ بَعِيْرٍ قَالَ فَتَخَيَّرَ مِنْهَا مِائَةً فَدَفَعَهَا اِلٰى وَرَثَتِهِ وَ تَرَكَ اَبَاهُ » [المنتقى لابن الجارود (٧٨٨)، بيهقى(٣٨/٨)، دارقطني(١٤٠/٣)]

''اے اپنی جان کے دشمن! تو وہ ہے جس نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا، اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے نہ

سنا ہوتا کہ ''باپ سے بیٹے کے بدلے قصاص نہ لیا جائے'' تو میں تجھے قتل کر دیتا، اس کی دیت لاؤ۔'' ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''وہ ایک سو بیس یا تیس اونٹ لایا، عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں سے سو اونٹ لے کر اس لڑکے کے وارثوں کے حوالے کر دیے اور اس کے باپ کو چھوڑ دیا۔''

یہ روایت حسن درجہ کی ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے مختلف طرق کی وجہ سے صحیح قرار دیا ہے۔[إرواء الغليل (٢٢١٤)، (٢٦٩/٧)]

یہی روایت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ [ابن ماجه، كتاب الديات: باب لا يقتل الوالد بولده (٢٦٦١)، ترمذی(١٤٠١)، دارقطنی(١٤١/٣) حلية الأولياء(١٨/٤)، بيهقی(٣٩/٨)، مسند دارمی (٢٤٠٢)، حاكم(٣٦٩/٤)، ابن ابی شيبة (٤٣/١٠)]

اس روایت کی سند میں اگرچہ اسماعیل بن مسلم المکی راوی کمزور ہے لیکن مختلف طرق اور شواہد کی وجہ سے صحیح ہے۔

عقلی طور پر اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ باپ بیٹے کے وجود کا سبب ہے اس لیے مناسب نہیں کہ بیٹا باپ کے فنا اور خاتمے کا سبب بنے اور دوسری بات یہ ہے کہ قصاص زجر و توبیخ کے لیے مشروع کیا گیا ہے، یہاں بیٹے کے قتل کی وجہ سے باپ کو زجر کی حاجت نہیں، اس لیے کہ والدین کی اولاد کے بارے میں شفقت و رافت معروف ہے اور یہ شفقت انھیں ظلم و عدوان کے ساتھ قتل کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ [عقوبة الاعدام(ص:١٩٥)]

پس معلوم ہوا کہ والد کو بیٹے کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔ بعض اہل علم قصاص کی عمومی آیات اور احادیث سے استدلال کرتے ہوئے باپ کو قصاص میں قتل کرنے کے قائل ہیں لیکن مختار قول وہی ہے جو ہم نے اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عقوبة الاعدام للشيخ محمد بن سعيد جامعة الامام محمد بن سعود الإسلامية اور القصاص فی النفس للدكتور عبد الله العلی استاذ جامعة الإمام محمد بن سعود۔

❀❀❀

دعاؤں اور اذکار کے احکام

WWW. KITABOSUNNAT.COM

تسبیح گننے کا صحیح اور ثابت طریقہ

(سوال) تسبیحات شمار کرنے کے لیے آج کل رنگا رنگ کی تسبیحیں بازاروں میں بک رہی ہیں اور کھجور کی گٹھلیوں سے بھی یہ کام لیا جا رہا ہے۔ کیا ان چیزوں کا ثبوت سنتِ رسول سے ملتا ہے؟ وضاحت فرما دیں۔

(جواب) تسبیح شمار کرنے کا جو مروجہ طریقہ ہے کہ لوگ کھجور کی گٹھلیوں پر یا کنکریوں پر یا دونوں ہاتھوں پر شمار کرتے ہیں، اس کا ذکر کسی صحیح حدیث میں موجود نہیں۔ انگلیوں پر شمار کرنے کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« يَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ ! اعْقِدْنَ بِالْأَنَامِلِ فَإِنَّهُنَّ مَسْئُولَاتٌ مُسْتَنْطَقَاتٌ » [ترمذی، کتاب الدعوات باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید: (۳٤۸٦)]

”آپ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ انگلیوں سے تسبیح شمار کریں بے شک ان انگلیوں سے سوال کیا جائے گا اور یہ بلائی جائیں گی۔“

یہ حدیث تو مطلق انگلیوں پر شمار کرنے کے متعلق تھی، اب وہ حدیث ملاحظہ فرمائیں جس میں دائیں ہاتھ کی صراحت موجود ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَعْقِدُ التَّسْبِيْحَ بِيَمِيْنِهِ » [ابوداؤد کتاب الوتر، باب التسبیح بالحصی(۱۵۰۲)، الاذکار للنبوی ۲۳۰)، عمل الیوم واللیلة (۸۱۹)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ دائیں ہاتھ سے تسبیح گنتے تھے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تسبیح شمار کرتے وقت سنت کے مطابق دائیں ہاتھ پر شمار کرنی چاہیے۔

کیا تسبیح کا استعمال جائز ہے؟

(سوال) کیا طواف کے چکر شمار کرنے کے لیے تسبیح کا استعمال جائز ہے؟

(جواب) طواف کے چکر شمار کرنے کے لیے تسبیح کا استعمال ہمارے علم کے مطابق کسی حدیث میں موجود نہیں بلکہ عام ذکر و اذکار کے متعلق بھی کوئی ایسی حدیث نہیں کہ رسول اللہ ﷺ تسبیح کے دانوں پر شمار کرتے ہوں۔

وظائف کی تعداد کا مسئلہ

سوال کیا وظائف کی تعداد مقرر ہے، بالخصوص درود شریف کی؟

جواب کچھ وظائف تو ایسے ہیں جن کی تعداد کتب احادیث میں مقرر ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کی تعداد رسول کریم ﷺ نے مقرر نہیں فرمائی۔

سو مرتبہ درود شریف کے متعلق کوئی صحیح حدیث مجھے معلوم نہیں۔ مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ نے ''پیارے رسول کی پیاری دعائیں'' میں سو بار درود شریف پڑھنے کی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص صبح اور مغرب کی نمازوں کے بعد کلام کرنے سے پہلے سو بار درود پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کی سو ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔ تیس دنیا میں اور ستر آخرت میں۔''

لیکن یہ روایت موضوع ہے، اس کو احمد بن موسیٰ نے روایت کیا ہے جیسا کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ''جلاء الأفهام (۲۹۸)'' میں باسند ذکر کیا ہے اور اسی طرح علامہ سخاوی نے ''القول البدیع (۱۷۴)'' میں ذکر کیا ہے اور اس کی سند پر ضعف کا حکم بھی لگایا ہے۔

امام حاکم رحمہ اللہ احمد بن موسیٰ کے متعلق فرماتے ہیں: ''یہ روایات گھڑتا تھا اور اسانید کو متن سے ملا دیتا تھا۔'' حمزہ السہمی فرماتے ہیں: ''اس نے مجاہیل مشائخ سے منکر روایات بیان کی ہیں جن کو کسی دوسرے نے بیان نہیں کیا۔ اس لیے محدثین نے اسے کذاب کہا ہے۔'' [ميزان الاعتدال(۱۵۹/۱)، المغني في الضعفاء (۹۶/۱)، لسان الميزان(۲۳۵/۱)، تنزيه الشريعة المرفوعة (۳۱۱/۱)]

اور اس کے دیگر رواۃ بھی مجہول ہیں۔ علم الرجال کی معروف کتب میں ان کا ذکر نہیں ملتا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت موضوع اور من گھڑت ہے۔

حافظ ابن مندہ رحمہ اللہ نے اس روایت کو ایک اور سند سے بھی بیان کیا ہے جسے امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ اس میں فجر اور مغرب کی قید نہیں بلکہ مطلق طور پر دن میں سو مرتبہ درود پڑھنے کا ذکر ہے۔ [جلاء الأفهام (۳۰۰) (ص:۲٤۲)]

امام ابن قیم اور علامہ سخاوی رحمہما اللہ نے ''القول البدیع (۱۲۸)'' میں لکھا ہے کہ حافظ ابو موسیٰ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور دونوں بزرگوں نے اس کی تحسین نقل کر کے سکوت کیا ہے حالانکہ یہ روایت بھی من گھڑت ہے۔ حافظ ابو موسیٰ بذات خود وضاع اور روایت گھڑنے والا ہے۔ اس کی تحسین کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اس کی سند میں عباس بن بکار الضبی ہے جس کے بارے میں امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ کذاب ہے۔'' [المغني في الصعفاء (۵۱۹/۱)، الضعفاء والمتروكين للدارقطني (۱۳۸/٤۲٤)]

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [مجمع الزوائد(۱٤۰/۱۰)]

امام عقیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کی اکثر روایات میں وہم و نکارت ہے۔'' [الضعفاء الكبير (٣٦٣/٣)]

امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لَا يَجُوزُ الْاِحْتِجَاجُ بِهِ بِحَالٍ وَ لَا كِتَابَةُ حَدِيثِهِ اِلَّا عَلَى سَبِيلِ الْاِعْتِبَارِ لِلْخَوَاصِّ "
[كتاب المجروحين (١٩٠/٢)]

''اس سے کسی حال میں بھی حجت پکڑنا جائز نہیں اور نہ اس کی روایت کو لکھنا ہی جائز ہے مگر خواص کے لیے اعتبار کے سبیل پر۔''

امام ابن عدی رحمہ اللہ نے اسے منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ [الكامل لابن عدى (١٦٦٥/٥)]

اسی طرح اس کا استاد ابو بکر الھذلی جو اس کا ماموں بھی ہے، قابل حجت نہیں اور محدثین کے ہاں بالاتفاق متروک ہے۔ امام یحییٰ بن سعید، امام یحییٰ بن معین، امام ابوزرعہ رازی، امام ابوحاتم رازی، امام نسائی، امام جوزجانی، امام یعقوب بن سفیان، امام ابو احمد حاکم وغیرہم رحمہم اللہ نے اسے ضعیف، متروک اور غیر ثقہ قرار دیا ہے۔ [تهذيب التهذيب (٣١٦/٦)، المغني في الضعفاء (٥٧٢/٢)، ميزان الاعتدال (٧٣٤/٤)]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ مِائَةً غُفِرَ لَهُ » [تاريخ الصفهان (٩٥/١)]

''جس نے مجھ پر سو مرتبہ درود پڑھا اس کی بخشش کر دی گئی۔''

اس روایت کی سند میں سفیان اور اعمش دو مدلس راوی ہیں جن کی تصریح بالسماع موجود نہیں اور احمد بن عبد الرحمٰن بن بحر السعدی کا فی الحال مجھے ترجمہ نہیں ملا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرًا وَ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ عَشْرًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ مِائَةً وَ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ مِائَةً كَتَبَ اللّٰهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ بَرَاءَةً مِنَ النِّفَاقِ وَ بَرَاءَةً مِّنَ النَّارِ وَ اَسْكَنَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ الشُّهَدَاءِ » [طبرانی أوسط (٧٢٣١) (١١٥/٨)]

''جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں بھیجتا ہے اور جس نے مجھ پر دس مرتبہ درود پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر سو رحمتیں بھیجتا ہے اور جس نے مجھ پر سو مرتبہ درود پڑھا اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں کے درمیان نفاق اور جہنم سے براءت لکھ دیتا ہے اور قیامت والے دن اسے شہداء کے ساتھ جگہ دے گا۔''

امام منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ فِيْ اِسْنَادِهِ اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَالِمِ بْنِ شِبْلِ الْهُجَيْمِيِّ لَا اَعْرِفُهُ بِجَرْحٍ وَ لَا عَدَالَةٍ "
[الترغيب والترهيب (٤٩٥/٢)]

''اس کی سند میں ابراہیم بن سالم بن سبل الھجیمی کے بارے میں جرح اور تعدیل میں نہیں جانتا۔''

اسی طرح اس کی سند میں عبد العزیز بن قیس بن عبد الرحمن مجہول ہے۔[تقریب التهذيب(ص/٢١٥)]

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ صَلّٰى يَوْمَ الْجُمُعَةِ مِائَةَ مَرَّةٍ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ مَعَهُ نُورٌ لَوْ قُسِمَ ذٰلِكَ النُّورُ بَيْنَ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ لَوَسِعَتْهُمْ »[حلية الأولياء (٤٧/٨)، ترتيب البغية للهيثمي(٣٢٧/٢)]

"جس نے جمعہ والے دن مجھ پر سو دفعہ درود پڑھا، وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے ساتھ ایک نور ہوگا اور اگر وہ نور ساری مخلوق پر تقسیم کر دیا جائے تو انھیں کافی ہوگا۔"

یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ اس کی سند میں محمد بن عجلان مدلس ہے اور روایت معنعن ہے، اس میں سماع کی تصریح نہیں ہے اور اس میں چند مجہول راوی بھی ہیں۔ الغرض مجھے ایسی کوئی صحیح روایت نہیں ملی جس میں درود شریف کے متعلق سو کے عدد کی تعیین ہو البتہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر کثرت کے ساتھ درود شریف پڑھنے کا حکم صحیح احادیث میں موجود ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَكْثِرُوا الصَّلَاةَ عَلَيَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ فَمَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرًا » [صحيح الجامع الصغير للألباني(٢٦٣/١)]

"جمعہ والے دن اور جمعہ والی رات مجھ پر کثرت سے درود پڑھو، جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل کرے گا۔"

مزید احادیث کے لیے "السلسلة الصحيحة اور صحيح الجامع الصغير" ملاحظہ فرمائیں۔ البتہ صبح و شام دس دس مرتبہ درود پڑھنے کی حدیث موجود ہے جسے امام منذری اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ حِيْنَ يُصْبِحُ عَشْرًا وَ حِيْنَ يُمْسِيْ عَشْرًا اَدْرَكَتْهُ شَفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ »

"جس نے مجھ پر صبح و شام دس دس بار درود شریف پڑھا قیامت کے دن اسے میری شفاعت نصیب ہوگی۔"

امام منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اسے امام طبرانی رحمہ اللہ نے دو سندوں سے روایت کیا ہے، ان میں سے ایک جید ہے۔"

اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ [صحيح الترغيب والترهيب للألباني(٢٤٥/١)]

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے بھی اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ [مجمع الزوائد (١٢٣/١٠)]

لہٰذا صبح و شام کے اذکار میں دس مرتبہ درود شریف کا عدد صحیح ثابت ہے، اسے معمول بنائیں اور پھر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے درود شریف پڑھتے رہیں بلکہ اگر آپ اپنی ساری دعاؤں کی جگہ درود ہی پڑھتے رہیں تو یہ بھی درست ہے۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”جب رات کا دوتہائی حصہ گزر جاتا ہے تو نبی کریم ﷺ کھڑے ہو جاتے اور فرماتے: ”لوگو! اللہ کو یاد کرو، زلزلے کا جھٹکا آ گیا، اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا، موت آ گئی اپنی ہولناکیوں کے ساتھ، موت آ گئی اپنی ہولناکیوں کے ساتھ۔“ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے کہا:

« يَا رَسُولَ اللّٰهِ ! إِنِّيْ أُكْثِرُ الصَّلَاةَ عَلَيْكَ فَكَمْ اَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلَاتِيْ ؟ فَقَالَ مَا شِئْتَ قَالَ قُلْتُ الرُّبُعَ ؟ قَالَ مَا شِئْتَ فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ قَالَ قُلْتُ فَالنِّصْفُ ؟ قَالَ مَا شِئْتَ وَ إِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ قَالَ قُلْتُ فَالثُّلُثَيْنِ ؟ قَالَ مَا شِئْتَ فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ قُلْتُ اَجْعَلُ لَكَ صَلَاتِيْ كُلَّهَا ؟ قَالَ إِذًا تُكْفٰى هَمُّكَ وَ يُغْفَرُ لَكَ ذَنْبُكَ »[ترمذی ، كتاب صفة القيامة: باب الترغيب في ذكر الله و ذكر الموت آخر الليل و فضل إكثار الصلاة على النبي(٢٤٥٧)، مستدرك حاكم (٥١٣/٢)، مسند احمد(١٣٦/٥)، مسند عبد بن حميد بحواله جلاء الافهام(ص: ٤٠) (٥٩)]

”اے اللہ کے رسول! میں آپ پر کثرت سے درود پڑھتا ہوں، میں درود کی آپ کے لیے کیا مقدار رکھوں (یعنی اور دعاؤں کے مقابلے میں) ؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس قدر تو چاہے۔“ عرض کیا: ”کیا ایک چوتھائی؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جتنا تو چاہے، اگر زیادہ کرے تو بہتر ہے۔“ عرض کیا: ”نصف۔“ فرمایا: ”جتنا تو چاہے، اگر زیادہ کرے تو بہتر ہے۔“ عرض کیا: ”دوتہائی؟“ فرمایا: ”جتنا تو چاہے، اگر زیادہ کرے تو بہتر ہے۔“ میں نے عرض کیا: ”میں تمام (وقت) آپ کے درود کے لیے وقف کر دوں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ایسی حالت میں تیرے مقاصد کی کفایت کی جائے گی اور تیرے گناہ بخش دیے جائیں گے۔“

” يَا مُقْسِطُ “ سات سو مرتبہ اور سورۂ یٰسین بہتر (۷۲) مرتبہ پڑھنا، یہ تعداد کہیں ثابت نہیں بلکہ لوگوں کے اپنے مقرر کردہ اعداد ہیں۔

مجلس برخاست کرنے سے قبل سو مرتبہ استغفار کرنا

سوال کیا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ہر مجلس برخاست کرنے سے پہلے ۷۰ یا ۱۰۰ مرتبہ استغفار کرتے تھے؟ کیا بندہ خطبہ جمعہ کے دوران بھی استغفار کرسکتا ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم شمار کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مجلس میں سو (۱۰۰) مرتبہ یہ کلمات کہتے:

« رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ »[ابوداؤد، كتاب الوتر: باب في الاستغفار (١٥١٦)، ابن ماجه (٣٨١٤)]

”اے میرے پروردگار! مجھے معاف کر دے اور میری توبہ قبول کر لے بلاشبہ تو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، بہت بخشنے والا ہے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ مجلس میں بیٹھے بیٹھے سو (۱۰۰) بار استغفار کرتے تھے تو ہمیں بھی اپنی مجالس میں کثرت سے استغفار کرنا چاہیے تا کہ ہمارے گناہوں کی معافی ہو سکے البتہ دوران خطبہ استغفار کرنا ثابت نہیں بلکہ خطبہ دھیان اور توجہ سے سننا چاہیے، جو آدمی اپنی توبہ و استغفار میں مشغول ہو وہ خطیب کی بات کو دھیان سے نہیں سن سکتا۔

چلتے پھرتے اللہ کا ذکر کرنا

(سوال) کیا چلتے پھرتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(جواب) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهٖ »

''رسول اللہ ﷺ ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔'' [مسلم، كتاب الحيض: باب ذكر الله تعالىٰ في حال الجنابة وغيرها (۳۷۳)]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾ [آل عمران: ۱۹۱]

''عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ کو کھڑے ہو کر، بیٹھ کر اور پہلوؤں کے بل یاد کرتے ہیں۔''

اس آیت کریمہ سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر کھڑے ہو کر، بیٹھ کر اور پہلو کے بل لیٹ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

کلمہ شہادت کا وظیفہ

(سوال) کیا پورے کلمہ شہادت کا وظیفہ کیا جا سکتا ہے نیز افضل الذکر سے کیا مراد ہے؟

(جواب) کلمہ طیبہ پڑھنے کے دو مواقع ہیں، ایک بطور اقرار و شہادت اور دوسرا موقع بطور ذکر و عبادت۔ اول الذکر موقع پر دونوں اجزا کو ملا کر پڑھنا لازمی و ضروری ہے کیونکہ ان اجزا کی شہادت کے بغیر انسان مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَلْإِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ » [مسلم، كتاب الايمان: باب بيان الإيمان و الاسلام (۸)، مسند احمد: (۳۱۹/۱)]

''اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔''

لیکن ذکر و عبادت کے موقع پر فقط لا الٰہ الا اللہ کہنا ثابت ہے کیونکہ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، محمد رسول اللہ ﷺ تو عبد ہیں معبود نہیں ہیں جیسا کہ مسند احمد کی روایت ''عبدہ و رسولہ'' سے عیاں ہے اور کتب احادیث میں بھی ایسے موقع پر صرف لا الٰہ الا اللہ ہی آیا ہے جیسا کہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« قَالَ مُوْسٰی یَا رَبِّ ! عَلِّمْنِیْ شَیْئًا اَذْکُرُكَ بِهِ وَ اَدْعُوْكَ بِهِ؟ قَالَ قُلْ یَا مُوْسٰی! لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ یَا رَبِّ ! کُلُّ عِبَادِكَ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا قَالَ یَا مُوْسٰی ! لَوْ اَنَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَ عَامِرَهُنَّ غَیْرِیْ وَ الْاَرَضِیْنَ السَّبْعَ فِیْ کَفَّةٍ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فِیْ کَفَّةٍ مَا لَتْ بِهِمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ »
[مستدرك حاكم، كتاب الدعاء (١٩٣٦) (٧١٠/١)]

''موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''اے میرے رب! مجھے تو کوئی ایسی چیز سکھا جس کے ذریعے میں تیرا ذکر کروں اور تجھے پکاروں ؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''تو لا الٰہ الا اللہ کہا کر۔'' موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''اے میرے رب! لا الٰہ الا اللہ تو تیرے تمام بندے کہتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اور ان کے باشندے بجز میرے، ایک پلڑے میں ہوں اور لا الٰہ الا اللہ ایک پلڑے میں تو لا الٰہ الا اللہ ان پر غالب ہو جائے گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ لا الٰہ الا اللہ ذکر اور دعا ہے جس پر حدیث کے الفاظ " اَذْکُرُكَ بِهِ وَ اَدْعُوْكَ بِهِ " دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک حدیث میں یہ آتا ہے:

« عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ » [ترمذی، کتاب الدعوات: باب ما جاء ان دعوة المسلم مستجابة (٣٣٨٣)]

''سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے افضل ذکر ''لا الٰہ الا اللہ'' ہے اور سب سے افضل دعا ''الحمد للہ'' ہے۔''

اس طرح کی اور بھی بے شمار احادیث موجود ہیں جن میں ذکر صرف لا الٰہ الا اللہ کو قرار دیا گیا ہے اور ان میں ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ نہیں ہیں کیونکہ ذکر اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور عبادت اس کے علاوہ کسی کی جائز نہیں ہے، ہاں اقرار و شہادت کے وقت ''محمد رسول اللہ'' کہنا ضروری اور لازمی ہے، ورنہ اس کے بغیر ایمان مقبول نہیں ہو گا۔

''لا الٰہ الا اللہ'' کی فضیلت

سوال سنا ہے کہ جو شخص ستر ہزار مرتبہ ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھے اس کو دوزخ کی آگ سے نجات مل جائے گی، کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب ''لا الٰہ الا اللہ'' کی اس تعداد کے متعلق تو کسی صحیح حدیث کے بارے مجھے علم نہیں البتہ صحیح احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ جس شخص نے صدق دل سے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہا اور اس پر موت آ گئی وہ جنت میں داخل ہو گا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں جو آدمی اس کو دل کی سچائی کے ساتھ کہتا ہے پھر اس پر موت آ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر آگ حرام کر دیتے ہیں اور وہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' ہے۔'' [مسند احمد (٢٣/١)، مستدرك حاكم (٧٦/١)]

لہٰذا ''لا الہ الا اللہ'' کو جاننا چاہیے اور صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر ایمان رکھنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرنی چاہیے کہ اسی پر ہماری موت آ جائے۔ (آمین!) اور اس کلمے کو احادیث میں افضل الذکر قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اس کا ذکر بھی کرتے رہیں، البتہ ذکر کے مصنوعی اور نو ایجاد طریقوں سے اجتناب کریں۔

حرام اور مباح امور کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

محرم کے بغیر عورت کا سفر

(سوال) کیا عورت بغیر محرم کے سفر پر نکل سکتی ہے یا ہر حال میں محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے؟ مہربانی فرما کر قرآن وسنت سے جواب دیں۔

(جواب) اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورت کی عفت وعصمت کو محفوظ کرنے کے لیے اس کا مسکن گھر کی چار دیواری قرار دیا ہے تاکہ یہ اپنے گھر کے اندر رہ کر اپنی عزت کو بچائے رکھے۔ کیونکہ عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانکتا ہے جیسا کہ یہ بات صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ یعنی جب عورت گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کو لوگوں کی نظروں میں مزین کر دیتا ہے اور لوگ اس کی طرف نگاہیں اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہیں، اسے اپنے دامن تزویر میں پھنسانے کے لیے ہر ممکن چارہ جوئی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو قواعد وضوابط مقرر فرمائے ہیں وہ عورت کے تقدس کو محفوظ کرنے ہی کے لیے ہیں۔ عورت کو اگر کسی کام کے لیے سفر پر نکلنا پڑے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کریم ﷺ کے ذریعے بتلایا ہے کہ وہ اپنے محرم کو ساتھ لے کر نکلے، بغیر محرم کے عورت کا سفر کرنا بالکل ناجائز وحرام ہے، عورت نہ ایک دن ورات کا سفر محرم کے بغیر کر سکتی ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ۔ سفر میں محرم کی پابندی عورت کے لیے لازم ہے۔ چند ایک صحیح احادیث ملاحظہ ہوں:

① حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُسَافِرُ امْرَأَةٌ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ »[مسلم، کتاب الحج : باب سفر المرأۃ مع محرم إلی حج وغیرہ (۱۳۳۸)، ابن حبان (۲۷۰۷)، بیہقی (۱۳۸/۳)، ابوداؤد(۱۷۲۶)، ابن ماجہ (۲۸۹۸)، ترمذی(۱۱۶۹)]

”کوئی عورت تین راتوں سے زیادہ محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔“

سنن ابی داؤد کی روایت میں ہے:

« لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ اَنْ تُسَافِرَ سَفَرًا فَوْقَ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ فَصَاعِدًا اِلَّا وَ مَعَهَا اَبُوْهَا اَوْ اَخُوْهَا اَوْ زَوْجُهَا اَوِ ابْنُهَا اَوْ ذُوْ مَحْرَمٍ مِنْهَا »[ابو داؤد، کتاب المناسك: باب فی المرأۃ تحج بغیر محرم(۱۷۲۶)]

”جو عورت اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے تین دن یا اس سے زائد سفر کرنا حلال نہیں مگر اس کے ساتھ اس کا باپ یا بھائی یا خاوند یا بیٹا یا کوئی اور محرم ہو۔“

② حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ تُسَافِرُ مَسِيْرَةَ ثَلَاثِ لَيَالٍ اِلَّا وَ مَعَهَا ذُوْ مَحْرَمٍ »
[مسلم، كتاب الحج: باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره (١٣٣٨)، ابو داؤد، كتاب المناسك : باب في المرأة تحج بغير محرم(١٧٢٧)، بيهقى(١٣٨/٣)، ابن حبان (١٧٧/٥) (٢٧١٩)]

'' جو عورت اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے حلال نہیں کہ وہ تین راتوں کا سفر کرے مگر اس کے ساتھ محرم ہو۔''

③ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ يَوْمَيْنِ اِلَّا وَ مَعَهَا زَوْجُهَا اَوْ ذُوْ مَحْرَمٍ » [بخارى ، كتاب العمل فى الصلاة : باب مسجد بيت المقدس (١١٩٧) ، مسلم ، كتاب الحج : باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره (١٣٣٨)، بيهقى(١٣٨/٣)، ابن حبان (١٧٥/٥)، (٢٧١٣)، مسند ابى يعلى (٣٨٨/٢)]

'' عورت دو دن کا سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ اس کا شوہر یا محرم ہو۔''

④ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ اَنْ تُسَافِرَ مَسِيْرَةَ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ لَيْسَ مَعَهَا حُرْمَةٌ »
[بخارى، كتاب تقصير الصلاة: باب فى كم يقصر الصلاة(١٠٨٨)، مسلم، كتاب الحج : باب. سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره (١٣٣٩)، بيهقى (١٣٩/٣)، ابن ماجه، كتاب المناسك: باب المرأة تحج بغير ولى (٢٨٩٩)، ابن حبان (١٧٦/٥)(٢٧١٤)]

'' جو عورت اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے حلال نہیں کہ وہ محرم کے بغیر ایک دن اور رات کا سفر کرے۔''

⑤ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: '' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

« لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ اَنْ تُسَافِرَ يَوْمًا وَاحِدًا لَيْسَ مَعَهَا ذُوْ مَحْرَمٍ »
[ابن حبان (١٧٦/٥) (٢٧١٥)]

'' جو عورت اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے محرم کے بغیر ایک دن کا سفر بھی حلال نہیں۔''

⑥ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بلا شبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ بَرِيْدًا اِلَّا مَعَ ذِىْ مَحْرَمٍ »[ابن حبان (١٧٦/٥)، (٢٧١٦) ، بيهقى (١٣٩/٣)، ابو داؤد (١٧٢٥)، ابن خزيمة(١٣٦/٣)، مستدرك حاكم(٤٤٢/١)]

'' عورت ایک برید بھی سفر نہ کرے مگر محرم کے ساتھ۔''

امام ابن اثیر جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" هُوَ اَرْبَعَةُ فَرَاسِخَ وَ الْفَرْسَخُ ثَلَاثَةُ اَمْيَالٍ " [عون المعبود (٧٣/٢)، تحفة الاحوذی(٢٠٦/٢)، النهاية (١١٦/١)]

''ایک برید چار فرسخ کا ہوتا ہے اور ایک فرسخ میں تین میل ہوتے ہیں۔''

یعنی ایک برید میں بارہ میل ہوتے ہیں۔ امام ابوبکر ابن خزیمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اَلْبَرِيْدُ اِثْنَا عَشَرَ مِيْلًا بِالْهَاشِمِيِّ " [صحيح ابن خزيمة(١٣٦/٤)]

''ایک برید میں بارہ ہاشمی میل ہیں۔''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''برید آدھے دن کا سفر ہے۔'' [شرح مسلم للنووی(٨٧/٩)]

معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں چونکہ پیدل سفر ہوتے تھے اور بارہ میل تقریباً آدھے دن میں سفر طے ہوتا ہوگا۔

⑦ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

« لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ وَ لَا تُسَافِرَنَّ امْرَأَةٌ اِلَّا وَ مَعَهَا مَحْرَمٌ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اُكْتُتِبْتُ فِيْ غَزْوَةِ كَذَا وَ كَذَا وَ خَرَجَتِ امْرَأَتِيْ حَاجَّةً قَالَ اذْهَبْ فَاحْجُجْ مَعَ امْرَأَتِكَ »

[بخاری، كتاب جزاء الصيد : باب حج النساء(١٨٦٢)، مسلم ، كتاب الحج : باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره (١٣٤١) ابن حبان (٢٧٢٠)، ابن خزيمة(٢٥٢٩)، مسند احمد (٢٢٢/١)، مسند طيالسی (٢٧٣٢)، ارواء الغليل(٩٩٥)، ابن ماجه(٢٩٠٠)]

''ہرگز کوئی مرد کسی (غیر محرمہ) سے خلوت اختیار نہ کرے اور ہرگز کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔'' ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا: ''اے اللہ کے رسول! میرا نام فلاں غزوہ میں لکھا گیا ہے اور میری عورت حج کرنے کے لیے نکلی ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو چلا جا، اپنی عورت کے ساتھ مل کر حج کر۔''

⑧ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَاتُسَافِرُ الْمَرْأَةُ اِلَّا وَ مَعَهَا ذُوْ مَحْرَمٍ » [صحيح ابن حبان(١٧٧/٥) (٢٧١٨)]

''عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔''

⑨ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُسَافِرُ اِلَّا مَعَ ذِيْ مَحْرَمٍ » [صحيح ابن حبان(١٧٨/٥) (٢٧٢١)]

''عورت کے لیے محرم کے بغیر سفر کرنا حلال نہیں۔''

⑩ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الْمَرْأَةَ اَنْ تُسَافِرَ اِلَّا وَ مَعَهَا ذُوْ مَحْرَمٍ قَالَتْ عَمْرَةُ فَالْتَفَتَتْ عَائِشَةُ اِلَى بَعْضِ النِّسَاءِ فَقَالَتْ مَا لِكُلِّكُمْ ذُوْ مَحْرَمٍ » [صحيح ابن حبان(١٧٨/٥) (٢٧٢٢)]

"رسول اللہ ﷺ نے عورت کو محرم کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا ہے۔" عمرہ بنت عبد الرحمٰن کہتی ہیں: "عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعض عورتوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "تم میں سے ہر ایک کا محرم نہیں ہے۔"

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے واضح ہوا کہ عورت محرم کے بغیر مطلقاً سفر نہیں کر سکتی اور ان روایات میں کوئی تفاوت نہیں ہے، یہ مختلف احوال پر مبنی ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مختلف مواقع پر سوالات کیے گئے کہ کیا عورت محرم کے بغیر تین دن کا سفر کر سکتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ اسی طرح یہ پوچھا گیا کہ عورت محرم کے بغیر دو دن یا ایک دن یا بارہ میل یا مطلق طور پر سفر کر سکتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے نفی میں جواب دیا۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْمَرْأَةِ تُسَافِرُ ثَلَاثًا مِنْ غَيْرِ مَحْرَمٍ فَقَالَ لَا وَ سُئِلَ عَنْهَا تُسَافِرُ يَوْمَيْنِ مِنْ غَيْرِ مَحْرَمٍ فَقَالَ لَا وَ يَوْمًا فَقَالَ لَا فَأَدّٰى كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ مَا حَفِظَ وَ لَا يَكُوْنُ عَدَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْاَعْدَادِ حَدًّا لِلسَّفَرِ وَ بِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ"

"رسول اللہ ﷺ سے عورت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ محرم کے بغیر تین دن سفر کر سکتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اور پوچھا گیا کہ وہ محرم کے بغیر دو دن سفر کر سکتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اور ایک دن کے متعلق پوچھا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں۔ ہر ایک نے جو یاد رکھا آگے پہنچا دیا اور ان اعداد میں سے کوئی عدد بھی سفر کے لیے حد نہیں ہے اور توفیق اللہ کے ساتھ ہے۔"

امام ابن حبان رحمہ اللہ نے نویں حدیث پر یوں باب قائم کیا ہے:

" ذِكْرُ الْبَيَانِ بِاَنَّ الْمَرْأَةَ مَمْنُوْعَةٌ عَنْ اَنْ تُسَافِرَ سَفَرًا قَلَّتْ مُدَّتُهُ اَمْ كَثُرَتْ اِلَّا مَعَ ذِيْ مَحْرَمٍ مِنْهَا "

"اس بات کا بیان کہ عورت کو محرم کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے سفر کی مدت خواہ کم ہو یا زیادہ۔"

اسی طرح دسویں حدیث میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان کہ "تم میں سے ہر ایک کا محرم نہیں" پر تبصرہ کرتے ہوئے (کہ کوئی اس کا غلط مفہوم نہ لے لے کہ ہر عورت کا محرم تو نہیں ہوتا لہٰذا محرم کے بغیر سفر ہو سکتا ہے) لکھتے ہیں:

" تُرِيْدُ اَنْ لَيْسَ لِكُلِّكُمْ ذُوْ مَحْرَمٍ تُسَافِرُ مَعَهُ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُسَافِرُ وَاحِدَةٌ مِنْكُنَّ اِلَّا بِذِيْ مَحْرَمٍ يَكُوْنُ مَعَهَا" [صحیح ابن حبان(۱۷۸/۵)]

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد یہ ہے کہ کیا تم میں سے ہر ایک کے لیے محرم نہیں ہے کہ اس کے ساتھ سفر کرے؟ اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ تم میں سے ہر ایک عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔"

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" قَالَ الْعُلَمَاءُ اِخْتِلَافُ هٰذِهِ الْاَلْفَاظِ لِاخْتِلَافِ السَّائِلِيْنَ وَ اخْتِلَافِ الْمَوَاطِنِ وَ لَيْسَ فِي النَّهْيِ عَنِ الثَّلَاثَةِ تَصْرِيْحٌ بِاِبَاحَةِ الْيَوْمِ وَ اللَّيْلَةِ اَوِ الْبَرِيْدِ " [شرح مسلم للنووی(۸۷/۹)]

"علماء نے کہا ہے کہ احادیث میں جو مختلف الفاظ وارد ہوئے ہیں ان کا سبب سائلین اور جگہوں کا اختلاف ہے اور تین

دن کی مسافت سے ممانعت میں ایک دن رات یا آدھے دن کے سفر کے جواز کی تصریح نہیں ہے۔"

یعنی مختلف سوال کرنے والوں نے مختلف مقامات پر مختلف حالات میں سوال پوچھے، کسی نے تین دن، دو دن، دن رات یا آدھے دن کے بارے میں پوچھا۔ آپ ﷺ نے ان کے سوال کے مطابق جواب دیا اور ہر ایک سفر میں محرم کے بغیر سفر کی ممانعت فرمائی اور جس حدیث میں ہے کہ عورت تین دن کی مسافت میں محرم کے بغیر سفر نہ کرے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تین سے کم دنوں کا سفر محرم کے بغیر کر سکتی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ ان روایات کا خلاصہ یوں نقل فرماتے ہیں:

" فَالْحَاصِلُ اَنَّ كُلَّ مَا يُسَمّٰى سَفَرًا تُنْهٰى عَنْهُ الْمَرْاَةُ بِغَيْرِ زَوْجٍ اَوْ مَحْرَمٍ سَوَاءً كَانَ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اَوْ يَوْمَيْنِ اَوْ يَوْمًا اَوْ بَرِيْدًا اَوْ غَيْرَ ذٰلِكَ لِرِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ الْمُطْلَقَةِ وَ هِيَ آخِرُ رِوَايَاتِ مُسْلِمِ السَّابِقَةِ لَا تُسَافِرُ امْرَاَةٌ اِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ وَ هٰذَا يَتَنَاوَلُ جَمِيْعَ مَا يُسَمّٰى سَفَرًا "

[شرح مسلم للنووی (۸۷/۹، ۸۸)]

" خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر وہ مسافت جسے سفر کہا جاتا ہے عورت کو خاوند یا دیگر محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا جائے گا، خواہ وہ سفر تین دن کا ہو یا دو دن کا، ایک دن کا یا نصف دن کا یا اس سے کم و بیش، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مطلق روایت کی بنا پر اور وہ پیچھے گزرنے والی مسلم کی روایات میں سے آخری ہے کہ عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے اور یہ حدیث ہر اس مسافت کو شامل ہے جسے سفر کہا جاتا ہے۔"

نیز دیکھیں: السراج الوهاج (۴۰۰/۱)، عون المعبود (۷۲/۲) علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ فِي الْحَدِيْثِ دَلِيْلٌ عَلٰى تَحْرِيْمِ سَفَرِ الْمَرْاَةِ مِنْ غَيْرِ مَحْرَمٍ وَ هُوَ مُطْلَقٌ فِي قَلِيْلِ السَّفَرِ وَ كَثِيْرِهِ وَ فِي سَفَرِ الْحَجِّ وَ غَيْرِهِ"

" اس حدیث (یعنی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما والی) میں محرم کے بغیر عورت کے سفر کی حرمت پر دلیل ہے اور یہ حدیث سفر کی قلت اور کثرت اور سفر حج وغیرہ کو مطلق طور پر شامل ہے۔"

مزید لکھتے ہیں:

" فِي هٰذَا الْحَدِيْثِ اَنَّ الْمَرْاَةَ لَا تُسَافِرُ اِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ وَ عُمُوْمُ اللَّفْظِ يَتَنَاوَلُ عُمُوْمَ السَّفَرِ فَيَقْتَضِيْ اَنْ يَحْرُمَ سَفَرُهَا بِدُوْنِ ذِي مَحْرَمٍ مَعَهَا سَوَاءً كَانَ سَفَرُهَا قَلِيْلًا اَوْ كَثِيْرًا لِلْحَجِّ اَوْ غَيْرِهِ وَ اِلٰى هٰذَا ذَهَبَ اِبْرَاهِيْمُ النَّخْعِيُّ وَ الشَّعْبِيُّ وَ طَاؤُسٌ وَ الظَّاهِرِيَّةُ "[مرعاة المفاتيح (۳۳۲/۸)]

" اس حدیث میں ہے کہ بلا شبہ عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے اور (یہاں) لفظ کی عمومیت سفر کی عمومیت کو شامل ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ محرم کے بغیر عورت کا سفر کرنا حرام ہے خواہ کم ہو یا زیادہ، حج کے لیے ہو یا کسی اور غرض سے اور اس بات کی طرف امام ابراہیم نخعی، امام شعبی، امام طاؤس اور اہل ظاہر (رحمہم اللہ) گئے ہیں۔"

علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ قَالَ اَكْثَرُ اَهْلِ الْعِلْمِ يَحْرُمُ لَهَا الْخُرُوْجُ فِيْ كُلِّ سَفَرٍ طَوِيْلًا كَانَ اَوْ قَصِيْرًا وَ لَا يُتَوَقَّفُ حُرْمَةُ الْخُرُوْجِ بِغَيْرِ الْمَحْرَمِ عَلٰى مُسَافَةِ الْقَصْرِ لِاِطْلَاقِ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ بِلَفْظٍ لَا تُسَافِرُ الْمَرْاَةُ اِلَّا مَعَ ذِيْ مَحْرَمٍ " [تحفة الأحوذی(۲/ ۲۰۶)]

'' اہل علم کی اکثریت نے کہا ہے کہ عورت کو ہر سفر میں (محرم کے بغیر) نکلنا حرام ہے، سفر خواہ لمبا ہو یا چھوٹا۔ محرم کے بغیر نکلنے کی حرمت کو قصر کی مسافت پر موقوف نہیں کیا جائے گا کیونکہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں سفر کی مطلق طور پر ممانعت ہے۔ ان کی حدیث کے الفاظ ہیں: '' عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔''

مولانا مبارکپوری کی اس عبارت سے بھی واضح ہوا کہ عورت کسی طرح بھی محرم کے بغیر سفر نہیں کر سکتی خواہ وہ طویل ہو یا مختصر، مشکل ہو یا آسان ہر حالت میں عورت اپنا محرم یعنی خاوند، باپ، بھائی، بیٹا، ماموں یا چچا غرض ہر وہ آدمی جس کے ساتھ اس کا نکاح حرام ہے، ان میں سے کسی کو ساتھ لے کر سفر پر نکلے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس مجاہد کو جس کا نام غزوہ میں لکھا گیا تھا، محض اس بنا پر غزوے سے رخصت دے دی کہ اس کی عورت اکیلی حج پر جا رہی تھی اور اسے فرمایا کہ اس کے ساتھ جا کر حج کرو اور صحیح احادیث میں حج کو عورت کا جہاد قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« اِسْتَاْذَنْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِي الْجِهَادِ فَقَالَ جِهَادُ كُنَّ الْحَجُّ » [بخاری، کتاب الجهاد والسير، باب جهاد النساء (۲۸۷۵)]

'' میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کے متعلق اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' تمھارا جہاد حج ہے۔''

عورت کے لیے محرم کے بغیر حج وعمرہ کا حکم

سوال کیا حج اور عمرہ کے لیے عورت محرم کے بغیر سفر کر سکتی ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب حج اور عمرہ یا کسی دیگر سفر کے لیے عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا درست نہیں۔ عورت کے سفر کے لیے محرم کا ہونا شرط ہے۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

① ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِامْرَاَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اَنْ تُسَافِرَ مَسِيْرَةَ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ لَيْسَ مَعَهَا حُرْمَةٌ »

[بخاری، کتاب التقصير : باب في كم يقصر الصلاة (۱۰۸۸)]

'' جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے محرم کے بغیر دن رات کا سفر کرنا حلال نہیں۔''

(۲) عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا:

« لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَاَةٍ اِلَّا وَمَعَهَا ذُوْ مَحْرَمٍ وَلَا تُسَافِرِ امْرَاَةٌ اِلَّا وَ مَعَهَا ذِيْ مَحْرَمٍ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ امْرَاَتِيْ خَرَجَتْ حَاجَّةً وَ اِنِّيْ اكْتُتِبْتُ فِيْ غَزْوَةِ كَذَا وَ كَذَا قَالَ

انْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ» [بخاری ، کتاب الجهاد و السير : باب من اكتتب فی جيش فخرجت امرأته حاجة (٣٠٠٦)، مسلم ، كتاب الحج : باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره (١٣٤١)]
''کوئی مرد کسی عورت سے ہرگز خلوت اختیار نہ کرے مگر اس کے ساتھ اس کا محرم ہونا چاہیے اور نہ کوئی عورت سفر کرے مگر اس کے ساتھ اس کا محرم ہونا چاہیے۔'' ایک آدمی نے کھڑے ہوکر کہا: ''اے اللہ کے رسول! میری عورت حج کرنے کے لیے چل پڑی ہے اور میرا نام فلاں فلاں غزوہ کے لیے لکھا جا چکا ہے۔'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تو چل اپنی عورت کے ساتھ جا کر حج کر۔''

اس مفہوم کی متعدد احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ بعض فقہائے مالکیہ اور شوافع نے محرم کے بغیر عورت کو سفر کی اجازت دی ہے لیکن انھوں نے پرامن راستے اور قافلے کی شرط عائد کی ہے۔ بعض نے کہا فرض حج میں محرم شرط نہیں لیکن نفلی حج میں شرط ہے۔ یہ قول ابن سیرین اور اوزاعی کا ہے۔ (المغنی لابن قدامة (٣/٢٣٠)]

اور ظاہریہ نے اس عورت کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت دی ہے جس کا خاوند ہے اور نہ محرم اور ہر ایک نے اپنے مذہب پر درج ذیل دلائل سے حجت پکڑی ہے:

① رسول اللہ ﷺ نے حج کی استطاعت کی تفسیر زادراہ اور سواری سے کی ہے: (بیہقی: ۴/۳۲۷) اور یہ عورت زاد راہ اور سواری کی استطاعت رکھتی ہے، لہٰذا حج کرسکتی ہے۔

② دوسری دلیل یہ دی ہے کہ عدی بن حاتم کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قریب ہے کہ اکیلی عورت حج کے لیے حیرہ سے نکلے گی، کوئی اس کا ہمرکاب نہیں ہوگا، وہ اللہ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھائے گی۔'' [بخاری ، کتاب المناقب : باب علامات النبوة فی الاسلام (٣٥٩٥)]

③ تیسری دلیل قیاسی ہے کہ یہ سفر واجب ہے، اس کے لیے محرم کی شرط نہیں ہے۔ جیسے مسلمان عورت کفار کے ہاتھوں سے رہائی پالے تو وہ اکیلی ہی سفر کرکے دارالسلام میں آجائے گی اور یہ امر متفق علیہ ہے۔

مذکورہ بالا دلائل جو ان حضرات کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں ان سے عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنے پر دلیل لینا درست نہیں ہے۔

نبی ﷺ کا استطاعت کے لیے زادراہ اور سواری کی تفسیر کرنا مرد کے حق میں ہے، عورت کے نہیں، یا اسے اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ یہ حج کی بڑی بڑی شرطیں ہیں اور بقیہ شروط سے غفلت نہیں برتی جائے گی اور یہ بات مذکورہ فقہاء کو بھی تسلیم ہے کہ یہ دو بڑی شرطیں ہیں، اسی لیے انھوں نے عورت کے لیے پرامن راستے اور قافلے کی شرط لگائی ہے اور بعض نے قرض کی ادائیگی، اہل وعیال کا نفقہ اور سواری کے اوپر جم کر بیٹھنا وغیرہ کی شرط بھی لگائی ہے اور یہ شروط تو مذکورہ حدیث میں نہیں ہیں اور شوافع و موالک نے دلیل کے بغیر اپنی طرف سے یہ شرائط عائد کی ہیں اور اگر ان دونوں روایتوں میں تعارض مان لیا جائے تو پھر بھی ہمارے دلائل راجح ہوں گے کیونکہ وہ عورت کے حوالے سے خاص ہیں اور ان کی صحت پر امت متفق ہے۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت سے دلیل پکڑنا بھی درست نہیں، اس لیے کہ وہ ایک حادثہ کے وقوع پر دلالت کرتی ہے کہ ایسا

امر واقع ہوگا اور اس میں امن کی خبر دی گئی ہے جبکہ عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا امر دیگر ہے جس سے یہ روایت خاموش ہے۔ اس لیے عورت کو سفر حج وغیرہ میں محرم کے بغیر نکلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے کیونکہ اس کی ممانعت پر خاص دلائل موجود ہیں۔اسی طرح مسلمان قیدی عورت پر قیاس بھی درست نہیں۔ اس لیے اس کا سفر کرنا ضرورت شرعی اور امر مجبوری ہے، اس پر حالت اختیاری کو قیاس نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی یاد رہے کہ عورتیں مردوں کے لیے بہت بڑے فتنے کا سبب بن سکتی ہیں۔ کسی جماعت یا معاشرے میں عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا فتنہ کو دعوت دینا اور شر کو پھیلانے کا باعث ہے بلکہ تھوڑے اور کم دنوں کا سفر بھی فتنے کو جنم دیتا ہے تو دور دراز اور مہینے سے زائد سفر تو بالاولیٰ فتنوں کو جنم دیتا ہے اور اسلام تو عورت کی عفت و عصمت کا محافظ اور کرامت انسانیہ کا نگہبان ہے۔ نبی ﷺ نے عورت کی عفت و عصمت کے لیے ایک صحابی کو غزوہ سے رخصت دے دی اور اسے اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کرنے کا حکم دیا۔ صحابیِ رسول کو جہاد جیسے عظیم کام سے رخصت دے کر عورت کو محرم کے بغیر سفر حج کرنے سے منع کر دیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے مطابق عورت کے لیے مطلق طور پر محرم کے بغیر سفر کرنا حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا حج و عمرہ ہو یا کوئی اور سفر عورت محرم کے بغیر اپنے گھر سے باہر نہ نکلے۔ اسی میں اس کی عزت، کرامت اور عفت و عصمت ہے۔ اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

ہاتھ اور پاؤں کی تصویر اتروانا

سوال کیا سر کے علاوہ باقی جسم کی تصویر بنانا جائز ہے اور اس کی دلیل کیا ہے؟

جواب یہ بات درست ہے کہ شریعت اسلامیہ نے جاندار اشیاء کی تصاویر کو حرام قرار دیا ہے۔ تصاویر کے مٹانے کے حکم کے ساتھ جاندار اشیاء کی تصاویر بنانے والے پر لعنت کی گئی ہے اور قیامت کے دن کے سخت ترین عذاب کی وعید سنائی گئی ہے لیکن غیر جاندار چیزوں کی تصاویر اور جس تصویر کا سر کاٹ دیا گیا ہو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ ایک آدمی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''میں یہ تصویریں بناتا ہوں، مجھے ان کے بارے میں فتویٰ دیجیے؟'' ابن عباس رضی اللہ عنہما کہنے لگے: ''قریب آؤ'' وہ قریب ہوگیا۔ انھوں نے کہا: ''قریب آجاؤ'' وہ اور قریب آیا تو انھوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور کہا:

« أُنَبِّئُكَ بِمَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُوْلُ كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ وَ يَجْعَلُ لَهُ بِكُلِّ صُوْرَةٍ صَوَّرَهَا نَفْسًا تُعَذِّبُهُ فِيْ جَهَنَّمَ وَ قَالَ اِنْ كُنْتَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَاصْنَعِ الشَّجَرَ وَ مَا لَا نَفْسَ لَهُ » [مسلم، كتاب اللباس: باب تحريم تصوير الحيوان (۲۱۱۰)]

''میں تمھیں اس کی خبر دیتا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے: ''ہر تصویر بنانے والا آگ میں جائے گا، اس کے لیے اس کی بنائی ہوئی تصویر کے بدلے میں ایک نفس مقرر کر دیا جائے گا جو اس کو جہنم میں

عذاب دے گا۔'' اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''اگر تو نے ضرور تصویر ہی بنانی ہے تو پھر درختوں کی بنا لو یا جس چیز میں جان نہیں۔''

اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ جس چیز میں جان نہیں اس کی تصویر بنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسری دلیل کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: ''میں گزشتہ رات بھی آیا تھا، گھر میں اس لیے داخل نہ ہوا کہ دروازے پر تصویریں تھیں۔'' گھر میں ایک پردے پر تصاویر تھیں اور کتا بھی گھر میں تھا، پھر کہا:

'' فَمُرْ بِرَأْسِ التِّمْثَالِ الَّذِیْ فِی الْبَیْتِ فَلْیُقْطَعْ فَیَصِیْرُ کَهَیْئَةِ الشَّجَرَةِ وَ مُرْ بِالسِّتْرِ فَلْیُقْطَعْ وَ یُجْعَلْ مِنْهُ وِسَادَتَیْنِ مُنْتَبِذَتَیْنِ تُوْطَئَانِ وَ مُرْ بِالْکَلْبِ فَلْیَخْرُجْ فَفَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ '' [ترمذی، کتاب الأدب : باب ان الملائکة لا تدخل بیتا فیه صور (۲۸۰۶)]

''گھر والی تصاویر کے سر کے متعلق حکم دے دو کہ اسے کاٹ دیا جائے تو وہ درخت جیسی بن جائیں گی اور پردے کو کاٹ کر اس کے دو گدے بنا لیے جائیں جو قدموں میں روندے جائیں اور کتے کو گھر سے نکال دیا جائے۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے یہ کر دیا۔''

اس حدیث کے پہلے جملے سے یہ ثابت ہو گیا کہ ساری تصویر میں حرام صرف سر ہی ہے۔ اگر اسے کاٹ دیا جائے تو وہ درخت کی صورت میں بن جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ثابت ہوا کہ تصاویر والے پردے وغیرہ کو پھاڑ کر ایسی جگہ استعمال کر لیا جائے جو قدموں میں روندے جائیں یا جس سے ان کی خست ظاہر ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' أَمَّا الشَّجَرُ وَ نَحْوُهُ مِمَّا لَا رُوْحَ فِیْهِ فَلَا تَحْرُمُ صُنْعَتُهُ وَ لَا التَّکَسُّبُ بِهِ سَوَاءٌ الشَّجَرُ الْمُثْمِرُ وَ غَیْرُهُ وَ هٰذَا مَذْهَبُ الْعُلَمَاءِ کَافَّةً '' [شرح مسلم للنووی (۹۱/۱۴)]

''درخت اور اس جیسی اور چیزیں جن میں روح نہیں ہے ان کی تصویر بنانا حرام نہیں اور نہ ان سے کمائی کرنا ہی حرام ہے، یہ تمام علماء کا مذہب ہے۔''

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' أَمَّا الْجِسْمُ بِلَا رَأْسٍ فَهُوَ کَالشَّجَرَةِ لَا شَكَّ فِیْ جَوَازِهِ '' [المجموع الثمین (۲۴۵/۲)]

''اور جسم سر کے بغیر درخت کی طرح ہے، اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں۔''

گھر میں تصویر لٹکانے کا حکم

سوال کیا گھر میں میت کی تصویر لٹکانا جائز ہے؟

جواب گھروں میں ذی روح اشیاء کی تصاویر لٹکانا جائز نہیں ہے، خواہ وہ ذی روح ابھی زندہ ہو یا اسے موت آ جائے، خواہ

یادگیری کے لیے ہو یا کسی اور مقصد کے لیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

((لَا تَدَعْ صُوْرَةً إِلَّا طَمَسْتَهَا وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ))

[صحيح مسلم كتاب الجنائز باب الأمر بتسوية القبر (٩٦٩)]

''کوئی صورت نہ چھوڑ مگر اسے مٹادے اور جو قبر اونچی ہو اسے برابر کر دے۔''

یعنی عام قبروں کے برابر کر دے۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ تصویریں ختم کرنے کا حکم ہے لٹکانے کا نہیں۔

جاندار کی تصویر والے لباس

سوال کیا نماز پڑھتے وقت ایسی جیکٹ یا قمیص پہنی جا سکتی ہے جس پر کسی پرندے یا کسی اور جاندار کی تصویر ہو؟

جواب کسی بھی جاندار، ذی روح پرندے وغیرہ کی تصویر بالکل نا جائز اور حرام ہے، حرمت تصویر پر بے شمار احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا، اس نے کہا:

''میں تصویر بناتا ہوں، آپ ان کے متعلق مجھے فتویٰ دیں؟'' ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور فرمایا: ''تمہیں اس بات کی خبر دوں گا جو میں نے رسول ﷺ سے سنی، آپ نے فرمایا: ''ہر تصویر بنانے والا نفس جہنمی ہے اس کے لیے ہر صورت کے بدلے، جو اس نے بنائی تھی، ایک نفس بنایا جائے گا، وہ اسے جہنم میں عذاب دے گا، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر تو ضرور تصویر بنانے ہی والا ہے تو اس کی تصویر بنا جس میں روح نہیں۔''

[مسلم كتاب اللباس باب تحريم تصوير الحيوان (٢١١٠)]

معلوم ہوا کہ جاندار کی تصویر حرام ہے۔ ایسا لباس مطلق طور پر پہننا ہی نہیں چاہیے خواہ نماز کے لیے ہو یا غیر نماز کے لیے۔ اگر ان تصاویر کے چہرے مسخ کر دیے جائیں تو پھر ان کا استعمال درست ہے۔ تفصیل کے لیے راقم کی کتاب ''ٹی وی معاشرے کا کینسر'' ملاحظہ ہو۔

قوالی کی شرعی حیثیت اور عرسوں کے کھانے

سوال شریعتِ اسلامیہ میں قوالی کی کیا حیثیت ہے نیز عرس وغیرہ کے کھانوں کا کیا حکم ہے؟ کیا انھیں کھانا جائز ہے؟

جواب موجودہ دور میں قوالی کا سلسلہ بہت وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اکثر گاڑیوں، بسوں وغیرہ میں صبح ہوتے ہی ڈرائیور حضرات قوالی کا سماع کرتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی ڈرائیور گاڑی چلاتے وقت گانے لگا دے اور اس کو منع کیا جائے تو وہ گانوں کی کیسٹ بند کر کے قوالی لگا دیتے ہیں، جب روکا جائے تو کہتے ہیں مولوی صاحب ہم نے گانے تو بند کر دیے ہیں، یہ تو قوالی ہے جو اسلام میں جائز ہے۔ حالانکہ قوالی گانے سے بھی بڑا جرم ہے۔ اولاً اس لیے کہ قوالیوں میں شرکیہ باتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں، پیروں وفقیروں کے متعلق ایسی ایسی لغو باتیں بیان کی جاتی ہیں جو سراسر شریعت اسلامیہ سے

متصادم اور روح اسلام کے خلاف ہوتی ہیں۔ کیونکہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کے ساتھ مخلوق میں سے کسی کو برابر سمجھنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« اَكْبَرُ الْكَبَائِرِ الْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ » [بخاری، كتاب الاستئذان: باب من اتكأ بين يديه أصحابه(٦٢٧٣)]

’’ تمام کبیرہ گناہوں سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے۔‘‘

ثانیاً: ان تمام قوالیوں میں ڈھول، سارنگی، مزامیر اور آلات لہو ولعب وغیرہ بجائے جاتے ہیں جو شرعاً بالکل حرام ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ ﴾ [لقمان:٦،٧]

’’ اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو گانے بجانے کے آلات کو خریدتے ہیں۔ اس لیے کہ سمجھ بوجھ کے بغیر اللہ تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو بہکا دیں اور اس کو ہنسی مذاق بنا دیں۔ ایسے لوگوں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا اور جب (ان لوگوں میں سے) کسی کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ اکڑتا ہوا پیٹھ موڑ کر چل دیتا ہے گویا اس نے اس کو سنا ہی نہیں گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں بوجھ ہے۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔‘‘

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ اس آیت کریمہ میں ’’لہو الحدیث‘‘ سے کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

« اَلْغِنَاءُ وَ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُرَدِّدُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ » [تفسير ابن كثير(٤٨٦/٣)]

’’ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں! اس سے مراد گانا ہے۔‘‘ آپ نے اس بات کو تین مرتبہ دہرایا۔‘‘

یہی تفسیر سیدنا عبداللہ بن عباس، جابر، عکرمہ رضی اللہ عنہم، سعید بن جبیر، مجاہد، مکحول اور علی بن حذیمہ رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ گانا بجانا اور اس کے آلات خریدنا بالکل ناجائز اور حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے گمراہی کا باعث ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ گانے بجانے اور ان کے آلات خریدتے اور سنتے ہیں ان پر اگر اللہ تعالیٰ کا قرآن پڑھا جائے تو وہ اس سے اعراض کرتے اور منہ موڑتے ہیں اور ایسے کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن انھوں نے سنا ہی نہیں۔ بعینہ یہی کیفیت آج کل اکثر گاڑیوں کے ڈرائیوروں کی ہے، اگر ان کو تلاوت کی کیسٹ لگانے کے لیے کہا جائے تو طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں اور اگر گانے بجانے اور قوالی کی کیسٹ کے متعلق کہیں تو فوراً لگا دیتے ہیں۔ گویا کلام باری تعالیٰ سے چڑ اور شیطانی عمل سے محبت ہے۔ باجوں اور آلات لہو ولعب کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

« لَيَكُوْنَنَّ فِيْ اُمَّتِيْ اَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّوْنَ الْحِرَ وَ الْحَرِيْرَ وَ الْخَمْرَ وَ الْمَعَازِفَ » [بخاری، كتاب الأشربة: باب ما جاء فيمن يستحل الخمر (٥٥٩٠)]

''میری امت میں ضرور ایسے لوگ ہوں گے جو عورتوں کی شرمگاہ، ریشمی کپڑے، شراب اور باجے حلال ٹھہرائیں گے۔''

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جس طرح زنا و شراب حرام ہیں اسی طرح باجے گاجے بھی حرام ہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل میں جائے بغیر بریلوی حضرات کے امام مولوی احمد رضا خان بریلوی کے ایک فتوے کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اپنے امام کے فتوے ہی کو پڑھ کر راہِ راست پر آجائیں۔ احمد رضا خان کی کتاب احکام شریعت (ص:۶۰، حصہ اول) پر ایک سائل کا سوال یوں درج ہے:

''آج میں جس وقت آپ سے رخصت ہوا اور نماز مغرب کے لیے مسجد گیا، بعد نماز مغرب میرے ایک دوست نے کہا کہ چلو ایک جگہ عرس ہے، میں چلا گیا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور اس طریقہ سے قوالی ہو رہی ہے کہ ایک ڈھول، دو سارنگی بج رہی ہیں اور چند قوال پیران پیر دستگیر کی شان میں اشعار کہہ رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی نعت کے اشعار اور اولیاء اللہ کی شان میں اشعار گا رہے ہیں اور ڈھول سارنگیاں بج رہی ہیں۔ یہ باجے شریعت میں قطعی حرام ہیں۔ کیا اس فعل سے رسول اللہ ﷺ اور اولیاء خوش ہوتے ہوں گے؟ اور یہ حاضر جلسہ گناہ گار ہوئے یا نہیں اور ایسی قوالی جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو کس طرح؟''

احمد رضا خان اس سائل کا جواب یوں تحریر کرتے ہیں: ''ایسی قوالی حرام ہے، حاضرین سب گناہ گار ہیں اور ان سب کا گناہ ایسا عرس کرنے والوں اور قوالوں پر ہے اور قوالوں کا بھی گناہ اس عرس کرنے والے پر، بغیر اس کے کہ عرس کرنے والے کے ماتھے قوالوں کا گناہ جانے سے قوالوں پر گناہ کی کچھ کمی آئے یا اس کے اور قوالوں کے ذمہ حاضرین کا وبال پڑنے سے حاضرین کے گناہ میں کچھ تخفیف ہو۔ نہیں بلکہ حاضرین میں ہر ایک پر اپنا پورا گناہ اور قوالوں پر اپنا گناہ الگ اور سب حاضرین کے برابر جدا اور ایسا عرس کرنے والے پر اپنا گناہ الگ اور قوالوں کے برابر جدا اور سب حاضرین کے برابر علیحدہ۔ وجہ یہ ہے کہ حاضرین کو عرس کرنے والے نے بلایا، ان کے لیے اس گناہ کا سامان پھیلایا اور قوالوں نے انھیں سنایا۔ اگر وہ سامان نہ کرتا، یہ ڈھول سارنگی نہ سناتے تو حاضرین اس گناہ میں کیوں پڑتے۔ اس لیے ان سب کا گناہ ان دونوں پر ہوا۔ پھر قوالوں کے اس گناہ کا باعث وہ عرس کرنے والا ہوا، وہ نہ عرس کرتا، نہ بلاتا تو یہ کیونکر آتے بجاتے۔ لہٰذا قوالوں کا بھی گناہ اس بلانے والے پر ہوا۔''

اس کے بعد آگے (ص ۶۴، ۶۵) پر رقمطراز ہیں: ''سید الاولیاء شریف میں ہے کہ ایک آدمی نے سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کیا: ''ان ایام میں بعض آستانہ دار درویشوں نے ایسے مجمع میں جہاں چنگ و رباب اور دیگر مزامیر تھے، رقص کیا۔'' فرمایا: ''انھوں نے اچھا کام نہیں کیا، جو چیز شرع میں ناجائز ہے، ناپسندیدہ ہے۔'' اس کے بعد ایک نے کہا: ''جب یہ جماعت اس مقام سے باہر آئی تو لوگوں نے ان سے کہا: ''تم نے یہ کیا کیا؟ وہاں تو مزامیر تھے، تم نے سماع کس طرح سنا؟ اور رقص کیا۔'' انھوں نے جواب دیا: ''ہم اس طرح سماع میں مستغرق تھے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ یہاں مزامیر ہیں یا نہیں۔'' سلطان المشائخ نے فرمایا: ''یہ جواب کچھ نہیں، اس طرح تو تمام گناہوں کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔''

مسلمانو! کیسا صاف ارشاد ہے کہ مزامیر ناجائز ہیں اور اس عذر کا کہ ہمیں استغراق کے باعث مزامیر کی خبر نہ ہوئی، کیا مسکت جواب عطا فرمایا کہ ایسا حیلہ ہر گناہ میں ہوسکتا ہے۔ شراب پیے اور کہہ دے شدت استغراق کے باعث ہمیں خبر نہ ہوئی کہ شراب ہے یا پانی، زنا کرے اور کہہ دے کہ غلبہ حال کے سبب ہمیں تمیز نہ ہوئی کہ جورو ہے یا بیگانی۔

مولوی احمد رضا خان کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ قوالی سننا، سنانا، عرسوں اور میلوں پر اس کا انعقاد کرانا حرام و ناجائز ہے۔ کیونکہ اس میں گانے بجانے کے آلات، ڈھول، سارنگی، ستار وغیرہ بجائے جاتے ہیں جن کی اسلامی شریعت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

ہاں اگر ایسے اشعار ہوں جو کتاب و سنت کے مطابق ہوں اور مذکورہ خرابیوں سے پاک ہوں تو انھیں پڑھنا جائز و درست ہے جیسا کہ شاعر رسول سیدنا حسان رضی اللہ عنہ اشعار کہا کرتے تھے۔ باقی رہا اہل قبور کے لیے نذر و نیاز کی پکائی ہوئی دیگیں یا مردوں پر چڑھائے ہوئے چڑھاوے تو یاد رہے کہ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے:

«عَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاكِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ كَانَ نَذَرَ رَجُلٌ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ (ﷺ) اَنْ يَّنْحَرَ اِبِلًا بِبُوَانَةَ فَسَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ نَذَرْتُ اَنْ اَنْحَرَ اِبِلًا بِبُوَانَةَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ هَلْ كَانَ فِيْهَا وَثَنٌ مِنْ اَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ ؟ قَالُوْا لَا ، قَالَ فَهَلْ كَانَ فِيْهَا عِيْدٌ مِنْ اَعْيَادِهِمْ ؟ قَالُوْا لَا ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَوْفِ بِنَذْرِكَ فَاِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَ لَا فِيْمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ» [ابو داؤد، كتاب الايمان والنذور: باب ما يؤمر به من الوفاء بالنذر (٣٣١٣)، بيهقي (١٠/٨٣)]

"ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نذر مانی تھی کہ بوانہ کے مقام پر اونٹ ذبح کروں گا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: "میں نے نذر مانی ہے کہ بوانہ جگہ اونٹ ذبح کروں گا۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا وہاں جاہلیت میں کسی بت کی پرستش تو نہیں ہوتی تھی؟" لوگوں نے جواب دیا: "نہیں۔" آپ ﷺ نے پھر فرمایا: "کیا وہاں کوئی تہوار یا میلا تو نہیں لگتا تھا؟ انھوں نے کہا: "نہیں۔" پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اپنی نذر پوری کر، بلاشبہ جو نذر اللہ جل وعلا کی نافرمانی میں ہو، وہ پوری نہیں کی جائے گی اور نہ اس نذر کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے جو اس کی وسعت سے باہر ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نذر و نیاز اللہ کے نام کی دینی چاہیے، دوسری بات کہ کسی ایسی جگہ اللہ کے نام کی نذر پوری کرنا جائز نہیں جہاں کسی بت کی پوجا کی جاتی رہی ہو اگرچہ وہ اب باقی نہ رہا ہو۔ اسی طرح وہاں بھی اللہ کے نام کی نذر پوری نہیں کی جائے گی جہاں اہل کفر و شرک کا کوئی میلا یا تہوار منایا جاتا ہو۔ لہٰذا ایسے مقامات جہاں عرس و میلے لگائے جاتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ کے نام کی نذر و نیاز دینا یا کھانا درست نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

دل بہلانے کے لیے بانسری بجانا

سوال کیا دل بہلانے کے لیے یا فارغ اوقات میں بانسری بجانا اسلام میں جائز ہے؟

جواب اسلام میں بانسری بجانے کی اجازت نہیں ہے، دل بہلانے کے لیے قرآن حکیم کی تلاوت کرو اور علمائے دین کی تقاریر وغیرہ سنا کرو۔ مومن آدمی کا دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

''خبردار! اللہ کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔'' (الرعد : ۲۸)

موسیقی کے آلات وغیرہ اللہ کی یاد سے غافل کرنے والی چیزیں ہیں اور شیطانی آوازیں ہیں۔ نافع بیان کرتے ہیں:

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بانسری کی آواز سنی تو اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور راستے سے ہٹ گئے اور مجھے کہا: ''اے نافع! کیا تم کوئی آواز سن رہے ہو۔'' میں نے کہا: ''نہیں!'' تو انہوں نے اپنے کانوں سے انگلیاں نکال دیں اور کہا: ''میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کی آواز سنی اور ایسے ہی کیا۔''

[ابوداؤد، كتاب الأدب: باب كراهية الغناء والزمر (٤٩٢٤)، بيهقي (٢٢/١٠)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ بانسری کی آواز دل بہلانے کے لیے یا کسی اور غرض کے لیے درست نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بانسری کی آواز سن کر اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لی تھی۔ ہمیں بھی بانسری کی آواز سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

قبروں پر عرس اور میلے کا حکم

سوال بعض لوگ قبروں پر عرس اور میلا ثابت کرنے کے لیے یہ روایت پیش کرتے ہیں: «يَأْتِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ حَوْلٍ قُبُوْرَ الشُّهَدَآءِ » ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال کی ابتدا یا انتہا پر شہدائے (احد) کی قبروں پر آتے تھے۔'' کیا ایسی کوئی صحیح روایت کتب احادیث میں موجود ہے؟

جواب جو لوگ قبروں پر عرس میلے، قوالی و محفل سماع، ڈھول وسارنگی وغیرہ منکرات قائم کرتے ہیں ان کے اس عمل کی دلیل قرآن وسنت میں موجود نہیں ہے۔ زمانہ خیر القرون میں اس کا کہیں بھی وجود نہیں، مسلم اقوام کے جب مشرک اقوام سے میل جول اور روابط ہونے لگے تو اس اختلاط کے نتیجہ میں کئی ایک مشرکانہ اور مبتدعانہ رسم ورواج اور عقائد واعمال نے امت مسلمہ میں جگہ پکڑ لی اور لوگوں نے انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام رحمہم اللہ کی قبروں پر یا ان کے ناموں پر عرس اور میلے قائم کرنے شروع کر دیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے

« لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِيْ عِيْدًا وَلَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا وَحَيْثُمَا كُنْتُمْ فَصَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِيْ » [مسند احمد (٨٧٩٠)، ابوداؤد، كتاب المناسك: باب زيادة القبور (٢٠٤٢)، شعب الايمان للبيهقي (٤١٦٢)]

"میری قبر کو میلا نہ بنانا اور نہ اپنے گھروں کو قبرستان بناؤ اور تم جہاں کہیں بھی ہو مجھ پر درود بھیجو، تمھار درود مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔"

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ دور دراز کا سفر کرکے نبی ﷺ کی قبر پر اجتماع کرنا جائز نہیں کیونکہ زیارت قبر کا مقصد تو وہاں صلوٰۃ وسلام ہی پڑھنا ہے جبکہ صلوٰۃ وسلام تو آپ کو دور ونزدیک سے پہنچا دیا جاتا ہے، لہٰذا جب رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر عید ومیلا جیسا اجتماع کرنا درست نہیں تو اور کسی کی آپ کے مقابلے میں کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی (سورۃ آل عمران کی آیت ۶۴) کی تفسیر کے ضمن میں فائدہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"لَا يَجُوزُ مَا يَفْعَلُهُ الْجُهَّالُ بِقُبُوْرِ الْاَوْلِيَآءِ وَالشُّهَدَاءِ مِنَ السُّجُوْدِ وَالطَّوَافِ حَوْلَهَا وَاتِّخَاذِ السُّرُجِ وَالْمَسَاجِدِ عَلَيْهَا وَمِنَ الْاِجْتِمَاعِ بَعْدَ الْحَوْلِ كَالْاَعْيَادِ وَيُسَمُّوْنَهُ عُرْسًا"

[تفسیر مظھری (۲/۶۵)]

"اولیاء اور شہداء کی قبروں پر جاہل حضرات جو سجدے کرتے ہیں، ان کے گرد طواف کرتے ہیں، چراغاں اور دیے جلاتے ہیں قبروں پر مسجدیں قائم کرتے ہیں اور سال بعد عیدوں کی طرح جو اجتماع منعقد کرتے اور اسے عرس کا نام دیتے ہیں یہ جائز نہیں ہے۔"

پس معلوم ہوا کہ قبروں پر عرس میلے جہال کی پیداوار ہے، کتاب وسنت میں اس پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ اب رہی سوال میں ذکرکردہ روایت تو اسے امام بیہقی نے دلائل النبوۃ (۳/۳۰۸) میں واقدی کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور سیوطی نے شرح الصدور میں بحوالہ بیہقی بیان کیا ہے جبکہ محمد بن عمر واقدی اسلمی مشہور کذاب راوی ہے۔

زکریا بن یحییٰ الساجی، امام بخاری، امام احمد، ابن نمیر، ابن المبارک، اسماعیل بن زکریا، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، مسلم، نسائی، ابواحمد، الحاکم اور دارقطنی وغیرھم نے اسے متروک، کذاب اور غیر ثقہ قرار دیا ہے۔(تهذيب الكمال (۱۷/۱۰۰)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"واقدی کی کتب سب جھوٹ کا پلندہ ہیں۔" (تهذيب (۹/۳۲۵)

یہی روایت ابو زید عمر بن شبہ النمیری البصری نے اپنی کتاب "تاریخ المدینۃ المنورۃ (۱/۱۳۲)" میں بطریق ابی غسان (محمد بن یحییٰ الکنانی) روایت کی ہے، حدیث مع سند مندرجہ ذیل ہے:

« حَدَّثَنِيْ عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عِمْرَانَ عَنْ مُوْسَى بْنِ يَعْقُوْبَ الزَّمْعِيِّ عَنْ عَبَّادِ بْنِ اَبِيْ صَالِحٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْتِيْ قُبُوْرَ الشُّهَدَاءِ بِاَحُدٍ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ حَوْلٍ »

[تاریخ المدینۃ المنورۃ (۱/۱۳۲)]

یہ تین علل کی بنا پر ناقابل حجت ہے:

۱۔ اس کی سند میں عبدالعزیز بن عمران راوی کے بارے میں امام یحییٰ بن معین نے کہا "لم يكن من أصحاب الحديث

" (یہ اصحاب الحدیث میں سے نہیں ہے) اور ایک مرتبہ کہا: "لَیسَ بِثِقَةٍ " (ثقہ نہیں ہے)۔
ابوزکریا کہتے ہیں " رَأَیتُهُ هَاهُنَا بِبَغْدَادِ كَانَ يَشْتُمُ النَّاسَ وَيَطْعَنُ فِي أَحْسَابِهِمْ لَيسَ حَدِيثُهُ بِشَيْءٍ "
''میں نے اسے بغداد میں دیکھا ہے، یہ لوگوں کو گالیاں دیتا اور ان کے حسب نسب میں طعن کرتا تھا، اس کی روایت کوئی چیز نہیں۔''

محمد بن یحییٰ نیسابوری کہتے ہیں: " عَلَيَّ بَدَنَةٌ إِنْ حَدَّثْتُ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ عِمْرَانَ حَدِيثًا ، يُضَعِّفُهُ جِدًّا " اگر میں عبدالعزیز بن عمران سے حدیث بیان کروں تو مجھ پر ایک اونٹ کی قربانی لازم ہو'' وہ اسے بہت ضعیف قرار دیتے تھے۔''

امام بخاری فرماتے ہیں:" مُنْكَرُ الْحَدِيثِ لَا يُكْتَبُ حَدِيثُهُ " امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :"مَتْرُوكُ الْحَدِيثِ لَا يُكْتَبُ حَدِيثُهُ" یہ منکر الحدیث اور متروک الحدیث ہے اس کی روایت لکھی نہیں جاتی۔(تهذيب الكمال (۱۱/۵۲۰)

ابن حبان کہتے ہیں: ''يَرْوِي الْمَنَاكِيرَ عَنِ الْمَشَاهِيرِ '' ''یہ مشہور راویوں کے نام سے منکر روایتیں بیان کرتا ہے۔'' ابو حاتم کہتے ہیں: " ضَعِيفُ الْحَدِيثِ، مُنْكَرُ الْحَدِيثِ جِدًّا " ابن ابی حاتم کہتے ہیں: " اِمْتَنَعَ أَبُوزُرْعَةَ مِنْ قِرَاءَةِ حَدِيثِهِ وَتَرَكَ الرِّوَايَةَ عَنْهُ " ابوزرعہ نے اس کی روایت پڑھنے سے منع کیا اور اس سے روایت لینا چھوڑ دیا۔ (تهذيب (۶/۳۱۳)

بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " وَقَالَ عُمَرُ بْنُ شبه فِي أَخْبَارِ الْمَدِينَةِ كَانَ كَثِيرُ الْغَلَطِ فِي حَدِيثِهِ لِأَنَّهُ احْتَرَقَتْ كُتُبُهُ فَكَانَ يُحَدِّثُ مِنْ حِفْظِهِ " (تهذيب (۶/۳۱۳) ''عمر بن شبہ نے اخبار المدینہ میں کہا یہ اپنی روایت میں کثرت سے غلطیاں کرتا تھا، اس لیے کہ اس کی کتابیں جل گئی تھیں تو اپنے حافظے سے بیان کرتا تھا۔''

۲۔ اسی طرح اس کا استاذ موسیٰ بن یعقوب الزمعی مختلف فیہ ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "صُدُوقٌ سَيِّءُ الْحِفْظِ" جبکہ دکتور بشار عواد اور شیخ شعیب ارناؤط لکھتے ہیں: " بَلْ ضَعِيفٌ يُعْتَبَرُهُ فِي الْمُتَابِعَاتِ وَالشَّوَاهِدِ ، فَقَدْ ضَعَّفَهُ ابْنُ الْمَدِينِيِّ فَقَالَ : ضَعِيفُ الْحَدِيثِ، مُنْكَرُ الْحَدِيثِ وَالنِّسَائِيُّ قَالَ : لَيسَ بِالْقَوِيِّ وَالدَّارَقُطْنِيُّ قَالَ : لَا يُحْتَجُّ بِهِ وَقَالَ أَحْمَدُ : لَا يُعْجِبُنِي حَدِيثُهُ " (تحرير تقريب التهذيب (۳/۴۴۱)
''بلکہ یہ ضعیف راوی ہے، متابعات وشواہد میں اس کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اسے علی بن المدینی نے ضعیف قرار دیا اور کہا: ''یہ ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث ہے۔'' نسائی نے کہا: ''قوی نہیں ہے۔'' دارقطنی نے کہا: ''قابل حجت نہیں۔'' احمد نے کہا: ''اس کی روایت مجھے پسند نہیں ہے۔''

۳۔ اور تیسری علت یہ ہے کہ یہ عباد بن ابی صالح جسے عبداللہ بن ابی صالح بھی کہا جاتا ہے، کی مرسل روایت ہے اور اس کے بارے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں " لين الحديث " ''یہ کمزور روایت والا ہے۔'' (تقريب مع تحرير ۲/۲۲۲)
لہٰذا یہ روایت کسی طرح بھی قابل حجت نہیں ہے۔ یہی روایت امام عبدالرزاق نے المصنف (۳/۵۷۳،۵۷۴) (۶۷۱۶)

میں عن رجل من أهل المدينة عن سهيل بن ابى صالح عن محمد بن ابراهيم التيمى کے طریق سے اور طبری نے سورۂ رعد کی آیت (۲۴) کے تحت حدثني المثنى قال حدثنا سويد قال أخبرنا ابن المبارك عن ابراهيم بن محمد عن سهل بن أبى صالح عن محمد بن إبراهيم ذکر کی ہے، نیز دیکھیں ابن کثیر (۵۲۹/۲) مطبوعہ مکتبہ حقانیہ پشاور، تفسیر ثعلبی (۲۸۷/۵)۔

عبدالرزاق کی سند میں رجل من أهل المدينة مبہم ہے۔

جبکہ طبری کی سند میں مثنی بن ابراہیم الطبری کے حالات نامعلوم ہیں اور پھر یہ روایت مرسل ہے جو محدثین کے ہاں ضعیف کی اقسام میں سے ہے۔ لہٰذا یہ روایت کسی بھی صحیح یا حسن سند سے مروی نہیں، اس لیے عباد القبور کا اس سے استدلال درست نہیں۔

گانا اور میوزک سننا

سوال کیا مسلمان کے لیے گانا اور میوزک سننا جائز ہے؟

جواب گانا اور میوزک سننا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتے ہیں، نیز انھیں سنتے رہنے سے دل بیمار اور سخت ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب مبین اور اس کے رسول امین کی سنت اس کی حرمت پر شاہد ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡتَرِىۡ لَهۡوَ الۡحَدِيۡثِ ﴾ [لقمان: ٦]

''اور لوگوں میں سے بعض ایسا ہی ہے جو بے ہودہ حکایتیں (آلات طرب) خریدتا ہے۔''

اکثر مفسرین اور بہت سے علمائے کرام نے " لَهۡوَ الۡحَدِيۡثِ " کی تفسیر گانا اور آلات طرب سے کی ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میری امت میں کچھ جماعتیں ہوں گی جو حریر، خمر اور معازف کو حلال بنائیں گے۔'' [بخاری، كتاب الأشربة: باب ما جاء فيمن يستحل الخمر (٥٥٩٠)]

''حر'' سے مراد حرام شرمگاہ ہے اور ''حریر'' یعنی ریشم جو مشہور چیز ہے اور مردوں کے لیے حرام ہے۔ ''خمر'' یعنی شراب یہ بھی مشہور ہی ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوگا جس میں نشہ ہو اور یہ عام مسلمان مرد و عورت، بڑے اور بچے کے لیے حرام ہے اور اس کا پینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور ''معازف'' گانا بجانا اور ہر قسم کے آلات طرب۔ گانے بجانے کی حرمت پر کئی ایک نصوص، آیتیں اور حدیثیں جنھیں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اغاثة اللهفان من مكائد الشيطان" میں ذکر کیا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے تمام مسلمانوں کی ہدایت و توفیق کی اور اس کے غضب سے محفوظ رہنے کی دعا کرتے ہیں۔

محفلوں میں تالی بجانا

سوال تقریبات اور جلسوں میں تالی بجانا جائز ہے یا مکروہ؟

جواب محفلوں میں تالی بجانا غیر اسلامی فعل ہے، کم از کم اسے مکروہ تو کہا ہی جا سکتا ہے، حالانکہ دلیل کے اعتبار سے یہ حرام ہے۔ اس لیے کہ مسلمان کو کافروں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے بارے میں کہا ہے:

﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ﴾ [انفال: ٣٥]

''بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہیں۔''

علمائے کرام کا کہنا ہے کہ "مُكَاءً" سے مراد سیٹی بجانا اور "تَصْدِيَةً" سے مراد تالی بجانا ہے اور ایک مومن کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ جب وہ کوئی پسندیدہ چیز دیکھے یا اچھی بات سنے تو سبحان اللہ یا اللہ اکبر کہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی بے شمار حدیثوں سے ثابت ہے اور اگر عورتیں مردوں کے ساتھ نماز میں ہوں اور امام کچھ بھول جائے تو ان کے لیے امام کو آگاہ کرنے کی غرض سے تالی بجانا جائز ہے لیکن مرد یہی کام ''سبحان اللہ'' کہہ کر انجام دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی صحیح سنت سے یہی ثابت ہے۔

معلوم ہوا کہ مردوں کی تالی بجانے میں کافروں اور عورتوں سے مشابہت پائی جاتی ہے، ان دونوں کی مشابہت اختیار کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ واللہ ولی التوفیق!

موسیقی، اسلام کی نظر میں

سوال اسلام کی نظر میں موسیقی کی کیا حیثیت ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورۂ لقمان میں اہل سعادت جو اللہ کے کلام کے سماع سے فیض یاب ہوتے ہیں، ان کا ذکر کر کے بعد میں اہل شقاوت کا ذکر کیا ہے جو کلام الٰہی سننے سے تو اعراض کرتے ہیں لیکن نغمہ و سرود، ساز و موسیقی اور گانے وغیرہ خوب ذوق وشوق سے سنتے ہیں بلکہ ایسے افراد بھی ہیں جو اسے عبادت سمجھتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ وَ إِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [لقمان:٦،٧]

''اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غافل کرنے والی چیزیں خریدتے ہیں تاکہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو گمراہ کریں اور اسے ہنسی و مذاق بنائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے اور (یہ ایسا شخص ہے کہ) جب اس کے سامنے ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو تکبر کرتے ہوئے اس طرح منہ پھیر لیتا ہے گویا اس نے سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں بوجھ ہے۔ آپ اسے دردناک عذاب کی خبر سنا دیں۔''

اس آیت کریمہ میں لفظ ''لہو الحدیث'' کا مطلب گانا بجانا اور آلاتِ طرب وغیرہ ہیں جیسا کہ صحابی رسول سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« اَلْغِنَاءُ وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُرَدِّدُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ » [ابن ابی شیبة(٣٠٩/٦)، تفسیر ابن کثیر (٤٨٦/٣) تفسیر ابن جریر طبری(٦٢/٢١) ، بیهقی (٢٢٣/١٠)]

"اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ! اس آیت میں "لہو الحدیث" سے مراد گانا بجانا ہے۔" یہ بات آپ نے تین مرتبہ دہرائی۔"

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحُ الْإِسْنَادِ وَ لَمْ يُخْرِجَاهُ " [مستدرک حاکم(٤١١/٢)]

"یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور شیخین نے اسے تخریج نہیں کیا۔"

امام ذہبی رحمہ اللہ نے بھی امام حاکم رحمہ اللہ کی موافقت کی ہے۔سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں :

"لہو الحدیث" سے مراد گانے بجانے اور اس کی مثل اشیاء ہیں۔" [تفسیر ابن جریر طبری(٦٢،٦١/٢١)، بیهقی (٢٢١/١٠)، کشف الاستار(٢٢٦٤)، ابن ابی شیبة (٣١٠/٦)، الأدب المفرد(٧٨٦)]

اس کی سند حسن ہے۔علاوہ ازیں جابر، عکرمہ، سعید بن جبیر، قتادہ، ابراہیم نخعی، مجاہد، مکحول، عمرو بن شعیب، علی بن بذیمہ وغیرھم رحمہم اللہ سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔[تفسیر ابن کثیر(٤٨٦/٣)، المنتقی النفیس من تلبیس ابلیس(ص/٣٠٣)]

ائمہ سلف کی اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ "لہو الحدیث" کا مفہوم آلاتِ طرب اور گانا بجانا ہے۔ لہٰذا ایسے آلات خریدنا جو گانے بجانے، ضلالت و گمراہی کا سرچشمہ ہوں، حرام ہیں۔

مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے آلات سننے والے افراد کی یہ خصلت بھی ہوتی ہے کہ وہ قرآنی آیات سننے سے دور بھاگتے ہیں اور یہ بات عملاً دیکھی گئی ہے کہ جب کسی ڈرائیور کو، جب وہ گانا لگاتا ہے، تلاوت وغیرہ کی کیسٹ لگانے کا کہا جائے تو وہ اس پر غصے میں آجاتا ہے بلکہ بعض اوقات لڑ پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد کو دردناک عذاب کی بشارت دی ہے اور جس کام پر عذاب کی وعید ہو وہ کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتا ہے جیسا کہ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کی کتاب "الزواجر" اور امام ذہبی رحمہ اللہ کی کتاب "الکبائر" میں تصریح ہے۔ بلکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے :

" اَلْكَبَائِرُ كُلُّ ذَنْبٍ خَتَمَهُ اللّٰهُ بِنَارٍ اَوْ لَعْنَةٍ اَوْ غَضَبٍ اَوْ عَذَابٍ »

"ہر وہ گناہ جسے بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اختتام آگ، غضب، لعنت یا عذاب کے الفاظ کے ساتھ کیا ہو، وہ کبیرہ گناہ ہے۔"

نیز کبیرہ گناہوں کا تذکرہ سورۂ نساء(۳۱) اور سورۂ نجم (۳۲) میں موجود ہے۔ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝ وَ تَضْحَكُوْنَ وَ لَا تَبْكُوْنَ ۝ وَ اَنْتُمْ سَامِدُوْنَ ﴾

[النجم: ٥٩-٦١]

"کیا تم اس بات (قرآن) سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور روتے نہیں بلکہ تم کھیل رہے ہو۔"

اس آیت کریمہ میں قرآن مجید کے سماع پر ہنسنے اور کھیلنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں "سامدون" یعنی کھیلنے والے

کی تفسیر صحابی رسول عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یوں بیان کرتے ہیں:

" هُوَ الْغِنَاءُ بِالْحِمْيَرِيَّةِ اَسْمَدَ لَنَا تَغَنَّى " [بیهقی(۱۰/۲۲۳)، ابن جریر طبری(۲۷/۸۲)]

''حمیری قبیلے کی لغت میں ''سمد'' سے مراد گانا ہے، جو کوئی شخص گانا گائے تو کہتے ہیں "أسمد لنا۔"

امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ هُوَ الْغِنَاءُ يَقُوْلُ اَهْلُ الْيَمَنِ سَمَدَ فُلَانٌ اِذَا غَنّٰى " [المنتقی النفیس (ص/۳۰٤)]

''اس سے مراد گانا ہے، جب کوئی شخص گانا گائے تو اہل یمن کہتے ہیں " سمد فلان۔"

تیسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ [بنی اسرائیل: ٦٤]

''اور ان میں سے تو جسے بھی اپنی آواز سے بہکا سکتا ہے بہکا لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا اور ان کے مال اور اولاد میں تو شریک ہو جا اور ان سے وعدے کر اور شیطان انھیں وعدے نہیں دیتا مگر سب کے سب فریب و دھوکا ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں شیطانی آواز سے مراد موسیقی، آلات طرب، گانے بجانے اور رقص و سرود کی محافل میں فحش گوئی اور ہر وہ آواز ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی دعوت دیتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" هُوَ الْغِنَاءُ وَ الْمَزَامِيْرُ " [المنتقی النفیس (۳۰٤)، تفسیر ابن کثیر (۳/٥٦)]

''اس سے مراد گانا اور مزامیر ہے۔''

قرآن مجید کی ان تینوں آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ گانا بجانا اور آلات طرب حرام اور شیطانی آوازیں ہیں، ان سے اجتناب انتہائی لازمی ہے۔ اس کے متعلق چند ایک صحیح احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَيَكُوْنَنَّ فِيْ اُمَّتِيْ اَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّوْنَ الْحِرَّ وَ الْحَرِيْرَ وَ الْخَمْرَ وَ الْمَعَازِفَ وَ لَيَنْزِلَنَّ اَقْوَامٌ اِلٰى جَنْبِ عَلَمٍ يَرُوْحُ عَلَيْهِمْ بِسَارِحَةٍ لَّهُمْ يَاْتِيْهِمْ يَعْنِي الْفَقِيْرَ لِحَاجَةٍ فَيَقُوْلُوْنَ ارْجِعْ اِلَيْنَا غَدًا فَيُبَيِّتُهُمُ اللّٰهُ وَ يَضَعُ الْعَلَمَ وَ يَمْسَخُ آخَرِيْنَ قِرَدَةً وَ خَنَازِيْرَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ » [بخاری، کتاب الأشربة، باب ما جآء فیمن یستحل الخمر و یسمیه بغیر اسمه (٥٥٩٠)، مسند الشامیین(۱/۳۳٤)(٥٨٨) المعجم الکبیر(۳٤۱۷)، بیهقی(۱۰/۲۲۱)، ابو داؤد(٤۰۳۹)، تهذیب السنن (٥/۲۷۱)، تاریخ کبیر(۱/۳۰٤)]

''میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور باجے حلال ٹھہرائیں گے اور چند لوگ ایک پہاڑ

کے پہلو میں اتریں گے۔ شام کو ان کا چرواہا ان کے جانور لے کر ان کے پاس آئے گا اور ان کے پاس ایک فقیر آدمی حاجت وضرورت کے لیے آئے گا، وہ اسے کہیں گے ہمارے پاس کل آنا۔ رات کو اللہ تعالیٰ ان پر پہاڑ گرا کر انھیں تباہ کردے گا اور ان میں سے کچھ لوگوں کو بندر اور سور بنا دے گا۔ وہ قیامت تک اسی طرح رہیں گے۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ باجے گاجے حلال سمجھنے والے لوگ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں گے۔ یہاں بندر اور سور کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے اور بندر حرص میں اور سور بے حیائی میں ضرب المثل ہے یعنی حدیث میں مذکورہ صفات کے حاملین دنیا دار، شہوت پرست اور حریص ولالچی ہوں گے اور بے حیائی و بے غیرتی میں سور کی مثل ہوں گے۔

② مذکورہ بالا حدیث دوسری سند کے ساتھ بھی مروی ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں:

« لَيَشْرَبَنَّ نَاسٌ مِّنْ أُمَّتِي الْخَمْرَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا يُعْزَفُ عَلٰى رُؤُوْسِهِمْ بِالْمَعَازِفِ وَ الْمُغَنِّيَاتِ يَخْسِفُ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ وَ يَجْعَلُ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ »[ابن ابی شیبة(۱۰۷/۸)، موارد الظمآن (۱۳۸٤)، بیهقی(۲۹۵/۸)، (۲۲۱/۱۰)، طبرانی کبیر (۳٤۱۹)، مسند احمد(۳٤۲/۵)]

''البتہ ضرور میری امت کے لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل دیں گے۔ ان کے سروں پر گلوکارائیں اور آلات طرب بجائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انھیں زمین میں دھنسا دے گا اور ان میں سے بعض افراد کو بندر اور سور بنا دے گا۔''

③ سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلٰى أُمَّتِي الْخَمْرَ وَ الْمَيْسِرَ وَ الْمِزْرَ وَ الْكُوْبَةَ وَ الْقِنِّيْنَ وَ زَادَنِيْ صَلَاةَ الْوِتْرِ »
[مسند احمد(۱٦۵/۲)، ابو داؤد(۳٦۸۵)، بیهقی(۲۲۱/۱۰)، کتاب المعرفة و التاریخ (۵۱۹/۲)]

'' یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری امت پر شراب، جوا، گیہوں کی نبیذ، طبلہ اور سارنگی حرام کر دیے ہیں اور مجھے نماز وتر زائد عطا کی ہے۔''

④ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْخَمْرَ وَ الْمَيْسِرَ وَ الْكُوْبَةَ وَ قَالَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ »[مسند احمد (۲۸۹/۱)، کتاب الأشربة لأحمد(۱۹۳)، بیهقی (۲۲۱/۱۰)، طبرانی کبیر(۱۲ /۱۰۱)، دارقطنی (۷/۳)]

'' یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم پر شراب، جوا اور طبلہ حرام کیا ہے اور فرمایا ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔''

⑤ « عَنْ نَافِعٍ قَالَ سَمِعَ ابْنُ عُمَرَ مِزْمَارًا قَالَ: فَوَضَعَ اِصْبَعَيْهِ عَلٰى اُذُنَيْهِ وَ نَأٰى عَنِ الطَّرِيْقِ وَ قَالَ لِيْ يَا نَافِعُ ! هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا ؟ قَالَ فَقُلْتُ لَا قَالَ فَرَفَعَ اِصْبَعَيْهِ مِنْ اُذُنَيْهِ وَ قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَسَمِعَ مِثْلَ هٰذَا فَصَنَعَ مِثْلَ هٰذَا »[ابو داؤد، کتاب

الأدب: باب كراهية الغناء والزمر (٤٩٢٤)، بيهقى(٢٢/١٠)، المنتقى النفيس(ص/٣٠٤)،موارد الظمآن (٢٠١٣)، مسند احمد (٨/٢)، حلية الأولياء(١٢٩/٦)، طبرانى صغير(١٣/١)]

’’نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بانسری کی آواز سنی تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اور راستے سے ہٹ گئے اور مجھ سے پوچھا: ’’اے نافع! کیا تو کوئی آواز سن رہا ہے؟‘‘ میں نے کہا: ’’نہیں۔‘‘ تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں سے نکال لیں اور فرمایا: ’’میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کی آواز سنی اور ایسا ہی کیا۔‘‘

⑥« عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ خَسْفٌ وَ مَسْخٌ وَ قَذْفٌ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ مَتٰى ذَاكَ ؟ قَالَ اِذَا ظَهَرَتِ الْقِيَانُ وَ الْمَعَازِفُ وَ شُرِبَتِ الْخُمُوْرُ » [ترمذى، كتاب الفتن: باب ما جآء فى علامة حلول المسخ والخسف (٢٢١٢)]

’’حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اس امت کے اندر زمین کے اندر دھنسنا، صورتیں بدلنا اور بہتان بازی پیدا ہوگی۔‘‘ مسلمانوں سے ایک آدمی نے عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول! ایسا کب ہو گا؟‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جب گلوکارائیں اور طبلے سارنگیاں عام ہوں گی اور شرابیں پی جائیں گی۔‘‘

⑦ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّمَا نُهِيْتُ عَنْ صَوْتَيْنِ اَحْمَقَيْنِ فَاجِرَيْنِ : صَوْتُ مِزْمَارٍ عِنْدَ نِعْمَةٍ وَ صَوْتُ رَنَّةٍ عِنْدَ مُصِيْبَةٍ » [ترمذى، كتاب الجنائز: باب ما جاء فى الرخصة فى البكاء على الميت (١٠٠٥)، طبقات ابن سعد (١٣٨/١)،مسند طيالسى (١٦٨٣)، حاكم(٤٠/٤)، شرح السنة(٤٣١/٥)، امام بغوى رحمہ اللہ فرماتے هيں كه اس كى سند حسن درجه كى هے۔]

’’مجھے دو بدترین آوازوں سے روکا گیا ہے، خوشی کے وقت بانسری کی آواز سے اور مصیبت کے وقت رونے کی آواز سے (یعنی نوحہ خوانی وغیرہ سے)۔‘‘

⑧« عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَ كَسْبِ الزَّمَّارَةِ » [شرح السنة (٢٣/٨)، (٢٠٣٨)، بيهقى(١٢٦/٦)، غريب الحديث لأبى عبيد (٣٤١/١)]

’’سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت اور گلوکارہ کی کمائی سے منع کیا ہے۔‘‘

سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا اثر اوپر قرآنی آیات کی تفسیر میں گزر چکا ہے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بھی پیچھے بیان کیا جا چکا ہے۔ ان کا ایک اور اثر مندرجہ ذیل ہے:

① « عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اِلَى السُّوْقِ فَمَرَّ عَلٰى جَارِيَةٍ

صَغِيرَةٍ تَغَنَّى فَقَالَ اِنَّ الشَّيْطَانَ لَوْ تَرَكَ اَحَدًا لَتَرَكَ هٰذِهِ» [الأدب المفرد(٧٨٤)، ابن ابی الدنيا (١٥٦/١)، بيهقی(٢٢٣/١٠)، شعب الايمان]

''عبداللہ بن دینار فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بازار کی طرف نکلا۔ آپ ایک چھوٹی بچی کے پاس سے گزرے، وہ گانا گا رہی تھی، تو آپ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''یقیناً شیطان اگر کسی کو چھوڑتا تو وہ اس بچی کو چھوڑ دیتا۔''

② ام علقمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

«اِنَّ بَنَاتَ اَخِيْ عَائِشَةَ خُتِنَّ فَقِيلَ لِعَائِشَةَ اَلَا تَدْعُوْ لَهُنَّ مَنْ يُّلْهِيهِنَّ قَالَتْ بَلٰى فَاَرْسَلَتْ اِلٰى عَدِيٍّ فَاَتَاهُنَّ فَمَرَّتْ عَائِشَةُ فِي الْبَيْتِ فَرَاَتْهُ يَتَغَنّٰى وَ يُحَرِّكُ رَاْسَهُ طَرَبًا وَ كَانَ ذَا شَعْرٍ كَثِيرٍ فَقَالَتْ اُفٍّ شَيْطَانٌ اَخْرِجُوْهُ اَخْرِجُوْهُ» [الأدب المفرد(١٢٤٧)، بيهقی(٢٢٣/١٠)، سلسلة الأحاديث الصحيحة (٣٥٨/٢)]

''عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی کی بیٹیوں کا ختنہ کیا گیا تو عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا: ''کیا ہم ان بچیوں کے لیے کسی ایسے شخص کو دعوت دیں جو انھیں کھیل میں مشغول کر دے؟'' انھوں نے کہا: ''کیوں نہیں۔'' عدی نامی آدمی کو پیغام دیا گیا، وہ آیا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا (اس کے پاس سے) گھر میں گزریں، اسے دیکھا تو وہ گانا گا رہا تھا اور جھوم جھوم کر سر ہلا رہا تھا اور وہ گھنے بالوں والا تھا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''افسوس! یہ تو شیطان ہے، اس کو نکال دو، اس کو نکال دو۔''

③ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما اس آیت: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [المائدة: ٩٠]

''اے ایمان والو! شراب، جوا، آستانے اور فال نامے کے تیر پلید ہیں، شیطانی کام سے ہیں، ان سے اجتناب کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔'' اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

'' هِيَ فِي التَّوْرَاةِ اِنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ الْحَقَّ لِيُذْهِبَ بِهِ الْبَاطِلَ وَ يُبْطِلَ بِهِ اللَّعِبَ وَ الزَّفْنَ وَ الزَّمَّارَاتِ وَ الْمَزَاهِرَ وَ الْكَنَّانَاتِ وَ التَّصَاوِيرَ وَ الشِّعْرَ وَالْخَمْرَ لِمَنْ طَعِمَهَا اَقْسَمَ بِيَمِينِهِ وَعِزَّتِهِ لِمَنْ شَرِبَهَا بَعْدَ مَا حَرَّمْتُهَا لَاُعَطِّشَنَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ مَنْ تَرَكَهَا بَعْدَ مَا حَرَّمْتُهَا سَقَيْتُهُ اِيَّاهَا مِنْ حَظِيرَةِ الْقُدُسِ'' [بيهقی(٢٢٢/١٠)، تفسير ابن ابی حاتم(١١٩٦/٤)، غريب الحديث لأبی عبيد(٢٧٦/٤)، غريب الحديث لابن قتيبة(٣٨٨/٢)]

''یہ بات تورات میں ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے حق اتارا تاکہ اس کے ذریعے باطل ختم کر دے اور اس کے ذریعے کھیل تماشے، ناچ، بانسریاں، سارنگیاں، ڈھولکیاں، تصویریں، برے شعر اور شراب کو باطل قرار دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت وعزت کی قسم کھائی ہے کہ جس نے اس کو میرے حرام کرنے کے بعد پیا، میں اسے قیامت کے روز ضرور پیاسا رکھوں گا اور جس نے اسے میرے حرام کرنے کے بعد ترک کر دیا، میں اس کو جنت سے پلاؤں گا۔''

④ امام ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اِعْلَمْ اَنَّ سِمَاعَ الْغِنَاءِ یَجْمَعُ شَیْئَیْنِ اَحَدُھُمَا : اِنَّهُ یُلْھِی الْقَلْبَ عَنِ التَّفْکِیْرِ فِیْ عَظَمَةِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ وَ الْقِیَامَةِ بِخِدْمَتِهِ وَ الثَّانِیْ اِنَّهُ یُمِیْلُهُ اِلَی اللَّذَّاتِ وَالْعَاجِلَةِ الَّتِیْ تَدْعُوْ اِلٰی اسْتِیْفَائِھَا مِنْ جَمِیْعِ الشَّھَوَاتِ الْحِسِّیَّةِ وَ مُعْظَمُھَا النِّکَاحُ وَ لَیْسَ تَمَامُ لَذَّتِهِ اِلَّا فِی الْمُتَجَدِّدَاتِ وَ لَا سَبِیْلَ اِلٰی کَثْرَةِ الْمُتَجَدِّدَاتِ مِنَ الْحِلِّ فَلِذٰلِكَ یَحُثُّ عَلَی الزِّنٰی "[المنتقی النفیس (ص/۲۸۹)]

" گانا سننا دو چیزوں کو جمع کرتا ہے۔ایک تو دل کو اللہ تعالیٰ کی عظمت میں غور کرنے اور اس کی خدمت میں قائم رہنے سے غافل کر دیتا ہے اور دوسرے دل کو جلد حاصل ہونے والی لذتوں کی طرف رغبت دلاتا ہے اور انھیں پورا کرنے کی ترغیب دلاتا ہے، ہر قسم کی حسی شہوتیں پیدا کرتا ہے، جن میں بڑی شہوت نکاح ہے اور نکاح کی پوری لذت نئی عورتوں میں ہے اور نئی عورتوں کی کثرت حلال ذریعے سے حاصل ہونا دشوار ہے لہٰذا انسان کو زنا پر برانگیختہ کرتا ہے۔"

مندرجہ بالا آیات ، صحیح احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ بات واضح ہو گئی کہ گانے بجانے کے آلات یعنی طبلے ، سارنگیاں ، بانسریاں ، ڈھولکیاں ، باجے گاجے ،طنبورے، ڈفلیاں، تو نبے ، ڈگڈیاں اور سائرن شرعاً حرام و ناجائز ہیں، پھر ان پر رقص و سرود کی محافل قائم کر کے گانے گانا جو انسانی شہوات کو بھڑکانے اور انھیں لذات کی طرف مائل کرنے کا بھرپور سامان ہے ، ان کی خرید و فروخت قطعاً درست نہیں۔

خودکشی

(سوال) قرآن وحدیث کی روشنی میں بتایئے کہ خودکشی (جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاک کرنا) کس حالت میں یا کس موقع پر جائز ہے؟

(جواب) خودکشی اسلام میں حرام ہے اور کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس آدمی نے اپنے آپ کو کسی آلے کے ساتھ قتل کیا تو اسے اسی کے ساتھ جہنم کی آگ میں عذاب دیا جائے گا۔"

[صحیح بخاری، کتاب الجنائز : باب ما جاء فی قاتل النفس: (۱۳۶۳)]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو آدمی گلا گھونٹتا ہے وہ آگ میں بھی اپنے گلے کو گھونٹتا رہے گا اور جو آدمی اپنے آپ کو نیزہ مارتا ہے وہ آگ میں بھی اسی طرح اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا۔" [صحیح بخاری: کتاب الجنائز: باب ما جاء فی قاتل النفس(۱۳۶۵)]

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ خودکشی کرنا یعنی اپنے آپ کو ہلاک کرنا اسلام میں حرام ہے، آدمی جس آلے کے ساتھ اپنے آپ کو زخمی کرے گا یا ہلاک کرے گا قیامت والے دن جہنم کی آگ میں بھی وہ اسی آلے کے ساتھ اپنے آپ کو مارتا رہے گا۔ لہٰذا حالات جیسے بھی ہوں خودکشی سے اجتناب لازم ہے۔

عزت بچانے کی خاطر خودکشی کرنا

سوال آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے خودکشی کی تو اس کو اسی آلے کے ساتھ قیامت تک عذاب دیا جاتا رہے گا جس کے ساتھ اس نے خودکشی کی۔'' تو ایسی عورتوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا جنھوں نے اپنی عزت بچاتے ہوئے اپنی جانیں ضائع کر دیں؟ مثلاً ہم سنتے ہیں کہ قیام پاکستان کے وقت عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگ لگا دی، کیا کسی بھی صورت میں خودکشی جائز نہیں؟

جواب اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''جس نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرایا اور اپنی جان کو قتل کر ڈالا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں گرتا رہے گا۔ جس نے زہر کا گھونٹ بھر کر اپنے آپ کو مار ڈالا، اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا، وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں اس کے گھونٹ بھرتا رہے گا اور جس نے کسی تیز دھار آلے سے اپنے آپ کو قتل کیا اس کا آلہ اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں اپنے پیٹ کو زخمی کرتا رہے گا۔'' [صحیح بخاری، کتاب الطب : باب شرب السم والدواء به (٥٧٧٨)]

جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''ایک آدمی کو زخم لگا، اس نے (زخم کی تاب نہ لا کر) اپنے آپ کو مار ڈالا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرے بندے نے جان نکالنے میں مجھ پر جلدی کی میں اس پر جنت کو حرام کرتا ہوں۔'' [صحیح بخاری، کتاب الجنائز: باب ماجاء فی قاتل النفس (١٣٦٤)]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اپنا گلا خود گھونٹتا ہے وہ جہنم میں بھی اپنا گلا گھونٹتا رہے گا اور جو برچھے یا تیر وغیرہ سے اپنے آپ کو مارتا ہے وہ جہنم میں بھی اسی طرح اپنے آپ کو مارتا رہے گا۔'' [صحیح بخاری، کتاب الجنائز: باب ما جاء فی قاتل النفس (١٣٦٥)]

ان احادیث صحیحہ سے تو یہی بات واضح ہوتی ہے کہ خودکشی حرام ہے، خودکشی کرنے والے پر اللہ نے جنت حرام کی ہے اور جس طرح اپنے آپ کو مارے گا اسی طرح جہنم میں اسے سزا دی جائے گی۔

صورت مسئولہ میں بظاہر تو یہ بات بڑی اچھی لگتی ہے کہ اپنی عزت بچانے کی غرض سے جان دی گئی ہے لیکن مجھے اس طرح کی خودکشی کے بارے کوئی حدیث نہیں ملی۔ ہماری جماعت کے معروف و مشہور مفتی اور شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی ﷾ کا الاعتصام ١٧ مئی ٢٠٠٢ء میں ایک فتویٰ طبع ہوا ہے، اس کی عبارت درج ذیل ہے:

''اس قسم کے حالات کے باوجود خودکشی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ خودکشی بہت بڑا جرم ہے۔ اس طرح کی جبری صورت میں عورت پر حد قائم نہیں ہوتی، وہ بری الذمہ ہے، چنانچہ امام بخاری ﷫ نے اپنی صحیح میں یہ باب قائم کیا ہے کہ

عورت کو جب زنا پر مجبور کیا جائے تو اس پر کوئی حد لاگو نہیں ہوگی۔''
حضرت حافظ صاحب نے جس باب کی طرف اشارہ کیا ہے وہ صحیح البخاری میں کتاب الاکراہ کا چھٹا باب ہے۔ اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ لیث بن سعد رحمہ اللہ کہتے ہیں مجھے نافع نے خبر دی ہے، انھیں صفیہ بنت ابی عبید نے بتایا: ''حکومت کے غلاموں میں سے ایک غلام نے خمس کے حصے کی ایک باندی سے زبردستی زنا کر کے اس کی بکارت زائل کر دی تو عمر رضی اللہ عنہ نے اس غلام پر حد جاری کی اور اسے شہر بدر کر دیا اور اس باندی پر حد نہیں لگائی کیونکہ غلام نے اس سے زبردستی کی تھی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ خودکشی سے اجتناب کرنا چاہیے اور اگر کسی عورت سے جبر واکراہ کی صورت میں بدکاری کی گئی تو وہ عورت اللہ کے ہاں بری الذمہ ہے، اس پر کوئی حد و سزا نہیں البتہ مجرموں کو شرعی حد لگائی جائے گی۔ اگر کفار و مشرکین مسلمان خواتین کی عصمت دری کریں اور ان کی عفت و پاکدامنی کو داغ دار کریں تو دوسرے مسلمان بھائیوں پر ان عورتوں کی عفت وعصمت کا بدلا لینا واجب ہے۔ اگر مسلمان اپنی اسلامی بہنوں کا بدلا نہیں لیتے تو اللہ کے ہاں جوابدہ ہوں گے۔ جہاد جو دین اسلام کی چوٹی ہے اس کے مقاصد میں سے یہ امر بھی ہے جس سے آج امت مسلمہ چشم پوشی کر رہی ہے، اگر جہاد فی سبیل اللہ کو صحیح معنوں میں جاری کر دیا جائے تو مسلمان خواتین کو یہ نوبت پیش نہ آئے۔ افسوس صد افسوس کہ آج کتنی تعداد میں مسلم حکمران، ممالک اور عوام موجود ہیں لیکن جہاد فی سبیل اللہ کے فریضے کو سمجھنے سے عاری ہیں اور اپنی دنیاوی خواہشات اور لذات کے پیچھے لگ کر اس فریضے سے غفلت برت رہے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں جہاد کو کھڑا کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے اور مسلم خواتین کی عفت وعصمت کو محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

رسومات میں شرکت کرنا

سوال میں اپنے خاندان میں اکیلا اہل حدیث ہوں، باقی سب شرک و بدعت میں مبتلا ہیں تو میں ان کے ساتھ اپنے معاملات کیسے رکھوں؟ ان کی رسومات تیجہ، ساتواں، دسواں اور چالیسواں وغیرہ اور ان کی شادی بیاہ میں شرکت کا کیا حکم ہے؟

جواب آپ اپنے عزیز و اقارب سے حسن سلوک سے پیش آئیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے مشرکین رشتہ داروں سے صلہ رحمی کا حکم فرمایا تھا جیسا کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں:

''میری ماں جو مشرکہ تھیں، اس وقت آئیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا تھا، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ میری ماں تشریف لائی ہیں اور وہ رغبت رکھنے والی ہیں، کیا میں اس سے صلہ رحمی کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں! اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔'' [بخاری، کتاب الهبة و فضلها: باب الهدية للمشركين (۲۶۲۰)، مسند احمد (۳۴۴/۶)]

اور قرآن حکیم میں بھی ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا﴾ [لقمان: ۱۵]

''اپنے والدین کے ساتھ دنیا میں اچھے طریقے سے پیش آئیں۔''

لہٰذا آپ اپنے والدین اور عزیز واقارب سے صلہ رحمی کریں، اچھے طریقے سے پیش آئیں، ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کریں اور انھیں حکمت کے ساتھ عقیدۂ توحید اور کتاب سنت کی دعوت دیتے رہیں، اگر وہ کوئی سخت کلمات بھی کہہ دیں تو برداشت کریں، اس میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے خیر ہے۔ البتہ ان کی رسومات اور خلاف شرع امور میں شرکت سے اجتناب کریں، خوشی وغمی کے موقع پر ضرور جائیں لیکن ایسے مواقع پر ڈھول، گانا بجانا، بے پردگی اور شادی کے غیر شرعی رسومات ہوں تو ان امور میں ان سے علیحدہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

ہوٹلوں میں منعقد تقریبات میں شرکت

سوال کیا شادی بیاہ کی تقریبات ہوٹلوں اور شادی گھروں میں منعقد کی جاسکتی ہیں؟ کتاب وسنت کی رو سے صحیح راہ نمائی فرمائیں۔

جواب عصر حاضر میں شادی بیاہ کی اکثر تقریبات ہوٹلوں اور شادی گھروں میں منعقد کی جاتی ہیں اور ان تقریبات میں بے شمار قباحتیں پائی جاتی ہیں جیسا کہ:۔

① اکثر مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ مرد وزن کا اختلاط بہت زیادہ ہوتا ہے۔ آزادانہ طریقے سے خواتین مردوں میں گھوم رہی ہوتی ہیں اور اسلامی حجاب کو ترک کر کے گلوں میں دوپٹے ڈال کر پھرتی ہیں، بلکہ کئی خواتین ایسے غیر شرعی لباس میں ملبوس ہوتی ہیں کہ شرم وحیا بالائے طاق ہوتی ہے۔

② ایسی تقریبات فضول خرچی اور غیر ضروری اخراجات کا باعث بنتی ہیں جبکہ فضول خرچی شرعی طور پر جائز نہیں۔ قرآن حکیم میں فضول خرچ افراد کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔

③ اکثر تقریبات میں ویڈیو بنائی جاتی ہے جس میں مرد غیر محرم عورت کی تصاویر اتارتے ہیں جو شرعاً حرام ہے۔

جہاں ایسی اخلاق باختہ اور حیا سوز اشیاء موجود ہوں تو وہاں تقریبات منعقد کرنے سے گریز کیا جائے اور اگر مذکورہ قباحتیں موجود نہ ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ آج کل اکثر گھروں میں جگہ اتنی کم ہوتی ہے کہ دعوت ولیمہ پر بلائے گئے افراد کے لیے جگہ کم پڑ جاتی ہے، جس کی وجہ سے لوگ ہوٹل وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔ بہر کیف بوقت ضرورت ایسی اشیاء سے شرعی حدود میں رہتے ہوئے فائدہ اٹھانا بالکل صحیح اور درست ہے۔

ویڈیو اور موسیقی والی شادیوں میں شرکت

سوال ایسی شادیاں جہاں موسیقی اور ویڈیو بنانے کا اہتمام ہو اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

جواب ایسی شادیوں میں شرکت کرنا درست نہیں، اس لیے کہ موسیقی سننا اور بجانا شرعاً ناجائز وحرام ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ان میں سے جس کو تو اپنی آواز سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے۔'' [بنی اسرائیل : ٦٣]

یعنی شیطان کو جب ڈھیل دی گئی تو اسے یہ بھی چھٹی مل گئی کہ وہ انسانوں کو اپنی آواز کے ذریعے اگر پھسلا سکتا ہے تو اپنا کام کر کے دیکھے۔ اس آواز کے بارے کئی مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد گانا بجانا، مزامیر اور ہر وہ آواز ہے جس میں اللہ کی نافرمانی ہو۔ اسی طرح سورۂ لقمان میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق آیت (٦) میں ''لَهْوَ الْحَدِيْثِ'' سے مراد گانا بجانا ہے۔ لہٰذا گانا بجانا اور آلات موسیقی شرعی طور پر درست نہیں۔ تصویر اتارنا اور اتروانا بھی شرعاً حرام ہے۔ نبی ﷺ کی ایک حدیث میں ہے کہ مصورین کو قیامت والے دن سب سے سخت عذاب ہوگا۔ لہٰذا تصویر بنوانا بھی شرعاً درست نہیں اور وہ مجالس جہاں یہ خلاف شرع کام ہو رہے ہوں ان میں شرکت کرنا صحیح نہیں۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اور اللہ تمھارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ تم جب کسی مجلس والوں کو اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے سنو تو اس مجمع میں ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک کہ وہ اس کے علاوہ اور باتیں نہ کرنے لگ جائیں۔ ورنہ تم بھی اس وقت انھی جیسے ہو، بے شک اللہ تعالیٰ منافقین اور کافروں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔'' [نساء: ١٤٠]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ایسی مجالس جہاں احکام شرع کی خلاف ورزی ہو رہی ہو ان میں شرکت کرنا منع ہے اور شرکت کرنے والا بھی انھیں جیسا ہوگا۔ آپ کی ایک حدیث میں ہے:

''جو آدمی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ ایسے دستر خوان پر ہرگز نہ بیٹھے جہاں شراب پیش کی جا رہی ہو۔''
[مسند احمد(٢٠/١)۔ ترمذی، کتاب الأدب : باب ما جاء فی دخول الحمام: (٢٨٠١)]

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جس دستر خوان پر شریعت کے خلاف کوئی چیز ہو وہاں شرکت کرنا درست نہیں۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''ہم ایسے ولیمے میں شریک نہیں ہوتے جس میں طبلے سارنگیاں ہوں۔''[آداب الزفاف لشیخ البانی رحمہ اللہ (١٦٦)]

لہٰذا طبلے سارنگیوں، گانے بجانے اور ویڈیو وغیرہ منکرات پر مشتمل مجلس میں حاضر ہونے سے مکمل اجتناب کیا جائے۔

اگرچہ دعوت قبول کرنا مستحب ہے تو دوسری طرف حصول منکر اس سے مانع ہے۔ مانع اور مقتضی میں جب تعارض ہو تو حکم مانع کا ہوگا، لہٰذا ایسی شادی جس میں مندرجہ ذیل خرافات ہوں اس میں شرکت کرنا ناجائز و ممنوع ہے، البتہ اگر کوئی شخص تبلیغ کی نیت سے وہاں جائے تو کوئی حرج نہیں، اگر تبلیغ نہیں کر سکتا تو بالکل نہ جائے۔

داماد سے پردہ

سوال داماد سے پردہ کا کیا حکم ہے؟

جواب داماد محارم میں سے ہے یعنی ان مردوں میں سے ہے جن سے عورت کی شادی شرعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ محرمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اور تمھاری بیویوں کی مائیں۔''[النساء : ٢٣]

یعنی یہ بھی حرام ہیں اور یہ اہل علم کا اجماعی مسئلہ ہے۔ مذکورہ آیت کی رو سے بیوی کی ماں، اس کی دادی اور نانی اس کے خاوند کے لیے حرام ہیں۔ لہٰذا ساس کے لیے داماد سے پردہ نہیں ہے، وہ اپنے داماد کے ساتھ کھانے میں شریک ہوسکتی ہے اس کے ساتھ بوقت ضرورت کہیں جانا پڑ جائے تو جا سکتی ہے۔ اگر ایسا کرتی ہے تو الفت و محبت کی پائیداری کے لیے یہ زیادہ بہتر اور زیادہ افضل ہے۔

خاوند کی وفات کے بعد ملازمت کرنا

(سوال) جب عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ ملازمہ ہو، اس کا کوئی کفیل نہ ہو تو اس مجبوری کے پیش نظر کیا وہ اپنی ملازمت پر جا سکتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

(جواب) جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو اسے عدت اپنے اسی گھر میں گزارنی چاہیے جس میں وہ شوہر کی رفاقت کے وقت قیام پذیر تھی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن فریعہ بنت مالک سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں اور بنی خدرہ میں اپنے اہل کے پاس جانے کی اجازت چاہی۔ کیونکہ ان کے خاوند اپنے مفرور غلاموں کے پیچھے نکلے اور مقام قدوم (مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر) کے پاس جب وہ ان سے ملے تو انھوں نے ان کو قتل کر دیا، وہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ مجھے اپنے اہل کے پاس جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں اس لیے کہ شوہر نے مجھے ایسے گھر میں نہیں چھوڑا جس کے وہ مالک رہے ہوں اور نہ نفقہ چھوڑا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو ہاں کردی اور میں واپس ہوگئی یہاں تک کہ جب میں حجرہ یا مسجد میں پہنچی تو آپ نے مجھے بلایا اور کہا: ''تو نے کیسے کہا؟'' میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا واقعہ دوبارہ سنایا اور اپنے شوہر کا حال ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنے گھر ہی میں رہو یہاں تک کہ تمھاری عدت ختم ہوجائے۔'' وہ کہتی ہیں کہ پھر میں نے اس گھر میں چار ماہ دس دن عدت گزاری اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو انہوں نے مجھے بلوا کر اس بارے میں دریافت کیا، میں نے انھیں بتایا تو اسی کے مطابق انھوں نے فیصلہ کیا اور اس کی پیروی کی۔ [ترمذی ، كتاب الطلاق واللعان : باب ما جاء أين تعتد المتوفى عنها زوجها (١٢٠٤)]

امام ترمذی فرماتے ہیں: ''یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اسی حدیث کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر اہل علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے، انھوں نے عدت گزارنے والی عورت کے لیے جائز نہیں رکھا کہ وہ اپنے شوہر کے گھر سے عدت پوری ہونے سے پہلے منتقل ہو۔

امام سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا یہی موقف ہے اور بعض اہل علم صحابہ نے کہا: ''عورت اگر اپنے خاوند کے گھر عدت نہ گزارنا چاہے تو جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے۔'' امام ترمذی فرماتے ہیں: ''پہلی بات صحیح ترین ہے یعنی عورت اسی گھر میں عدت گزارے جہاں وہ اپنے شوہر کی رفاقت میں قیام پذیر تھی۔'' [ترمذی مع تحفة الاحوذی (٤٤١/٤)، (٤٤٢)]

موطا میں امام محمد نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔

البتہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ مجبوری کے تحت کام کاج کے لیے دن کے وقت گھر سے نکل سکتی ہے اور رات اسی گھر میں آ کر بسر کرے گی۔ انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری خالہ کو طلاق دے دی گئی تو انھوں نے (اپنی عدت کے دوران) اپنے باغ کی کھجوریں اتارنے کا ارادہ کیا تو ایک شخص نے انھیں باہر نکلنے سے منع کیا اور ڈانٹا تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں، آپ نے فرمایا: ''ہاں! جاؤ اپنے درخت کی کھجوریں توڑو ممکن ہے کہ تم اس میں سے کچھ صدقہ کر دیا کرو اور نیکی کا کام کرو۔'' [صحیح مسلم، کتاب الطلاق: باب جواز خروج المعتدة البائن (١٤٨٣)، ابوداؤد (٢٢٩٧)، مسند احمد، (٣٢١/٣)، ابن ماجه (٢٠٣٤)]

ان کا کہنا ہے کہ آپ نے اس حدیث میں مطلقہ کو عدت کے دوران بوقت ضرورت گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے، لہٰذا وفات کی عدت والی عورت کو اسی پر قیاس کیا جائے گا۔ اس کی تائید مجاہد تابعی کے اس اثر سے بھی ہوتی ہے کہ احد کے دن بہت سے لوگ شہید ہو گئے۔ ان کی عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں اور کہا:

''اے اللہ کے رسول! ہم رات کے وقت وحشت محسوس کرتی ہیں، اس لیے چاہتی ہیں کہ کسی دوسری عورت کے ہاں رات بسر کر لیں اور جب ہم صبح کریں تو اپنے گھر کو جلدی واپس آ جائیں؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم جس کسی کے ہاں چاہو بات چیت کرو اور جب سونا چاہو تو ہر عورت اپنے اپنے گھر چلی جائے۔'' [بیهقی: (٤٣٦/٥)]

لہٰذا معلوم ہوا کہ عورت بوقت مجبوری کام کاج کی غرض سے گھر سے نکل سکتی ہے لیکن رات اپنے گھر ہی میں بسر کرے گی۔

کسی کی وفات پر خاموشی اختیار کرنا

سوال کسی کے مرنے پر ایک منٹ یا اس سے زیادہ عرصہ خاموش رہنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ سوگ کا صحیح طریقہ ہے؟

جواب لوگوں کا مذکورہ طریقہ کسی دلیل سے ثابت نہیں، البتہ اگر کوئی آدمی کسی کی موت کا سن کر اچانک سکتے میں آ جائے تو وہ الگ مسئلہ ہے، فطرتی طور پر ایسا ہو جاتا ہے، جب کسی انتہائی عزیز کی موت کی خبر ملتی ہے تو یکدم سکتہ طاری ہو جاتا ہے، انسان منہ سے کچھ بول نہیں سکتا لیکن کسی کی وفات کی خبر سن کر درخواست کرنا اور ایک یا دو تین منٹ کی خاموشی کے لیے کہنا یہ کوئی سوگ کا طریقہ نہیں ہے۔

کتا کہلوانا

سوال کیا کتا رکھنا جائز ہے نیز اپنے آپ کو کتا کہلوانا کیسا ہے؟ قرآن وحدیث کی رو سے آگاہ فرمائیں۔

جواب اسلام کی نظر میں یہ ایک ناپسندیدہ جانور ہے، اسے گھر میں رکھنے سے رحمت کے فرشتے گھر میں داخل نہیں ہوتے اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

① « عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِکَةُ بَیْتًا فِیْهِ کَلْبٌ وَ لَا تَصَاوِیْرُ » [بخاری، کتاب بدء الخلق: باب اذا قال أحدكم آمين والملائكة في السماء فوافقت إحداهما الأخرى (٣٢٢٥)]

''حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصاویر ہوں۔''

ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام وعدے کے باوجود نہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت پریشان ہوئے پھر بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما جو ابھی کم عمر تھے، وہ گھر میں کتے کا بچہ لے آئے تھے۔

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« طُهُوْرُ اِنَاءِ اَحَدِکُمْ اِذَا وَلَغَ فِیْهِ الْکَلْبُ اَنْ یَّغْسِلَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ اُوْلَاهُنَّ بِالتُّرَابِ» [مسلم كتاب الطهارة: باب حكم ولوغ الكلب: (٢٧٩)]

''جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں کتا منہ ڈال جائے تو اسے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے سات مرتبہ دھوئے، جن میں سے پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ ہو۔''

③ خالص سیاہ رنگ کا کتا اگر نمازی کے آگے سے گزر جائے اور اس کے سامنے سترہ نہ ہو تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے:

« اَلْکَلْبُ الْاَسْوَدُ شَیْطَانٌ » [مسلم، كتاب الصلاة: باب قدر ما يستر المصلي (٥١٠)]

'' کالا کتا شیطان ہے۔''

④ خالص سیاہ رنگ کے کتے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

« عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ لَوْ لَا اَنَّ الْکِلَابَ اُمَّةٌ مِّنَ الْاُمَمِ لَاَمَرْتُ بِقَتْلِهَا کُلِّهَا فَاقْتُلُوْا مِنْهَا الْاَسْوَدَ الْبَهِیْمَ » [ابو داؤد، كتاب الصيد: باب اتخاذ الكلب للصيد وغيره (٢٨٤٥)]

''حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر یہ بات نہ ہوتی کہ کتے امتوں میں سے ایک امت ہیں تو میں تمام کتے مار ڈالنے کا حکم دے دیتا، لیکن اب تم ان میں سے خالص سیاہ رنگ کے کتے کو مار دو۔''

⑤ اسی طرح دو نقطوں والے سیاہ کتے کو بھی مارنے کا حکم ہے:

« عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ بِقَتْلِ الْکِلَابِ حَتّٰی اِنَّ الْمَرْاَةَ تَقْدَمُ مِنَ الْبَادِیَةِ بِکَلْبِهَا فَنَقْتُلُهُ ثُمَّ نَهَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ عَنْ قَتْلِهَا وَ قَالَ

عَلَيْكُمْ بِالْاَسْوَدِ الْبَهِيْمِ ذِی النُّقْطَتَيْنِ فَاِنَّهُ شَيْطَانٌ » [مسلم ،كتاب المساقاة : باب الأمر بقتل الكلاب (۱۵۷۲)]

'' سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کتے مار ڈالنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ بادیہ سے کوئی عورت اپنا کتا لے کر آتی تو ہم اسے مار ڈالتے، پھر رسول اللہ ﷺ نے انھیں قتل کرنے سے منع فرما دیا اور فرمایا: ''تم دو نقطوں والے کالے سیاہ کتے کو مارو کیونکہ وہ شیطان ہے۔''

⑥ اللہ تعالیٰ کی آیات کا علم ہو جانے کے بعد نفسانی خواہشات کی وجہ سے ان سے نکل جانے والے کی مثال کتے کے ساتھ دی گئی ہے:

﴿ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ﴾ [الأعراف:۱۷٦]

بدترین انسان یعنی برے عالم کی مثال کتے کے ساتھ دینے سے اس کی ذلت واضح ہے۔

⑦ اپنے دیے ہوئے عطیے کو واپس لینے والے کی مثال کتے کے ساتھ دی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السُّوْءِ الَّذِیْ يَعُوْدُ فِیْ هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَرْجِعُ فِیْ قَيْئِهِ » [بخاری ، كتاب الهبة و فضلها: باب لا يحل لأحد ان يرجع فی هبته و صدقته (۲٦۲۲)]

'' بری مثال ہمارے لیے نہیں، جو شخص اپنا ہبہ واپس لیتا ہے وہ کتے کی طرح ہے جو اپنی قے دوبارہ چاٹ لیتا ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنے آپ کو کتا قرار دیتے ہیں خواہ وہ شیخ جیلانی کے کتے بنیں یا مدینہ کے کتے (سگ مدینہ) یا رسول اللہ ﷺ کے کتے ، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس جانور کے ساتھ نفرت کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اس چیز کے ساتھ خود کو تشبیہ دینا کیسے درست ہو سکتا ہے جس سے نبی کریم ﷺ سخت نفرت رکھتے ہوں؟

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق بڑے بہترین انداز میں فرمائی اور اسے اپنی تمام مخلوقات پر شرف عطا کیا، عقل و شعور کے ذریعے جانوروں سے ممتاز کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ وَ حَمَلْنَاهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ رَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَ فَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾ [الإسراء:۷۰]

'' یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی اور خشکی و تری میں انھیں سواری دی اور ہم نے انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور انھیں بہت سی مخلوقات پر فضیلت و برتری عنایت کی۔''

جس خالق نے انسان کو سب سے بہترین تخلیق کیا اور اسے اپنی دیگر مخلوقات پر برتری و منزلت اور اعلیٰ مقام عطا کیا، اگر انسان اس کا صحیح شکر گزار بندہ بن کر رہتا ہے تو وہ کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس انسان کی مثال کتے سے دی جائے۔ کیونکہ کتا نجس و پلید ہے۔ لہٰذا انسان کو اس نجس اور پلید جانور کی مثال نہیں بننا چاہیے اور نہ اپنے آپ کو مدینے کا کتا کہنا چاہیے۔ یہ تمام احکامات آپ ﷺ کے مدینہ سمیت ہر جگہ کے کتوں سے متعلق ہیں۔

جو لوگ اپنے آپ کو سگ مدینہ کہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نسبت انتہائی تذلل و عاجزی پر مبنی ہے، حالانکہ یہ شیطانی فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ اگر یہ نسبت تذلل و عاجزی و انکسار والی ہوتی تو صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم)، تابعین عظام اور تبع تابعین (رحمہم اللہ) اس سے محروم نہ ہوتے۔ خیر القرون کے لوگوں میں اس طرح کی نسبت کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ کسی نے اپنے آپ کو مدینے کا کتا کہا ہو۔ یہ نسبت موجودہ دور کے صوفی اور قبر پرست لوگوں ہی میں پائی جاتی ہے اور جو اپنے آپ کو سگ مدینہ کہتے ہیں ان کا دماغ اس قدر مفلوج و ماؤف ہو چکا ہے کہ وہ کتوں کو بھی ولی اور صاحب کرامت بزرگ سمجھنے لگ گئے ہیں۔ جیسا کہ مولوی اشرف علی تھانوی اپنی کتاب ''امداد المشتاق (ص:۱۵۸)'' میں اور حاجی امداد اللہ اپنی کتاب ''شمائم امدادیہ (۷۶/۲) میں لکھتے ہیں:

''جنید بغدادی بیٹھے تھے، ایک کتا سامنے سے گزرا، آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ وہ اس قدر صاحب کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا تو سب کتوں نے اس کے گرد بیٹھ کر مراقبہ کیا۔''

اسی طرح مولوی منظور احمد شاہ اپنی کتاب مدینۃ الرسول (ص:۴۰۸) میں ''مدینۃ الرسول کے سگانِ محترم اور چند یادیں'' کے عنوان کے تحت جماعت علی شاہ کا واقعہ لکھتا ہے:

''آپ اپنے احباب میں مدینۃ الرسول کی کسی گلی میں کھڑے تھے کہ سامنے سے ایک زخمی کتا چیختا ہوا گزرا۔ اس کتے کو کسی نے پتھر مارا تھا۔ سید صاحب اس منظر کو دیکھ کر بے خود ہو گئے۔ اس بے خودی میں سگ طیبہ کو کلاوے میں لے لیا۔ اپنی دستار سے اس کا خون صاف کیا، پھر ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا: ''اے سگ مدینہ! خدارا بارگاہ رسالت میں میری شکایت نہ کر دینا۔'' پھر دیر تک سگ طیبہ کو کلاوے میں لے کر روتے رہے۔''

اسی طرح صفحہ (۴۰۹) پر لکھتا ہے:

''۱۹۶۸ء کی بات ہے، پیر سید حیدر علی شاہ نے مجھے مدینۃ الرسول میں یہ واقعہ سنایا کہ ایک حاضری پر سیدنا نے فرمایا: ''آج مدینۃ الرسول کے درویشوں کی دعوت ہے۔'' دیگیں پکوا دی گئیں، بازار سے نئے برتن منگوا لیے گئے۔ عرض کی گئی: ''حضور! درویشوں کی آمد کا سلسلہ کب شروع ہوگا؟'' فرمایا: ''یہ درویش آئیں گے نہیں، تمھیں ان کے حضور جا کر نذرانہ خود پیش کرنا ہوگا۔'' فرمایا: ''یہ روٹیاں، یہ گوشت مدینہ منورہ کے سگانِ محترم کو پیش کیا جائے۔'' چنانچہ تلاش کر کے حکم کی تعمیل کی گئی۔''

اسی طرح صفحہ (۴۰۹، ۴۱۰) پر ''سگ طیبہ کی نوازش'' کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں:

''ایک حاضری میں مدینہ منورہ سے واپسی کی ساری رات سگانِ مدینہ کی زیارت میں صرف کر دی۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ ان کی قدم بوسی کر کے مدینہ سے رخصت ہوں۔ یہ بھی شوق تھا کہ سگ طیبہ کی آواز بھی ریکارڈ کر لوں۔ ٹیپ لے کر گھومتا رہا۔ کسی سگ نے مجھے اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ جوں ہی کسی سگ طیبہ کے قریب گیا اس نے مجھ سے نفرت کی اور دور چلا گیا۔ سحری کے قریب ایک سگ طیبہ کو سویا ہوا پایا، دور بیٹھ گیا کہ اس کی بیداری پر سلام عرض کروں گا۔ ایک کار کی آواز سے وہ بیدار ہو گیا۔ میں نے قریب جانے کی کوشش کی تو وہ نفرت سے بھاگ گیا۔ میں نے وہیں کھڑے

منت سماجت کی کہ خدا کے لیے قدم بوسی کا موقع دے دو، صبح مدینہ چھوٹ رہا ہے پھر قسمت کی بات ہے۔

بات بنتی ہے میری تیرا بگڑتا ہے کیا

مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میری اس عاجزانہ درخواست پر وہ رک گیا۔ میں قریب ہوا تو قدم بوسی کی، اس کی آواز ٹیپ کی اور صبح کی اذان ہوتے ہی میں وہاں سے چلا تو کم و بیش پچاس قدم سگ طیبہ میرے ساتھ آیا۔ سگ طیبہ کی اس نوازش کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ مجھے قریب جانے کا موقع دیا اور پچاس قدم میرے ساتھ چل کر مجھے شرف بخشا۔''

قارئین کرام! مذکورہ بالا واقعات باحوالہ آپ کے سامنے ذکر کیے ہیں۔ ان سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جو انسان اللہ تعالیٰ کی توحید چھوڑ کر شرک کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے صحیح منہج کو چھوڑ کر بدعات اور رسوم و رواج سے خود کو وابستہ کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے اپنی رحمت اٹھا لیتے ہیں، پھر وہ در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے حتیٰ کہ کتوں کو کلاوے میں لے کر روتا پھرتا ہے۔ کبھی وہ کتوں کو بوسہ دیتا ہے اور کبھی گلیوں میں کتوں کی محبت سے گھومتا ہوا راتیں گزارتا ہے اور کتے کی قدم بوسی اور اس کی آواز ریکارڈ کرنے کے لیے مارا مارا پھرتا ہے۔ کبھی کتوں سے اپنے عشق کا اظہار کرتے ہوئے انھیں درویش بنا دیتا ہے اور کتوں کے دربار میں نذرانہ لے کر پیش ہوتا ہے۔ یہ گندے کام اس آدمی کی قسمت میں ہوتے ہیں جو رحمت ایزدی سے دھتکار دیا جاتا ہے، پھر وہ اپنے آپ کو انسانیت سے خارج کر کے کتا کہنے لگتا ہے۔ کتا خواہ بریلی شریف کا ہو، یا دیوبند کا، مدینہ کا ہو یا مکہ کا، غرض کسی جگہ کا بھی کیوں نہ ہو، اس کے متعلق شریعت مطہرہ کا یہی حکم ہے کہ وہ جس برتن میں منہ ڈال جائے وہ برتن پلید ہو جاتا ہے جہاں موجود ہو وہاں رحمت کا فرشتہ نہیں آتا۔ وہ کتے مدینہ منورہ ہی کے تھے جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے یہ احکامات جاری فرمائے تھے کہ'' کالا کتا شیطان ہے'' اور پھر آپ ﷺ نے ایسے کتوں کو قتل کرنے کا بھی حکم دیا۔ لہٰذا کسی انسان کو یہ لائق نہیں کہ ان تمام احکامات کو جانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کتا کہے۔ اپنے آپ کو کتا کہنا عقل و نقل کے بھی خلاف ہے اور ناجائز و غیر مشروع بھی ہے۔

گھروں میں کتے رکھنا بھی جائز نہیں البتہ تین کاموں کے لیے نبی ﷺ نے کتا رکھنے کی اجازت دی ہے، مویشیوں کی حفاظت کے لیے، شکار کے لیے یا کھیتی کی حفاظت کے لیے۔ ان کے علاوہ اگر کوئی شخص کتا رکھے گا تو روزانہ اس کے اجر سے ایک قیراط کی کمی ہو جائے گی۔ قیراط اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر پیمانہ ہے۔ جنازے میں شامل ہونے کے ثواب والی حدیث میں مذکور قیراط کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے۔'' مسلم میں ہے:

« عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا اِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ اَوْ صَيْدٍ اَوْ زَرْعٍ انْتَقَصَ مِنْ اَجْرِهٖ كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطٌ » [مسلم ، كتاب المساقاة: باب الأمر بقتل الكلاب و بيان نسخه و بيان تحريم اقتنائها إلا لصيد أو زرع أو ماشية و نحو ذلك (١٥٧٥)]

'' سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مویشیوں کے لیے، شکار کے لیے یا کھیتی کے لیے

(رکھے گئے) کتے کے علاوہ کسی نے کوئی کتا رکھا تو اس کے اجر سے روزانہ ایک قیراط کم ہو جائے گا۔"
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صرف گھر کی حفاظت کے لیے کتا رکھنا جائز نہیں۔ بعض لوگ قیاس کے ذریعے اسے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس صورت میں تین قسم کے کتوں کو مستثنیٰ کرنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا۔

چوسر کھیلنا کیسا ہے؟

سوال کیا چوسر کھیلنا شرعاً جائز و درست ہے؟

جواب چوسر کھیلنا حرام ہے، بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس آدمی نے چوسر کا کھیل کھیلا گویا اس نے اپنے ہاتھ خنزیر کے گوشت اور خون سے رنگ لیے۔" [مسلم، کتاب الشعر: باب تحريم اللعب بالنرد شير (۲۲۶۰)]

اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس شخص نے چوسر کا کھیل کھیلا اس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔" [ابو داؤد، كتاب الأدب: باب النهي عن اللعب بالنرد (۴۹۳۸)]

یہ دونوں احادیث ہر طرح کا چوسر کھیل کھیلنے والے پر منطبق ہوتی ہیں، خواہ اس میں جوئے کا عنصر شامل ہو یا نہ ہو لہٰذا ہمارے ہاں شہروں اور گلی محلوں کے اندر جو چوسر وغیرہ کے کھیل کھیلے جاتے ہیں یہ شیطانی کام ہیں، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر مشتمل ہونے کی بنا پر حرام ہیں۔

عورت کے لیے چہرے کے بال اکھیڑنا

سوال کیا عورت خوبصورتی کے لیے چہرے کے بال اکھاڑ سکتی ہے؟ قرآن و حدیث کی رو سے مسئلہ کی وضاحت فرما دیں۔

جواب کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے چہرے کے بال اکھیڑے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خلق کو بدلنا ہے اور شیطانی عمل ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کام کرنے والی عورت پر لعنت فرمائی ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

« عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَ الْمُسْتَوْشِمَاتِ وَ الْمُتَنَمِّصَاتِ وَ الْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ فَبَلَغَ ذٰلِكَ امْرَأَةً مِنْ بَنِيْ اَسَدٍ يُقَالُ لَهَا أُمُّ يَعْقُوْبَ فَجَاءَ تْ فَقَالَتْ اِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِيْ اَنَّكَ لَعَنْتَ كَيْتَ وَ كَيْتَ ؟ فَقَالَ وَ مَا لِيْ لَا اَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ مَنْ هُوَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ ؟ فَقَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ اللَّوْحَيْنِ مَا وَجَدْتُّ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَالَ لَئِنْ قَرَأْتِيْهِ لَوَجَدْتِّيْهِ اَمَا قَرَأْتِ: ﴿وَ مَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ قَالَتْ بَلٰى قَالَ فَاِنَّهُ قَدْ نَهٰى عَنْهُ قَالَتْ فَاِنِّيْ اَرٰى اَهْلَكَ

يَفْعَلُوْنَهُ قَالَ فَاذْهَبِيْ فَانْظُرِيْ فَذَهَبَتْ فَنَظَرَتْ فَلَمْ تَرَ مِنْ حَاجَتِهَا شَيْئًا فَقَالَ لَوْ كَانَتْ كَذٰلِكَ مَا جَامَعْتُهَا » [بخاری، کتاب التفسير: باب ﴿ وَ مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ﴾ (٤٨٨٦)، (٥٩٣١)]

''سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے گودنے والی اور گدوانے والی اور چہرے کے بال اکھیڑنے والی، خوبصورتی کے لیے دانتوں پر سوہن کرنے والی اور اللہ کی تخلیق میں تغیر کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔'' بنو اسد کی ام یعقوب نامی عورت کو یہ بات پہنچی تو وہ آئی اور اس نے کہا: '' مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ نے اس طرح لعنت کی ہے؟'' تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو اور وہ کتاب اللہ میں بھی موجود ہو؟'' اس نے کہا: ''میں نے پورا قرآن پڑھا ہے مگر اس میں یہ چیز مجھے نہیں ملی۔'' تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو تمھیں یہ بات مل جاتی۔ کیا تو نے یہ نہیں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز تمھیں دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں، اس سے باز آجاؤ۔'' تو اس نے کہا: ''کیوں نہیں؟'' تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام سے روکا ہے۔'' تو اس عورت نے کہا: ''تمھاری بیوی میں بھی یہ بات موجود ہے۔'' انھوں نے کہا: ''جاؤ اور دیکھو۔'' وہ گئی اور اسے ان کی بیوی میں ایسی کوئی بات نظر نہ آئی پھر واپس آئی تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر اس میں ایسا عمل موجود ہوتا تو میں اس کے ساتھ مجامعت نہ کرتا۔''

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے چہرے کے بال اکھیڑے یا دیگر فیشن وغیرہ کیلئے دانت رگڑ کر خوبصورت کرے یا چہرے اور باقی جسم پر نیل وغیرہ بھر کر پھول بنائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے فعل پر لعنت کی ہے اور جس فعل پر لعنت ہو وہ حرام ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسا عمل اپنانا بالکل ناجائز وحرام ہے۔

بیوی کے ساتھ جھوٹ بولنا

سوال کیا کسی صحیح حدیث سے پتا چلتا ہے کہ مرد اپنی اہلیہ کے ساتھ جھوٹ بول سکتا ہے؟ بسا اوقات گھر میں جھگڑا ہو جاتا ہے، اسے سلجھانے کے لیے آدمی کوئی جھوٹی بات کہہ ڈالتا ہے، کیا اس پر گناہ تو نہیں ہوگا؟

جواب ام کلثوم بنت عقبہ مہاجرہ صحابیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: آپ نے فرمایا:

« لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ فَيَنْمِيْ خَيْرًا أَوْ يَقُوْلُ خَيْرًا؟ وَقَالَتْ وَلَمْ أَسْمَعْهُ يُرَخِّصُ فِيْ شَيْءٍ مِنَ الْكَذِبِ مِمَّا يَقُوْلُ النَّاسُ إِلَّا فِيْ ثَلَاثٍ الْحَرْبُ وَالْإِصْلَاحُ بَيْنَ النَّاسِ وَحَدِيْثُ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ وَحَدِيْثُ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا »

[السنن الكبرى للنسائی (٨/٣٦، ٨٥٨٨) واللفظ له صحيح البخاری، کتاب الصلح :باب ليس الكاذب

الذی یصلح بین الناس (٢٦٩٢) الادب المفرد (٣٨٥) صحیح مسلم (٢٦٠٥) سنن أبی (٤٩٢٠، ٤٩٢١) سنن الترمذی (١٩٣٨)]

''وہ آدمی کذاب نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح کراتا ہے، وہ خیر کی بات بڑھاتا یا کہتا ہے: ام کلثوم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''میں نے کسی چیز کے بارے میں جھوٹ کی رخصت دیتے ہوئے آپ کو نہیں سنا جو لوگ کہتے ہیں سوائے تین مواقع پر: جنگ میں، لوگوں کے درمیان صلح کرانے میں، آدمی کا اپنی بیوی سے اور بیوی کا اپنے شوہر سے بات کرنا۔''

اسلام میں رشتہ ازدواج کی بڑی اہمیت ہے اور حتی الوسع اسے برقرار رکھنا چاہیے اور خوشگوار زندگی گزارنے کی کاوش وکوشش کرنی چاہیے، بسا اوقات شیطان اس مقدس رشتے میں دراڑ ڈال دیتا ہے اور شوہر و بیوی کو جدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ پاک نے شریعت میں اس رشتہ کو بحال رکھنے کے لیے مرد و زن ہر دو کو رخصت دی کہ وہ اپنے زندگی کے ہم سفر کو راضی رکھے خواہ جھوٹ ہی بولنا پڑ جائے، صلح وصفائی اور امن و آشتی کو رواج دیں۔ اس موقع پر جھوٹ کو مباح تو قرار دے دیا لیکن اس بابرکت رشتے کا انقطاع گوارا نہیں کیا۔

قرآن اور دوسری الہامی کتابوں کو زمین پر رکھنا

سوال کیا قرآن مجید یا دیگر آسمانی واسلامی کتب کو زمین پر رکھ دینا جائز ہے؟ بعض لوگ اس بات کی پروا نہیں کرتے، جہاں خود بیٹھے ہوتے ہیں وہاں زمین پر قرآن پاک وغیرہ رکھ دیتے ہیں، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب قرآن پاک ہو یا کوئی بھی اسلامی و دینی کتاب، اس کا ادب واحترام کرنا ہمارے اوپر لازم ہے۔ ہمیں ان کا ادب کرتے ہوئے بلند رکھنا چاہیے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ آیا، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وادی قف کی طرف دعوت دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں مدراس میں چلے گئے۔ انھوں نے کہا: ''اے ابوالقاسم! ہم میں سے ایک مرد نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا ہے، ان کے درمیان فیصلہ کیجیے۔'' انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک تکیہ رکھا، آپ اس پر بیٹھ گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس تورات لاؤ۔'' تورات لائی گئی تو آپ نے اپنے نیچے سے تکیہ نکالا اور اس کے اوپر تورات رکھی، پھر فرمایا: ((آمَنْتُ بِكِ وَبِمَنْ أَنْزَلَكِ)) ''میں تیرے اوپر بھی ایمان لایا اور اس پر بھی جس نے تجھے نازل کیا ہے۔'' پھر فرمایا: ''میرے پاس اپنے سب سے زیادہ علم والے کو لاؤ۔'' ایک نوجوان کو لایا گیا، پھر آگے رجم کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ (سنن أبی داؤد، کتاب الحدود: باب فی رجم الیھودیین (٤٤٤٩)

شیخ الالبانی رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ یہ روایت ہشام بن سعد کی وجہ سے حسن ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوگیا کہ تورات جو آسمانی کتاب تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ادب کرتے ہوئے اسے تکیے پر رکھا۔ قرآن حکیم تو اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان والی کتاب ہے، اس کا ادب کرنا تو بالاولیٰ ضروری ٹھہرا۔ اس لیے قرآن پاک کا ادب کرتے ہوئے اسے زمین نہ رکھا جائے بلکہ اس کو کسی بلند جگہ رکھا جائے تا کہ اس کی توہین سے بچا جاسکے۔

سکول میں گھنٹی بجانا

(سوال) سکول میں پیریڈ بدلنے کیلئے جو گھنٹی بجائی جاتی ہے کیا یہ شرعاً درست ہے؟ شرعی حیثیت واضح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(جواب) اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ سکول کے اوقات معلوم کرنے کے لیے گھنٹی سے کام لینے سے فائدہ ہے مگر مسلمان کے سامنے صرف فائدہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا بھی پابند ہے۔ چاہے اسے کسی چیز میں چاہے کتنا زیادہ فائدہ دکھائی دیتا ہو، اگر اللہ اور اس کے رسول اس سے منع فرما دیں تو وہ حکم عدولی نہیں کرے گا، وقتی نقصان خوش دلی سے گوارا کرے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ﴾ [البقرة: ٢١٩]

''(لوگ) آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہوتا ہے۔''

کتاب اللہ کا اعجاز دیکھیے، شراب اور جوئے کے فوائد سے انکار نہیں کیا، فائدہ تسلیم کر کے بتایا کہ ان کا باعث گناہ ہونا فائدہ اٹھانے میں حائل ہے۔ گھنٹی کا بھی یہی حال ہے۔ بڑی گھنٹی کو عربی میں ناقوس کہتے ہیں، جانوروں کے گلے والی گھنٹی کو جرس کہتے ہیں، اس سے چھوٹی ہو تو اسے جلجل (یعنی گھنگھرو) کہتے ہیں۔ ان کے فوائد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ناقوس وقت کی اطلاع دینے کیلئے بجائی جاتی ہے اور جرس اونٹوں کی قطار میں اس بات سے آگاہ رکھتی ہے کہ آخری اونٹ بھی قطار کے ساتھ موجود ہے، اگر جانور رہٹ یا خراس پر چل رہا ہو تو وہ گھنٹی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصروف کار ہے یا رک گیا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ان کے گناہ ہونے کی جانب بھاری ہے۔ ناقوس سے عیسائیوں سے مشابہت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ » [مسند احمد(٤٩/٢)]

''جو شخص کسی قوم کے ساتھ مشابہت کرے گا وہ انہی سے ہے۔''

مسلمانوں کے لیے وقت کی اطلاع دینے کے لحاظ سے سب سے اہم چیز اذان ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« لَمَّا كَثُرَ النَّاسُ قَالَ ذَكَرُوْا اَنْ يَّعْلَمُوْا وَقْتَ الصَّلَاةِ بِشَيْءٍ يَعْرِفُوْنَهُ فَذَكَرُوْا اَنْ يُّوْرُوْا نَارًا اَوْ يَضْرِبُوْا نَاقُوْسًا فَاُمِرَ بِلَالٌ اَنْ يَّشْفَعَ الْاَذَانَ وَ اَنْ يُّوْتِرَ الْاِقَامَةَ » [بخاری، کتاب الاذان : باب الأذان مثنى مثنى(٦٠٦)]

''جب لوگ زیادہ ہوئے تو انھوں نے اس بات کا ذکر کیا کہ نماز کا وقت کس چیز کے ساتھ معلوم کریں، جسے وہ پہچان لیا کریں تو انھوں نے ذکر کیا کہ آگ کو جلا دیا کریں یا گھنٹی بجا دیا کریں تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ وہ دہری

اذان دیں اور اکہری اقامت کہیں۔“

بخاری میں روایت مختصر ہے۔ ابوالشیخ نے اسے ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

”لوگوں نے کہا: ”اگر ہم گھنٹی بنالیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ تو عیسائیوں کے لیے ہے۔“ انھوں نے کہا: ”اگر ہم بوق (بگل) بنالیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ یہود کے لیے ہے۔“ انھوں نے کہا: ”اگر ہم آگ بلند کر دیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ مجوس کے لیے ہے۔“ [فتح الباری، (تحت الحدیث/۶۰۳)]

اس سے معلوم ہوا کہ وقت کی اطلاع کے لیے اسلام میں گھنٹی، بگل یا آگ کی بجائے انسانی آواز کو اختیار کیا جاتا ہے اور یہی فطرت ہے کیونکہ گھنٹی، بگل یا آگ ہر جگہ اور ہر وقت میسر نہیں آ سکتے۔ عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کے غیر فطری طریقے کو رسول اللہ ﷺ نے ناپسند فرمایا۔

جرس (جانوروں کے گلے والی گھنٹی) اور ناقوس میں یہ فرق ہے کہ جرس خود بخود جانور کی حرکت سے بجتی ہے جب کہ ناقوس بجائی جاتی ہے۔ نغمے کے لحاظ سے دونوں کی آواز ملتی جلتی ہے۔ عیسائیوں کی مشابہت کے علاوہ ناقوس (بڑی گھنٹی) کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ گھنٹی کی آواز کا نغمہ ہے جو ناقوس اور جرس دونوں میں موجود ہے اور مزامیر (باجوں) سے ملتا جلتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَلْجَرَسُ مَزَامِيرُ الشَّيْطَانِ » [مسلم، كتاب اللباس: باب كراهة الكلب والجرس فى السفر (۲۱۱۴)]

”گھنٹی شیطان کے باجے ہیں۔“

گھنٹی شیطان کی پسندیدہ ہونے کی وجہ سے فرشتوں کو اس سے اتنی نفرت ہے کہ رفقاء کے جس قافلے یا مجلس میں وہ موجود ہو (رحمت کے) فرشتے ان کے ساتھ نہیں رہتے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِكَةُ رُفْقَةً فِيهَا كَلْبٌ وَ لَا جَرَسٌ » [مسلم، كتاب اللباس: باب كراهة الكلب والجرس فى السفر (۲۱۱۳)]

”فرشتے ان مسافروں کے ساتھ نہیں رہتے جن کے ساتھ کتا یا گھنٹی ہو۔“

یہ چیزیں ایسی ناپاک ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں موجود ہوں تو رحمت کے فرشتے وہاں آنے سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَصْبَحَ يَوْمًا وَاجِمًا فَقَالَتْ مَيْمُوْنَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! لَقَدِ اسْتَنْكَرْتُ هَيْئَتَكَ مُنْذُ الْيَوْمِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِنَّ جِبْرِيْلَ كَانَ وَعَدَنِيْ اَنْ يَّلْقَانِيَ اللَّيْلَةَ فَلَمْ يَلْقَنِيْ اَمَ وَاللّٰهِ مَا اَخْلَفَنِيْ قَالَ فَظَلَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَوْمَهُ ذٰلِكَ عَلٰى ذٰلِكَ ثُمَّ وَقَعَ فِيْ نَفْسِهِ جَرْوُ كَلْبٍ تَحْتَ فُسْطَاطٍ لَنَا فَاَمَرَ بِهِ فَاُخْرِجَ ثُمَّ

اَخَذَ بِيَدِهِ مَاءً فَنَضَحَ مَكَانَهُ فَلَمَّا اَمْسٰى لَقِيَهُ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ لَهُ قَدْ كُنْتَ وَعَدْتَّنِیْ اَنْ تَلْقَانِیْ الْبَارِحَةَ قَالَ اَجَلْ وَ لٰكِنَّا لَا نَدْخُلُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَ لَا صُوْرَةٌ» [مسلم ، كتاب اللباس: باب تحريم تصوير صورة الحيوان(٢١٠٥)]

"ایک دن رسول اللہ ﷺ نے اس حال میں صبح کی کہ آپ ﷺ غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے، خاموش تھے۔ فرمانے لگے: "جبرائیل علیہ السلام نے آج رات مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ نہیں ملے۔ اللہ کی قسم! انھوں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔" پھر آپ ﷺ کے دل میں کتے کے ایک بچے کا خیال آیا جو آپ کی چارپائی کے نیچے تھا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا تو اسے نکال دیا گیا، پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس جگہ پانی چھڑکا۔ شام ہوئی تو جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ سے ملے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "آپ نے مجھ سے کل رات ملنے کا وعدہ کیا تھا؟" انھوں نے فرمایا: "ہاں! مگر ہم اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔"

اب آپ کفار کی مرغوب و محبوب چیز کو دیکھیں تو اس میں کتا، تصویر اور جرس نمایاں نظر آئیں گی، ان کی یہ کوشش ہے کہ دنیا بھر میں مسلمان ہو یا غیر مسلم، کوئی بھی گھر ان سے خالی نہ رہے حتیٰ کہ ان کے بنائے ہوئے کلاک ہمارے گھروں اور ہماری مساجد میں آویزاں ہیں جن میں وقت بتانے کے لیے گھنٹی کی آواز رکھی گئی ہے۔ بلکہ گھنٹی کے مزامیری نغمے کو کم سمجھ کر موسیقی کی آواز دو گھنٹیوں کے درمیان بڑھا دی گئی ہے۔ گھروں کے دروازے پر لگائی جانے والی گھنٹی کی آواز بھی عموماً ناقوس یا جرس سے ملتی جلتی ہے۔ اب اگر مسلمان رسول اللہ ﷺ کے فرمان پر چلنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے گھروں سے، اپنی مسجدوں سے، اپنے مدارس اور اپنی سواریوں سے شیطان کے ان مزامیر کو دور کرنا ہوگا، کلاکوں سے وہ پرزہ نکالنا ہوگا جس سے گھنٹی کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم پیریڈ بدلنے کے لیے یا وقت کی اطلاع دینے کے لیے کیا کریں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے انسانی آواز استعمال کی جائے۔ اس کے لیے سپیکر استعمال ہوتا ہے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ کونسا پیریڈ ہے؟ یا پھر ہم الیکٹرانک گھنٹی کی جگہ وہ آلہ بھی استعمال کر سکتے ہیں جس میں انسانی آواز بھری ہوئی ہو۔ آج کل بہت سے ٹائم پیس اور گھڑیوں میں اذان یا اقامت یا دوسری قسم کی آوازیں بھری گئی ہیں۔ گھروں میں لگائے جانے والے آلات میں گھنٹی کی آواز کی جگہ "السلام علیکم" وغیرہ کے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ اسی طرح پیریڈ بدلنے کے لیے الفاظ بھی بھرے جا سکتے ہیں۔ الدعوۃ ماڈل سکولز سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ الیکٹرانک سائنس کا یہ معمولی سا کام کرنے سے عاجز نہیں رہیں گے۔ ہمارے مجاہد بھائی جو باقاعدہ سائنس کے تعلیم یافتہ بھی ہیں، انھوں نے اپنی گاڑیوں میں ایسے پرزے لگائے ہیں کہ دروازہ کھولیں تو السلام علیکم اور اس قسم کے فقرات کی آواز خود بخود نکلتی ہے اور گھروں میں بھی اس قسم کی اطلاع دینے والے آلات لگائے ہیں۔

اگر انسانی آواز والا آلہ مشکل ہو تو ایسا آلہ استعمال کریں جس میں آواز تو ہو مگر وہ ناقوس یا جرس یا موسیقی سے نہ ملتی ہو

تا کہ عیسائیوں سے مشابہت اور شیطان کے ماحول سے اجتناب ہو سکے۔ الارم کے طور پر مرغ کی آواز بھی استعمال ہو سکتی ہے بلکہ ہو رہی ہے۔

آخر میں گزارش ہے کہ جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ ہماری نیت یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں میں بجنے والی گھنٹیوں سے مشابہت نہیں ہے، ویسے بھی بجانے کا انداز ان سے یکسر مختلف ہے لہٰذا اس کے بارے میں اجتہاد سے آگاہ فرمائیں۔

تو گزارش ہے کہ ہر کام کے درست ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک تو یہ کہ نیت درست ہو دوسرا وہ کام فی نفسہ درست ہو۔ اگر کوئی کام فی نفسہ غلط ہے تو نیت جتنی مرضی درست کر لیں وہ کام درست نہیں ہو گا۔ امید ہے کہ ان کے سامنے اس کے دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

گھنٹی بجانا فی نفسہ غلط کام ہے۔ یہ شیطان کا باجا ہے۔ جس گھر میں یہ ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ اب اگر پیریڈ بتانے کا تھوڑا سا فائدہ حاصل ہو بھی تو کیا فائدہ؟ جب کہ ہم نے شیطان کو خوش کیا اور فرشتوں کو گھر میں آنے سے روک دیا۔ اجتہاد کے متعلق یاد رہے کہ اجتہاد تو وہاں ہوتا ہے جہاں ہمیں واضح حکم معلوم نہ ہو اور وہ بھی اس وقت تک جائز ہے جب تک ہمیں قرآن و حدیث سے اس کا واضح حکم معلوم نہ ہو جائے۔ اس کے بعد نہ اجتہاد کرنا جائز ہے اور نہ کسی کے اجتہاد کے پیچھے چلنا۔

تقریبات میں طبلے بجانا اور ترانے پڑھنا

سوال تقریبات وغیرہ کے موقعوں پر ہم فحش گوئی سے پاک ترانوں کے ساتھ طبلے استعمال کرتے ہیں، اس میں کئی کئی راتیں صرف ہو جاتی ہیں، کیا ہمارا یہ عمل قابل انکار ہے؟

جواب ہمیں کوئی ایسی دلیل معلوم نہیں جس سے طبلوں کا استعمال جائز ثابت ہو، اس کے برخلاف صحیح حدیثوں کے ظاہری مفہوم سے اس کی حرمت ثابت ہوتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے عام آلات طرب، بانسری و سارنگی وغیرہ حرام ہیں۔ اس قسم کی حدیثوں میں سے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور گانے بجانے کو حلال جانیں گے۔"

[صحيح بخاری، كتاب الأشربة: باب ما جاء فيمن يستحل الخمر و يسمية بغير اسمة (٥٥٩٠)]

اس حدیث میں لفظ "معازف" استعمال ہوا ہے اور لفظ "معازف" ہر قسم کے گانوں اور تمام آلات طرب کو شامل ہے۔

اپریل فول

سوال اپریل فول کی حیثیت قرآن اور حدیث کی رو سے واضح فرما دیں۔ جزاکم اللہ خیراً

جواب اپریل فول کا شرعی حکم معلوم کرنے سے پہلے اس کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ اپریل انگریزی سال کا چوتھا مہینا ہے۔

یہ لفظ لاطینی زبان کے لفظ (Aprilis) اپریلیس یا (Aperire) اپیریر سے ماخوذ ہے۔ یہ لفظ موسم بہار کے آغاز، پھولوں کے کھلنے اور نئی کونپلیں پھوٹنے کے موسم کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور فول (Fool) بے وقوفی، حماقت اور جھوٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو اپریل فول کا مفہوم یہ ہے کہ اپریل کی یکم تاریخ کو وہ لوگ جھوٹ بول کر استہزاء و مذاق کیا کرتے تھے۔ اس کی مختلف توجیہات کی جاتی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ فرانس میں سال کی ابتدا جنوری کی بجائے اپریل سے ہوتی تھی۔ جب فرانس میں تاریخی کیلنڈر تبدیل کیا گیا اور ۱۵۶۴ء میں نیا کیلنڈر جاری کیا گیا تو جو لوگ اس نئے کیلنڈر کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی مخالفت کرتے تھے، انھیں طعن و تشنیع، مذاق اور استہزاء کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور ان کے ساتھ انتہائی برے طریقے سے پیش آیا جاتا تھا۔

اپریل فول کا ذکر سب سے پہلے ڈریک نیوز لیٹر (Drak news letter) اخبار میں ملتا ہے۔ مذکورہ اخبار نے دو اپریل ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں لکھا کہ کچھ لوگوں نے یکم اپریل کو لندن ٹاور میں شیروں کے غسل کا عملی مشاہدہ کروانے کا اعلان کیا۔ یکم اپریل کو یورپ میں ہونے والے مشہور واقعات میں سے اہم اور مشہور واقعہ وہ ہے جو انگریزی اخبار ''الفینج سٹار'' نے ۳۱ مارچ ۱۸۴۶ء کو اعلان کیا کہ یکم اپریل کو اسلنجون (جو ایک شہر کا نام ہے) کے زراعی فارم میں گدھوں کی عام نمائش اور میلا ہوگا۔ لوگ انتہائی شوق سے جمع ہوئے اور نمائش کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ انتظار میں تھک کر چور ہو گئے تو انھوں نے پوچھنا شروع کیا کہ میلا کب شروع ہوگا؟ مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ آخر کار انھیں بتایا گیا کہ جو لوگ نمائش دیکھنے میلے میں آئے ہیں وہ خود ہی گدھے ہیں۔ [ماخوذ از ''اپریل فول کی تاریخی و شرعی حیثیت'']

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ اپریل فول یہودیوں اور عیسائیوں کی جاری کردہ قبیح رسم ہے جس میں جھوٹ پر مبنی خبریں دے کر لوگوں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات جھوٹی خبر دینے سے معاشرے میں بگاڑ و فساد حتیٰ کہ قتل و غارت کی نوبت آجاتی ہے اور جھوٹ قرآن و سنت کی رو سے قطعی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴾ [البقرة: ۱۰]

''ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کا وصف جھوٹ بولنا ذکر کیا ہے اور اس پر انھیں دردناک عذاب کی بشارت دی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَ مَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَ اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ » [بخاری، كتاب الايمان: باب علامات المنافق (۳٤)]

''سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس آدمی میں چار خصلتیں ہوں وہ خالص

منافق ہے اور جس میں ان چاروں میں سے ایک خصلت ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے:

① جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ ② جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔
③ جب عہد کرے تو عہد شکنی کرے۔ ④ اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ کرے۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ بولنا شرعاً ناجائز وحرام ہے اور نفاق کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِىْ اِلَى الْبِرِّ وَ اِنَّ الْبِرَّ يَهْدِىْ اِلَى الْجَنَّةِ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتّٰى يَكُوْنَ صِدِّيْقًا وَ اِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِىْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَ اِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِىْ اِلَى النَّارِ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا » [بخاري ، كتاب الأدب:باب قول الله تعالىٰ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ و ما ينهى عن الكذب (٦٠٩٤)، مسلم ، كتاب البر والصلة : باب قبح الكذب و حسن الصدق و فضله (٢٦٠٧) ، مسند احمد(٣٩٣/١)]

''یقیناً سچ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور بے شک آدمی سچ بولتا رہتا ہے حتیٰ کہ صدیق بن جاتا ہے اور یقیناً جھوٹ برائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور برائی آگ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور بے شک آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ کے ہاں کذاب لکھا جاتا ہے۔''

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« رَاَيْتُ رَجُلَيْنِ اَتَيَانِىْ قَالَا الَّذِىْ رَاَيْتَهٗ يُشَقُّ شِدْقُهٗ فَكَذَّابٌ يَكْذِبُ بِالْكَذْبَةِ تُحْمَلُ عَنْهُ حَتّٰى تَبْلُغَ الْاٰفَاقَ فَيُصْنَعُ بِهٖ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ »[بخاري، كتاب الأدب : باب قول الله تعالىٰ:﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ......﴾ (٦٠٩٦)]

''میں نے گزشتہ رات خواب میں دو آدمیوں (فرشتوں) کو دیکھا، وہ میرے پاس آئے، انھوں نے کہا: ''جس شخص کو تم نے دیکھا کہ اس کے جبڑے چیرے جا رہے تھے، وہ دنیا میں بہت جھوٹ بولنے والا تھا، جو جھوٹ بات کہہ دیتا، سارے ملک میں پھیل جاتی۔ قیامت تک اس کو یہی سزا ملتی رہے گی۔''

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« دَعْ مَا يُرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيْبُكَ فَاِنَّ الصِّدْقَ طُمَانِيْنَةٌ وَ اِنَّ الْكِذْبَ رِيْبَةٌ »[ترمذي، كتاب صفة القيامة: باب (٢٥١٨)، نسائي ، كتاب الأشربة(٥٧١٤)، مسند ابى يعلى(٦٧٦٢/١٢)، حلية الأولياء (٢٦٤/٨)، بيهقي (٣٣٥/٥)، مسند طيالسي(١٢٩١)]

''مشکوک بات کو ترک کر کے غیر مشکوک کو اختیار کر، یقیناً سچائی میں اطمینان ہے اور جھوٹ میں بے سکونی ہے۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ : إِمَامٌ كَذَّابٌ وَ عَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ وَ الشَّيْخُ الزَّانِيُ »[مسلم، كتاب الإيمان: باب بيان غلظ تحريم إسبال الإزار (١٠٧)، مسند ابی يعلى(١١٩٧/١١)، مسند ابی عوانة(٤٠/١)، بيهقی (١٦١/٨)، مسند احمد(٤٨٠/٢)، نسائی (٨٦/٥)]

”تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ کلام نہیں کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف نظر رحمت ہی کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے: جھوٹا حکمران، تنگ دست متکبر اور بوڑھا بدکار۔“

ان صحیح احادیث سے جھوٹ بولنے کی مذمت معلوم ہوئی کہ جھوٹا آدمی جب ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا ہے تو اللہ کے ہاں کذاب لکھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جھوٹے شخص کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا بھی نہیں اور جھوٹ سے اطمینان بھی نصیب نہیں ہوتا بلکہ بے سکونی اور تردد رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر مباہلہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ﴾ [آل عمران:٦١]

”ہم جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔“

علاوہ ازیں سابقہ اقوام کی رذیل صفات میں سے جھوٹ کا ذکر قرآن مجید نے بالخصوص کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ بولنا شرعاً حرام ہے اور اپریل فول کی بنیاد ہی جھوٹ ہے، لہٰذا یہ شرعاً بالکل حرام ہے۔ نیز یہ یہود و نصاریٰ کی قبیح عادات میں سے ایک عادت ہے جسے اپنانا یہود کی تقلید اور ان کے ساتھ مشابہت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہود و نصاریٰ کے ساتھ مشابہت سے کئی مواقع پر منع فرمایا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« وَ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ » [مسند احمد(٤٩/٢)]

”جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴾[البقرة: ١٢٠]

”یہودی اور عیسائی آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ آپ ان کے راستے کی پیروی کر لیں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر اللہ کی طرف سے علم آ جانے کے بعد آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں آپ کا کوئی کارساز اور مددگار نہیں آ سکے گا۔“

مندرجہ بالا آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ شریعت اسلامیہ میں جھوٹ بولنا حرام ہے اور یہ یہود و نصاریٰ کا طریقہ و راستہ ہے۔ لہٰذا اپریل فول شرعاً حرام ہے اور یہود و نصاریٰ کی عادات قبیحہ اور بری

رسم سے ہے۔ اس پر چلنا یہود و نصاریٰ کے طرز کو اپنانا ہے، جو کسی بھی مسلمان کے لیے درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ اخلاق رذیلہ اور عادات قبیحہ سے ہر مسلمان مرد و زن اور چھوٹے بڑے کو محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

ماتم کا شرعی حکم

(سوال) ہمارے معاشرے میں یہ رواج سا بن چکا ہے کہ محرم جو اسلامی سال کا سرِ آغاز ہے اس کی ابتدا رونے پیٹنے اور ماتم کرنے سے ہوتی ہے جس کی مثال کسی اور قوم میں نہیں ملتی۔ ازراہِ کرم اس کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرما دیں۔

(جواب) اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مصیبت کے وقت صبر کی تلقین کی ہے۔ گریبان چاک کرنا، سینہ کوبی کرنا وغیرہ صبر کے خلاف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [البقرة: ١٥٣]

"اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

انسان کو احکام شریعت پر عمل کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں اور مصائب و آلام برداشت کرنے پڑتے ہیں، صبر و صلاۃ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہترین معاون ہیں، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ مومن کے لیے ہر حال میں بہتری ہے، تکلیف کی حالت میں صبر کرتا ہے اور خوشحالی میں شکر گزار رہتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے جہاد کے احکامات اور مومنین کی آزمائش کا ذکر کیا ہے۔

﴿ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٥٤۔١٥٦]

"جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں انھیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے اور البتہ ہم آزمائیں گے تمھیں کسی ایک چیز کے ساتھ ڈر سے اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور صبر کرے والوں کو خوشخبری سنا دیجیے، جب انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" کہتے ہیں۔"

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ مومن آدمی کو اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے آزماتے ہیں، کبھی خوف اور ڈر کے ذریعے، کبھی جانوں اور مالوں کی کمی کے ذریعے اور کبھی پھلوں کے نقصانات سے۔ ایمان دار آدمی کو جب ان میں سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بے صبری نہیں کرتا بلکہ صبر کے ساتھ ان مصائب کو برداشت کرتا ہے۔ جو لوگ مصیبت یا پریشانی دیکھ کر بے صبری کریں اور واویلا مچائیں، گریبان چاک کریں، بال نوچیں وہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق امت محمد (ﷺ) سے

نہیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَ شَقَّ الْجُيُوْبَ وَ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ » [بخاری ، کتاب الجنائز: باب ليس منا من ضرب الخدود (۱۲۹۷)]

''جس شخص نے رخسار پیٹے اور گریبان چاک کیا اور جاہلیت کے واویلے کی طرح واویلا کیا وہ ہم میں سے نہیں۔''

عشرہ محرم الحرام میں جو لوگ سیدنا علی، سیدنا حسین اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہم کا نام لے کر گلی کوچوں میں نکلتے ہیں اور گریبان چاک کرتے ہیں، سینہ کوبی کرتے ہیں، ان کا یہ عمل قرآن و سنت کے خلاف ہونے کے علاوہ ائمہ اہل بیت اور مجتہدین فقہ جعفریہ کے فتاویٰ کے بھی خلاف ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق یہ قبیح عمل ۳۵۲ھ محرم الحرام میں بغداد میں معز الدولہ شیعہ کے حکم سے جاری ہوا۔ اس سے قبل اس عمل قبیح کا نام و نشان نہیں ملتا۔ امام ابن اثیر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''عشرہ محرم الحرام میں اس قبیح رسم کا رواج بغداد میں معز الدولہ شیعہ سے ہوا، جس نے دس محرم الحرام ۳۵۲ھ کو حکم دیا کہ دکانیں بند کر دی جائیں، بازار اور خرید و فروخت کا کام روک دیا جائے اور لوگ نوحہ کریں، مکمل کالا لباس پہنیں، عورتیں پراگندہ ہو کر گریبان چاک کریں، پیٹتی ہوئی شہر کا چکر لگائیں۔'' [تاریخ ابن اثیر (ص/۱۹۷)]

اب ہم فقہ جعفریہ کی معتبر کتاب سے چند روایات درج کرتے ہیں:

" عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ الصَّبْرَ وَالْبَلَاءَ لَيَأْتِيَانِ اِلَى الْمُؤْمِنِ فَيَأْتِيْهِ الْبَلَاءُ وَ هُوَ صَبُوْرٌ وَ اِنَّ الْجَزَعَ وَالْبَلَاءَ لَيَأْتِيَانِ اِلَى الْكَافِرِ فَيَأْتِيْهِ الْبَلَاءُ وَ هُوَ جَزُوْعٌ "[فروع کافی، کتاب الجنائز (۱۳۱/۱)]

''امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: ''یقیناً صبر اور آزمائش دونوں مومن پر آتے ہیں۔ مومن پر جب آزمائش آتی ہے تو وہ صبر کرنے والا ہوتا ہے۔ بے صبری اور آزمائش دونوں کافر پر آتے ہیں، جب اس پر آزمائش آتی ہے تو وہ بے صبری کرتا ہے۔''

امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے اس فتوے سے معلوم ہوا کہ صبر کرنے والا مومن ہے اور جو بے صبری کرتا ہے وہ مومن نہیں ہے۔

ایک اور روایت میں ہے:

« قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لِفَاطِمَةَ اِذَا اَنَا مِتُّ فَلَا تَخْمُشِیْ عَلَیَّ وَجْهًا وَ لَا تُرْخِیْ عَلَیَّ شَعْرًا وَ لَا تُنَادِیْ بِالْوَيْلِ وَ لَا تُقِيْمِیْ عَلَیَّ نَائِحَةً » [فروع کافی ، کتاب النکاح (ص/۲۲۸)]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''جب میں مر جاؤں تو مجھ پر چہرہ نہ نوچنا اور نہ مجھ پر اپنے بال بکھیرنا اور نہ واویلا کرنا اور نہ مجھ پر نوحہ کرنا۔''

" قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا يَنْبَغِیْ الصِّيَاحُ عَلَى الْمَيِّتِ وَ لَا شَقُّ الثِّيَابِ" [فروع کافی (۱۸۸/۱)]

''امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا: ''میت پر چیخ پکار اور کپڑے پھاڑنا جائز نہیں۔''

امام باقر رحمہ اللہ نے فرمایا: '' جس نے قبر کی تجدید کی یا کوئی شبیہ بنائی وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔'' [من لا یحضرہ الفقیہ : باب النوادر]

« قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلْطِمَنَّ خَدًّا وَ لَا تَخْمِشَنَّ وَجْهًا وَ لَا تَنْتِفَنَّ شَعْرًا وَ لَا تَشْقُقْنَ جَيْبًا وَ لَا تُسَوِّدَنَّ ثَوْبًا وَ لَا تَدْعِيْنَ بِالْوَيْلِ» [فروع کافی، کتاب النکاح (ص/۲۲۸)]

'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رخسار ہرگز نہ پیٹنا اور نہ چہرہ نوچنا اور نہ بال بکھیرنا اور نہ گریبان چاک کرنا اور نہ کپڑے سیاہ کرنا اور نہ واویلا کرنا۔''

مندرجہ بالا فقہ جعفریہ کی پانچ روایات سے معلوم ہوا کہ فقہ جعفریہ میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، امام باقر اور امام جعفر صادق وغیرہ سے روایات موجود ہیں جو واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مصیبت کے وقت بال بکھیرنا، چہرہ پیٹنا، سینہ کوبی کرنا، واویلا کرنا، مرثیے پڑھنا، شبیہیں بنانا، قبروں کی تجدید کرنا ناجائز اور حرام عمل ہے۔ لہٰذا پنج تن کا نعرہ لگانے والوں کو مذکورہ بالا فقہ جعفریہ کے پانچ دلائل کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے اور اس کی خلاف ورزی سے بچنا چاہیے۔

غمی کے موقع پر گریبان پھاڑنا یا سینہ پیٹنا

سوال کیا کسی غمی کے موقع پر اپنے گریبان کو پھاڑنا، چہرے یا سینے کو پیٹنا یا واویلا کرنا جائز ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مصیبت اور پریشانی کے وقت صبر و تحمل کی تلقین کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لو یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (البقرۃ: ۱۵۳)

اسی طرح فرمایا:

''جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کر دیے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے اور ہم ضرور تمہاری کسی چیز کے ساتھ آزمائش کریں گے، خوف سے اور بھوک سے اور جانوں، مالوں اور پھلوں کی کمی سے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں، جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانے والے ہیں۔'' (البقرۃ: ۱۵۴-۱۵۶)

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومن آدمی مصیبت و پریشانی کے موقع پر صبر و تحمل سے کام لیتا ہے، گریبان چاک کرنا یا چہرہ نوچنا اور سینہ کوبی کرنا صبر و تحمل کے خلاف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُوْدَ وَ شَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ »[بخاری، کتاب الجنائز: باب ليس منا من شق الجيوب (١٢٩٤)]

''جس آدمی نے رخسار پیٹے اور گریبان چاک کیا اور جاہلیت کے واویلے کی طرح واویلا کیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مصیبت کے وقت آواز بلند کرنے والی، بال منڈانے والی اور کپڑے پھاڑنے والی سے براءت کی ہے۔[صحیح مسلم، کتاب الایمان: باب تحریم ضرب الحدود و شق الجیوب (١٠٤)]

آپ کا ایک ارشادِ گرامی ہے:

''اگر نوحہ کرنے والی نے اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کی تو قیامت والے دن اس طرح اٹھائی جائے گی کہ اس پر گندھک کا قمیص اور خارش کی قمیص ہوگی۔'' [صحیح مسلم، کتاب الجنائز: باب التشدید فی النیاحة: (٩٣٤)]

لہٰذا آفات اور مصائب و آلام میں صبر و تحمل کا دامن تھامنا چاہیے، جزع و فزع اور بے صبری کا مظاہرہ کرنے سے باز رہنا چاہیے۔

ہدیہ و تحفہ واپس لینے کا حکم

سوال کیا کسی آدمی کو ہدیہ و تحفہ دے کر واپس لینا جائز ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب کسی شخص کو ہدیہ و تحفہ دے کر پھر واپسی کا مطالبہ کرنا حرام ہے۔ ہدیہ لغت و شرع کے اعتبار سے ہبہ ہے۔ عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« اَلْعَائِدُ فِيْ هِبَتِهِ كَالْعَائِدِ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهِ» [صحيح البخاری كتاب الهبة : باب لا يحل لأحد أن يرجع فی هبةو صدقته (٢٦٢١)، صحيح مسلم (١٦٢٢)]

''ہبہ میں واپس پلٹنے والا ایسے ہے جیسے کوئی اپنی قے میں واپس لوٹتا ہے۔''

ایک اور جگہ آپ نے فرمایا:

«لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ »[بخاری، کتاب الهبة: باب لا يحل لأحد أن يرجع فی هبة و صدقة (٢٦٢٢)]

''ہمارے لیے بری مثال نہیں ہے۔''

عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس ؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ اَنْ يُّعْطِيَ عَطِيَّةً ثُمَّ يَرْجِعُ فِيْهَا إِلَّا الْوَالِدَ فِيْمَا يُعْطِيْ وَلَدَهُ وَمَثَلُ الَّذِیْ يُعْطِي الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيْهَا كَمَثَلِ الْكَلْبِ أَكَلَ حَتّٰى إِذَا شَبِعَ قَاءَ ثُمَّ عَادَ فِيْ قَيْئِهِ»(مسند احمد (٢/٢٧، ٧٨)، ابوداؤد، كتاب البيوع: باب الرجوع فی الهبة (٣٥٣٩)، ترمذی (٢١٣٢)، نسائی

(۳۷۰۳)، ابن ماجه (۲۳۷۷) اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن صحیح قرار دیا ھے اور علامه البانی نے بھی صحیح قرار دیاھے۔ التحقیقات الرضیة (۵۲۶/۲)]

’’کسی بھی آدمی کے لیے حلال نہیں کہ وہ عطیہ دے کر پھر اس میں رجوع کرے سوائے والد کے اس چیز میں جو وہ اپنے بیٹے کو دیتا ہے اور جو آدمی عطیہ دے کر پھر اس میں رجوع کرتا ہے وہ اس کتے کی طرح ہے جو کھاتا ہے حتیٰ کہ جب سیر ہوتا ہے تو قے کر دیتا ہے پھر اپنی قے میں رجوع کرتا ہے۔‘‘

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کو ہدیہ وتحفہ اور ہبہ وعطیہ دے کر پھر اس سے واپسی کا مطالبہ کرنا حرام ہے مگر والد اپنی اولاد میں سے کسی کو عطیہ دے کر واپس لے سکتا ہے اور اس پر نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ والی اوپر ذکر کردہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی شخص کو تحفہ دے کر واپس نہیں لینا چاہیے اور اس کی مثال بھی بہت بری ہے اور مسلمان کے لیے ایسی مثال کا مصداق بننا درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

بسم اللہ یا قرآنی آیات کو اعداد کی صورت لکھنا

سوال کیا بسم اللہ یا دوسری قرآنی آیات کو اعداد کی صورت میں لکھنا جائز ہے اور اس میں شرعی قباحت کیا ہے؟ قرآن و حدیث سے جواب دیں۔

جواب اسلام ایک مکمل دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہمیں زندگی گزارنے کے آداب بتائے ہیں اور جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے مقدس فرامین کے ذریعے عملی نمونہ پیش کر کے ان کی مکمل وضاحت فرما دی۔

① ان اسلامی آداب میں سے ایک اہم ادب یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان اپنے ہر کام میں اللہ کا نام لے۔ مسلمانوں کو ہر اہم کام ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ سے شروع کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کیونکہ اس میں برکت ہوتی ہے۔ تحریر میں بھی جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت یہی ہے کہ اسے ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ سے شروع کیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور سرداروں کو جو مکتوب مبارک تحریر فرمائے ان سب میں ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ لکھی گئی جیسا کہ احادیث مبارکہ کی کتابوں میں وہ خطوط مکمل طور پر درج ہیں۔

② کچھ لوگوں نے ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ کی بجائے ’’۷۸۶‘‘ کا ہندسہ اختیار کر لیا ہے اور عوام میں بھی یہی عدد رائج ہو گیا ہے۔ حالانکہ شریعت میں اعداد کو کبھی الفاظ کا بدل تسلیم نہیں کیا گیا۔ البتہ یہود میں یہ چیز پائی جاتی تھی اور وہ الفاظ کو اعداد کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہود و نصاریٰ میں ۷ اور ۱۴ کے عدد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے ان کی مذہبی کتابوں میں ساتویں سال کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کے لیے خاص احکام موجود ہیں۔ اس بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نسب نامہ کو ابراہیم علیہ السلام سے لے کر مسیح علیہ السلام تک چودہ چودہ ناموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مسیحی علماء اس بات کی ایک وجہ یہ بتاتے ہیں کہ چودہ کا عدد سات کا دگنا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ داؤد، جسے عبرانی میں...... د و د...... کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ اس کے اعداد ۱۴ ہیں۔ اس سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے روحانی وارث ہیں۔

③ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حساب جمل یعنی حروف و اعداد کے ہیر پھیر کے بانی اور اس پر ایمان رکھنے والے غیر مسلم اہل کتاب ہیں، مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ حروف مقطعات جو سورتوں کے شروع میں ہیں اور الگ الگ حرف کے طور پر پڑھے جاتے ہیں ان کے متعلق کتب تفسیر میں یہ روایات موجود ہیں کہ یہود نے جب یہ حروف سنے تو ان کا خیال تھا کہ اس سے مراد مدت ہے کہ اس نبی کی نبوت اتنا عرصہ رہے گی، چنانچہ "الم" کو سن کر ایک یہودی عالم نے کہا کہ مسلمانوں کا نبی تو محض اکہتر سال تک باقی رہے گا۔ جب اسے بتایا گیا کہ قرآن میں " المصٓ" بھی ہے تو اس نے کہا یہ ۱۶۱ سال ہو گئے۔ پھر اسے بتایا گیا کہ قرآن مجید میں " الرٓ" بھی ہے تو اس نے کہا یہ تو اور زیادہ ہو گئے۔ پھر جب اس کے سامنے " المر" پیش کیا گیا تو وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا کیونکہ یہ ۲۷۱ بنتے ہیں۔ آخر کہنے لگا کہ مسئلہ الجھ گیا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ان کا مقصد کیا ہے؟ (جب کہ ان حروف کی حقیقت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور یہی موقف درست اور حقیقت پر مبنی ہے۔)

④ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف اور اعداد کو ایک دوسرے کا بدل قرار دینے کا تصور یہودیوں کی طرف سے آیا ہے لہٰذا مسلمانوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں بھی اعداد کو الفاظ کا بدل سمجھنے کا تصور موجود نہیں۔

اگر کسی کا نام انور ہے تو اس کو ۲۵۷ صاحب کہہ کر نہیں بلایا جاتا۔ نہ قریشی صاحب ۶۲۰ کہلانا پسند کریں گے۔ اگر مولانا صاحب کی بجائے ۱۲۸ صاحب کہہ دیا جائے تو وہ یقیناً ناراض ہو جائیں گے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقدس نام کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے؟

⑤ پھر ایک عدد ضروری نہیں کہ ایک ہی عبارت کو ظاہر کرے بلکہ اس سے زیادہ عبارتوں کے مجموعی عدد کے بھی مساوی ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہی عدد ۷۸۶ جسے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا بدل قرار دیا جاتا ہے، یہ ہندوؤں کے معبود کرشن کے نام کا نعرہ ''ہرے کرشنا'' کے اعداد کا مجموعہ بھی ہے۔

⑥ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر اعداد الفاظ کا بدل ہیں تو کیا ہم اپنے معاملات میں ان کا اس لحاظ سے استعمال قبول کر سکتے ہیں؟ ایک شخص آپ سے کوئی واقعہ بیان کرتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ اسے کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم کھاؤ، وہ کہتا ہے ''چھیاسٹھ کی دوسو'' میں سچ کہہ رہا ہوں تو کیا آپ تسلیم کر لیں گے کہ اس نے اللہ کی قسم کھائی ہے؟ کیا اس کی بات کا اعتبار کر لیا جائے؟ اسی طرح نکاح کے موقع پر دولہا کہے میں نے ۱۳۸ کیا تو کیا یہ تسلیم کیا جائے گا کہ اس نے ''قبول'' کر لیا؟ یا کوئی اپنی بیوی سے کہے جا تجھے ۱۴۰ ہے، تو کیا اسے ''طلاق'' سمجھا جا سکتا ہے۔ یقیناً کوئی سمجھ دار اس منطق کو قبول نہیں کر سکتا۔

⑦ پھر کیا وجہ ہے کہ جس چیز کو اپنے لیے پسند نہیں کرتے اسے اللہ تعالیٰ کے مقدس نام کے لیے اور جناب رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک کے لیے ہم پسند کریں۔ ایک مومن کے لیے اس کا تصور بھی ناقابل قبول ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہم ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی جگہ ۷۸۶ اس لیے لکھتے ہیں تاکہ اللہ کے پاک نام کی بے حرمتی نہ ہو۔ کاغذ پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہو تو اسے ادب سے رکھنا چاہیے لیکن ۷۸۶ لکھا ہو تو اس قدر احتیاط کی ضرورت نہیں۔ ان حضرات کی اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں ۷۸۶ بسم اللہ کا بدل نہیں ہے۔ اسی لیے اس کا احترام کرنا ضروری نہیں ورنہ اگر عدد بھی بسم اللہ ہے تو اس کا احترام بھی اسی طرح ضروری ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ۷۸۶ کا عدد بسم اللہ کا نعم البدل صرف تحریر میں سمجھا جاتا ہے، زبان سے بولنے میں نہیں، ورنہ کھانا کھاتے ہوئے بھی سات سو چھیاسی (۷۸۶) پڑھ کر کھانا شروع کر دیا جائے اور تلاوت کرتے ہوئے بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھایا جائے اور اگر نماز کے لیے اذکار کے اعداد نکال لیے جائیں تو بڑی آسانی سے جھٹ پٹ نماز سے فراغت حاصل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ۷۸۶ کا عدد استعمال کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا مبارک نام اور مکمل ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا کریں تاکہ وہ یہود و نصاریٰ کی نقل سے بچتے ہوئے اللہ کے نام کی برکتوں سے فیض یاب ہو سکیں۔

داڑھی اور مونچھوں کے متعلق شرعی احکامات

سوال کیا داڑھی کی کاٹ چھانٹ کرنا جائز ہے اور کیا رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا ہے؟ مہربانی فرما کر صحیح سنتِ رسول سے آگاہ فرما دیں۔

جواب ① نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ وَ إِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ » [مسلم ، کتاب الطهارة : باب خصال الفطرة (٢٦١)]

''دس خصلتیں فطرت سے ہیں جن میں سے مونچھیں تراشنا اور داڑھی بڑھانا بھی ہے۔''

② عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

« خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ اَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَ اَوْفُوا اللِّحٰى » [مسلم ، کتاب الطهارة : باب خصال الفطرة (٢٥٩)]

''مشرکین کی مخالفت کرو، مونچھوں کو پست کرو اور داڑھی کو پورا کرو۔''

③ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ اَهْلَ الْكِتَابِ يَقُصُّوْنَ عَثَانِيْنَهُمْ وَ يُوَفِّرُوْنَ سِبَالَهُمْ قَالَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قُصُّوْا سِبَالَكُمْ وَ وَفِّرُوْا عَثَانِيْنَكُمْ وَ خَالِفُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ »[مسند احمد (٢٦٤/٥)، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ [فتح الباری (٣٥٤/١٠)] اور علامہ عینی رحمہ اللہ نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ [عمدة القاری (٥٠/٢٢)]

''ہم نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اہل کتاب داڑھیوں کو کاٹتے ہیں اور مونچھوں کو بڑھاتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے

فرمایا: ''تم مونچھیں کاٹو اور داڑھیاں بڑھاؤ اور اہل کتاب کی مخالفت کرو۔''

مذکورہ بالا تینوں احادیث سے معلوم ہوا کہ مونچھیں کاٹنا یا پست کرنا اور داڑھی بڑھانا فطرت اسلام میں داخل ہے اور داڑھی کٹانا اور مونچھیں بڑھانا فطرت اسلام کو بدلنا اور اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی علامت ہے۔لہٰذا جو شخص مونچھیں بڑھاتا ہے، کاٹتا نہیں وہ اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت دردناک عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ [النور:٦٣]

''پس جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، انھیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آفت آن پڑے یا ان پر کوئی دردناک عذاب اترے۔''

باقی رہا داڑھی کی مقدار کا مسئلہ تو اللہ کے رسول ﷺ نے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے اور اس کے متعلق اللہ کے رسول ﷺ سے پانچ الفاظ مروی ہیں۔امام نووی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" فَحَصَلَ خَمْسُ رِوَايَاتٍ اَعْفُوا وَ اَوْفُوا وَ اَرْخُوا وَ اَرْجُوا وَ وَفِّرُوا وَ مَعْنَاهَا كُلِّهَا تَرْكُهَا عَلىٰ حَالِهَا هٰذَا هُوَ الظَّاهِرُ مِنَ الْحَدِيثِ الَّذِي يَقْتَضِي اَلْفَاظُهُ " [شرح مسلم للنووی(١٢٩/١)]

''پانچ روایات مروی ہیں " اعفوا ، اوفوا، ارخوا ، ارجوا اور وفروا " ان سب کا معنی یہ ہے کہ داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔اس حدیث کے ظاہری الفاظ اسی بات کا تقاضا کرتے ہیں۔''

لہٰذا جب اللہ کے رسول ﷺ نے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے اور اسے کاٹنا اہل کتاب کی علامت بتائی ہے تو داڑھی کو اس حال پر چھوڑ دینا ہی منشائے الٰہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے آپ ﷺ کے فرمان کے ہوتے ہوئے کسی دوسری بات کی طرف توجہ کرنا درست نہیں۔بعض حضرات داڑھی تراشنے اور اس کی کاٹ چھانٹ کرنے کے متعلق جامع ترمذی کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں:

« اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يَأْخُذُ مِنْ لِحْيَتِهِ مِنْ عَرْضِهَا وَ طُولِهَا » [ترمذی، کتاب الأدب : باب ماجاء فی الأخذ من اللحية (٢٧٦٢)]

''رسول اللہ ﷺ اپنی داڑھی کو عرض وطول سے کاٹتے تھے۔''

اگر یہ روایت درست ہوتی تو فی الجملہ داڑھی ترشوانے اور کاٹ چھانٹ کرنے پر استدلال صحیح ہوتا ہے لیکن یہ روایت انتہائی کمزور بلکہ من گھڑت ہے ۔ اس کی سند میں عمر بن ہارون نامی راوی ہے جس کے بارے میں حافظ الحدیث امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی، امام احمد ابن حنبل اور امام نسائی رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ وہ متروک ہے ۔ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ کذاب خبیث ہے اور امام صالح جزرہ رحمہ اللہ بھی اسی طرح کہتے ہیں۔ امام علی بن مدینی اور امام دارقطنی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بہت زیادہ ضعیف ہے۔ امام ابوعلی الحافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ متروک الحدیث ہے ۔امام

ساجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں ضعف ہے۔ امام ابونعیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر حدیثیں بیان کرتا ہے اور محض ہیچ ہے۔ امام عجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ [تهذيب التهذيب (٣١٦/٤ـ ٣١٧)]

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ [سلسلة الاحاديث الضعيفة (٣٠٤/١)]

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس بے اصل، من گھڑت اور بے بنیاد روایت سے نہ صرف استدلال کیا جاتا ہے بلکہ اسے صحیح احادیث کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے اور ایک ایسے نظریہ کو ثابت کیا جاتا ہے جس کا خیر القرون میں سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ بعض لوگ اس بے بنیاد روایت کو دلیل بنا کر داڑھی کا حلیہ اس طرح بگاڑ دیتے ہیں کہ کچھ داڑھی اوپر والے حصے سے مونڈ دی اور کچھ نیچے والے حصے سے اور چہرے پر ایک چھوٹی سے پٹی کی صورت میں چند بال رکھ لیے جو کھلم کھلا شریعت سے مذاق اور شیطان کی پیروی ہے اور اللہ کے رسول ﷺ سے بغاوت اور اظہار بیزاری ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے اور اپنے آپ کو سکالر سمجھنے والے لوگ اس سنت متواترہ کا نہ صرف مذاق اڑاتے ہیں بلکہ اسے سنت نبوی سے بھی خارج کر دیتے ہیں۔

داڑھی رکھنا فرض ہے

سوال داڑھی رکھنا اسلام میں فرض ہے یا واجب، سنت ہے یا صرف ایک عبادت؟ جو رکھ لی جائے تو بہتر ہے ورنہ کوئی گناہ نہیں اور اگر داڑھی کے بارے میں کوئی ارشاد خداوندی ہے تو وہ بھی لکھ دیں اور لفظ فرض کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب مسلمان مرد کے لیے داڑھی رکھنا ضروری و لازمی ہے جسے شرعی اصطلاح میں فرض و واجب کہتے ہیں۔ کیونکہ نبی ﷺ نے اسے فطرت میں سے قرار دیا ہے اور اس کے رکھنے کا حکم ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

''دس چیزیں فطرت میں سے ہیں: مونچھیں کتروانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا اور ناک میں پانی ڈال کر اوپر کو کھینچنا، ناخن کٹوانا، انگلیوں کے جوڑ اچھی طرح دھونا، بغل کے بال اکھیڑنا، زیر ناف بال صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا۔''

راوی حدیث مصعب نے کہا: ''میں دسویں چیز بھول گیا ہوں مگر یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کلی کرنا ہو۔'' [صحيح مسلم، كتاب الطهارة:باب خصال الفطرة: ٢٦١]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

''مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھوں کو پست کرو۔'' [مسلم، كتاب الطهارة: باب خصال الفطرة (٢٥٩)]

ان ہر دو احادیث سے معلوم ہوا کہ داڑھی بڑھانا فطرت میں سے ہے اور اس کے بڑھانے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے اور اہل علم خوب جانتے ہیں کہ حکم کا صیغہ کسی کام کو واجب و فرض کرنے کے لیے ہوتا ہے الا یہ کہ کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جو اسے وجوب کے حکم سے خارج کرتا ہو اور یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جو اسے وجوب کے حکم سے نکالتا ہو لہٰذا داڑھی رکھنا

فرض و واجب ہے۔ امام ابن کثیر نے اپنی تاریخ کی کتاب البدایہ والنہایہ میں، اسی طرح تاریخ طبری اور المنتظم لابن الجوزی میں لکھا ہے:

''ایران کے دو باشندے جو داڑھی منڈے تھے جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کے چہرے دیکھ کر اپنا رخ انور پھیر لیا، پھر ان سے جب دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ ہمارے آقاؤں نے ہمیں داڑھی مونڈنے کا حکم دیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے میرے رب نے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے۔''

معلوم ہوا داڑھی بڑھانا اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ جمہور ائمہ محدثین کے ہاں فرض و واجب ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ مسلم وغیرہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا تو فرمایا:

''اے لوگو! بے شک اللہ نے تمھارے اوپر حج فرض کیا ہے سو تم حج کرو۔'' تب ایک آدمی نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! کیا ہر سال؟'' آپ ﷺ خاموش رہے حتیٰ کہ اس نے تین دفعہ یہ بات کہی پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا اور تمھیں اس کی استطاعت نہ ہوتی۔'')[مسلم، کتاب الحج: باب فرض الحج مرة فی العمر (۱۳۳۷)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ فرض اور واجب ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور اس کا ادا کرنا ضروری و لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا داڑھی رکھنا شرعی طور پر فرض اور واجب ہے، اس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے۔

داڑھی کے متعلق عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث

سوال داڑھی کے متعلق مختلف لوگوں کا نظریہ مختلف ہے، کوئی کچھ کہتا ہے تو کوئی کچھ۔ پچھلے دنوں بخاری شریف کا مطالعہ کر رہا تھا (ترجمہ و تفسیر علامہ وحید الزماں) تو ایک حدیث نظر سے گزری جس کا ترجمہ کچھ یوں تھا: ''نافع سے، اور انھوں نے ابن عمر سے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے، بیان کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مشرکین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے داڑھیاں چھوڑ دو اور مونچھوں کو خوب کتر ڈالو۔'' اور عبداللہ بن عمر جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی مٹھی سے تھامتے اور جتنی زیادہ ہوتی اس کو کتروا دیتے تھے۔''[صحیح بخاری، کتاب اللباس: باب تقلیم الأظفار: (۵۸۹۲)]

اس حدیث مبارکہ میں نبی ﷺ نے مشرکوں کی خلاف ورزی کرنے کا حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ داڑھیاں بڑھاؤ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کتنی بڑھاؤ، آیا شروع ہی سے رکھنی چاہیے یا کاٹی جا سکتی ہے؟ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق ہے کہ وہ جب حج یا عمرہ کرتے تو مٹھی بھر سے زائد داڑھی کٹوا دیتے۔ کیا ان کا یہ فعل نبی ﷺ کے قول کے خلاف تھا یا کوئی اور بات تھی؟ اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ عمل ایک سے زائد مرتبہ کیا ہے۔ بعض لوگ داڑھی کے متعلق کہتے ہیں اگر رکھ لی جائے تو ثواب ہے اور اگر نہ رکھی جائے تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیا مشرک بھی داڑھی رکھتے تھے؟ آج کل جو کافر ہیں وہ تو داڑھی نہیں رکھتے۔ تو اگر تراشیدہ داڑھی رکھ لی جائے تو کس قدر گناہ ہوتا ہے۔ اسلام میں ''خط'' کا کوئی تصور موجود ہے یا نہیں اور داڑھی فرض ہے یا

سنت اور اگر سنت ہے تو کیسی سنت؟ اور جو لوگ داڑھیاں نہیں رکھتے اسلام نے ان کے متعلق کیا وعید سنائی ہے؟ اہل سنت داڑھی کو مٹھی سے بڑھانا مکروہ اور اہل شیعہ حرام قرار دیتے ہیں، شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

(جواب) داڑھی رکھنے کے متعلق بخاری شریف کی حدیث صریح نص ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے داڑھی کو بڑھانے کا حکم دیا ہے اور آپ نے خود داڑھی بڑھائی اور داڑھی کا کاٹنا اور منڈانا نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی اس کے علاوہ بھی کئی احادیث داڑھی بڑھانے اور اسے معاف کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ احادیث میں داڑھی کے متعلق "وَاعْفُوْ اَوْفُوْ، وَفِّرُوْا، اَرْجُوْا، اَرْخُوْا" پانچ طرح کے الفاظ ملتے ہیں جنھیں امام نووی نے مسلم کی شرح میں اور قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں ذکر کیا ہے۔ ان الفاظ کا تقاضا یہی ہے کہ داڑھی کو اول روز سے رکھ لینا چاہیے، کاٹ چھانٹ اور منڈانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ صحابی رسول عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنا ذاتی عمل کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، مرفوع حدیث کے مقابل اس کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ مذکورہ بالا احادیث کے الفاظ حدیث امر کے صیغے ہیں اور امر لغت عرب میں وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اسلام میں داڑھی رکھنا واجب ہے۔ اس کا خط بنوانے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ اہل تشیع کے ہاں داڑھی تراشنا حرام ہے جیسا کہ علامہ محمد حسین نجفی نے اپنی کتاب "حرمت ریش تراشی" میں با دلائل واضح کیا ہے اور کئی ایک ائمہ اہل سنت کے ہاں داڑھی ایک مشت ہونی چاہیے اور وہ آثار صحابہ سے دلیل لاتے ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ حدیث نبوی کے مقابلے میں اثر صحابی کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ لہٰذا بہتر موقف یہی ہے کہ داڑھی بڑھائی جائے اللہ کے رسول ﷺ نے خود داڑھی بڑھائی بھی ہے اور بڑھانے کا حکم بھی دیا ہے اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ لہٰذا ہمیں بھی اس کی حد بندی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

خضاب لگانا

(سوال) خضاب لگانا کیسا ہے اور کیا سیاہ خضاب استعمال کرنا ممنوع اور حرام ہے؟ تفصیل سے مسئلہ کی وضاحت فرما دیں۔

(جواب) رسول اکرم ﷺ اپنے بالوں کو خود بھی خضاب لگاتے تھے اور اس کی ترغیب بھی دیا کرتے تھے۔ اسی طرح خلفائے راشدین اپنے سفید بالوں کو رنگا کرتے تھے۔ شریعت اسلامیہ میں سیاہ خضاب ممنوع و حرام ہے، اس کے علاوہ مہندی یعنی سرخ، زرد، سیاہی مائل وغیرہ خضاب جائز و مشروع ہے۔ سیاہ رنگ کی ممانعت میں کئی ایک احادیث ہیں جن کو آئندہ بالتفصیل ذکر کیا جائے گا۔ پہلے آپ ﷺ کی خضاب کے متعلق چند احادیث ملاحظہ ہوں:

① « عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ مَوْهَبٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی أُمِّ سَلَمَةَ فَأَخْرَجَتْ إِلَيْنَا شَعْرًا مِنْ شَعْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَخْضُوْبًا بِالْحِنَّاءِ وَ الْكَتَمِ » [بخاري، كتاب اللباس: باب ما يذكر في الشيب(٥٨٩٧)، مسند احمد (٢٩٦/٦)، الحاكم (٤٧٥/١)، ابن ابی شيبة(٤٣٤/٨)]

"عثمان بن عبداللہ نے کہا: "میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا تو انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے بالوں سے ایک بال نکالا جس کو مہندی اور کتم کا خضاب لگا ہوا تھا۔"

کتم ایک ایسی بوٹی ہے جو نرم زمین میں اگتی ہے۔ اس کے پتے زیتون کی طرح ہوتے ہیں، چرخی وغیرہ پر چڑھ کر بلند ہوتی ہے، مرچ کے دانے کی طرح اس کا پھل ہوتا ہے۔ اس کے اندر گٹھلی ہوتی ہے جب اسے کوٹا جائے تو رنگ سیاہ ہو جاتا ہے اور اس کے پتوں کا عرق نکال کر ایک اوقی کی مقدار پیا جائے تو سخت قے آتی ہے۔ اگر کسی کو کتا کاٹ جائے تو اس کے علاج کے لیے مفید ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ جب اسے پانی میں ڈال کر پکایا جائے تو اس سے سیاہی نکلتی ہے جس سے لکھا جاتا ہے۔ [زاد المعاد (٣٦٦/٤)]

② «عَنُ اَبِیُ رِمُثَةَ قَالَ اَتَیُتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیُهِ وَ سَلَّمَ ...... وَ کَانَ قَدُ لَطَخَ لِحُیَتَهٗ بِالُحِنَّاءِ»

[ابو داؤد، کتاب الترجل: باب فی الخضاب(٤٢٠٨)، احمد(١٦٣/٤)، نسائی (١٤٠/٨)]

''ابو رمثہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ نے اپنی داڑھی مبارک کو مہندی لگائی ہوئی تھی۔''

③ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«وَ اَمَّا الصُّفُرَةُ فَاِنِّیُ رَاَیُتُ رَسُوُلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیُهِ وَ سَلَّمَ یَصُبغُ بِهَا فَاِنِّیُ اُحِبُّ اَنُ اَصُبغَ بِهَا» [بخاری، کتاب الوضوء: باب غسل الرجلین فی النعلین(١٦٦)، احمد (١٧/٢)، مسلم (١١٨٧)، ابو داؤد (١٧٧٢)، ابن ماجه(٣٦٢٦)، ابن ابی شیبة(٤٤٣/٨)]

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ زرد رنگ کا خضاب لگاتے تھے، میں بھی یہی پسند کرتا ہوں۔''

انس رضی اللہ عنہ سے مروی جس روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کی نفی ہے اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَ حَاصِلُهٗ اَنَّ مَنُ جَزَمَ اَنَّهٗ خَضَبَ کَمَا فِیُ ظَاهِرِ حَدِیُثِ اُمِّ سَلَمَةَ وَ کَمَا فِیُ حَدِیُثِ ابُنِ عُمَرَ الُمَاضِیُ قَرِیُبًا اَنَّهٗ خَضَبَ بِالصُّفُرَةِ حَکٰی مَا شَاهَدَهٗ وَکَانَ ذٰلِكَ فِیُ بَعُضِ الُاَحُیَانِ وَ مَنُ نَفٰی ذٰلِكَ کَاَنَسٍ فَهُوَ مَحُمُوُلٌ عَلَی الُاَکُثَرِ الُاَغُلَبِ مِنُ حَالِهٖ " [فتح الباری(٣٥٤/١٠)]

'' خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس نے بالجزم یہ بات کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب لگایا جیسا کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ظاہر حدیث میں ہے اور جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زرد خضاب لگایا، جو قریب ہی پیچھے گزری ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو انھوں نے مشاہدہ کیا بیان کر دیا اور یہ کبھی کبھی ہوتا تھا اور جس نے انس رضی اللہ عنہ کی طرح خضاب کی نفی کی ہے وہ اکثر اور اغلب حالت پر محمول ہے۔''

مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی خضاب بھی لگایا کرتے تھے اور اکثر نہیں لگاتے تھے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" فَاِنُ قِیُلَ قَدُ ثَبَتَ فِی الصَّحِیُحِ عَنُ اَنَسٍ اَنَّهٗ قَالَ لَمُ یَخُتَضِبِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیُهِ وَ سَلَّمَ قِیُلَ: قَدُ اَجَابَ اَحُمَدُ ابُنُ حَنُبَلٍ عَنُ هٰذَا وَ قَالَ: قَدُ شَهِدَ بِهٖ غَیُرُ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنُهُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیُهِ وَ سَلَّمَ اَنَّهٗ خَضَبَ وَ لَیُسَ مَنُ شَهِدَ بِمَنُزِلَةِ مَنُ لَمُ یَشُهَدُ فَاَحُمَدُ اَثُبَتَ خِضَابَ النَّبِیِّ وَ مَعَهٗ جَمَاعَةٌ مِنَ الُمُحَدِّثِیُنَ وَ مَالِكٌ اَنُکَرَهٗ " [زاد المعاد(٣٦٧/٤)]

''اگر یہ کہا جائے کہ صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب نہیں لگایا تو کہا جائے گا اس کا جواب امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ نے دیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے کہا: ''انس رضی اللہ عنہ کے علاوہ (ام سلمہ، ابو رمثہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم) نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کی شہادت دی ہے اور جس نے مشاہدہ کیا، وہ مشاہدہ نہ کرنے والے کی منزلت پر نہیں ہو سکتا (یعنی مشاہدہ کرنے والے کی بات زیادہ قابل قبول ہوگی)۔'' امام احمد رحمہ اللہ نے اور ان کے ساتھ محدثین کی ایک جماعت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خضاب ثابت کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس بات کا انکار کیا ہے۔''

امام مالک رحمہ اللہ کی یہ بات درست نہیں کیونکہ صحیح سند کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب لگایا جیسا کہ اوپر مذکور ہے، علاوہ ازیں خضاب لگانے میں یہود و نصاریٰ کی مخالفت بھی ہے اور اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے:

« عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ اَعْفُوا اللِّحٰی وَ خُذُوْا الشَّوَارِبَ غَیِّرُوْا شَیْبَكُمْ وَ لَا تُشَبِّهُوْا بِالْیَهُوْدِ وَ النَّصَارٰی »[احمد(٢/٣٥٦)]

''سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''داڑھیاں بڑھاؤ، مونچھیں ترشواؤ اور اپنی سفیدی کو بدلو اور یہود و نصاریٰ کی مشابہت نہ کرو۔''

یہی حدیث مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے:

« اِنَّ الْیَهُوْدَ وَ النَّصَارٰی لَا یَصْبَغُوْنَ فَخَالِفُوْهُمْ »[بخاری ، کتاب أحادیث الانبیاء : باب ما ذکر عن بنی اسرائیل (٣٤٦٢) و کتاب اللباس: باب الخضاب (٥٨٩٩)، مسلم ، کتاب اللباس والزینة (٢١٠٣)، ابو داؤد، کتاب الترجل : باب فی الخضاب (٤٢٠٣)، ابن ماجه(٣٦٢١) نسائی (٥٠٧٤) ، احمد (٢/٢٤٠_٣٠٩)، ابن ابی شیبة (٨/٤٣١)، عبد الرزاق(١١/١٥٤)]

''بلاشبہ یہود و نصاریٰ (اپنے بالوں کو) نہیں رنگتے، تم ان کی مخالفت کرو۔''

جس رنگ کا خضاب لگانا جائز ہے اس کے متعلق چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

① ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ عَلٰی مَشْیَخَةٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ بِیْضٌ لِحَاهُمْ فَقَالَ یَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ ! حَمِّرُوْا وَ صَفِّرُوْا وَ خَالِفُوْا اَهْلَ الْکِتَابِ »[مسند احمد (٥/٢٦٤)]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے بوڑھے افراد جن کی داڑھیاں سفید تھیں، کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ''اے انصار کی جماعت! (داڑھیاں) سرخ اور زرد کرو اور اہل کتاب کی مخالفت کرو۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔[فتح الباری(١٠/٣٥٤)]

علامہ عینی رحمہ اللہ نے بھی اسے حسن کہا ہے۔[عمدة القاری(٢٢/٥٠)]

② « عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ اِنَّ اَحْسَنَ مَا

غَيَّرْتُمْ بِهِ الشَّيْبَ الْحِنَّاءُ وَ الْكَتَمُ» [ابوداؤد، كتاب الترجل، باب فى الخضاب (٤٢٠٤)، ترمذى، كتاب اللباس، باب ما جاء فى الخضاب(1753)، ابن ماجه (٣٦٢٢)، مسند احمد (١٥٤/٥)، نسائى (٥٠٨٤)، عبد الرزاق (١٥٣/١١)، ابن ابى شيبة (٤٣٣/٨)، موارد الظمآن (١٤٧٥)]

''حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک جس چیز کے ذریعے تم اپنی سفیدی کو بدلتے ہو ان میں سب سے عمدہ مہندی اور کتم ہے۔''

③ «عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ مَرَّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ رَجُلٌ قَدْ خَضَبَ بِالْحِنَّاءِ فَقَالَ مَا اَحْسَنَ هٰذَا قَالَ فَمَرَّ آخَرُ قَدْ خَضَبَ بِالْحِنَّاءِ وَ الْكَتَمِ فَقَالَ هٰذَا اَحْسَنُ مِنْ هٰذَا قَالَ فَمَرَّ آخَرُ قَدْ خَضَبَ بِالصُّفْرَةِ فَقَالَ : هٰذَا اَحْسَنُ مِنْ هٰذَا كُلِّهِ»

[ابوداؤد، كتاب الترجل : باب فى الخضاب(٤٢١١)، ابن ماجه(٣٦٢٧)، ابن ابى شيبة (٣٢/٨ ٤)، طبقات ابن سعد(٤٤٠/١)، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید قرار دیا ھے۔ [التحقيق على المشكاة (١٢٦٦/٢)]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک آدمی گزرا جس نے مہندی کا خضاب لگایا ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کس قدر اچھا ہے؟'' پھر ایک اور آدمی گزرا جس نے مہندی اور کتم ملا کر لگایا ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ اس سے بھی اچھا ہے۔'' پھر ایک آدمی اور گزرا جس نے زرد خضاب لگایا ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ان سب سے اچھا ہے۔''

مذکورہ بالا روایات میں بعض میں مطلقاً خضاب لگانے کا حکم ہے لیکن رنگ کی قید نہیں اور بعض روایات میں رنگ کا ذکر موجود ہے تو شرعی اصول کی رو سے مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ظہار کے کفارے میں گردن آزاد کرنے کا ذکر فرمایا ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ﴾ [المجادلة:٣]

''جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کر لیں پھر اپنے قول کی طرف رجوع کریں تو ایک گردن آزاد کریں۔''

اس آیت میں مطلق گردن آزاد کرنے کا ذکر ہے لیکن یہ ذکر نہیں کہ وہ غلام مومن ہو یا کافر۔ اسی طرح قسم کے کفارے میں بھی عام گردن کا ذکر ہے۔ لیکن قتل خطا کے کفارے میں ہے:

﴿ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ﴾ [النساء:٩٢]

''جس نے کسی مومن شخص کو غلطی سے قتل کر دیا تو وہ ایک مومن غلام آزاد کرے۔''

اس آیت میں مومن غلام آزاد کرنے کا حکم ہے۔ لہٰذا پہلے دونوں کفاروں میں بھی مومن غلام ہی مراد ہوگا کیونکہ وہ مطلق ہیں، یہ آیت مقید ہے اور مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جن احادیث میں صرف رنگنے کا ذکر ہے ان کو ان احادیث پر منطبق کیا جائے گا جن میں جائز رنگوں کا ذکر ملتا ہے۔ سیاہ خضاب لگانے سے منع کیا گیا ہے اور اس سے ممانعت

کے متعلق چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

① جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« أُتِيَ بِأَبِيْ قُحَافَةَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ وَ رَأْسُهُ وَ لِحْيَتُهُ كَالثُّغَامَةِ بَيَاضًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ غَيِّرُوْا هٰذَا بِشَيْءٍ وَ اجْتَنِبُوْا السَّوَادَ » [مسلم ، كتاب اللباس والزينة: باب استحباب خضاب الشيب بصفرة أو حمرة و تحريمه بالسواد (٢١٠٢) نسائى (٥٠٨٩) ، ابوداؤد (٤٢٠٤) ابن ماجه (٣٦٢٤)، ابن ابى شيبة(٤٣٢/٨)، عبد الرزاق (١٥٤/١١)، حاكم (٢٤٤/٣)، بيهقى(٣١٠/٧)]

’’فتح مکہ والے دن (ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد) ابو قحافہ کو لایا گیا۔ ان کا سر اور داڑھی ثغامہ (سفید پھولوں والا ایک درخت) کی طرح سفید تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس سفیدی کو بدلو اور سیاہی سے اجتناب کرو۔‘‘

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« اِذْهَبُوْا بِهِ اِلٰى بَعْضِ نِسَائِهِ فَلْيُغَيِّرْهُ بِشَيْءٍ وَ جَنِّبُوْهُ بِالسَّوَادِ » [مسند احمد(٣١٦/٣)]

’’انھیں ان کی بعض عورتوں کی طرف لے جاؤ، وہ ان کی سفیدی کو بدلیں اور سیاہی سے بچو۔‘‘

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ يَحْرُمُ خِضَابُهُ بِالسَّوَادِ عَلَى الْاَصَحِّ وَ قِيْلَ يُكْرَهُ كَرَاهَةً تَنْزِيْهٍ وَ الْمُخْتَارُ التَّحْرِيْمُ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ اجْتَنِبُوْا السَّوَادَ » [شرح مسلم للنووى(١٩٩/٢)]

’’سب سے صحیح قول کے مطابق سیاہ خضاب حرام ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سیاہ خضاب مکروہ تنزیہی ہے۔ مختار قول حرمت کا ہے اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’سیاہ خضاب سے بچو۔‘‘

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فَقَوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ اجْتَنِبُوْا السَّوَادَ دَلِيْلٌ وَاضِحٌ عَلَى النَّهْيِ عَنِ الْخِضَابِ بِالسَّوَادِ " [تحفة الأحوذى (٥٧/٣)]

’’آپ ﷺ کا فرمان ’’سیاہی سے بچو‘‘ سیاہ خضاب کی حرمت پر واضح دلیل ہے۔‘‘

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ثُمَّ اِنَّ الْمَاذُوْنَ فِيْهِ مُقَيَّدٌ بِغَيْرِ السَّوَادِ لِمَا اَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ مِنْ حَدِيْثِ جَابِرٍ اَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ : « غَيِّرُوْهُ وَ جَنِّبُوْهُ السَّوَادَ " [فتح البارى(٤٩٩/٦)]

’’سیاہ خضاب کے علاوہ خضاب لگانے کی اجازت ہے، اس لیے کہ امام مسلم نے جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اس کی سفیدی کو بدلو اور اسے سیاہی سے بچاؤ۔‘‘

امام نووی رحمہ اللہ اپنی کتاب "المجموع" میں فرماتے ہیں:

"اِتَّفَقُوْا عَلٰی ذَمِّ خِضَابِ الرَّأْسِ وَ اللِّحْیَةِ بِالسَّوَادِ" [المجموع شرح المهذب(۳۲۳/۱)]

"سر اور داڑھی کے بالوں کو سیاہ خضاب لگانے کی مذمت پر محدثین کا اتفاق ہے۔"

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"وَ الصَّحِیْحُ بَلِ الصَّوَابُ اَنَّهُ حَرَامٌ" [المجموع شرح المهذب(۳۲۳/۱)]

"صحیح بلکہ درست یہ ہے کہ سیاہ خضاب حرام ہے۔"

علامہ سفارینی نے نقل کیا ہے:

"وَ یُکْرَهُ بِالسَّوَادِ اِتِّفَاقًا نُصَّ عَلَیْهِ" [شرح ثلاثیات مسند احمد(۵۳/۲)]

"سیاہ خضاب کی کراہت پر اتفاق ہے، اس پر نص شرعی موجود ہے۔"

② انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«غَیِّرُوْا الشَّیْبَ وَ لَاتُقَرِّبُوْهُ السَّوَادَ» [مسند احمد (۲۴۷/۳)، صحیح الجامع الصغیر(۴۱۶۹)]

"سفید بالوں کو بدلو اور ان کو سیاہی کے قریب نہ کرو۔"

③ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«کُنَّا یَوْمًا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ فَدَخَلَتْ عَلَیْهِ الْیَهُوْدُ فَرَاٰهُمْ بِیْضَ اللِّحٰی فَقَالَ مَا لَکُمْ لَا تُغَیِّرُوْنَ فَقِیْلَ اِنَّهُمْ یَکْرَهُوْنَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ وَ لٰکِنَّکُمْ غَیِّرُوْا وَ اِیَّایَ وَ السَّوَادَ» [مجمع الزوائد (۱۶۰/۵) طبرانی (۱۶۳/۵) امام هیثمی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے]

"ہم ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہودی آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سفید داڑھیاں دیکھ کر فرمایا: "تمھیں کیا ہے، تم انھیں رنگتے کیوں نہیں؟" کہا گیا کہ یہ نا پسند کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے مسلمانو! لیکن تم رنگ بدلو اور سیاہی سے بچتے رہو۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بالوں کی سفیدی کو بدلنے سے کراہت کرنا یہودیوں کا کام تھا۔ مسلمان سیاہ خضاب سے اجتناب کرتا ہے اور دیگر خضاب پسند کرتا ہے۔

④ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«یَکُوْنُ قَوْمٌ یَخْضِبُوْنَ فِیْ آخِرِ الزَّمَانِ بِالسَّوَادِ کَحَوَاصِلِ الْحَمَامِ لَا یَرِیْحُوْنَ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ» [مسند احمد(۲۷۳/۱)، بیهقی(۳۱۱/۷)، ابو داؤد، کتاب الترجل: باب فی الخضاب(۴۲۱۲)]

"آخر زمانے میں ایک قوم ہوگی جو کبوتر کے پوٹوں کی طرح سیاہ خضاب لگائیں گے، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائیں گے۔"

یہ حدیث بھی سیاہ خضاب کی ممانعت پر واضح طور پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں شدید وعید ہے۔

⑤ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« يَكُوْنُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ يُسَوِّدُوْنَ اَشْعَارَهُمْ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلَيْهِمْ » [مجمع الزوائد (١٦٤/٥)، طبراني اوسط (٣٨١٥)، اس کی سند جید ہے]

"آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے بال سیاہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائیں گے۔"

⑥ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ خَضَبَ بِالسَّوَادِ سَوَّدَ اللّٰهُ وَجْهَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ » [مجمع الزوائد(١٦٦/٥)]

"جس شخص نے سیاہ خضاب لگایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ سیاہ کر دے گا۔"

مذکورہ بالا چھ احادیث سے معلوم ہوا کہ سیاہ خضاب کی شریعت میں بڑی مذمت آئی ہے اور اس پر شدید وعید فرمائی گئی۔ اس لیے یہ حرام ہے اور گناہ کبیرہ ہے۔

علامہ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔[الزواجر(٢٦١/١)]

علاوہ ازیں داڑھی یا سر کے بالوں کو شادی بیاہ یا کسی کاروباری سلسلے کے لیے سیاہ کرنا دھوکا اور فراڈ ہے۔ اپنے بڑھاپے کو چھپانا، جوانی ظاہر کرنا ہے، دھوکا دہی اور اصلیت چھپانا بھی شرع محمدی میں حرام ہے۔ جو لوگ سیاہ خضاب نکاح یا جہاد کے موقع پر لگانے کا جواز پیش کرتے ہیں وہ ابن ماجہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّ اَحْسَنَ مَا اخْتَضَبْتُمْ بِهِ لَهٰذَا السَّوَادُ اَرْغَبُ لِنِسَائِكُمْ فِيْكُمْ وَ اَهْيَبُ لَكُمْ فِيْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمْ »[ابن ماجه ، كتاب اللباس : باب الخضاب بالسواد (٣٦٢٥)]

" بہترین خضاب جو تم لگاتے ہو وہ سیاہ رنگ کا ہے، جس سے تمھاری عورتیں تمھاری طرف زیادہ رغبت رکھیں اور تمھارے دشمن کے سینوں میں یہ ہیبت ناک ہے۔"

یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی چند وجوہات ہیں:

① رفاع بن دغفل سدوسی راوی اس کی سند میں ضعیف ہے۔

② عبدالحمید بن صیفی لین الحدیث ہے۔ اس سند کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " بعض راویوں کا بعض سے سماع معروف نہیں۔" لہٰذا یہ روایت کسی طرح بھی حجت نہیں ہو سکتی۔

چاندی کی انگوٹھی پہننا

سوال کیا چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو دائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنے یا بائیں ہاتھ کی انگلی میں؟

جواب مرد و عورت کسی کے لیے بھی چاندی کی انگوٹھی پہننے میں کوئی حرج نہیں، دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں

پہنی جا سکتی ہے مگر داہنے ہاتھ میں پہننا زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ بائیں کے مقابلہ میں دایاں بہتر اور افضل ہے۔

لیکن مردوں کے لیے سونے کی انگوٹھی یا گھڑی پہننا جائز نہیں ہے، یہ صرف عورتوں کے لیے خاص ہے۔ اس لیے کہ رسول ﷺ سے ایسی بہت سی حدیثیں مروی ہیں جو مردوں کے لیے سونے اور ریشم کی حرمت اور عورتوں کے لیے ان کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں۔

گھڑی باندھنا

سوال ہاتھ میں گھڑی باندھنے کا کیا حکم ہے؟ بہت سے لوگ یہ سمجھ کر کہ اس میں عورتوں کی مشابہت ہے ہمیں گھڑی باندھنے سے منع کرتے ہیں؟

جواب میں گھڑی پہننے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، اس میں عورتوں سے مشابہت کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ عورتوں اور مردوں کی گھڑیاں مختلف ہوتی ہیں۔ اگر ایک جیسی بھی ہوں تو بھی کوئی حرج نہیں، بالکل اسی طرح جس طرح عورتوں اور مردوں کی انگوٹھی مشترک ہوتی ہے اور دونوں کے لیے پہننا درست ہے۔ اس کے علاوہ گھڑی باندھنے کا مقصد زیب و زینت نہیں ہوتا بلکہ اوقات جاننے کے لیے باندھی جاتی ہے۔

عورت کا خوشبو لگا کر باہر نکلنا

سوال عورت کا خوشبو لگا کر باہر نکلنا کیسا ہے؟

جواب اگر اس کو عورتوں کے اجتماع میں شرکت کے لیے جانا ہو اور راستے میں مردوں کے قریب سے گزرنا پڑے تو اس کے لیے خوشبو استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور ایسے بازاروں میں جہاں مرد ہوں معطر ہو کر جانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''کوئی بھی عورت خوشبو استعمال کر کے ہمارے ساتھ نماز عشاء میں شریک نہ ہو۔'' [صحيح مسلم، كتاب الصلاة: باب خروج النساء الى المساجد (٤٤٤)]

اس معنی کی اور بھی حدیثیں ہیں۔ ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورت کا معطر ہو کر ان راستوں پر چلنا جہاں مرد ہوتے ہیں اور مردوں کے اجتماع میں جانا، جیسے مساجد وغیرہ ہیں، فتنہ کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اس کے برخلاف پردہ کا اہتمام کرنا اور زیب و زینت کی نمائش سے بچنا عورت پر واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح پہلے جاہلیت کے دنوں میں اظہار تجمل کرتی تھیں اس طرح زینت نہ دکھاؤ۔'' (الاحزاب : ٣٣)

مثلاً چہرہ اور سر وغیرہ کی بے پردگی بھی نمائش زیب و زینت میں داخل ہے۔

فیشن کے لیے ناخن بڑھانا

سوال عورتوں اور مردوں کا فیشن کے لیے ناخن بڑھانا کیسا ہے؟

جواب عورتوں اور مردوں کے لیے ناخن تراشنا فطرت میں سے ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ : قَصُّ الشَّارِبِ وَ إِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَ السِّوَاكُ وَ اسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَ قَصُّ الْاَظْفَارِ وَ غَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَ نَتْفُ الْإِبِطِ وَ حَلْقُ الْعَانَةِ وَ انْتِقَاصُ الْمَاءِ قَالَ زَكَرِيَّا قَالَ مُصْعَبٌ وَ نَسِيتُ الْعَاشِرَةَ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ الْمَضْمَضَةُ » [مسلم، كتاب الطهارة : باب خصال الفطرة (٢٦١)]

”دس اشیاء فطرت میں سے ہیں: مونچھیں تراشنا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی چڑھانا، ناخن تراشنا، انگلیوں کے جوڑوں کو دھونا، بغلوں کے بال اکھیڑنا، شرمگاہ کے اردگرد سے بال مونڈنا اور پانی کے ساتھ استنجاء کرنا۔“

زکریا بن ابی زائدہ کہتے ہیں کہ مصعب بن شیبہ نے کہا: ”میں دسویں بات بھول گیا ہوں، ہوسکتا ہے وہ کلی کرنا ہو۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ناخن تراشنا فطرت میں سے ہے۔ ہر مسلمان مرد و زن کو اپنے ناخن بڑھانے کی بجائے تراشنے چاہییں۔ جو لوگ ناخن بڑھاتے ہیں ان کا یہ عمل خلاف فطرت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حد چالیس دن مقرر فرمائی ہے یعنی چالیس دن کے اندر اندر ناخن تراش لینے چاہییں۔ انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا:

« وُقِّتَ لَنَا فِي قَصِّ الشَّارِبِ وَ تَقْلِيمِ الْاَظْفَارِ وَ نَتْفِ الْإِبِطِ وَ حَلْقِ الْعَانَةِ اَنْ لَا نَتْرُكَ اَكْثَرَ مِنْ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً » [مسلم، كتاب الطهارة : باب خصال الفطرة(٢٥٨)]

”ہمارے لیے مونچھیں تراشنے، ناخن کاٹنے، بغلوں کے بال اکھیڑنے اور شرمگاہ کے اردگرد کے بال مونڈنے کے لیے وقت مقرر کیا گیا ہے کہ چالیس راتوں سے زیادہ نہ چھوڑیں۔“

لہٰذا کسی مسلمان مرد یا عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے ناخن چالیس دنوں سے زیادہ تک ترک کردے بلکہ چالیس دن کے اندر اندر یہ تراش دینے چاہییں۔ جن لوگوں نے فیشن کے لیے ناخن بڑھا رکھے ہیں اور انھیں تراشنے سے جی چراتے ہیں انھیں اپنے عمل پر توجہ دینی چاہیے، اگر ہم ان فطری امور کا لحاظ نہیں رکھتے تو ایک مسلم اور غیر مسلم میں ظاہری طور پر کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ شریعت اسلامیہ نے داڑھی بڑھانے، مونچھیں کاٹنے اور ناخن تراشنے وغیرہ جیسے احکام مقرر کر کے مسلمان کا غیر مسلم سے عملی فرق واضح کر دیا ہے۔ لہٰذا ان امور سے غفلت برتنا اپنی پہچان کھو دینا ہے۔

راہ چلتے اگر کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

سوال کیا راستے میں چلتے ہوئے اگر کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو فوراً نظر پھیر لینا چاہیے یا نہیں اور حدیث میں ہے کہ پہلی نظر

معاف ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر سمجھی جاتی ہے، غلط نظر انسان کو گمراہی کے دہانے پر پہنچا دیتی ہے۔ اسی لیے اسے آنکھ کا زنا بھی کہا گیا ہے۔ لہٰذا اس کے استعمال میں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ قرآن حکیم میں نظر کو نیچا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ اسے بچا کر رکھا جائے۔ اگر راستے میں چلتے چلتے کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو اسے فوراً پھیر لینا چاہیے نہ کہ ٹکٹکی باندھ کر مسلسل دیکھتے جائیں۔ نظر کے پیچھے نظر لگائے رکھنا حرام ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''نظر کے پیچھے نظر نہ لگاؤ۔'' [ابو داؤد، کتاب النکاح : باب ما یؤمر به من غض بصر (۲۱٤۸)]

اسی طرح مسند احمد وغیرہ میں حدیث ہے کہ جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اچانک نظر کا کیا حکم ہے تو آپ نے فرمایا: ''اپنی نگاہ کو پھیر لو۔'' [مسند احمد (۳٦۱/٤)]

یہ حدیث اس بات پر نص صریح ہے کہ نظر پڑ جائے تو پہلی بار ہی دیکھتے نہیں رہنا چاہیے بلکہ فوراً نگاہ پھیر لینی چاہیے۔ اگر ہر شخص یہ خیال کرے کہ اس کی ماں، بہن، بیوی، بیٹی پر اگر کوئی شخص اس طرح نظر ڈالے رہے تو کیا وہ اس بات کو پسند کرے گا؟ جواب نفی میں ہو گا۔ جب ایماندار شخص اپنے گھر کی خواتین کے بارے یہ پسند نہیں کرتا تو دوسرے شخص کی ماں، بہن وغیرہ کے بارے میں بھی اسی طرح محتاط رہنا چاہیے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ صحیح شرم و حیا کی دولت سے مالا مال رکھے اور نظر کی پراگندگی سے محفوظ رکھے۔ (آمین!)

شادی شدہ عورت کے لیے باپ کی اطاعت

سوال اگر کسی عورت کا باپ اسے اپنے خاوند کے ہاں جانے سے روکے تو کیا عورت پر اپنے باپ کی اطاعت ضروری ہے یا نہیں، نیز اس کا باپ شرعی لحاظ سے مجرم ہے یا نہیں؟

جواب کسی بھی عورت کے باپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو اس کے خاوند کے پاس جانے سے روکے اور اگر باپ منع کرے تو عورت پر باپ کی بات ماننا ضروری نہیں۔ کیوں کہ نکاح کے بعد عورت پر زور و اختیار اس کے شوہر کا ہوتا ہے اور باپ شرعی عذر کے بغیر روکنے پر گناہ گار اور مجرم ہو گا۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے ہر شخص راعی و نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھ گچھ ہو گی...... عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگران اور راعیہ ہے، اس سے بھی اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

[مسلم، کتاب الإمارة: باب فضیلة الأمیر العادل و عقوبة الجائر (۱۸۲۹)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ شادی کے بعد عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار بن جاتی ہے اور اس سے گھر کے متعلق پوچھ گچھ ہو گی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا:

''عورت پر لوگوں میں سے سب سے زیادہ کس کا حق ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اس کے خاوند کا۔'' میں نے کہا: ''آدمی پر لوگوں میں سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی ماں کا۔'' [کشف الاستار عن زوائد البزار (١٤٦٢)، نسائی کبریٰ (١٧٤/٣)، عشرة النساء (٢٦٦)]

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب عورت پانچ نمازیں ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور شرمگاہ کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے تو اسے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہتی ہے گزر جاؤ۔'' [مسند احمد (١٩١/١)]

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ عورت پر سب سے زیادہ حق اس کے خاوند کا ہے اور اگر خاوند کی اطاعت کرتی ہے تو جنت کے سب دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں۔ حصین محصن کہتے ہیں کہ میری پھوپھی نے مجھے حدیث بیان کرتے ہوئے بتایا:

''میں نبی کریم ﷺ کے پاس کسی ضرورت کے تحت گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم خاوند والی ہو؟'' میں نے کہا: ''ہاں!'' تو آپ ﷺ نے کہا: ''تم اس کے حق میں کیسی ہو؟'' کہنے لگیں: ''میں نے اس کے حق میں کبھی کوتاہی نہیں کی سوائے اس کام کے جس کے کرنے میں عاجز آ جاؤں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اس کی نسبت کہاں ہو، وہ تمھاری جنت اور جہنم ہے۔'' [المستدرك للحاكم (٥٤٨/٢)، (١٨٩/٢)، (٢٨٦٩)]

یہ صحیح حدیث بھی خاوند کی اہمیت پر بڑی عیاں اور واضح ہے۔ لہٰذا عورت کو اپنے شوہر کی بات ماننا چاہیے اور اس کے باپ کو اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔

خوش طبعی

سوال دوست احباب کا آپس میں خوش طبعی کرنا کیسا ہے؟ کیا یہ لہو ولعب کے زمرے میں آ کر منع تو نہیں؟ وضاحت کریں۔

جواب دوست احباب کا آپس میں خوش طبعی کرنا اگر حقیقت پر مبنی ہو اور شریعت کا استہزا و مذاق نہ ہو تو بالکل درست ہے۔ نبی کریم ﷺ خود بھی خوش طبعی فرمایا کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ انس رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی ابو عمیر کے پاس ایک سرخ چونچ والا پرندہ تھا، جس کے ساتھ وہ کھیلتا تھا، جب وہ پرندہ مر گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے کہا:

''سرخ چونچ والے پرندے نے کیا کیا؟'' [بخاری، کتاب الأدب: باب الانبساط إلى الناس (٦١٢٩)، مسلم، کتاب الأدب: باب جواز تكنية من لم يولد (٢١٥٠)]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا:

''اے اللہ کے رسول! یقیناً آپ بھی ہمارے ساتھ کھیلتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا۔''

[ترمذی ، کتاب البر والصلة : باب ما جاء فی المزاح (۱۹۹۰)]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سواری کے لیے اونٹ طلب کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہم تجھے اونٹنی کے بچے پر سوار کریں گے۔'' اس نے کہا: ''میں اونٹنی کا بچہ کا کیا کروں گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر اونٹ کسی نہ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔'' [ابوداؤد ، کتاب الأدب: باب ما جاء فی المزاح (٤٩٩١)، ترمذی کتاب البر والصلة: باب ما جاء فی المزاح (۱۹۹۱)]

اسی طرح آپ ﷺ نے انس رضی اللہ عنہ سے کہا:

((يَا ذَا الْأُذُنَيْنِ !)) ''اے کانوں والے!''

[ترمذی، کتاب البر والصلة (۱۹۹۲)، ابوداؤد، کتاب الأدب (۵۰۰۲)]

الغرض ایسی خوش طبعی جو جھوٹ پر مبنی ہو وہ جائز نہیں۔ کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

''اس آدمی کے لیے بربادی ہے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے، اس کے لیے بربادی ہے۔''

[ابوداؤد، کتاب الأدب: باب التشديد فی الكذب(٤٩٩٠)، ترمذی، کتاب الزهد: باب ما جاء من تكلم بالكلمة يضحك الناس (۲۳۱۵)]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بلوغ المرام (۱۵۴۴) میں فرماتے ہیں: ''اس کی سند قوی ہے۔'' لہٰذا جھوٹ کہنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM
KITABOSUNNAT@GMAIL.COM

چند اہم مسائل کا بیان

WWW. KITABOSUNNAT.COM

شادی کرنے میں بھی والدین کی اطاعت

(سوال) میں ایک ثیبہ (شوہر دیدہ) سے شادی کا خواہش مند ہوں، میرے والد راضی ہیں، لڑکی اور اس کے اہل خانہ بھی راضی ہیں، صرف میری والدہ راضی نہیں ہیں، وہ اس رشتہ کو ناپسند کرتی ہیں، کیا میں اپنی والدہ کی پسند و ناپسند کی پروا کیے بغیر اس عورت سے شادی کر سکتا ہوں؟ کیا شادی کر لینے کے بعد میں اپنی والدہ کا نافرمان کہلاؤں گا یا نہیں؟

(جواب) والدہ کا بہت بڑا حق ہے اور اس سے حسن سلوک سے پیش آنا ایک اہم فریضہ ہے، میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ جس عورت کو آپ کی والدہ ناپسند کرتی ہیں اس سے شادی نہ کریں، اس لیے کہ وہ تمام لوگوں سے زیادہ آپ کی خیر خواہ ہیں۔ ہو سکتا ہے انھیں اس عورت کے اخلاق سے متعلق ایسی باتوں کا علم ہو جو آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ ویسے آپ کو اس کے علاوہ بھی بہت سی عورتیں مل سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ [طلاق : ۲،۳]

”جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو وہاں سے رزق عطا فرماتا ہے جہاں سے اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔“

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ والدہ کی دل جوئی و فرمانبرداری تقویٰ میں سے ہے، الا یہ کہ والدہ دیندار نہ ہو اور مخطوبہ دیندار اور تقویٰ والی ہو۔ اگر بات ایسی ہو جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے تو پھر اس معاملہ میں آپ پر والدہ کی اطاعت لازم نہیں ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

« اِنَّمَا الطَّاعَةَ فِي الْمَعْرُوْفِ » [بخاری، کتاب الأحکام: باب السمع والطاعة: (۷۱٤٥)]

”اطاعت صرف نیک کاموں میں ہے۔“

اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو ایسے کام کرنے کی توفیق دے جس سے وہ راضی ہو نیز جو چیز آپ کے حق میں مفید ہو اور آپ کے دین و دنیا کے لیے کارآمد ہو اسے آپ کے لیے آسان بنا دے۔ [ابن بازؒ]

ولدیت تبدیل کرانے کا حکم

(سوال) بیرون ملک ملازمت کے لیے ولدیت تبدیل کرانے کا کیا حکم ہے؟

(جواب) زمانہ جاہلیت سے رواج چلا آ رہا تھا جو ابتدائے اسلام میں بھی موجود رہا کہ لوگ لے پالکوں کو حقیقی بیٹا سمجھتے تھے اور انھیں حقیقی بیٹوں کی مانند حقوق حاصل تھے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لے کر پالا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انھیں زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ کر پکارتے تھے۔ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل کی:

﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ مَوَالِيْكُمْ وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الاحزاب:۵]

”لے پالکوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف منسوب کر کے بلاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پورا انصاف یہی ہے۔ اگر تمھیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو وہ تمھارے دینی بھائی اور دوست ہیں اور جو تم سے بھول چوک ہو جائے اس میں تم پر گناہ نہیں، البتہ گناہ وہ ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو اور اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔“ [بخاري، كتاب التفسير: باب ادعوهم لآباء هم هو أقسط عند الله (٤٧٨٢)، مسلم، كتاب فضائل الصحابة: باب فضائل زيد بن حارثة و أسامة بن زيد(٢٤٢٥)، تحفة الأحوذي(٥٨/٩)]

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت سہلہ بنت سہیل بن عمرو جو حضرت حذیفہ ابن عتبہ کی بیوی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہنے لگی: ”ابو حذیفہ کا غلام سالم ہمارے پاس آتا ہے اور میں کام کاج کے لباس میں ہوتی ہوں، ہم اسے بیٹا سمجھتے ہیں۔“ ابو حذیفہ نے اسے اسی طرح متبنیٰ بنا رکھا تھا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو بیٹا بنایا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔

﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [الاحزاب:۵]

”لے پالکوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ، اللہ تعالیٰ کے نزدیک پورا انصاف یہی ہے۔“

[بخاري، كتاب النكاح: باب الإكفاء في الدين(٥٠٨٨)، ابو داؤد (٢٠٦١)، ابن الجارود (٦٩٠)، مؤطا مالك(٦٠٥/٢)، دارمي(٨١/٢)، عبد الرزاق(٤٠٩/٧)، مسند احمد(٢٠١/٦)، صحيح ابن حبان (٤٢/٢)، بيهقي(٤٠٩/٧)، مسلم(١٤٥٣)، ابن ماجه(١٩٤٣)، مسند حميدي (٢٧٨)]

اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں کہا جاتا تھا بلکہ انھیں ان کے باپ حارثہ ہی کی طرف منسوب کر کے پکارا جاتا تھا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جاہلی رسم کی ممانعت کر دی اور ساری نسبتیں ختم کر کے حقیقی باپوں کی طرف منسوب کر کے بلانے کا حکم دیا۔ جس کی نسبت کا علم نہیں تو انھیں بیٹا کہنے کی بجائے بھائی اور دوست کہنا چاہیے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

« اَنْتَ اَخُوْنَا وَ مَوْلَانَا » [بخاري، كتاب المغازي: باب عمرة القضاء (٤٢٥١)، مسند احمد(١١٥/١)، شرح السنة (١٤٠/١٤)، بيهقي(٦/٨)،(٢٢٦/١٠)، مستدرك حاكم(١٢٠/٣)]

”تم ہمارے بھائی اور دوست ہو۔“

جو شخص جان بوجھ کر غلط انتساب کرے گا وہ سخت گناہ گار ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحیفے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے:

« وَ مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ اَوِ انْتَمٰی اِلٰی غَیْرِ مَوَالِیْهِ فَعَلَیْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلَائِکَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ صَرْفًا وَ لَا عَدْلًا »[مسلم ، کتاب الحج: باب المدینة حرم بین عیر إلی ثور(١٣٧٠) ، ترمذی(٢١٢٠) ، ابن ماجه(٢٦٠٩)، مسند احمد(٣٢٨/١)، مسند ابی یعلی(٢٥٤٠)، ابو داؤد (٥١١٥)]

”جس شخص نے اپنے باپ کے علاوہ کی طرف نسبت کی یا جس غلام نے اپنے موالی (جنھوں نے اسے آزاد کیا) کے علاوہ نسبت کی اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہو، قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اس سے نفلی اور فرض کوئی عبادت قبول نہیں کرے گا۔“

نبی کریم ﷺ کا ایک اور ارشاد گرامی ہے:

« مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ وَ هُوَ یَعْلَمُ اَنَّهٗ غَیْرُ اَبِیْهِ فَالْجَنَّةُ عَلَیْهِ حَرَامٌ »[بخاری، کتاب الفرائض : باب من ادعی الی غیر أبیه(٦٧٦٦)، و فی کتاب المغازی (٤٣٢٦، ٤٣٢٧) ، ابن ماجه(٢٦١٠)، مسند طیالسی(١٩٩)، عبد الرزاق (١٦٣١٠)، (١٦٣١٣) ، ابن ابی شیبة(٨٢٥/٨)، مسند احمد(١٦٩/١)، مسند عبد بن حمید(١٣٥)، ابو داؤد(٥١١٣) ، مسند ابی یعلی (٧٠٠)، مسند ابو عوانة(٢٩/١)، شرح السنة(٢٣٧٦)]

”جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کی طرف منسوب کیا اور وہ جانتا بھی ہے کہ وہ میرا باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے۔“

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ لَمْ یَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَ اِنَّ رِیْحَهَا لَیُوْجَدُ مِنْ مَسِیْرَةِ خَمْسِ مِائَةِ عَامٍ »[ابن ماجه، کتاب الحدود: باب من ادعی الی غیر أبیه او تولی غیر موالیه(٢٦١١)، مسند احمد (١٧١/٢)، مسند طیالسی(٢٢٧٤)]

”جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا اور بلاشبہ جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے پائی جائے گی۔“

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

« لَیْسَ مِنْ رَجُلٍ ادَّعٰی لِغَیْرِ اَبِیْهِ وَ هُوَ یَعْلَمُهٗ اِلَّا کَفَرَ بِاللّٰهِ وَ مَنِ ادَّعٰی قَوْمًا لَیْسَ لَهٗ فِیْهِمْ نَسَبٌ فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ »[مسلم ، کتاب الایمان: باب بیان حال إیمان من قال لأخیه المسلم یا کافر! (٦١)، مسند احمد(١٦٦/٥)]

”جو شخص جانتے ہوئے بھی اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف نسبت کی اس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا اور جس نے

کسی ایسی قوم میں سے ہونے کا دعویٰ کیا جس قوم میں اس کا نسب نہیں ہے تو وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔"

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:

"«اِدَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ» اَیْ نَسَبَهٗ اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ «اِلَّا کَفَرَ» کُفْرًا مُخْرِجًا عَنِ الْاِسْلَامِ اِنْ کَانَ مُسْتَحِلًّا لَهٗ وَ اِلَّا فَقَدْ کَفَرَ النِّعْمَةَ وَ الْاِحْسَانَ وَحَقَّ اللّٰهِ وَ حَقَّ اَبِیْهِ وَ هٰذَا کَمَا قَالَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ عَنِ النِّسَاءِ یَکْفُرْنَ ثُمَّ خَسَّرَهٗ بِکُفْرَانِهِنَّ الْاِحْسَانَ وَ کُفْرَانِ الْعَشِیْرِ"

[منة المنعم(۹۱/۱)]

"جس شخص نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی کی طرف حلال سمجھتے ہوئے نسبت کی تو اس نے ایسے کفر کا ارتکاب کیا جو اسلام سے خارج کرنے والا ہے اور اگر ایسے نہیں ہے تو اس نے نعمت، احسان، اللہ کے حق اور اپنے باپ کے حق سے کفر کیا ہے یعنی کفران نعمت کا مرتکب ہوا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے کفر کے بارے میں فرمایا پھر اس کی تفسیر کفران احسان اور کفران عشیر سے کی۔"

مذکورہ بالا آیت اور صحیح وصریح احادیث سے معلوم ہوا کہ کسی بھی شخص کے لیے اپنے باپ کے علاوہ کسی کی طرف نسبت کرنا حلال نہیں، جو شخص جانتے بوجھتے اپنے آپ کو کسی کی طرف منسوب کرے تو وہ کفر صریح کا مرتکب ہوتا ہے اور جس شخص کے باپ کا علم نہ ہو اسے بیٹا کہنے کی بجائے بھائی یا دوست کہا جائے۔ البتہ اگر کوئی کسی چھوٹے کو محبت اور پیار سے بیٹا یا بھتیجا کہے تو وہ الگ بات ہے۔

مذکورہ بالا آیت اور احادیث اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو خواہ اپنے ملک میں یا بیرون ملک، کسی صورت میں بھی اپنے آپ کو غیر باپ کی طرف منسوب نہیں کر سکتا اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے دلیل لینا بالکل غلط ہے کیونکہ آیت کے نزول کے بعد زید بن محمد (ﷺ) نہیں کہا جاتا تھا۔ احکامات منسوخہ سے استدلال کرنا بالکل مردود ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے خلاف ظاہر بات کہنے سے دلیل لینا بھی بالکل غلط اور باطل ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس امر کی تصریح فرما دی ہے کہ غیر باپ کی طرف جان بوجھ کر نسبت کرنے والا کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔

دوسرے ملک میں کاروبار کی غرض سے ولدیت بدل کر جانے کو ابراہیم علیہ السلام کے معاملہ سے ذرہ بھر بھی علاقہ نہیں ہے۔ بخاری شریف کی مذکورہ حدیث اس امر پر بالکل واضح ہے کہ نسبت بدلنا حرام ہے۔

توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی اصل ولدیت اپنے کاغذات پر تحریر کرے، اپنے کیے پر ندامت اختیار کرے اور اللہ کے حضور سچے دل سے معافی چاہے کیونکہ سچی توبہ کے لیے ضروری ہے کہ پچھلے گناہ کو ترک کرے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے اور اپنے کیے پر ندامت اختیار کر کے اللہ سے استغفار کر لے۔

جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے ریاض الصالحین میں توبہ کے باب میں ذکر کیا ہے۔ اپنے کاغذات میں اپنی اصل ولدیت تحریر کرنا ضروری ہے۔ جان بوجھ کر غلط ولدیت لکھنے کے متعلق اوپر ذکر کردہ احادیث پر غور کر لیں۔ اگر اصل ولدیت تحریر نہ کر سکے اور وہاں رہ کر اسلامی احکامات کا اظہار نہ کر سکے تو ایسا شخص اپنے وطن واپس آ جائے۔

علاوہ ازیں ایسے افراد کی دیگر ممالک میں رہ کر کمائی کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر وہاں رہ کر صحیح حلال کام و تجارت کرتے ہیں تو آمدنی حلال ہے بصورت دیگر حرام۔ یہ غلط ولدیت تحریر کرنے کی وجہ سے احادیث میں مذکور وعید کے مستحق ضرور ہیں لیکن ان کی کمائی پر حرمت کا حکم تب لگے گا جب وہ وہاں حرام کام کر کے اجرت لیں کیونکہ فعل حرام پر اجرت حرام ہے۔

جیسے شراب بنانا حرام ہے اور شراب بیچ کر اجرت لینا بھی حرام ہے۔ سود حرام ہے اور سود کے ذریعے کمائی کر کے کھانا بھی۔ حرام سودی معاملات میں تعاون کرنے والے کاتب اور گواہ بھی اس پر جو اجرت لیں گے، وہ حرام ہے۔

اسی طرح زنا حرام ہے اور زنا کی اجرت بھی۔ الغرض فعل حرام پر اجرت درست نہیں اور اگر فعل صحیح جائز اور شرعی ہے تو اس پر لی گئی اجرت درست ہے۔

اولاد کے نان ونفقہ کی ذمہ داری

سوال کیا گھریلو اخراجات اور اولاد کے نان ونفقہ کی ذمہ داری عورت پر ہے یا مرد پر؟

جواب عورت کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اللہ نے مرد پر ڈالی ہے، عورت اگرچہ مال دار ہی کیوں نہ ہو وہ گھر کے اخراجات کی ذمہ دار نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔"

اس آیت کریمہ میں مرد کو دو وجہ سے حاکم قرار دیا گیا ہے۔

ا۔ وہبی فضیلت :

کہ اللہ نے مرد کو فطری طور پر ایسا بنایا ہے کہ اسے عورت پر درجہ و مقام حاصل ہے۔

۲۔ کسبی فضیلت :

کہ مرد اپنا مال و متاع خرچ کرتا ہے اس مال کے خرچ کرنے کی وجہ سے بھی مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"عورت کے لیے کھانا اور کپڑا عرف کے مطابق مہیا کرنا بچے کے باپ پر فرض ہے"۔ [البقرہ: ۲۳۳]

ان دو آیات کریمہ سے واضح ہوا کہ مال خرچ کرنا، کھانا اور لباس فراہم کرنا مرد کی ذمہ داری ہے، اولاد کے باپ کا حق ہے کہ وہ بچوں کی ماں کو کھانا اور کپڑا لا کر دے۔ ہر مرد کی آمدنی کے لحاظ سے خرچ کا تعین کیا جائے گا، اگر مرد کے پاس اسباب و ذرائع زیادہ ہیں تو اس کا حق ہے کہ وہ اپنی دولت کے لحاظ سے عورت کو سہولتیں دے اور جس طرح کا کھانا پینا اور لباس خود پسند کرتا ہے بیوی کو بھی اسی حساب سے دے اور اگر کوئی مرد تنگ دست ہے تو وہ اپنی آمدن کے لحاظ سے خرچ کرے گا۔ بہر صورت نان ونفقہ کی ذمہ داری اللہ نے مرد کے کندھوں پر ڈالی ہے، عورت کا یہ حق نہیں کہ وہ گھر کے اخراجات

برداشت کرنے کے لیے نوکری و جاب تلاش کرے، اس کا حق ہے کہ گھر کی چار دیواری میں خاوند کی خدمت، گھر کی نگرانی اور بچوں کی نگہداشت کرے، دفاتر، بازار، کارخانہ وفیکٹری، ہوٹلز وریسٹورنٹ وغیرھا کی زینت نہ بنے۔

میاں بیوی میں علیحدگی کی صورت میں نابالغہ بچی کے خرچہ کا حکم

سوال میاں بیوی میں علیحدگی کی صورت میں نابالغہ بچی کا خرچہ کس پر ہے؟

جواب مذکورہ صورت اگر صحیح رقم کی گئی ہے تو اس میں نابالغہ بچی کا خرچ والد پر واجب ہے اور والد شرعی طور پر پابند ہے کہ وہ اپنی بچی کا نان ونفقہ ادا کرے، بچی خواہ والد کے پاس ہو یا والدہ کے پاس۔ سید الفقہاء امام المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک باب یوں قائم کیا ہے" باب وجوب النفقة على الأهل و العيال" کہ مرد پر بیوی بچوں کا خرچ دینا واجب ہے۔ پھر اس کے تحت یہ حدیث لائے ہیں:

« عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ مَا تَرَكَ غِنًى وَ الْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى وَ ابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ تَقُوْلُ الْمَرْأَةُ اِمَّا اَنْ تُطْعِمَنِیْ وَ اِمَّا اَنْ تُطَلِّقَنِیْ وَ يَقُوْلُ الْعَبْدُ أَطْعِمْنِیْ وَ اسْتَعْمِلْنِیْ وَ يَقُوْلُ الابْنُ أَطْعِمْنِیْ إِلٰى مَنْ تَدَعُنِیْ »

[صحيح بخاری ، كتاب النفقات : باب وجوب النفقة على الأهل والعيال (٥٣٥٥)]

" ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" سب سے بہترین صدقہ وہ ہے جسے ادا کرنے کے بعد دینے والا مالدار ہی رہے اور دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور سب سے پہلے اپنے زیر کفالت افراد پر خرچ کرو، بیوی کہتی ہے مجھے کھلاؤ یا طلاق دو اور غلام کہتا ہے مجھے کھلاؤ اور کام پر لگاؤ اور بیٹا کہتا ہے مجھے کھلاؤ۔ مجھے کس کے سپرد کرتے ہو؟"

اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى وَ ابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ [صحيح بخاری ، كتاب النفقات : باب وجوب النفقة على الاهل والعيال (٥٣٥٦)، سنن النسائی ، كتاب الزكاة : باب ای الصدقة افضل (٢٥٤٥)، مسند احمد (٢/٢٧٨)، (٧٧٤١) ، صحيح ابن حبان (٤٢٤٣)، بيهقى (٤/١٧٧)، كتاب العيال (٧) لابن ابی الدنيا ، حلية الأوليا(٢/١٨١)، تاريخ بغداد(٨/٤٨٢)]

" بہترین صدقہ وہ ہے جس کے ادا کرنے کے بعد آدمی مالدار رہے اور سب سے پہلے اپنے زیر کفالت افراد پر خرچ کرو۔"

قعقاع بن حکیم کہتے ہیں کہ عبدالعزیز بن مروان نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف لکھا:

" إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ إِنَّ الْيَدَ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى وَ ابْدَأْ

بِمَنْ تَعُوْلُ وَ لَسْتُ أَسْأَلُكَ شَيْئًا وَ لَا أَرُدُّ رِزْقًا رَزَقَنِيهِ اللّٰهُ مِنْكَ" [مسند احمد (٢/٤)،(٤٤٧٤)، طبقات ابن سعد(١٥٠/٤)، مسند أبي يعلى (٥٧٣٠)، الجامع الصغير(١٠٠٢٧)]

"بلاشبہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: "دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور جو لوگ تیرے زیر کفالت ہیں ان پر پہلے خرچ کر۔ میں تجھ سے کسی چیز کا سوال نہیں کرتا اور جو رزق مجھے اللہ نے تجھ سے دیا اسے میں رد نہیں کروں گا۔"

مذکورہ بالا احادیث صحیحہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان پر اس کے زیر کفالت افراد کا خرچ واجب ہے، یہ بھی یاد رہے کہ والد پر اولاد کا نان ونفقہ اس وقت تک واجب ہے جب تک لڑکا بالغ نہ ہو جائے اور لڑکی کا نکاح نہ کر دیا جائے۔

لڑکے کی بلوغت اور لڑکی کے نکاح کے بعد ان کا نفقہ والد کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے بشرطیکہ لڑکا کمانے پر قادر ہو ،معذور نہ ہو۔حافظ الحدیث حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ذَهَبَ الْجُمْهُوْرُ إِلَى أَنَّ الْوَاجِبَ أَنْ يُّنْفِقَ عَلَيْهِمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الذَّكَرُ أَوْ تَتَزَوَّجَ الْأُنْثٰى ثُمَّ لَا نَفَقَةَ عَلَى الْأَبِ إِلَّا أَنْ كَانُوْا زَمْنٰى فَإِنْ كَانَتْ لَهُمْ أَمْوَالٌ فَلَا وُجُوْبَ عَلَى الْأَبِ وَ أَلْحَقَ الشَّافِعِيُّ وَ لَا الْوَلَدَ وَ إِنْ سَفَلَ بِالْوَلَدِ فِيْ ذٰلِكَ " [فتح الباری (٥٠٠/٩،٥٠١)]

" جمہور ائمہ محدثین رحمہم اللہ اس طرف گئے ہیں کہ باپ پر اولاد کا نفقہ واجب ہے، یہاں تک کہ لڑکا بالغ ہو جائے اور لڑکی کی شادی ہو جائے، اس کے بعد والد پر کوئی نفقہ نہیں الا یہ کہ اولا لنگڑی لولی اور معذور ہو۔پس اگر اولاد صاحب مال ہو تو پھر باپ پر نفقہ واجب نہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ نے پوتوں، پڑپوتوں کو بھی نیچے تک اس حکم میں اولاد کے ساتھ ملحق کیا ہے۔"

لہٰذا باپ پر اس نابالغہ بچی کا خرچہ واجب ہے اور باپ شرعی طور پر اس حق کی ادائیگی کا پابند ہے بصورت دیگر سخت گناہ گار ہو گا۔لیکن اس خرچہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں عدالت کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ باپ کو اس بچی سے ملنے پر کسی قسم کا حکم امتناعی جاری کر سکے کیونکہ جس طرح نابالغہ بچی کا نفقہ شرعاً باپ پر واجب ہے اسی طرح باپ کو اپنی بچی سے ملاقات کا بھی شرعاً حق حاصل ہے اور اس کے اس شرعی حق کو عدالت سلب نہیں کر سکتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ﴾ [البقرة:٢٣٣]

"ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے یا باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔"

پس عدالت ایسی پابندی لگانے کی شرعاً مجاز نہیں ،ہاں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نابالغہ بچی کی پرورش کا حق اس کی ماں ہی کو ہے، ماں ہی اس کو اپنے پاس رکھے گی اور ہر طرح سے اس کی پرورش کرے گی۔مگر عدالت یا ماں اس بچی کے والد کو اس سے ملاقات کرنے سے روک نہیں سکتے۔

عدالت نے اگر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے جو اللہ نے اس آیت میں فرمایا:

﴿ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ٢٣٣]

''ہر ایک نفس کو اس کی ہمت و بساط کے مطابق حکم ہوا کرتا ہے۔''

اس کے علاوہ سورۂ طلاق میں ہے:

﴿ لِيُنفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهٖ وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتٰهُ اللّٰهُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتٰـهَا ﴾ [الطلاق :٧]

''جو وسعت والا ہے وہ اپنی وسعت سے خرچ کرے گا اور جس کا رزق تنگ ہے وہ بھی اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرے گا، اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اتنا ہی حکم کرتا ہے جتنی اس کو طاقت دی ہے۔''

تو عدالت بلاشبہ خرچ کی ادائیگی پر مجبور کرسکتی ہے اور عدالت کو اپنے اختیار بروئے کار لا کر ایسا بندوبست کرنا چاہیے جس کی وجہ سے باپ یہ خرچ ادا کرنے پر مجبور ہو جائے اور اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

اگر میاں بیوی میں جدائی ہو جائے تو اولاد کس کے پاس رہے گی

سوال اگر میاں بیوی میں جدائی ہو جائے تو اولاد کس کے پاس رہے گی؟

جواب مذکورہ بالا صورت کی تفسیم کے لیے درج ذیل احادیث صحیحہ و حسنہ پر غور کیا جائے:

① نبی کریم ﷺ نے کفار مکہ سے جب صلح کا معاہدہ کیا اور اس کے نتیجے میں آئندہ سال عمرہ کے لیے تشریف لے گئے اور تین دن کی مدت پوری ہوگئی تو مکہ والے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا:

« قُلْ لِصَاحِبِكَ أُخْرُجْ عَنَّا فَقَدْ مَضَى الْاَجَلُ فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَتَبِعَتْهُ ابْنَةُ حَمْزَةَ تُنَادِيْ يَا عَمِّ! يَا عَمِّ! فَتَنَاوَلَهَا عَلِيٌّ فَأَخَذَ بِيَدِهَا وَ قَالَ لِفَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلَامُ دُوْنَكِ ابْنَةَ عَمِّكِ حَمَلَتْهَا فَاخْتَصَمَ فِيْهَا عَلِيٌّ وَ زَيْدٌ وَ جَعْفَرٌ قَالَ عَلِيٌّ اَنَا اَخَذْتُهَا وَ هِيَ بِنْتُ عَمِّيْ وَ قَالَ جَعْفَرٌ هِيَ ابْنَةُ عَمِّيْ وَ خَالَتُهَا تَحْتِيْ وَ قَالَ زَيْدٌ بِنْتُ أَخِيْ فَقَضٰى بِهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لِخَالَتِهَا وَ قَالَ الْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْاُمِّ وَ قَالَ لِعَلِيٍّ اَنْتَ مِنِّيْ وَ اَنَا مِنْكَ قَالَ لِجَعْفَرٍ أَشْبَهْتَ خَلْقِيْ وَ خُلُقِيْ وَ قَالَ لِزَيْدٍ اَنْتَ اَخُوْنَا وَ مَوْلَانَا وَ قَالَ عَلِيٌّ اَلَا تَتَزَوَّجُ بِنْتَ حَمْزَةَ ؟ قَالَ اِنَّهَا بِنْتُ اَخِيْ مِنَ الرَّضَاعَةِ » [صحيح البخاری ، كتاب المغازی : باب عمرة القضاء (٤٢٥١)، سنن ابی داود، کتاب الطلاق : باب من احق بالولد (٢٢٧٨)، مسند احمد(١/ ١١٥)، (٩٣١)، مستدرك حاكم(٣/ ١٢٠)، مسند بزار(٧٤٤، كشف)، ابن حبان (٧٠٤٦)، ابن ابی شيبة(١٢/ ١٠٥)، بيهقی(٨/ ٦)]

''اپنے ساتھی سے کہو کہ اب یہاں سے چلے جائیں کیونکہ مدت پوری ہو چکی ہے۔'' جب نبی کریم ﷺ مکہ سے نکلے تو حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی چچا چچا کہتے ہوئے آئی، علی رضی اللہ عنہ نے اسے لے لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس

لے آئے اور کہا: ''اپنے چچا کی بیٹی کو لے لو، میں اسے اٹھا لایا ہوں۔'' اس بچی کے بارے علی، زید اور جعفر رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہوا، علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں نے اسے پکڑا ہے، یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔'' جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہیں۔'' اور زید رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ میرے بھائی کی لڑکی ہے۔'' لیکن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خالہ کے حق میں فیصلہ دیا اور فرمایا: ''خالہ ماں کے درجہ میں ہوتی ہے۔'' اور علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ''تم مجھ سے اور میں تم سے ہوں۔'' جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تم شکل وصورت اور عادات واخلاق میں مجھ سے مشابہ ہو۔'' اور زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تم ہمارے بھائی اور مولی ہو۔'' علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ''آپ حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لے لیں۔'' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔''

② عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! إِنَّ ابْنِيْ هٰذَا كَانَ بَطْنِيْ لَهُ وِعَاءً وَثَدْيِيْ لَهُ سِقَاءً وَ حِجْرِيْ لَهُ حِوَاءً وَ إِنَّ اَبَاهُ طَلَّقَنِيْ وَ اَرَادَ اَنْ يَّنْتَزِعَهُ مِنِّيْ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ أَنْتِ اَحَقُّ بِهٖ مَا لَمْ تَنْكِحِيْ »[سنن ابی داود ، کتاب الطلاق ، باب من احق بالولد(٢٢٧٦)، بیهقی(٨/٤)، مستدرك حاكم(٢/٢٠٧)، مسند احمد (٢/١٨٢)،(٦٧٠٧)، عبد الرزاق (١٢٠٩٧) ، سنن الدار قطنی(٣٧٦٦، ٣٧٦٧، ٣٧٦٨)]

''بلاشبہ ایک عورت نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! یہ میرا بیٹا ہے، میرا پیٹ اس کے لیے تھیلا تھا اور میرے دونوں پستان اس کے مشکیزہ تھے اور میری گود اس کو سمیٹے رہی اور اب اس کے والد نے مجھے طلاق دے دی ہے اور مجھ سے وہ اسے چھیننا چاہتا ہے۔'' تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس کی زیادہ حق دار ہے جب تک تو نکاح نہ کرے۔''

③ ابو میمونہ کہتے ہیں کہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس ایک فارسی عورت آئی، اس کے ساتھ اس کا بیٹا تھا، دونوں (میاں بیوی) نے اس کا دعویٰ کیا اور شوہر بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔ اس عورت نے کہا: ''اے ابو ہریرہ! (عورت نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فارسی میں گفتگو کی) میرا شوہر میرا بیٹا لے جانا چاہتا ہے۔''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس سے فارسی میں بات کرتے ہوئے کہا: ''تم دونوں اس پر قرعہ ڈال لو۔'' اس عورت کا شوہر آیا تو اس نے کہا: ''میرے بیٹے کے بارے میں مجھ سے کون جھگڑا کر سکتا ہے؟'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اے میرے اللہ! میں یہ فیصلہ اس لیے دے رہا ہوں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، آپ کے پاس ایک عورت آئی اس نے کہا: ''میرا شوہر مجھ سے میرا بیٹا چھیننا چاہتا ہے، حالانکہ وہ مجھے ابو عتبہ کے کنویں سے پانی پلاتا ہے اور اس نے مجھے نفع پہنچایا ہے۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِسْتَهِمَا عَلَيْهِ فَقَالَ زَوْجُهَا مَنْ يُّحَاقُّنِيْ فِيْ وَلَدِيْ ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ هٰذَا اَبُوْكَ وَ هٰذِهٖ اُمُّكَ فَخُذْ بِيَدِ اَيِّهِمَا شِئْتَ فَاَخَذَ بِيَدِ اُمِّهٖ فَانْطَلَقَتْ بِهٖ »

"تم دونوں اس پر قرعہ اندازی کرو۔" تو اس کے شوہر نے کہا: "میرے بچے کے بارے میں مجھ سے کون جھگڑا کرتا ہے؟" تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے، ان دونوں میں سے جس کا چاہو ہاتھ پکڑ لو۔" تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لے کر چلے گئی۔" [سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب من أحق بالولد (٢٢٧٧)، واللفظ له ، جامع الترمذی ، کتاب الأحکام ، باب ما جاء فی تخییر الغلام بین ابویه اذا افترقًا(١٣٥٧)، سنن ابن ماجه ، کتاب الأحکام، باب تخییر الصبی بین أبویه (٢٣٥١) ، کتاب الأم(٩٢/٥)، مسند شافعی (٦٢/٢)، سنن سعید بن منصور(٢٢٧٠)، مسند حمیدی(١٠٨٣)، سنن الدارمی(٢٢٩٨)، شرح مشکل الآثار(٣٠٨٠)، مسند ابو یعلی (٦١٣١)، بیهقی(٣/٨)، مسند احمد (٤٤٧/٢)،(٩٧٧١)، ابن ابی شیبة(٢٣٧/٥)]

④ رافع بن سنان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« أَنَّهُ أَسْلَمَ وَ أَبَتِ امْرَأَتُهُ أَنْ تُسْلِمَ فَأَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَتِ ابْنَتِي وَ هِيَ فَطِيمٌ أَوْ شَبَهُهُ وَ قَالَ رَافِعٌ ابْنَتِي فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اقْعُدْ نَاحِيَةً وَ قَالَ لَهَا اقْعُدِي نَاحِيَةً وَ أَقْعَدَ الصَّبِيَّةَ بَيْنَهُمَا ثُمَّ قَالَ ادْعُوَاهَا فَمَالَتِ الصَّبِيَّةُ إِلَى أُمِّهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اهْدِهَا فَمَالَتِ الصَّبِيَّةُ إِلَى أَبِيهَا فَأَخَذَهَا » [سنن ابی داود ، کتاب الطلاق، باب إذا أسلم أحد الابوین لمن یکون الولد(٢٢٤٤)، سنن النسائی ، کتاب الطلاق، باب اسلام أحد الزوجین و تخییر الولد(٣٥٢٥)، سنن ابن ماجه ، کتاب الأحکام ، باب تخییر الصبی بین ابویه (٢٣٥٢)، مستدرك حاكم(٢٠٦/٢،٢٠٧) ، بیهقی(٣/٨)، مسند احمد (٤٤٦/٥)، (٢٣٧٥٧)، السنن الکبریٰ للنسائی(٦٣٨٥) شرح مشکل الآثار، اس حدیث کو امام حاکم اور امام ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، علامہ البانی نے بھی اسے صحیح ابی داؤد میں ذکر کیا ہے]

"میں اسلام لے آیا لیکن میری بیوی نے اسلام لانے سے انکار کر دیا۔ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگی: میری بیٹی دودھ چھوڑنے والی ہے یا دودھ چھوڑنے کے قریب ہے۔" اور رافع کہنے لگے: "میری بیٹی ہے۔" نبی کریم ﷺ نے رافع سے کہا: "ایک جانب بیٹھ جاؤ" اور اس خاتون سے کہا "تم بھی ایک جانب بیٹھ جاؤ۔" آپ ﷺ نے بچی کو دونوں کے درمیان بٹھا دیا پھر فرمایا: "تم دونوں اسے بلاؤ۔" بچی جب ماں کی طرف مائل ہونے لگی تو نبی ﷺ نے دعا کی: "اے میرے اللہ! اس بچی کو ہدایت دے۔" تو وہ اپنے باپ کی طرف مائل ہو گئی اور رافع رضی اللہ عنہ نے اس بچی کو لے لیا۔"

ان احادیث صحیحہ و حسنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خاوند اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی پڑ جائے تو بچے اگر چھوٹی عمر کے ہوں تو ماں ان کی زیادہ حقدار ہے جب تک وہ نکاح نہیں کرتی۔ اگر بچوں کی ماں موجود نہ ہو تو خالہ کو ماں کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور اگر بچے سن شعور کو پہنچ جائیں تو انھیں والدین کے درمیان اختیار دیا جائے گا، وہ جس کے پاس جانا چاہیں جا سکتے ہیں۔

البتہ والدین میں سے کسی ایک کو بھی اولاد کے ساتھ ملاقات سے نہیں روکا جائے گا۔ کیونکہ صلہ رحمی واجب ہے۔ حضانت و پرورش میں بچے کی نگہداشت مقصود ہوتی ہے جس سے اس کی جسمانی و روحانی تربیت ہو اور جس کے ذریعے یہ اغراض و مقاصد حاصل نہ ہو سکتے ہوں تو اس کا حق حضانت ختم ہو جائے گا۔

جیسا کہ ماں اگر دوسری جگہ شادی کر لے تو اس کا حق حضانت ختم ہو جائے گا جیسا کہ آپ نے فرمایا:

« اَنْتِ اَحَقُّ بِهٖ مَا لَمْ تَنْكِحِيْ »[مسند احمد (۱۸۲/۲) ، ابو داؤد (۲۲۷٦)]

”جب تک تو نکاح نہ کر لے اس کی زیادہ حق دار ہے۔“

کیونکہ جب دوسرے شخص سے نکاح ہو جاتا ہے تو وہ صحیح طور پر پہلے خاوند کی اولاد کی نگہداشت نہیں کر سکتی۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ اسی طرح عورت اگر مجنوں ہو یا جذام و کوڑھ وغیرہ جیسے امراض میں مبتلا ہو یا کافرہ ہو جس سے بچے کے دین و عقائد خراب ہونے کا خطرہ ہو تو اس صورت میں بھی عورت کا حق حضانت ختم ہو جائے گا۔ ملاحظہ ہو ”اسلامی طرز زندگی (٦٦٣)“ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کے حصول کے لیے ان کے درمیان قرعہ اندازی بھی کر سکتے ہیں جیسا کہ اوپر حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں بالتصریح موجود ہے۔ اسی طرح ایک صحیح مرسل روایت میں خلیفہ رسول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی فیصلہ موجود ہے۔ قاسم بن محمد بیان کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی اہلیہ ام عاصم بنت عاصم انصاریہ سے بیٹے کے بارے جھگڑا ہو گیا، عمر رضی اللہ عنہ نے ام عاصم سے جدائی اختیار کی۔

ایک دفعہ عمر رضی اللہ عنہ قباء تشریف لائے اور اپنے بیٹے عاصم کو مسجد کے صحن میں کھیلتے ہوئے پایا تو اسے بازو سے پکڑا اور سواری پر اپنے آگے بٹھا لیا، اب بچے کی نانی نے انھیں آ لیا اور ان سے جھگڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ یہ فیصلہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میرا بیٹا ہے اور عورت نے کہا میرا بیٹا ہے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« رِيْحُهَا وَ فِرَاشُهَا وَ حِجْرُهَا خَيْرٌ لَّهٗ مِنْكَ حَتّٰى يَشُبَّ وَ يَخْتَارَ لِنَفْسِهٖ »

”اس عورت کی ہوا، بستر اور گود آپ کی نسبت بچے کے لیے زیادہ بہتر ہے، یہاں تک کہ وہ بڑا ہو جائے اور اپنے نفس کا مختار بن جائے۔“

اور ایک روایت میں ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« اَلْاُمُّ اَعْطَفُ ، وَ اَلْطَفُ وَ اَرْحَمُ وَ اَحْنَا وَ اَرْاَفُ هِيَ اَحَقُّ بِوَلَدِهَا مَا لَمْ تَتَزَوَّجْ »

”ماں زیادہ مشفق، لطیف، رحم کرنے والی، مائل ہونے والی اور نرم ہے یہ اپنے بچے کی زیادہ حق دار ہے جب تک شادی نہ کر لے۔“[موطا للمالك (۷٦۸،۷٦۷/۲)، بیهقی (۵/۸)، عبد الرزاق (۱۲٦۰۰)،(۱۲٦۰۱) سنن سعید بن منصور (۲۲۷۲)]

امام ابن عبد البر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ خبر کئی اسانید منقطعہ و متصلہ سے مشہور ہے اسے اہل علم کے ہاں قبولیت عامہ حاصل ہے۔[زاد المعاد (٤٣٦/٥)]

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے دور خلافت میں اس پر فتویٰ دیتے اور فیصلہ فرماتے رہے ہیں اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت اس بات میں نہیں کی کہ جب تک بچہ چھوٹا ہو اور سن تمیز تک نہ پہنچا ہو تو وہ ماں کے پاس رہے گا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بھی ان دونوں کا کوئی مخالف نہیں ہے۔'' [زاد المعاد(٤٣٦/٥)]

روایت فضیلتِ سورۃ واقعہ کی تحقیق

سوال کیا سورۃ الواقعہ سے تنگی دور ہونے والی بات صحیح ہے؟

جواب سورۃ الواقعہ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ سورت غنا اور تونگری والی ہے، جو اسے رات کو پڑھے، اپنے اہل وعیال کو پڑھائے اسے کبھی فاقہ نہیں پہنچتا۔ لیکن اس کے متعلق مروی روایات ضعیف اور موضوع ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْوَاقِعَةِ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ اَبَدًا قَالَ وَ قَدْ اَمَرْتُ بَنَاتِيْ اَنْ يَّقْرَأْنَهَا كُلَّ لَيْلَةٍ » [عمل اليوم والليلة لابن السنى(٦٨٠)، المطالب العالية(٣٧٦٥)، شعب الايمان للبيهقى (٢٤٩٨) ، العلل المتناهية(١٠٥/١)، تفسير ابن كثير (ص/١٢٩٣) مطبوعة دارالسلام)

''جس شخص نے ہر رات سورۃ الواقعہ تلاوت کی اسے کبھی فاقہ نہیں پہنچے گا۔'' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے اپنی بیٹیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ہر رات اسے تلاوت کریں۔''

ابن کثیر اور شعب الایمان میں یہ بھی ہے کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیمار پرسی کے لیے گئے تو کہا: ''آپ کو کیا شکوہ ہے؟'' تو انھوں نے کہا: ''اپنے گناہوں کا۔'' پھر کہا: ''آپ کی کیا خواہش ہے۔'' تو انھوں نے کہا: ''اپنے رب کی رحمت کی۔'' عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کسی طبیب کو بھیج دوں۔'' کہنے لگے: ''طبیب ہی نے تو بیمار کیا ہے۔'' پھر کہا: ''میں تمھارے لیے کچھ مال کا حکم دوں؟'' کہنے لگے: ''ایک دن پہلے آپ نے مجھے اس سے منع کیا ہے۔ مجھے اس کی حاجت نہیں۔'' عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اسے اپنے اہل وعیال کے لیے چھوڑ دینا۔'' کہنے لگے: ''میں نے انھیں ایک ایسی چیز کی تعلیم دی ہے جب وہ اسے پڑھیں گے تو فقیر نہیں ہوں گے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے ہر رات سورۃ الواقعہ کی تلاوت کی وہ فقیر نہیں ہوگا۔'' یہ روایت ضعیف ومضطرب ہے۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں:

① اس کی سند میں شجاع یا ابو الشجاع راوی مجہول ہے، امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" هٰذَا حَدِيْثٌ مُنْكَرٌ وَ شُجَاعٌ وَ السَّرِيُّ لَا اَعْرِفُهُمَا " [العلل المتناهية(١٠٥/١)، ميزان الاعتدال(٢٦٥/٢)(٥٣٦/٤)، لسان الميزان(١٣٩٢/٦)]

''یہ روایت منکر ہے اور اس کی سند میں شجاع اور السری کو میں نہیں پہچانتا۔''

② اسی طرح اس کی سند میں ابو طیبہ یا ابو ظبیہ بھی مجہول ہے۔ [میزان الاعتدال(٤/٥٤٢)، تقریب التهذيب (ص/٤١٣)]

③ اس کی سند میں اضطراب بھی ہے، السری کے شاگردوں نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ اس کا استاد شجاع ہے یا ابو الشجاع۔ اسی طرح شجاع کے استاد میں بھی اختلاف ہے کہ وہ ابو فاطمہ ہے یا ابو ظبیہ۔ پھر انھوں نے ابو ظبیہ کا لفظ ضبط کرنے میں بھی اختلاف کیا ہے کہ وہ ابو ظبیہ ہے یا ابو طیبہ؟

④ اور یہ ابو ظبیہ عیسیٰ بن سلمان الجرجانی ہے اور اس کی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت منقطع ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے [لسان الميزان(٧/٦١)، تعليق العلل المتناهية (١/١٠٥)]

⑤ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو چار وجوہ کی بنا پر ضعیف کہا ہے:

① یہ منقطع ہے جیسا کہ امام دارقطنی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

② اس کا متن منکر ہے جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

③ اس کے راوی ضعیف ہیں جیسا کہ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

④ یہ روایت مضطرب ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر امام احمد، امام ابو حاتم، امام ابن ابی حاتم، امام دارقطنی، امام بیہقی وغیرہم کا اجماع ہے۔ [سلسلة الأحاديث الضعيفة(١/٣٠٥)، (٢٨٩)]

② عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

« مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْوَاقِعَةِ كُلَّ لَيْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ اَبَدًا اَوْ مَنْ قَرَأَ كُلَّ لَيْلَةٍ ﴿ لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴾ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ وَجْهُهُ فِيْ صُوْرَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ » [تذكرة الموضوعات (ص/٧٨)، ذيل الأحاديث الموضوعة(١٧٧)]

”جس شخص نے ہر رات سورۃ الواقعہ تلاوت کی اسے کبھی فاقہ نہیں پہنچے گا اور جس نے ہر رات ﴿ لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴾ کی تلاوت کی وہ اللہ سے قیامت کے دن اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہو گا۔“

اس کی سند میں احمد بن محمد بن عمر الیمامی کذاب راوی ہے جس کی وجہ سے یہ روایت موضوع و من گھڑت ہے۔ [سلسلة الأحاديث الضعيفة(١/٣٠٥)،(٢٩٠)، كتاب المجروحين(١/١٤٣)، ميزان الاعتدال (١/١٤٣)]

③ انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

« مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْوَاقِعَةِ وَ تَعَلَّمَهَا لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ وَ لَمْ يَفْتَقِرْ هُوَ وَ اَهْلُ بَيْتِهِ »

”جس نے سورۃ الواقعہ کی تلاوت کی اور اسے سیکھا وہ غافل لوگوں میں نہیں لکھا جائے گا نیز وہ اور اس کے گھر والے فقیر نہیں ہوں گے۔“

امام سیوطی رحمہ اللہ نے ''ذیل الاحادیث الموضوعۃ (۲۷۷) میں اسے ابوالشیخ کی روایت بطریق عبدالقدوس بن حبیب از حسن از انس رضی اللہ عنہ مرفوع بیان کیا ہے اور فرمایا کہ عبدالقدوس بن حبیب متروک ہے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت وضع کرتا تھا۔ امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔ [سلسلة الأحاديث الضعيفة (۱/ ۳۰۶)، (۳۹۱)]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سورۃ الواقعہ کے متعلق مروی روایات ضعیف اور موضوع ہیں۔ بہت سارے خطیب اور واعظ حضرات اس روایت کو بیان کرتے ہیں اور وظائف و اوراد بتانے والے مشائخ بھی اسے اپنے مریدوں کو تلقین کرتے ہیں اور فراخی رزق کے لیے یہ فضائل کیلنڈوں کی صورت میں شائع بھی کیے جاتے ہیں۔اس کی وجہ عام طور پر یہ ہے کہ خطباء اور واعظین کو روایت کی صحت وسقم سے کوئی غرض نہیں ہوتی اور کچھ اہل علم اس مسئلے میں متساہل ہیں اور فضائل اعمال میں ضعیف روایت بھی قبول کیے جاتے ہیں۔

ہمارے نزدیک کسی عمل کی فضیلت و استحباب ایک خالص شرعی مسئلہ ہے، اس میں ایسی روایت قابل حجت اور لائق استناد ہے جس میں کوئی علت قادحہ نہ ہو جو اسے ضعیف بنا دے۔

ضعف بیان کرنا اہل علم پر لازم ہے، اگر وہ ضعف بیان نہیں کریں گے تو عام لوگ اسے صحیح سمجھ کر قبول کرتے جائیں گے۔ مسائل کے لیے صحیح اور حسن احادیث کے علاوہ کسی سے حجت نہیں پکڑنی چاہیے اور یہ مذہب بڑے بڑے ائمہ محدثین کا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وَ لَا يَجُوْزُ اَنْ يُّعْتَمِدَ فِي الشَّرِيْعَةِ عَلَى الْاَحَادِيْثِ الضَّعِيْفَةِ الَّتِيْ لَيْسَتْ صَحِيْحَةً وَ لَا حَسَنَةً '' [قاعده جليلة فى التوسل والوسليلة (ص:۱۱۲)]

''شریعت میں ضعیف احادیث جو نہ صحیح ہیں اور نہ حسن، قابل اعتماد نہیں۔''

مشہور حنفی عالم محمد زاہد کوثری نے لکھا ہے: '' ضعیف روایت کو مطلق طور پر نہ لینا امام بخاری، امام مسلم، امام ابو بکر بن العربی جو اپنے دور کے بہت بڑے مالکی تھے، امام ابو شامہ المقدسی جو اپنے وقت کے کبیر شافعی عالم تھے، امام ابن حزم اور امام شوکانی رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور ان کا اس مسئلہ میں قوی غیر مہمل بیان ہے۔'' [مقالات کوثری (ص:۴۵،۴۶)]

لہٰذا ضعیف روایات مطلق طور پر قابل حجت نہیں، فضائل میں اور نہ مسائل میں۔ فقر و تنگ دستی کے لیے اللہ تعالیٰ سے اخلاص سے دعا کریں وہ ضرور دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

﴿ رَبِّ اِنِّيْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴾ [القصص :۲٤]

''اے میرے پروردگار! تو بھلائی میں سے جو کچھ میری طرف اتارے میں اس کا محتاج ہوں۔''

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''ایک مکاتب غلام ان کے پاس آیا اور کہنے لگا:''میں اپنی مکاتبت سے عاجز آچکا ہوں، آپ میرا تعاون کریں۔''

علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیا میں تمھیں ایسے کلمات نہ سکھاؤں جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے تھے؟ اگر تیرے اوپر پہاڑ جتنا بھی قرض ہو اللہ تعالیٰ اسے اتار دے گا۔'' پھر انھوں نے یہ دعا بتلائی:

« اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَ اَغْنِنِيْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ »[ترمذی، کتاب الدعوات (۳۵۶۳)، مسند احمد (۱/۱۵۳)، مستدرك حاكم(۱/۵۳۸)]

''اے اللہ! اپنے حلال کے ذریعے اپنے حرام سے میری کفایت فرما اور اپنے فضل کے ساتھ مجھے اپنے علاوہ سے غنی کر دے۔''

توبہ کے بعد مسروکہ مال نا معلوم مالکوں تک پہنچانا

(سوال) توبہ کے بعد مسروکہ مال نا معلوم مالکوں تک کیسے پہنچایا جائے؟

(جواب) قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے سے پتا چلتا ہے کہ بندے کے لیے توبہ کا دروازہ مسلسل کھلا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ [الزمر:۵۳]

''اے نبی! کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بے شک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ تَابَ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ »[مسلم ، كتاب الذكر و الدعاء : باب استحباب الاستغفار(۲۷۰۳)]

''جس نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے توبہ کر لی، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔''

دوسری حدیث میں ہے:

« اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ »[ترمذی، کتاب الدعوات : باب فی فضل التوبة(۳۵۳۷)]

''اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک اس کی روح حلقوم تک نہیں پہنچ جاتی۔''

ان دلائل سے یہ واضح ہو گیا کہ توبہ کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہے، ایسا شخص اگر صدق دل سے توبہ کر لے اور حق داروں کو ان کا حق پہنچانا اس کے لیے ممکن نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے گا کیونکہ یہ اس کی طاقت میں نہیں اور اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے: ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ اللہ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔'' اس

کے علاوہ اس کی دلیل صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سو قتل کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے حقوق العباد کے اتنے بڑے جرم کو صرف سچی توبہ کی وجہ سے معاف کر دیا ہے تو ایسا شخص جس کا جرم اس سے کم ہے اللہ تعالیٰ اس کی بھی توبہ قبول کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے شخص کو دنیا میں زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنی چاہئیں۔ خصوصاً صدقہ زیادہ کرنا چاہیے تاکہ گزشتہ گناہوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو جائے۔

علم حاصل کرنے کے متعلق چین جانے والی حدیث

سوال کیا علم حاصل کرنے کے متعلق چین جانے والی حدیث صحیح ہے؟

جواب یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب " الرحلة في طلب الحديث" میں تین سندوں سے یہ روایت ذکر کی ہے، جن کا دارو مدار الحسن بن عطیہ عن ابی عاتکہ طریف بن سلمان عن انس پر ہے اور اسی سند سے انھوں نے "تاریخ بغداد(٣٦٤/٩)" ابن عبد البر نے "جامع بيان العلم و فضله (٨٧/١)" میں ذکر کی ہے اور امام عقیلی رحمہ اللہ نے "كتاب الضعفاء الكبير (٢٣٠/٢)" میں "حماد بن خالد الخياط قال حدثنا طريف بن سلمان ابو عاتكه قال سمعت انس بن مالك" کے طریق سے ذکر کی ہے اور ابو عاتکہ طریف بن سلمان کے سوا کسی سے چین کے الفاظ محفوظ نہیں ہیں اور طریف منکر الحدیث اور متروک راوی ہے۔

طریف کی اس روایت کی طرف امام بخاری رحمہ اللہ نے "التاريخ الكبير(٣١٠/٤)" (٦٠٢٩) میں اشارہ کر کے اسے منکر الحدیث قرار دیا ہے اور جسے امام بخاری منکر الحدیث قرار دیں، اس سے روایت لینا حلال نہیں جیسا کہ میزان الاعتدال وغیرہ میں مذکور ہے، لہٰذا یہ روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم!)

ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں اس کی متابعت ذکر کی ہے لیکن اس سند میں یعقوب بن اسحاق العسقلانی کذاب راوی ہے جیسا کہ "ميزان الاعتدال(٤٤٩/٤)" وغیرہ میں ہے۔

ابن عدی نے اس روایت کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے لیکن اس کی سند میں احمد بن عبداللہ الجویباری کذاب راوی ہے، لہٰذا اس کی سند بھی علل قادحہ سے خالی نہیں۔ امام ابن جوزی نے تو اسے موضوعات میں شمار کیا اور اسماعیل بن محمد العجلونی نے "كشف الخفاء و مزيل الالباس (١٣٨/١)" میں ذکر کر کے اسے مجموعی طرق کے لحاظ سے حسن قرار دیا ہے۔ حقیقت میں یہ نہ موضوع ہے نہ حسن بلکہ انتہائی ضعیف ہے۔

وفات کے بعد میت کی طرف سے سود کے مال سے صدقہ کرنا

سوال اگر مسلمان والدین اپنی وراثت میں غفلت دنیا اور معاشرے کی مجبوری کی بنا پر اپنے بال بچوں کی دینی تربیت نہ

کرسکیں، گھر میں بے پردگی کا آزادانہ ماحول رکھا اور سود کو نفع سمجھتے ہوئے اس سے اولاد کے لیے جائداد بھی چھوڑ گئے اور گھر کے آزادانہ ماحول میں ڈش، ویڈیو، کیبل بچوں کے وقت پورا کرنے کے لیے لگا گئے ہوں، تو کیا اب ان کی وفات کے بعد ان کے ورثہ سے ان کے لیے صدقہ وخیرات کر سکتے ہیں؟

جواب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا » [صحيح مسلم: كتاب الزكوٰة باب قبول الصدقة من الكسب الطيب و تربيتها : (١٠١٥)]

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاک چیز ہی قبول کرتا ہے۔"

چونکہ متوفی کا مال سودی ہے اور سود نص قرآنی سے حرام و ناپاک ہے، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ ہے، ایسے مال سے صدقہ قبول نہیں ہوتا اور کفارہ گناہ نہیں بن سکتا، ہاں پسماندگان کی دعاؤں سے میت کو فائدہ ہوسکتا ہے، اگر اس کے پسماندگان اولاد وغیرہ ان غیر شرعی تکلفات وآلات وغیرہ کو ختم کردیں اور توبہ و استغفار کی پابندی کر کے اپنی حالت شریعت کے مطابق بنالیں اور رزق حلال کھانے کی کوشش کریں تو پھر مخلصانہ دعائیں آپ کے والدین کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہیں کیونکہ جس جسم کو حرام سے غذا دی گئی ہو یا لباس حرام پہنایا گیا ہو تو ایسے شخص کی دعا قبولیت کے شرف سے محروم رہتی ہے۔ اگر آپ کے والدین سود کو حلال سمجھتے ہوں اور کفر یا شرک کی حالت میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے ہوں تو پھر آپ کے صدقات و خیرات اور مخلصانہ دعائیں بھی بے سود اور غیر مفید ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ معاشرے کی مجبوری کوئی شرعی مجبوری نہیں کیونکہ مسلمان معاشرے کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات اور اسلامی تعلیمات کا پابند ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و لا تبطلوا اعمالکم ﴾ [محمد:٣٣]

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال باطل نہ کرو۔"

اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو صحیح عقیدہ، عمل صالح، رزق حلال، صدق مقال اور دین حنیف کی پابندی نصیب کرے۔ (آمین!)

ناراضی کے دوران شوہر فوت ہو جائے تو؟

سوال اگر بیوی سے ناراضی کے دوران ہی شوہر فوت ہو جائے تو؟

جواب اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کے لیے باعث سکون بنایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [الروم:٢١]

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھاری ہی جنس سے تمھاری بیویاں پیدا کی ہیں تا کہ تم ان سے آرام

پاؤ۔ اس نے تمھارے درمیان محبت اور مہربانی قائم کر دی ہے۔ یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ شوہر کے لیے بیوی سکون و اطمینان کا سبب ہے اور مرد و زن کے اس رشتے کو اللہ تعالیٰ نے محبت و رحمت بنایا ہے۔ لیکن بسا اوقات شیطان اس رشتے میں رکاوٹ ڈالنے اور اطمینان وسکون کو بے سکونی، بدامنی اور زحمت میں بدلنے کے لیے بھرپور کوشش کرتا ہے۔

جس کی بنا پر ان دونوں کے درمیان محبت نفرت میں بدل جاتی ہے اور لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ یہ گھریلو لڑائی جھگڑے میاں بیوی دونوں کی کسی نہ کسی غلطی کی بنا پر کھڑے ہوتے ہیں۔

اور جب کوئی ایسی غلطی مرد یا عورت سے صادر ہو جائے تو اسے دور کرنے کے ساتھ توبہ و استغفار کو لازم پکڑنا چاہیے۔ ارشا باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ یَظۡلِمۡ نَفۡسَہٗ ثُمَّ یَسۡتَغۡفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴾ [النساء:١١٠]

"جس نے کوئی برا عمل کیا یا اپنی جان پر ظلم کیا، پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہی تو وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔"

لہٰذا کسی قسم کی بھی زیادتی خواہ شوہر سے ہو جائے یا اس کی رفیقہ حیات سے، انھیں اس میں توبہ و استغفار کرنا چاہیے اور اس کے علاوہ جو بھی نیکی کر سکے، کرے کیونکہ نیکیاں بھی گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِکَ ذِکۡرٰی لِلذّٰکِرِیۡنَ ﴾ [ھود:١١٤]

"نماز قائم کیجیے دن کے دونوں اطراف میں اور رات کی گھڑیوں میں، بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لیے۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ نیکیاں کرنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں لہٰذا نیکیوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ جس قسم کی بھی نیکی ہو سکے ضرور کرے یعنی صدقات و خیرات وغیرہ۔ نبی ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

« اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُ مَا كُنْتَ وَ أَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَ خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ »

[ترمذی، کتاب البر والصلة: باب ما جاء في معاشرة الناس(١٩٩٤)، مسند احمد (٥/١٥٣)، دارمی، کتاب الرقاق(٢٧٩١)]

"تو جہاں بھی ہو اللہ سے ڈر، برائی کے پیچھے نیکی لگا دے، وہ اسے مٹا دے گی اور لوگوں سے اچھا معاملہ کر۔"

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ نیکی کرنے سے آدمی کی برائی اور گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسی عورت جس کا اپنے خاوند کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ ہونے کی وجہ سے جھگڑا ہوا ہو یا خاوند کی غلطی کی وجہ سے معاملہ بڑھ گیا ہر دو صورتوں میں توبہ و

استغفار سے کام لے اور مرنے والے کے حق میں دعائے خیر کرے اور خود توبہ واستغفار کے ساتھ ساتھ نیکی کے کام یعنی نماز، روزہ، تلاوت قرآن پاک، صدقات و خیرات وغیرہ سے کام لے، فرائض کی پابندی کرے اور نفلی امور کی طرف رغبت رکھے، اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔

مسلمان مریض کوخون کا عطیہ

سوال کسی مسلمان مریض کوخون کا عطیہ دینا کیسا ہے؟

جواب جب بوقت مجبوری ماہر حکماء یا ڈاکٹروں کے کہنے پر مریض کوخون کی ضرورت ہوتو اسے خون کا عطیہ دینا جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ﴾ [الانعام:۱۱۹]

"جو کچھ تمھارے اوپر حرام کیا ہے اس کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے بیان کر دی ہے الا کہ تم کسی چیز کے لیے مجبور ہو جاؤ۔"

معلوم ہوا کہ اضطراری حالت میں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے اور یہ بقدر ضرورت ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر ہے:

﴿ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ [البقرة : ۱۷۳]

"جسے مجبوری ہے وہ نہ تو بغاوت کرنے والا ہو اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہی ہو، تب اس پر کوئی گناہ نہیں۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

« اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَ لَا يُسْلِمُهُ وَ مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهِ »[بخاری ، کتاب المظالم: باب لا يظلم المسلم المسلم (۲٤٤۲)]

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے جو نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے کسی کے حوالے کرتا ہے اور جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت میں لگا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت میں ہوتا ہے۔"

معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت مسلمان کی حاجت پوری کرنا جائز و درست ہے اور یہ خون دینا حالت اضطرار میں بالکل صحیح ہے۔ (واللہ اعلم!)

کالے بکرے کا صدقہ

سوال صدقہ کیا ہے، صدقہ دینے کا طریقہ کیا ہے؟ کیا جو عزیز و اقارب غریب ہوں، معذور ہوں ان کو صدقہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا مجاہدین اس کے مستحق ہیں کہ نہیں؟ مروجہ طریقہ کہ کالا بکرا یا کالی بکری کی سری جو مسجد یا مدرسہ وغیرہ میں صدقہ کے

طور پر دی جاتی ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

(جواب) رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

« كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ » [صحيح بخاري، كتاب الأدب: باب كل معروف صدقة: (٦٠٢١)]

''ہر نیکی صدقہ ہے۔''

اور ایک حدیث میں ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

''بلاشبہ ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر تکبیر صدقہ ہے، ہر تحمید صدقہ ہے، ہر تہلیل صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے، نہی عن المنکر صدقہ ہے، آدمی کا اپنی اہلیہ سے صحبت کرنا صدقہ ہے''۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا ہم میں سے کوئی جب اپنی شہوت کے لیے اپنی اہلیہ کے پاس آتا ہے تو اس کو اس میں اجر ملتا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم بتاؤ اگر وہ فعل حرام میں واقع ہوتا تو کیا اسے گناہ ہوتا؟ پس اس طرح جو فعل حلال طریقے سے کرے گا تو اسے اجر ملے گا۔''

[صحيح مسلم كتاب الزكاة: باب بيان أن اسم الصدقة: (١٠٠٥)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر نیکی کا کام انسان کے لیے صدقہ ہوتا ہے البتہ عرف عام میں وہ مال و متاع جو آدمی اللہ کو راضی کرنے کے لیے کسی فقیر، مسکین، محتاج اور مجاہد کو دیتا ہے وہ صدقہ کرتا ہے، جس طرح محتاج کو صدقہ دینا درست ہے اسی طرح مجاہدین اسلام کو بھی صدقہ دیا جا سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''صدقات ان فقراء کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ (جہاد) میں رکے ہوئے ہیں، زمین میں (کاروبار وغیرہ کے لیے) سفر نہیں کر سکتے، سوال سے بچنے کی وجہ سے ناواقف انھیں غنی گمان کرتا ہے، تو انھیں ان کی علامت سے پہچانے گا۔ وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے۔'' [البقرة: ٢٧٣]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے صدقات و خیرات کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدین کے لیے صدقات بالکل درست ہیں بلکہ موجودہ حالات میں مجاہدین کو زکوٰۃ اور صدقات دے کر کفر کے خاتمے کے لیے میدانوں میں روانہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ مجاہدین ہی کا ایسا گروہ ہے جس سے کفر اور اس کے لیڈر دن رات پریشان رہتے ہیں اور کئی حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ان مجاہدین کی مدد نہ کی گئی تو پھر پاکستان کے لیے بھی انتہائی زیادہ خطرات ہیں۔ ہماری مساجد، مدارس، گھر بار تب ہی محفوظ ہوں گے جب جہاد صحیح معنوں میں قائم ہوگا۔ لہٰذا ان مجاہدین کے لیے صدقات اور زکوٰۃ دیں (اللہ تعالیٰ قبول فرمائے) بلکہ یہ بھی یاد رہے کہ مجاہد غنی اور دولت مند بھی ہو تو بھی اسے صدقہ دیا جا سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ افراد کے علاوہ کسی دولت مند کو صدقہ حلال نہیں جن میں سے ایک غازی فی سبیل اللہ ہے۔ [ابوداود، كتاب الزكاة: باب من يجوز له أخذ الصدقة وهو غني (١٦٣٥)،(١٦٣٦)]

اور لوگوں میں جو کالا بکرا یا بکری وغیرہ صدقہ دینے کا تصور ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں، صدقہ کسی بھی پاک و حلال مال سے دیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے سیاہ و سفید جانور کی کوئی قید نہیں۔

مذہبی جلسوں میں نعرہ بازی

(سوال): مذہبی جلسوں میں نعرہ بازی کیسا عمل ہے؟

(جواب) نبی اکرم ﷺ جب وعظ ونصیحت فرماتے تو اس میں اللہ تعالیٰ کے کلام کو بیان کرتے تھے اور صحابہ کرام توجہ سے سماعت فرماتے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کو توجہ سے سننے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ [الاعراف:٢٠٤]

''جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اس آیت کریمہ کی رو سے قرآن مجید کے بیان کے وقت خاموشی کا حکم ہے اور دوران وعظ نعرہ بازی کرنا، یہ شور وغل ہے جو آداب قرآن کے منافی ہے اور اللہ کے نبی ﷺ کی کسی بھی حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ آپ ﷺ کے وعظ کے دوران صحابہ کرام اس طرح نعرہ بازی کرتے ہوں۔ لہٰذا ہمیں ان امور سے اجتناب کرنا چاہیے۔

کوے کا شرعی حکم

(سوال): کوے کا شرعی حکم کیا ہے؟

(جواب) کوا شریعت محمدیہ میں حرام ہے، اسے کھانا جائز نہیں ،اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو فاسق قرار دیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

① «عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ : خَمْسٌ فَوَاسِقُ یُقْتَلْنَ فِی الْحِلِّ وَ الْحَرَمِ الْحَیَّةُ وَ الْغُرَابُ الْاَبْقَعُ وَ الْفَأْرَةُ وَ الْكَلْبُ الْعَقُوْرُ وَ الْحِدَأَةُ» [بخاری، کتاب بدء الخلق : باب إذا وقع الذباب فی شراب أحدکم (٣٣١٤)،ابن ماجه (٣٠٨٧)، ترمذی(٨٣٧)]

''ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:'' پانچ اشیاء فاسق ہیں، سانپ ،کوا ، چوہیا ، کاٹنے والا کتا اور چیل ۔''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' اَمَّا الْغُرَابُ الْاَبْقَعُ فَهُوَ الَّذِیْ فِیْ ظَهْرِهٖ اَوْ بَطْنِهٖ بَیَاضٌ '' [شرح مسلم للنووی (٣٨١/١)]

'' غراب الابقع سے مراد وہ کوا ہے جس کی پشت یا پیٹ پر کچھ سفیدی ہو۔''

② «عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ : اَلْحَیَّةُ فَاسِقَةٌ وَالْعَقْرَبُ فَاسِقٌ وَالْفَأْرَةُ فَاسِقٌ وَ الْغُرَابُ فَاسِقٌ فَقِیْلَ لِلْقَاسِمِ اَیُؤْكَلُ الْغُرَابُ ؟ قَالَ مَنْ

يَّأْكُلُهُ بَعْدَ قَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَاسِقًا »[ابن ماجه، كتاب الصيد: باب الغراب: (٣٢٤٩)، مسند احمد(٦/٢٠٩)]

'' عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' سانپ فاسق ہے، بچھو فاسق ہے، چوہیا فاسق ہے اور کوا فاسق ہے۔'' قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: '' کیا کوا کھایا جاتا ہے؟'' تو انھوں نے کہا: '' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کو فاسق کہنے کے بعد اسے کون کھاتا ہے؟''

③ « عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ مَنْ يَّأْكُلُ الْغُرَابَ ؟ وَ قَدْ سَمَّاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَاسِقًا وَ اللّٰهِ مَا هُوَ مِنَ الطَّيِّبَاتِ »[ابن ماجه، كتاب الصيد: باب الغراب، (٣٢٤٨)]

'' ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: '' کوا کون کھاتا ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام فاسق رکھا ہے۔ اللہ کی قسم! کوا پاکیزہ چیزوں میں سے نہیں ہے۔''

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ کوا فاسق ہے اور پاکیزہ چیزوں میں سے نہیں ہے لہٰذا اس کا کھانا حرام ہے۔ شریعت مطہرہ کی ان تصریحات کے باوجود حنفی حضرات کے نزدیک کوا مفتیٰ بہ قول کے مطابق حلال ہے اس کا کھانا پکانا بالکل درست ہے۔

موجودہ زمانہ کے مشہور متعصب حنفی مولوی محمد حبیب اللہ ڈیروی کا اس مسئلہ پر اردو زبان میں ایک مستقل رسالہ ہے جس کا نام " الشيئ العجاب فى حلة الغراب " یعنی کوا حلال ہے۔ اس میں مولوی حبیب اللہ ڈیروی نے موجودہ دیسی شہری کوا حلال قرار دیا ہے اور اسے فقہ حنفی کا مفتیٰ بہ قول قرار دیا ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "البحر الرائق شرح كنز الدقائق (۱۷۲/۸)" کے حوالے سے لکھتا ہے:

" وَ نَوْعٌ يَخْلِطُ بَيْنَهُمَا وَ هُوَ اَيْضًا يُؤْكَلُ عِنْدَ الْإِمَامِ وَ هُوَ الْعَقْعَقُ لِاَنَّهُ يَاْكُلُ كَمَا يَاْكُلُ الدَّجَاجُ وَ عَنْ اَبِيْ يُوْسُفَ اَنَّهُ يَكْرَهُ اَكْلَهُ لِاَنَّهُ غَالِبُ اَكْلِهِ الْجِيَفُ وَ الْاَوْلٰى اَصَحُّ "[كوا حلال هے (ص/٤٠)]

'' اور کوے کی ایک قسم دانہ اور مردار دونوں کھاتا ہے وہی کھایا جائے نزدیک امام اعظم کے اور اس کا نام عقعق ہے اس لیے کہ وہ مرغی کی طرح (گندگی اور دانہ) کھاتا ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اس کا کھانا مکروہ ہے اس لیے کہ اس کی اکثر غذا گندگیوں کا کھانا ہے اور اول قول امام اعظم کا زیادہ صحیح ہے۔''

اسی طرح یہی بات فتاویٰ خانیہ برحاشیہ فتاویٰ عالمگیری (۳۹۱/۳) کے حوالے سے لکھی ہے۔

مولوی سرفراز صفدر نے اپنی کتاب اتمام البرہان کے صفحہ (۳۲۱) پر مبسوط (۲۲۶/۱۱) اور عنایۃ شرح ہدایۃ (۶۲/۸) کے حوالہ سے ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہی درج کیا ہے کہ کوا حلال ہے۔

مولوی حبیب اللہ اپنے رسالہ '' کوا حلال ہے'' کے صفحہ (۴۱) پر ''عقعق'' کا معنی شہری کوا لکھتا ہے۔ اسی طرح اس کے دیسی وشہری ہونے کے دس حوالے درج کیے ہیں اور یہ بات بار بار لکھی ہے کہ یہ کوا جو ہمارے اردگرد بیٹھتا ہے مفتیٰ بہ قول کے

مطابق حلال ہے، اس کا کھانا جائز ہے۔

علاوہ ازیں مولوی محمد نصیر الدین میرٹھی دیوبندی نے کوے کی حلت پر ساٹھ سے زائد حنفی علماء کے فتاوی پر مشتمل ایک کتاب بنام "فصل الخطاب فی تحقیق مسئلة الغراب" لکھی اور مفتی رشید احمد لدھیانوی کے فتاویٰ پر مشتمل کتاب "احسن الفتاوٰی" کی ساتویں جلد میں صفحہ (۴۳۹ تا ۴۵۸) میں اپنا فتویٰ اور مفتی محمد تقی کا فتویٰ "رفع الحجاب عن حکم الغراب" طبع ہوا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ حنفی دیوبندی حضرات کے نزدیک مفتیٰ بہ قول کے مطابق شہری کوا حلال ہے۔

نوائے وقت لاہور صفحہ :۲ مجریہ ۷ اگست ۱۹۷۶ء کی رپورٹ کے مطابق جامعہ حنفیہ سلاں والی سرگودھا میں حکیم شریف الدین، قاری فتح محمد کراچی والے، قاری محمد صدیق جھنگ والے اور حافظ محمد ادریس کے متفقہ فیصلے کے مطابق کوے ذبح کر کے کھائے گئے اور فقہ حنفی کے فتوے پر عمل کیا گیا۔

قل اور ساتے کی جگہ کوئی دینی پروگرام کروانا

(سوال) کیا قل اور ساتے کی جگہ کوئی دینی پروگرام کروانا جائز ہے؟

(جواب) مرنے والے پر نوحہ خوانی جاہلیت کا عمل ہے۔ صحیح مسلم میں ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میری امت میں چار چیزیں جاہلیت کے کاموں میں سے ہیں جنھیں وہ نہیں چھوڑیں گے۔" تو آپ ﷺ نے ان میں سے ایک چیز "نیاحة" (بین کرنا) شمار فرمائی اور آپ ﷺ نے فرمایا:

"نوحہ کرنے والی موت سے پہلے توبہ نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس پر گندھک کی قمیص اور خارش کا کرتہ ہوگا۔" [مسلم، کتاب الجنائز: باب التشدید فی النیاحة (۹۳۴)]

نوحہ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ میت کے دفن کے بعد میت کے گھر میں اجتماع کیا جائے اور کھانا تیار کیا جائے۔ مسند احمد میں جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

« كُنَّا نَعُدُّ الْاِجْتِمَاعَ اِلَى اَهْلِ الْمَيِّتِ وَصُنِيْعَةِ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهِ مِنَ النِّيَاحَةِ » [مسند احمد (۲/ ۲۰۴)]

"یعنی ہم (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میت کے گھر والوں کی طرف اکٹھ کرنا اور کھانا تیار کرنا نوحہ میں سے شمار کرتے تھے۔"

اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی (رضی اللہ عنہ) سے صراحت آئی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قسم کے اجتماع اور کھانا تیار کرنے کو نوحہ (بین کرنا) شمار کرتے تھے۔ کیونکہ یہ بھی اظہارِ غم کی ایک مذموم صورت ہے جس میں اہل میت پر بے جا بوجھ ڈالا جاتا ہے، کھانا تیار کرنے کی ناروا مشقت ڈالی جاتی ہے اور بلا ضرورت تمام کام چھوڑ کر اکٹھے ہونے کا بے جا اہتمام کیا جاتا ہے۔ غیر مسلموں کی دیکھا دیکھی برسی منانے کا سلسلہ بھی اظہار غم کی ایک ایسی ہی صورت ہے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں بلکہ خالص کفار کی رسم ہے۔ کفار کی کئی اور رسمیں مثلاً تیجا، ساتواں، دسواں، چالیسواں بھی مسلمانوں میں داخل ہوگئی ہیں۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ جو شخص ان رسوم میں حاضر نہ ہو اسے مطعون کیا

جاتا ہے کہ اسے مرنے والے کا کوئی غم اور صدمہ نہیں۔ چنانچہ ملامت کے خوف سے مجبوراً لوگ ان رسموں میں پہنچتے ہیں۔

بعض لوگوں نے تو میت کے گھر اس قسم کے اجتماعات مثلاً تیجے، ساتویں، دسویں، چالیسویں اور برسی کو دین ہی بنا لیا ہے۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان دنوں میں اس طریقے سے اکٹھ کرنا، کھانا پکانا، مولوی صاحب کا اس پر ختم پڑھنا نوحہ کی ایک صورت ہونے کے علاوہ ہندوؤں کی نقالی ہے اور ان دنوں میں وہ بھی اکٹھ کرتے اور کھانا تیار کرتے ہیں جس پر ان کے پنڈت باقاعدہ اپنی کتاب پڑھتے ہیں، ان حضرات کے علماء بھی ان کاموں کو کار ثواب قرار دینے کے لیے دلائل گھڑتے رہتے ہیں۔ کیونکہ عوامی دین اختیار کر لینے کی وجہ سے ان کا کام یہ نہیں کہ قرآن وسنت سے لوگوں کی رہنمائی کریں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ لوگوں نے جو رسوم اختیار کر لی ہیں، انھیں قرآن وسنت سے ثابت کریں، خواہ ان کا قرآن وسنت سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔

بعض لوگ جو کسی اہل حدیث گھر میں پیدا ہو گئے مگر اتباع سنت سے اپنے آپ کو آراستہ نہ کر سکے، نہ بدعت سے اجتناب کا جذبہ قائم رکھ سکے، وہ عجیب مشکل میں گرفتار ہیں۔ وہ اگر ان رسوم میں شریک ہوتے ہیں تو اتباع سنت کا آبائی شرف ہاتھ سے جاتا ہے، شریک نہیں ہوتے تو اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتے کہ جاہلانہ رسوم میں مبتلا حضرات کی ملامت برداشت کر سکیں۔ یہ لوگ ان رسوم کو جائز کرنے کے لیے حیلے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک حیلہ یہ ہے جو آپ نے ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ تیسرے دن قل اور ختم وغیرہ کا اہتمام تو نہیں کرتے لیکن مولوی صاحب کی تقریر کروا لیتے ہیں اور ساتھ کھانا کھلا دیتے ہیں۔ حالانکہ اس موقع پر میت والوں کے ہاں اکٹھ کرنا اور کھانا تیار کرنا اظہار غم کی ایک صورت ہے جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نوحہ خوانی میں شمار کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس موقع پر کبھی اس قسم کا اجتماع نہیں کیا اور نہ کھانے ہی کا اہتمام کیا ہے۔

عورتوں میں یہ کام مردوں سے بھی زیادہ ہے حتیٰ کہ بعض اہل حدیث مدارس کی مقررہ خواتین باقاعدہ اس قسم کی مجالس میں شریک ہوتی ہیں اور اپنے خیال میں لوگوں کو قل اور ختم کی بدعات سے بچاتی ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ وہ دوسروں کو بدعت سے بچاتے بچاتے خود ایک بہت بڑے گناہ میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ کیونکہ اس پر اجتماع اور کھانا نوحہ کی ایک قسم ہے اور بجائے خود ایک عبادت ہے۔

ہاں کسی کی موت کی خبر آنے پر اس کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کر کے بھیجنا سنت ہے کیونکہ اس وقت گھر والے غم و اندوہ کی وجہ سے کھانا پکانے کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتے۔ حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

« لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اصْنَعُوا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَقَدْ أَتَاهُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ » [ابن ماجه، كتاب الجنائز: باب ما جاء فى الطعام يبعث الى اهل الميت (١٦١٠)، ترمذی(٩٩٨)، ابوداود(٣١٣٢)]

”جب جعفر رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کے پاس ایسی چیز آئی ہے جس نے انھیں مشغول کر دیا ہے۔“

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" وَ اُحِبُّ لِجِيرَانِ الْمَيِّتِ اَوْ ذِي قَرَابَةٍ اَنْ يَّعْمَلُوا لِاَهْلِ الْمَيِّتِ فِي يَوْمِ يَمُوْتُ وَ لَيْلَتِهٖ طَعَامًا يُّشْبِعُهُمْ فَاِنَّ ذٰلِكَ سُنَّةٌ وَّ ذِكْرٌ كَرِيْمٌ وَّ هُوَ مِنْ فِعْلِ اَهْلِ الْخَيْرِ قَبْلَنَا وَ بَعْدَنَا لِاَنَّهٗ لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : « اجْعَلُوْا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَاِنَّهٗ جَآءَ هُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ » [کتاب الام (۳۱۷/۱)]

"میں میت کے رشتہ داروں کے لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ میت کی وفات کے دن اس کے گھر والوں کے لیے اس دن اور اس رات کے لیے اتنا کھانا تیار کریں جس سے وہ سیر ہو جائیں کیونکہ یہ سنت ہے اور اچھی یاد ہے اور یہ ہم سے پہلے اور پچھلے اہل خیر کا عمل ہے۔ کیونکہ جب جعفر رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آل جعفر کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کے پاس وہ چیز آئی ہے جس نے انھیں مشغول کر دیا ہے۔"

اس حدیث سے اس دن میت کے گھر والوں کے پاس آنے والے مہمانوں کا کھانا تیار کر کے بھیجنے کی ترغیب بھی ملتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنے لیے کھانا تیار نہیں کر سکتے تو مہمانوں کے لیے کھانا کیسے تیار کر سکیں گے۔ مگر اس حدیث کا مروجہ قل ساتے وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ کھانا تیار کر کے جلسے کے نام پر تعزیتی ماتمی اجتماع ہی کا کوئی تعلق ہے۔ میت کے گھر والوں کے پاس تعزیت کے لیے جانا بھی مسنون ہے مگر اس کے لیے باقاعدہ اجتماع کرنا اور اس کا دن مقرر کرنا درست نہیں۔ بغیر کسی پروگرام کے جیسے جیسے لوگ آتے جائیں تعزیت کر کے واپس چلے جائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ میت کے گھر میں تیسرے یا ساتویں دن قل اور ساتے کی بجائے کسی دینی پروگرام کا اہتمام کرنا اور کھانا تیار کرنا نوحہ خوانی میں شامل ہے اور درحقیقت ماتمی اجتماع ہے۔ اس لیے اس میں شریک ہونا جائز نہیں خواہ تبلیغ دین کے بہانے سے ہو کیونکہ ناجائز کام کو دین کی تبلیغ کا ذریعہ سمجھنا درست نہیں جیسے کہ آج کل اقامت دین کی دعویدار جماعتیں قوالی، تصویر کشی، موسیقی، بھنگڑے، ڈرامے، یوم پیدائش، برسی وغیرہ کو اپنے خیال میں اقامت دین کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ دعوت و تبلیغ کی صرف وہی صورتیں جائز ہیں جن میں کوئی شرعی قباحت نہ پائی جائے۔ بلند مقاصد کے لیے ذرائع بھی صاف ستھرے ہونے چاہییں۔

احناف کے ہاں فاتحہ پیشاب سے لکھنا

سوال: کیا احناف کے ہاں فاتحہ پیشاب سے لکھنا جائز ہے؟

جواب پیشاب نجس و پلید ہے، اس کے ساتھ قرآن مجید لکھنا حرام ہے:

« عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا رَفَعَهٗ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ عَامَّةُ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنَ الْبَوْلِ فَتَنَزَّهُوْا مِنَ الْبَوْلِ » [دارقطنی (۱۲۸/۱)]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عام عذاب قبر پیشاب سے ہوتا ہے لہٰذا تم پیشاب سے بچو۔''

« عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَكْثَرُ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنَ الْبَوْلِ » [دارقطنی (١٢٨/١)، حاکم (١٨٣/١)، امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے اور مجھے اس کے ضعف کی کوئی علت معلوم نہیں ۔ شیخین نے اس کو نہیں نکالا۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے بھی تلخیص میں امام حاکم رحمہ اللہ کی موافقت کی ہے۔]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اکثر عذاب قبر پیشاب سے ہے۔''

ان احادیث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ پیشاب نجس و پلید ہے اور اس پلیدی سے اجتناب نہ کرنے کے باعث عذاب قبر ہوتا ہے اور اس کی مثال بھی حدیث میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی قبر دیکھ کر بتایا کہ انھیں عذاب ہو رہا ہے جن میں سے ایک کو پیشاب سے اجتناب نہ کرنے کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے۔ لہٰذا جب پیشاب پلید اور نجس ہے تو اس کے ساتھ سورۂ فاتحہ یا کوئی اور قرآنی آیت لکھنا بالکل حرام ہے اور قرآن مجید کی توہین ہے۔ لیکن اس کے برعکس فقہ حنفیہ میں سورۂ فاتحہ کو پیشاب کے ساتھ لکھنا جائز لکھا گیا ہے۔ فقہ حنفی کا یہ فتویٰ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں بلخ کے ایک بہت بڑے حنفی فقیہ ابو جعفر ہندوانی کے استاد ابو بکر محمد بن احمد اسکاف کی طرف منسوب ہو کر شائع ہوا۔ چنانچہ فتاویٰ قاضی خان میں موصوف سے منقول ہے:

" وَالَّذِیْ رُعِفَ فَلَا یَرْقَأُ دَمُهُ فَاَرَادَ اَنْ یَّكْتُبَ بِدَمِهِ عَلٰی جَبْهَتِهِ شَیْئًا مِّنَ الْقُرْاٰنِ قَالَ اَبُوْ بَكْرٍ الْاِسْكَافِ یَجُوْزُ قِیْلَ لَوْ كَتَبَ بِالْبَوْلِ قَالَ لَوْ كَانَ فِیْهِ شِفَاءٌ لَا بَأْسَ بِهٖ " [فتاویٰ قاضی خان (٣٦٥/٤)]

''اگر کسی کی نکسیر بند نہ ہوتی ہو تو اس نے اپنے ماتھے پر خون کے ساتھ قرآن میں سے کچھ لکھنا چاہا تو ابو بکر اسکاف نے کہا: ''یہ جائز ہے۔'' کہا گیا: ''اگر وہ پیشاب کے ساتھ لکھے تو؟'' اس نے کہا: ''اس میں شفا ہو تو کوئی حرج نہیں۔''

یہی فتویٰ فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاویٰ سراجیہ، باب التداوی (٧٥)، البحر الرائق شرح کنزالدقائق ، باب تنزح البئر بوقوع نجس (ص/١١٦)، حموی شرح الأشباہ والنظائر، باب القاعدة الخامسة الضرر لا یزال (ص/١٠٨) اور رد المحتار شرح الدر المختار المعروف فتاویٰ شامی، باب التداوی بالمحرم (ص/١٤٧) احناف کا یہ فتویٰ انتہائی غلط ہے اور قرآن مجید کی توہین ہے۔ اعاذنا اللہ من ذلك۔

ایک بریلوی عالم مولوی غلام رسول سعیدی نے صحیح مسلم کی اردو زبان میں شرح لکھی ہے، اس کی پہلی جلد میں ''عبد المجید شرقپوری برسٹل برطانیہ'' کے تاثرات درج ہیں۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''فقہ کی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ علاج کی غرض سے خون یا پیشاب کے ساتھ سورۂ فاتحہ کو لکھنا جائز ہے، راقم

الحروف نے اکثر علماء سے اس کے متعلق پوچھا مگر چونکہ یہ بات بڑے بڑے فقہاء نے لکھی ہے اس لیے سب نے اس مسئلے پر سکوت اختیار کیا ہے۔"

علامہ سعیدی نے پہلی بار اس جمود کو توڑا، وہ لکھتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ خون یا پیشاب کے ساتھ سورۂ فاتحہ لکھنے والے کا ایمان خطرے میں ہے۔ اگر کسی آدمی کو روز روشن سے زیادہ یقین ہو کہ اس عمل سے اس کو شفا ہو جائے گی تب بھی اس کا مرجانا اس سے بہتر ہے کہ وہ خون یا پیشاب کے ساتھ سورۂ فاتحہ لکھنے کی جرأت کرے۔ اللہ تعالیٰ ان فقہاء کو معاف کرے جن سے بال کی کھال نکالنے اور جزئیات مستنبط کرنے کی عادت کی وجہ سے یہ قول شنیع سرزد ہو گیا ورنہ ان کے دلوں میں قرآن مجید کی عزت وحرمت بہت زیادہ تھی۔'' [شرح صحیح مسلم (٦/٥٥٧)]

مذکورہ بالا حوالہ سے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ کو پیشاب یا خون سے لکھنا فقہ حنفی کے اندر جائز قرار دیا گیا تھا جس پر مولوی غلام رسول سعیدی نے تبصرہ کرتے ہوئے اس سے مرجانا بہتر قرار دیا ہے۔ یعنی مذکورہ فقہاء مثلاً قاضی خان، ابو بکر اسکاف، ابن نجیم المعروف ابوحنیفہ ثانی، علامہ سراج الدین، حموی، ابن عابدین شامی اور فتاویٰ عالم گیری کو مرتب کرنے والے سینکڑوں حنفی اس فتوے کو لکھ کر اپنے ایمان کو خطرے میں ڈال گئے ہیں، ان کے لیے یہ فتویٰ دینے سے مرجانا بہتر تھا اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان حضرات کو فقہی جزئیات بیان کرتے ہوئے بال کی کھال ادھیڑنے کی عادت تھی جس بنا پر انھوں نے بہت سے فضول اور لایعنی قسم کے فتوے صادر کیے جس کی حقیقت فتاویٰ عالمگیری کے مطالعہ سے واضح ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ صحیح اور سیدھا دین قرآن وحدیث والا ہے، اس کو مضبوطی سے تھامنے میں نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی پر قائم ودائم رکھے۔ (آمین!)

قرآن خوانی کرانا

سوال: کیا قرآن خوانی کرانا جائز ہے؟

جواب: کچھ چیزیں اصلاً حرام ہوتی ہیں اور کچھ وصفاً حرام ہوتی ہیں۔ مثلاً خنزیر تو اصلاً حرام ہے اور غیر اللہ کے نام کا بکرا بھی حرام ہے لیکن یہ بکرا غیر اللہ کا نام پکارنے کی وجہ سے حرام ہوا ہے اصلاً حلال تھا۔ اسی طرح قرآن مجید پڑھنا اصلاً تو حلال و جائز تھا بلکہ ثواب ہے مگر قرآن خوانی کا مروجہ طریقہ حرام ہے۔ حلقہ بندی، مخصوص آیات وسور کا ورد وتکرار اور پھر کسی خاص مقصد یا ایصال ثواب کے لیے پڑھنا، یہ ایسے اوصاف ہیں جو قرآن پڑھنے کو ثواب کی بجائے الٹا بدعت یعنی گناہ بنا دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں سنت سے ثابت نہیں ہیں اور جو عمل سنت سے ثابت نہ ہو وہ مردود ہے۔ کیوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيْهِ فَهُوَ رَدٌّ » [بخاری، کتاب الصلح : باب إذا اصطلحوا علی صلح جور (٢٦٩٧)]

''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی تو وہ مردود ہے۔''

نیز فرمایا:

« وَ شَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا » [بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة : باب الاقتداء بسنن رسول اللّٰہ ﷺ (۷۲۷۷)]

''دینی معاملات میں بدترین کام نئے ایجاد شدہ ہیں۔''

ویسے بھی نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہے کہ نیک کام یا عبادت کو بھی اگر دنیاوی مقاصد کے لیے کیا جائے تو وہ دنیاوی مقاصد پورے ہوں یا نہ ہوں، دنیا داری کی نیت اس عمل کے ثواب کو برباد یا کم ضرور کر دیتی ہے۔

حدیث نبوی ہے:

« اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَ اِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ فَهِجْرَتُهُ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ وَ مَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى الدُّنْيَا اَوْ اِلَى امْرَاَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ » [بخاری ، کتاب بدء الوحی(۱)، (۵٤)]

''اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے، جس نے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کی تو واقعی اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہی ہوئی اور جس نے دنیا کمانے یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کی تو اس کی ہجرت کا ثمرہ وہی ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔''

لہٰذا مروجہ قرآن خوانی اپنے دوسرے اوصاف کے اعتبار سے بدعت ہونے کے ساتھ دنیا داری کی نیت کی وجہ سے بھی برباد ہے۔

جھوٹی قسم کا کفارہ

سوال اگر کوئی شخص مشکل میں پھنس جائے اور جھوٹی قسم اٹھانے پر اس کی مشکل حل ہو جائے تو اس کی سزا یعنی کفارہ کیا ہے؟

جواب جھوٹی قسم اٹھانا کبیرہ گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کبیرہ گناہ یہ ہیں، اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی جان کو قتل کر دینا اور جھوٹی قسم اٹھانا۔

[بخاری، کتاب الأیمان والنذور: باب الیمین الغموس: ٦٦٧٥]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

''دو شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس جھگڑا لے کر آئے۔ ان دونوں میں سے ایک (مدعی علیہ) پر قسم واقع ہوگئی۔ اس نے کہا: ''مجھے اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! مدعی کی کوئی چیز میرے پاس نہیں۔'' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: ''قسم کھانے والا جھوٹا ہے، مدعی کا حق اس کے پاس ہے۔'' آپ ﷺ نے اس کو مدعی کا حق ادا کرنے کا حکم دیا، جبریل علیہ السلام نے کہا: ''اس کی قسم کا کفارہ لا الہ الا اللہ کی

معرفت ہے یا لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔‘‘

[مسند احمد (۱/۲۹٦)،(۲۵۳)،(۳۲۲)،(۲ / ۷۰)، مستدرك حاكم (۹٦/٤) ابوداؤد(۳۲۷۵)،اس حدیث کو امام حاکم اور امام ذھبی نے صحیح قرار دیا ھے]

امام ابوداؤد فرماتے ہیں: ’’اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے کفارہ ادا کرنے کا حکم نہیں دیا۔‘‘ تفسیر احسن البیان (۳۲۲) میں ہے کہ قسم کی تین قسمیں ہیں: لغو، غموس اور معقدہ۔

لغو وہ قسم ہے جو انسان بات بات پر عادتاً بغیر ارادہ اور نیت کے اٹھاتا رہتا ہے، اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ غموس وہ جھوٹی قسم ہے جو انسان دھوکا اور فریب دینے کے لیے کھائے۔ یہ کبیرہ گناہ بلکہ اکبر الکبائر ہے لیکن اس کا کفارہ نہیں۔ معقدہ وہ قسم ہے جو انسان اپنی بات میں تاکید اور پختگی کے لیے ارادتاً اور نیتاً کھائے، ایسی قسم اگر توڑے گا تو اس کا وہ کفارہ ہے جو اگلی آیت میں بیان کیا جا رہا ہے۔ یعنی سورۂ مائدہ کی آیت (۸۹) میں۔

معلوم ہوا کہ جھوٹی قسم کا کفارہ نہیں صرف اخلاص کے ساتھ کلمہ طیبہ کی شہادت دیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیں، اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

قسم کا کفارہ اور مسکین کے کھانے کی مقدار

سوال قسم کا کفارہ کیا ہے اور مسکین کے کھانے کی مقدار کیا ہے؟

جواب اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورۃ المائدہ (۸۹) میں قسم کا کفارہ یہ بیان کیا ہے کہ اوسط درجے کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یہ دس مسکینوں کو کھلاؤ یا انھیں کپڑے پہنا دو یا ایک غلام آزاد کرو، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو پھر تین دن کے روزے رکھو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قسم کا کفارہ اور کھانے کی مقدار دونوں چیزیں بتا دی ہیں کہ تم اپنے گھروں میں جو اوسط درجے کا کھانا استعمال کرتے ہو اس میں سے دس مسکینوں کو کھلا دو۔ اس کی متعین مقدار کہ کلو یا ڈیڑھ کلو ہو، اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث وارد نہیں۔ ہر شخص اپنے گھر کا حساب دیکھ کر فیصلہ کرے اور لباس کم از کم اتنا ضرور ہو جس میں نماز ادا کی جا سکتی ہو۔ واللہ اعلم!

دو یا تین نابالغ بچوں کی وفات پر جہنم سے آزادی

سوال کیا یہ حدیث ہے کہ اگر کسی کے دو یا تین نابالغ بچے فوت ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے والدین کو جنت میں جگہ دے گا؟ برائے مہربانی صحیح رہنمائی کریں۔

جواب والدین کو اگر اپنی نابالغ اولاد کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑے تو ایسے والدین کو اس صدمے کا اجر ملتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''جب کسی مسلمان کے تین نابالغ بچے فوت ہو جائیں تو اللہ ان بچوں پر رحم کی وجہ سے ایسے مسلمان کو جنت میں داخل کردے گا۔'' [صحیح بخاری، کتاب الجنائز باب فضل من مات له ولد فاحتسب (١٢٤٨)]

ایک خاتون بچہ لے کر رسول کریم ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر کہنے لگی:

''یا رسول اللہ! اس بچے کے لیے دعا فرمائیں کیونکہ میں اس سے قبل تین بچوں کو دفنا چکی ہوں۔'' آپ ﷺ نے کہا: ''کیا تو تین بچوں کو دفن کر چکی ہے؟'' اس نے کہا: ''ہاں!'' تو آپ ﷺ نے اسے کہا: ''تب تو تم نے جہنم سے ایک بہت محفوظ باڑ بنا لی ہے۔'' [صحیح مسلم، کتاب البر والصلة: باب فضل من یموت له ولد فیحتسبه (٢٦٣٦)]

اگر کسی مسلمان کے دو بچے بھی فوت ہو جائیں تو وہ بھی اپنے والدین کے لیے ذریعہ نجات بن سکتے ہیں۔ نبی مکرم ﷺ نے ایک بار خواتین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''تم میں سے جس کے تین بچے فوت ہو جائیں وہ (قیامت کے دن) جہنم سے رکاوٹ کا ذریعہ بن جائیں گے۔'' ایک عورت نے پوچھا: ''اگر کسی کے دو بچے فوت ہو جائیں تو کیا حکم ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! دو بچے بھی جہنم سے رکاوٹ بن جائیں گے۔'' [صحیح بخاری، کتاب الجنائز: باب فضل من مات له ولد فاحتسب (١٢٤٩)]

مذکورہ بالا احادیث صحیحہ صریحہ سے معلوم ہوا کہ مسلمان آدمی کو اگر اپنے تین یا دو نابالغ بچوں کا صدمہ برداشت کرنا پڑے تو اس اندوہناک اور غمناک حادثہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو اجر سے نوازے گا اور یہ بچے ان کے لیے جہنم سے بچنے کا ذریعہ بن جائیں گے اور اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ انھیں جنت نصیب کرے گا۔ مومن آدمی کا معاملہ اللہ کے ساتھ بہت پیارا ہے، یہ مصیبت آنے پر صبر سے کام لیتا ہے اور خوشی آنے پر شکر کرتا ہے اور صبر و شکر دونوں اس کے حق میں اللہ کی عظیم نعمتیں ہیں۔ لہٰذا مسلم آدمی کو ہر مصیبت پر صابر اور ہر خوشی و مسرت پر شاکر رہنا چاہیے اور ہر دو صورتوں میں اس کے لیے اجر ہی اجر ہے۔

چچا زاد یا خالہ زاد بھائی سے پردہ

سوال: کیا چچا زاد یا خالہ زاد بھائی سے پردہ ضروری ہے؟

جواب: مسلمان عورت کے لیے غیر محرم مرد سے حجاب و پردہ ضروری ہے۔ شوہر کے بھائی یا چچا زاد یا خالہ زاد بیوی کے لیے محرم ہیں لہٰذا وہ ان کے سامنے بے حجاب نہیں رہ سکتی اور جسم کے جو اعضا وہ اپنے محرم رشتہ دار کے سامنے کھول سکتی ہے وہ ان کے سامنے نہیں کھول سکتی اگر چہ یہ لوگ کتنے ہی پارسا، متقی، پرہیز گار اور قابل اعتماد کیوں نہ ہوں۔

عورت جن لوگوں کے سامنے اپنی زینت ظاہر کر سکتی ہے ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ آبَآءِ هِنَّ اَوْ آبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ﴾ [النور: ٣١]

’’اور اپنی زیب و زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اپنے شوہروں کے یا اپنے باپوں یا اپنے سسر یا اپنے بیٹے یا اپنے شوہروں کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنے میل جول کی عورتوں یا اپنے غلاموں یا ایسے نوکر چاکر مردوں کے جو شہوت والے نہ ہوں یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے واقف نہیں۔‘‘

خاوند کے بھائی یا اس کے چچازاد ان رشتوں کی وجہ سے بیوی کے محرم نہیں ہیں۔ عزت و آبرو کے تحفظ اور فساد و شر کے ذرائع کو روکنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صالح اور غیر صالح میں کوئی فرق نہیں کیا اور صحیح حدیث میں وارد ہے کہ شوہر کے بھائی کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’خاوند کا بھائی تو موت ہے۔‘‘ [بخاري، كتاب النكاح : باب لا يخلون رجل (٥٢٣٢) ، مسند احمد (٤/ ٤٩)]

’’حمو‘‘ سے مراد خاوند کے بھائی دیور، جیٹھ وغیرہ ہیں جو بیوی کے لیے محرم نہیں ہیں، لہٰذا مسلمان کو دین کے تحفظ اور عزت و آبرو کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ جو لوگ اسلامی احکامات کو سچے دل سے قبول کر لیتے ہیں ان کے لیے اس پر عمل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ایک ہی گھر میں رہ کر عورت اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر اپنے گھر کے کام کاج کرے اور دیور، جیٹھ وغیرہ کو بھی چاہیے کہ وہ اس معاملے میں محتاط رہیں، گھر میں کام کاج کے وقت اپنی بھابھی کے لیے پریشانی کا باعث نہ بنیں۔ گھر کے کسی کمرے میں بیٹھ جائیں۔ بکثرت آمد و رفت نہ کریں۔ اگر کسی ضرورت کے لیے باہر نکلنا ہو تو آواز دے کر متنبہ کر دیں تاکہ پردہ کر لیا جائے۔ لہٰذا میرے بھائی دین کی باتوں پر عمل کرنا اہل اسلام کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی ایسے معاملات تھے لیکن وہ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سچے نمونے تھے، انھیں اللہ کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری ہی میں کامیابی نظر آتی تھی، اس لیے ہمیں بھی فراخ دلی سے اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا چاہیے اور ایسے مسائل کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔

آیت کریمہ پڑھنے کی فضیلت

سوال کیا آیت کریمہ پڑھنے کی کوئی فضیلت ہے؟

جواب آیت کریمہ قرآن مجید کی سورۃ الانبیاء کی مشہور آیت ہے، اللہ کے نبی یونس علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء:٨٧]

’’اور مچھلی والے (نبی یونس علیہ السلام کو یاد کیجیے) جب وہ غصے کی حالت میں چل دیے اور خیال کیا کہ ہم اسے نہ پکڑ سکیں گے۔ بالآخر اس نے اندھیروں میں پکارا: ’’الٰہی! تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ہی خطا

کاروں میں سے ہوں۔'' تو ہم نے اس کی پکار کو قبول کیا اور غم سے نجات دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح نجات دیتے ہیں۔''

قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نبی یونس علیہ السلام جب مچھلی کے پیٹ میں گرفتار ہو گئے اور مشکلات میں پھنس گئے تو انھوں نے مشکل کے حل کے لیے اللہ تعالیٰ کو ان کلمات کے ساتھ پکارا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ان اندھیروں سے نجات دے دی اور بتا دیا کہ مشکلات کو حل کرنے والا، مصائب و بلیات سے نجات دینے والا، دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا سب سے بڑا فریاد رس غوث اعظم صرف اللہ تعالیٰ ہے اور مشکل سے نجات صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کوئی بھی ایمان والا اللہ تعالیٰ کو پکارے تو وہ اس کی دعا سنتا اور قبول کرتا ہے۔

جیسا کہ آیت کے آخر میں فرمایا کہ ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں۔ اس لیے مشکل حالات میں آفات و بلیات کو ٹالنے کے لیے آیت کریمہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے ندا کی جائے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« دَعْوَةُ ذِی النُّوْنِ اِذَا دَعَا بِهَا وَ هُوَ فِی بَطْنِ الْحُوْتِ ﴿ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّی كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾ فَاِنَّهُ لَمْ یَدْعُ بِهَا مُسْلِمٌ رَبَّهُ فِی شَیْءٍ قَطُّ اِلَّا اسْتَجَابَ لَهُ »[عمل الیوم واللیلة (٦٥٦)، مسند احمد (١٧٠/١)، حاکم (٥٠٥/١)، المختارة للضیاء المقدسی، ترمذی(٣٥٠٥)]

''مچھلی والے پیغمبر کی دعا، جب انھوں نے مچھلی کے پیٹ میں پکارا ﴿ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّی كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾ تھی، اس دعا کے ساتھ کوئی مسلمان کسی بھی چیز کے متعلق دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے۔''

اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ ایک آدمی نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! کیا یہ دعا یونس علیہ السلام ہی کے ساتھ خاص ہے یا عام مومنین کے لیے بھی ہے؟'' تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلَا تَسْمَعُ اِلٰی قَوْلِهِ تَعَالٰی : ﴿ فَنَجَّیْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَ كَذٰلِكَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾

''کیا تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنتا: ''ہم نے اسے غم سے نجات دی اور ایمان والوں کو ہم اسی طرح نجات دیتے ہیں۔''

یعنی یہ دعا صرف یونس علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام ایمان والوں کے لیے بھی ہے، جب بھی ایمان والے اللہ تعالیٰ کو آفات و بلیات، مشکلات و مصائب، دکھ و آلام میں، الغرض کسی بھی کام کے لیے پکاریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرے گا، اس لیے جو شخص ضرورت مند ہے وہ خود یہ دعا اللہ کے حضور کرے، اپنی حاجت اللہ کے سامنے رکھ کر اسے پکارے۔

عامۃ الناس کی اکثریت اس بات میں گرفتار ہے کہ وہ کھجور کی گٹھلیاں یا اس جیسی دیگر اشیاء جمع کر کے لوگوں کو اکٹھا کر لیتے ہیں اور آیت کریمہ پڑھواتے ہیں، یہ ایک رواج بن چکا ہے اور بالکل بے ثبوت اور بے بنیاد چیز ہے۔ ہر انسان کو اپنا تعلق

اللہ تعالیٰ سے استوار کرنا چاہیے، وہ خود اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے ، اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہو، توبہ و استغفار سے کام لے کہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

وہ ضرور معاف کرے گا اور اپنی رحمت بے پایاں سے کرم کرے گا، ہاں !زندہ انسان سے جا کر دعا بھی کروا سکتا ہے لیکن لوگوں کا ہجوم بلوا کر سنگ ریزوں یا گٹھلیوں پر آیت کریمہ کا ورد کرانا سوائے ایک رواج کے اور کچھ نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی مذکورہ حدیث اور قرآن حکیم کی آیت سے صرف یہی بات واضح ہوتی ہے کہ جس مسلم کو کوئی حاجت ہے وہ خود اللہ تعالیٰ سے ان کلمات کے ذریعے دعا کرے۔ اللہ تعالیٰ ہماری آفات کا ازالہ فرمائے اور قحط سالی ، دکھ درد اور ہر قسم کی بیماریوں سے شفا نصیب فرمائے۔ (آمین!)

تاج کمپنی کی کتاب اعمال قرآنی

سوال تاج کمپنی کی مطبوعہ کتاب ''اعمال قرآنی'' میں لکھا ہے کہ فلاں فلاں آیات کو کسی چیز پر اس طرح دم کر کے کھایا پیا جائے تو مسئلہ حل ہوتا ہے۔ سورۂ نور کی آیات (۳۹، ۴۰) کے بارے لکھا ہے کہ ''ان آیات کو لونگ کے چالیس دانوں پر دم کر کے ہر رات ایک دانہ کھایا جائے، تو اولاد ہو جائے گی'' کیا یہ درست ہے؟

جواب قرآن حکیم یا کسی صحیح حدیث میں ایسی بات مروی نہیں ہے کہ قرآن کی یہ آیات لونگ کے چالیس دانوں پر دم کر کے کھائیں تو اولاد ہوگی، یہ صاحب کتاب کی اپنی ایجاد ہوگی یا کسی اور بزرگ کا قول، البتہ قرآنی آیات پڑھ کر دم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مسنون اور صحیح اذکار سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مختلف مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچنے کے اذکار و وظائف کے بارے میں راقم کی کتاب ''پریشانیوں سے نجات'' ملاحظہ کریں، جس میں صرف صحیح احادیث اور قرآنی آیات درج کی گئی ہیں۔

ایک نماز کے بدلے انچاس کروڑ نمازوں کا ثواب

سوال کیا ایک نماز کے بدلے انچاس کروڑ نمازوں کا ثواب مل سکتا ہے؟

جواب دینی امور کی تبلیغ و اشاعت یا تحصیل دین نماز و روزہ وغیرہ کے لیے ایسی کوئی صحیح و صریح حدیث نہیں ملتی جس میں یہ بات مذکور ہو کہ ایک نماز یا ایک تسبیح کا ثواب انچاس کروڑ نمازوں کے برابر ہے۔ تبلیغی حضرات نے اس بات کی بنیاد ضعیف روایات پر رکھی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ اَرْسَلَ بِنَفَقَةٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ اَقَامَ فِیْ بَیْتِہٖ فَلَہٗ بِکُلِّ دِرْھَمٍ سَبْعُمِائَةِ دِرْھَمٍ وَ مَنْ غَزَا بِنَفْسِہٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ اَنْفَقَ فِیْ وَجْہِ ذٰلِکَ فَلَہٗ بِکُلِّ دِرْھَمٍ سَبْعُمِائَةِ اَلْفِ دِرْھَمٍ ثُمَّ تَلَا ھٰذِہِ الْاٰیَةَ ﴿ وَ اللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴾» [ابن ماجہ، کتاب الجهاد: باب فضل النفقة فی سبیل الله (۲۷۶۱)]

"جس نے اللہ کی راہ میں خرچہ بھیج دیا اور خود گھر میں ٹھہرا رہا، اس کے لیے ہر درہم کے بدلے میں سات سو درہم ہیں اور جو بذات خود اللہ کی راہ میں نکل کر لڑا اور اپنے اوپر اس مال کو خرچ کیا، اس کے لیے ہر درہم کے معاوضے میں سات لاکھ درہم کا ثواب ہے۔" پھر یہ آیت پڑھی: "اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔"

اور دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ الصَّلَاةَ وَ الصِّيَامَ وَ الذِّكْرَ يُضَاعَفُ عَلَى النَّفَقَةِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ بِسَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ » [الترغيب والترهيب (٢/٢٦٧)]

"یقیناً نماز، روزہ اور ذکر اللہ کی راہ میں روپیہ خرچ کرنے سے سات سو گنا ملتا ہے۔"

سبز پگڑیوں والے یعنی دعوت اسلامی والے بھی انہی ضعیف روایتوں کی بنا پر دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی جماعت کے ساتھ نکلنے والے اور وقت لگانے والے کو ایک نماز کے بدلے انچاس کروڑ نماز کا ثواب ملے گا۔ یہ عقیدہ انھوں نے شاید تبلیغی جماعت ہی سے متاثر ہو کر اپنایا ہے۔

اسی طرح سات لاکھ کو سات سو سے ضرب دینے سے انچاس کروڑ بن جاتے ہیں لیکن یہ دونوں روایات سنداً ضعیف اور ناقابل حجت ہیں۔ پہلی روایت میں خلیل بن عبد اللہ راوی مجہول ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ روایت منکر ہے۔" [تهذيب التهذيب(٣/١٦٧)، لسان الميزان(٢/٤١٠)]

امام منذری رحمہ اللہ نے بھی ترغیب و ترہیب میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی عدالت و جرح کے بارے میں مجھے علم نہیں۔ دوسری روایت میں دو ضعیف راوی ہیں۔

① پہلا راوی زبان بن فائد امام ساجی ہے، امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی روایات کو منکر کہا ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے اسے ضعیف اور امام ابن حبان نے منکر الحدیث اور ناقابل حجت قرار دیا ہے۔ [تهذيب التهذيب(٣/٣٠٨)]

② دوسرا راوی سہل بن معاذ ہے۔ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس کی روایت کو ناقابل اعتبار اور ضعیف قرار دیا ہے۔ [تهذيب التهذيب (٤/٢٥٨)]

لہٰذا جب یہ دونوں روایات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں تو ان سے استدلال بے کار ہے۔ ثانیاً اگر یہ روایات بالفرض صحیح بھی ہوں، تو تب بھی یہ ثواب تبلیغی جماعت کے لیے نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے مجاہدین کے لیے ہوگا۔ اس روایت کے الفاظ « مَنْ غَزَا بِنَفْسِهِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ » "جو بذات خود اللہ کی راہ میں نکل کر لڑا" اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ تبلیغی جماعت اور اس نوع کی دوسری جماعتیں تو قتال فی سبیل اللہ کو تسلیم ہی نہیں کرتیں، لہٰذا وہ اس ثواب سے محروم ہوں گی۔

ترجمہ پڑھنے کا ثواب

سوال کیا ترجمہ پڑھنے کا بھی اجر ہے؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کا حکم دیا ہے:

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ [محمد:٢٤]

"بھلا کیا وہ غور نہیں کرتے قرآن میں یا ان کے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں؟"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ » [بخاری، کتاب العلم: باب من یرد الله خیراً یفقهه فی الدین (٧١)، مسلم(١٠٣٧)]

"اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرنا چاہتا ہے اس کو دین میں سمجھ دے دیتا ہے۔"

فرمان باری تعالیٰ ہے:

"اللہ جسے چاہے دین کی باتوں میں عقل اور سمجھ دے دیتا ہے اور جسے سمجھ عنایت ہوئی، اسے بڑی نعمت مل گئی اور نصیحت قبول کرنا صرف عقلمند کا کام ہے۔" [البقرة: ٢٦٩]

حدیث میں ہے:

"عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے جیسے چودھویں کے چاند کی فضیلت ستاروں پر۔" [ابو داوٗد، کتاب العلم: باب فی فضل العلم (٣٦٤١)، ترمذی، (٢٦٨٢)، ابن ماجه (٢٢٣)]

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ دین میں سمجھ بوجھ اور بصیرت حاصل کرنے کی فضیلت ملتی ہے۔ اگر قرآن کی تلاوت کے علاوہ ترجمہ پڑھنے اور دین میں بصیرت حاصل کرنے کا ثواب نہ ہوتا تو یہ فضیلت علماء کو بھی حاصل نہ ہوتی۔ البتہ صرف ترجمہ پڑھنے کو قرآن کی تلاوت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ترجمہ پڑھنے کا ثواب اپنی جگہ اور تلاوت کا ثواب اپنی جگہ ہے۔

سیاہ لباس پہننا

(سوال) سیاہ کپڑے پہننا کیسا ہے؟

(جواب) شرعی طور پر سیاہ لباس پہننے میں کوئی قباحت نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ام خالد رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے وہ کہتی ہیں:

"نبی کریم ﷺ کے پاس کپڑے لائے گئے، ان میں ایک چھوٹی سیاہ چادر تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: "تمھارے خیال میں ہمیں یہ چادر کس کو پہنانی چاہیے؟" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش رہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "میرے پاس ام خالد بنت خالد کو لاؤ۔" اسے اٹھا کر لایا گیا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اسے چادر پہنا دی اور فرمایا: "اسے بوسیدہ اور پرانا کر۔" اس چادر میں سبز یا زرد نشانات تھے، آپ نے فرمایا: "اے ام خالد! یہ اچھا ہے۔" [بخاری، کتاب اللباس: باب الخمیصة السوداء (٥٨٢٣)]

اسی طرح بخاری شریف کے اس مقام پر نبی ﷺ کی سیاہ چادر کا بھی ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ لباس پہننا درست ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بعض مخصوص ایام میں ان سے مشابہت کی وجہ سے اجتناب کیا جائے۔

مرد و خواتین کا اختلاط

سوال میں ایک ایسے ہسپتال میں ملازمت کرتا ہوں جس میں ہمیشہ اجنبی عورتوں سے اختلاط رہتا ہے اور ان سے بات چیت کرنا پڑتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب خواتین سے اختلاط نا جائز اور انتہائی مہلک اور حد درجہ خطرناک ہے، خاص طور پر جب عورت زیب و زینت سے ہو اور بے پردہ ہو۔ کیونکہ ایسی خواتین جو زینت لگا کر میک اپ کے دبیز پردوں میں معطر ہو کر مردوں کی مجالس سے گزرتی ہیں انھیں شرعاً بدکار قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو بھی عورت خوشبو لگا کر کسی قوم کے پاس سے گزرے تا کہ وہ اس کی خوشبو پا لیں وہ زانیہ ہے۔“ [مسند احمد (٤/٤١٤)]

اسی طرح خوشبو لگانے والی عورت کو رات کی نماز میں حاضر ہونے سے روکا گیا ہے۔ [مسند احمد (٢/٣٠٤)]

آج ہسپتالوں، دفاتر، یونیورسٹیز الغرض ہر ادارے میں عورتوں کو داخل کر دیا گیا ہے اور وہ بے پردہ، میک اپ کر کے مردوں میں گھومتی پھرتی ہیں۔ اسلام میں اس طرح مرد و زن کا اختلاط حرام ہے۔ آپ کوئی ایسی ملازمت تلاش کر لیں جہاں ایسی قباحتیں نہ ہوں۔ والدین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو شرعی آداب سکھائیں اور اسلام کی پابند بنائیں، انھیں ایسی نوکری کے لیے مت بھیجیں جو فتنے کا باعث ہو اور معاشرے کو تباہی کے دہانے پر لا کر کھڑا کرے۔

گھروں میں پردہ

سوال کیا خواتین کو اپنے گھروں میں بھی دوپٹا اوڑھنا چاہیے؟

جواب مسلمان عورت کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا فیصلہ ہے کہ یہ پردے کے اندر رہنی چاہیے، اسے کھلے عام پھرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ عورت کو اپنے گھر میں بھی سر پر دوپٹا وغیرہ اوڑھنا چاہیے کیونکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

« اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ فَإِذَا خَرَجَتِ اسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ » [ترمذی، کتاب الرضاع: باب ما جاء فی کراهية الدخول على المغيبات (١١٧٣)، صحيح ابن خزيمة (١٦٨٥، ١٦٨٦)، صحيح ابن حبان (٣٢٩۔ الموارد) المعجم الكبير للطبرانی (١٠/١٣٢)، تاريخ بغداد (٨/٤٥١)، مجمع الزوائد (٢/١٥٦)، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ [إرواء الغليل (١/٣٠٣)، (٢٧٣)، نصب الراية (٢٩٨، ٢٩٩)]

''عورت پردہ ہے جب یہ نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانکتا ہے۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت ایسی چیز ہے جو چھپانے کے لائق ہے، اس لیے عورت کو بذات خود پردہ قرار دے دیا ، لہٰذا مسلمان خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنے سارے وجود کو ڈھانپ کر رکھیں سوائے چہرے اور ہاتھوں کے، کیونکہ گھر میں کام کاج کے لیے انھیں کھلا رکھنا ایک ضرورت ہے اور یہ ستر سے مستثنیٰ ہے لیکن غیر مردوں کے آگے ان اعضاء کو بھی کھلا نہیں رکھنا چاہیے۔

نماز کی تارک بیوی کا حکم

(سوال) میرے گھر میں نماز کے معاملہ میں بہت سستی ہے، خصوصاً میری اہلیہ نماز ادا کرنے میں غفلت کا شکار ہو جاتی ہے جبکہ چھوٹے بچے نماز ادا کرنے کے لیے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ بے وضو ہوتے ہیں، میں بھی چاہتا ہوں کہ وہ نماز سیکھیں تو اس حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

(جواب) بچوں کو نماز سکھانا ہمارا حق و فریضہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے قول و فعل سے بچوں کو مسنون نماز کا طریقہ بتائیں کیونکہ ابوداؤد میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو انھیں نماز کی تعلیم دو اور دس سال کے ہو جائیں تو انھیں مار کر نماز پڑھاؤ۔ اس صحیح حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ تربیت اولاد انتہائی ضروری ہے، بچوں کو سات سال کی عمر تک نماز سکھا دینی چاہیے۔ نبی مکرم ﷺ نے اپنے قول و عمل سے امت کو فریضہ نماز بتایا ہے۔ جب آپ کے لیے منبر بنا دیا گیا تو آپ نے اس پر چڑھ کر نماز ادا کی اور جب سجدہ کرنے کا ارادہ کیا تو منبر سے اتر کر زمین پر سجدہ کیا اور پھر ارشاد فرمایا:

« أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا صَنَعْتُ هٰذَا لِتَأْتَمُّوْا بِیْ وَ لِتَعَلَّمُوْا صَلَاتِیْ » [صحیح البخاری، کتاب الجمعة: باب الخطبة علی المنبر (۹۱۷)]

''اے لوگو! میں نے یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا تا کہ تم میری اقتدا کرو اور میری نماز سیکھ لو۔''

لہٰذا عملاً نماز سکھانا رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے، بچے اگر سمجھ بوجھ والی عمر کو پہنچ چکے ہیں تو انھیں طہارت اور وضو کا طریقہ بتانا چاہیے پھر نماز سکھانی چاہیے۔ رہا بیوی کا مسئلہ تو شوہر پر واجب ہے کہ وہ اپنی اہلیہ کو نماز پڑھنے کا حکم دے اور ادب سکھائے، اگر وہ اس کا حکم مان کر نماز ادا کرنے لگ جائے تو بہت اچھا ہے اور اگر ترک نماز پر اصرار کرے تو کافر ہو جائے گی اور اس کے لیے حلال نہیں رہے گی، نکاح ٹوٹ جائے گا اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہجرت کرنے والی خواتین کے بارے میں فرمایا:

﴿ فَإِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ﴾ [ممتحنة : ۱۰]

''اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ ایمان والی ہیں تو انھیں کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ، یہ ان کے لیے حلال نہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال ہیں۔''

مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی کافر یا مرتد سے شادی کرے اور اگر یہ ارتداد یا صریح کفر نکاح کے بعد پیدا ہوا ہو تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا مسلمان مرد یا عورتیں سب کو چاہیے کہ وہ فریضہ نماز ادا کریں۔ اس جوڑے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی دعا ہے جو رات کو قیام کے لیے ایک دوسرے کو بیدار کرتے ہیں، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلاً قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلّٰى وَ أَيْقَظَ امْرَأَتَهٗ فَإِنْ أَبَتْ نَضَحَ فِيْ وَجْهِهَا الْمَاءَ رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّتْ وَ أَيْقَظَتْ زَوْجَهَا فَإِنْ أَبٰى نَضَحَتْ فِيْ وَجْهِهِ الْمَاءَ »

[ابوداؤد كتاب الصلوة: باب قيام الليل (١٣٠٨)، ابن خزيمة (١١٤٨)، ابن حبان (٦٤٦)، المستدرك للحاكم (٣٠٩/١)]

''اللہ تعالیٰ ایسے مرد پر رحم کرے جو رات کو اٹھے اور نماز ادا کرے اور اپنی بیوی کو بیدار کرے، اگر وہ اٹھنے سے انکار کرے تو اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور ایسی عورت پر بھی رحم کرے جو رات کو اٹھ کر نماز ادا کرے اور اپنے شوہر کو بیدار کرے، اگر وہ بیدار ہونے سے انکار کرے تو اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔''

اس حدیث کو امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے، یہ روایت نسائی اور ابن ماجہ میں بھی موجود ہے اور محمد بن عجلان کی تصریح بالسماع نسائی کے ہاں ثابت ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا أَيْقَظَ الرَّجُلُ أَهْلَهٗ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّيَا أَوْ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ جَمِيْعًا كُتِبَا فِي الذَّاكِرِيْنَ وَالذَّاكِرَاتِ »[ابوداؤد ، كتاب الصلوة: باب قيام الليل (١٣٠٩)، ابن حبان (٦٤٥)]

''جب آدمی رات کے وقت اپنی اہلیہ کو بیدار کرے پھر وہ دونوں نماز ادا کریں یا فرمایا دونوں دو رکعت پڑھیں تو وہ دونوں ذاکرین اور ذاکرات میں لکھے جائیں گے۔''

ان ہر دو صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے لیے مرد کو اپنی اہلیہ اور عورت کے لیے اپنے شوہر کو جگانا چاہیے، کیونکہ نماز ایک اہم ترین فریضہ ہے، اس سے غفلت برتنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اللہ ہمیں صحیح عمل کی توفیق عنایت کرے۔ (آمین!)

عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ نہ ہونے کی دلیل پکڑنے والوں کا ردّ

سوال کیا یہ روایت کسی صحیح سند سے مروی ہے:« لَوْ كَانَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى حَيَّيْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا إِلَّا اتِّبَاعِيْ » ''اگر موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے تو انھیں میری پیروی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔'' مرزائی حضرات اس روایت کو پیش کر کے عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت کرتے ہیں۔ صحیح تحقیق اس کے بارے میں کیا ہے؟

جواب اس روایت کو ابن کثیر نے ﴿ وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ ﴾ کی تفسیر (۴۰۶/۱) اور سورۂ کہف میں موسیٰ وخضر کے قصہ میں (۱۱۱/۳) بیان کیا ہے، لیکن اس کا کوئی حوالہ بیان نہیں کیا جبکہ اس روایت کا حدیث وسنت کی معروف کتب میں کہیں ذکر نہیں اور نہ اس کی کوئی اصل ہے اور یہ ان متواتر احادیث کے خلاف ہے جن میں عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر زندہ اٹھائے

جانے کا ذکر ہے۔عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے بارے میں مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ کی کتاب ''شہادۃ القرآن'' لائق مطالعہ ہے' اسی طرح حیات عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں متواتر روایات پر حافظ زبیر علی زئی حفظہ اللہ کا ایک مضمون ماہنامہ ''محدث'' میں طبع ہو چکا ہے۔اصل حدیث یوں ہے:((لَوْ كَانَ مُوسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِي)) اَوْ كَمَا قَالَ۔

ہومیو پیتھی ادویات استعمال

(سوال) کیا ہومیو پیتھی ادویات استعمال کرنا جائز ہے؟

(جواب) یہ بات بالکل عیاں اور واضح ہے کہ ہومیو پیتھک دوائیوں میں الکحل استعمال ہوتی ہے اور الکحل شراب ہے، اس کے استعمال کی اجازت نہیں۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا اس کا سرکہ بنایا جا سکتا ہے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں۔'' [مسلم ، كتاب الأشربة: باب تحريم تحليل الخمر(١٩٨٣)]

وائل حضرمی سے روایت ہے: ''طارق بن سوید نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع کیا تو اس نے کہا: ''میں نے یہ دوائی کے لیے بنائی ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ یہ دوا نہیں ہے بلکہ یہ بیماری ہے۔'' [مسلم ، كتاب الأشربة : باب تحريم التداوي بالخمر(١٩٨٤)]

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی یمن سے آیا، اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی شراب کے بارے میں پوچھا جسے وہ اپنی زمین میں مکئی سے بنا کر پیتے تھے، اسے مزر کہا جاتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا وہ نشہ آور ہے؟'' اس نے کہا: ''ہاں!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نشہ آور حرام ہے۔ بے شک اللہ کا اس شخص کے لیے عہد ہے جو نشہ آور چیز پیتا ہے کہ اسے طینۃ الخبال سے پلائے گا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! طینۃ الخبال کیا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جہنمیوں کا پسینا وغیرہ ہے۔'' [مسلم ، كتاب الأشربة: باب بيان أن كل مسكر خمر(٢٠٠٢)]

الغرض اس معنی کی بے شمار احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ الکحل یعنی شراب پینا حرام ہے لہٰذا وہ دوا جس میں شراب ملائی گئی ہو خواہ وہ ہومیو پیتھک ہو، ایلو پیتھک یا دیسی اس کا استعمال حرام ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ استعمال کے وقت وہ موجود نہیں ہوتی تو گزارش یہ ہے کہ شراب کی بیع اور خریداری بھی منع ہے۔ جب یہ دوا خریدی جاتی ہے تو اس میں الکحل ہوتی ہے لہٰذا اس کا پینا اور خریداری کرنا دونوں حرام ہیں۔

لقطہ کا حکم

(سوال) لقطہ یعنی گری پڑی چیز کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(جواب) لقطہ زمین پر گری ہوئی چیز اٹھا لینے کو کہتے ہیں، اس کی تین صورتیں ہیں:

① وہ چیز بالکل معمولی سی ہو اور کھانے کے کام آنے والی ہو۔ اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اسے اٹھا کر صاف کر کے تناول کر لیا جائے جیسا کہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« مَرَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِتَمْرَةٍ مَسْقُوْطَةٍ فَقَالَ لَوْ لَا اَنْ تَكُوْنَ مِنْ صَدَقَةٍ لَاَكَلْتُهَا »

[بخاری، کتاب البیوع: باب ما یتنزه من الشبهات (۲۰۵۵)]

''نبی کریم ﷺ ایک گری ہوئی کھجور کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ''اگر (مجھے یقین ہوتا کہ) یہ صدقہ کی نہیں ہے تو میں اسے کھا لیتا۔''

« عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ اِنِّیْ لَاَنْقَلِبُ اِلٰی اَهْلِیْ فَاَجِدُ التَّمْرَةَ سَاقِطَةً عَلٰی فِرَاشِیْ فَاَرْفَعُهَا لِاٰكُلَهَا ثُمَّ اَخْشٰی اَنْ تَكُوْنَ صَدَقَةً فَاُلْقِیْهَا »

[بخاری، کتاب اللقطة : باب إذا وجد تمرة فی الطریق (۲٤۳۲)]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''(کبھی) جب میں اپنے گھر آتا ہوں تو اپنے بستر پر پڑی ہوئی کھجور دیکھتا ہوں تو کھانے کے لیے اس کو اٹھا لیتا ہوں لیکن پھر خوف ہوتا ہے کہ کہیں یہ صدقہ کی نہ ہو، اس لیے میں اسے پھینک دیتا ہوں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر راستے میں کوئی ایسی گری پڑی چیز مل جائے جو معمولی ہو اور کھانے کے قابل ہو تو اٹھا کر کھا سکتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ظَاهِرٌ فِیْ جَوَازِ اَكْلِ مَا یُوْجَدُ مِنَ الْمُحَقَّرَاتِ مُلْقًی فِی الطُّرُقَاتِ لِاَنَّهٗ ذَكَرَ اَنَّهٗ لَمْ یَمْتَنِعْ مِنْ اَكْلِهَا اِلَّا تَوَرُّعًا لِخَشْیَةِ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الصَّدَقَةِ الَّتِیْ حُرِّمَتْ عَلَیْهِ لَا لِكَوْنِهَا مَرْمِیَّةً فِی الطَّرِیْقِ فَقَطْ" [فتح الباری : ٥/٨٦)

''یہ حدیث راستے میں پڑی ہوئی حقیر چیزوں کو اٹھا کر کھا لینے کے جواز میں ظاہر ہے، اس لیے کہ نبی ﷺ نے جو ذکر کیا ہے کہ انھیں اس کھجور کے کھانے میں صرف یہ چیز مانع ہوئی کہ کہیں یہ صدقہ کی نہ ہو جو آپ پر حرام کیا گیا ہے۔ نہ کہ اس کا راستہ میں فقط گرا پڑا ہونا۔''

لہٰذا معمولی سی کھانے والی چیز گری پڑی مل جائے تو اسے اٹھا کر کھا سکتے ہیں، اس کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں۔

② دوسری صورت یہ ہے کہ وہ چیز ہو تو معمولی نوعیت کی مگر کھانے کے کام آنے والی نہ ہو جیسے چھڑی، کوڑا، رسی، چاقو وغیرہ۔ اس کے بارے میں متعدد اقوال ہیں کہ تین دن تک لوگوں کے اجتماع میں اعلان کرتا رہے یا اتنی دیر اعلان کرے کہ اسے یقین ہو جائے کہ اس کا مالک اس کے بعد اسے تلاش نہیں کرے گا۔ سید سابق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اَلشَّیْءُ الْحَقِیْرُ لَا یُعَرَّفُ سَنَةً بَلْ یُعَرَّفُ زَمَنًا یُظَنُّ اَنَّ صَاحِبَهٗ لَا یَطْلُبُهٗ بَعْدَهٗ وَ لِلْمُلْتَقِطِ اَنْ

يُنْتَفِعَ بِهِ إِذَا لَمْ يُعْرَفْ صَاحِبُهُ " [فقه السنة : ۲۳۳/۳]

" حقیر سی چیز کا سال بھر اعلان نہ کیا جائے بلکہ اتنی دیر اعلان کیا جائے کہ یقین ہو جائے کہ اس کا مالک اس کے بعد اسے تلاش نہیں کرے گا۔ ایسی چیز کو اٹھانے والا اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے جب اس کا مالک معلوم نہ ہو۔"

اس کی دلیل بعض روایات و آثار سے ملتی ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« رَخَّصَ لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِي الْعَصَا وَ السَّوْطِ وَ الْحَبْلِ وَ أَشْبَاهِهِ يَلْتَقِطُهُ الرَّجُلُ يَنْتَفِعُ بِهِ » [ابو داود، كتاب اللقطة: باب التعريف باللقطة(۱۷۱۷)، بيهقى (۱۹۵/٦)]

" رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لاٹھی، کوڑا، رسی اور اس جیسی اشیاء میں رخصت دی ہے کہ اگر کوئی آدمی ایسی چیز گری پڑی اٹھالے تو وہ اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ فِي إِسْنَادِهِ ضُعْفٌ " [فتح البارى : ۸۵/۵]

" اس کی سند میں ضعف ہے۔"

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فِي هٰذَا الْحَدِيْثِ شَكٌّ وَ فِي إِسْنَادِهِ ضُعْفٌ " [بيهقى(۱۹۵/٦)]

" اس حدیث کے مرفوع ہونے میں شک ہے اور اس کی سند میں کمزوری ہے۔"

امام ابو داود رحمہ اللہ نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ راجح بات یہ ہے کہ حدیث موقوف ہے، مرفوع نہیں اور مرفوع و موقوف دونوں صورتوں میں علت یہ ہے کہ اس کی سند میں ابو الزبیر مدلس راوی ہیں اور انھوں نے اپنے استاد سے سننے کی وضاحت نہیں کی۔ [إرواء الغليل (۱۵/٦)]

علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حدیث ہے کہ انھیں بازار سے ایک دینار ملا تو نبی کریم ﷺ نے انھیں کہا: " تین دن تک اس کا اعلان کرو۔" انھوں نے ایسا ہی کیا تو کوئی شخص ایسا نہ ملا جو اس دینار کو پہچاننے والا ہو۔ انھوں نے نبی کریم ﷺ کی طرف رجوع کر کے آپ کو خبر دی۔ آپ نے انھیں کہا: " اسے کھالو۔" اس نے اس ایک دینار کو بارہ درہم سے تبدیل کیا، اس میں سے تین درہم کی کھجوریں اور ایک درہم کا زیتون خریدا...... الغرض ان کے پاس تین درہم باقی بچ گئے۔ جب انھوں نے ان اشیاء میں سے کچھ حصہ استعمال کر لیا تو اس دینار کا مالک آ گیا۔ علی رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: " مجھے نبی کریم ﷺ نے اس کو کھا لینے کا حکم دیا تھا۔" وہ اسے لے کر نبی ﷺ کے پاس آئے اور یہ بات بیان کی۔

آپ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا: " اس کا دینار اسے ادا کر دو۔" انھوں نے کہا: " ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔" تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " جب ہمارے پاس کوئی چیز آئے گی تو ہم اسے ادا کر دیں گے۔" [عبد الرزاق (۱۴۲/۱۰) ، (۱۸٦۳۷)، باب احلت اللقطة اليسيرة، نصب الراية(۴۷۰/۳)، كشف الأستار(۱۳۱/۲)،

(۱۳٦۸)، مسند ابی یعلی(۲/ ۳۳۲)، (۱۰۷۳)]

امام بزار ﷫ فرماتے ہیں: ''اس کی سند میں ابوبکر بن ابی سبرہ ہے، وہ لین الحدیث ہے۔'' علامہ ہیثمی ﷫ فرماتے ہیں: ''ابوبکر بن ابی سبرہ وضاع ہے۔'' [مجمع الزوائد(٤/ ١٦٩)، (٦٨٤٩)]

لیکن حافظ ضیاء مقدسی ﷫ فرماتے ہیں: ''یہ ابوبکر بن ابی سبرہ کے علاوہ ہے اور اس حدیث کو انھوں نے احادیث مختارہ میں ذکر کیا ہے۔'' (واللہ اعلم)

حضرت یعلیٰ بن مرہ ثقفی ﷜ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنِ الْتَقَطَ لُقْطَةً يَسِيرَةً دِرْهَمًا اَوْ حَبْلًا اَوْ شِبْهَ ذٰلِكَ فَلْيُعَرِّفْهُ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فَاِنْ كَانَ فَوْقَ ذٰلِكَ فَلْيُعَرِّفْهُ سَنَةً » [مسند احمد(٤/ ١٧٣)]

''جو شخص کوئی ہلکی سی چیز گری پڑی اٹھا لے جیسے درہم یا رسی یا اس جیسی کوئی اور چیز تو وہ تین دن تک اس کا اعلان کرے، اگر اس سے اوپر ہو تو ایک سال تک اس کا اعلان کرے۔''

مسند احمد کے مطبوعہ نسخے میں اس حدیث کے آخر میں ایک سال کا ذکر ہے، جب کہ مجمع الزوائد (۱۶۹/۴) میں « فَلْيُعَرِّفْهُ سِتَّةَ اَيَّامٍ » کے الفاظ ہیں یعنی چھ دن تک اس کا اعلان کرے۔ مسند احمد کے اطراف (۴۷۰/۵) میں بھی اسی طرح ان الفاظ کو ضبط کیا گیا ہے اور محقق نے مسند احمد کے ترکی اور ہندی مخطوطے سے بھی اسی طرح ثبت کیا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے یعنی ایسی چیز کا اعلان تین یا چھ دن تک کرے، اگر مالک نہ آئے تو استعمال کرے لیکن اس کی سند میں عمر بن عبداللہ بن یعلیٰ کمزور راوی ہے۔ مذکورہ بالا روایات میں اگرچہ ضعف ہے لیکن ان کی تائید میں صحیح آثار موجود ہیں جیسا کہ اسماعیل بن امیہ سے روایت ہے کہ عمر بن خطاب ﷜ نے فرمایا:

« اِذَا وَجَدْتَّ لُقْطَةً فَعَرِّفْهَا عَلَى بَابِ الْمَسْجِدِ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فَاِنْ جَاءَ مَنْ يَّعْتَرِفُهَا وَ اِلَّا فَشَأْنُكَ بِهَا » [مصنف عبد الرزاق (١٠/ ١٣٦)]

''جب تو کوئی گری پڑی چیز پائے تو مسجد کے دروازے پر تین دن تک اس کا اعلان کر۔ اگر تو اس کا پہچاننے والا آجائے تو اس کے حوالے کر اور اگر نہ آئے تو اسے استعمال کر لے۔''

اس لقطہ کو معمولی سی چیز ہی پر محمول کیا جائے گا۔

جیسا کہ عمر ﷜ سے مروی ایک اور اثر میں ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا جس کو ایک ستو کی تھیلی ملی تھی تو عمر ﷜ نے اسے حکم دیا کہ وہ تین دن تک اس کا اعلان کرے۔ وہ تین دن کے بعد آیا، اس نے کہا: ''اس کو پہچاننے والا کوئی نہیں۔'' تو عمر ﷜ نے کہا: ''اے غلام! اسے پکڑ لے، یہ اس سے بہتر ہے کہ اسے درندے لے جائیں یا ہوائیں اڑا دیں۔'' [عبد الرزاق (١٠/ ١٤٣)]

لہٰذا جب کوئی معمولی سی چیز ملے جو کھانے کے کام نہ آنے والی ہو تو اس کا تین دن تک یا اتنے دن تک اعلان کرے کہ

یقین ہو جائے کہ اس کا مالک اسے تلاش نہیں کرے گا، اس کے بعد وہ اسے استعمال کر سکتا ہے۔

③ تیسری صورت یہ ہے کہ وہ چیز قیمتی ہو۔ اس کا سال بھر اعلان کرتا رہے۔ عصر حاضر میں اخبارات، ریڈیو، بڑے بڑے جلسوں میں اعلان کرایا جا سکتا ہے اور اگر سال تک مالک نہ آئے تو اسے اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔ اگر مالک آ جائے تو اسے وہ چیز واپس کرنی پڑے گی۔ اگر وہ استعمال کر چکا ہو اور اصل چیز موجود نہ ہو تو اتنی قیمت ادا کر دے اور جب چیز ملے تو اس کی علامات اور نشانیاں اچھی طرح ذہن نشین کر لے یا نوٹ کر لے۔

لقطہ اگر حیوان ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو ایسا ہوگا جو اپنا دفاع خود کر سکتا ہوگا جیسے اونٹ، بیل وغیرہ تو ایسے حیوان کو نہ پکڑا جائے اور اگر ایسا ہو کہ وہ اپنا دفاع خود نہ کر سکتا ہو تو اسے پکڑ لیا جائے جیسے بکری وغیرہ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے گری پڑی چیز کے بارے میں پوچھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَعْرِفْ عِفَاصَهَا وَ وِكَائَهَا ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَ اِلَّا فَشَأْنُكَ بِهَا »

''اس کا ٹاٹ اور تسمہ خوب پہچان لے پھر سال بھر اس کا اعلان کرتا رہے، اگر اس کا مالک آ جائے تو اس کے سپرد کر دو ورنہ جو چاہو کرو۔''

پھر اس نے گم شدہ بکریوں کے بارے میں پوچھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« هِيَ لَكَ اَوْ لِاَخِيْكَ اَوْ لِلذِّئْبِ »

''وہ تیرے لیے ہے یا تیرے بھائی کے لیے یا بھیڑیے کے لیے۔''

پھر اس نے گم شدہ اونٹ کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَا لَكَ وَ لَهَا ؟ وَ مَعَهَا حِذَاءُ هَا وَ سِقَاؤُهَا تَرِدُ الْمَاءَ وَ تَأْكُلُ الشَّجَرَ حَتّٰى يَجِدَهَا رَبُّهَا »

[بخاری، کتاب اللقطة: باب اذا لم یوجد صاحب اللقطة بعد سنة فهي لمن وجدها (٢٤٢٩)، مسلم، کتاب اللقطة (١٧٢٢)]

''تجھے اس سے کیا سروکار؟ اس کا پانی، اس کے جوتے اس کے پاس ہیں۔ گھاٹ پر آ کر پانی پی لے گا، درختوں کے پتے کھائے گا یہاں تک کہ اس کا مالک اس کے پاس آ جائے گا۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ لقطہ اگر قیمتی چیز ہو یا جانور بکری وغیرہ کی مثل ہو تو اس کو پکڑ لے، اس کی علامات و نشانیاں اچھی طرح ذہن نشین کر لے اور سال بھر اس کا اعلان کرتا رہے، اگر اس کا مالک سال تک نہ آئے تو اسے ضمانت و ذمہ داری کے ساتھ اپنے استعمال میں لے آئے اور اگر اس کا مالک بعد میں آ جائے تو اس کی ملکیت باقی رہتی ہے لہٰذا وہ چیز واپس کرنی پڑے گی اور اگر ایسا حیوان ہو جو اپنا دفاع کر سکتا ہو تو اسے نہیں پکڑنا چاہیے۔ گری پڑی چیز جس شخص کو مل جائے اسے وہ چیز چھپانی نہیں چاہیے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لقطہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« تَعرِفُ وَ لَا تَغِيبُ وَ لَا تَكْتُمُ فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَ إِلَّا فَهُوَ مَالُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ »[مجمع الزوائد (٤/٢٩٧)، (٦٨٣٩)، مسند بزار(١٣٦٧)، كشف الأستار]

''اس کی شناخت کی جائے اور اسے غائب کیا جائے نہ چھپایا جائے۔ اگر اس کا مالک آ جائے تو اس کے حوالے کر دو اور اگر نہ آئے تو وہ اللہ کا مال ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔''

شناخت و پہچان کا حکم اس لیے ہے کہ اس چیز کے جعلی دعویدار پیدا نہ ہوں بلکہ جو شخص صحیح علامات بیان کر دے اس کے حوالے کر دی جائے۔[واللہ اعلم بالصوب]

اجتہاد کے متعلق معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تحقیق

سوال کیا اجتہاد کے متعلق معاذ رضی اللہ عنہ کی معروف حدیث صحیح ہے؟

جواب سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں ہے۔ سنن ابي داؤد میں اس سند کے ساتھ مروی ہے:

« حَدَّثَنَا حَفْصُ ابْنُ عُمَرَ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ اَبِيْ عَوْنٍ عَنِ الْحَارِثِ بْنِ عَمْرٍو، ابْنِ اَخِي الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ عَنْ أُنَاسٍ مِن اَهْلِ حِمْصَ مِنْ اَصْحَابِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَمَّا اَرَادَ اَنْ يَّبْعَثَ مُعَاذًا اِلَى الْيَمَنِ قَالَ كَيْفَ تَقْضِيْ اِذَا عُرِضَ لَكَ قَضَاءٌ ؟ قَالَ اَقْضِيْ بِكِتَابِ اللّٰهِ قَالَ فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ ؟ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ لَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ ؟ قَالَ اَجْتَهِدُ بِرَأْيِيْ وَ لَا آلُوْ فَضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ صَدْرَهُ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لِمَا يَرْضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ »[ابو داؤد، كتاب القضاء: باب اجتهاد الرأى فى القضاء (٣٥٩٢)، (١٨/٢)، ترمذى، كتاب الأحكام: باب ما جاء فى القاضى كيف يقضى (١٢٣٨)]

''معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیا تو انھیں کہا:'' اے معاذ! جب تیرے پاس کوئی معاملہ آئے تو تو کیسے فیصلے کرے گا؟'' انھوں نے کہا:'' میں کتاب اللہ کے ذریعے فیصلہ کروں گا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' اگر تو کتاب اللہ میں نہ پائے تو؟'' انھوں نے کہا:'' سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کروں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' اگر تو کتاب اللہ اور سنت رسول میں نہ پائے تو؟'' انھوں نے کہا:'' میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہیں کروں گا۔'' تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا:'' تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جس کے

ذریعے وہ رسول اللہ ﷺ کو راضی کرتا ہے۔“

یہ روایت انتہائی ضعیف ہے اور اس کے ضعف کے اسباب درج ذیل ہیں:

① اس کی سند میں ابوعون محمد بن عبیداللہ الثقفی حارث بن عمرو سے روایت بیان کرنے میں متفرد ہے۔

② دوسرا راوی حارث بن عمرو مجہول ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے تقریب (ص:۲۰) پر لکھا ہے: ” مَجْهُوْلٌ مِنَ السَّادِسَةِ “

③ اس روایت میں تیسری کمزوری یہ ہے کہ اس کی سند میں سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے اصحاب معاذ غیر معروف ہیں، پتا نہیں وہ کون ہیں؟

لہٰذا مندرجہ بالا تین اسباب کی وجہ سے حدیث معاذ رضی اللہ عنہ ضعیف ہے۔

بینک کی چوکیداری کی نوکری

سوال کیا بینک کی چوکیداری کی نوکری جائز ہے؟

جواب بینک میں کام کرنے والے مینیجر وغیرہ چونکہ سودی کاروبار میں شریک ہونے کی وجہ سے لعنت کے حقدار ہو جاتے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، سود لکھنے والے اور سود کے گواہوں پر لعنت کی ہے اور انھیں گناہ میں برابر قرار دیا ہے۔[مسلم ، کتاب المساقاۃ: باب لعن آکل الربا و مؤکلہ(۱۵۹۸)]

اس میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ سود کھانے اور کھلانے پر لعنت کے ساتھ سود لکھنے والے اور گواہوں پر لعنت کیوں ہے؟ نہ انھوں نے سود لیا اور نہ سود دیا۔ یاد رہے کہ اس پر لعنت سودی معاملے میں تعاون کی وجہ سے ہے اور گناہ پر تعاون حرام ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [المائدۃ: ۲]

” نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو، زیادتی اور گناہ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈر جاؤ، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔“

بینک کی چوکیداری کرنے والا شخص بھی سودی رقم کا تحفظ کر کے گناہ پر تعاون کر رہا ہے، اس لیے اس کی نوکری درست نہیں۔

سودی کاروبار کرنے والے کے گھر سے کھانا

سوال کیا سودی کاروبار کرنے والے کے گھر سے کھانا جائز ہے؟

جواب: جس شخص کے بارے میں یہ بات معلوم ہو کہ اس کا کاروبار سود پر مبنی ہے تو اس کی رقم سے خریدی ہوئی کوئی چیز بھی کھانا یا پینا جائز نہیں کیونکہ سود صریح حرام اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے مترادف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور سودی معاملات پر گواہی دینے والے پر لعنت کی ہے اور انھیں برابر کے لعنتی قرار دیا ہے۔[مسلم ، كتاب المساقاة : باب لعن آكل الربا(۱۵۹۸)]

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''سود کے ستر حصے ہیں اور سب سے چھوٹا حصہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے بدکاری کرے۔''[ابن ماجه، كتاب التجارات : باب التغليظ في الربا(۲۲۷٤)]

لہٰذا اتنے بڑے گناہ سے اجتناب اور ہر طرح کے سودی معاملے سے مکمل گریز کیا جائے تاکہ آخرت سنور جائے۔

لفظ ''نصب'' کا معنی

سوال: لفظ ''نصب'' کا معنی کیا ہے اور کیا آستانہ بھی نصب ہے؟

جواب: انصاب عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا واحد نصب ہے اور لغت میں اس سے مراد وہ تمام مقامات ہیں جو لوگوں نے غیر اللہ کی پرستش کے لیے مخصوص کیے ہوتے ہیں۔ عربی لغت کی معتبر کتاب القاموس میں لکھا ہے:

'' كُلُّ مَا جُعِلَ عَلَمًا كَالنَّصِيبَةِ وَ كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ '' [القاموس المحيط (۱۳۷/۱)]

''وہ جس کو علم بنایا جائے جیسے کہ نصیبہ ہے اور ہر وہ چیز جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جائے اس کو نصب کہتے ہیں۔''

نصب کا یہی معنی محمد بن ابی بکر بن عبد القادر الرازی نے ''مختار الصحاح (ص:٦٦١)'' اور ''المعجم الوسيط (ص:٩٢٥)'' پر مذکورہ ہے اور اردو تراجم میں مولانا مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں یہی ترجمہ کیا ہے بلکہ ایک حاشیے میں لکھا ہے:

''اصل میں لفظ ''نصب'' استعمال ہوا ہے اس سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی مورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا معنی لفظ آستانہ یا استھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔''

یہ معنی لغت کے اعتبار سے درست ہے اور « كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ » میں داخل ہے کیونکہ موجودہ دور میں تمام آستانوں پر غیر اللہ سے فریاد رسی، سجدہ ریزی، نذر و نیاز اور چڑھاوے وغیرہ چڑھائے جاتے ہیں۔ جو کام اللہ کے لیے مختص ہیں وہ بزرگوں کے آستانوں سے وابستہ کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا نصب یا انصاب کا معنی آستانے کرنا درست ہے غلط نہیں۔

علماء کی سیکیورٹی

سوال: حفاظت کے لیے علماء کا اپنے لیے محافظ رکھنا کیسا ہے؟

جواب دشمنان دین کی بڑھتی ہوئی یلغاروں اور فسادات کی بنا پر اپنی حفاظت کے لیے اسباب کو بروئے کار لانا توکل کے خلاف نہیں جیسا کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے کہا: ''کیا میں اپنی اونٹنی چھوڑ دوں اور اللہ پر توکل کروں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کا گھٹنا باندھ اور توکل کر۔'' [صحیح ابن حبان(٢٥٣٩)، مستدرك حاكم(٦٢٣)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ اسباب کو بروئے کار لانا توکل علی اللہ کے خلاف نہیں لہٰذا علمائے کرام یا قائدین اسلام اگر دشمنان دین کی خفیہ چالوں سے محفوظ ہونے کے لیے حفاظتی ساز و سامان کا بندوبست کرتے ہیں تو یہ توکل علی اللہ کے خلاف نہیں۔

جہاد و قتال ایک ایسا فریضہ ہے جس میں اسلحہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے جس سے جان و مال کی حفاظت کی جاتی ہے اور جان و مال کی حفاظت شریعت اسلامی میں مطلوب ہے۔ قرآن حکیم اور صحیح احادیث میں ایسے دلائل بکثرت موجود ہیں جن میں اسباب اختیار کرنے کا صراحتاً حکم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ﴾ [الانفال: ٦٠]

''اوران کافروں کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق قوت تیار رکھو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے مقابلے کے لیے تیاری کا حکم ہے۔ اس طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ﴾ [النساء: ١٠٢]

''کفار چاہتے ہیں کہ تم اپنے اسلحہ اور اسباب و متاع سے غافل ہو جاؤ تاکہ وہ یک بارگی تم پر حملہ کر دیں۔''

ان واضح آیات سے معلوم ہوا کہ مسلمان آدمی کو اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ اور اسباب جمع رکھنے چاہییں تاکہ وہ اپنی حفاظت کا بندوبست اچھے طریقے سے کر سکے۔ باڈی گارڈ بھی اسباب میں سے ایک سبب ہے جسے ضرورت کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مختلف مواقع پر حفاظت اور پہرے کا بندوبست کیا ہے۔

جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل روایت میں ہے: ''ایک رات آپ ﷺ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور فرمایا: ''آج رات چوکیداری کون کرے گا؟'' تو آپ ﷺ کی بات پر لبیک کہہ کر ایک انصاری اور ایک مہاجر صحابی نے رات کو چوکیداری کی۔''
[ابوداود، كتاب الطهارة: باب الوضوء من الدم (١٩٨)، مستدرك حاكم(١/ ١٥٦)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ حفاظتی بندوبست کرتے ہوئے آپ نے پہرے داروں کا بندوبست کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے رات کو آپ کی اور دیگر ساتھیوں کی حفاظت کے لیے چوکیداری کی۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حطیم میں نماز ادا کرتے تو عمر رضی اللہ عنہ تلوار سونت کر آپ ﷺ کا پہرا دیتے تھے۔
[تاريخ مدينة لابن شبة (١/ ٣٠٠)]

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے اور وہ آپ کے پہلو میں تھیں۔ کہتی ہیں میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کو کیا ہوا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کاش! میرا کوئی صالح صحابی آج رات میرا پہرا دے۔

''کہتی ہیں ہم اسی حال میں تھے کہ ہم نے اسلحہ کی آواز سنی۔'' آپ نے کہا: ''کون ہے؟'' تو اس آدمی نے کہا: ''میں سعد بن ابی وقاص ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیری کیا حالت ہے؟'' اس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں آپ کی چوکیداری کے لیے حاضر ہوا ہوں۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ سو گئے اور میں نے آپ ﷺ کے خراٹوں کی آواز سنی۔''
[بخاری، کتاب الجهاد: باب الحراسة فی الغزو فی سبیل الله (۲۸۸۵)، تاريخ مدينة منورة(۱/۳۰۰)]

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ مسائل کا استنباط کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''دشمن سے بچاؤ کے لیے حفاظتی تدابیر کرنا صحیح ہے۔ لوگوں پر ضروری ہے کہ وہ اپنے سلطان و امیر کے قتل کے ڈر کی وجہ سے پہرا دیں۔'' [فتح الباری(٦/٦١)]

ایک صحیح روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں بھی اسلحہ لایا جا سکتا ہے مگر اس کا ادب یہ ہے کہ اس کے پھالے کو پکڑ کر رکھے تاکہ کسی مسلمان کو زخمی نہ کر دے لہٰذا مساجد و غیر مساجد میں اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ لایا جا سکتا ہے اور اسباب کے تحت محافظ وغیرہ رکھنا درست ہے۔

غیر محرم مردوں سے عورتوں کا مصافحہ کرنا

سوال غیر محرم مردوں سے عورتوں کا مصافحہ کرنا کیسا ہے؟

جواب عورتوں کا غیر محرم مردوں سے مصافحہ کرنا ناجائز ہے۔ نبی ﷺ نے عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے فرمایا:

«اِنِّیْ لَا اُصَافِحُ النِّسَاءَ» [نسائی، کتاب البیعة : باب بیعة النساء(٤١٨٦)، احمد (٣٥٧/٦)]

''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں لگا۔ آپ صرف زبانی بیعت لیا کرتے تھے۔'' [مسلم، کتاب الإمارة: باب کیفیة بیعة النساء (١٨٦٦)]

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو عمدہ نمونہ بنایا ہے لہٰذا ہمیں رسول اللہ ﷺ کی مکمل اطاعت و فرمانبرداری کرنی چاہیے اور غیر محرم اجنبی عورتوں سے قطعاً مصافحہ نہیں کرنا چاہیے تاکہ فتنہ و فساد اور مشکوک ماحول سے اجتناب ہو، البتہ عورتوں کا اپنے محرم رشتہ داروں، مثلاً باپ، بیٹا، بھائی وغیرہ سے مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے لینز لگانا

سوال کیا آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے لینز لگانا جائز ہے؟

جواب مارکیٹ میں دو طرح کے لینز دستیاب ہیں۔ ایک تو نظر کے لیے کہ جس شخص کی بینائی کمزور پڑ جائے تو وہ عینک کی

جگہ لینز لگاتا ہے اور دوسرے بالکل سادہ ہیں جو بینائی کی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ فیشن اور زینت سمجھ کر لگائے جاتے ہیں، تو ان دونوں کے لگانے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ البتہ خواتین کے بارے میں ایک بات کا لحاظ ضروری ہے۔ کہ کتنی ہی نصوص شرعیہ میں عورت کو غیر محرم کے سامنے اظہار زینت سے روکا گیا ہے، لہٰذا اگر کوئی عورت لینز لگا کر غیر محرم کے سامنے اس کا اظہار کرتی ہے اور آنکھوں کے رنگ کو تبدیل کر کے دعوت گناہ دیتی ہے تو یہ فعل عبث اور حرام ہوگا، اس کے لیے لینز لگانے کی اجازت نہیں ہے اور جو عورتیں شرعی لباس وحجاب کا لحاظ رکھتی ہیں، گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنی آنکھوں کی حفاظت کرتی ہیں تو جس طرح دیگر زیب و زینت ان کے حق میں جائز اور درست ہے تو یہ بھی اس قسم میں داخل ہے۔

سالگرہ منانا

سوال کیا سالگرہ منانا جائز ہے؟

جواب شادی یا پیدائش وغیرہ کی سالگرہ منانا دین اسلام میں ثابت نہیں۔ رسول کریم ﷺ کی ولادت بھی ہوئی اور شادیاں بھی، اسی طرح آپ کی بیٹیوں کی شادیاں بھی ہوئیں لیکن یہ بات کہیں بھی ثابت نہیں کہ آپ نے اپنی یا اپنی اولاد کی سالگرہ منائی ہو یا اپنے اصحاب کو سالگرہ منانے کا حکم دیا ہو یا کسی صحابی نے سالگرہ منائی ہو اور آپ ﷺ نے اس پر سکوت کر کے برقرار رکھا ہو۔ لہٰذا یہ فعل اسلامی نہیں۔ اگر اسلام میں اس کی کوئی اہمیت ہوتی تو ضرور اس کا کہیں تذکرہ ہوتا لیکن عیسائیوں وغیرہ کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اسے منانا شروع کر دیا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں تو وہ مردود ہے۔'' لہٰذا سالگرہ منانا درست نہیں۔

صاع، مد، رطل اور وسق کا صحیح وزن

سوال صاع، مد، رطل اور وسق کا صحیح وزن کیا ہے؟

جواب صاع ماپ کا پیمانہ ہے، وزن کا نہیں۔ جب اسے اوزان میں لایا جاتا ہے تو اجناس کی مختلف اقسام کی بنا پر اس میں کمی بیشی ہو جاتی ہے، جس کی بنا پر اہل علم میں اس کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک صاع میں ۴ مد ہوتے ہیں اور یہ بات اہل علم کے ہاں معروف ہے کہ صاع نبوی $5\frac{1}{3}$ ہے، لہٰذا ایک مد کا وزن $1\frac{1}{3}$ رطل ہے۔ ایک وسق میں ۶۰ صاع ہوتے ہیں تو ۵ وسق کے ۳۰۰ صاع ہوئے۔ ۵ وسق کا وزن صاع کے وزن پر موقوف ہے۔

برصغیر کے عام علماء صاع کا وزن دو سیر گیارہ چھٹانک تین تولے اور چار ماشے بیان کرتے ہیں۔

مولانا عبداللہ محدث روپڑی کے فتاوئ اہل حدیث (۴۰۹/۲) میں لکھا ہے کہ صاع مدینہ کا معتبر ہے اور اس کا صحیح اندازہ پانچ رطل اور تہائی رطل ہے اور رطل کا مشہور اندازہ آدھ سیر ہے۔ اس حساب سے صاع دو سیر پختہ انگریزی ۱۰ چھٹانک ۳ تولہ ۴ ماشے ہوتا ہے۔

جبکہ محدث حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کے ہاں ایک مد ۹ چھٹانک کے برابر اور ۴ مد ۳۶ چھٹانک کے برابر ہوئے اور ایک صاع پھر سوا دو سیر ہوا۔ ۵ وسق کا ۱۶ من ۳۵ سیر ہوا۔ جب کہ صحیح اور اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ایک مد میں نصف کلو کے قریب گندم آتی ہے۔ اس لحاظ سے پانچ وسق ۳۰۰ صاع کا وزن ۶۰۰ کلو گندم یعنی ۱۵ من کے برابر ہو گا۔

مَدَّ يَمُدُّ مَدًّا کا معنی "پھیلانا" ہے۔ لغت کی مشہور کتب " لسان العرب (۵۳/۱۳)، مجمع بحار الأنوار(۵۶۸/٤) اور النہایۃ فی غریب الحدیث والأثر (۳۰۸/٤) میں ہے:

" اِنَّ اَصْلَ الْمُدِّ بِاَنْ يَّمُدَّ الرَّجُلُ يَدَيْهِ فَيَمْلَأَ كَفَّيْهِ طَعَامًا "

"مد کی اصل یہ ہے کہ آدمی اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور ہتھیلیوں میں غلہ بھرے۔"

قاموس میں ہے:

" اَلْمُدُّ بِالضَّمِّ مِكْيَالٌ وَ هُوَ رِطْلَانِ اَوْ رِطْلٌ وَ ثُلُثٌ اَوْ مِلْئُ كَفَّي الْاِنْسَانِ الْمُعْتَدِلِ اِذَا مَلَأَهُمَا وَ مَدَّ يَدَهُ بِهِمَا وَ بِهِ سُمِّيَ مُدًّا وَ قَدْ جَرَّبْتُ ذٰلِكَ فَوَجَدْتُّهُ صَحِيْحًا " [القاموس المحيط(ص/٤٠٧)]

"مد ضمہ (پیش) کے ساتھ پیائش کا پیمانہ اور وہ دو رطل (اہل عراق اور ابو حنیفہ کے نزدیک) یا رطل (اہل حجاز کے ہاں) یا درمیانے انسان کی دونوں ہتھیلیاں ہیں، جب وہ ان دونوں کو بھرے اور ہتھیلیاں پھیلا دے۔ اسی وجہ سے اسے مد کہا جاتا ہے۔ میں نے اس کا تجربہ کیا اور اسے صحیح پایا۔"

ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں:

" اَلصَّاعُ اَرْبَعَةُ اَمْدَادٍ كُلُّ مُدٍّ رِطْلٌ وَ ثُلُثٌ قَالَ الدَّاوُوْدِيُّ : مِعْيَارُهُ الَّذِيْ لَا يَخْتَلِفُ : اَرْبَعُ حَفَنَاتٍ بِكَفَّيِ الرَّجُلِ الَّذِيْ لَيْسَ بِعَظِيْمِ الْكَفَّيْنِ وَ لَا صَغِيْرِهِمَا اِذْ لَيْسَ كُلُّ مَكَانٍ يُوْجَدُ فِيْهِ صَاعُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِنْتَهٰى وَ جَرَّبْتُ ذٰلِكَ فَوَجَدْتُّهُ صَحِيْحًا" [القاموس المحيط (ص/٩٥٥)] ۔

"ایک صاع کے چار مد ہوتے ہیں۔ ہر ایک مد ۱⅓ رطل ہوتا ہے۔ (ایک صاع ۵⅓ رطل ہوتا ہے) داودی نے کہا: "اس کا معیار جو مختلف نہیں ہوتا ایسے آدمی کے دونوں ہاتھوں کی چار لپیں ہیں جس کی ہتھیلیاں نہ بڑی ہوں اور نہ چھوٹی۔ اس لیے کہ ہر جگہ رسول اللہ ﷺ کا صاع نہیں پایا جاتا۔ علامہ فیروز آبادی صاحب قاموس فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے اور اسے صحیح پایا ہے یعنی ایسی چار لپیں رطل کے برابر ہوتی ہیں۔"

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وَ قَالَ جَمَاعَةٌ مِّنَ الْعُلَمَاءِ : اَلصَّاعُ اَرْبَعُ حَفَنَاتٍ بِكَفَّيْ رَجُلٍ مُعْتَدِلِ الْكَفَّيْنِ " [المجموع (١٢٩/٦)] ، نیز دیکھیں: مغنی المحتاج(٣٨٢/١)، المصباح المنیر(٤١٥/١)، الایضاح والتبیان فی

معرفة المكيال والميزان(ص/٥٧ـ٥٦)، بحوالة التعليق على كتاب الزكاة للبغوى (ص/٢٢٣)]
''علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: ''ایک صاع میں درمیانی ہتھیلیوں والے آدمی کی چار لپیں ہوتی ہیں۔''
مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ ایک صاع میں درمیانی ہتھیلیوں والے آدمی کی چار لپیں ہوتی ہیں۔ حافظ عبدالسلام بھٹوی ﷾ فرماتے ہیں: ''اسلام دین فطرت ہے اور اس کے مقرر کردہ پیمانے بھی سادہ اور فطری ہیں۔'' سعودی عرب کے مشہور مفتی شیخ عبدالعزیز بن باز اور ان کے ساتھ هيئة كبار العلماء کے اراکین نے بھی یہی فرمایا ہے کہ صدقہ فطر ادا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ معتدل ہاتھوں والا آدمی دونوں ہاتھوں کی لپیں چار دفعہ بھر کر ادا کر دے۔
یہ مقدار ہمارے تجربہ کے مطابق گندم میں سے دو کلو ہے اور ہر شخص خود بھی تجربہ کر سکتا ہے: ''احکام زکوٰۃ وعشر (ص:۵۴) اور مفتی عبدالرحمٰن رحمانی کے رسالہ '' الميزان فى الأوزان'' میں بھی یہی بات موجود ہے۔ لہٰذا انھوں نے جو اپنی کتاب'' مسائل عشر پر تحقیقی نظر (ص:۱۲۔۱۱) میں پانچ وسق کا وزن تقریباً ۲۰ من کے برابر قرار دیا ہے، وہ درست نہیں۔ صحیح اور درست ۱۵ من وزن پانچ وسق بنتا ہے۔ (واللہ اعلم)

بغیر اجازت کسی کی چیز استعمال کرنا

سوال بغیر اجازت کسی کی چیز استعمال کرنا کیسا ہے؟

جواب مسلمان آدمی کا مال، خون اور عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے کسی شخص کی چیز اس کی اجازت و رضا مندی کے بغیر استعمال کرنا درست نہیں۔ دفاتر یا مساجد وغیرہ میں ایک دوسرے کے جوتے اجازت کے بغیر استعمال کرنا درست نہیں۔ دفاتر یا مساجد وغیرہ میں جو لوگ ایک دوسرے کی جوتیاں اجازت کے بغیر استعمال کرتے ہیں اس میں بہت سی قباحتیں ہیں:

① کسی بھائی کی چیز اس کی اجازت کے بغیر لینا ہی حلال نہیں یہاں تک کہ اس کی لاٹھی بھی نہیں اٹھائی جا سکتی۔

ابو حمید ساعدی ﷜ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّأْخُذَ عَصَا اَخِيْهِ بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسِهِ مِنْهُ » [ابن حبان(١١٦٦)فى موارد الظمآن]
''کسی بھی مسلمان کے لیے اپنے بھائی کی لاٹھی اس کی رضا مندی کے بغیر لینا حلال نہیں۔''

آپ ﷺ نے مسلمان کا مال دوسرے مسلمان پر حرام قرار دیا ہے، اس لیے بغیر اجازت چیز اٹھانے سے وہ فعل حرام کا ارتکاب کرتا ہے۔

② جس شخص کا جوتا اٹھایا جاتا ہے جب وہ اسے تلاش کرتا ہے تو نہ ملنے پر وہ کسی دوسرے کا پہن لیتا ہے جس سے یہ عمل مسلسل آگے چل پڑتا ہے، جس سے ایک کی بجائے کئی افراد پریشان ہوتے ہیں۔ تو پہلا شخص جس نے یہ برا عمل جاری کیا مسلسل گناہ حاصل کرتا رہتا ہے، اس پر اپنے عمل کا بھی گناہ اور اس کی وجہ سے جتنے لوگ اس فعل میں مبتلا ہوئے ان کا بھی گناہ بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کمی کی جائے۔ بہت کم ایسے افراد دیکھے گئے ہیں جو اپنا جوتا گم ہونے پر کسی

دوسرے کا نہ پہنیں۔ (واللہ اعلم)

③ پھر اس عمل سے یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایک جوتا کسی کا پہن لیتے ہیں اور ایک کسی دوسرے کا، جس کی بنا پر اکثر جوتے بیکار سمجھے جاتے ہیں اور انھیں مستقل لا وارث سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہے۔

④ اخلاقیات کا انحطاط بڑھتا جاتا ہے اور اچھے بھلے لوگ بدظن ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص کی غلطی سے پوری تحریک بدنام ہو جاتی ہے۔ بہر کیف ایک چھوٹی سی غلطی بڑے بڑے جرائم کا سبب بن جاتی ہے اور چوری جیسی بد عادت جنم لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قبیح عادات اور اخلاق رذیلہ سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

شوہر سے پوچھے بغیر عورت کا صدقہ کرنا

سوال شوہر سے پوچھے بغیر کیا عورت صدقہ کر سکتی ہے؟

جواب عورت کو اپنے خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر مال خرچ نہیں کرنا چاہیے۔

ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تُنْفِقُ امْرَأَةٌ شَيْئًا مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِهَا قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَ لَا الطَّعَامَ ؟ قَالَ ذٰلِكَ اَفْضَلُ اَمْوَالِنَا » [ابوداود، كتاب البيوع: باب فى تضمين العارية(٣٥٦٥)، ترمذى(٦٧٠)، ابن ماجه (٢٢٩٥)، مسند احمد(٢٦٧/٥)، مسند طيالسى (١١٢٧)، مصنف عبد الرزاق(١٦٦٢١)، التمهيد(٢٣٠/١) ، بيهقى(١٩٣/٤،١٩٤)، شرح السنة (٢٠٤/٦)]

''عورت اپنے شوہر کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر کوئی چیز خرچ نہ کرے۔'' کہا گیا: ''اے اللہ کے رسول! اور غلہ بھی نہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ تو ہمارے افضل مالوں سے ہے۔''

معلوم ہوا کہ جب ایسا صدقہ اور خیرات جو غلے سے کم قدر و قیمت والا ہو وہ خاوند کی اجازت کے بغیر خرچ نہیں کر سکتی تو جو غلہ افضل اموال سے ہے وہ کیسے خرچ کر سکتی ہے؟ [تحفة الأحوذى (٢٨٨/٣)]

اگر عورت کو معلوم ہو کہ صدقات و خیرات کرنے سے مرد نہیں روکتا بلکہ پسند کرتا ہے تو پھر خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِذَا تَصَدَّقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا كَانَ لَهَا بِهِ اَجْرٌ وَ لِلزَّوْجِ مِثْلُ ذٰلِكَ وَ لَا يَنْقُصُ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ مِنْ اَجْرِ صَاحِبِهٖ شَيْئًا لَهٗ بِمَا كَسَبَ وَ لَهَا بِمَا اَنْفَقَتْ »[ترمذى، كتاب الزكاة: باب ما جاء فى نفقة المرأة من بيت زوجها(٦٧١) ، نسائى فى السنن الكبرىٰ(٣٥/٢)]

''جب عورت اپنے شوہر کے گھر سے صدقہ کرتی ہے تو اسے اس کا اجر ملتا ہے اور شوہر کو بھی اسی طرح اجر ملتا ہے اور ہر ایک دوسرے کے اجر کو کم نہیں کرتا۔ مرد کے لیے اس کی کمائی کا اجر اور عورت کے لیے اس کے خرچ کرنے کا

اجر ہے۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا أَعْطَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا بِطِيبِ نَفْسٍ غَيْرَ مُفْسِدَةٍ فَإِنَّهَا لَهَا مِثْلُ أَجْرِهِ لَهَا مَا نَوَتْ حَسَنًا وَ لِلْخَازِنِ مِثْلُ ذٰلِكَ» [ترمذی ، کتاب الزکاة: باب ما جاء في نفقة المرأة من بيت زوجها(٦٧٢)، نسائي في السنن الكبرىٰ (٩/٥/٣٧٩)]

''جب عورت شوہر کے گھر سے خوشی کے ساتھ عطیہ دے اور عطیہ میں اسراف کرنے والی نہ ہوتو اس کے لیے شوہر کے اجر کے مثل اجر ہے اور عورت کے لیے وہ ہے جو اس نے اچھی نیت کی اور خازن کو بھی اسی جتنا اجر ہے۔''

علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ اس کی شرح میں رقمطراز ہیں:

''وَ هٰذَا مَحْمُولٌ عَلىٰ إِذْنِ الزَّوْجِ لَهَا بِذٰلِكَ صَرِيحًا أَوْ دَلَالَةً'' [تحفة الأحوذي (٣/٣٩٠)]

''یہ عورت کے لیے شوہر کی اجازت پر محمول ہے، خواہ یہ اجازت صراحتاً ہو یا اشارۃً۔''

مطلب یہ ہے کہ مرد نے عورت کو واضح طور پر خرچ کرنے کی اجازت دے رکھی ہو یا اس کے عمل سے معلوم ہو کہ عورت کے خرچ کرنے پر وہ ناراض نہیں ہوتا۔ مرقاۃ میں یہ قول بھی ہے:

''یہ معاملہ اہل حجاز کی عادت کے موافق ہے، ان کی عادت تھی کہ انھوں نے اپنی بیویوں اور نوکروں کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ مہمان نوازی کریں، سائل، مساکین اور پڑوسیوں کو کھلائیں پلائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس اچھی عادت اور عمدہ خصلت پر شوق دلایا ہے۔'' [مرقاة شرح مشكوٰة (٤/٤٣٥)]

لہٰذا عورت کو جب شوہر کی طرف سے اجازت ہو، خواہ یہ اجازت وضاحت کے ساتھ ہو یا کسی اور طریقے سے تو اسے خرچ کرنا چاہیے، مرد کی طرح عورت کو بھی اجر ملے گا، مرد کو کمائی کرنے کی وجہ سے اور عورت کو خرچ کرنے کی وجہ سے۔ ہمارے گھروں میں مرد حضرات کی عادت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اور خواتین اللہ کی راہ میں عطیات و صدقات دیتی رہتی ہیں اور شوہر اس پر ناراض نہیں ہوتے۔ بہر کیف عورت کو شوہر کی اجازت اور رضا مندی حاصل کر لینی چاہیے۔ (واللہ اعلم)

افتتاح کے لیے فیتا کاٹنا

سوال دکان وغیرہ کے افتتاح کے لیے فیتا کاٹنے کا کیا حکم ہے؟

جواب کسی دکان، فیکٹری، دفتر وغیرہ کا افتتاح کرنے کے لیے پہلے فیتا باندھ دینا پھر کسی بڑے آدمی کو بلا کر بسم اللہ کرانا اور فیتا کاٹنا کسی صحیح حدیث یا آثار صحابہ سے ثابت نہیں اور نہ اس میں کوئی فائدہ ہی ہے۔ یہ صرف غیر مسلموں کی اندھی تقلید کا نتیجہ ہے۔ اسلام نے کسی بھی اچھے کام کے افتتاح سے پہلے جو طریقہ کار بتایا ہے وہ استخارہ ہے یعنی باوضو ہو کر پہلے دو رکعت

نماز ادا کریں پھر دعائے استخارہ پڑھیں، پھر محنت، توجہ اور اخلاص کے ساتھ کام کریں، ملاوٹ، ظلم، دھوکا دہی، کرخت رویہ جیسے اخلاق رذیلہ سے اجتناب کریں تو اللہ تعالیٰ خیر وبرکت نازل کرے گا۔ البتہ صحیح حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلا پھل دیکھتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے: ''اے اللہ! ہمارے پھل میں برکت فرما اور ہمارے شہر میں برکت فرما اور ہمارے صاع میں برکت فرما اور ہمارے مد میں برکت فرما۔ اے اللہ! بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے اور میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے دعا کی اور میں تجھ سے اسی طرح کی مدینہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے چھوٹے بچے کو بلا کر وہ پھل دے دیتے۔'' [مسلم ، کتاب فضائل المدینة: باب فضل المدینة و دعاء النبی فیھا بالبرکة و بیان تحریمھا و تحریم صیدھا و شجرھا(۱۳۷۳)]

اور دوسری حدیث مسلم میں ہے کہ آپ کے پاس بچوں میں سے جو بھی چھوٹا بچہ حاضر ہوتا آپ اسے وہ پھل دے دیتے۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کوئی کام نیا نیا ہو تو کسی صالح اور اللہ کے ولی کے پاس جا کر دعا کروائیں اور اگر پھل نیا نیا تیار ہو تو دعا کروا کے کسی سب سے چھوٹے بچے کو دے دیں۔

حرام جانور کے اعضاء کا حکم

سوال کیا حرام جانوروں کے اعضاء انسانی بدن میں لگائے جاسکتے ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے ہمارے استعمال کے لیے جو اشیاء بنائی ہیں وہ حلال اور طیب ہیں، حرام وخبیث اشیاء ہمارے لیے ناجائز ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ﴾ [الأعراف: ١٥٧]

''اور آپ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں۔''

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں بعض علماء نے کہا ہے:

"فَكُلُّ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنَ الْمَاْكَلِ فَهُوَ طَيِّبٌ نَافِعٌ فِى الْبَدَنِ وَ الدِّيْنِ وَ كُلُّ مَا حَرَّمَهُ فَهُوَ خَبِيْثٌ ضَارٌ فِى الْبَدَنِ وَ الدِّيْنِ" [تفسیر ابن کثیر(۴۳۹/۳)]

''کھانے والی اشیاء میں سے جو چیز بھی اللہ نے حلال کی ہے وہ پاک اور جسم و دین کے لیے نفع بخش ہے اور ہر وہ چیز جسے اللہ نے حرام کیا ہے وہ ناپاک اور جسم و دین کے لیے نقصان دہ ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اشیاء میں نفع اور پاکیزگی ہے جب کہ حرام کردہ اشیاء میں ضرر اور نقصان ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حرام اشیاء کو دوا کے لیے استعمال کرنے سے روکا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَنِ الدَّوَاءِ الْخَبِيْثِ »[ابو داؤد، كتاب الطب : باب فى الأدوية المكروهة(٣٨٧٠)، ترمذى ، كتاب الطب: باب ما جآء فيمن قتل نفسه بسم أو غيره (٢٠٤٥)، ابن ماجه، كتاب الطب : باب النهى عن الدواء الخبيث (٣٤٥٩)، بيهقى(١٠/٥)، مستدرك حاكم (٤/١٠/٤) ، مسند احمد (١٣/٤١٦)،(٨٠٤٨)، ابن ابى شيبة (٨/٥)، حلية الأولياء (٥/٣٧٤)، بيهقى فى شعب الايمان (٥٦٢٢)]

''رسول اللہ ﷺ نے خبیث دوا سے منع کیا ہے۔''

بعض روایات میں اس کی تفسیر زہر اور خمر سے کی گئی ہے لیکن یہ حدیث عام ہے۔ زہر، شراب اور ہر حرام چیز کو شامل ہے۔

نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

'' كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا دَعَا طَبِيْبًا يُعَالِجُ بَعْضَ اَهْلِهِ اشْتَرَطَ عَلَيْهِ اَنْ لَا يُدَاوِىَ بِشَىْءٍ مِّمَّا حَرَّمَ اللّٰهُ '' [بيهقى (١٠/١٦٥)]

''ابن عمر رضی اللہ عنہما جب کسی ایسے طبیب کو بلاتے جو ان کے گھر میں سے کسی کا علاج کرتا تو اس پر شرط لگاتے کہ وہ کسی ایسی چیز سے علاج نہیں کرے گا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔''

اس اثر کی سند صحیح ہے۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ الدَّاءَ وَ الدَّوَاءَ وَ جَعَلَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءً فَتَدَاوَوْا وَ لَا تَتَدَاوَوْا بِحَرَامٍ »[ابوداؤد، كتاب الطب : باب فى الأدوية المكروهة (٣٨٧٤)، بيهقى (١٠/٥)، شرح السنة(١٢/١٣٩)]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دوا نازل کی اور ہر بیماری کے لیے دوا بنائی۔ پس تم دوا کرو اور حرام سے دوا نہ کرو۔''

اس کی سند میں گو اسماعیل بن عیاش مدلس ہے اور اس کا استاد ثعلبہ بن مسلم مستور ہے لیکن حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کا قوی شاہد ہے اور اس کے پہلے حصے کا شاہد ابو داؤد (كتاب الطب ، باب فى الرجل يتداوى :٣٨٥٥) میں حدیث اسامہ ہے۔

مندرجہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ حرام اشیاء سے علاج کرنا منع ہے لہٰذا حرام جانوروں کے اعضا کی پیوند کاری جسم انسانی میں درست نہیں۔ (واللہ اعلم!)

کبوتر بازی اور مرغ لڑانا

سوال کبوتر اڑانا یا مرغ لڑانا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

جواب شریعت کی نظر میں کبوتر بازی مکروہ ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ رَاٰى رَجُلًا يَتْبَعُ حَمَامَةً فَقَالَ : شَيْطَانٌ يَتْبَعُ شَيْطَانَةً »[ابن ماجه، كتاب الأدب : باب اللعب بالحمام (٣٧٦٥)، مسند احمد(١٧/٢٢١)، (٨٥٤٣)، الأدب المفرد(١٣٠٠)، المسند الجامع(١٧/٦٣٩)]

''بلاشبہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو ایک کبوتر کے پیچھے دوڑتا ہوا دیکھا تو فرمایا:''شیطان شیطان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔''

قاضی شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث میں کبوتروں کے ساتھ کھیلنے کی کراہت پر دلیل ہے اور یہ ایسا کھیل ہے جس کی شرع میں اجازت نہیں دی گئی اور شیطان کا لفظ ایسے آدمی پر بولا جانا اس پر دلالت کرتا ہے اور کبوتر پر شیطان کے لفظ کا اطلاق یا تو اس وجہ سے ہے کہ وہ آدمی کے اس کے لیے پیچھے لگنے کا سبب ہے یا وہ ایسا شیطانی عمل کرتا ہے کہ اس کی مطابقت اور اس کے حسن صورت اور نغمے کی عمدگی کے باعث انسان اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ یا وہ حقیقت میں کبوتر کی شکل میں جن شیطان ہے جو آدمی کو اللہ کے ذکر سے غافل کرتا ہے۔'' [فضل الله الصمد(٢/ ٦٨٤)]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بچے نکلوانے، انڈے لینے ،انس کے لیے یا خطوط بھیجنے کے لیے کبوتر رکھنا بلا کراہت جائز ہیں۔ بہرکیف کبوتروں کے ساتھ کھیلنے کے متعلق صحیح بات یہی ہے کہ مکروہ ہے اور اگر اس کھیل کے ساتھ جوا مل جائے تو حرام ہے۔'' [فضل الله الصمد(٢/ ٦٨٤)، مرقاة شرح مشكاة (٨/ ٢٨٠)]

رہا جانوروں کو آپس میں لڑانا تو یہ بھی شرعاً حرام ہے کیونکہ جانوروں کو ایذا دینا شریعت اسلامیہ میں جائز نہیں ہے۔ جانوروں کو لڑانے کے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''جانوروں کو ایذا و تکلیف دینا درست نہیں۔'' [مسند ابی یعلی (٦٥١) مسند بزار (٢٠٦٣)]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک اونٹ کے پاس سے گزرے جس کے چہرے پر داغ لگایا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:''جاؤ اونٹ کے مالک سے کہو کہ اس کے چہرے سے آگ کو دور رکھے۔'' [مسند ابی یعلیٰ (٦٥١)، مسند بزار (٢٠٦٣)]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک گدھا دیکھا جس کے چہرے کو داغا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:''اللہ کی لعنت برسے اس آدمی پر جس نے یہ داغ دیا۔'' [مسند بزار(٢٠٦٥)، طبراني أوسط(٥/ ١٥٧)، مجمع الزوائد(١٣٢٤٠)]

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ مَرَّ عَلَیْهِ بِحِمَارٍ قَدْ وُسِمَ فِیْ وَجْهِهِ فَقَالَ : اَمَا بَلَغَكُمْ اَنِّیْ لَعَنْتُ مَنْ وَسَمَ الْبَهِیْمَةَ فِیْ وَجْهِهَا اَوْ ضَرَبَهَا فِیْ وَجْهِهَا ؟ فَنَهٰی عَنْ ذٰلِكَ» [ابو داؤد، كتاب الجهاد: باب النهي عن الوسم في الوجه(٢٥٦٤)، مسند احمد(٢٢/ ٧٢)، ابن ابی شيبة(٥/ ٤٠٦)]

''نبی ﷺ کے پاس سے ایک گدھا گزرا جس کے چہرے پر داغ لگایا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:''کیا تمھیں یہ بات نہیں پہنچی کہ میں نے اس آدمی پر لعنت کی ہے جس نے جانوروں کے چہرے پر داغ دیا یا مارا؟'' پس آپ ﷺ نے اس کام سے منع فرما دیا۔''

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ جانوروں کو لڑانا اور انھیں ایذا دینا کسی طرح بھی جائز نہیں، لہٰذا مرغ، کتے، بٹیر، تیتر وغیرہ لڑانا کسی طرح بھی درست نہیں۔ تو جو لوگ جانوروں کو لڑاتے یا ان پر جوا لگاتے ہیں وہ فعل حرام کے مرتکب ہیں، انھیں اس فعل سے باز آ جانا چاہیے۔

زیادہ نمازیں پڑھنے والا شہید سے پہلے جنت میں

سوال کیا زیادہ نمازیں پڑھنے والا شہید سے پہلے جنت میں جا سکتا ہے؟

جواب جس حدیث سے یہ استدلال کیا جاتا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''بنو قضاعہ میں سے دو آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسلام لائے، ان دونوں میں سے ایک اللہ کی راہ میں شہید ہو گیا اور دوسرا ایک سال بعد اللہ کو پیارا ہوا۔ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا کہ بعد میں فوت ہونے والا شہید سے پہلے جنت میں داخل ہو گیا۔ طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مجھے بڑا تعجب ہوا، میں نے صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس بات کا ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلَيْسَ قَدْ صَامَ بَعْدَهُ رَمَضَانَ وَ صَلّٰى سِتَّةَ آلَافِ رَكْعَةً اَوْ كَذَا وَ كَذَا رَكْعَةً صَلَاةَ السَّنَةِ »

[مسند احمد(٢/٣٣٣)، الترغيب والترهيب(١/٢٤٤)، مجمع الزوائد(١٠/٢٠٧)، امام منذری اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔]

''کیا اس نے بعد میں رمضان کے روزے نہیں رکھے اور چھ ہزار رکعات نماز یا اتنی اتنی رکعات سال بھر ادا نہیں کیں؟''

اسی طرح طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ جو خواب دیکھنے والے ہیں، ان کی زبانی بھی یہ حدیث موجود ہے۔[ابن ماجہ، کتاب تعبیر الرؤیا: باب تعبیر الرؤیا(٣٩٢٥)، بیہقی(٣/٣٧٢)، مشکل الآثار (٣/١٠٠)]

اس صحیح حدیث سے بعض لوگ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ نماز پڑھنے والا اور روزہ رکھنے والا شخص شہید سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ لہٰذا نماز روزہ ادا کرتے رہو جہاد کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہ فلسفہ بالکل غلط ہے اور نہ حدیث کا یہ مفہوم ہے کہ نماز روزہ ادا کرتے رہیں اور جہاد نہ کریں بلکہ یہ دونوں شخص مجاہد بھی تھے اور نمازی بھی تھے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے مشکل الآثار میں اس مسئلہ کو شرح و بسط کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ یہ دونوں شخص مہاجرین میں سے تھے۔ دونوں نے اکٹھے ہجرت کی اور دونوں جہاد وغیرہ میں برابر تھے۔ ایک تو محاذ جنگ میں شہید ہو گیا اور دوسرا مرابط (محاذ جنگ پر پہرا دیتا تھا یا ہر وقت جہاد کے لیے تیار) تھا اور اس کے ساتھ اسے دیگر اعمال صالحہ کا موقع بھی مل گیا اور مرابط کے بارے میں یہ حدیث بھی ہے کہ مرابط کا عمل و اجر جاری رہتا ہے۔ لہٰذا یہ بعد میں فوت ہونے والا اپنے زائد اعمال کی وجہ سے اپنے بھائی سے آگے نکل گیا۔[ملاحظہ ہو: مشکل الآثار(٣/١٠٣)]

معلوم ہوا کہ یہ دونوں صحابی مہاجر و مجاہد تھے۔ ایک مجاہد شہید ہو گیا جب کہ دوسرا مجاہد اپنے سال بھر کے اعمال صالحہ کی وجہ سے آگے نکل گیا۔ لہٰذا بعض متصوفین اور منکرین جہاد کا اس روایت سے استدلال کر کے جہاد چھوڑ کر گھر بیٹھے رہنا اور ''اللہ ہو''

کا تصور باندھ کر مصنوعی ذکر کے طریقوں میں مشغول رہنا اور لوگوں کو جہاد سے روکنا ایک مغالطہ اور دھوکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب کرے اور یہ بھی یاد رہے کہ کچھ لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اپنے اعمال صالحہ کی بنا پر صدیقیت کے مقام پر فائز ہو جاتے ہیں اور شہداء سے بھی آگے نکل جاتے ہیں لیکن یہ مقام مکمل دین اسلام کو اپنانے اور عمل پیرا ہونے ہی سے ملتا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ جیسے عمل صالح اور ایمان کا انکار کرکے نہ صدیقیت کا مقام ملتا ہے اور نہ شہادت ہی کا۔ اس حدیث کے اور بھی شواہد ہیں۔ عبید اللہ بن خالد اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا، ان میں سے ایک شہید کر دیا گیا اور دوسرا اس کے بعد فوت ہوا، ہم نے اس کا جنازہ پڑھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم نے کیا کہا؟'' صحابہ نے کہا: ''ہم نے اس کے لیے دعا کی:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ اَللّٰهُمَّ اَلْحِقْهُ بِصَاحِبِهِ»

''اے اللہ! تو اسے بخش دے، اے اللہ! تو اس پر رحم فرما! اے اللہ! اسے اس کے ساتھی کے ساتھ ملا دے۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« فَاَيْنَ صَلَاتُهُ بَعْدَ صَلَاتِهِ وَ اَيْنَ عَمَلُهُ بَعْدَ عَمَلِهِ ؟ فَلَمَا بَيْنَهُمَا كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَ الْاَرْضِ »

[نسائي ، كتاب الجنائز : باب الدعاء(١٩٨٧)، سنن ابى داؤد، كتاب الجهاد: باب فى النور يرى عند قبر الشهيد(٢٥٢٤)، مسند احمد(٢/٥٠٠)، كتاب الزهد لابن المبارك (١٣٤١)، كتاب الزهد للبيهقى(٦٣٣)]

''اس کی اس کے بعد کی نماز کہاں گئی اور اس کا اس کے بعد کا عمل کہاں گیا؟ ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔''

پھولوں کا تحفہ پیش کرنا

سوال کسی کو پھولوں کا تحفہ پیش کرنا کیسا ہے؟

جواب ایک دوسرے کو تحفے دینا اچھی عادت ہے اور اس سے محبت بڑھتی ہے، شریعت میں تحفے دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« تَهَادَوْا تَحَابُّوْا »[الأدب المفرد للبخارى (٥٩٤)]

''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو تم آپس میں محبت کرنے لگو گے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے۔ [تلخيص الحبير(٣/٧٥)]

اسی طرح صحیح بخاری وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے ہدیہ بھیجنا ہرگز حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کا ایک کھر ہی ہو۔'' [بخاری، کتاب

الهبة: باب فضل الهبة (٢٥٦٦)]
مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدیہ وتحفہ لینا یا دینا محبت کا باعث ہے۔ لہٰذا پھولوں کا گلدستہ ہو یا کوئی کھانے پینے کی حلال چیز، ایسے تحفے دینے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور نہ اس میں یہود کی مشابہت ہے۔ مشابہت سے مراد کسی قوم کے ایسے شعار ومخصوص طرز کو اپنانا ہوتا ہے جس کی اسلام میں اجازت نہ ہو۔

بال زائل کرنے کا حکم

سوال مختلف جسم کے حصوں سے بال زائل کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب پشت، پنڈلی اور جسم کے دوسرے حصوں سے بال زائل کرنا جائز ہے، اگر اس سے بدن کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور اس کا مقصد کافروں کی مشابہت نہ ہو کیونکہ اصل اباحت ہے اور کسی بھی مسلمان کے لیے بلا دلیل کسی چیز کو حرام ٹھہرا دینا جائز نہیں ہے اور جو کچھ پوچھا گیا ہے اس کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا ان اشیاء کے بارے میں خاموش رہنا ان کے مباح و جائز ہونے کی دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے مونچھیں کتروانے، ناخن کاٹنے، بغل کے بال اکھیڑنے اور شرمگاہ کے بال مونڈنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح مردوں کے لیے سر مونڈنے کو بھی مباح کیا ہے اور چہرے کے بالوں کو اکھیڑنے والی اور اکھڑوانے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے۔ نیز ہمیں داڑھی بڑھانے، اسے لمبی کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسری چیزوں سے خاموشی اختیار کی ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ جس سے خاموش رہ جائیں وہ مباح ہوتا ہے، اسے حرام ٹھہرانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں جنھیں ضائع مت کرو، کچھ حدود متعین کی ہیں جنھیں پامال مت کرو، کچھ چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے جن کا ارتکاب نہ کرو اور تم پر رحم کرتے ہوئے کچھ چیزوں سے دانستہ سکوت اختیار کیا ہے ان کی کرید میں نہ پڑو۔" [دارقطني (١٨٣/٤)، طبراني كبير (٢٢٢،١٢/٢٤)]

مذکورہ حدیث کی روشنی میں بہت سے علماء نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ اس معنی ومفہوم کی اور بھی احادیث وآثار مروی ہیں، جن میں سے کچھ کو حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے جامع العلوم والحکم میں ابوثعلبہ سے مروی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے نقل کیا ہے، جو مزید معلومات حاصل کرنا چاہے وہ مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کرے۔ (واللہ اعلم)

دین کے لیے وقف کی گئی اولاد سے کام لینا

سوال میں نے اپنے بیٹے کی پیدائش سے قبل منت مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ بیٹا عطا فرمائے گا تو اس کو اللہ کے راستے میں وقف کروں گا، اب یہ چھ سات سال کا ہو چکا ہے تو کیا میں اس کو گھر کا چھوٹا موٹا کام کہہ سکتا ہوں یا نہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ کے لیے وقف شدہ بیٹے کا مفہوم تو یہ ہے کہ اسے دین اسلام کی سربلندی کے لیے لگا دیا جائے تا کہ یہ اللہ

کے دین کا کام کرے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ والدین اپنے بیٹے کو گھر بار کا کوئی چھوٹا موٹا کام نہیں کہہ سکتے۔ والدین کی اطاعت بھی دین اسلام میں داخل ہے اور نیک اولاد اللہ کے حقوق بھی ادا کرتی ہے اور والدین کے بھی۔ آپ اسے خلاف شرع کوئی کام نہیں کہہ سکتے اور نہ جب یہ بڑا ہو جائے اسے دنیاوی جھمیلوں میں جھونک سکتے ہیں، آپ اسے خالص اللہ کا دین پڑھائیں اور مجاہد فی سبیل اللہ بنانے کی بھرپور کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی محنتوں اور کاوشوں کو دین اسلام کی سربلندی کے لیے بارآور کرے۔ (آمین!)

رسول اللہ ﷺ کا ختنہ

سوال کیا رسول اللہ ﷺ کا ختنہ کیا گیا تھا؟

جواب نبی کریم ﷺ کو اللہ وحدہ لا شریک لہ نے سب سے اعلیٰ و ارفع بنایا ہے اور بے شمار صفات و خوبیوں سے نوازا ہے۔
آپ ﷺ کے مختون پیدا ہونے کے متعلق مختلف روایات ہیں جو اختصار کے ساتھ پیش خدمت ہیں:

① انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''میری کرامت میں سے ہے کہ میں مختون پیدا ہوا ہوں، کسی نے میری شرمگاہ کو نہیں دیکھا۔'' [طبرانی صغیر (٩٣٦) طبرانی أوسط، العلل المتناهية (١٦٥/١) دلائل النبوة لأبی نعیم (٤٦/١) مجمع الزوائد (١٣٨٥٢)]
لیکن اس کی سند میں سفیان بن محمد الغزاری الحیصی سارق الحدیث اور متہم بالکذب ہے۔ (میزان الاعتدال (١٨٢/٢)، لسان المیزان (١٨٥/٦) اسی طرح اس کی سند میں ہشیم اور حسن بصری مدلس بھی ہیں۔

② عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مختون پیدا ہوئے۔ [طبقات ابن سعد (١٠٣/١) دلائل النبوة (٤٦/١) البداية والنهاية (٢٦٥/٢)] یہ روایت یونس بن عطا کی وجہ سے صحیح نہیں۔

③ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کا ختنہ کیا جس وقت اس نے آپ کے دل کی طہارت کی۔
اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن عیینہ اور سلمہ بن محارب کے بارے میں علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں ان دونوں کو نہیں پہچانتا۔'' [مجمع الزوائد (١٣٩٥٢)]

④ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عبدالمطلب نے ساتویں دن نبی ﷺ کا ختنہ کیا اور دعوت کی اور آپ کا نام محمد ﷺ رکھا۔ [سير أعلام النبلاء (٢١/١)]
اس کی سند میں ولید بن مسلم مدلس ہیں۔ اس روایت کو امام ذہبی رحمہ اللہ نے عباس رضی اللہ عنہ والی روایت سے زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔
علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس روایت کے متعلق تین اقوال نقل کیے ہیں:

① آپ ﷺ پیدائشی مختون پیدا ہوئے لیکن اس باب میں جو حدیث سب سے زیادہ مشہور ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے اسے ''الموضوعات'' میں ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں اور یہ آپ ﷺ کے

خواص میں سے بھی نہیں۔ اس لیے کہ بہت سے لوگ مختون پیدا ہوئے ہیں۔

② دوسرا قول یہ ہے کہ ختنہ اس دن ہوا جب حلیمہ دائی کے ہاں ملائکہ نے آپ ﷺ کا شق صدر کیا۔

③ تیسرا قول یہ ہے کہ ولادت کے ساتویں دن آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے ختنہ کیا اور اس تقریب پر دعوت بھی کی اور آپ ﷺ کا نام محمد (ﷺ) رکھا۔ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''اس باب میں ایک مسند غریب روایت کی گئی ہے۔''
[زاد المعاد (١/ ٨١،٨٢)]

یہ مسئلہ دو فاضلوں کمال الدین ابی طلحہ اور کمال الدین بن العدیم کے درمیان واقع ہوا۔ اول الذکر نے اس پر کتاب لکھ ماری اور ہر طرح کی بے لگام روایات اکٹھی کر دیں کہ آپ ﷺ مختون پیدا ہوئے اور ثانی الذکر نے اس کا نقض کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ نبی ﷺ کا عرب کے دستور کے مطابق ختنہ ہوا، چونکہ یہ رواج تھا اس لیے ثبوت کے لیے کسی سند کی حاجت نہیں، مدعی کو دلیل پیش کرنی چاہیے۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی ایک بیٹی فاطمہ تھی یا چار؟

سوال خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی ایک بیٹی فاطمہ تھی یا چار؟

جواب رسول اکرم ﷺ کی ٢٥ برس کی عمر میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہوئی اور بعثت سے قبل سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے آپ ﷺ کی تین بیٹیاں زینب، رقیہ، ام کلثوم رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں اور بعثت کے بعد سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح آپ ﷺ نے ابو العاص بن ربیع رضی اللہ عنہ سے کیا، رقیہ اور ام کلثوم کا نکاح بالترتیب آپ ﷺ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا۔ تیسری صدی ہجری تک کسی بھی شخص نے آپ ﷺ کی مذکورہ بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کیا اور فریقین (شیعہ وسنی) کی معتبر کتب میں ان بیٹیوں کا تذکرہ موجود ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ایک غالی شیعہ ابو القاسم علی بن احمد بن موسیٰ المتوفی ٣٥٢ھ نے اپنی بدنام زمانہ کتاب ''الاستغاثة فی بدع الثلاثة'' میں اس بات کا انکار کیا اور کہا: ''یہ آپ ﷺ کی حقیقی بیٹیاں نہیں تھیں بلکہ ربیبہ بیٹیاں تھیں۔ حالانکہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا اور اس سے ایک لڑکی ہندہ پیدا ہوئی۔ پھر اس کے بعد دوسرا نکاح ابو ہالہ تمیمی سے ہوا جس سے ایک لڑکا ہند اور ایک لڑکی ہالہ پیدا ہوئی اور اس کے بعد پھر آپ رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ آپ ﷺ سے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی چار بیٹیاں زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں۔ نسب کی یہ تفصیل کتاب نسب قریش (ص:٢٢٨،٣٣)، کشف الغمة فی معرفة الأئمة، عمدة الطالب فی أنساب آل أبی طالب اور جمهرة الأنساب وغیرہ میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اپنے پہلے خاوندوں سے زینب، رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہن نامی کوئی بیٹی نہیں۔ یہ شیعہ کا دجل اور ان کی تلبیس ہے۔

لیکن شیعہ محدثین میں سے مشہور شیعہ عبداللہ مامقانی نے اپنی کتاب ''تنقیح المقال (ص:٧٩)'' پر ابو القاسم کوفی کی اس بات

کا رد کیا ہے۔

چنانچہ عبداللہ مامقانی شیعہ نے لکھا ہے:

''ابو القاسم کوفی کا '' الاستغاثة في بدع الثلاثة'' میں یہ قول کہ زینب اور رقیہ رضی اللہ عنہما آپ کی بیٹیاں نہیں تھیں بلکہ ربیبہ تھیں، یہ قول بلا دلیل ہے، یہ ابو القاسم کی محض اپنی رائے ہے جس کی حیثیت نصوص کے مقابلے میں مکڑی کے جالے کے برابر بھی نہیں۔ کتب فریقین میں رسول اللہ ﷺ کی چار بیٹیوں پر نصوص موجود ہیں اور شیعوں کے پاس اپنے اقوال موجود ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں۔''

یہ بات بھی یاد رہے کہ اکثر علمائے شیعہ نے ابو القاسم شیعہ کی ہفوات پر نقد کیا ہے بلکہ اسے بے دین قرار دیا ہے جیسا کہ معروف شیعہ عالم شیخ عباس قمی نے ''تتمة المنتهى (ص:۲۹)'' پر لکھا ہے:

'' ابو القاسم کوفی علی بن احمد بن موسیٰ وفات یافت و اودر آخر عمر مذهبش فاسد شده بود و کتابها بسیار تالیف کرده انداز کتاب هائے ابو القاسم کوفی کتاب الاستغاثة است ''

''ابو القاسم کوفی فوت ہوا تو آخر عمر میں اس کا مذہب فاسد ہو گیا تھا اور اس نے کئی کتابیں تالیف کی ہیں۔ اس کی کتابوں میں سے ایک کتاب ''الاستغاثہ'' بھی ہے۔''

اسی طرح شیعہ عالم آقا میر نے ''نقد الرجال (ص:۲۲۶)'' پر لکھا ہے:

'' اَبُو الْقَاسِمِ كُوفِيٌّ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْكُوفَةِ كَانَ يَقُولُ مِنْ آلِ اَبِيْ طَالِبٍ وَ غَلَا فِيْ آخِرِ عُمْرِهٖ وَ فَسَدَ مَذْهَبُهٗ وَ صَنَّفَ كُتُبًا كَثِيْرَةً اَكْثَرُهَا عَلَى الْفَسَادِ ''

اس سے معلوم ہوا کہ ابو القاسم کوفی جو غالی شیعہ تھا اور کئی فساد پر مبنی کتابوں کا مصنف تھا، اس نے سب سے پہلے بنات الرسول ﷺ کا انکار کیا، پھر اس کی پیروی میں بعد والے شیعوں نے انکار کیا حالانکہ قرآن مجید، کتب احادیث اور فریقین کی کتب سے یہ بات تواتر کی حد تک ثابت ہے کہ آپ ﷺ کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

اب نصوص ملاحظہ کریں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الاحزاب: ۵۹]

'' اے نبی! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادریں لٹکا لیا کریں، یہ قریب تر ہے کہ وہ پہچانی جائیں۔ پس وہ ایذا نہ دی جائیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت کریمہ میں لفظ ''ازواج'' زوجہ کی اور لفظ ''بنات'' بنت کی اور لفظ ''نساء'' امراۃ کی جمع ہے اور جمع کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہے اور اس آیت سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آپ ﷺ کی بیٹیاں تین سے زائد تھیں اور فریقین کی

کتب سے اس بات کا تعین ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی بیٹیوں کی تعداد چار ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت میں پردے کے احکام بیان کیے جا رہے ہیں اور احکام شرعیہ کا مکلف بالغ ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نزول آیت کے وقت آپ ﷺ کی تین سے زائد بالغ بیٹیاں موجود تھیں جنھیں پردے کا حکم دیا گیا ہے۔ اہل سنت کے ہاں تو یہ بات متفقہ ہے کہ آپ ﷺ کی چار بیٹیاں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں، اس لیے اہل سنت کے حوالے نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ جو لوگ اس بات کے منکر ہیں، ہم ان کی معتبر کتابوں کے حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں:

① عبداللہ مامقانی شیعہ اپنی کتاب "تنقیح المقال فی احوال الرجال (ص:۷۷)" پر رقمطراز ہیں:

"اِنَّ كُتُبَ الْفَرِيْقَيْنِ مَشْحُوْنَةٌ بِاَنَّهَا وُلِدَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَرْبَعُ بَنَاتٍ زَيْنَبُ وَ اُمُّ كَلْثُوْمٍ وَ فَاطِمَةُ وَ رُقَيَّةُ وَ بَنَاتُهُ اَدْرَكْنَ الْاِسْلَامَ وَ هَاجَرْنَ مَعَهُ وَ اتَّبَعْنَهُ"

"بے شک فریقین کی کتب اس بات سے بھری پڑی ہیں کہ آپ ﷺ کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے چار بیٹیاں زینب، ام کلثوم، فاطمہ اور رقیہ رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں اور انھوں نے اسلام کو پایا اور آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی اور آپ ﷺ کی اتباع کی۔"

② مشہور شیعہ محدث محمد بن یعقوب کلینی نے "اصول کافی" باب التاریخ (ص:۲۷۸) پر لکھا ہے:

"وَ تَزَوَّجَ خَدِيْجَةَ وَ هُوَ ابْنُ بِضْعٍ وَّ عِشْرِيْنَ سَنَةً فَوُلِدَ لَهُ مِنْهَا قَبْلَ مَبْعَثِهِ الْقَاسِمُ وَ رُقَيَّةُ وَ زَيْنَبُ وَ اُمُّ كَلْثُوْمٍ وَ وُلِدَ لَهُ بَعْدَ الْمَبْعَثِ الطَّيِّبُ وَ الطَّاهِرُ وَ الْفَاطِمَةُ"

"آپ ﷺ نے ۲۵ برس کی عمر میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی اور خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بعثت سے پہلے آپ ﷺ کے ایک بیٹا قاسم اور تین بیٹیاں رقیہ، زینب اور ام کلثوم رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں اور بعثت کے بعد طیب، طاہر اور فاطمہ پیدا ہوئے۔"

③ شیخ صدوق نے لکھا ہے:

"وَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَا حُمَيْرَا! فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى بَارَكَ فِي الْوَلُوْدِ فَاِنَّ خَدِيْجَةَ رَحِمَهَا اللّٰهُ وَلَدَتْ مِنِّيْ طَاهِرًا وَ هُوَ عَبْدُ اللّٰهِ وَ هُوَ الْمُطَهَّرُ وَلَدَتْ مِنِّيْ الْقَاسِمَ وَ فَاطِمَةَ وَ رُقَيَّةَ وَ اُمَّ كَلْثُوْمٍ وَّ زَيْنَبَ"

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے حمیرا (عائشہ)! بے شک اللہ تعالیٰ نے بچے دینے والی میں برکت رکھی ہے۔ خدیجہ نے مجھ سے طاہر کو جنم دیا اور وہ عبداللہ اور مطہر ہے اور اس نے مجھ سے قاسم، فاطمہ، رقیہ، ام کلثوم اور زینب رضی اللہ عنہن کو جنم دیا۔"

اس حوالہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ خود اپنی چار بیٹیوں کا اقرار کر رہے ہیں جو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہیں۔

④ "مناقب ابن شہر آشوب (۱/۱۶۱)" میں ہے:

" وَ اَوْلَادُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنْ خَدِيْجَةَ الْقَاسِمُ وَ عَبْدُ اللّٰهِ وَ هُمَا الطَّاهِرُ وَ الطَّيِّبُ وَ اَرْبَعُ بَنَاتٍ زَيْنَبُ وَ رُقَيَّةُ وَ اُمُّ كَلْثُوْمٍ وَ فَاطِمَةُ "

" آپ ﷺ کی خدیجہ ؓ سے اولاد قاسم اور عبد اللہ ؓ تھی اور وہ دونوں طاہر و طیب تھے اور چار بیٹیاں زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ ؓ تھیں۔"

⑤ تذکرۃ المعصومین (ص ۶) پر ہے:

" تَزَوَّجَ خَدِيْجَةَ : وَهُوَ ابْنُ بِضْعٍ وَّعِشْرِيْنَ سَنَةً فَوَلَدَتْ لَهٗ قَبْلَ مَبْعَثِهٖ رُقَيَّةَ وَاُمَّ كَلْثُوْمٍ وَ زَيْنَبَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُنَّ "

" جب رسول اللہ کی عمر ۲۰ برس سے کچھ زیادہ تھی تو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ ؓ سے نکاح کیا اور بعثت سے پہلے خدیجہ ؓ سے رسول اللہ ﷺ کی تین بیٹیاں رقیہ، ام کلثوم اور زینب ؓ تھیں۔"

⑥ شیعہ حضرات کی معروف ترین کتاب "تحفۃ العوام (ص:۱۱۶)" پر ہے:

" اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى رُقَيَّةَ بِنْتِ نَبِيِّكَ وَ الْعَنْ مَنْ اٰذٰى نَبِيَّكَ فِيْهَا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى كَلْثُوْمٍ بِنْتِ نَبِيِّكَ وَ الْعَنْ مَنْ اٰذٰى نَبِيَّكَ فِيْهَا "

" اے اللہ! اپنے نبی کی بیٹی رقیہ پر رحمت نازل فرما اور جس نے تیرے نبی کو اس بارے میں تکلیف دی، اس پر لعنت کر۔ اے اللہ! اپنے نبی ﷺ کی بیٹی ام کلثوم پر رحمت نازل فرما اور جس نے تیرے نبی کو اس بارے میں تکلیف دی اس پر لعنت کر۔"

اس کے علاوہ شیعہ مذہب کی معتبر کتب حياة القلوب، حلاء العيون، تهذيب الأحكام، الاستبصار، مرأة العقول، فروع كافي، صافي شرع كافي، كشف الغمة، قرب الاسناد، مجالس المؤمنين، أعلام الورى، منتخب التواريخ، مناقب آل أبي طالب، امالي شيخ طوسي، رجال كشي اور انوار نعمانيه وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ کی سیدہ خدیجہ ؓ سے چار بیٹیوں کا ذکر موجود ہے۔

کالے کپڑے پہننے کا حکم

سوال کالے کپڑے پہننے کا کیا حکم ہے؟

جواب شرعی طور پر سیاہ لباس پہننے میں کوئی قباحت نہیں۔ امام بخاری ؒ نے ایک روایت نقل کی ہے:

" ام خالد ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کپڑے لائے گئے، ان میں ایک چھوٹی سیاہ چادر تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تمھارا کیا خیال ہے ہم یہ چادر کسے پہنائیں؟" صحابہ کرام ؓ خاموش رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میرے پاس ام خالد بنت خالد کو لاؤ۔'' اسے اٹھا کر لایا گیا۔ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ میں چادر پکڑی اور اسے پہنا دی اور فرمایا: ''اسے بوسیدہ و پرانا کرو۔'' اس چادر میں سبز یا زرد نشانات تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ام خالد! یہ اچھا ہے۔''
[بخاری، کتاب اللباس : باب الخمیصة السوداء : (۵۸۲۳)]
بخاری ہی میں نبی کریم ﷺ کی سیاہ چادر کا بھی ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ لباس پہننا درست ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بعض مخصوص ایام میں مشابہت کی وجہ سے اجتناب کیا جائے۔

ضعیف روایات کا حکم

سوال کیا ضعیف روایات قابل حجت ہیں؟

جواب ضعیف روایات سے شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا اگر چہ بعض علماء ترغیب و ترہیب اور فضائل اعمال میں ضعیف روایات ذکر کرتے ہیں لیکن کبار محدثین و اصولیین رحمہم اللہ ضعیف حدیث پر عمل کرنے کو نہ تو احکام میں جائز سمجھتے ہیں اور نہ فضائل اعمال وغیرہ ہی میں۔ ان محدثین کے گروہ میں امام یحییٰ بن معین، امام بخاری، امام مسلم، امام ابن حبان البستی، امام ابن حزم، امام ابن العربی المالکی، امام ابوشامہ المقدسی، امام ابن تیمیہ، امام شاطبی، امام خطیب بغدادی اور علامہ شوکانی رحمہم اللہ جیسی عظیم الشان ہستیاں شامل ہیں۔ علامہ محمد جمال الدین القاسمی رقمطراز ہیں:

''ضعیف روایت کے بارے میں تین مذاہب ہیں: پہلا مذہب یہ ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل مطلق جائز نہیں، نہ احکام میں اور نہ فضائل میں۔ ابن سید الناس نے عیون الأثر میں امام یحییٰ ابن معین رحمہ اللہ کی نسبت اور علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں امام ابوبکر ابن العربی کی طرف یہ مذہب منسوب کیا ہے۔ بظاہر امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام بخاری کا اپنی صحیح میں شرط اور امام مسلم کا ضعیف راویوں پر تشنیع کرنا اور صحیحین میں ان سے کسی روایت کی تخریج نہ کرنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے ہاں ضعیف روایت پر عمل مطلق طور پر جائز نہیں۔ یہی مذہب امام ابن حزم رحمہ اللہ کا ہے، انھوں نے اپنی کتاب ''الملل و النحل'' میں فرمایا ہے: ''(پانچویں چیز وہ ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ) وہ روایت جس کو اہل مشرق و مغرب نے یا گروہ نے گروہ سے یا ثقہ نے ثقہ سے نقل کیا ہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئی لیکن اگر کسی طریق میں کوئی ایسا راوی ہے جو کذب، غفلت یا مجہول الحال ہونے کے ساتھ مجروح ہے تو یہ بھی وہ بات ہے جس کو بعض مسلمانوں نے بیان کرنا جائز رکھا ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا بیان کرنا، اس کی تصدیق کرنا اور اس سے کچھ اخذ کرنا حلال نہیں۔'' [قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث (ص/۱۱۳)]

دوسرا مذہب علامہ قاسمی رحمہ اللہ نے امام سیوطی رحمہ اللہ وغیرہ کا نقل کیا ہے، جن کے نزدیک ضعیف روایت پر عمل کرنا مطلقاً جائز ہے۔ تیسرا مذہب فضائل اعمال میں ضعیف روایات کو چند شرطوں کے ساتھ قبول کیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک پہلا مذہب ہی راجح و قوی ہے کیونکہ کسی امر کا مستحب ہونا بھی ایک شرعی امر ہے اور شرعی امور کے لیے صحیح احادیث ہی درکار ہوتی ہیں۔
[قواعدالتحدیث من فنون مصطلح الحدیث (ص/۱۱۳)]

مشہور حنفی عالم محمد زاہد کوثری نے ضعیف روایت کو مطلق طور پر نہ لینے کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ [مقالات کوثری (ص/٤٥-٤٦)]

علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔ [الفوائد المجموعة فی الأحاديث الموضوعة (ص/٢٨٣)]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ بھی اس کے قائل ہیں۔ [الفوائد المجموعه فی الأحاديث الموضوعة (ص/٢٨٣)]

امام ابن تیمیہ اور علامہ ناصر الدین رحمہ اللہ بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ [قاعدة جليلة فی التوسل والوسيلة (ص/١١٢-١١٣) صحیح الجامع الصغير (ص/٥١)]

گھر سے نکلنے کی دعا کی وضاحت

سوال آپ کے مرکز کی ڈائری میں گھر سے نکلنے کی اور داخل ہونے کی دو دعائیں لکھی ہیں:

❶ « بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ »

❷ « اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَ عَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا »

جبکہ صلوۃ الرسول کی تخریج تسہیل الوصول (ص: ٤٩٤/٤٩٥) میں لکھا ہے کہ یہ دونوں روایات ضعیف ہیں، برائے مہربانی صحیح رہنمائی فرمائیں؟

سوال گھر سے نکلنے کی یہ دعا ابوداؤد، ترمذی، عمل اليوم والليلة للنسائی، التوكل لابن ابی الدنيا، کتاب الدعاء للطبرانی اور ابن حبان وغیرھا میں مروی ہے، اس کے متعلق میری تحقیق یہی ہے کہ یہ روایت درست نہیں۔ اس کی سند میں اسحاق بن عبداللہ ابی طلحہ سے بیان کرنے والے راوی ابن جریج ہیں اور یہ مدلس ہیں اور اپنی روایت میں انھوں نے اپنے استاد اسحاق سے حدیث سننے کی وضاحت نہیں کی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ ابن جریج کی اسحاق سے مجھے ملاقات معلوم نہیں۔ [الفتوحات الربانية (١/٣٣٥)]

لہٰذا یہ روایت اس علت کی وجہ سے درست نہیں اور گھر میں داخل ہونے والی یہ روایت بھی درست نہیں۔ اس لیے کہ اس کی سند میں شریح بن عبید حضرمی ہیں جن کی ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت مرسل ہے۔ جیسا کہ امام ابوحاتم رازی نے اپنی کتاب مراسیل (٩٠) میں ذکر کیا ہے اور مرسل محدثین کے ہاں ضعیف کی اقسام میں سے ہے، لہٰذا یہ دونوں روایتیں ہمارے نزدیک اسنادی اعتبار سے صحیح نہیں۔ ڈائری مرتب کرنے والے بھائی کو (ان شاء اللہ) متنبہ کردیں گے۔

آل محمد ﷺ سے مراد

سوال آل محمد ﷺ سے کیا مراد ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ کی آل کے بارے میں اہل علم مختلف فیہ ہیں:

① ایک قول یہ ہے کہ آل نبی سے مراد وہ لوگ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ پھر ان میں بھی اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ آل نبی جن پر صدقہ حرام ہے وہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وہ خاص طور پر بنو ہاشم ہیں۔

② دوسرا قول یہ ہے کہ آل نبی ﷺ سے مراد آپ ﷺ کی اولاد اور بیویاں ہیں۔

③ تیسرا قول یہ ہے کہ آل نبی ﷺ سے مراد قیامت تک آنے والے آپ کے پیروکار ہیں۔

④ چوتھا قول یہ ہے کہ آل سے مراد آپ ﷺ کی امت کے متقی و پرہیزگار لوگ ہیں۔

پہلے قول کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ کھجوریں پکنے کے وقت آپ ﷺ کے پاس مختلف کھجوریں لائی جاتی تھیں۔ مختلف لوگ کھجوریں لاتے یہاں تک کہ آپ کے ہاں کھجوروں کا ڈھیر لگ جاتا۔ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما ان کھجوروں سے کھیلنے لگے تو ان میں سے ایک نے کھجور پکڑ کر منہ میں ڈال لی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے منہ سے کھجور نکال دی اور فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آل محمد صدقہ نہیں کھاتے؟'' [بخاری، كتاب الزكاة: باب أخذ صدقة التمر...... (١٤٨٥)]

صحیح مسلم وغیرہ میں حدیث ہے کہ ربیعہ اور فضل بن عباس کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''یہ صدقات لوگوں کی میل کچیل ہیں اور یہ محمد (ﷺ) اور آپ (ﷺ) کی آل کے لیے حلال نہیں۔'' [مسلم، كتاب الزكاة: باب ترك استعمال آل النبي على الصدقة (١٠٧٢)]

آپ ﷺ کی اولاد اور ازواج کو آل محمد ﷺ میں شامل کرنے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث میں ہے:

« اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ اَزْوَاجِهِ وَ ذُرِّيَّتِهِ » [بخاری، كتاب أحاديث الأنبياء: باب قول الله: واتخذ الله إبراهيم خليلا (٣٣٦٩)]

''اے اللہ! محمد (ﷺ) آپ کی ازواج اور اولاد پر رحمت نازل فرما۔''

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے مؤطا کی شرح التمہید میں ذکر کیا ہے کہ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ آل محمد سے مراد آپ ﷺ کی بیویاں اور اولاد ہے اور « اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ اَزْوَاجِهِ وَ ذُرِّيَّتِهِ » آل محمد ﷺ کی تفسیر ہے۔ اسی طرح صحیحین کی حدیث:

« اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا » [مسلم، كتاب الزكاة: باب في الكفاف والقناعة (١٠٥٥)]

''اے اللہ! آل محمد کا رزق بقدر خوراک بنا دے۔''

ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی یہ دعائے مستجاب تمام بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب پر صادق نہیں آتی کیوں کہ ان میں اس وقت بھی دولت مند اور صاحب وسعت تھے اور اب بھی ہیں مگر ازواج و ذریت پر یہ دعا بالکل صادق آتی ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کی زندگی میں ان کا رزق بقدر خوراک تھا اور آپ ﷺ کے بعد بھی یہی حال تھا۔ اگر کہیں سے مال آ جاتا تو ازواج

مطہرات بقدر خوراک کچھ رکھ کر باقی صدقہ کر دیتی تھیں۔

تیسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ معظم اور متبوع شخص کی آل وہ ہوتی ہے جو اس کے طریقے اور دین پر ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِلَّآ آلَ لُوْطٍ نَجَّيْنَا هُمْ بِسَحَرٍ ﴾ [القمر:٣٤]

''ہم نے آل لوط کو سحری کے وقت نجات دی۔''

یہاں آل لوط سے مراد ان کے پیرو کار ہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾ [غافر:٤٦]

''آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو۔''

یہاں آل فرعون سے مراد اس کے پیرو کار ہی ہیں۔ اسی طرح واثلہ بن اسقع کے بارے میں بیہقی میں حدیث ہے کہ آپ نے انھیں اپنے اہل میں شمار کیا حالانکہ واثلہ رضی اللہ عنہ نسب میں تو بنولیث بن بکر میں سے تھے لیکن وہ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ چوتھے قول کی دلیل یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ﴾ [هود:٤٦]

''یہ آپ کے اہل میں سے نہیں، اس لیے کہ یہ اچھے اعمال والا نہیں۔''

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے جلاء الافہام میں اس موضوع پر مفصل بحث کر کے فرمایا ہے کہ ان چاروں میں سے صحیح ترین قول پہلا ہے۔ کیوں کہ اس شبہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ان احادیث میں رفع کر دیا ہے: ''صدقہ محمد اور آل محمد پر حلال نہیں'' اور ''آل محمد کو رزق بقدر خوراک عطا کر۔'' ان احادیث کے مضمون کو ملحوظ رکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد عموم امت کو سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ مزید تفصیل کے لے دیکھیے [جلاء الأفهام لابن القيم رحمه الله]

خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں

سوال اگر کوئی اس طرح کے کام میں اپنی ماں کے حکم کی نافرمانی کرے جس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ جیسے کہ میری ماں مجھے زیب و زینت اختیار کرنے اور بے پردہ رہنے کو کہتی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ''حجاب'' بے ہودہ چیز ہے، دین میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ مجھ سے محفلوں میں جانے اور ایسے کپڑے پہننے کو کہتی ہیں جن سے ہر وہ عضو جھانکتا نظر آتا ہے جس کی نمائش کو اللہ تعالیٰ نے عورت کے لیے حرام قرار دیا ہے نیز جب وہ مجھے پردہ میں دیکھتی ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتی ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مخلوق میں سے کسی کی بھی اطاعت جائز نہیں، چاہے ماں ہو یا باپ یا کوئی اور ہو، نبی

اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''صرف معروف ہی میں اطاعت کی جائے گی۔'' (بخاری، كتاب الأحكام: باب السمع والطاعة للامام ...... الخ ،(٦١٤٥)]

دوسری جگہ فرمایا:'' خالق کی نافرمانی کی صورت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔''[مسند احمد، (١٣١/١)]

اور وہ تمام کام جنھیں کرنے کی آپ کی ماں آپ کو دعوت دیتی ہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے ہیں، ان میں اپنی ماں کی اطاعت کرنا آپ کے لیے جائز نہیں ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کی ہدایت اور شیطان کی اطاعت سے محفوظ رکھنے کی دعا کرتے ہیں۔

قرآن پاک کے شہید اوراق کو محفوظ کرنا

سوال کچھ لوگ قرآن پاک کے شہید اوراق دفن کر دیتے ہیں یا کنویں اور دریا وغیرہ میں ڈال دیتے ہیں، کیا یہ جائز ہے۔ قرآن وحدیث کی رو سے تحریر کریں۔

جواب قرآن حکیم کے شہید اوراق ہوں یا کسی اور دینی کتاب کے انھیں جس طرح بھی مناسب ہو محفوظ کر دینا چاہیے تا کہ ان کی توہین نہ ہو۔ انھیں دفن کر کے بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جلا کر راکھ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ صحیح البخاری میں عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے۔ الغرض ایسی ممکنہ صورت اختیار کی جائے جس سے ان اوراق کا تحفظ ہو جائے۔ آج کل کئی لوگ دریاؤں میں ڈال دیتے ہیں، اس میں کچھ قباحتیں بھی ہیں۔ دریائے راوی میں گندے گٹروں کا پانی گرتا ہے اور اکثر یہ خشک رہتا ہے۔ اب جس پانی میں پاخانے اور پیشاب والا پانی ملا ہو اس میں ان اوراق کو ڈالنے سے توہین ہوتی ہے، اس سے بچا جائے۔ کئی علاقوں کو دریا سے نہریں نکال کر سیراب کیا جاتا ہے اور ایسے اوراق اس پانی میں بہ کر کھیتوں میں چلے جاتے ہیں، جہاں لوگوں کے پاؤں تلے روندے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر طریقہ یہی ہے کہ گہرا گڑھا کھود کر زمین میں دفن کر دیا جائے یا جلا کر ان کی حیثیت ختم کی جائے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر فقیہ

سوال کیا احناف ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہتے ہیں؟

جواب فقہ حنفی کو ماننے والے خواص و عام کی حالت یہ ہے کہ جب کسی صحابی کا فتویٰ یا قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے موافق ہو تو اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور اگر مخالف ہو تو غیر فقیہ و غیر مجتہد اور اعرابی کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُصَرُّوا الْإِبِلَ وَ الْغَنَمَ فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ اَنْ يَّحْلُبَهَا فَاِنْ

رَضِيَهَا اَمْسَكَهَا وَ اِنْ سَخِطَهَا رَدَّهَا وَ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ » [مسلم، كتاب البيوع: باب تحريم بيع الرجل على بيع اخيه...... الخ (١٥١٥) ، بخاری، كتاب البيوع: باب النهى للبائع أن يحفل الإبل(٢١٤٨)]

''اونٹنی اور بکری کا دودھ روک کر نہ بیچو اور جو آدمی ایسا جانور خریدے تو دودھ دوہنے کے بعد اس کی اپنی مرضی ہے اگر چاہے تو رکھ لے اور اگر چاہے تو اس کو واپس کر دے اور ایک صاع کھجور کا بھی ساتھ دے۔''

احناف کہتے ہیں کہ یہ حدیث قیاس کے خلاف ہے۔ ملا جیون حنفی نے لکھا ہے:

'' فَاِنَّ هٰذَا الْحَدِيْثَ مُخَالِفٌ لِّلْقِيَاسِ مِنْ كُلِّ وَجْهٍ ''

''ہر لحاظ سے یہ حدیث قیاس کے مخالف ہے۔''

اس کے بعد کہتے ہیں: ''اگر راوی عدالت اور ضبط کے ساتھ معروف ہو، فقیہ نہ ہو جیسا کہ انس و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما ہیں تو اگر ان کی حدیث قیاس کے موافق ہو گی تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر قیاس کے خلاف ہو گی تو ضرورت کے تحت چھوڑ دیا جائے گا ورنہ ہر لحاظ سے رائے کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

بلاشبہ یہ حدیث ہر لحاظ سے قیاس کے خلاف ہے کیوں کہ یہ ایک صاع کھجور دودھ کے عوض دے رہا ہے۔ قیاس کا تقاضا ہے کہ دودھ کا تاوان دودھ ہی سے ادا کیا جائے یا اس کی قیمت سے اور اگر کھجور بدلا ہو تو قیاس یہ چاہتا ہے کہ دودھ کی کمی بیشی کے لحاظ سے کھجور میں بھی کمی بیشی ہو، نہ یہ کہ کمی بیشی کے ہر حال میں ایک صاع کھجور ضروری ہو۔ اس لیے احناف نے کہا ہم دیکھیں گے کہ اس حدیث کا راوی کون ہے؟ اگر راوی فقیہ ہوا تو حدیث لی جائے گی اور قیاس کو ترک کیا جائے گا اور اگر راوی غیر فقیہ و غیر مجتہد ہوا تو قیاس کو مانا جائے گا اور حدیث کو چھوڑا جائے گا۔''

[نور الأنوار (١٧٩)، اصول شاشی (٧٥)، الحسامی مع شرح النظامی (٧٥)، اصول بزدوی (١٥٩)، التوضيح والتلويح (٤٧٣)، اصول سرخسی (٣٤١/١)]

احناف نے کہا: ''اس حدیث کے راوی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ فقیہ ہیں۔ اس لیے یہ حدیث متروک ہے۔''

نور الانوار کی عبارت یہ ہے:

'' وَ اِنْ عُرِفَ بِالْعَدَالَةِ وَ الضَّبْطِ دُوْنَ الْفِقْهِ كَاَنَسٍ وَ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اِنْ وَافَقَ حَدِيْثُهُ الْقِيَاسَ عُمِلَ بِهٖ وَ اِنْ خَالَفَهٗ لَمْ يُتْرَكْ اِلَّا بِالضُّرُوْرَةِ لَانْسَدَّ بَابُ الرَّأْيِ مِنْ كُلِّ وَجْهٍ ''

یہ حدیث صرف سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی نہیں بلکہ، اس حدیث کو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی بیان کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی روایت کے بعد ان کا یہ فتویٰ درج کیا ہے اور مذکورہ بالا روایت کی وجہ سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر فقیہ ہیں تو حنفیوں کو چاہیے کہ وہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھی غیر فقیہ کہہ دیں۔ اس کے علاوہ یہ حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مسند ابو یعلیٰ موصلی میں، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنن ابی داؤد اور طبرانی میں، سیدنا عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ سے خلافیات بیہقی میں اور رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تحفۃ الاحوذی میں مروی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَ اَظُنُّ اَنَّ لِهٰذِهِ النُّكْتَةِ اَوْرَدَ الْبُخَارِيُّ حَدِيْثَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَقِبَ حَدِيْثِ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اِشَارَةً مِنْهُ اِلٰى اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ قَدْ اَفْتٰى بِوَفْقِ حَدِيْثِ اَبِيْ هُرَيْرَةَ فَلَوْ لَا اَنَّ خَبَرَ اَبِيْ هُرَيْرَةَ فِيْ ذٰلِكَ ثَابِتٌ لَمَا خَالَفَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ الْقِيَاسَ الْجَلِيَّ فِيْ ذٰلِكَ " [فتح الباری (٣٦٥/٤)]

" مجھے یقین ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بعد سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اس لیے نقل کی ہے تا کہ معلوم ہو کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ اگر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ثابت نہ ہوتی تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ قیاس جلی کی مخالفت نہ کرتے۔"

اس لیے اصول شاشی پر حاشیہ لگانے والا چیخ اٹھا اور اس نے کہا:

" لٰكِنْ هٰهُنَا دِقَّةٌ قَوِيَّةٌ وَ هِيَ اَنَّ هٰذَا الْحَدِيْثَ جَاءَ فِي الْبُخَارِيِّ بِرِوَايَةِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَيْضًا وَالْحَالُ اَنَّهُ مَعْرُوْفٌ بِالْفِقْهِ وَالْاِجْتِهَادِ "

" یہاں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہی روایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی بخاری میں مروی ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فقہ و اجتہاد میں معروف ہیں۔"

اسی لیے بعض حنفیوں نے اس اصول سے جان چھڑانے کے لیے کہا: " یہ قاضی ابو یوسف کے شاگرد عیسیٰ بن ابان کا قاعدہ ہے۔ مگر ان کی جان کی خلاصی اس قانون سے کبھی نہیں ہو سکتی۔"

اولاً: اس لیے کہ ان کے اصول کی معتبر کتابوں میں یہ قانون موجود ہے جس کی بنا پر یہ حدیث مصراۃ کو رد کرتے ہیں اور یہ قانون جہاں جہاں موجود ہے اس کے حوالے میں نے اوپر درج کر دیے ہیں۔

ثانیاً: مولوی خلیل احمد سہارنپوری نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ ہمارے حنفی علماء ہی کا یہ قاعدہ کلیہ ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

" وَ الْاَصْلُ عِنْدَنَا اَنَّ الرَّاوِيَ اِنْ كَانَ مَعْرُوْفًا بِالْعَدَالَةِ وَ الْحِفْظِ وَ الضَّبْطِ دُوْنَ الْفِقْهِ وَ الْاِجْتِهَادِ مِثْلُ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ فَاِنْ وَافَقَ حَدِيْثُهُ الْقِيَاسَ عُمِلَ بِهِ وَ اِلَّا لَمْ يُتْرَكْ اِلَّا لِضُرُوْرَةٍ وَ انْسِدَادِ بَابِ الرَّأْيِ وَ تَمَامُهُ فِيْ اُصُوْلِ الْفِقْهِ " [حاشیة علی البخاری (٢٨٨/١)]

" ہمارے نزدیک قاعدہ یہی ہے کہ اگر راوی عدالت، حفظ اور ضبط میں تو معروف ہو لیکن فقاہت و اجتہاد کی دولت سے محروم ہو جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا انس ابن مالک رضی اللہ عنہ ہیں تو اگر ان کی حدیث قیاس کے مطابق ہو گی تو عمل کیا جائے گا اور اگر قیاس کے خلاف ہو گی تو بوقت ضرورت چھوڑ دی جائے گی تا کہ رائے و قیاس کا دروازہ بند نہ ہو اور اس کی مکمل بحث اصول فقہ کی کتب میں موجود ہے۔"

حنفی علماء کا سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہنا سراسر باطل ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حفظ حدیث اور ادائے حدیث میں سب سے فائق تھے۔ انھوں نے حدیث مصراۃ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، ہم پر لازم ہے کہ اس پر عمل کریں۔" [سير أعلام النبلاء (۲/ ۶۱۹)]

یہاں یہ بات ضرور یاد رہے کہ اصل کتاب وسنت ہے، اس کے برعکس قیاس فرع ہے۔ اصل کو فرع کے ساتھ رد کرنا مردود و باطل ہے۔ اس کے علاوہ یہ روایت قیاس کے بھی مطابق ہے۔ مزید تفصیل کے لیے امام ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب "اعلام الموقعین" کا مطالعہ کیجیے۔

صحیح بخاری کو ناقابل صحت سمجھنے والوں کا حکم

سوال صحیح بخاری کو ناقابل صحت سمجھنے والوں کا کیا حکم ہے؟

جواب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مشتمل مجموعہ کے بارے میں اس طرح کا موقف اپنانا اور کتب احادیث کو حقیر سمجھنا بدعتیوں اور زندیقوں کا کام ہے۔ جو لوگ حدیث کی کتاب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ ﴿ وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ کا مصداق ہیں۔ اصل ایمان کا راستہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے افراد کا نام لے کر نہیں بتایا کہ فلاں فلاں شخص ایماندار ہیں اور فلاں فلاں کافر، مشرک اور بدعتی ہیں بلکہ عقائد و اعمال بتائے ہیں جن کے اپنانے سے آدمی مسلمان ہوتا ہے اور ایسے عقائد و اعمال بھی بتائے ہیں جن کو اختیار کرنے سے آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جو آدمی ایسا یقین پیدا کر لے کہ اللہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ ذات، صفات اور افعال میں یکتا اور بے مثل ہے۔ فرشتے اس کی پیدا کردہ نورانی مخلوق ہیں اور جہاں جہاں اس نے ان کی ذمہ داری لگا رکھی ہے وہ احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔ اس کے حکم کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے جو کتابیں اپنے پیغمبروں پر نازل کی ہیں وہ برحق ہیں اور قرآن حکیم اس کی طرف سے آخری کتاب نازل ہوئی ہے۔ اب اس کے احکامات کے مطابق چلنا چاہیے اور اس کے تمام انبیاء و رسل سچے ہیں، آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کی اطاعت و اتباع فرض ہے اور قیامت ضرور قائم ہو کر رہے گی۔ جس میں ہر انسان کو اس کے دنیا میں کیے ہوئے اعمال کا پورا پورا بدلا دیا جائے گا۔ کسی پر ذرا برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ نیکی اور بدی پیدا کرنے والا وہی ہے۔

تو ایسے عقائد اختیار کرنے والا مسلم و مومن ہے اور کلمہ شہادت کے اقرار کے بعد نماز قائم کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، صاحب استطاعت کا زکوۃ دینا اور حج کرنا، جس آدمی کے اندر یہ باتیں پائی جائیں وہ مسلمان ہے خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہائش رکھتا ہو، اس میں دیار عرب یا عجم کی کوئی قید نہیں ہے اور جس کے عقائد یہ نہ ہوں وہ مسلمان نہیں ہے۔ ہر چیز اپنی علامت سے پہچانی جاتی ہے۔ ورنہ کوئی زندیق یہ بھی سوال کر سکتا ہے کہ امام مالک، امام احمد، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام

بخاری، امام مسلم وغیرہ کا اسلام لانا قرآن کی کسی آیت سے ثابت ہے یا حدیث کی کسی کتاب میں مرقوم ہے؟
زندیق وملحد لوگ بھی ایسا سوال کرنے سے گریز کرتے ہیں مگر تف ہے ایسے لوگوں پر جو اپنے آپ کو مسلمان گردانتے ہیں اور یہ سوال داغ دیتے ہیں کہ بخاری شریف کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے تو صحیح نہیں کہا، یا احادیث کی تصحیح وتضعیف اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ثابت کرو۔ ایسی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جن میں شرم وحیا کا مادہ باقی نہ ہو۔ اسلام نے جو علامات بتائی ہیں جن سے آدمی مسلمان ہوتا ہے، اس کا کوئی ذی شعور آدمی انکار نہیں کرسکتا۔ اگر علامت و پہچان کا لحاظ نہ کیا جائے تو کائنات کا نظام فاسد ہو جائے۔ اسلام، کفر وشرک، فسق و بدعت کا دارو مدار علامات پر رکھتا ہے۔ اسلام کی حفاظت کے لیے شرع نے کئی ایک قواعد وضوابط دیے ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ﴾ [الحجرات:٦]

”اے ایمان والو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو، بغیر تحقیق کے اس کی بات قبول نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ بغیر کسی تحقیق کے تم کسی پر بہتان باندھ دو یا عیب والزام جڑ دو پھر تم اپنی جہالت کی بنا پر کیے ہوئے پر پچھتانے لگو۔“

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عادل آدمی کی خبر واحد قبول ہوگی۔ اگر ہم عادل کی خبر لینے سے توقف کریں تو گویا ہم نے اس کے اور فاسق کے درمیان برابری کر دی۔ اس طرح تخصیص فائدے سے خالی ہو جاتی ہے۔ فسق کا اصل معنی کسی چیز سے نکلنا ہے۔ کھجور جب اپنے چھلکے سے باہر نکل جاتی ہے تو کہا جاتا: ” فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا “ (کھجور اپنے چھلکے سے نکل گئی) امام رازی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

”چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اصحاب نے دلیل پکڑی ہے کہ خبر واحد حجت ہے اور فاسق کی شہادت غیر مقبول ہے۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے کہا: ”فاسق کی خبر میں توقف کی یہ علت ہے کہ وہ فاسق ہے۔ اگر عادل کی خبر واحد بھی قبول نہ کی جائے تو فاسق کی ترتیب پر اس کو بیان کرنے کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ یہ مفہوم سے دلیل پکڑنے کے باب سے ہے۔“

یہ بات کئی ایک تفاسیر میں موجود ہے۔ پس واضح ہوگیا کہ عادل کی خبر واحد حجت اور قابل قبول ہے اور مالک الملک کے مذکورہ بالا فرمان کو سامنے رکھیں اور امام بخاری رحمہ اللہ کی مرتب کردہ صحیح بخاری کو دیکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں جن راویوں کی خبریں جمع کی ہیں وہ عدالت اور صدق کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے اور جب سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس وقت سے لے کر آج تک ائمہ محدثین نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اس کی صحت پر متفق ہوئے ہیں کیوں کہ اس کی روایات اصول قرآنی کے عین مطابق ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

ہر منصف کے لائق ہے کہ وہ یقین کرے کہ صحیح والا راوی کسی راوی کی تخریج کرے تو اس کے نزدیک اس کی عدالت کا

مقتضی ہوتا ہے اور اس کا ضبط اور غافل نہ ہونا اس کے نزدیک صحیح ہوتا ہے، بالخصوص جب ساتھ یہ بات مل جائے کہ جمہور ائمہ دین نے ان دونوں کتابوں پر صحیحین کا لفظ بولا ہے اور یہ لفظ ان کتابوں کے علاوہ دیگر کو حاصل نہیں ہوا۔" [فتح الباری مقدمۃ]

الغرض بخاری کے راوی عدالت و ضبط کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور ان کی بیان کردہ احادیث صحیح ہیں اور یہ صحت علمائے احناف کی اکثریت نے تسلیم کی ہے۔ دو چار جاہل و معاند اگر صحیح بخاری کے خلاف بات کریں تو ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ مولوی خلیل احمد سہارنپوری نے جو مقدمہ بخاری تالیف کیا اس میں صحیح بخاری کی صحت کا صاف اقرار موجود ہے۔

اگر کسی کے کچھ کہہ دینے ہی سے عیب لازم آجاتا ہے تو امام دار الہجرۃ مالک بن انس رحمہ اللہ نے جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں کہا ہے وہ کسی بھی اہل علم سے مخفی نہیں۔ اس کی تفصیل امام عبداللہ بن احمد ابن حنبل کی ''کتاب السنۃ'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اگر صرف کہہ دینے ہی کا اعتبار کیا جائے تو تمام احناف ردی اور نالائق تصور کیے جائیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کہنے والے بہت کچھ کہتے رہتے ہیں، اصل میں چیز کی حقیقت ملاحظہ کرنی چاہیے۔

صحیح بخاری کے اصح ہونے پر تو امت مسلمہ متفق ہو چکی ہے، اگر بخاری کے منکر ہیں تو تمام دہریہ قسم کے الحاد پسند اور ان کے متبعین، کیوں کہ صحیح بخاری بے دینوں اور ملحدوں کا دائرہ کار تنگ کر دیتی ہے اور عمل کی راہ واضح کر دیتی ہے۔ بخاری کی صحت کا انکار ایسے ہی ہے جیسے کوئی مجنوں اپنا سر پتھر پر مار کر پتھر توڑنا چاہے۔ وہ اپنا سر تو پھوڑ لے گا لیکن پتھر کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ بالکل اسی طرح بخاری کی صحت بہر حال رہے گی اور ایسے مجنوں حدیث کے منکر اور بے دین ہو جائیں گے۔ صحیح بخاری کی عظمت و شان اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسی بنا دی ہے کہ منکر بھی اپنے مدارس میں پڑھانے پر مجبور ہیں۔ اتنی دیر تک کسی شخص کو سند فراغت نہیں ملتی جب تک وہ صحیح بخاری پڑھ نہیں لیتا۔ ہر مدرسہ میں دورہ حدیث کے اندر یہ کتاب شامل ہے اور کتنے ہی احناف ایسے ہیں جنھوں نے صحیح بخاری کو تمام ذخیرہ احادیث میں سے سب سے زیادہ صحیح تسلیم کیا ہے اور اس کی احادیث کو قطعی اور یقینی قرار دیا ہے۔

بہر کیف کتب احادیث کے بارے میں زبان درازی کرنے والے لوگ اہل اسلام میں سے نہیں ہیں، ملحد و زندیق ہیں اور ایسی باتیں پھیلا کر خود گمراہ ہوئے اور لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت نصیب کرے۔ (آمین)

کیا امام بخاری اور دیگر محدثین بھی مقلد تھے؟

سوال بعض لوگوں سے سنا ہے کہ امام بخاری اور دیگر محدثین بھی تقلید کرتے تھے، وہ خود مجتہد نہیں تھے، کیا یہ بات درست ہے؟ بادلائل ذکر کریں۔

جواب امام بخاری اور دیگر اکابر محدثین حدیث وفقہ میں اپنے دور کے اساطین علم اور مجتہدین وفقہاء تھے۔ ان ائمہ محدثین کی امانت و دیانت اور فقاہت واجتہاد معروف ہے اور ان کی مرتب کردہ کتب کو دیگر کتب سے ممتاز اور صحیح ترین قرار دیا گیا

ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب کے متعلق تو یہ جملہ زبان زد عام و خاص ہے :"اَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللّٰهِ الْبُخَارِیُّ" اللہ کی کتاب کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب امام بخاری کی بخاری شریف ہے اور بخاری کی فقہ واجتہاد کے بارے بھی یہ جملہ عام ہے :"فِقْهُ الْبُخَارِيِّ فِيْ تَرَاجُمِهٖ" امام بخاری کی فقاہت ان کے تراجم ابواب میں ہے۔ امام بخاری کے مجتہد ہونے کی گواہی تو کبار ائمہ محدثین نے دی ہے جو کتب رجال میں ان کے ترجمہ میں موجود ہے، ہم یہاں صرف دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کاشمیری کا ایک قول ذکر کرتے ہیں، وہ رقمطراز ہیں:

''جان لو کہ امام بخاری بلا شک وشبہ مجتہد ہیں اور ان کے بارے جو یہ مشہور ہے کہ وہ شافعی ہیں تو اس کی وجہ مشہور مسائل میں ان کی طرف سے امام شافعی کی موافقت ہے وگرنہ امام ابوحنیفہ سے ان کی موافقت امام شافعی کے ساتھ موافقت میں کم نہیں۔'' (فیض الباری : ١/٥٨)

علامہ کاشمیری کے اس قول سے عیاں ہوتا ہے کہ امام بخاری بلاریب مجتہد تھے اور مقلدین نے چند مسائل میں کسی امام کے ساتھ موافقت کی وجہ سے انہیں اس کا مقلد بنادیا ہے۔ وہ قطعاً کسی امام کے مقلد نہ تھے اور نہ اس کی کوئی پختہ دلیل موجود ہے۔ امام بخاری جیسے امام الفقہاء والمحدثین کو مقلد قرار دینا سراسر زیادتی اور ظلم ہے۔ انھوں نے فقہ الحدیث پر کام کیا ہے، کسی مخصوص امام کے نظریات کو نہیں اپنایا، وہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے جامع ہیں اور صحیح وسقیم کے پرکھنے کی مکمل صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ سے مروی صحیح احادیث کو مختلف فقہی ابواب کے تحت یکجا کیا ہے بلکہ ان کی جمع کردہ احادیث کے بارے علامہ کاشمیری نے لکھا ہے :

''صحیحین کی احادیث قطعیت کا فائدہ دیتی ہیں۔حافظ ابن حجر عسقلانی، شمس الائمہ سرخسی، ابن تیمیہ اور ابن الصلاح رحمہ اللہ کا یہی قول ہے اور گو یہ تعداد کے لحاظ سے کم ہے مگر درست رائے یہی ہے۔'' (فیض الباری : س ١/٤٥)

امام بخاری کی طرح امام ابوداؤد، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام حمیدی، امام ابن خزیمہ، امام ابن حبان، امام ابوعوانہ وغیرہم بھی حدیث وفقہ میں امام تھے اور انھوں نے کسی بھی امام و مجتہد کی تقلید نہیں کی۔ ان ائمہ حدیث نے اپنی اپنی کتب میں احادیث کو لاکر ان پر ابواب قائم کرکے بے شمار مسائل کا استنباط واستخراج کیا ہے۔شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ محدثین کے اصول وضوابط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ان ائمہ محدثین کے ہاں پہلے بزرگوں کی تقلید نہ تھی اور وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ ان مذاہب میں سے ہر مذہب کی بعض روایات و آثار متناقض ومخالف ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے مقرر کردہ قواعد وضوابط کی رو سے نبی ﷺ کی احادیث، آثار صحابہ اور تابعین ومجتہدین کی پیروی کی۔ [(الانصاف (ص/٢٦) ، حجة الله البالغة (١٤٩/١)]

معلوم ہوا کہ محدثین کسی بھی امام کے مقلد نہ تھے اور نہ ان کی اندھا دھند پیروی کرتے تھے بلکہ جو قواعد وضوابط انہوں نے روایات کے لیے وضع کیے وہ ان کے مطابق احادیث و آثار وغیرہ کی پیروی کرتے تھے اور اصل طریقہ بھی یہی ہے کہ کسی خاص آدمی کی تقلید کے بغیر قرآن وحدیث کی پیروی کی جائے اور حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی بننے کی بجائے سچا مسلمان بن کر امت مسلمہ کو تفرقہ بندی میں تقسیم ہونے سے بچایا جائے، سب نسبتیں ترک کرکے صحیح اسلام کی راہ اپنائی جائے اور سلف صالحین

کے طریق کو لازم پکڑا جائے۔ جو لوگ تقلید کو لازم قرار دیتے ہیں وہ امت مسلمہ کو فرقہ بندی میں تقسیم کرنے کے درپے ہیں اور فرقہ بندی کے عذاب کو امت پر مسلط کر رہے ہیں۔انہیں اس سے اجتناب کرنا چاہیے اور کتاب وسنت کی راہ پر خود بھی چلنا چاہیے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دینی چاہیے۔

کیا اختلاف امت رحمت ہے؟

سوال کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ امت کا اختلاف رحمت ہے؟ کتاب وسنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"آپ کہہ دیں اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب نازل کرے یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے یا تم کو مختلف گروہ بنا کر ایک کو دوسرے سے مزہ چکھادے۔آپ دیکھیں کہ ہم کس طرح دلائل پھیر کر لاتے ہیں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔" (الانعام:٦٥)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ امت کی گروہ بندی عذاب الٰہی ہے اور عذاب الٰہی رحمت کس طرح ہوسکتی ہے!؟ امت میں کفر واسلام، توحید وشرک، سنت و بدعت اور دیگر کئی قسم کے اختلافات موجود ہیں، انھیں رحمت سے تعبیر کرنا کسی طرح درست نہیں۔اللہ تعالیٰ نے اختلاف وافتراق سے منع کیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور تم شرک کرنے والوں میں سے مت بنو جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور گروہ گروہ ہوگئے اور ہر گروہ اپنے طریق پر شاداں وفرحان ہے۔" (الروم : ٣١،٣٢)

دوسری جگہ فرمایا: "اور تم آپس میں جھگڑا واختلاف نہ کرو، ورنہ کم ہمت ہوجاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔" (الانفال:٤٦)

بعض لوگ کہتے ہیں آپس کے فروعی اختلافات کی بنا پر حنفی وشافعی، حنبلی و مالکی، بننا یہ رحمت ہے۔ یاد رہے یہ بات بھی کسی صورت درست نہیں، ان کا اگر مسائل اجتہادیہ میں اختلاف ہے تو ان میں سے حق صرف ایک ہوگا جس کی بنیاد دلیل پر ہوگی، دوسرا خطا اور غلطی پر ہوگا اور خطا وغلطی کو رحمت سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اس موضوع پر بڑی شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے، فرماتے ہیں: "اگر دونوں مختلف صورتیں درست ہوتیں تو سلف صالحین ایک دوسرے کے اجتہادی فیصلوں کے بارے خطا کا حکم نہ لگاتے اور عقل وفکر بھی اس بات کا انکار کرتی ہے کہ ایک چیز اور اس کی ضد دونوں صحیح و درست ہوں۔(جامع بیان العلم : ٢/٨٨)

معلوم ہوا کہ مجتہدین نے ایک دوسرے کے مسائل پر خطا کا حکم لگایا تھا۔اگر دوسرا بھی جائز و درست ہوتا تو اس پر خطا کا حکم کیوں لگاتے۔ایک دفعہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے درمیان اس بات پر اختلاف ہوا کہ ایک کپڑے میں نماز درست ہے یا نہیں۔سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: "درست ہے۔" سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یہ اس وقت

درست ہے جب دیگر کپڑے نہ ہوں یہ اختلاف سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ غصے میں تشریف لائے اور فرمایا:
''رسول اللہ ﷺ کے دو ایسے صحابہ نے اختلاف کیا جن کی طرف دیکھا جاتا ہے اوران سے احکام لیے جاتے ہیں ابی (رضی اللہ عنہ) نے سچ کہا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کمی نہیں کی، لیکن میں اس کے بعد اس مسئلہ میں یہاں جس کسی کو اختلاف کرتے ہوئے دیکھوں گا تو اسے سزا دوں گا۔'' (جامع بیان العلم : ۲/۸٤)
غور فرمائیں جب ان پاکباز ہستیوں کا اختلاف خلیفہ راشد نے پسند نہیں کیا تو آج کے دور کا وہ اختلاف جو کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے اسے کیسے پسند کرلیا جائے اور رحمت قرار دے کر توحید و شرک اور سنت و بدعت کو اکٹھا گوارا کرلیا جائے، لہٰذا اختلاف و انتزاع سے مکمل اجتناب کیا جائے۔ بعض لوگوں نے ایک روایت گھڑلی کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے، یہ روایت جعلی اور من گھڑت ہے۔ جیسا کہ علامہ مناوی نے فیض القدیر (۲۱۲/۱) میں ذکر کیا ہے۔ علامہ ابن حزم نے کیا خوب کہا ہے: ''اگر اختلاف رحمت ہے تو اتفاق یقیناً ناراضی کا سبب ہے۔'' (الاحکام : ٥/٦٤)

ہر امت کے لیے فتنہ والی حدیث کی تحقیق

(سوال) کیا یہ کوئی حدیث ہے کہ ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے؟ اگر یہ کوئی حدیث ہے تو اس کی تخریج درکار ہے۔

(جواب) اللہ تعالیٰ نے ہر امت کی ابتلا و آزمائش کی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی پیروی کرتی ہے یا ہوائے نفسانی کے پیچھے پڑتی ہے، اس دنیا میں اللہ نے جن امتحانات سے انسان کو گزارنا ہے ان میں سے ایک مال بھی ہے۔ جو آدمی اپنے مال و متاع کو اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کے حصول کے لیے فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے وہ قابل رشک ہے اور جو دنیاوی جاہ و جلال، کفر و شرک کی اشاعت، آلات طرب اور ڈھول و سارنگی کی خرید و فروخت، گندے ڈائجسٹ، گانے بجانے کے آلات، فلمی سی ڈیز وغیرہ میں اپنا مال برباد کرتا ہے وہ دنیا و آخرت میں خائب و خاسر ہے، مال کو فتنہ تو خود اللہ العالمین نے قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ [انفال: ۲۸]
''جان لو تمھارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں۔''

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس فرماتے کی تفسیر میں آیت ہیں کہ فتنہ سے مراد تمھارا اختبار و امتحان ہے۔ وہ تمھیں اموال و اولاد عطا کرکے دیکھنا چاہتا ہے کہ تم اس پر اس کا شکر بجالاتے اور اطاعت کرتے ہو یا ان اموال کے ذریعے تم اس سے بے رغبت ہوجاتے اور منہ موڑ لیتے ہو۔ جیسے اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ [التغابن:۱۵]
''تمھارے اموال و اولاد فتنہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔''

اور ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ﴾ [الانبياء : ٣٥]

”ہم امتحان کے لیے شر اور خیر کے ذریعے تمھاری ابتلا کرتے ہیں۔“

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَا اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ ﴾ [المنافقون:٩]

”اے ایمان والو! تمھیں تمھارے اموال اور اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردیں اور جن لوگوں نے یہ کام کیا وہ خسارہ پانے والے ہیں۔“

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ مال و زر انسان کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔ مال کے ذریعے انسان کا دل زنگ آلود ہوجاتا ہے بلکہ اس دل پر حصول مال، حفاظت مال، ہوا وحرص اور اس کے بڑھنے کی فکر کے گھنے پردے پڑ جاتے ہیں اور دل سیاہ ہو جاتا ہے اور اللہ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے اور جس آدمی کے اندر اس قسم کے امراض جگہ پکڑ لیں اس کے لیے مال ومتاع کا اکٹھا کرنا درست نہیں، ایسے لوگوں کے متعلق اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا تَتَّخِذُوا الضَّيْعَةَ فَتَرْغَبُوْا فِي الدُّنْيَا»

”صنعت وتجارت اور زراعت وغیرہ کو اختیار نہ کرو تم دنیا کی رغبت میں پڑ جاؤ گے۔“

[صحيح ابن حبان (٧١٠)، مسند ابي يعلىٰ (٥٢٠٠)، مسند احمد (٤٢٦/١)، تاريخ بغداد (١٨/١)، مسند حميدى (١٢٢)، ترمذى (٢٣٢٩)، مستدرك حاكم (٣٢٢/٤)، ابن ابى شيبة (٢٤١/١٣) كتاب الزهد لأحمد ابن حنبل (ص ٢٩)، مسند طيالسى (٧٤/٢۔ ٧٥)، اخبار اصبهان (١١٦/٢)

صنعت وحرفت اور تجارت وزراعت ایسے لوگوں کو کرنی چاہیے جو اس کی وجہ سے اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے۔ نماز ادا کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں، جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴾ [النور:٣٧]

”اللہ کے گھر میں ایسے آدمی ہیں جنھیں تجارت اور کاروبار اللہ کے ذکر، نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے سے غافل نہیں کرتے، وہ ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں پلٹ جائیں گی۔“

بہر کیف مال و دولت ایک ایسی آزمائش ہے جس میں پڑ کر انسان فتنے کا شکار ہوجاتا ہے اور اطاعت الٰہی سے غافل ہوجاتا ہے آپ نے جس حدیث کے متعلق سوال کیا ہے وہ کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

«إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً وَإِنَّ فِتْنَةَ أُمَّتِي الْمَالُ »

"ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور یقیناً میری امت کا فتنہ مال ہے۔"

[ابن حبان (٥/٩١- ٩٢) (٣٢١٢)، ترمذی، کتاب الزهد : باب ما جاء ان فتنة هذه الأمة فی المال (٢٣٣٦)، تاریخ کبیر للبخاری (٢٢٢/٧)، طبرانی کبیر (١٧٩/١٩)، مسند الشهاب للقضاعی (١٠٢٢، ١٠٢٣)، مستدرك حاكم (٣١٨/٤)، مسند احمد (١٦٠/٤)، اسد الغابة (٤٨٥/٤)، الاستیعاب (٢٥١/٩)، الاصابة (٣٠٢/٨- ٣٠٣)]

اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح الاسناد قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، امام ابن عبدالبر نے فرمایا: "هو حديث صحيح" امام منذری نے "الترغیب والترهيب ٤/١٧٨" میں ذکر کرکے فرمایا کہ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح الاسناد کہا ہے۔

ام کلثوم بنت علی (رضی اللہ عنہ) کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے

سوال کیا ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا؟

جواب سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ جو سیدہ فاطمۃ الزہراء بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی تھیں، بلا شبہ ان کا نکاح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ہوا اور یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس کا اعتراف فریقین کے محدثین و مؤرخین کو بغیر کسی تردد کے ہے اور ہر دو مکتب فکر کی معرکہ آرا کتب میں اس کا ذکر موجود ہے۔ پہلے اہل سنت کے محدثین و مؤرخین کی تصریحات نقل کی جاتی ہیں پھر شیعہ محدثین و مؤرخین کے حوالہ جات درج کیے جائیں گے:

① « قَالَ ثَعْلَبَةُ بْنُ أَبِي مَالِكٍ إِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَسَمَ مُرُوطًا بَيْنَ نِسَاءٍ مِّنْ نِسَاءِ الْمَدِينَةِ فَبَقِيَ مِرْطٌ جَيِّدٌ فَقَالَ لَهُ بَعْضُ مَنْ عِنْدَهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ! أَعْطِ هٰذَا بِنْتَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الَّتِي عِنْدَكَ يُرِيدُونَ أُمَّ كُلْثُومٍ بِنْتَ عَلِيٍّ فَقَالَ عُمَرُ أُمُّ سَلِيطٍ أَحَقُّ وَ أُمُّ سَلِيطٍ مِنْ نِسَاءِ الْأَنْصَارِ مِمَّنْ بَايَعَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ عُمَرُ فَإِنَّهَا كَانَتْ تَزْفِرُ لَنَا الْقِرَبَ يَوْمَ أُحُدٍ » [بخاری، کتاب الجهاد: باب حمل النساء القرب الى الناس فی الغزو (٢٨٨١)]

"ثعلبہ بن ابی مالک کہتے ہیں کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی عورتوں میں چادریں تقسیم کیں تو ایک عمدہ چادر بچ گئی۔ ان کے پاس بیٹھنے والوں میں سے کسی نے کہا: "اے امیر المومنین! یہ چادر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی کو دیجیے۔" یعنی ام کلثوم بنت علی (رضی اللہ عنہا) جو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "ام سلیط زیادہ حق دار ہیں۔" وہ انصاری عورت تھیں انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "ام سلیط جنگ احد کے دن

ہمارے لیے مشکیں لاد لاد کر لاتی تھیں۔"

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" كَانَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَدْ تَزَوَّجَ أُمَّ كَلْثُوْمٍ بِنْتَ عَلِيٍّ وَ أُمُّهَا فَاطِمَةُ وَ لِهٰذَا قَالُوْا لَهَا بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَانَتْ قَدْ وُلِدَتْ فِيْ حَيَاتِهِ وَهِيَ أَصْغَرُ بَنَاتِ فَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلَامُ " [فتح الباری (٧٩/٦)]

" سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں اور ان کی ماں فاطمہ بنت رسول اللہ تھیں۔ اس لیے لوگوں نے ان کو بنت رسول اللہ کہا۔ ام کلثوم رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں پیدا ہوئی تھیں اور یہ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔"

امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ اور شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی اس تصریح سے واضح ہوا کہ سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔

② " وَ وُضِعَتْ جَنَازَةُ أُمِّ كَلْثُوْمٍ بِنْتِ عَلِيٍّ امْرَأَةِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَ ابْنٍ لَهَا يُقَالُ لَهُ زَيْدٌ وُضِعَا جَمِيْعًا وَ الْإِمَامُ يَوْمَئِذٍ سَعِيْدُ بْنُ الْعَاصِ "

" ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ جو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، ان کا اور ان کے بیٹے زید کا جنازہ اکٹھا رکھا گیا اور اس دن امام سعید بن عاص رضی اللہ عنہ تھے۔"

③ امام ابن حزم رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

" وَ تَزَوَّجَ أُمَّ كَلْثُوْمٍ بِنْتَ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ بِنْتَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَوَلَدَتْ لَهُ زَيْدًا لَمْ يُعْقِبْ وَ رُقَيَّةَ " [جمهرة أنساب العرب (١٥٢،٣٨)]

" ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی تھیں، ان سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ان سے ایک لڑکا زید اور ایک لڑکی رقیہ پیدا ہوئے۔"

④ امام طبری رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

" وَتَزَوَّجَ أُمَّ كَلْثُوْمٍ بِنْتَ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ وَ أُمُّهَا فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَوَلَدَتْ لَهُ زَيْدًا وَ رُقَيَّةَ " [تاريخ الأمم والملوك (٥٦٤/٢)]

" ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ جن کی ماں فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھیں، اس سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا۔ اس سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے۔"

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے بھی یہی بات رقم کی ہے۔ [الاستيعاب على هامش اصابة (٤٩٠/٤)]

ائمہ اہل سنت کی ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ سے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا تھا اور

اس سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے۔ اب شیعہ ائمہ کی تصریحات ملاحظہ کریں۔

سب سے پہلے ہم شیعہ حضرات کی معتبر کتاب کافی کی عبارت پیش کرتے ہیں جو ان کے ہاں بخاری شریف کے پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے اور بعض شیعی محدثین کی تصریح کے مطابق یہ وہ کتاب ہے جو محمد بن یعقوب کلینی ''صاحب کافی'' نے لکھنے کے بعد امام مہدی کے پاس غار میں پیش کی تو انہوں نے کہا: ''یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لیے کافی ہے۔''

① شیخ کا ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی لکھتا ہے:

" عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ عَلَیْهِ السَّلَامُ فِیْ تَزْوِیْجِ اُمِ کَلْثُوْمٍ فَقَالَ اِنَّ ذٰلِكَ فَرْجٌ غُصِبْنَاهُ " [فروع كافي ، كتاب النكاح: باب تزويج ام كلثوم (٣٤٦/٥)]

''امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ آپ سے ام کلثوم کے نکاح کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے کہا:'' یہ ایک رشتہ تھا جو ہم سے چھین لیا گیا۔''

② ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں:

" عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سِنَانٍ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ سَأَلْتُهُ عَنِ الْمَرْاَةِ الْمُتَوَفّٰی عَنْهَا زَوْجُهَا اَیْنَ تَعْتَدُّ فِیْ بَیْتِهَا اَوْ حَیْثُ شَاءَتْ ؟ ثُمَّ قَالَ اِنَّ عَلِیًّا صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَیْهِ لَمَّا مَاتَ عُمَرُ اَتٰی اُمَّ کَلْثُوْمٍ فَاَخَذَ بِیَدِهَا فَانْطَلَقَ بِهَا اِلٰی بَیْتِهٖ " [فروع كافي، كتاب للطلاق: باب المتوفى عنها زوجها المدخول بها أين تعتد وما يجب عليها (١١٥/٦)]

'' عبداللہ بن سنان امام صادق سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق سے مسئلہ دریافت کیا:''جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے وہ عدت کہاں گزارے؟ اپنے شوہر کے گھر رہے یا جہاں مناسب خیال کرے وہاں رہے؟'' تو آپ نے جواب دیا:''جہاں چاہے عدت گزارے کیوں کہ جب عمر فوت ہوئے تو سیدنا علی علیہ السلام اپنی بیٹی ام کلثوم کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنے گھر لے گئے۔''

شیعوں کے شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی نے اپنی کتاب ''تہذیب الاحکام'' میں فروع کافی سے ان دونوں روایتوں کو اسی طرح نقل کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ کتاب شیعوں کے ہاں صحیح مسلم کے پائے کی ہے۔

③ اسی طرح ابو جعفر محمد بن حسن طوسی نے اپنی دوسری کتاب جو شیعوں کی صحاح اربعہ میں شمار ہوتی ہے، میں بھی اسی روایت کو درج کیا ہے:

" عَنْ جَعْفَرٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ مَاتَتْ اُمُّ کَلْثُوْمٍ بِنْتُ عَلِیٍّ وَ ابْنُهَا زَیْدُ بْنُ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ فِیْ سَاعَةٍ وَّاحِدَةٍ لَا یُدْرٰی اَیُّهُمَا هَلَكَ قَبْلُ وَ لَمْ یُوَرَّثْ اَحَدُهُمَا مِنَ الْاٰخَرِ وَ صَلّٰی عَلَیْهِمَا جَمِیْعًا " [تهذيب الأحكام، كتاب المیراث (٢٦٢/٩)]

''امام جعفر صادق اپنے والد محمد باقر سے روایت کرتے ہیں کہ ام کلثوم بنت علی اور اس کا بیٹا زید بن عمر بن خطاب

دونوں ماں بیٹا ایک ہی وقت میں فوت ہوئے اور یہ علم نہ ہو سکا کہ دونوں میں سے پہلے کون فوت ہوا ہے اور ان دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کا وارث نہ بن سکا اور ان دونوں کی نماز جنازہ بھی اکٹھی پڑھی گئی۔''

④ شیعہ فقہ کی معتبر کتاب شرائع الاسلام کی شرح ایک شیعہ عالم سالک نے لکھی ہے وہ صاحب شرائع کے اس قول "يجوز نكاح العربية بالعجمي والهاشمية والعكس " کے تحت لکھتا ہے:

" زَوَّجَ عَلِيٌّ ابْنَتَهُ أُمَّ كَلْثُوْمٍ مِنْ عُمَرَ "

'' عربی عورت کا عجمی مرد سے نکاح جائز ہے اور اسی طرح ہاشمیہ عورت کا غیر ہاشمی مرد سے اور اس کے برعکس بھی جائز ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح عمر سے کیا تھا۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے صحیح بخاری کی ایک روایت پر نظر

سوال ایک حدیث میں ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے غسل جنابت کا طریقہ پوچھا گیا تو انہوں نے پانی منگوا کر پردے کے پیچھے غسل کر کے بتایا۔ کچھ لوگ اس کو غلط رنگ دے رہے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہا نے بغیر کپڑوں کے غسل کر کے دکھایا۔ اس حدیث کی مفصل وضاحت فرمائیں۔

جواب اللہ تبارک و تعالیٰ کا دین قرآن و حدیث میں محصور ہے۔ ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت اور فرماں برداری لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا مقصود و مطلوب ہے کہ اللہ کے قرآن کو صحیح طور پر تسلیم کیا جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث وسنت کو تسلیم کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کار کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اسوۂ کامل کو اپنی زندگیوں میں جگہ دی جائے۔ بعض لوگ قرآن حکیم کے نام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کو غلط رنگ دے کر قرآن و حدیث میں ٹکراؤ کے درپے ہیں اور بعض جعلی قواعد وضوابط وضع کر کے کتب احادیث میں موجود احادیث رسول کو رد کرنے کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو عربی علوم سے نابلد و ناواقف ہیں اور عربی کتاب کا ایک صفحہ بھی پڑھنے پر قدرت نہیں رکھتے بلکہ بعض نادان قرآن حکیم کے الفاظ بھی صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے۔ ہمارا کئی ایسے نادانوں سے سابقہ پڑا ہے جو بالخصوص صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو ہدف تنقید بناتے ہیں لیکن ان میں صحیحین کی ایک لائن پڑھنے کی بھی سکت و ہمت نہیں ہوتی بلکہ ایک دفعہ سوال میں پوچھی گئی حدیث پر معترض بن کر ایک آدمی ہمارے پاس آیا اور کچھ سادہ لوح عوام کو گمراہ کرنے کے لیے ساتھ لایا۔ ہم نے صحیح بخاری اصل عربی والا نسخہ سامنے رکھ دیا اور کہا یہ حدیث صحیح بخاری سے نکالو، اللہ شاہد ہے وہ آدمی حدیث نہ نکال سکا بلکہ ہمیں کہنے لگا آپ ہی نکال دیں۔ جب ہم نے اس کی مزعومہ حدیث نکادی تو پھر اس سے کہا اس کا ترجمہ کرو۔ وہ ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا اور ﴿ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ﴾ کا مصداق ہو کر واپس لوٹ گیا اور آج تک ملاقات کے لیے نہیں آیا۔ بہر کیف چند گمراہ اور گمراہ کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ کا مفہوم بگاڑ کر عوام کو متنفر اور گمراہ کرنے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ انھیں ہدایت

نصیب کرے۔

ان پر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی صادق آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ النَّاسِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَ أَضَلُّوا » [ابن ماجه ، كتاب السنة ، باب اجتناب الرأى والقياس: ٥٢]

''بلا شبہ اللہ تعالیٰ علم بندوں سے چھین کر قبض نہیں کرتا لیکن وہ علم کو علماء کے قبض کرنے کے ذریعہ قبض کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، وہ سوال کیے جائیں گے، تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔''

سوال میں جو حدیث درج کی گئی ہے، اس کے بارے میں بعض شر پسند عناصر منکرین حدیث اور معاندین بہت غلط پروپیگنڈا کرتے ہیں اور حدیث کا مفہوم بگاڑ کر محدثین کرام ؒ اور کتب احادیث کے بارے میں زبان درازی کرتے ہیں، سب سے پہلے صحیح بخاری سے اس حدیث کا متن درج کرتے ہیں پھر اس کی تفصیل عرض کریں گے۔

ابوبکر بن حفص ؒ کہتے ہیں:

« سَمِعْتُ أَبَا سَلَمَةَ يَقُوْلُ دَخَلْتُ أَنَا وَ أَخُوْ عَائِشَةَ عَلٰى عَائِشَةَ فَسَأَلَهَا أَخُوْهَا عَنْ غُسْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَدَعَتْ بِإِنَاءٍ نَحْوًا مِّنْ صَاعٍ فَاغْتَسَلَتْ وَ أَفَاضَتْ عَلٰى رَأْسِهَا وَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهَا حِجَابٌ » [بخارى، كتاب الغسل بالصاع و نحوه(٢٥١)]

''میں نے ابوسلمہ ؓ سے سنا، انھوں نے کہا:'' میں اور عائشہ ؓ کا بھائی عائشہ ؓ کے پاس آئے۔ ان کے بھائی نے ان سے نبی ﷺ کے غسل کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے ایک صاع کی مقدار برتن منگوایا پھر غسل کیا اور اپنے سر پر پانی بہا دیا اور ہمارے درمیان اور ان کے درمیان حجاب تھا۔''

اس حدیث کے بارے میں جو غلط فہمی پھیلائی گئی ہے اس کے لیے درج ذیل امور پر غور فرمائیں:

① دونوں سائل ان کے محرم رشتہ دار تھے، غیر محرم نہیں تھے۔ ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عوف ؓ ان کے رضاعی بھانجے تھے، ام المومنین عائشہ صدیقہ ؓ ان کی خالہ تھیں۔ اس لیے کہ ان کی بہن ام کلثوم ؓ نے انھیں دودھ پلایا تھا۔ [فتح البارى(١/٣٦٥) ، شرح مسلم للنووى (٤/٤)]

اور دوسرے بھی ان کے رضاعی بھائی تھے۔ صحیح بخاری میں تو « أَخُوْ عَائِشَةَ » ہے یعنی عائشہ ؓ کے بھائی اور صحیح مسلم وغیرہ میں شعبہ کے طریق سے مروی حدیث میں ہے کہ « أَخُوْهَا مِنَ الرَّضَاعَةِ » یعنی ''وہ ان کے رضاعی بھائی تھے۔'' [مسلم(٣٢٠) ، نسائى (٢٢٨)، مسند ابى عوانة (٨٤٩)] امام نووی ؒ اور محدثین کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ وہ رضاعی بھائی عبداللہ بن یزید ہیں۔

بہر کیف ان دونوں میں سے کوئی ایک ہو یا کوئی اور رضاعی بھائی ہو، اس سے نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، رضاعی رشتے بھی اسی طرح حرام ہیں جیسے نسبی رشتے حرام ہیں۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ » [مسلم ، كتاب الرضاع: باب يحرم من الرضاعة ما يحرم من الولادة (١٤٤٤) ، بخارى، كتاب النكاح: باب وأمهاتكم اللتى أرضعنكم (٥٠٩٩)،موطا، كتاب الرضاع]

''جو رشتے ولادت سے حرام ہوتے ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہوتے ہیں۔''

لہٰذا دونوں سائل غیر محرم نہ تھے۔

② دوسری بات یہ ہے کہ حدیث کا مقصود غسل کے لیے پانی کی مقدار بتانا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر باب منعقد کیا ہے: " بَابُ الْغُسْلِ بِالصَّاعِ وَ نَحْوِهِ " یعنی ''صاع اور اس کے برابر پانی سے غسل کرنا۔'' اور مسلم شریف میں اس پر یوں باب باندھا گیا ہے: "بَابُ الْقَدْرِ الْمُسْتَحَبِّ مِنَ الْمَاءِ فِيْ غُسْلِ الْجَنَابَةِ " •

''غسل جنابت میں مستحب پانی کی مقدار کا بیان۔''

اور زیر بحث حدیث میں « غسل النبی صلی اللہ علیہ وسلم » سے مراد نہانے کی بجائے ''نہانے کا پانی'' بھی ہو سکتا ہے اور ان معانی میں یہ لفظ صحیح بخاری میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں میمونہ رضی اللہ عنہا سے حدیث ہے:

« صَبَبْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ غُسْلًا » [بخارى، كتاب العلم : باب المضمضة والاستنشاق فى الجنابة (٢٥٩)]

''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غسل کا پانی بہایا۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

« وَضَعْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ غُسْلًا » [بخارى، كتاب الغسل، باب من أفرغ بيمينه على شماله فى الغسل (٢٦٦)]

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غسل کا پانی رکھا۔''

اس بنیاد پر حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے نہانے کے لیے غسل کے پانی کے بارے میں سوال کیا کہ اس کی مقدار کتنی تھی۔ اس کے جواب میں عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک برتن منگوایا جس میں ایک صاع کی مقدار کے برابر پانی تھا اور انھیں بتا دیا کہ اتنے پانی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل کیا کرتے تھے۔ ان کی مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی نمائش نہ تھی۔ غسل کی کیفیت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے زبانی بتائی تھی۔ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت میں ہے:

« قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا اغْتَسَلَ بَدَأَ بِيَمِيْنِهِ فَصَبَّ عَلَيْهَا مِنَ

الْمَاءِ فَغَسَلَهَا ثُمَّ صَبَّ الْمَاءَ عَلَى الْاَذَى الَّذِیْ بِهٖ بِیَمِیْنِهٖ وَ غَسَلَ عَنْهُ بِشِمَالِهٖ حَتّٰی اِذَا فَرَغَ مِنْ ذٰلِكَ صَبَّ عَلٰی رَأْسِهٖ » [مسلم، كتاب الحيض: باب القدر المستحب من الماء (٣٢١)]

"عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "رسول اللہ ﷺ جب غسل فرمانے کا ارادہ کرتے تو دائیں ہاتھ سے شروع کرتے، اس پر پانی ڈالتے اور اسے دھوتے پھر دائیں ہاتھ سے گندگی والی جگہ پانی ڈالتے اور اسے بائیں ہاتھ سے دھوتے، جب اس سے فارغ ہوتے تو اپنے سر پر پانی انڈیل دیتے۔"

اور سنن نسائی میں ہے کہ ابوسلمہ کہتے ہیں:

« وَصَفَتْ عَائِشَةُ غُسْلَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ مِنَ الْجَنَابَةِ » [نسائی، كتاب الطهارة: باب إعادة الجنب غسل يديه بعد ... (٢٤٧)]

"عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کا غسل جنابت بیان فرمایا۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سائلوں کی اصل غرض غسل کی کیفیت پوچھنا نہ تھی بلکہ غسل جنابت کے لیے پانی کی مقدار پوچھنا تھی۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے جب غسل جنابت کے لیے پانی کی مقدار کا بتایا کہ آپ ﷺ ایک صاع پانی سے غسل کر لیا کرتے تھے تو ان دونوں محرم رشتہ داروں نے اس مقدار پر تعجب کیا اور کہا: "اتنے کم پانی سے کیسے نہایا جاسکتا ہے؟" پھر بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو سمجھایا کہ یہ بالکل ممکن ہے۔ وہ پردے کے پیچھے گئیں اور غسل کر کے آگئیں اور ثابت کر دیا کہ تقریباً ایک صاع کی مقدار سے غسل ہوسکتا ہے اور یہ تعجب کئی لوگوں کو پہلے بھی ہوا اور آج بھی لوگ کرتے ہیں کہ اتنے کم پانی سے غسل کیسے ہوسکتا ہے؟ جیسا کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا اغْتَسَلَ مِنْ جَنَابَةٍ صَبَّ عَلٰی رَأْسِهٖ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ مِنْ مَاءٍ فَقَالَ لَهُ الْحَسَنُ بْنُ مُحَمَّدٍ اِنَّ شَعْرِیْ كَثِیْرٌ قَالَ جَابِرٌ فَقُلْتُ لَهٗ یَا ابْنَ اَخِیْ! كَانَ شَعْرُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ اَكْثَرَ مِنْ شَعْرِكَ وَ اَطْیَبَ » [مسلم، كتاب الحيض: باب استحباب إفاضة الماء (٣٢٩)]

"رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تھے تو اپنے سر پر تین لپیں ڈالتے تھے۔" حسن بن محمد نے انھیں کہا: "بلا شبہ میرے بال زیادہ ہیں۔" جابر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے اسے کہا: "اے بھتیجے! رسول اللہ ﷺ کے بال تیرے بالوں سے زیادہ اور صاف ستھرے تھے۔"

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ تھوڑے پانی کے استعمال پر لوگوں کو تعجب ہوتا تھا لیکن اللہ کے رسول ﷺ ایسے مقامات پر بھی اسراف نہیں کرتے تھے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی غسل کے پانی کی مقدار ایک صاع بتائی اور ان کے متعجب ہونے پر پردے کے پیچھے جا کر غسل کر کے آئیں اور انھیں سمجھا دیا کہ ایک صاع پانی سے غسل کرنا صحیح اور درست ہے

اور عملاً ممکن بھی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ حدیث میں « بَيْنَنَا وَ بَيْنَهَا حِجَابٌ » کے الفاظ ہیں کہ ہمارے اور ان کے درمیان حجاب تھا، اس سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی کہ انھوں نے اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کو غسل کرتے دیکھا۔ اگر ان کو دکھانا ہوتا تو حجاب و پردے میں جانے کا کوئی مطلب نہیں رہتا اور ہمارے علم میں کوئی ایسی صحیح حدیث موجود نہیں جس میں یہ ہو کہ انھوں نے ام المومنین کو غسل کرتے دیکھا۔ جو لوگ یہ مفہوم نکالتے ہیں ان کے پاس اس کے پیچھے کوئی پختہ دلیل موجود نہیں۔ اگر حجاب کرنے کے بعد بھی نظر آتا ہو تو اس آیت پر غور فرمائیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوهُنَّ مِنْ وَرَآءِ حِجَابٍ ﴾ [الاحزاب:٥٣]

''جب تم ان سے کسی متاع کا سوال کرو تو حجاب کے پیچھے رہ کر سوال کرو۔''

آپ غور فرمائیں اگر حجاب کرنے کے بعد بھی خاتون نظر آئے تو اس حجاب کا کیا فائدہ؟ پھر حجاب کے بغیر ہی سوال کی اجازت دے دی جاتی اور حدیث میں بھی لفظ حجاب ایسے لوگوں کے ابطال کے لیے نمایاں اور واضح ہے اور ان کی خود تراشیدہ باتوں پر پانی پھیر رہا ہے۔ بہر کیف شرپسند منکرین حدیث بلکہ اصلاً منکرین قرآن اور گمراہ کرنے والے لوگوں کا استدلال اور طریقہ کار انتہائی غلط ہے اور مسلمان آدمی کے لیے روا نہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی احادیث کا مذاق اڑائے۔ بلکہ ایسے لوگ صحیح احادیث کے استہزاء کی بنا پر مسلمان نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرمائے۔ (آمین!)

عورت کی آواز سننا

سوال کیا عورت کی آواز سننا حرام ہے؟

جواب عورت کی آواز کا پردہ نہیں ہے۔ عورت شرعی حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے مردوں سے بات کر سکتی ہے۔ اس کی آواز شیریں اور لوچدار نہیں ہونی چاہیے بلکہ سنجیدگی اور معقول حد تک بلند ہو تاکہ مخاطب اگر دل میں کسی قسم کا روگ رکھتا ہو تو وہ کسی قسم کے غلط خیالات اور تصورات دل میں نہ جما سکے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کئی ایک مسائل ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے جا کر پوچھتے تھے اور آپ حجاب و پردے کے پیچھے ان کے مسائل سن کر جوابات دیا کرتی تھیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿ يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ ﴾ [الأحزاب:٣٢]

''اے نبی کی عورتو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو نرم گفتگو نہ کرو تاکہ جس آدمی کے دل میں روگ ہے وہ کسی قسم کا طمع نہ رکھے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اگرچہ خطاب ازواج مطہرات سے کیا ہے لیکن یہ حکم عام ہے اور ہر عورت کو

شامل ہے کہ وہ اجنبی مردوں سے گفتگو کرتے وقت نرم اور لوچدار طریقہ سے بات نہ کریں بلکہ اچھے طریقے سے بات کریں اور ﴿ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴾ کہہ کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے معروف اور عمدہ طریقے سے گفتگو کی اجازت دی ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں اس کا مفہوم یہ لکھا ہے:

"عورت اجنبی مردوں سے ایسے کلام سے مخاطب ہو جس میں نرمی نہ ہو یعنی عورت اجنبی مردوں سے اس طرح بات نہ کرے جیسے اپنے شوہر سے کرتی ہے۔"

اس آیت کریمہ سے واضح ہوگیا کہ عورت کی آواز جو شرعی حدود کے دائرے میں مرد سن سکتا ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ سلف صالحین کے منہج سے بھی اس بات پر روشنی پڑتی ہے کیوں کہ بڑے بڑے محدثین نے کئی ایک احادیث کی کتب خواتین محدثات سے پڑھی ہیں۔ امام مزی کے اساتذہ میں زینب رحمہا اللہ اور کریمہ بنت احمد المروزیہ رحمہا اللہ سے صحیح بخاری کا درس کئی ایک محدثین نے لیا۔ اگر کتب رجال کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے آخر میں کتاب النساء میں بے شمار صحابیات و تابعیات وغیرہا کا ذکر خیر ملتا ہے جن سے مرد حدیث روایت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات صحیح و درست ہے کہ شرعی دائرہ کار میں رہتے ہوئے مرد حضرات خواتین سے مسائل سن سکتے ہیں، اس پر شرعاً کوئی حرج نہیں ہے اور عورت بھی مسائل بیان کرتے ہوئے سنجیدگی کو لازم رکھے۔

خضر علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں؟

سوال کیا خضر علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں؟

جواب خضر علیہ السلام بندے تھے اور کئی ایک محدثین نے با دلائل ثابت کیا ہے کہ وہ اللہ کے نبی تھے۔ امام قرطبی نے کہا: "وہ جمہور کے نزدیک نبی تھے۔ اس بات کی شہادت قرآنی آیات دیتی ہیں، اس لیے بھی کہ نبی اپنے سے کم مقام والے سے علم نہیں سیکھتا اور باطن کے حکم پر انبیاء ہی کو اطلاع دی جاتی ہے اور ان کے آب بقا پینے والی کہانی بلا دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کے لیے بھی ہمیشگی نہیں رکھی ہر ایک نے موت کا جام پینا ہے اور خضر علیہ السلام کی موت پر امام بخاری، ابراہیم الحربی، ابوجعفر ابن المنادی، ابو یعلی بن الفراء، ابو طاہر العبادی اور ابوبکر ابن العربی رحمہم اللہ وغیرھم محدثین نے قطعی حکم صادر کیا ہے۔ ان کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جو آپ نے آخری ایام میں فرمایا: "ایک صدی بعد سطح زمین پر جو لوگ آج موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔"

اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ نے جو بھی نبی بھیجا اس سے میثاق لیا کہ اگر اس کی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے تو وہ ان پر ضرور ایمان لائے اور ان کی ضرور مدد کرے اور کسی بھی صحیح خبر میں موجود نہیں کہ خضر علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے ہوں اور نہ یہ ہی ثابت ہے کہ انھوں نے آپ کے ساتھ مل کر قتال کیا ہو اور آپ نے بدر والے دن فرمایا: "اے اللہ! اگر یہ گروہ ہلاک کر دیا گیا تو تیری زمین میں عبادت نہیں کی جائے گی۔" اگر خضر علیہ السلام موجود

ہوتے تو یہ نفی صحیح نہ ہوئی۔[مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: فتح الباری (٤٣٤/٦)]

لہٰذا خضر علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں، یہی بات دلائل کی رو سے قوی اور مضبوط ہے۔ اس سلسلے میں کئی شعروں اور حکایتوں میں خضر کی تا قیامت زندگی اور عمر خضر کی جو باتیں کی جاتی ہیں وہ سراسر غیر شرعی ہیں۔

یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے کے متعلق حدیث

سوال کیا یہ حدیث صحیح ہے: ''جو آدمی کسی یتیم کے سر پر اللہ کی رضا کے لیے ہاتھ رکھتا ہے تو اس کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آتے ہیں اللہ ہر بال کے بدلے ایک نیکی عطا کرتا ہے؟''

جواب یتیم بچوں کے سر پر دست شفقت رکھنا اجر کا باعث ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف شقاوت قلبی کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسکین کو کھانا کھلاؤ اور یتیم کے سر پر ہاتھ رکھو۔'' (مسند احمد: ٢٦٣/٢۔ فتح الباری: ١٥١/١١)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کی سند حسن ہے۔ البتہ مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ یہ روایت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے احمد، طبرانی، حلیۃ الاولیاء اور شرح السنۃ میں موجود ہے لیکن اس کی سند میں علی بن یزید الہانی منکر الحدیث ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی فتح الباری (١٥١/١١) میں اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب!)

خواتین کے لیے بھی سونے کا زیور ممنوع ہے

سوال کیا خواتین کے لیے بھی سونے کا زیور ممنوع ہے؟

جواب خواتین کے لیے سونے کا زیور پہننا جائز ہے خواہ وہ گولائی والا ہو یا نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَ هُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴾ [الزخرف:١٨]

''کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے اور جھگڑے کے وقت بات کی وضاحت نہ کر سکے۔''

اس آیت کریمہ میں عورت کی پرورش زیور میں بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے زیورات پہننے کی تردید نہیں کی اور اس قول میں عموم ہے۔ زیور گولائی والا ہو یا کسی اور طرز پر تیار کیا گیا ہو۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''عورت ناقص ہے، اس کا نقص بچپن ہی سے زیور پہنا کر پورا کیا جاتا ہے۔'' [تفسیر ابن کثیر (٥١٩/٥) بتحقیق عبد الرزاق مهدی]

امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''رُخِّصَ لِلنِّسَاءِ فِي الذَّهَبِ وَ الْحَرِيْرِ''

''عورت کو سونے اور ریشم کی اجازت دی گئی ہے۔''

اور پھر انھوں نے یہی آیت تلاوت کی۔ الکیا الهراسی فرماتے ہیں:

" فِيهِ دَلَالَةٌ عَلَى إِبَاحَةِ الْحُلِيِّ لِلنِّسَاءِ وَ الْإِجْمَاعُ مُنْعَقِدٌ عَلَيْهِ وَ الْأَخْبَارُ فِيهِ لَا تُحْصٰى"
[تفسير قرطبي (١٦/ ٤٨) ، مختصر قرطبي (٤/ ٥٢) ، تفسير القرآن للكيا الهراسي (٤/ ٣٩١)]

''اس آیت میں عورتوں کے لیے زیور مباح ہونے کی دلیل ہے اور اس پر اجماع منعقد ہے اور اس بارے میں احادیث شمار نہیں کی جاسکتیں۔''

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« حُرِّمَ لِبَاسُ الْحَرِيرِ وَ الذَّهَبُ عَلَى ذُكُورِ أُمَّتِي وَ أُحِلَّ لِإِنَاثِهِمْ » [ترمذی، كتاب اللباس: باب ما جآء في الحرير و الذهب (١٧٢٠)، مسند احمد(٤/ ٣٩٢)، شرح معاني الآثار (٤/ ٢٥١)، نسائي، كتاب الزينة: باب تحريم الذهب على الرجال (٥١٤٨)، عبد بن حميد (ص/ ١٩٣)، ابن ابی شيبة (٨/ ٣٣٢)، مسند طيالسي (٥٠٦)]

''ریشم کا لباس اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام کیا گیا ہے اور ان کی عورتوں کے لیے حلال ہے۔''

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلْحَرِيرُ وَ الذَّهَبُ حَرَامٌ عَلَى ذُكُورِ أُمَّتِي وَ حِلٌّ لِإِنَاثِهِمْ » [تحفة الأخيار بترتيب شرح مشكل الآثار (٤١٩٨) (٦/ ٢٥٠)]

''ریشم اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام ہے اور ان کی عورتوں کے لیے حلال ہے۔''

عبداللہ بن زریر الغافقی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

« قَالَ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَقُولُ اَخَذَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ذَهَبًا بِيَمِينِهِ وَحَرِيرًا بِشِمَالِهِ ثُمَّ رَفَعَ بِهِمَا يَدَيْهِ فَقَالَ هٰذَانِ حَرَامٌ عَلَى ذُكُورِ أُمَّتِي » [مسند احمد (٢/ ١٤٦)، عبد بن حميد (٨٠)، مسند ابی يعلى (٢٧٢)، بيهقي (٢/ ٤٢٥) ،ابن ابی شيبة (٨/ ٣٥١) ، ابن ماجه (٣٥٩٥) ، مسند بزار (٨٨٦) ، ابن حبان (٥٤٣٤)]

''میں نے علی رضی اللہ عنہ سے سنا انھوں نے کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ میں سونا اور بائیں میں ریشم پکڑا پھر دونوں ہاتھوں کو ان کے ساتھ بلند کیا اور فرمایا: ''یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔''

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ امْرَأَتَيْنِ اَتَتَا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ فِي اَيْدِيهِمَا سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ فَقَالَ لَهُمَا اَتُؤَدِّيَانِ زَكَاتَهُ قَالَتَا لَا قَالَ فَقَالَ لَهُمَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَتُحِبَّانِ اَنْ يُسَوِّرَكُمَا اللّٰهُ بِسِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ قَالَتَا لَا قَالَ فَاَدِّيَا زَكَاتَهُ » [ترمذی، كتاب الزكوة: باب ماجاء

فی زکوۃ الحلی (٦٣٧) ، ابو داؤد (١٥٦٣) ، بیهقی (٤/١٤٠) ، شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید قرار دیا ھے۔ [إرواء الغلیل(٣/٢٩٢)] امام ابن قطان نے اسے صحیح کہا ھے۔ [نصب الرایة(٢/٣٧٠)]

''بے شک دو عورتیں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور ان کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا: ''کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم دونوں پسند کرتی ہو کہ اللہ تمھیں ان کے بدلے میں آگ کے کنگن پہنا دے؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا پھر ان کی زکوٰۃ دو۔''

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَرَأَى فِيْ يَدَيَّ فَتَخَاتٍ مِنْ وَرِقٍ فَقَالَ مَا هٰذَا يَا عَائِشَةُ ! ؟ فَقُلْتُ صَنَعْتُهُنَّ أَتَزَيَّنُ لَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ أَتُؤَدِّيْنَ زَكَاتَهُنَّ قُلْتُ لَا أَوْ مَاشَاءَ اللّٰهُ قَالَ هُوَ حَسْبُكِ مِنَ النَّارِ » [ابوداؤد، کتاب الزکاة: باب الکنز ما هو و زکاة الحلی (١٥٦٥)، حاکم (١/٣٨٩)، بیهقی (٤/١٣٩) امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے شیخین کی شرط پر صحیح کہا اور امام ذھبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ھے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے فرمایا یہ حدیث اسی طرح ھے جیسے حاکم و ذھبی نے کہا ھے۔ [إرواء الغلیل (٣/٢٩٧)]

''رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو آپ ﷺ نے میرے ہاتھ میں چاندی کی چوڑیاں دیکھیں۔ آپ ﷺ نے کہا: ''اے عائشہ! یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے انھیں تیار کیا ہے تاکہ آپ کے لیے زینت اختیار کروں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم ان کی زکوٰۃ دیتی ہو؟'' میں نے کہا: ''نہیں یا کہا جو اللہ نے چاہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ آگ سے تجھے کافی ہیں۔''

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ عورت سونے و چاندی کا زیور پہن سکتی ہے اور اس کے ذمے ان زیورات کی زکوٰۃ ہے۔ اگر زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تو اس کی سزا جہنم کی آگ ہوگی۔

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ احادیث اور دیگر جو اس معنی میں وارد ہوئی ہیں، عورتوں کے لیے سونے کے زیورات کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں اور خاص طور پر جن روایات میں عورتوں کے لیے سونے کی حرمت کا ذکر ہے ان اخبار کے منسوخ ہونے پر ہم نے اجماع سے استدلال کیا ہے کہ عورتوں کے لیے سونے کے زیورات حلال ہیں۔'' [بیهقی (٤/١٤٢)]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عورتوں کے لیے ریشم پہننا اور سونے اور چاندی کے زیورات پہننا صحیح احادیث کی رو سے اجماع کے ساتھ جائز ہے۔'' [المجموع (٤/٤٤٢)]

نیز فرماتے ہیں: ''مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ عورتوں کے لیے سونے اور چاندی کا ہر طرح کا زیور جائز ہے جیسے طوق، ہار، انگوٹھی، کنگن، پہنچیاہ، گلوبند اور ہر وہ چیز جو گلے وغیرہ میں پہنی جاتی ہے اور ہر وہ چیز جسے پہننے کی وہ عادی ہوں، اس سے کسی چیز میں اختلاف نہیں۔'' [المجموع(٦ / ٤٠)]

صحیح بخاری میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جس میں مردوں کو سات چیزوں سے منع کیا گیا ہے، اس کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''جب یہ بات مقرر ہو چکی تو یہ ممانعت جو سونے کی انگوٹھی پہننے کے متعلق آئی ہے، مردوں کے ساتھ خاص ہے، عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں اور عورتوں کے لیے اس کے حلال ہونے پر اجماع نقل کیا گیا ہے۔'' [فتح الباری (١٠/٣١٧)]

پھر اس کے بعد ابن حجر رحمہ اللہ ابن ابی شیبہ سے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث لائے ہیں کہ نجاشی نے سونے کی انگوٹھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ بھیجی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ انگوٹھی اپنی نواسی امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو پہنا دی۔ ابو بکر جصاص رقمطراز ہیں:

''عورتوں کے لیے سونے کے زیورات کے مباح ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اتنی زیادہ روایات مروی ہیں کہ ممانعت والی روایات سے زیادہ ظاہر اور مشہور ہیں اور اسی طرح آیت کی دلالت بھی عورتوں کے لیے زیورات کے مباح ہونے پر واضح ہے اور عورتوں کا زیورات پہننا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر ہمارے اس دن تک بغیر کسی نکیر کے مستفیض ومشہور ہو چکا ہے۔'' [احکام القرآن(٣/٣٨٨)]

لہٰذا عورتوں کے لیے سونے کے زیورات پہننا بالکل واضح اور ظاہر ہے، رہی وہ روایت جس میں مذکور ہے کہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو عورت سونے کا ہار پہنے گی قیامت والے دن اس کی گردن میں اس کی مانند آگ کا ہار پہنایا جائے گا اور جو عورت سونے کی بالیاں پہنے گی قیامت والے دن اس کے کان میں اس کی مانند آگ کی بالیاں پہنائی جائیں گی۔''
[ابوداؤد، کتاب الخاتم: باب ما جآء فی الذهب للنساء(٤٢٣٨) ، نسائی (٨/١٥٧)، مسند احمد (٦/٤٦٠)]

اس کی سند میں محمود بن عمرو ہے جسے ابن حبان کے سوا کسی نے ثقہ قرار نہیں دیا اور ابن حبان رحمہ اللہ کا راویوں کی توثیق کے بارے میں قاعدہ معروف ہے کہ ہر وہ راوی جس پر کسی نے جرح نہ کی ہو اسے وہ کتاب الثقات میں درج کر دیتے ہیں۔

محمود بن عمرو بن یزید بن السکن کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مقبول ہے یعنی متابعت کے وقت جب کہ دکتور بشار عواد اس پر تعلیق وتعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بلکہ یہ مجہول الحال ہے، اس سے صرف دو راویوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اکیلے نے صرف اسے کتاب الثقات میں درج کیا ہے، اس لیے ابن قطان نے اسے مجہول کہا ہے اور ذہبی نے کہا ہے: ''اس میں جہالت ہے۔'' امام ذہبی کے کلام کے لیے دیکھیں۔ [میزان الاعتدال(٤/٧٨) ، المغنی فی الضعفاء (٢/٣٩٢)، الکاشف (٢/٢٤٦)] اسے امام ابن حزم رحمہ اللہ نے ضعیف کہا ھے۔ [المحلّٰی(١٠/٨٣)(١٩١٩)]

امام ابن قطان الفاسی اسماء بنت یزید والی زیر بحث روایت کے تحت لکھتے ہیں:

''اس روایت کی علت یہ ہے کہ محمود بن عمرو مجہول الحال ہے اگرچہ اس سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔''[بیان الوھم والایھام (۳/۵۹۰)]

یہ روایت چونکہ ضعیف ہے اس لیے صحیح احادیث اور قرآنی دلالت کا معارضہ نہیں کر سکتی۔ واللہ اعلم۔ پس اس تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ عورتوں کے لیے سونے اور چاندی وغیرہ کے زیورات پہننا مباح اور جائز ہے، البتہ خواتین پر لازم ہے کہ وہ زیورات کی زکوٰۃ ادا کیا کریں۔ جن زیورات کی زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے وہ کنز وخزانہ شمار نہیں ہوتے اور پہننے والی خاتون کے لیے جہنم میں جانے کا باعث نہیں بنتے۔

نفاق سے براءت

سوال کیا مسجد نبوی میں چالیس نمازوں کی ادائیگی سے نفاق سے براءت ہوتی ہے؟

جواب یہ روایت سند کے ساتھ حسب ذیل ہے:

« حَدَّثَنَا عُقْبَةُ بْنُ مُكْرَمٍ وَ نَصْرُ بْنُ عَلِيٍّ الْجَهْضَمِيُّ قَالَا حَدَّثَنَا اَبُوْ قُتَيْبَةَ سَلْمُ بْنُ قُتَيْبَةَ عَنْ طُعْمَةَ بْنِ عَمْرٍو ، عَنْ حَبِيْبِ بْنِ اَبِيْ ثَابِتٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَنْ صَلّٰى لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا فِيْ جَمَاعَةٍ يُدْرِكُ التَّكْبِيْرَةَ الْاُوْلٰى كُتِبَتْ لَهُ بَرَاءَتَانِ بَرَاءَةٌ مِّنَ النَّارِ وَ بَرَاءَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ » [ترمذی، ابواب الصلاة: باب ماجآء فی فضل التکبیرة الأولی (۲٤۱)]

''انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''جس نے اللہ کے لیے چالیس دن جماعت کے ساتھ نماز ادا کی اور وہ تکبیر اولیٰ کو پالیتا ہے تو اس کے لیے دو خلاصیاں لکھ دی جاتی ہیں۔ ایک خلاصی آگ سے اور دوسری نفاق سے۔''

یہ روایت انس رضی اللہ عنہ سے مختلف طرق کے ساتھ مروی ہے۔ ایک طریق حبیب بن ابی ثابت عن انس رضی اللہ عنہ سے اور حبیب سے یہ روایت طعمہ بن عمرو نے بیان کی ہے۔[الکامل لابن عدی(۲/۸۱۰) ، ذخیرة الحفاظ (٤/۲۱۸۹) ، شعب الایمان للبیھقی (٦/١٦١) ، العلل المتناھیة (۱/٤۳۵)]

اور اسی طرح خالد بن طہمان ابو العلاء الخفاف نے بھی حبیب سے یہ روایت بیان کی ہے۔

پھر اس روایت کو موقوف و مرفوع دونوں طرح بیان کیا گیا ہے۔ جب موقوف و مرفوع میں جھگڑا ہو تو روایت مرفوع سمجھی جاتی ہے، اگر موقوف مان لیں تو پھر بھی حکماً مرفوع ہو گی کیوں کہ اس میں رائے و قیاس کو دخل نہیں۔ یہی روایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے عمارہ بن غزیہ نے بھی بیان کی ہے جیسا کہ ابن ماجہ (۷۹۸) اور شعب الایمان للبیھقی (۱۲۳/٦) میں ہے۔

لیکن یہ سند ضعیف ہے، اس میں انقطاع ہے۔ عمارہ بن غزیہ کی ملاقات انس رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے اور اسماعیل بن عیاش حمص و شامی کی روایت غیر شامیوں سے ضعیف ہوتی ہے اور اس روایت میں اس کے استاذ عمارہ بن غزیہ شامی نہیں بلکہ مدنی ہیں۔ الغرض اس کی کئی اسناد ہیں اور سب سے بہتر اوپر ذکر کردہ سند ہے جس کی بنیاد پر یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔

جس روایت میں مسجد نبوی کا ذکر ہے وہ مسند احمد (۴۰/۲۰، ۱۲۵۸۳)، طبرانی اوسط (۲۱۱/۶) اور مجمع البحرین (۲۸۰/۳) میں موجود ہے۔

مگر اس کی سند میں نبیط بن عمر مجہول راوی ہے اور عبدالرحمٰن بن ابی الرجال اس سے بیان کرنے میں منفرد ہے۔ لہٰذا چالیس روز تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز ادا کرنے والے کے بارے میں یہ فضیلت ہے کہ اسے دوزخ کی آگ اور منافقت سے بری کر دیا جاتا ہے۔ مسجد نبوی کے حوالے سے اس کی سند درست نہیں۔

شعبان کی پندرھویں رات کی فضیلت

سوال کیا شعبان کی ۱۵ ویں رات جسے شب برأت کا نام دیا جاتا ہے اس کی فضیلت میں کوئی صحیح روایت موجود ہے؟ بعض لوگ سورۂ دخان کی ابتدائی آیات شب برات کے بارے میں بتاتے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟

جواب اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورۂ دخان کی ابتدا میں جو فرمایا ہے:

''بے شک ہم نے اس قرآن کو برکت والی رات میں نازل کیا کیونکہ ہم لوگوں کو ڈرانے والے ہیں، یہ وہ رات ہے جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ صادر کیا جاتا ہے۔'' [الدخان: ۳، ۴]

اس آیت میں ''لیلۃ مبارکۃ'' سے مراد ''لیلۃ القدر'' ہے جس کی تفسیر خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کردی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو قدر والی رات میں نازل کیا۔'' [القدر: ۱]

سورۂ دخان میں جس رات کو مبارک قرار دیا ہے اسے ہی سورۃ القدر میں لیلۃ القدر فرمایا ہے۔ رمضان المبارک کے بارے میں ارشاد باری ہے:

''رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔'' [البقرۃ: ۱۸۵]

قرآنی آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کا نزول رمضان کے مہینا میں ہوا اور اس ماہ مبارک کی بابرکت اور قدر والی رات میں جن لوگوں نے ''لیلۃ مبارکۃ'' کو شعبان کی نصف رات قرار دیا ہے ان کی بات درست نہیں۔ ملاحظہ ہو (تفسیر ابن کثیر) (سورۃ الدخان: ۳) رہا اس رات کی تخصیص کے بارے میں روایات کا وارد ہونا تو یاد رہے کہ اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔

امام عقیلی فرماتے ہیں: ''نصف شعبان کی رات اللہ تعالیٰ کے نزول کے بارے میں جتنی روایات مروی ہیں سب ضعیف ہیں۔''

(الضعفاء: ۳/۲۹)اور یہی بات حافظ ابوالخطاب ابن دحیہ نے کہی ہے۔ [الباعث علی انکار البدع والحوادث: (ص/ ۵۲)]
البتہ عمومی طور پر ہر رات آسمان دنیا پر نزول باری تعالیٰ کے متعلق صحیح احادیث موجود ہیں۔ شعبان کی تخصیص کے ساتھ نہیں۔ "البدع والنهي عنها" میں لکھا ہے کہ میں نے مشائخ اور فقہاء میں سے کسی کو بھی نصف شعبان کی رات کی طرف التفات کرتے ہوئے نہیں پایا اور مکحول کی روایت ذکر کرتے ہوئے بھی کسی کو نہیں پایا اور دیگر راتوں کے علاوہ اس کی فضیلت کا بھی قائل کوئی نہیں۔ اسی طرح البدع والنهي عنها (ص/ ۱۱۳) میں صحیح سند کے ساتھ ابی ملیکہ العمیری سے نقل کیا گیا ہے:

"انھیں کہا گیا قاضی زیاد العمیری کہتا ہے: "نصف شعبان کی رات کا اجر شب قدر کے اجر کی طرح ہے" تو فرمانے لگے: "اگر یہ بات میں اس سے سن لیتا اور میرے ہاتھ میں لاٹھی ہوتی تو اس سے اس کی پٹائی کر دیتا۔"

ابن رجب فرماتے ہیں:

"اکثر علمائے حجاز نے اس کا انکار کیا ہے جن میں سے عطاء بن ابی رباح اور ابن ابی ملیکہ ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے فقہائے مدینہ سے یہ بات نقل کی ہے اور اصحاب مالک وغیرہ کا یہی قول ہے۔ انھوں نے کہا کہ" ذٰلِكَ كُلُّهُ بِدْعَةٌ " کہ یہ سارا عمل بدعت ہے۔"

مذکورہ توضیح سے معلوم ہوا کہ سلف صالحین ائمہ حجاز کے ہاں شب برأت کا کوئی تصور نہ تھا، اصل میں قدر و برکت والی رات لیلۃ القدر ہے جس میں قرآن حکیم کا نزول ہوا اور شب قدر کو خود رسول اللہ ﷺ بیدار ہوتے اور اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کرتے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔ شعبان کے مہینا میں ۱۵ ویں رات کی خاص فضیلت کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں ہوئی۔ اس کے متعلق جتنی روایات مروی ہیں ان میں بعض موضوع و من گھڑت قصے ہیں اور بعض ضعیف اور ناقابل احتجاج ہیں۔

شعبان کی نصف رات کے اعمال کی حیثیت

سوال شعبان کی نصف رات کو بعض لوگ صلاة البرأة یا صلاة الالفية ادا کرتے ہیں، بعض ۱۰۰ رکعات نماز اور ہر رکعت میں ۱۰ بار سورۂ اخلاص پڑھتے ہیں، اس طرح ایک ہزار مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھی جاتی ہے۔ کیا ایسا عمل کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

جواب صلاة البرأة یا صلاة الألفية بدعت ہے، اس کا ثبوت کسی بھی صحیح روایت میں موجود نہیں۔ علامہ طاہر پٹنی ہندی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"شعبان کی نصف رات کو جو نماز الفیہ ادا کی جاتی ہے یہ بدعات میں سے ہے، جس میں سو رکعات میں سے ہر رکعت میں ۱۰ بار "قل ھو اللہ" پڑھی جاتی ہے اور لوگوں نے عیدوں سے زیادہ اس کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے متعلق اخبار و آثار ضعیف یا موضوع ہیں۔ امام غزالی نے احیاء العلوم وغیرہ میں جو اس کا ذکر کیا ہے اس سے دھوکا نہ کھایا جائے اور

نہ تفسیر شعبی سے دھوکا کھایا جائے کہ شب قدر لیلۃ القدر ہے۔ اس نماز کی وجہ سے عوام الناس ایک عظیم فتنہ میں مبتلا ہوگئے ہیں، حتیٰ کہ اس کے سبب وہ چراغاں کثرت سے کرتے ہیں اور اس پر فسق و فجور اور عفت و عصمت دری کا ترتب رہتا ہے، جس کا ذکر نا قابل بیان ہے۔ یہ نماز سب سے پہلے بیت المقدس میں ۴۴۸ھ میں ایجاد کی گئی ہے۔''
تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ الموضوعات (ص۴۵،۴۶) لہٰذا ایسی کوئی نماز شریعت سے ثابت نہیں جس میں ۱۰۰۰ بار سورۂ اخلاص تلاوت کی جائے اور اسے صلاۃ البراءۃ کا نام دیا جائے۔

پندرہ شعبان کا قیام اور روزہ

سوال کیا شعبان کی پندرھویں رات کا قیام اور روزہ کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

جواب اس سلسلہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بیان کی جاتی ہے:

''جب نصف شعبان کی رات ہو تو قیام کرو اور دن کو روزہ رکھو۔'' [میزان الاعتدال (١٠٠٢٤)، تذكرة الموضوعات: (٤٥) كنزل العمال (٣٥١٧٧)]

یہ روایت موضوع ہے، اس کی سند میں ابن ابی سبرۃ ہے جس کے بارے میں امام احمد ابن حنبل اور امام یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ یہ روایات گھڑتا ہے۔

لہٰذا روایت موضوع ہے، اس لیے خاص اہتمام کے ساتھ شب برأت کا قیام اور صبح کا روزہ رکھنا درست نہیں ہے۔ البتہ جن لوگوں کا معمول ہے کہ وہ سوموار، جمعرات یا چاند کی ۱۳،۱۴ اور ۱۵ کا روزہ رکھتے ہیں، جنھیں ایام بیض کہا جاتا ہے یا ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن روزہ رکھتے ہیں، ان کے معمول میں آجائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن خصوصاً اس رات جاگنا اور صبح روزے کا اہتمام کرنا یہ درست نہیں ہے۔

WWW. KITABOSUNNAT. COM
KITABOSUNNAT@GMAIL. COM